دہلی مرکز میرٹھ کا تازہ ترین شاہکار

ملک کے نامور شاعر و انشاپرداز حضرت ساغر نظامی کا غیر فانی کارنامہ

انسان اور عالم انسانیت کے لئے محبت اور پُرکیف زندگی کا روحانی پیغام

حجم
۶۰۰
صفحات

مع صفت اعلیٰ و بہترین جلد مضبوط و خوبصورت

کاغذ ۳۶ پونڈ

سرورق سہ رنگا

یعنی

حضرت ساغر نظامی کی سوح پرور وطنی و قومی فطری اخلاقی نظموں اور وجد انگیز غزلوں کا مکمل مجموعہ

جس میں مرکز کی مشہور مصور ... سے بنایا ہوا ساغر نظامی کا اسکیچ بھی شامل ہیں

"دنیا کے تمام انسان ایک خاندان کے افراد ہیں"

"محبت سب مذاہب سے سچا اور اونچا مذہب ہے"

"وطن کی محبت میں جان قربان کردینا حیات جاوید ہے"

یہ اور اسی قسم کے بلند تصورات کی روح "بادۂ مشرق" کے ایک ایک حرف میں پھونکی گئی ہے۔ تصوف، فلسفہ، عشق، محبت، قومیت، اسلامیت، نیشنلزم اور انٹرنیشنلزم کی موج آتشیں "بادۂ مشرق" کے لفظ لفظ میں کار فرما ہے۔ سرورِ کائنات صلعم کے علاوہ رام، کرشن، بدھ، مہاتما گوتم اور اکثر اسلامی و ہندوستانی نامورین پر ایسی نظمیں اس کتاب میں نظر آتی ہیں جو اتحاد اقوام کا سبب بننے کی طاقت رکھتی ہیں۔

"بادۂ مشرق" خالص ہندوستانی شاعری کے جدید و پاکیزہ تصور کو پیش کرتا ہے"

بغور دیکھ عجب کاریٔ حریفِ فرنگ
کہ خاکِ خشک سے پیدا ہے چشمۂ نوری

نصیبِ روس میں جاگا غریب دہقاں کا
بنا ہے نخلِ تمنا ستونِ دستوری

اٹھا و تیشۂ فرہاد و مسندِ خسرو
چمک اٹھا ہے زمانے میں بختِ مزدوری

شکستِ مذہب و ایماں میں غم وہی گم ہے خدا
کمالِ جوش میں ہے بندگی کی مقہوری

اُپج سہی مگر انسان سوزیاں تو نہیں
وطن میں پھیل گئی موجِ روحِ جمہوری

رہا نہ خطرۂ سرمایہ داریٔ افراد
رہی نہ کوئی امیر و غریب میں دوری

اِک انقلابِ مسلسل کا دور ہے جاری
قبائے نو کہ ہے جسمِ قدیم پر بھاری

"مصری"

شکارِ مکر و دنائت فریب سے دل تنگ
چبھا ہے جس کے کلیجہ میں حریت کا خدنگ

فراعنہ کی وہ اک سرزمینِ حسن و جمال
بجا رہی ہے قلوپطرہ جہانِ دف و چنگ

حلول کرنے لگی سعدِ زاغلول کی روح
دماغِ مصر ہے اور مستقل تخیلِ جنگ

وہ ایک حربۂ مغرب کا کشتۂ رنگیں
جو امتداد زمانہ سے ہو گیا بے رنگ

مجاہدینِ سلف کا وہ آئینہ بردار
ہے جس کے عزم کی رفعت کا آسماں پلنگ

اسی کے پاس ہے مشرق کے گلستاں کی کلید
خدا کرے کہ کبھی ایک ہوں سویز اور گنگ

ہر ایک غنچۂ خاموش آگ بن جائے
بہارِ غیر ہو اور شعلۂ فلک آہنگ

سویز پر ہو کبھی اختیار مشرق کا
اِسے عبور کرے راہوار مشرق کا

"عربی"

وہ ایک مرکزِ انوارِ روحِ انسانی
جہانِ علم میں سب سے عظیم عرفانی

خدا نے جس کو دیا ہے جلال عظمت و جاہ
عطا ہوئی جسے قدرت سے خود جہانبانی

علوم جس کے ہیں خادم فنون جسکے غلام
تمام جوہرِ ہستی کی روحِ لافانی

پیامِ صدق دیا جس نے سارے عالم کو
جہاں میں پھیل گئی جس سے روحِ ایمانی

مزارِ سید کونین کی محافظ قوم
خدا کے گھر کی میسر ہے جس کو دربانی

وہ قوم جس میں رسولِ خدا ہوئے پیدا
وہ قوم سر پہ رہا جس کے ظلِ سبحانی

وہ قوم حالِ زبوں بھی ہے جس کا نخلِ بہار
وہ قوم جس کا سکوں بھی ہے موجِ طوفانی

وہ جس کا سینہ امانت ہے دردِ ایماں کی
جو ایک آخری اُمید ہے مسلماں کی

"ترک"

ہر اک زباں پہ جہاں میں ہے داستانِ کمال
یہ ارضِ نقرہ ہے یا کہ آسمانِ کمال

وہ جس نے قوتِ بازو سے زندگی پائی
ہے جس کا آج قدم بوس آستانِ کمال

وہ مصطفےٰ کے مقدس وجود کی حامل
وہ قصہ خوانِ ترقی وہ ترجمانِ کمال

وہ جسکے خون سے رنگیں ہے باسفورس تک
بلند جس کے جہازوں پہ ہے نشانِ کمال

وہ قوم جس نے چلائے جہاز خشکی پر
فرازِ سینۂ ہستی میں تھی سنانِ کمال

نپولین ہے ہر اک فرد جس کا دنیا میں ۔۔۔ وہ تیغ زن وہ مدبر وہ رازدانِ کمال
وہ لازوال جمال و جلال کی مالک ۔۔۔ جہاں میں وہ ادبیات کا جہانِ کمال

وہ ایک شمع کہ جو آندھیوں میں تاباں ہے
وہ آفتاب گھٹاؤں میں جو درخشاں ہے

"عراق"

کنارِ غیب میں اک جسم عظمت و تمکین ۔۔۔ کہ جیسے پنجۂ مضبوط میں ہو اک شاہین
ذرا گرفت ہوئی دستِ باغباں کی جو نرم ۔۔۔ تو دیکھنا یہی پہنچے گا آسماں کے قرین
جھلک رہا ہے خطِ قسمتِ عراق سے ۔۔۔ کہ جھک سکے گی نہ باطل کے سامنے یہ جبیں
وہ ایک سیرتِ انسان کا بہترین حامل ۔۔۔ جفا شعار و وطن دوست حریت آگیں
زمانہ یاد رکھے میری پیش گوئی کو ۔۔۔ کہ ہے عراق کی آئندہ زندگی زریں
اُٹھاؤ قبر سے ہاروں کو اور ماموں کو ۔۔۔ کہ پھر ہو بزم میں اک دورِ ساغرِ زریں
ہوا شراب میں ڈوبی ہوئی چلے ساغر ۔۔۔ فضا تمام مئے ارغواں سے ہو رنگیں

نئی شراب سے دامن کو لالہ زار کریں
سرورِ تازہ سے پھر مقدمِ بہار کریں

"چینی"

وہ ایشیا کے چمن کی بہارِ گلشن زا ۔۔۔ جسے ہے یاد ابھی تک پیام گوتم کا

مقدمہ نہ قیامت کا ہوں یہ تمہیدیں — کہ زلف جہل ہے اور سخت شانۂ تہذیب

سوادِ جہل سے ہے آہِ آتشیں پیدا — سُلگ اُٹھے نہ کہیں آشیانۂ تہذیب

ہے اِن کے خون سے پُر جامِ شرق و مغرب

شکارگاہِ کُل اقوامِ مشرق و مغرب

"سرِّ دلبراں"

میں ذکر اس کا کروں کیا جو ہے مثیلِ نہنگ — بنائے نوحہ و ماتم بہ پردۂ دف و چنگ

وہ مستبد کہ زمانہ ہے جس کا شکوہ طراز — وہ جنگجو کہ خموشی ہے جس کی صوتِ جنگ

وہ ظالموں کا خدا ظلم پروروں کا خدا — وہ جس کے ظلم و ستم سے ہے ایشیا دل تنگ

جگر ہو چین کا یا دل ہو ترک و افغاں کا — ہر ایک سینہ میں پیوست ہے اسی کا خدنگ

نئے تمدن و تہذیب کا وہ دل دادہ — جسے محبتِ انساں ہے باعثِ صد ننگ

قمار خانۂ اقوام کا وہ صدر نشیں — بساطِ مشرق و مغرب ہے جس کی چال سے دنگ

وہ پیرِ میکدۂ قیصری وہ میکشِ زر — کہ جس کے جام میں لبریز ہے مے صد رنگ

کوئی غریب سرِ رہگزر یہ کہتا تھا

کہ اس نے چوس لیا خون سارے مشرق کا

(۲)

وہ ایک تاجرِ صد حیلہ باز و عربدہ ساز — ہوا و حرص و شہنشاہیت کا نغمہ طراز

وہ راہزن پسِ دیوارِ عظمت و حکمت — وہ خود ہی موجدِ قانون خود سیاست باز

وہ علم و حلم کے پردے میں دیوِ استعمار — وہ سیم و زر کے اجالوں میں ایک بادہ نواز

وہ جسکے زیر اثر ہند و مصر اور عراق — وہ جسکے زیر نظر ارضِ روم و شام و حجاز

محیطِ بحر و بر اس کا جلال طوفانی — غرورِ مغرب و مشرق وہ اک خدائے مجاز

وہ جس کا سرِ سیاست کوئی سمجھ نہ سکا — وہ جس کی ظاہری شانیں ہیں ایک عالم راز

وہ پاسبانِ کلیسا ندیم دیر و حرم — کہ ظلم جس کا ہے ایمان، جبر جس کی نماز

جہاں کو آتش و خوں میں ڈھکیلنے والا

وہ بربریتِ انساں سے کھیلنے والا

یہ بادہ خوار ہیں سب ان کا ایک ساقی ہے — جو اپنی قدرت و عظمت کے ساتھ باقی ہے

برابر اس کی نظر میں ہیں شاہ اور گدا — سب اس کو ایک ہیں ہندی ہے یا عراقی ہے

ہے صرف اس کے اشارے پہ قائم و باقی — کوئی نظام جو شخصی ہے یا وفاقی ہے

حصول کیف کو سمجھا ہے جاوداں سب نے — مگر در اصل یہ اک امرِ اتفاقی ہے

کوئی یہاں متردد ہے اور کوئی خاموش — کسی میں جذبۂ مغرورِ طمطراقی ہے

نشاطِ زیست کی بدمستیاں معاذ اللہ — ہے صلح کوش کوئی اور کوئی نفاقی ہے

یہاں ثبات کہاں جام و ساغر و مے کو — نظامِ میکدۂ دہر افتراقی ہے

نہ بادہ خوار رہیں گے نہ یہ صدا باقی

رہیگا صرف وہ ساقیِ میکدا باقی

اُسی کے نام پہ لبریز اپنے جام کرو — پھر ایک جشن محبت کا اہتمام کرو

شرابِ عشق و محبت ہو ہر پیالے میں — بقدرِ ذوق و مساوات انتظام کرو

بہیگا خون یہ توپ و تفنگ سے کب تک؟ — خدا کیواسطے اب بند قتلِ عام کرو
سکون و امن ہیں تسکینِ ہر دو عالم ہے — بلند زندگیِ جنگ کا مقام کرو
حدیثِ میکدہ چھیڑو نئے طریقے سے — اب اس فسانۂ فرسودہ کو تمام کرو
پیو پلاؤ بہاؤ شرابِ گل افروز — تمام عالمِ انساں کو لالہ فام کرو

شرابِ کیفِ اُخوت سے مست ہو جاؤ
وفا پسند محبت پرست ہو جاؤ

ساغر نظامی

اقوال مہاتما گاندھی

تنقیدِ شایدہُ نفس کا ذریعہ ہوتی ہے۔

ترکِ املاک ——— کے لئے قطعی انقلابِ خیال کی ضرورت ہے۔

اگر انسان خاندان کے مفہوم کو وسیع کرے تو اس کے ملک پر بھی اس کے گھر اور اس کے ہم وطنوں پر بھی اہلِ خاندان ہونے کا انطباق ہو سکتا ہے۔

نفرت جرم سے کرو مجرم سے نہ کرو

اصل سوال یہ نہیں ہے کہ آدمی کیا چیزیں کھاتا پیتا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ وہ دماغ سے کیا بات نکالتا ہے

شاعر وہ ہے جو انسان کے دل میں سوئی ہوئی نیکیوں کو جگا دے۔

خیال پر پورا قابو "برہمچاریہ" کی جان ہے۔

کامل تسلیم و رضا کے بغیر خیال پر پورا قابو حاصل ہونا محال ہے۔

نیکی روح کی خلقی صفت ہے۔

فطرت سے ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے جتنے تجربے اور قربانیاں کی جائیں کم ہیں۔

تعلیم میں تہذیب کا خیال رکھنا سب سے مقدم ہے۔

تعمیرِ سیرت تعلیم کی بنیاد ہے۔

گناہ ہولناک شئے ہے۔

جو شخص دوسروں کو دھوکا دیتا ہے وہ ایک دن خود دھوکا کھاتا ہے۔

عہد ایسا ہونا چاہئے جس میں نفسِ لئیم کو بہانہ سازی کی گنجائش نہ رہے۔

کسرِ نفس ترکِ خودی کا نام ہے اور ترکِ خودی درحقیقت موکش (نجات) ہے۔

چھوٹی چھوٹی باتوں میں حقارت و دل آزاری کا برتاؤ ہو تو چپ چاپ سہہ لینا چاہئے۔

نڈر ہونے کے ساتھ حفظِ مراتب کا بھی خیال رکھو یہ فرض ہے۔

جو اپنا فرض ادا کرتا ہے اس کا حق خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔

اُمیدیں پوری نہیں ہوتیں تو اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔

کسی چیز کی فکر نہ کرو!

یہ خیال کہ ہم حق کے راستے پر ہیں کبھی نہیں ہرا سکتا۔

جمہوریت کی اصلی ضمانت یہ ہے کہ لوگ انکو اپنا نمایندہ بنائیں جو نیک و سچے ہوں۔

یہ ہر قوم کا خداداد حق ہے کہ وہ عہد شکنی کی صورت میں حکومت کے ساتھ اتحادِ عمل سے انکار کر دے

ہماری خدمتِ وطن کا مقصد دوسروں کو لوٹنا نہیں ہے (البتہ) ہم خود لٹنا نہیں چاہتے۔

سچے کا ساتھی خدا ہے۔

کسرِ نفس ترکِ خودی کا نام ہے اور ترکِ خودی درحقیقت موکش (نجات) ہے یہ کوئی عمل نہیں ہے بلکہ وہ مقصد ہے جس کے لئے اور اعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر خدمت یا نجات کا طالب کسرِ نفس سے محروم ہے تو اس کی طلب جھوٹی ہے بلغیر کسرِ نفس کے خدمت خود غرضی بن جاتی ہے۔

انسان کی زبان جب خدا کی کارسازیوں کو بیان کرتی ہے تو اسے ناقص طریقے سے بیان کرتی ہے۔

انسان کی جسمانی حالت بڑی حد تک اس کی نفسی کیفیت کی تابع ہے۔

روحانی قوت سے شب و روز جذبات کو مغلوب کرنا مشکل ہے اور جسمانی قوت سے دُنیا کو فتح کرنا سہل ہے۔

اپنے دشمنوں پر محبت کے ذریعے کامیابی حاصل کرو صداقت کا دھرم یہی ہے کہ دوستی کے ہاتھ کو کبھی نہ جھٹکو۔

قطبِ جنوبی میں نئی زمین کی تلاش

فرانسس ڈریک (F. Drake) نے قطب جنوبی میں سب سے پہلے قدم رکھا تھا۔ مگر وہ قطب جنوبی کی تمام سرزمین کو معلوم نہ کر سکا تھا اس لئے اب یہ دوسرا وفد انگلستان سے Britishgraham land (برٹش گریہم لینڈ وفد کے نام سے) پینولا (Penola) نامی جہاز میں بسرکردگی مسٹر جان ریمل (J. Rymill) Expedition قطب جنوبی کو روانہ ہوا ہے۔ اس وفد کو یہ اُمید ہے کہ فاک لینڈ (Falkland) کے مشرق میں کم از کم ایک ہزار میل زمین نئی معلوم ہو جائیگی اور اس پر یہ اپنا قبضہ کر سکیں گے۔ اخبار "لندن ٹائمس" کا نامہ نگار خصوصی جو اس وفد کے ہمراہ ہے لکھتا ہے کہ:۔

۱۱ نومبر ۱۹۳۵ء کو پورے باسٹھ دن کے پانی پر چلنے کے بعد ہم مانٹی ویڈیو (Monte vedo) پہنچے۔ مسٹر ریمل کا ارادہ بالکل سیدھے جانے کا تھا مگر فنچل۔ مڈیرا پر کچھ گھنٹہ اس لئے ٹھیرے کہ وہاں اُتر کر لندن سے لاسلکی کا سامان منگوانا تھا۔ یہاں سے ہم نے کھانے کا تازہ سامان اور پانی بھر لیا۔ میڈیرا سے روانہ ہو کر ہمیں ذرا سی تکلیف صرف خطِ استوا کے جنوب میں پیش آئی تھی پھر تو موسم ہر جگہ برابر خوشگوار رہا ہم نے تو پہلے ہی سے اپنے مُشیر مسٹر میک (Meek) کی ہدایات کے بموجب جہاز کا پچھلا حصہ برف کے مقابلہ کیلئے زیادہ مضبوط کر لیا تھا مگر جہاز میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوا اور (Trade winds) شمالی ہوا کے کم چلنے کی وجہ سے جہاز انجن کے ذریعہ چلایا گیا۔

یہ پہلے ہی سے طے کر لیا گیا تھا کہ اس وفد میں کوئی شخص تنخواہ دار نہ ہوگا اس لئے یہ جہاز لفٹننٹ آر۔ ای۔ ڈی رائڈر (Ryder) کے زیرِ حکم چلایا گیا۔ اور وفد کا کام مندرجہ ذیل اصحاب میں منقسم ہوا۔

مسٹر مارٹن۔ افسر انچارج چوکیداری و مشاہدۂ قطب۔ لفٹننٹ رائڈر انکے نائب۔ لفٹننٹ ملٹ چیف انجنیر اور مسٹر مُور (Moore) .... نائب انجنیر۔ لفٹننٹ ہکل جان لاسلکی کے ماہر مسٹر گُرنے معدنیات اور ارضیات کے ماہر۔ پادری فلیمنگ صاحب۔ وفد کے پیش نماز۔ مسٹر رابرٹس پرندوں کے ماہر۔ مسٹر ریلے۔ فلکیات اور موسم کے ماہر مسٹر۔ برٹرام نباتات اور حیوانات کے ماہر۔

ہر ایک کو ان میں سے چار چار گھنٹہ جہاز پر کام کرنا ہوتا ہی اور وہ کام یہ ہے کہ رات کو محض جہاز رانی اور دن کو جہاز کے رسّوں اور لوہے کے حصوں ستونوں اور بلیوں وغیرہ اور چھت کے تختوں پر تیل، چربی رنگ وارنش ملیں۔

جب موسم اچھا ہوتا ہے اتوار کو تعطیل مناتے ہیں۔ علی الصباح نماز سے فارغ ہو کر دن بھر کپڑے دھوئے غسل کیئے۔ کپڑے سینے اور روزنامچے لکھنے میں وقت خوب گزرتا ہے۔

ہم میں سے بہت سے جہاز رانی میں پہلے سے تجربہ کار نہیں ہیں تاہم بسا اوقات ہمارا جوش و خلوص ہماری ناتجربہ کاری اور بھونڈے پن پر اس طرح غالب آجاتا ہے کہ ہمیں خود حیرت ہوتی ہے ہمارے وفد میں جو سائنس کے ماہر ہیں اُنہوں نے ابتداء ہی میں ہمیں جمع کر کے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کس کس کو کیا کیا کرنا ہوگا۔ کچھ دن ہوئے کہ قسم قسم کے رنگین پرندے چڑیاں۔ تتلیاں۔ بھونرے۔ مکھے ہمارے جہاز پر آکر بیٹھے تھے ان میں سے ایک کافی تعداد ہم نے پکڑ لی ہے۔ اس ماہ کے آخر تک ہم اُمید کرتے ہیں کہ اسٹنلی بندر پر پہنچ جائیں گے۔

عنایت علی بی اے

"(ترجمہ)

کہنے کی باتیں

ایک روسی افسانے کا آزاد ترجمہ

مترجمہ

نروتم پرشاد ناگر

"یہ دلچسپ افسانہ انقلاب روس سے قبل کی سیاسی و مجلسی حالت کا آئینہ دار ہے اور اس فضا کو پیش کرتا ہے جو روس میں انقلاب ہونے سے پہلے تیار ہو رہی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ عوام و خواص میں ایک سے خیال کی آفرینش نے بیتابی و بے چینی پیدا کر دی تھی لیکن باوجود اسکے انقلاب کی تمام مشینری کا اخوا نہیں تھی اور رنگ تجربہ کے طور پر ترک و اختیار کے پھیر میں پڑے ہوئے تھے۔ روس اور ہندوستان کے انقلاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ روس میں تمام جنگ شہنشاہیت کے خلاف تھی اور کارل مارکس کا نظریۂ اشتراکیت ایک نیا جمہوری نظام پیش کر رہا تھا۔ اس کا مقصد مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم کرنا تھا اور ایک عام مساواتی نظام جس کی بنا پر اقتصادی مساوات قائم ہو سکتے۔ لیکن ہندوستان میں انقلاب کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ یہ عام طور پر ساری جنگ سرمایہ داری کے خلاف نہیں لڑی جا رہی ہے بلکہ محض آزادی اور غلامی کی جنگ ہے جس کے وجوہ و اسباب بہت کچھ اقتصادی ہیں۔ ہر چند کہ اس جنگ کی بنیاد بھی مقابلے اور برابری کے مضبوط احساس پر قائم ہے لیکن اشتراکیت پر ہرگز نہیں ہے۔ آزادی چاہنے والے انفرادی زمینداری کے خلاف جنگ نہیں کر رہے ہیں اور نہ ان کے محسوسات ابھی اس قدر ترقی یافتہ ہیں تاہم وہ جنگ مساوات اور مزدوروں اور غریبوں کے نام پر ہی کی جا رہی ہے لیکن اس وقت تک عام طور پر انفرادی افضلیت کے زعم باطل کے سنگین بت کو قطعی طور پر پارہ پارہ نہیں کیا گیا ہے ان حالات میں یہ افسانہ بہت ہی دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ اس فسانے کو انگریزی زبان سے ہمارے دوست مسٹر نروتم پرشاد ناگر نے کمال محنت سے ترجمہ کیا ہے۔ ناگر صاحب ہندی دنیا کے نہایت مقبول ادیب ہیں اور شمالی بھارت میں مقبول اور بلند رسالہ انکے مقالات احترام کے ساتھ شائع کرتا ہے۔ نروتم پرشاد صاحب ناگر نے "ایشیا" کیلئے ہندی لٹریچر کے بہترین نمونوں کو اردو میں منتقل کرنے کا ذمہ لیا ہے اور ان کی فرض شناسی سے مجھے یقین ہے کہ وہ ہر وقت اپنی ذمہ داری کو محسوس کرینگے۔ کیونکہ وہ اہل دماغ، اہل قلم اور فرض شناس نوجوان ہیں"

"ساغر"

آٹون آیچ ایک سرکاری افسر تھا۔ روس اُن دنوں انقلاب کی آگ میں تپ رہا تھا۔ چاروں طرف سدھار اور پریورتن کی دھوم مچی ہوئی تھی روسی عوام کے رہنما نئے عقیدہ کا پروپیگنڈہ کر رہے تھے ان کی ہر ایک بات میں انسانیت، محبت اور بھائی چارے کی شیرینی ملی ہوئی تھی جو بغیر کسی رکاوٹ کے حلق سے اُتر کر رگ رگ میں دوڑ جاتی تھی۔ آٹون ایچ پر بھی ان عقائد کا اثر ہوا۔ اثر ہی نہیں بلکہ وہ پسند بھی کرنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ انہیں عملی جامہ پہنا کر بھی دکھا دینا چاہتا تھا۔ لیکن خیال کو عمل بنانے کے لئے ابھی اُسے کوئی جائز موقع نہیں ملا تھا۔ اپنے دوستوں سے جو کہ عموماً سرکاری افسر ہی ہوتے تھے وہ اپنے خیالات کو ظاہر کیا کرتا تھا لیکن وہ سب اس کی ہنسی اُڑاتے اور اس کو باتونی کہا کرتے تھے۔

آج اس کے ایک دوست نے اپنی سالگرہ کی خوشی میں اسے دعوت دی تھی اور بھی بہت سے حکام اس دعوت میں شریک ہوئے اور حسب معمول اچھا خاصہ میخانہ بھی جاری تھا خوب دور پر دور چل رہے تھے۔ عادت نہ ہونے پر بھی آٹون ایچ کو کئی گلاس پینے پڑے یہاں بھی انسانیت، محبت، بھائی چارہ اور اشتراکیت کی روحانی بحث شروع ہو گئی تھی۔

آٹون ایچ ایک طرف تھا اور باقی سب دوسری طرف، تمام مدعوین نے مل کر اس کا خوب مذاق اُڑایا۔ خوب بنایا اُن کا خیال تھا کہ یہ جہلاء اور دہقانیوں کو بہکانے کی باتیں ہیں انہیں عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ کسوٹی پر اگر یہ سونا کھرا اُترے تب ہم جانیں، یوں باتیں بنانے سے کیا ہوتا ہے

آٹون ایچ جب دعوت گاہ سے چلنے لگا تو معلوم ہوا کہ اس کی گاڑی موجود نہیں ہے اُسے اطلاع دئے بغیر ہی اس کا نوکر اس کی گاڑی کہیں لے گیا ہے۔ اس کے دوستوں نے صلاح دی کہ نوکر کو پکڑ بلایا جائے اور اس کی گستاخی پر اس کے کوڑے لگائے جائیں۔ لیکن آٹون ایچ نے اس صلاح نیک کو ٹھکرا دیا اور پیدل چلنا ہی گوارا کیا۔

موسم اچھا تھا ہی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی، سر در گھوم رہا تھا اور اس کے ساتھ نیرنگی تخیل کا طوفان۔

کتنی خوشگوار رات ہے اور اس خوشگوار رات کے اندھیرے میں یہ چھوٹے چھوٹے مکانات کتنے اچھے معلوم ہو رہے ہیں ان گھروں میں چھوٹے آدمی دفتروں کے کلرک اور لباطی وغیرہ رہتے ہونگے ان لوگوں سے اگر میں بھلے آدمیوں کی طرح رحم و محبت سے پیش آؤں تو کیا میری طرف رجوع نہ ہونگے کیا مجھ سے مخاطب نہ ہونگے ؟! ——— ہونگے اور ضرور ہونگے بلکہ مجھ سے محبت کرنے لگیں گے لیکن مجھے یہ ہو کیا گیا ہے میں اپنے خیالات کو ترتیب بھی نہیں دے سکتا۔ کمبخت شراب کا یہی اثر ہوتا ہے۔ میں اب کبھی نہیں پینے کا اور اس سے فائدہ ہی کیا ہے شام کو اُڑائی خوش ہو گئے۔ صبح ہوئی توبہ کرنے لگے ——— لیکن میں چل تو ٹھیک رہا ہوں ——— میرے پاؤں تو نہیں لڑکھڑا رہے ہیں ! ؟ !

یہ اور اسی قسم کے خیالات میں الجھا ہوا وہ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ اس کے کانوں میں گانے بجانے کی آواز آئی اس نے چاروں طرف دیکھا گلی کے اس طرف ایک ٹوٹے ہوئے مکان سے وہ آواز آ رہی تھی دروازے پر باہر سے کچھ عورتیں دروازے کی درازوں میں جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے، پاس ہی ایک سپاہی کھڑا تھا اس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آٹون کے دفتر کے ایک چھوٹے سے، صرف دس روبل ماہوار پانے والے ایک کلرک سیلڈ ونیو کی شادی کا جشن ہو رہا ہے۔

بھلا اس سے اچھا اور کونسا موقع ملیگا کہ میری جیسی حیثیت کا آدمی لاکھ بار غیرت کا پلڑا نہ پلنے پر بھی سیلڈ ونیو جیسے معمولی آدمی (کہنا تو چاہیے جانور ہی) کے مکان پر نہیں جا سکتا لیکن میں اس ناممکن کو ممکن کر کے دکھاؤں گا اور سب کے روبرو ایک زندہ مثال پیش کروں گا۔

وہ اسی اُدھیڑ بن میں تھا اور اس کے علاوہ اپنے تخیل میں ایک دوسری ہی دنیا کی سیر کر رہا تھا نشے کی حالت میں اس کی خیالی دنیا کی دھندلی تصویریں سچی اور جیتی جاگتی تصویروں کے مانند

اس کے سامنے آنے لگیں، اس نے دیکھا کہ روس کی کایا پلٹ ہو گئی ہے اور آتشکدۂ انقلاب سے نکل کر وہ اور بھی کھرے سونے کی طرح چمکنے لگا ہے۔ زار کا ظالمانہ اور وحشیانہ دور ختم ہو چکا ہے اور انقلاب کی خوشی میں جا بجا جشن ہائے مسرت منائے جا رہے ہیں لہر کہیں روس کے مقدس و محترم رہنماؤں کے ترانے گائے جا رہے ہیں ——————

یہی سب مناظر دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہ ایک جگہ رُکا یہاں اس کا ہی ذکر ہو رہا تھا۔

ہاں اور اس نے (یہاں اس کا نام لیا گیا) ہمارے لئے کیا کچھ قربانیاں

نہ کیں اس کے بعد ایک معمولی ترین کلرک کی شادی میں شریک ہونے کے

قصے کو بڑے دلچسپ طریقے اور خوبصورت لفاظی کے ساتھ سُنا"

یہ سب سن کر اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے اور اس کا سر غرور سے بلند ہو گیا وہ آگے بڑھا چوراہے پر جا کر اس نے دیکھا اس کی ان قربانیوں کے عوض جو اس نے اپنے وطن کے لئے کی تھیں اس کا ایک بُت نصب کیا جا رہا ہے

خیالات کی اسی دُنیا کی سیر کرتے ہوئے اُس نے عزم بالجزم کر لیا کہ وہ اس شادی میں ضرور شریک ہوگا اِسے ایسا محسوس ہوا کہ اپنے عقائد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس سے بہتر موقعہ اور کوئی نہ ملے گا اب اس کے خیالات کی پرواز کا رُخ تبدیل ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ مکان کے اندر داخل ہو گیا ہے اس کے پہنچتے ہی گانا بجانا بند ہو گیا۔ سب کی سٹی گم ہو گئی۔ سیلڈ دنیمو کی تو یہ حالت ہوئی۔ وہ اس طرح حیرت میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا جیسے اسے لقوہ مار گیا ہو۔

"لیکن اس حالت میں میں زیادہ عرصہ تک ان کو نہیں رہنے دوں گا اور بہت جلد ان کے خوف کو اپنے پیارا ور محبت بھری باتوں سے دور کر دونگا' میرے عقائد کی سچائی کو محسوس کرنے کے بعد وہ سب میرے ساتھ اسی طرح گھُل مل کر باتیں کرینگے جس طرح کہ اپنے ہم پایہ آدمیوں سے کرتے ہیں"

یہ سب باتیں سوچ کر وہ گھر میں داخل ہوا، اس کی فوجی وردی کو دیکھ کر کسی کو اُسے ٹوکنے کی ہمت نہ پڑی۔ راستے کی چیزوں کو ٹھوکر سے ادھر اُدھر ٹکراتے ہوئے (آٹون ایچ سے یہ تمام حرکتیں غیرارادی طور پر بے خودی میں ہوئیں اسی لئے اُسے افسوس بھی ہوا) وہ اس مقام پر پہنچا جہاں گانا ہو رہا تھا۔

جو کچھ اس کو اندیشہ تھا اور جو کچھ اُس نے سوچا تھا وہی ہوا' اُس پر نظر پڑتے ہی جو جہاں تھا وہیں ساکت ہو گیا۔ رقاص جوڑوں کے قدم خود بخود رُک گئے اور تمام لوگ اس نووارد کو دیکھنے لگے پھر آہستہ آہستہ عقب میں کھسکنے لگے لوگ جو نووارد کی اہمیت و حیثیت سے واقف نہیں تھے اور بے بہرہ تھے اُنہیں ہاتھ کے اشارے کپڑا کھینچ کر یا کہنی کے اشارے سے بتا دیا گیا کہ آنے والا ایک بڑا آدمی ہے' افسر ہے' ہوشیاری سے تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ جائے —————— کھڑے ہو جاؤ کوئی بیہودگی نہ ہونے پائے۔

آٹون ایچ ابھی ڈیوڑھی کی چوکھٹ ہی پر کھڑا تھا اس کا ایک قدم ڈیوڑھی میں اور ایک آنگن میں تھا اور چند لمحوں تک تمام حاضرین سکتے کے عالم میں کھڑے رہے آخر ایک نوجوان جس کے بال بھورے اور ناک نکیلی تھی آگے بڑھا وہ مرعوب اور خوفزدہ نگاہ سے آٹون ایچ کو اس طرح دیکھنے لگا جس طرح کوئی کتا جس پر کوڑے پڑنے والے ہوں اپنے مالک کی طرف دیکھتا ہے

"کہو سیلڈ دنیمو کیسے ہو؟ مجھے پہچانتے تو ہو گے؟" آٹون ایچ نے کہا لیکن یہ کہنے کے ساتھ اُسے بے اختیارانہ طور پر محسوس ہوا کہ آغازِ گفتگو بیہودہ ہے اور اس کو ایسے بھدے طریقے سے بات چیت نہیں کرنی چاہئے۔

ہاں —————— سر —————— کا —————— ر اسیلڈ دنیمو کی خوفزدہ زبان سے نکلا

اچھا میرے دوست! میرے یہاں آنے سے تمہیں حیرت تو ضرور ہوئی ہوگی، ؟

سیلڈ دنیمو کوئی جواب نہ دے سکا' جواب دینے کے لئے اس کا دماغ کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ خوف زدہ باہر نکلی ہوئی آنکھوں سے وہ صرف آٹون ایچ کی طرف دیکھتا رہا گویا کوئی عظیم اور خطرناک آفت آنے والی ہے۔

سیلڈ دنیمو کی خاموشی سے آٹون ایچ کو اور بھی کشمکش میں ڈال دیا اور اس کی حالت کو اور بھی بے ڈھنگا بنا دیا۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ اس کا یہاں آنا مناسب و برمحل نہیں ہے اس احساس کے بعد اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ کمرہ کی ہر شے اُسے ایک غیر ضروری مہمان خیال کر رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کو اندازہ ہوا کہ اس کا دماغ کچھ زیادہ چکرایا جا رہا ہے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو بجا طور پر ادا نہیں کر سکتا۔ اُس سے سڑک پر جن تصورات میں دل کو خوش کیا تھا اُن سب پر پانی پھرتا کنظر آیا۔ وہ کچھ بے چین ہو کر اُٹھا لیکن پھر کچھ سنبھل کر اس نے کہا۔

میں سمجھتا ہوں میرا یہاں آنا آپ کو ناگوار خاطر نہ گزرا ہوگا۔ اگر میرے داخلہ بیجا سے آپ لوگوں کو زحمت ہوئی ہو تو میں واپس چلا جاؤں"۔

سیلڈ دنیمو چونک پڑا' جیسے بیہوش انسان کو یکایک ہوش آ جائے' اتنا بڑا مہمان گھر پر آیا ہے اور وہ اب تک کچھ نہیں کر سکا ہے اس خیال کے آتے ہی اس نے خود کو اور قریب رکھے ہوئے صوفے کی طرف دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے اس نے کہا۔

"نہیں سرکار آپ نے مجھ ناچیز کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں قدم رنجہ فرما کر مجھے غیر معمولی عزت بخشی ہے۔

آٹون ایچ کے دل سے ایک بوجھ سا اتر گیا صوفے پر بیٹھ کر اُسے کچھ تسکین محسوس ہوئی اس نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی اس کے علاوہ اور سب کھڑے تھے۔ یہ اُس کو بُرا معلوم ہوا ان سب کو اپنے عقائد سمجھانے کا اور ان عقیدوں کے عملی پہلوؤں کی زندہ مثال پیش کرنے کا موقع تو اچھا تھا لیکن بعد کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ کہنا چاہتا تھا مگر نہ کہہ سکا' وہ یہ تک طے نہ کر سکا کہ آخر وہ کہے کیا؟ اس کی زبان نے ایک حرف ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہی نہیں اس کا دماغ بھی اس کی زبان ہی کا ساتھ دے رہا تھا' عجیب کشمکش تھی۔

"اچھی آفت میں پھنسا' اس سے کیونکر چھٹکارا ہو"

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس عجیب حالت سے چھٹکارا پانے کے لئے اسے ایک سہارا مل گیا۔ یہ سہارا تھا دفتر کا ہیڈ کلرک جو ابھی سیلڈ دنیمو کے برابر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُسے دیکھ کر آٹون ایچ کو سکون ہوا' اس نے تسکین کا ایک سانس لیا۔

یہ نہ سمجھئے کہ دفتر کا ہیڈ کلرک اس کے دوستوں میں سے تھا' یہ بات نہیں ہے بلکہ "ضرورت ایجاد کی ماں" ہے وقتی طور پر اس کو دوست بنا لیا گیا اور اس کے بعد آٹون ایچ کا دل کھلا اور اُس نے گفتگو کرنی شروع کی۔

اسے جو کچھ کہنا ہوتا وہ ہیڈ کلرک سے کہتا اور ہیڈ کلرک دیگر مہمانوں تک اس کی بات پہنچا دیتا۔ بہ الفاظِ دیگر ہیڈ کلرک ہم وطن و ہم زبان ہونے کے باوجود اس کے اور دوسرے مہمانوں کے درمیان "ترجمان" کا کام کر رہا تھا۔

اب کمرے میں بھی جان سی پڑنے لگی' تکلف کے پردے اُٹھ گئے۔ خوف نے اپنے پنجے ڈھیلے کرنے شروع کئے نووارد مہمان کی آمد پر اس کا استقبال کرنے کے لئے ہیڈ کلرک

کے لبوں پر ہلکے تبسم کی ایک جھلک نمودار ہوئی کتنی ہی نازنین جو اب تک کھڑی تھیں بیٹھنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ ایک نے بڑی جرأت و ہمت سے کام لیکر اپنے رومال سے ہوا کرنی شروع کی بعض نے دبی ہوئی آواز میں گفتگو بھی کرنی شروع کی۔ ایک صاحب بہت زور سے بولنے لگے لیکن کمرہ بھر میں اپنی ہی آواز کو گونجتے ہوئے دیکھکر خاموش ہوگئے۔

اسی دوران میں ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی وہ قد کی چھوٹی اور بدن کی موٹی تھی گلے میں رومال اور سر پر ٹوپی پہنے ہوئے تھی جسے وہ عید اور شب برات کے دن ہی استعمال کرتی تھی اس کے ہاتھوں پر ایک گول تھالی تھی جس میں شراب کی دو بوتلیں اور دو گلاس رکھے تھے یہ بوتلیں بطور خاص وہمانانِ عزیز کے لئے منگائی گئی تھیں بقیہ پارٹی کا انتظام کیا گیا

آٹون ایچ کے پاس پہنچکر اس نے کہا۔

سرکار نے میرے لڑکے کی شادی میں شرکت کرکے مجھے تاریخی اہمیت بخشی ہے جب تک اس خاندان میں کوئی نام لیوا باقی رہیگا، اُس وقت تک آپ کا نام زبانوں پر رہیگا آپ جیسے معزز اور عظیم ہستی کی میں خاطر تو کیا کرسکتی ہوں پھر بھی جو روکھا سوکھا ہے اسے منظور فرماکر اس ناچیز کو عزت بخشئے۔

"اچھا تو تمہیں سیلڈونیمو کی والدہ ہو!؟

صوفے سے اُٹھتے ہوئے آٹون ایچ نے کہا۔

ہاں سرکار یہ میری ماں ہیں، سیلڈونیمو نے گردن جھکاکر کہا۔

"مجھے تم سے مل کر بہت مسرت ہوئی"

تو میں سمجھتی ہوں کہ میری درخواست منظور ہوئی سیلڈونیمو کی ماں نے گھٹنے جھکاتے ہوئے کہا سیلڈونیمو نے آگے بڑھکر بوتل اُٹھالی اور ایک گلاس آٹون ایچ کو اور دوسرا ہیڈ کلرک کو پیش کیا آٹون ایچ کا یہ ساتواں گلاس تھا نشہ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جیسے گھی کی آہوتی پڑجانے سے پیتے ہی نشہ تیز تر ہوگیا۔ پھر بھی ابھی کسر تھی۔ ایک آدھ گلاس کی نہیں بلکہ چند لمحوں کی، ان چند لمحوں کے گزرتے بھی دیر نہ لگی چنانچہ آٹون ایچ کو محسوس ہوا کہ اس کی زبان سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے ہیں۔ وہ کہنا کچھ چاہتا ہے اور نکلتا کچھ ہے اس کی زبان ہی نہیں ٹوٹتی

"سب ٹھیک ہوجائیگا" اور ایک گلاس ڈھال کر چڑھا گیا، وہ چاہتا تو نہیں تھا کہ زیادہ پیے مگر ان ہاتھوں کو کیا کرے جو خود بخود بوتل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ اس بیہوشی میں اس کو ہوش آیا اور اصلاح و ترقی محبت و اشتراکیت کے نظارے اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے اسے محسوس ہوا کہ اس وقت اگر اس کا کوئی دشمن بھی آجاتا تو گلے لگا لیتا۔ اس نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اب وہ اپنی قوم کے لئے، اپنے ملک کے لئے.. بہت کار آمد ثابت ہوگا۔

——— آہستہ آہستہ محبت، اُنس، اصلاح اور ترقی کی دنیا غائب ہوگئی صرف آٹون ایچ سامنے رکھی ہوئی میز کے سہارے پڑا رہ گیا پھر کچھ دیر کے بعد اس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوسکا اس کے پاؤں نے کام نہ دیا اور وہ کرسی سے لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا۔

رنگ میں بھنگ ہوگئی، سیلڈونیمو کی بُری حالت تھی غریب نے سوچا تھا کہ بڑا افسر آیا ہے ممکن ہے کہ اس کی ذات سے اسے کچھ فائدہ ہوجائے اور بہت ممکن ہے کہ اس کا مستقبل سُدھر جائے اور اس کے دن پھر جائیں، یہی سب کچھ سوچکر اور سمجھکر ابھی اس نے جیسے تیسے قرض دام لیکر اس کے لئے بڑھیا شراب منگائی لیکن اس کی امیدوں کا انجام اور اس کا متخیلہ فائدہ جس شکل میں نمودار ہوا اس کے لئے وہ تیار نہیں تھا ——— یہ سب کچھ دیکھکر اس نے اپنا سر پیٹ لیا اور اس کی حالت بہت بُری ہوگئی۔

سیلڈونیمو کی نوکری کو ابھی پانچ چھ مہینے ہی ہوئے تھے اس سے پیشتر اور اپنے باپ کے فوت ہوجانے کے بعد وہ اور اس کی ماں بے یار و مددگار رہ گئے تھے۔ انہیں اپنے مستقبل میں علاوہ تاریکی اور در در ٹھوکریں کھانے کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ غربت کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ گھاس پھونس مل جاتا، کھالیتے، کئی بار فاقوں کی بھی نوبت آئی گھومتے گھامتے، زمانے کی خاک چھانتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے پیٹرس برگ آئے۔ یہاں سیلڈونیمو کو دس روبل ماہانہ پر ایک جگہ مل گئی۔ وہ خود دفتر جاتا تھا اور گھر پر اس کی ماں پڑوسیوں کے کپڑے دھویا کرتی تھی کیسی نہ کسی طرح شکم پُری ہوہی جاتی تھی اور انہوں نے اپنی کفایت شعاری سے کام لیکر کچھ جمع بھی کرلیا تھا۔ پیٹرس برگ ہی میں سیلڈونیمو کے باپ کے ایک دوست رہتے تھے ان کی دو لڑکیاں تھیں، دُبلی پتلی اور بیمار سی بڑی بہت دُبلی اور کمزور تھی اس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا ہورہا تھا اس وجہ سے اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی جہیز میں آنے والی ۴۰۰ روبل کی بڑی رقم اور ایک لکڑی کے خستہ حال مکان کے سبب سے سیلڈونیمو نے اس لڑکی سے شادی کرنا منظور کرلیا وہ جہیز کے لالچ سے اپنی ذات کو بری نہ کرسکا۔

شادی کی رسم اسی لکڑی کے مکان میں ادا کی گئی، سیلڈونیمو نے صرف دو مہمانوں کو دعوت شرکت دی تھی جن میں سے ایک ہیڈ کلرک تھا۔ دوسرے مہمان لڑکی کے والدین کی طرف سے بلائے گئے تھے۔ اور ان کی خاطر تواضع کا بار بھی انہیں کے ذمہ تھا۔ سیلڈونیمو کے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں۔ جو کچھ تھا وہ یوں ہی چٹ پٹ میں اُٹھ گیا اسی حالت میں آ نمودار ہوئے آٹون ایچ جن کی خاطر تواضع کا زیر بار ہونا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے شیمپین کی دو بوتلوں کی اسے کتنی زبردست قیمت ادا کرنی پڑی ہوگی یہ بتانا مشکل ہے۔

ہاں۔ سیلڈونیمو کو سر پیٹتے ہوئے دیکھ کر اس کا قیاس البتہ کیا جاسکتا ہے۔

———— ⁂ ————

کسی نہ کسی بہانے یکے بعد دیگرے کل مہمان کھسک گئے صرف سیلڈونیمو اس کی ماں اور دلہن باقی رہ گئے۔ اس بلائے ناگہانی کا ظلم سہنے کے لئے ایک بڑا افسر فرش پر بیہوش پڑا ہے یہ کیونکر گوارا کیا جاسکتا ہے۔ سیلڈونیمو نے پہلے تو یہ سوچا کہ کسی ڈاکٹر کی مدد لی جائے مگر ڈاکٹر کی فیس کا خیال آتے ہی اُسے یہ ارادہ بدل دینا پڑا وہ فیس کہاں سے لائے؟ پیسہ کے لئے تو اس نے نوکروں (جو اس کی سسرال کے لئے) تک کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ مگر وہ کہاں سے دیتے جبکہ جن کے پاس پیسہ تھا انہوں نے ہی قرض دینے سے انکار کردیا تھا تو پھر کیا کیا جائے ہوش آنے پر جب سرکار اپنے آپ کو فرش پر پائینگے تو ان کے غصہ کا کیا عالم ہوگا؟.... ایک بار اُس نے سوچا کہ دو کرسیوں کو ملاکر بستر بچھا دیا جائے لیکن یہ بھی ٹھیک نہ ہوگا۔ رات کو کوئی ایسی ویسی بات ہوئی اور اگر کرسیاں الگ ہوگئیں تو کیا ہوگا؟ لیکن کچھ تو ہونا ہی چاہئے۔ پاس والے کمرے میں دولہا دلہن کے لئے ایک خوبصورت اور صاف بستر کا انتظام کیا گیا تھا۔ پلنگ پر تازہ خریدا ہوا گلابی رنگ کا نیا گدا بچھا ہوا تھا۔ تکئے بھی ہلکے گلابی رنگ کے تھے اسی پر آٹون ایچ کو لٹا دیا گیا۔

دولہا اور دلہن کے لئے ایک دوسری کوٹھڑی میں دو کرسیوں پر پھٹا سا کپڑا بچھاکر انتظام کیا گیا تھا۔ گھر کے دوسرے آدمی رسوئی گھر میں فرش پر ہی پڑے رہے لیکن ان سب باتوں کا یہیں پر خاتمہ نہیں ہوا۔ ابھی تھوڑی ہی رات گزری ہوگی کہ سیلڈونیمو کی

کوٹھری سے چیخ کی آواز سنائی پڑی۔ سوتے سوتے کرسیاں الگ ہوگئیں اور دولہا دُلہن پہلی رات کو ہی اپنی بینچ سے نیچے گر پڑے۔ دل ہی دل میں دُلہن نے سیلڈ ونیمو کو اور اس سے زیادہ آٹون ایچ کو کتنا کوسا ہوگا اس کا قیاس آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

سیلڈ ونیمو اُٹھ بیٹھا اُس کی نیند اُچٹ گئی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات بے ترتیبانہ طور پر آنے لگے جو آتے تھے اور منتشر ہو جاتے تھے۔ سامنے ہی اس کی بینچ دو کرسیاں۔ اس کے سارے ولولوں اور اُمنگوں کا خون کرنے کے بعد اُس کے دل کو نوچ رہی تھیں۔ ایک گھنٹہ تک اُس کی یہی کیفیت رہی اور نہ معلوم کب تک رہتی اگر صبح ہوتے ہوتے اُس کی آنکھ نہ لگ جاتیں۔

ادھر نرم بچھونے پر پڑے آٹون ایچ پر بھی بُری طرح بیتی۔ رہ رہ کر وہ رات بھر ہاتھ پاؤں پھینکتا رہا اور نہ معلوم کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ آخر کار جب صبح ہونے کو آئی تو اُس کا ہاتھ پاؤں پھینکنا اور بڑبڑاتا بند ہوا۔ اُس کے بعد غالباً وہ پون گھنٹہ تک خوب گہری نیند سویا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب جب اُس کی آنکھ کھلی تو وہ بالکل ہوش میں تھا۔ لیکن اس کے سر میں بُری طرح درد ہو رہا تھا۔ اور مُنہ کا ذائقہ کچھ بگڑا ہوا سا معلوم ہوتا تھا وہ بستر پر بیٹھ گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سورج کی سنہری شعاعیں کھڑکی کی درازوں میں سے ہوتی ہوئی دیوار پر پڑ کر کانپ رہی تھیں۔ یکایک رات کی باتوں کا اُسے خیال آیا۔ اُس نے صاف طور پر محسوس کیا کہ سیلڈ ونیمو کی شادی کے جشن کو خاک میں ملانے کا باعث وہی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اُسے اپنے وجود سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اور شرم کی وجہ سے اُس نے اپنا مُنہ ڈھانپ لیا۔ اُس نے طے کیا کہ وہ چپ چاپ بغیر کسی سے ملے وہاں سے نکل جائیگا۔ کسی کے سامنے پڑنے کی اُسے ہمت نہیں ہو رہی تھی سامنے ہی اُس کے کپڑے رکھے تھے۔ انہیں پہننے کے لئے جیسے ہی وہ اٹھا کہ سیلڈ ونیمو کی بُڑھیا ماں نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ ایک ہاتھ میں پانی کا برتن اور کندھے پر انگوچھا ڈالے ہوئے تھی۔ انگوچھا اور پانی کو وہیں رکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ ارے! آپ جا کہاں رہے ہیں۔ پہلے ذرا مُنہ ہاتھ دھو لیجئے بعد میں کپڑے پہنئے گا۔

آٹون ایچ نے دیکھا کہ جیسا سمجھتا تھا ویسا نہیں ہوا۔ سیلڈ ونیمو کی والدہ سے اُسے قطعی شرم محسوس نہیں ہوئی اُسے ایسا معلوم ہوا کہ دنیا میں صرف وہ ہی ایک ایسی ہے جس سے اسے شرم محسوس نہیں ہوگی۔ پھر اُس نے منہ ہاتھ دھونا شروع کیا۔ کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں صابون کی ایک ٹکیا لپٹی تھی، جو غالباً دُلہن کے لئے منگائی گئی تھی، آٹون ایچ کو دیدی گئی۔ ٹھنڈے پانی سے مُنہ ہاتھ دھونے کے بعد اس کی طبیعت اور تازہ ہوگئی جب اُس نے گھر سے باہر قدم رکھا تو اُسے ایسا محسوس ہوا ہر ایک شخص اُسے ہی دیکھ رہا ہے اور سیلڈ ونیمو کی شادی کے جشن کو خاک میں ملانے کے لئے اسے نفرت انگیز نظر سے لعنت ملامت کر رہا ہے۔

دفتر جانے کا ذکر کیا پورے ایک ہفتہ آٹون ایچ اپنے گھر سے نہیں نکلا۔ اس ہفتہ میں اُسے جسمانی تکلیف تو کوئی نہیں ہوئی لیکن اُس کی مجروح روح نے اُسے بڑا تنگ کیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اُسے دوزخ میں ڈال دیا گیا ہے۔ کئی بار اُس نے ارادہ کیا کہ دنیاوی جھگڑوں کو خیرباد کہہ فقیرانہ زندگی اختیار کرکے خدمتِ خلق میں اپنی باقی ماندہ زندگی گزار دے لیکن تھوڑی دیر بعد اُسے یہ سب باتیں بیہودہ حرکات معلوم ہوئیں۔ لوگ اُس کی باتوں کو سُنکر اور گزشتہ شب کی حرکتوں کا ذکر سُنکر کیا کہیں گے؟ اُسے کتنی حقارت کی نظر سے دیکھیں گے اور سب سے بڑھکر اُسے اپنے ہم افسروں کے سامنے کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا، کتنا نیچا دیکھنا پڑے گا۔

.... ان سب باتوں کا خیال آتے ہی وہ پھر اپنے آپ کو بھلا بُرا کہنے لگا۔ ایک بار اس نے نوکری سے استعفیٰ دینے کا بھی خیال کیا۔ لیکن یہ خیال بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا اس کے بعد اُس نے ارادہ کیا کہ جو کچھ ہوگیا ہے اُسے وہ بھول جانے کی کوشش کریگا اور کل ہی سے اپنے فرائض کے انجام دینے کے لئے دفتر جانے لگے گا۔

آٹون ایچ اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ کاغذات کی اُلٹ پلٹ میں وہ اپنے آپ کو ایک دم محو کر دینا چاہتا تھا کہ دفتر کا ہیڈ کلرک سرکاری کاغذات لئے ہوئے دفتر میں حاضر ہوا۔ آٹون ایچ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو روک لیا اور پھر جائز سنجیدگی کے ساتھ ہیڈ کلرک کو کاغذات کے متعلق جو سمجھانا تھا سمجھا دیا۔

ہیڈ کلرک وہاں سے جانا ہی چاہتا تھا۔ مگر جاتے جاتے ٹھہر گیا۔ مُڑ کر اُس نے کہا۔

"سرکار ایک گزارش اور ہے۔ سیلڈ ونیمو اپنا تبادلہ کرانا چاہتا ہے۔

کہنے کو تو آٹون ایچ نے کہدیا۔ ہاں مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا میں ضرور کروں گا مگر سیلڈ ونیمو کا نام سنتے ہی اُسے سب باتیں یاد آئیں۔ اب اُس کی شرم نے غصہ کی شکل اختیار کر لی۔ اُس نے کہا

کچھ نہیں! اس طرح کام نہیں چلے گا۔ مجھے خوب سختی سے کام لینا چاہئے۔ دراصل یہ سب منر خرافات ہے میرے دوست ٹھیک کہتے تھے کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ انہیں عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ بلکہ انہیں عمل میں لانا بالکل ناممکن ہے۔ میری غلطی تھی جو میں ایسا سمجھا تھا ——— بیشک ——— میری غلطی تھی ——— لیکن اب مجھے خوب سختی سے کام لینا چاہئے ——— خوب سختی سے ———

اس کے بعد آٹون ایچ اپنے پُرانے دوستوں کی پُرانی پارٹی میں جا ملا۔ صرف کہنے کی باتوں کو پھر کبھی دہراتے ہوئے اُسے کسی شخص نے نہیں دیکھا۔

ارشادات حضرت علی کرم اللہ وجہہ

آرزو کا ترک کرنا ہی تونگری ہے۔
باطل کی حکومت چند لمحوں تک قائم رہتی ہے۔
اور سچائی کی حکومت قیامت تک
مایوسی روح کے لئے موت ہے۔

درخت میں زبان
بہتے ہوئے چشمے میں کتاب
پتھر میں نصیحت
اور
ہر شے میں کوئی نہ کوئی حقیقت مخفی ہے
"شکسپیر"

مشرق کی ایک عظیم المرتبت و مایۂ ناز شاعرہ

بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو

جہاں تک دُنیا کے بہترین علمی و ادبی حلقوں کا تعلق ہے بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو کی محترم و مایۂ ناز ہستی اب محتاج تعارف باقی نہیں رہی ہے۔ مشرق کی اس عظیم المرتبت اور مایۂ ناز شاعرہ کی عزت افزائی میں پوری وسعت قلبی اور فرض شناسی کا ثبوت دیا گیا ہے اسی سے ان کے ادب کو ایک لافانی شہرت حاصل ہو چکی ہے ایشیا میں ہندوستان کی کوئی انجمن اور کوئی چوٹی کی شخصیت ایسی نہیں جو سروجنی دیوی کی ذی کشش شاعری کی پجاری نہ ہو اور فردوسِ مشرق کی کوئی روش ایسی باقی نہیں جو بلبلِ ہند کے پُر بہار اور رس بھرے گیتوں سے ایک ابدی کیف کے جھولے میں جھولتی نظر نہ آتی ہو۔ جہاں تک اُردو دُنیائے ادب کا تعلق ہے وہ اس "گیتوں کی رانی" نے گوشے گوشے کو متاثر کر دیا ہے پھر بھی اس کی رہبرانہ سیاسی حیثیت نے اس کی اصلی روح کو بے نقاب نہیں ہونے دیا اور عام طور پر ہم جس قدر ٹیگور کو جانتے ہیں سروجنی سے واقف نہیں یا یوں کہئے کہ ہم واقف ہونے کے جذبہ کی تشنگی سے مجبور ہو کر اپنے اشتیاق وافر کو پیش کر رہے ہیں۔ یہ تو واقعہ ضرور ہے کہ سر رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعرانہ شہرت کا راز یہی ہے کہ وہ سیاسی مناظر پر نظر نہیں آتے اور ان کو عملی سیاسیات سے دور کا بھی تعلق نہیں لیکن مسز نائیڈو ملک کی ہر عملی سیاست میں ذخیل ہیں، اور ان کو تمام ملک نہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے بلکہ سیاسی و وطنی رہبر کی حیثیت سے پہچانتا ہے ان کی سیاسی و عملی حیثیت اتنی ارفع ہو گئی ہے کہ شاعرانہ حیثیت کے آفتاب کی شعاعیں نور بیز نہیں ہوتیں۔

لیکن بہر حال اس مضمون میں ہم ان کی زندگی اور ان کی شاعری پر ایک جامع نظر ڈالنی چاہتے ہیں گو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم ان کو تمام و کمال سمجھ سکے ہیں مگر ہماری کوشش ہوگی کہ ہم مشرق کی اس عظیم المرتبت شاعرہ، ہندوستان کی اس آتش نفس عندلیب اور بنگال کی اس شیریں گلو اور دل سوز کوئل کے گیتوں کے حقیقی کیف کو سمجھیں اور سمجھائیں۔ اس مضمون کا پہلا حصہ ان کے سوانح حیات اور دوسرا ان کی شاعری پر مشتمل ہوگا۔

(۱)

شریمتی سروجنی دیوی ۱۸۷۹ء میں بنگال کے ایک معزز و باوقار برہمن خاندان میں بمقام ریاست حیدر آباد دکن پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام رگھو ناتھ چٹوپادھیائے (چٹرجی) تھا جن کے خاندان کا قدیمی سلسلہ "برہم نگر" سے ملتا ہے۔ مسٹر رگھو ناتھ چٹوپادھیائے نے ۱۸۷۷ء میں اڈنبرا یونیورسٹی سے ڈی ایس سی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس ہو کر حیدر آباد میں نظام کالج کھولا اور تمام عمر تعلیمی ترقی میں کوشاں رہے۔

شریمتی سروجنی دیوی کا اصلی وطن بنگالہ ہے لیکن ان کے خاندان کی مستقل بود و باش مدتوں سے حیدر آباد میں ہے، جہاں ہر قوم کے افراد مسلمانوں کی شرکت و مجالست کے اثر سے بے تکلف اور شستہ اُردو بولتے ہیں، چنانچہ رگھو ناتھ چٹوپادھیائے بھی اپنی بیٹی سے شیر خوارگی کے زمانے میں بنگالی میں بات نہیں کی بلکہ ہمیشہ زبان اُردو ہی میں گفتگو فرماتے تھے در اصل ان کی مادری اور اصلی زبان اُردو ہی تھی اور وہ قدرتاً اس طرزِ عمل کے لئے مجبور تھے لیکن یہ ہندوستان کی ذہنی اور دماغی غلامی کا پُر شباب زمانہ تھا اور ہندوستانی زبانوں کو انگریزی زبان کے مقابلے میں کمتر سمجھا جاتا تھا۔ غالباً یہی صورت حال اس کی ذمہ دار ہے کہ زمانہ سروجنی کو انگریزی زبان کی شاعرہ کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے ورنہ ان کے اظہارِ خیال کے لئے بنگالی یا اُردو زبان جسے ان کی مادری زبان سمجھنا چاہئے تنگ دامن اور غیر فطری نہ تھی سروجنی دیوی اپنی ماں کی مقدس کوکھ ہی سے ذہین اور فطین پیدا ہوئی تھیں اس لئے ان کے والدین نے تربیت و تعلیم کی طرف خاص توجہ دی، سروجنی دیوی کی تعلیم ابتدا ہی سے انگریزی مدارس میں ہوئی، ابھی ان کی عمر بارہ برس کی بھی نہ تھی کہ مدراس یونیورسٹی کے میٹریکولیشن کے امتحان میں کامیابی حاصل کی یہ ان کی فطری ذہانت اور جودت کا سب سے پہلا کارنامہ تھا جس نے ان کو تمام ملک میں مشہور کر دیا۔

جب سروجنی دیوی کی عمر سولہ برس کی ہوئی تو سرکار نظام کی طرف سے وظیفہ دے کر انگلستان بھیجی گئیں جہاں آپ نے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی انگلستان میں آپ نے اول اول کنگس (شاہی) کالج لندن میں تعلیم پائی اور پھر غیر معمولی ذہانت و فطانت کی وجہ سے ایک اجنبی زبان پر ان کو مادری زبان کی طرح کامل قدرت و مہارت حاصل ہو گئی۔

اعلیٰ تعلیم و تربیت کے بعد شاعری کے وہ فطری جذبات جو شاعرہ کے بطون و شعور پر طاری تھے، یقیناً بے تاب ہو جانے چاہئے تھے کیونکہ اظہارِ خیال کے لئے تربیت نطق اور ذخیرۂ الفاظ کے حصول کے بعد کوئی وجہ باقی نہیں رہتا۔ یہ حقیقت کسی دور میں بھی غلط نہیں ہوئی ہے اور نہ ہوگی کہ شاعر محض دل سے بن سکتا ہے۔ مگر محض دماغ سے کبھی نہیں بن سکتا۔ اگر سروجنی کے پہلو میں الوہیت کی ایک غیر فانی شمع روشن نہ ہوتی اگر اس کے دل میں محبت انسانی اور عشق الٰہی کی انگیٹھی نہ دہک رہی ہوتی تو ناممکن تھا کہ وہ "سروجنی" ہو سکتیں۔ ان کی روحانیت نے ان کی علمی قابلیت کو ذوقِ اظہار بخشا اور ان کے اظہارِ قابلیت نے ایک عالم کو مسحور کر لیا۔

۱۸۹۸ء میں سروجنی دیوی کے شوہر ہونے کا فخر ڈاکٹر نائیڈو کو حاصل ہوا۔ اس غیر مذہبی رشتۂ زوجیت سے سروجنی دیوی کی آزاد خیالی اور بلندی کا پتہ چلتا ہے۔ سروجنی دیوی چٹوپادھیائے

خاندان سے ہیں اور ڈاکٹر نائیڈو کا خاندان بالکل مختلف ہے لیکن یہ شاعرانہ سپرٹ تھی جس نے فرسودگی، ذات پات، خاندان وغیرہ کی قیود کو توڑ کر ضمیر اور روح، محبت اور فطرت کے تقاضات کی بنا پر ایک نئی مثال قائم کی۔ ڈاکٹر نائیڈو جو نظام دکن کے بہت بڑے ڈاکٹر ہیں نہایت آزاد خیال اور بلند انسان ہیں۔ مسز سروجنی نائیڈو کے بڑے صاحبزادے جو ابھی امریکہ سے ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری لیکر آئے ہیں بہت فہیم اور ہوشیار ڈاکٹر ہیں اور ان کے چھوٹے صاحبزادے مسٹر مینا ایک ذہین نوجوان ہیں جن کی انگریزی انشا پردازی ان کی برگزیدہ ماں کی طرح ہندوستان اور دوسرے ممالک سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے دو صاحبزادوں کے علاوہ مسز نائیڈو کی دو صاحبزادیاں بھی ہیں، اور پدمجہ دونوں نہایت قابل اور ذہین ہیں۔ مس پدمجہ شاعرہ بھی ہیں اور اپنی والدہ محترمہ کی طرح انگریزی زبان میں بہت اچھے شعر کہتی ہیں۔ تمام دکن میں اس خاندان کی ذہانت اور فطانت کی دھوم ہے اور ہر شخص اس خاندان کے کمالات کے راگ الاپتا نظر آتا ہے۔

مسز سروجنی نائیڈو کی شاعری

مسز سروجنی نائیڈو نے بیس برس کی عمر ہونے سے قبل ہی ایک حسین مجموعہ "گولڈن تھریش ہولڈ" (آستانِ طلائی) یا "فرشِ زریں" کے نام سے شائع کیا اور وہ بے حد مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ انگلستان کے شعراء کی صفِ اول میں ان کو جگہ دیدی گئی۔ مسز سروجنی دیوی نائیڈو نہایت وسیع النظر اور بلند معیار شاعرہ ہیں "آستانِ طلائی" کو شائع کرتے وقت انہوں نے اپنے کمالِ فن کی بلند آہنگی سے کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد جو کام ان کی طرف سے پیش ہوا اس میں رفعت و شیرینی، بلند خیالی اور لذت کی فراوانی تھی۔

سروجنی کا طائرِ تخیل فطرت کے ہر منظر پر پروانہ وار رقص کرتا نظر آتا ہے! اور اس کو ہم جلیسیِ فطرت نے اپنے فیض سے نطق و بیان کی وہ قوتیں بخش دی ہیں کہ فطرت کے خفی ترین خط کو بھی مصور کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ یہی وہ کمال ہے جو کسی شاعر کو علوم کے دروازوں پر دریوزہ گری کرنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ فطرت کا جمال شاعر کو نذر دیتا ہے مگر اُردو زبان کے کتنے شاعر ایسے ہونگے جو صبح خیزی کے عادی ہوں اور جنہوں نے آفاق میں نیرنگیٔ سحر کا طلسمی و عجیب سماں دیکھا ہو، جنہوں نے طیور کے چہچہانے سے پہلے گوش بر آواز ہو کر فطرت کا لطیف راگ سُنا ہو۔

اُردو شاعری کا جہاں تک تعلق ہے اسے مثالی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ ابھی اولیں دور میں ہے اور تعمیر کی منزلوں سے گزر رہی ہو۔ اس کی تخلیق اور پھر اس کی تخلیق اور پھر اس کی مسلسل تعمیر و تشکیل کی جو تاریخ ہے وہ اس کے غیر معمولی ارتقا کو تو پیش کرتی ہے لیکن تکمیل کو پیش نہیں کرتی یعنی اگر غور کیا جائے تو ابھی اس کا کوئی کلچر اور کوئی فضا ہی مرتب نہیں ہوئی۔ فارسی کے موثرات نے اس کو جس قالب میں ڈھال دیا اور عقائد نے جو صورت دی وہ نہ ہندوستانی تھی نہ ایرانی اور نہ آرین۔ بلکہ گستاخی نہ ہو تو اس کو نقالی سے تعبیر کرنے کو جی چاہتا ہے نقل سے کبھی روح متاثر نہیں ہو سکتی چنانچہ اُردو شاعری کی روح کم متاثر ہوئی اور فن کے لحاظ سے اُس نے اس لئے ترقی کی کہ اس کے پاس فصل کی تیاری کے لئے کھیت، تخم اور تمام سامان فارسی زمینداران ادب سے مستعار مل چکا تھا لیکن اس کے بازوؤں اور قوتِ دماغی کو اگر اس باب میں جفاکشی کرنی پڑتی تو اس کی روح کے متاثر ہونے کا موقع تھا مگر اس حال میں کیونکر ممکن تھا کہ اُردو شاعری کی روح (الا ماشاءاللہ) میں شاعری کی اصلی کیفیت پیدا تی۔ پھر مذہب نے بھی شاعری کو کمتر خیال کر کے یہ بجائے خود روح کے مضمحل کر دینے کے لئے کافی تھا۔ ایسی صورت میں مکمل اور اچھے شاعر پیدا ہوتے تو کیونکر ہوتے؟ تاہم فضا اور ماحول کی غلط سامانیوں کے باوجود فطرت نے اپنی رسالت کے فرائض ادا کئے اور چند لوگ اُردو میں ایسے پیدا ہوئے جو فطرت کے حقیقی پیامی تصور کئے جا سکتے ہیں۔

لیکن عام طور پر شاعری کے مفہوم اور فضا، رنگ و روپ، کلچر اور اسپرٹ میں خالص ہندوستانیت پیدا نہیں ہو سکی اور اُردو زبان کا شاعر اصلی کیفیت سے محروم رہا۔ نہ صرف محروم رہا بلکہ اُس میں کچھ مزاجی نقائص بھی پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی کمی اس میں خود انتقادی اور شاعرانہ خودی کی ہے وہ ہمیشہ سوسائٹی کا غلام رہا۔ اور اس نے کبھی اپنی پہنی ہوئی زنجیروں کو خود نہیں توڑا۔ سوسائٹی نے اپنے ذوق کے مطابق اس کو مدت تک چلایا۔ تا آنکہ خود اس میں انقلاب پیدا نہیں ہوا شاعر نہیں بدلا ایک وجہ اس کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُردو زبان میں سچے نقادوں کی کمی ہے۔ یہاں تنقید کا مقصد تعریف و تنقیص محض کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہاں اگر کسی شاعر کے کلام پر تنقید کی جائے تو وہ اس کو اپنی دشمنی تصور کرتا ہے اور سچ پوچھئے تو جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وہ بھی دشمنی ہی کی غرض سے کی بھی جاتی ہے۔ مگر زندہ اور مہذب ممالک میں یہ طریقہ نہیں لیکن بہر حال وہ مشرق ہو یا مغرب حقیقی شاعر کو خود اپنا نقاد ہونا چاہیئے۔ اگر وہ خود اپنا نقاد ہو گا تو کسی نکتہ چین کی زبان نہیں کھل سکتی۔

مسز سروجنی نائیڈو سے انگلستان کے ایک انگریز نقاد مسٹر ایڈمنڈ گوس نے صاف کہدیا کہ اگر تم کو انگریزی شاعری میں اپنی مخصوص جگہ لینی ہے تو اپنے وطن اور اس کی خصوصیات کو نظر انداز نہ کرو انگریزی خیالات کو انگریزی میں دُہرانے سے تم حقیقی شاعر نہیں بن سکتیں۔ بلکہ انگریزی میں ہندوستانی خیالات و جذبات کو پیش کرنے ہی سے تم مغرب میں اپنی مشرقی نثر اور شاعری کا پرچم لہرا سکتی ہو۔ وہ نقاد بہت بڑا نباض تھا جس نے یہ رائے دی اور وہ شاعرہ بہت بڑی عقیل تھی جس نے اس رائے کو سمجھا اور پھر اس کی شاعری تصنع کے تمام لباسوں کو چاک کر کے حقیقی رنگ میں جلوہ افروز ہو گئی۔

شاعر کے لئے محتاط اور مفکر ہونے کی ضرورت ہے۔ مشاعروں اور کوی سمیلنوں کے شاعر وقتی واہ واہ حاصل کر سکتے ہیں مگر ان کی روح میں کیف نہیں پیدا ہو سکتا اور وہ عالمگیر حیثیت اختیار نہیں کر سکتے جو کافی ریاضتِ روحانی و دماغی کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ سروجنی کی شاعری ان ہنگامہ خیزیوں اور آفاقی اثرات سے آزاد تھی۔ اس کے سامعین مشرق و مغرب کے پختہ کار نقاد خوش ذوق طبقے تھے۔ اور اس کی اشاعت کے ذرائع وہ نہ تھے جو دہلی و لکھنؤ ہی کی قسمت ہیں۔ اس کی شاعری ہونٹوں پر رسمی لفظوں کو زبردستی پیدا کرنے سے مجمل اور روح کو رقصاں کر دینے میں مشاق ثابت ہوئی۔

اس کی شاعری کا پیکر، روحانی وجد و قص، کیف و سرور، رنگینیٔ بہار، درسِ پیغامِ اتحاد اور ہندوستانی تقاضاتِ فطرت کی گہری اور لطیف نفسیات کے عناصر اور اجزا سے مرکب ہوا ہے۔ وہ ایک شعلہ نفس عندلیب ہے جو اپنے چمن (ہندوستان) کی عظمت کے گیت سرشار ہو کر گاتی ہے۔

مادرِ وطن سے خطاب

اُٹھ مادرِ وطن!

جمود و تعطل کے ذلت آفریں خواب سے بیدار ہو، بادِ حوادث کے جھونکے تیرے گلشنِ شباب کو

ابھی تاراج نہیں کرسکے ہیں تو نئی نویلی دُلہن بنکر اپنے بطن سے نئی شوکتیں پیدا کر۔

پابہ سلاسل قومیں غلامی کی ظلمت میں مصروف فغاں ہیں۔ اُٹھ اور انہیں امیدوں کے نئے سپیدۂ سحری کا جلوہ دکھادے
مادرِ ہند ——— اے مادرِ ہند تو کہاں سورہی ہے، تیرے بچے پکار رہے ہیں۔ انہیں اپنی آواز سنادے

مادرِ وطن!
مستقبل تجھے پکار رہا ہے
عزت، شوکت، اور فتوحات تیرے قدموں پر قربان ہونے کے لئے تیار ہیں۔
اُٹھ لے نیند کی ماتی ماں اُٹھ
اپنے سر پر تاج رکھ لے۔ تو اقلیم ماضی کی ملکہ تھی۔

بہت بڑی دقت ہے کہ اُردو داں حضرات سروجنی کی اصلی روحِ شاعری کو معلوم نہیں کرسکتے ایک زبان سے دوسری زبان میں شعر کا ترجمہ کامیابی کے ساتھ مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے انگریزی زبان میں یہی نظم لرزہ براندام کردینے والی ہے اور اُردو کے قالب میں وہ بات باقی نہیں رہی۔ اصلی زبان میں شاعرہ کا جذبۂ محبتِ وطن الفاظ میں سرایت کئے ہوئے ہے اور اس نے جذبہ کی حاجت اور اظہارِ خیال کی ضرورت سے الفاظ تجویز کئے ہیں، مترجم کو تو اس کی ضرورت نہیں پڑی وہ تو سروجنی کی شاعری سے بحث کرنے کے لئے بیٹھا ہے۔

دیہاتی گانے نظم کرنے میں بھی سروجنی دیوی کو مہارت ہے ان گانوں کے پردے میں اپنے مادرِ وطن کے مصائب کے افسانے کہے ہیں۔ مسز نائیڈو فطرتِ انسانی کی ماہر ہیں۔ انکے کلام میں ہندی جذبات کی حرارت، ہندی قلب کا تموج، اور ہندی خیالات کی تحریک پائی جاتی ہے۔

یہاں تک کہنے کے بعد ہم اختر دہلوی کا ایک مختصر نوٹ شریکِ مضمون کرتے ہیں جو سروجنی دیوی کی شاعری پر کمل نوٹ تو نہیں ہے لیکن اس کے مطالعہ سے ان کی شاعرانہ کمال کا اجمالی اندازہ ضرور ہوجاتا ہے۔

"مسز نائیڈو کی شاعری بجائے خود ایک وسیع مضمون ہے اور چونکہ وہ تمام وکمال انگریزی زبان میں ہے! اس لئے اُردو میں اُس کی مفصل تنقید اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس کے لئے ضرور ہے کہ اوّل اُن اثرات کو واضح کیا جائے جو اُن کی شاعری پر تقاضا پر تو فگن ہوئے اس کے بعد اُن کی شاعری کا تقابل اور موازنہ دیگر انگریزی شعراء کے کلام کے ساتھ کرکے اُس کی خصوصیات کو واضح کیا جائے اور آخر میں یہ تعین کیا جائے کہ انگریزی نظم میں اُن کا پایہ کیا ہے ظاہر ہے کہ اگر اُردو زبان میں ان تمام مباحث کے لئے وسعت بھی ہو تو وہ نقاد کہاں جو ان سے کشمکش کرسکے لہٰذا یہاں صرف اس قدر ہوسکتا ہے کہ ایک اجمالی تبصرہ ناظرین کے پیشکش کردیا جائے یہ بیان اوپر آچکا ہے کہ مسز نائیڈو کو اپنے طالبعلمانہ قیام انگلستان میں اپنی علمی اور شاعرانہ استعداد کو ترقی دینے کے خاص مواقع نصیب رہے ہے۔ انگلستان میں اُس وقت سوئن برن موریس اور روزیٹی کا اثر غالب تھا اور انگریزی نظم میں نئی نئی گلکاریاں اور رنگ آمیزیاں ہوچکی تھیں۔ مذکورہ بالا شعراء اور ان کے معاصرین نے جو رنگ پیدا کردیا تھا وہ اگرچہ بہت مدت تک تو اُس آفتابِ شاعری کے غروب کی شفق تھا جو انیسویں صدی کے شروع میں ورڈز ورتھ بائرن اور شیلے کے عروج کے ساتھ طلوع ہوا تھا لیکن تاہم موسم خزاں کی کسی سہانی شام کی مانند نظر فریب ضرور تھا۔ ان شعراء کی سعی سے انگریزی شاعری نے زبان کے اعتبار سے نئی لطافتیں اختیار کرلیں تھیں اور شاعری موسیقی کے نصب العین کے قریب ہوگئی تھی تخیل کے اعتبار سے اُس کی حدود مصوری کے قریب پہنچ گئی تھیں اور فن مصوری کے اصول شاعری میں جھلکتے نظر آتے تھے شاعری کو دیگر فنون لطیفہ سے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے، اور اس میں مصوری اور موسیقی دونوں کے اجزا ابتدا سے شامل رہے ہیں خصوصاً موسیقی اور شاعری کا قدیم اور قریبی رابطہ بالکل بیّن اور واضح ہے لیکن اس دور کے انگریزی شعراء کی غالباً سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ انہوں نے مصورانہ تخیلات کو سُریلے الفاظ میں منظوم کرنے کی خاص طور پر مہارت بہم پہنچائی تھی اس میلان کا اثر ہماری شاعرہ کے کلام پر بھی پڑا۔ اور جہاں تک وہ اثر مسز نائیڈو کی نظموں کو فردوس گوش بنانے میں مدد دیتا ہے۔ اُس کو مفید کہنے میں کوئی تامل نہیں ہوسکتا لیکن اس اثر کا ایک مضر پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ بعض دفعہ محض سُریلے الفاظ کو شاعرانہ کلام کا مترادف خیال کرلیا جاتا ہے یا پڑھنے والے کی توجہ الفاظ کے نغمہ میں اس قدر اُلجھ جاتی ہے کہ نظم کا مفہوم بالکل نظر انداز ہوجاتا ہے شاعری کا مدعا محض ایک نغمۂ صوات کی تخلیق نہیں، اس کا دائرۂ تخلیق اس سے بہت زیادہ وسیع ہے خوش آواز الفاظ کا بڑھا ہوا شوق بعض دفعہ شاعری کو محض لفاظی کے درجہ تک گرادیتا ہے حق پسندی کا تقاضا اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور کرتا ہے کہ یہ مضر اثر بھی مسز سروجنی نائیڈو کی ابتدائی نظموں میں بالکل مفقود نہیں ہے۔

بادی النظر میں یہی امر کچھ کم حیرت خیز نہیں کہ کوئی ہندوستانی انگریزی میں شعر کہے۔ اصلی شاعری تمام وکمال فطرت پر مبنی ہے اور اُس کا اظہار فطری طور پر اپنی ہی زبان میں ہوسکتا ہے لیکن خواہ اسے ہنر کہئے یا عیب مگر یہ واقعہ ہے ہندوستانیوں کو غیر زبانوں کے اختیار کرنے اور اُن زبانوں کو اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں عرصۂ دراز سے ایک خاص ملکہ حاصل رہا ہے مثال کے طور پر فارسی کو لیجے، مسلمانوں کے عہد میں زبان نے وہ عروج پایا کہ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی کثرت سے فارسی شعر کہنے لگے اور ہندوستان کی فارسی شاعری کے متعلق شیخ علی حزیں جیسے تنگ خیال اہل زبان خواہ کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں اور "بوئے کچوری می آید" پھبتی اڑائیں، لیکن اس ملک کے فارسی گو شعراء کے گروہ میں چند ایسے بھی ہیں جن کے کمال کی داد ہر ایک منصف مزاج شخص کو دینی پڑتی ہے۔ عربی فارسی سے زیادہ مشکل الحصول زبان ہے لیکن اہلِ ہندی لحن نجدی کے اختیار کرنے سے عاجز ثابت نہیں ہوا متعدد ہندوستانیوں نے عربی نظم و نثر میں قابل قدر سلیقہ دکھایا ہے انگریزی تعلیم کے بنگال میں رواج ہی بنگالی شعراء کو انگریزی نظم کا شوق ہوگیا۔ اور ان میں کم از کم دو شاعر اس پایہ کے ہوئے کہ ان کا کلام اہلِ زبان کی نگاہ میں بھی وقیع قرار پایا ہے۔ ان میں سے ایک (ڈیروزیو) تو مخلوط النسل ہونے کی وجہ سے انگریزی کو غالباً مادری زبان کی طرح استعمال کرتا تھا۔ لیکن مس تورودت خالص بنگالی ہونے کے اعتبار سے مسز سروجنی نائیڈو کی حقیقی پیشرو

تھیں۔ غرض کہ مسز سروجنی نائیڈو کی پیدائش سے بھی پہلے ہندوستان اور خصوصاً بنگال میں انگریزی شاعری کی رسم جاری ہوگئی تھی۔ علاوہ بریں اُن کی ابتدائی تعلیم کے متعلق جو کچھ مذکور ہو چکا ہے اُس کو خیال میں رکھتے ہوئے یہ حیرت کسی قدر کم ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ہندوستانی ہو کر انگریزی زبان پر ایسی قدرت کیونکر حاصل کی کہ اس میں اپنی شاعرانہ کمال کا اظہار کرسکیں۔ اُن کی انگریزی زباندانی کی پوری داد کوئی اہلِ زبان ہی دے سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک ایک ہندوستانی سمجھ سکتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ محاورات اور الفاظ دونوں پر اُن کو کامل تصرف حاصل ہے۔ اور اُن کے استعمال میں کوئی ایسی خامی یا نقص نہیں نظر آتا جو اُن کے اظہارِ کمال میں مانع ہو سکے۔ انگریزی شعراء کے کلام پر اُن کو پورا عبور ہے۔ اور اُس کی ملاوٹیں اُنکے اپنے کلام کی شکر ریزی میں مدد دیتی ہیں۔ شاید میرا یہ خیال غلط نہیں کہ وہ شیلے کے کلام کی خاص طور سے دلدادہ ہیں کیونکہ اُس کے کلام میں وہ نزاکت اور لطافت ہے جو بہ نسبت عام آدمیوں کے شعراء کو زیادہ اپنی جانب جذب کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ اب تک جو کچھ بیان ہوا اُس سے یہ قیاس کر لیا جائے کہ مسز نائیڈو کی شاعری انگریزی یا مغربی شاعری کا عکس ہے اور اس میں مشرقی رنگ کی کوئی آمیزش نہیں لیکن یہ قیاس صحیح نہیں کیونکہ اُنھوں نے مغربی شعراء کے ساتھ مشرقی شعراء کے مطالعہ کو بھی جاری رکھا ہے اور فارسی اور اُردو زبان کے شعراء کا کلام نہایت شوق و ذوق سے سنتی ہیں اور اپنی باریک بیں طبیعت سے اُس پر ایسی تنقید کرتی ہیں کہ بڑے سے بڑے شعر فہم محوِ حیرت ہو جاتے ہیں۔ اساتذہ اُردو میں غالب کا کلام خاص طور پر آپ کے مطبوعِ خاطر ہے اور عہدِ حاضر کے شعراء میں اقبال کے اشعار کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہیں ان دونوں شعراء کے خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مسز نائیڈو ایشیائی شاعری کے نکات سے کس درجہ واقف ہیں۔ راقم الحروف کو علم نہیں کہ سنسکرت اور ہندی شاعری سے واقفیت بہم پہنچانے کا اُن کو کہاں تک موقع ملا ہے لیکن اُن کی اپنی شاعری کے بعض پہلو ہندی شاعری سے نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں جس کی کچھ تشریح بعد میں کی جائے گی۔ فی الحال اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ مسز نائیڈو کی شاعری مغربیت اور مشرقیت دونوں کے اثرات سے مستفید ہوئی ہے متفرق نظموں کے علاوہ مسز نائیڈو نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۷ء تک تین مستقل مجموعے پانچ پانچ برس کے وقفہ سے شائع کر چکی ہیں۔ ان تینوں مجموعوں کے انگریزی ناموں کے ترجمے علی الترتیب "شاعت" "طلائی آستانہ" "طائرِ وقت" اور "شکستہ پر" ہوسکتے ہیں، اور ایک حد تک یہ نام اُن نظموں کی نوعیت کے مظہر ہیں جو ان کتابوں میں جمع کی گئی ہیں۔ "طلائی آستانہ" میں پندرہ سے لیکر پچیس برس کی عمر تک کے کلام کا انتخاب ہے ان نظموں میں شاعرہ نے دُنیا کی دلفریبیوں کے تہِ طلائی کی دہلیز پر قدم رکھا ہے اور اُسے ہر ایک شے اُس سنہری لمعے سے چمکتی ہوئی نظر آتی ہے جو عنفوانِ شباب میں اشیاء کے تاریک رُخ کو ہماری نگاہ سے پوشیدہ کر دیتا ہے ہندوستان کے کسی قدیمی شہر اور خصوصاً حیدرآباد جیسے شہر میں بیسیوں نظارے ایسے ہوتے ہیں جو شاعر کے نازک دماغ کو پراگندہ کر سکتے ہیں لیکن ابھی تک ہماری شاعرہ کی نگاہ ان ناگوار نظاروں پر سے اُچٹتی ہوئی گزر جاتی ہے اور

اس کی نظر صرف انہی چیزوں پر جمتی ہے جو اپنی خوشنمائی سے اُس کے دل کو خوش کر سکتی ہیں" اور دل اس خوشی کا اظہار زبان سے ایسے نغموں میں کرتا ہے جو سامعہ کو ہندی ٹھمریوں سے زیادہ لذت بخشتے ہیں۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ خیالات میں پختگی آجاتی ہے اور شاعر کی نگاہ اشیاء کی ظاہری خوشنمائی سے تجاوز کر کے اُن کی باطنی حقیقت تک پہنچنے لگتی ہے اور اُس پر یہ حال منکشف ہوتا ہے کہ دُنیا صرف سُہانے رنگوں اور سُریلی آوازوں سے مرکب نہیں بلکہ اس میں بہت سے بدنما رنگ اور کرخت سُر بھی ہیں جن کا التقابل ہمیں اپنے دلفریب خواب سے چونکا کر مجبور کرتا ہے کہ ہم اس دلق ملمع کو الٹ کر دیکھیں کہ اُس کا اَستر کیسا ہے اور اس بے سُرے نغمہ کو کان لگا کر سنیں اور غور کریں کہ آیا اُس کی کوئی لے ہے؟ "طائرِ وقت" کی نظمیں زبان و تخیل دونوں کے لحاظ سے اس کا پتہ دیتی ہیں کہ ہماری شاعرہ کے کلام میں اب وہ پختگی پیدا ہو گئی ہے جو فطرت کے غائر مطالعہ سے اخذ کی جاتی ہے۔ "شکستہ پر" میں یہ صفت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے اس عرصہ میں شاعرہ کو بعض ایسے ناگزیر صدمات پیش آتے ہیں جن سے دُنیا میں کوئی بشر مامون نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ عمومیت کے اعتبار سے موت اور زیست سے زیادہ دُنیا میں کوئی واقعہ پیشِ نظر نہیں رہتا لیکن کسی عزیز یا دوست کی موت اس عام واقعہ کو ایک مکاشفہ کی صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے اور خیال کو یہ کاوش ہوتی ہے کہ اس تغیر پذیر عالم میں اپنے لئے کوئی مستقر تلاش کرے۔ یہ تلاش ہم کو حقیقت کی طرف لے جاتی ہے اور ہمیں اپنی معصومیت کے زمانے کے بہت سے خواب ترک کرنے پڑتے ہیں، لیکن یہ نقصان انجام کار ہیں نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ تخیل و عقل میں ایک قسم کا توازن قائم ہو جاتا ہے جس پر شاعری کے صحیح عروج کا مدار ہے۔ اس آخری مجموعہ کا نام ہی شاہد ہے کہ اُس کے اشعار میں اُسی درد کا اظہار ہے جسے غالب نے "شکست کی آواز" کے نام سے موسوم کیا ہے ان اشعار میں روانی و صفائی ہے مگر ایسی روانی اور صفائی جو ایک آنسو کے رخسار پر بہنے کی یاد دلاتی ہے۔ ان میں نغمہ ہے لیکن وہ نغمہ جو آہِ سرد کی طرح دل کے پار ہو جاتا ہے۔ خیالات کا ارتقاء مسز نائیڈو کی شاعری کی ظاہری شکل (یعنی جدّتِ الفاظ و ترکیب) میں بھی مناسب تغیر پیدا کرتا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ سریلا پن جس کا ذکر آچکا ہے اُن کی تمام شاعری میں قدرِ مشترک ہے لیکن جس طرح میں نے اُن کی اولین نظموں کو ٹھمری سے مشابہت دی تھی اُسی استعارہ کو قائم رکھتے ہوئے۔ یہ کہنا چاہیے کہ اُن کی آخری نظمیں خیال یا دھرپد سے مشابہ ہیں جن میں سریلا پن، رفعت اور شکوہ کے ساتھ نمودار ہو کر قلب کو مطمئن اور کانوں کو خوش کر دیتا ہے۔

ہندی راگ اور مسز نائیڈو کی شاعری کے درمیان جو تشبیہ قائم کی گئی ہے، وہ نہ صرف شاعری کی ظاہری شکل سے تعلق رکھتی ہے بلکہ اُن جذبات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو اس کی تہ میں پوشیدہ ہیں۔ اُس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ محبت اُن جذبات میں جو شاعری کے محرک بن سکتے ہیں۔ سب سے قوی جذبہ ہے اور اگرچہ اور جذبات بھی شعر کا لباس پہن سکتے ہیں لیکن یہ لباس جیسا محبت کے جسم پر راست آتا ہے، ویسا کسی اور جذبہ پر نہیں کھلتا لیکن محبت کے ایک سے زیادہ رنگ ہیں۔ اور جو رنگ وہ ہندی شاعری (جس کے ضمن میں ہندی راگ بھی شامل ہے) میں دکھاتی ہے وہ مغربی رنگ شاعری میں شاذ مثالوں کو چھوڑ کر کہیں نظر نہیں آتا۔

مسز نائیڈو کی زبان اگرچہ انگریزی ہے لیکن اُن کا دل ہندی ہے اور اس دل میں جو جذبات ہیں وہ بھی ہندی ہیں۔ ہندی شاعری میں محبت کا اظہار ہمیشہ عورت کی جانب سے ہوتا ہے اور یہ نسوانی محبت اپنی مجازی صورتوں میں بھی اُس روحانی جذبہ سے معمور نظر آتی ہے جو اور زبانوں میں صرف مذہبی شاعری میں دکھائی دیتا ہے بلکہ ہندی شاعری میں پریم یعنی محبت بھگتی یعنی پرستش دونوں ایک دوسرے سے اس قدر پیوست پائے جاتے ہیں کہ ان دونوں جذبات میں کوئی مابہ الامتیاز قائم کرنا مشکل ہے۔ مسز نائیڈو کی شاعری میں جس محبت کی جھلک نظر آتی ہے وہ وہی محبت ہے جو بھگتی کی جانب لے جاتی ہے جس میں روحانی رفعت اور مذہبی جوش دونوں موجود ہیں جو ہمیشہ اخلاق کے دائرہ میں محصور اور مذہب کے احکام کے تابع رہتی ہے جسمیں محبت کرنے والی اپنے محبوب کو ایک دیوتا اور خود کو اُس کا ادنیٰ پجاری تصور کرتی ہے جو موت کے سامنے بھی سر تسلیم خم نہیں کرتی بلکہ ستی کی چتا کے شعلوں کے ساتھ غرور سے اپنے سر کو آسمان تک بلند کرتی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جس محبت کو مسز نائیڈو کی شاعری سراہتی ہے وہ ایک معمولی ہندی عورت کی رسمی محبت ہے جو مذہب رواج ذات پات اور بیسیوں قیود سے پابند نظر آتی ہے بلکہ اُس میں وہ انفرادی قوت موجود ہے جو ضرورت کے وقت ہر قسم کی قیود اور بندشوں کو توڑ سکتی ہے۔

محبت کے علاوہ مسز نائیڈو کے اشعار میں دیگر سب اعلیٰ اور ارفع جذبات اور تحریکات سے کام لیا گیا ہے۔ حب وطن۔ شفقت مادری۔ انسانی ہمدردی غرضکہ کوئی بھی قابل قدر جذبہ ایسا نہیں جس کا ان کی کسی نہ کسی نظم میں جلوہ نہ نظر آتا ہو۔ قدرتی مناظر سے دلبستگی شاعرانہ طبیعت کا لازمی جزو ہے لیکن مسز نائیڈو نے مناظر قدرت کو اپنی شاعری کا خاص موضوع قرار نہیں دیا۔ بلکہ ہمیشہ اس کو انسانی جذبات کی تصویر کے حاشیہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ البتہ ہر طبقہ اور ہر نوع کے انسانوں کے خیالات کی ترجمانی کرنے میں اُنہیں خاص ملکہ ہے اور اُن کی نظموں میں موذن کی اذان اور پجاری کے بھجن سے لیکر پنہاریوں کے گیت پالکی بردار کہاروں کے گانے اور فقیر کی صدا تک سب قسم کے نغمے موجود ہیں۔ اشیاء کے رنگین اور نمایاں پہلو دیکھنے کا ان کی آنکھ کو خاص ملکہ ہے اور بسا اوقات وہ چند فقروں یا چند لفظوں میں کسی واقعہ یا نظارہ کی پوری تصویر ہماری نگاہ کے سامنے کھینچ دیتی ہیں۔

ہندوستان کی عورتوں کے متعلق کبھی طنز اور کبھی حسرت کے لہجہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ اُن کی زندگی صرف تین اہم واقعات پر مشتمل ہوتی ہے یعنی پیدا ہوئیں، بیاہ ہوا اور مرگئیں۔ کیا یہ بات بجائے خود تعجب خیز نہیں کہ ایسے درماندہ طبقہ میں سروجنی نائیڈو جیسی مجموعہ کمالات خاتون کیسے پیدا ہوگئی؟ اس کو ہم معجزہ خیال کریں یا فطری اسباب کا نتیجہ۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ واقعہ صرف تعجب خیز ہی نہیں بلکہ اُمید افزا بھی ہے کہ اگر ہندوستانی عورتوں کو موافق حالات میسر آئیں تو وہ کیا کچھ کر سکتی ہیں۔ یہ ضرور نہیں کہ ہر ایک خاتون مسز سروجنی نائیڈو کے مانند خوشگو شاعر یا خوش بیان مقرر یا سیاسی مدبر بننے کی سعی لاحاصل کرے۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن کی رفیع الشان مثال سے سبق لیکر وہ کارکن اور فرض شناس انسان ہوجائیں اور یہ مثال ہمارے مردوں کے لئے بھی ایسی سبق آموز ہے جیسی کہ ہماری عورتوں کے لئے۔"

اب ہم آخر میں مسز نائیڈو کی شاعری کے چند منظوم و منثور ترجمے پیش کرتے ہیں ناظرین خود ان کے مطالعہ سے اندازہ کرلیں گے کہ مسز نائیڈو کی شاعری کس قدر پُر درد اور کیف آفریں و دل نواز ہے بعض ترجموں کے ساتھ ان کی نظمیں اصل زبان میں بھی شائع کی جاتی ہیں، تاکہ جو اجزاء اور حقیقی کیف ترجمہ سے باقی رہ گیا ہے وہ بھی پیش نظر ہو جائے۔ سب سے پہلے ہم وہ معرکتہ الآرا قصیدہ نقل کرتے ہیں جو اعلےٰ حضرت نظامِ دکن خلد اللہ ملکہٗ کی شان میں مسز نائیڈو نے فرمایا ہے۔

شاہِ دکن کے حضور میں

سروجنی نائیڈو کی عقیدت کے پھول

بادشاہِ ذی وقار!

چند اشعار کا یہ ہدیۂ ناچیز گزارنے کیلئے حاضر ہوئی ہوں۔ دستِ کرم دراز کرکے انہیں شرفِ قبول اور مجھے وجۂ افتخار بخشئے۔

اے وہ کہ جس کے مرصع عطائے شاہی میں ایک شاعر کے گلہائے شہرت آویزاں ہیں! ——— ہاں وہ عصائے پُروقار جس کے زیر حکم سلطنت کے جملہ مذاہب و اقوام ہم آہنگی و یکجہتی کے ساتھ دوش بدوش رہتے ہیں۔

ش رہتے ہیں۔

خواہ وہ پیغمبر اسلام کے پیروانِ پرجوش ہوں ——— جن کے تم سرتاج و حاکم ہو۔

یا وہ جن کی منور پیشانیوں پر ویدوں کے مقدس منتروں کے نقوش ہُویدا ہیں!

اور ہاں وہ بھی جو خلیج فارس کو عبور کرکے برسوں گزرے یہاں آئے تھے اور تمہارے سایۂ عاطفت میں پناہ گزیں ہوئے تھے ——— وہ جو آفتاب کو معبود سمجھتے ہیں+

ـــــ آہ! وہ بھی جو اس یسوع ناصری کی پرستش کرتے ہیں جس نے جھیل "گلیلی" کی امواجِ نیم شبی کو اپنے مبارک قدموں سے عبور کیا تھا!

تیرے دربار کی شوکت وصولت دیکھکر بغداد کے پُر وقار درباروں اور خلفائے عباسیہ کی شان وشوکت کی داستانیں یاد آنے لگتی ہیں۔

آہ! صرف ایک جشن پر "الف لیلہ" کی ہزاروں شمعیں روشن کردی جاتی ہیں اور "ساقی" نغمہ سنج گلی کوچوں میں گاتا پھرتا ہے ـــــ اور تیری غزلوں کے پیمانوں سے شرابِ تصوف کے کیف پرور جرعے بھر بھر کر میکشانِ ادب کو پلاتا رہتا ہے!

پادشاہِ ذی وقار!

تیرا بارونق شہر اپنی جلو میں سرور ونشاط کی محفلیں لئے ہوئے ہے لیکن اس کے گرد سنجیدہ روکوہستانی سلسلہ ایک عالمِ سکوت میں کھڑا اس کی پاسبانی کررہا ہے تیری سلطنت کے دشت وبیاباں میں صدیوں کی تاریخ کے منتشر اوراق بکھرے پڑے ہیں آہ! وہ مخزنِ تاریخ ہے۔ مدفنِ تاریخ ہے!

کھنڈروں۔ غیر آباد قلعوں اور مسمار شدہ عمارتوں پر مُرغانِ امن اپنے سفید پروں کو لئے ہوئے اُڑتے رہتے ہیں ـــــ ہاں ان خاموش وسوگوار کھنڈروں میں تمہارے باوفا خدام جابجا متعین ہیں ـــــ ہاں وہ ماضی کے پاسباں جو آجتک سلطنت کے خزانہائے زر وجواہر اور فصلوں کے سُنہری انباروں کی نگرانی میں دن رات لگے رہتے ہیں!

خدائے برتر تجھے مسرت بے پایاں عنایت کرے ـــــ تیرے بازو میں قوت دے کہ وہ سچ کی حمایت اور بدی کی مخالفت میں ہمیشہ شمشیر بے نیام لئے مستعد رہیں ـــــ خدا کرے تو محاسن ومکارم اور شجاعت وقدرشناسی کے اوصافِ حمیدہ کی عزت افزائی کے لئے ہمیشہ زندہ رہے۔

ایمان کی سلامتی اور شعریت کی بقا کے لئے ہر وقت کوشاں رہو!!

خدا کرے کہ تیرے بارونق عہد کی جلوہ پاشیاں "نغماتِ اعمال" کو منور کردیں جو کبھی فردوسی نے گائے تھے! ـــــ قومی دعا میں تیرا نام روشن ہوا ـــــ پرچم ملی پر بھی تیرا ہی نشان جلوہ فگن ہو! ـــــ ہر فردِ سلطنت کی زبان پر تیرے ہی گیت ہوں!!!

عندلیبِ شکستہ پر

شبِ طویلِ غم گئی ــ مسرتوں کی لَو ہوئی
اُفق چمک اُٹھی ہے اب ــ نمودِ صبحِ نو ہوئی
رگوں میں خون پھر گیا ــ حیات گرم رو ہوئی۔ نمودِ صبحِ نو ہوئی
نمودِ صبحِ نو ہوئی ــ اُمید جلوہ گر ہوئی
مسرتوں کے گل کھلے ــ نسیم باثمر ہوئی
بہار آگئی ہے پھر ــ خوشی پیام بر ہوئی۔ امید جلوہ گر ہوئی
اُمید جلوہ گر ہوئی ــ نئی زمین نیا وطن
مگر شکستہ پر ہے تو ــ اے عندلیبِ نغمہ زن
اے عندلیبِ نغمہ زن ــ عروس بن گیا چمن۔ مگر شکستہ پر ہے تو

THE BROKEN WING.

QUESTION

The great dawn breaks, the mournful night is past
From her deep age-long sleep she wakes at last!
Sweet and long slumbering buds of gladness ope
Fresh lips to the returning winds of hope
Our eager hearts renew their radiant flight
Towards the glory of renascent light
Life and our land await their destined spring
Song bird why dost thou bear a broken wing?

ANSWER.

Shall spring that wakes mine ancient land again
Call to my wild and suffering heart in vain?
Or Fate's blind arrows still the pulsing note
Of my far-reaching, frail, unconquered throat?
Or a weak bleeding pinion daunt or tire
My flight to the high realms of my desire?
Behold! I rise to meet the destined spring
And scale the stars upon my broken wing!

ECSTASY.

Heart, O my heart! lo, the springtime is waking
In meadow and grove.
Lo, the mellifluous **Koels** are making
Their paeans of love.
Behold the bright rivers and rills in their glancing
Melodious flight,
Behold how the sumptuous peacocks are dancing
In rhythmic delight.

جواب

وہ روز و شب بدل گئے
خزاں کے دن نکل گئے
خوشی کا دور آگیا
زمانہ اور آگیا
تو پھر میں بے بصر ہوں کیا　شکستہ اس قدر ہوں کیا!
کہ نغمہ زن نہ ہو سکوں　کہ جان و دل نہ کھو سکوں
خوشی سے خون نہ رو سکوں
جگر میں پھانس ہے تو کیا　بہار جلوہ گر- تو ہے!
میں نامرادِ غم سہی　امید بارور تو ہے!
شکستہ ہے تو کیا ہوا　اُڑیگا یہ کہ پر تو ہے!
یہی شکستہ پر مرا سوئے بہار لے چلا
لو دیکھنا یہی مجھے فلک کے پار لے چلا

کیفِ بہار

بہار اے دل! آگئی چمن میں سبزہ زار میں
یہ کوئلوں کی بولیاں!
یہ زمزموں کی مستیاں!
یہ عشق کی کہانیاں، چڑھاؤ اور اُتار میں　بہار اے دل! آگئی چمن میں سبزہ زار میں
کنار جو کی مستیاں میں کس طرح کروں بیاں؟
وہ مور ناچنے لگے!
وہ مستِ نغمہ ہوگئے!
یہ نہر کی روانیاں، روانیوں میں شوخیاں　کنار جو کی مستیاں میں کس طرح کروں بیاں؟
پھر اے دلِ حزیں! نہ کیوں غم اپنا ہم بھی بھول جائیں
جہاں تمام مست ہے

Shall we in the midst of life's exquisite chorus
Remember our grief,
O heart, when the rapturous season is o'er us
Of blossom and leaf?
Then joy from the birds and the streams let us borrow
O heart! let us sing
The years are before us for weeping and sorrow
To day it is spring!

LEILI.

The serpents are asleep among the poppies
The fireflies light the soundless panther's way
To tangled paths where shy gazelles are straying
And parrot plumes outshine the dying day
O soft! the lotus buds upon the stream
Are stirring like sweet maidens when they dream

A caste mark on the azure brows of Heaven
The golden moon burns sacred, solemn, bright
The winds are dancing in the forest temple
And swooning at the holy feet of Night
Hush! in the silence mystic voices sing
And make the gods their incense offering

GOLDEN CASSIA

O Brilliant blossoms that strew my way
You are only woodland flowers they say
But I sometimes think that perchance you are
Fragments of some new fallen star
Or golden lamps for a fairy shrine
Or golden pitchers for fairy wine

پئے ہوئے خوشی کی مے

پھر اب بھی کیوں ہمیں یہ غم یہ رنج یہ ستم اٹھائیں — اب آ کہ اے دلِ حزیں! غم اپنا ہم بھی بھول جائیں

یہ زمزمہ طیور کا یہ نغمے جوئبار کے
میں اور مستعار لائیں!
اٹھ، اور آج ہم بھی گائیں!

کہ عمر ابھی پڑی ہے غم کی یاد کے لئے — ذرا سنبھل، دلِ حزیں! کہ ہیں یہ دن بہار کے

حامد

کنول

خفتہ جہاں ہیں مار سرِ شاخ کو کنار — آہستہ رو پلنگ کے رستہ میں بار بار
ہیں شعلہ بار کرمکِ شب تاب اس قدر — روشن ہیں دور دور کی راہیں وہ پیچدار
بھٹکے ہوئے جہاں ہیں وحوشِ رمیدہ خو — اور ہیں سبک خرام غزالانِ شرمسار
دن ڈوبتا ہے گو، پہ عیاں ہے چمک فزیں — ہیں تابناک طوطیوں کی کلغیاں ہزار

سنا ذرا!! کنول ہیں یہ بالائے سطحِ آب
جنبش میں جیسے ہو کوئی طنّاز محوِ خواب

قشقہ لگائے ماتھے پہ ہے چرخِ نیلوفر! — یعنی یہ شان و شوکت و تمکین و کرّ و فر
جلوہ فگن اُدھر مہِ زرّیں نقاب ہے — اور خوفناک معبدِ صحرائی ہیں اِدھر
رقصاں جو بادِ تند بھی اب ہو کے نیم جان — غش کھائے "شب" کے قدموں پہ پٹکتی ہے سر

پُر رمز، کچھ سکوت میں آوازیں گاتی ہیں
خاموش!! دیوتاؤں پہ نذریں چڑھاتی ہیں

احسن

املتاس کا پھول

اے املتاس تجھے کیوں گلِ صحرا کہئے — صورتِ سبزہ ہے پامال مگر کیا کہئے
کوئی ٹوٹا ہوا تارا ہے تو افتادۂ خاک — یا تجھے طالعِ خوابیدہ ہمارا کہئے
جامِ زرّیں مئے ہوش رُبا ہے گویا — یا تجھے شمع تہِ دامنِ صحرا کہئے
ساقِ سیمینِ پری کی ہے سنہری پازیب — موسمِ گل کا تجھے نقشِ کفِ پا کہئے

Perchance you are, O frail and sweet!
Bright anklet-bells from the wild spring's feet,
Or the gleaming tears some fair bride shed
Remembering her lost maidenhead.
But now, in the memoried dusk you seem
The glimmering ghosts of a by gone dream.

SUTTEE.

Lamp of my life, the lips of Death
Hath blown thee out with their sudden breath:
Naught shall revive thy vanished spark
Love, must I dwell in the living dark?

Tree of my life, Death's cruel foot
Hath crushed thee down to thy hidden root.
Nought shall restore thy glory fled
Shall the blossom live when the tree is dead?

Life of my life, Death's bitter sword
Hath severed us like a broken word,
Rent us in twain who are but one
Shall the flesh survive when the soul is gone?

THE HUSSAIN SAAGAR.

The youngdawn woos thee with his amorousgrace,
The journeying clouds of sunset pause and hover,
Drinking the beauty of thy luminous face,
But none thine inmost glory may discover,
For thine evasive silver doth enclose
What secret purple and what subtle rose
Responsive only to the wind, thy lover.
Only for him thy shining waves unfold
Translucent music answering his control;
Thou dost, like me, to one allegiance hold,
O lake, O living image of my soul.

سر بزانو ہے دلہن محوِ خیالِ طفلی
ڈبڈبائے ہوئے اشک ستم آرا کہیئے
شامِ غربت میں کوئی خوابِ پریشاں ہے تو
یا تجھے غولِ فریبندہ صحرا کہیئے

رونمائے پرِطاؤس ہے تیرا جلوہ
دیدۂ آہوئے رم دیدہ کا نقشا کہیئے
زردشکلِ رخ مجنوں ہے بیاباں میں تو
گرد آلودہ حسنِ طرۂ لیلا کہیئے
مثلِ داغِ جگرِ عاشق محزوں ہی تو
تجھ کو مغزِ سرِ آمادۂ سودا کہیئے

ستی

اے شمع زندگانی! آخر لبِ اجل نے
یکبار جل بجھی تو اِطرح تجھ کو پھونکا
ممکن نہیں کہ روشن پھر ہو شرار تیرا
اس تیرہ خاکداں میں کیونکر گزر ہو میرا
اے نخلِ زندگانی! پائے قضا نے تجھکو
افسوس بیخ و بن سے پامال کرکے چھوڑا
ممکن نہیں کہ پھر تو سرسبز و باردر ہو
جو نخل سوکھ جائے دشوار ہے کہ تر ہو
اے وجہ زندگانی! تلخیٔ مرگ نے یوں
ہم کو کیا دوپارہ جوں لفظ ہوں شکستہ
فی الاصل ایک تھے ہم جب ہو چکی جدائی
بیجان ہو کے قالب باقی نہیں رہیگا

شباب

تالاب حسین ساگر

بہار وقتِ سحر تیری سادگی پہ نثار
غضب کا روپ ہے تجھ پر بلا کا تیرا نکھار
فدائے ناز و ادا مہرِ عالم آرا ہے
فلک پہ ابرِ بہاری کا بھی تو پیارا ہے
گھٹائیں چرخ پہ کیا جھوم جھوم آتی ہیں
ترے جمال سے سیراب ہو کے جاتی ہیں
جھلک ہے صرف ترے یہ نقاب سیمیں کی
خبر کسے ہے ترے جلوہ ہائے رنگیں کی
کھلا ہوا گل و ریحاں کا ایک گلشن ہے
بھرا ہوا دُرِ مرجاں سے تیرا دامن ہے
غرض تجھے تو ہے بادِ نسیم سے اُلفت
اُسی کے واسطے سب وقف ہے تری دولت
طریقِ بندگیٔ عشق تجھ کو زیبا ہے
چلن وفا کا مرے دل نے تجھ سے سیکھا ہے
ستم نسیم کے گو بار بار سہتا ہے
اُسی کے نشۂ الفت میں چور رہتا ہے
ہوائے تازہ کا ہر دم تو ایسا مفتوں ہے
ہر ایک لہر میں آوازِ نَے کا افسوں ہے

اشاروں پر جو ہوا کے ہمیشہ چلتا ہے — سرودِ عشق ہر اک موج سے نکلتا ہے
زباں پہ دیکھ کے تجکو یہ مصرعہ تر ہے
حیاتِ تازہ کی صورت حسین ساگر ہے

تقدیر

نصیر

نارسائی سے تری بختِ سیہ کیا ہوگا — مجھکو تجھ سے نہ کبھی شکوۂ بیجا ہوگا
میں نہ ہونگا کبھی امداد کا خواہاں تجھ سے — تیرا اے بخت نہ احسان گوارا ہوگا
بن گیا ہے تو مری جان کا دشمن لیکن — سر جدا ہو، نہ جدا سر سے یہ سودا ہوگا

ٹوٹ بھی جائیں اگر میری امیدوں کے طلسم — کم نہ ہرگز یہ مرا ذوق تماشا ہوگا
مٹ گئے پیشِ نظر تھے جو مرقعے دلکش — تیرے بس میں نہ مگر دیدۂ بینا ہوگا
مل گئی خاک میں گو سلطنتِ وہم و خیال — اس خرابے میں گراں مایہ خزانا ہوگا

کر دے بیگانہ مجھے نغمۂ شادی سے مگر — یادِ ایّام کا دلچسپ فسانا ہوگا
زمزمے آکے سُنائے گی نسیمِ اشراق — طبعِ مواج میں اک شور سا پیدا ہوگا
راگ موجوں کا سنونگا صفتِ تارِ رباب — پیچ میں حلقۂ گرداب ترانا ہوگا

لاکھ تو لذتِ گفتار سے کردے محروم — لب پہ لیکن نہ کبھی حرفِ تمنا ہوگا
گنگ ہو جائے اگر میری زبانِ گویا — دل نالاں صفتِ بُلبلِ شیدا ہوگا
باغ میں نغمہ پُر شور عنادل ہوں ہزار — نالۂ دل کا مگر رنگ نرالا ہوگا

گو تپِ غم سے نہ ہو طاقتِ رفتار مجھے — فکرِ رنگیں سے زمانہ تہ و بالا ہوگا
بڑھکے ہے بادِ صبا سے یہ مرا توسنِ فکر — گرم جولاں روشِ آہوئے صحرا ہوگا
آسماں رس فرسِ فکرِ رسا ہے میرا — خاک سے اُڑکے رواں تا بہ ثریا ہوگا

A CHALLENGE TO FATE.

Why will you vex me with your futile conflict,
Why will you strive with me, O Foolish Fate?
You cannot break me with your poignant envy,
You cannot slay me with your subtle hate:
For all the cruel folly you pursue
I will not cry with suppliant hands to you.

You may perchance wreck in your bitter malice
The radiant empire of mine eager eyes
Say, can you rob my memory's dear dominion
O'er sunlit mountains and sidereal skies?
In my enduring treasuries I hold
Their ageless splendour of unravished gold

You may usurp the kingdoms of mp hearing
Say, shall my scatheless spirit cease to hear
The bridle rapture of the blowing valleys,
The lyric pageant of the passing year,
The sounding odes and surging harmonies
Of battling tempests and unconquared seas?

Yea, you may smite my month to thorbbing silence
Pluck from my lips power of articulate words
Say, shall my heart lackits familiar language
While earth has nests for her melifluous birds?
Shall my impassioned heart forget to sing
With the ten thousand voices of the spring?

Yea, you may quell my blood with sudden anguish,
Fetter my limbs with some compelling pain
How will you daunt my free, tor-journeying fancy
That rides upon the pinions of the rain?
How will you tether my triumphant mind,
Rival and fearless comrade of the wind?

آرزوئے دلِ ناکام ہے خود مثلِ حباب
ٹوٹ کر قطرہ مگر شاملِ دریا ہوگا

نقش برآب ہے ساری ہوسِ نام و نمود
فکر کیا میرا مخالف جو ستارا ہوگا

قطرۂ غم کو ڈبو دوں میں نہ لطفِ عظیم
نذرِ تسلیم ہمیشہ دلِ دانا ہوگا

گنہگار محبت

سغیر

اے مہِ حسن و جمال اے بتِ خورشید عذار
سیکڑوں آہوئے صحرا تری آنکھوں پہ نثار

جس طرح طائر بے خوف اڑا کرتے ہیں
اڑکے کر لیتے ہیں افلاک معلّیٰ کا حصار

کی ہو میں نے نگہ چشم محبت تم پر
دردِ دل کا اگر اشکوں نے کیا ہو اظہار

جز نظر تارِ رفوئے دلِ صد چاک نہ تھا
شوقِ دیدار نے آنکھوں کو کیا تھا لاچار

میں نے مانا کہ گنہگارِ نظر بازی ہوں
کیا کروں اس کو کہ مجبور تھے یہ دیدۂ زار

بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں اِن کو
کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار

دستِ حسرت نے اگر کی ہو کوئی گستاخی
ہو کے بیتاب بنے ہوں جو گلے کا ترے ہار

بادۂ شوقِ محبت میں اگر ہو کر مست
ہو گئے ہوں یہ کبھی مائلِ آغوش و کنار

لپٹنے آغوشِ محبت میں تمہیں لے لیکر
ہو کے بیتاب نکالے ہوں گر ارمان دو چار

صورتِ زلف یہ پہنچے ہوں اگر تا بہ کمر
ہو کے قربان چھوئے ہوں جو تمہارے رخسار

نذر کرنے کے لئے لائے ہوں تحفے یہ اگر
ریگ کی طرح کہ ممکن ہی نہیں جن کا شمار

بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں اِن کو
کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار

لبِ عشاق نے کھینچی ہو اگر آہ کوئی
ہو کے سرگرمِ فغاں دل کا نکالا ہو بخار

ہو کے مجبور اگر عرضِ تمنا کی ہو
لبِ نازک سے جو بوسوں کا لیا ہو اقرار

ضبطِ الفت سے جو فرقت میں رہے ہو خاموش
رخِ زیبا کی ثنا میں جو پڑھے ہوں اشعار

الغرض جوشِ محبت میں اگر مست ہو کر
لے لئے ہوں لبِ نازک کے جو بوسے دو چار

ہو کے بیدرد نکالی ہو تمنا دل کی
لب جاں بخش کو پہنچا ہو اگر کچھ آزار

بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں اِن کو

THE SINS OF LOVE.

Forgive me the sine of mine eyes,
O Love, if they dared for a space
Invade the dear shrine of your face
With eager, insistent delight,
Like wild birds interpid of flight
That raid the high sanctuaried skies
O pardon the sin of mine eyes!

Forgive me the sin of my hands·········
Perchance they were bold overmuch
In their tremulous longing to touch
Your beautiful flesh, to caress,
To clasp you, O Love, and to bless
With gifts as uncounted as sands
O pardon the sin of my hands!

Forgive me the sin of my mouth,
O Love, if it wrought you a wrong,
With importunate silence or song
Assailed you, encircled, oppress'd,
And ravished your lips and your breast
To comfort its anguish of drouth
O pardon the sin of my mouth!

Forgive me the sin of my heart,
If it trespassed against you and strove
To lure or to conquer your love
Its passionate love to appease
To solace its hunger and ease
The wound of its sorrow or smart
O pardon the sin of my heart!

کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار

قصۂ درد و الم تم کو سنایا ہو اگر — آہیں بھر بھر کے نکالا ہو اگر دل کا غبار
ہو گئے پامال جفا ہجر میں تڑپا ہو اگر — بیقراری میں رہا ہو نہ اگر صبر و قرار
نام اغیار کا لے لے کے شکایت کی ہو — نالہ بن بن کے سنائی ہو اگر حالت زار
داغہائے دل پر درد کی تسکین کیلئے — بن کے مظلوم ہوا ہو جو ترا شکوہ گزار
ہو کے مجبور تقاضائے محبت سے اگر — حسرت و یاس و تمنا کا کیا ہو اظہار

بخشدو تم جو سمجھتے ہو خطائیں ان کو
کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار
وفا

سروجنی دیوی کی ملکی و قومی خدمات

یہ خیال غلط اور غیر مدبرانہ ہے کہ حقیقی شاعری قومی و ملکی خدمات میں شامل نہیں ہے مسز نائیڈو سب سے پہلے شاعر ہیں اور انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندوستان کی عظمت و بزرگی کا سکہ سارے جہان کے دلوں پر بٹھایا ہے آج دنیا کے ہر مہذب ملک میں مسز نائیڈو کی مستقل عزت و شہرت ہندوستان کے لئے طرۂ امتیاز کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن ان کی ادبی خدمات کے علاوہ ان کی سیاسی خدمات بھی کسی طرح کم نہیں ہیں۔ جنگ عظیم کے زمانے ہی سے سروجنی دیوی نے ملکی سیاسیات میں آزادانہ شرکت کر لی تھی اور ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کانگریس میں حکومت خود اختیاری کی تائید نہایت پر جوش اور زور دار الفاظ میں کی اسکے بعد تمام ملک میں دورہ کرکے اپنے کمال منطق سے محفل سیاست کو گرما دیا، ۱۹۱۷ء میں افریقی ہندوستانیوں کے متعلق الہ آباد میں جو تقریر سروجنی دیوی نے کی وہ بے حد متاثر کن تھی ۱۹۱۷ء کے آخر میں کلکتہ کانگریس میں بھی سروجنی دیوی نے حکومت خود مختاری کے رزولیوشن کی تائید کی ۱۹۱۸ء میں کانجیورم میں صوبہ کانفرنس کے صدارت کے فرائض آپ نے انجام دیئے۔ ستمبر ۱۹۱۸ء میں بمبئی کی اسپیشل کانگریس میں عورتوں کی رائے دہی کے حقوق کا رزولیوشن دوبارہ پیش کیا۔ اور دسمبر ۱۹۱۸ء میں آل انڈیا سوشل سروس کانفرنس کی صدارت کے فرائض آپ نے انجام دیئے۔

تحریک ترک موالات کے شروع ہوتے ہی مسز نائیڈو کی سیاسی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں، اور آپ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں ہمہ تن محو ہو گئیں۔

۱۹۲۲ء میں لکھنؤ کانفرنس میں آپ نے اردو میں تقریر فرمائی ۱۹۲۴ء میں آپ جنوبی افریقہ تشریف لے گئیں اور کامل دورے کے بعد ہندوستانیوں کی حالت کا اندازہ کیا آپ نے کونکناڈا کانگریس کی صدارت بھی فرمائی۔

جب امریکہ کی بدشہرت خاتون مس میو نے اپنی کتاب مدر انڈیا شائع کی جس میں ہندوستان کے اخلاق تہذیب سیاست، تمدن اور مذہب کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو ہندوستانیوں نے آپ کو اپنا سفیر بنا کر امریکہ بھیجا تاکہ آپ اس بے بنیاد اور لغو پروپیگنڈہ کی تخلیف کریں۔

۱۹۳۰ء میں تحریک نمک کے سلسلے میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد آپ بھی گرفتار ہو گئیں اور "بغاوت چمن" کے سلسلے میں اس عندلیب نغمہ پیرا نے چھ ماہ "زندان وقفس" کے مصائب برداشت کئے۔ رہائی کے بعد پھر بلبل ہند نے اپنی ذات کو قوم کی راہ میں ستیہ آگرہ کے لئے پیش کیا۔ گاندھی ارون پیکٹ کے وقت مہاتما گاندھی کے ساتھ شریک مشورہ رہیں۔

۲۹ اگست کو دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے سلسلے میں مہاتما جی کے ہمراہ انگلستان گئیں جہاں آپ کا شاندار استقبال کیا گیا۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپسی کے بعد آپ بھی دوبارہ زعمائے قوم کے ساتھ گرفتار ہو گئیں مگر زندان میں بھی بخوشی و عافیت زندگی گزاری — یہ بلبل جہاں تھی وہیں گلستاں تھا۔ ۱۹۳۳ء میں جیل سے آپ بھی رہا کر دی گئیں۔ مہاتما گاندھی کے تاریخی برت کے موقع پر آپ نے تیمارداری کرکے اخلاص انسانیت اور ہمدردی کا ثبوت دیا۔ گاندھی جی حیدرآباد میں آپ کے دولتکدہ کے علاوہ کہیں قیام نہیں فرماتے اخلاقی طور پر سروجنی قومی غیرت سیاسی استقلال و ایمان حب الوطنی، ہندو مسلم اتحاد، نیک نیتی، اخلاص، محبت، شرافت، بلندی، اور انسانیت کبریٰ کی بہت عظیم مظہر ہیں۔ اور یہ کی نظیر ہندوستان کی کسی قوم نے آج تک پیش نہیں کی۔ قومی و سیاسی طور پر سروجنی کی بڑائی اور اہلیت کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ وہ قومی پارلیمنٹ (آل انڈیا نیشنل کانگریس ورکنگ کمیٹی) کی رکن ہیں۔

تاریخِ علم ہیئت و تنجیم پر ایک نظر

پہلی قسط

تاریخ کی ورق گردانی اور سفر ناموں کے مشاہدہ سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اہل چین علم ہیئت سے ۲۸۵۷ سال قبل مسیح واقف ہو چکے تھے، فوہی (Fo-Hi) جس کا عہد حکومت ۲۸۵۷ قبل مسیح ہے، ماہرین فلکیات کا قدرشناس تھا، اس نے علم ہیئت کی ترقی و احیا میں کافی دلچسپی سے کام لیا، اس زمانہ میں ہیئت کے ابتدائی اصولوں سے کام لیا جاتا تھا، دوسرے فرمانروا ہونگ ٹی (Hong-ti) نے جس کا زمانہ ۲۶۰۸ قبل مسیح ہے، ایک رصد گاہ چین میں بنوائی، اہل چین اہل یونان سے ۲۰۰۰ سال قبل علم ہیئت سے واقف ہو چکے تھے[1]

ہندوستان میں علم ہیئت و تنجیم کی قدامت کا پتہ زمانۂ وید سے چلتا ہے، اور یہ وید کا ایک جز سمجھا جاتا تھا، تمام جوتش شاستر میں شمس و قمر کی رفتار کا بیان موجود ہے۔ اتھروید جوتش کا زمانہ جیسا کہ مسٹر ڈیکسٹ اور اس کے دیگر ہمنوا و معاصرین بیان کرتے ہیں ۹۰۰ سے ۱۵۰۰ سال قبل مسیح ہے اس میں کوئی بیان بروج کے متعلق نہیں کیا گیا ہے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اہل ہند بروج سے ناواقف تھے، یہ سچ ہے کہ اُس وقت تک دوازدہ بروج کی تقسیم سے اہل ہند ناآشنا تھے، لیکن منازل قمر اور اُس کے اثرات سے ضرور واقف تھے

پانچویں و چھٹی صدی میں آریہ بھٹ۔ ورہ مہر۔ برہم گپت۔ بھاسکر آچاریہ وغیرہ مشہور ہیئت داں گزرے ہیں۔ ان کی تصانیف چھٹی صدی بعد مسیح کی ہیں، ورہ مہر کی تصانیف کے علاوہ کسی اور مصنف کی لکھی ہوئی کتاب میں علم تنجیم پر بحث نہیں ملتی، ورہ مہر ہی ایک ایسا مصنف ہے جس نے جا بجا اپنی تصانیف میں علم نجوم پر بحث کی ہے

وید سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اہل ہند ہزارہا سال قبل مسیح نیرین کی رفتار سے واقف تھے اور اس کا علم ہونا ان کے لئے یوں ضروری ہوگیا کہ سالانہ قربانیوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے نظام اوقات کی تعین میں مدد ملتی تھی، اسی باعث وہ نیرین کی رفتار کو بغور ملاحظہ کرتے رہے، صرف نیرین تک اُن کی نگاہیں محدود نہ تھیں بلکہ مریخ مشتری و زحل وغیرہ کی رفتار سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔

علم تنجیم ورہ مہر کے زمانہ سے اپنے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اوج ترقی پر پہنچ گیا ورہ مہر ہندوستانی ہیئت والوں کے دور آخر میں سب سے نامور مصنف گزرا ہے، اور وہ اکثر اپنی تصانیف میں پچھلے مصنفین کے حوالے دیتا ہے مثلاً گرگ وغیرہ جو بہت قدیم علم نجوم و ہیئت کے ماہر گزرے ہیں۔

سکندر اعظم نے چوتھی صدی قبل مسیح جب ہندوستان فتح کیا تھا وہ تاریخ یونان میں علم و تمدن کا بہتر زمانہ سمجھا جاتا تھا، یونان کے ماہرین علوم سالہا سال تک ہندوستان میں رہے اور زبان کی اجنبیت و بیگانگی نے دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے علوم و فنون سے کچھ عرصہ تک متمتع ہونے سے محروم رکھا، چھٹی صدی بعد مسیح ورہ مہر کے زمانہ میں جب زبان کی اجنبیت دور ہونے لگی اور ایک نے دوسرے کے علم و فن سے استفادہ حاصل کیا، تو یونانی مصطلحات علمیہ ہندوستانی زبان میں اور ہندوستان کے یونانی زبان میں استعمال ہونے لگیں، ورہ مہر و نیز دیگر ہندوستانی مصنفین ہیئت کی تصانیف سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ انہوں نے بہت سے یونانی مصطلحات علم ہیئت و نجوم اپنی تصانیف میں بلا کسی تعصب استعمال کئے ہیں۔

مسٹر ویبر نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بارہ بروج کی تقسیم اور منازل قمر کے اشکال اہل ہند نے یونانیوں سے لئے ہیں، ورہ مہر اپنی تصنیف برہتن مالا میں بارہ بروج کی تقسیم "یاونا" (yavana) (ممکن ہے "اعوان" کی بگڑی ہوئی شکل ہو) ایک ملیچھ[2] مسلمان کے حوالہ سے بتاتا ہے، حالانکہ اس زمانہ میں کسی مسلمان کا ہندوستان آنا ثابت نہیں، اور چھٹی صدی بعد مسیح اسلام کا آغاز ہوتا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مسلمان کون تھا۔

مسٹر ویبر[3] نے یونانی و ہندوستانی بروج کے نام جو ملتے جلتے ہیں اُن کی ایک فہرست مرتب کی ہے اس میں سے چند بطور مثال یہاں بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

---

[1] دیکھو ہسٹری آوف اسٹرونومیکل کالفرنیس۔ کیلاڈی صفحہ ۱۵۵ - [2] دیکھو برہت جاتکا انگلش ایڈیشن از سوروج نرائن بی اے ایڈیٹر اسٹرونجیکل میگزین۔ [3] دیکھو رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی مطبوعہ ۱۸۹۳ء الرجے بزمین

یونانی نام بروج	عربی نام	ہندوستانی نام بروج
کری اوس (Krios)	حمل	کریا (Kirya)
لیون (Leon)	اسد	لیا (Leya)
پارتھی نوس (Parthenos)	سنبلہ	پارٹینا (Partina)

مسٹر ویش لکھتے ہیں کہ یہی مصطلحات ورہ مہر کی تصانیف علم ہیئت و نجوم میں بھی استعمال کئے گئے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ یونانیوں سے لئے گئے ہیں، یہی الفاظ یونانیوں کے ہاں بھی چوتھی صدی میں مستعمل تھے اور ہندوستان میں چوتھی یا پانچویں صدی بعد مسیح ان الفاظ و مصطلحات کا رواج ہوا اور اسی زمانے سے سیارگان کی رفتار کے بابت تاریخی ثبوت ملتا ہے، اور یہ کہ کتنے عرصہ کے بعد اہل ہند نے زائچہ بنانا شروع کیا۔ اس کے بارہ میں کوئی صحیح تاریخی ثبوت کا پتہ نہیں چلتا، ایک دکھنی شاعر اپنی ایک نظم میں جو تامل (Tamil) زبان میں ہے بیان کرتا ہے کہ مدورا کے نزدیک "دیلیے ویگی" میں طغیانی آئی اور صبح آفتاب کے طلوع سے قبل خسوف واقع ہوا، اس وقت مریخ برج حمل میں، عطارد جوزا میں، اور زحل برج قوس و جدی کے مابین تھا، ریاضیات فلکیات سے یہ زمانہ ۴۶۳ بعد مسیح یوم جمعہ علی الصباح واقع ہوتا ہے، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دکھن میں اہل ہنود ۱۵۰ سال قبل مسیح زائچہ بنانا جانتے تھے نہ کہ یونانیوں سے زائچہ بنانا سیکھا یہ صحیح مگر یہ ایک شاعرانہ تخیل سے زائد وقعت نہیں رکھتا، کوئی تاریخی ثبوت نہیں، ویدانگ جوتش کی رو سے یہ بات مشہور ہے اور یہ بہت ہی قدیم زمانہ ہے جبکہ اہل ہند سیارگان کی رفتار کا مشاہدہ کیا کرتے تھے اور ان کی رفتار سے اچھی طرح واقف ہوگئے تھے، شمس و قمر کی رفتار، ریاضی کے اصول سے نکال لیا جانتے تھے سال، ماہ، تھتی، منازل قمر وغیرہ کے معلوم کرنے میں وہ کسی دوسری قوم کے رہین منت نہیں بلکہ دو ہزار سال قبل واقف ہو چکے تھے

(باقی صفحہ ۶۱ پر ملاحظہ کیجئے)

تبسم

سنجیدگی نے اُن کی لُوٹا مرا تبسم — گہرائیوں سے دل کی اُبھرا ہوا تبسم

وہ میری التجا سے پھیری ہوئی نگاہیں — وہ ناز کی لب سے چھلکا ہوا تبسم

اس حُسن کی ادا کو کیا فتحِ عشق سمجھوں — گھلتی ہوئی نگاہیں بڑھتا ہوا تبسم

جس طرح رفتہ رفتہ مہر سحر کی تابش — یوں اُن پہ ہلکے ہلکے چھاتا گیا تبسم

پہلے تو مسکرائے بے اختیار مجھ پر — چہرے کا رنگ بنکر پھر اُڑ گیا تبسم

محفل میں سب کے دعوے تصدیق ہو رہے ہیں — اُڑتی ہوئی نگاہیں چلتا ہوا تبسم

رنگِ شفق میں جیسے ڈوبا ہوا ہو دریا — وہ اُن پہ سر سے پا تک چھایا ہوا تبسم

وہ ان کا عزمِ محفل وحدت میں شوق کثرت — آئینے کے مقابل جھجکا ہوا تبسم

افسردگی میں دل کی ڈوبا ہوا ہوں مسکیش
ورنہ خیال میں ہے بے انتہا تبسم

محمد علی شاہ مسکیش اکبرآبادی

مسٹر کوویل ([illegible]) نے اُن پختہ اینٹوں کا بغور معائنہ کیا جنہیں کلدانی ۱۰۶۳ سے ۷۶۲ قبل مسیح کسوف و خسوف کی تاریخ لکھنے کے کام میں لایا کرتے تھے اور ان اینٹوں سے تمر کے خطوط طول البلد کی کمی و زیادتی کی جداول کی تصحیح و دیگر مفید علومات میں بہت کچھ مدد ملی۔ کلدانیوں سے رومیوں اور یونانیوں نے علم فلکیات سیکھا۔ اہل یونان نے مصریوں سے بھی استفادہ حاصل کیا۔

کلدانیہ۔ اسیریہ۔ بابل ہیئت و نجوم کے گہوارے رہ چکے ہیں۔ جہاں سن عیسوی سے بہت قبل سیارگان کا مشاہدہ کیا جاتا تھا اور علوم سیارگان سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے، بابل میں ۵۳۹ سال قبل مسیح دوازدہ بروج میں کسوف و خسوف کی تقسیم کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا۔ اور اہل بابل کا مبلغ علم صرف سیارگان کے مشاہدہ اور اُنکے اثرات تک محدود رہا۔

یونان کا علم ہیئت و نجوم ہندوستان میں پانچویں چھٹی صدی بعد ولادت مسیح آیا۔ یونانیوں اور مسلمانوں کے حملہ کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، یہ قومیں اہل ہند سے باہم مل جل کر رہنے لگیں اور تبادلۂ خیال کا موقعہ ملا تو ایک دوسرے کے تخیلات و مطلحات علمیہ سے واقف ہو گئے اور یہی سبب ہے کہ اہل ہند کی تصانیف میں دوسری قوموں کے بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ موجودہ علم نجوم خالص ہندوستانی نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں کلدانی۔ مصری و یونانی کا بہت کچھ عنصر شامل ہو جانے سے مختلف اقوام کے تخیلات کا ایک مجموعہ بن گیا۔ جو آجکل مروج ہے [4]۔

عربوں نے یونانیوں کے علم فلکیات اپنی زبان میں منتقل کر کے اس کو ترقی دی، ہندوستانیوں اور سریانیوں سے بھی بہت کچھ سیکھا اور ان کے تصانیف کے تراجم کر کے اُن کی تصحیح کی اور اس کو ترقی پر پہنچایا۔ مسلمانوں کے فلکیات کے متعلق کارنامے مشہور ہیں، بطلیموس جدولین کو نہایت کاوش فکر و جانفشانی سے باریک کیا، نہ صرف یہی بلکہ چاند کی خرابیوں کا بھی پتہ چلایا، عربوں نے خط نصف النہار کے ذریعہ طول درجہ کا قانون بنایا بہت سی رسدگاہیں قائم کیں اور حرکات قمر کے لئے بہت سی جدولیں بنائیں یہاں تک کہ عرب یونانیوں سے علم فلکیات میں سبقت لے گئے۔ یونانیوں کی نگاہیں صرف نظریات تک محدود رہیں اور عربوں نے عملی طور پر حصہ لیا۔

پنچانگ (جنتری) میں سب سے بڑا نقص یہ پایا جاتا ہے کہ ایک ہی جوتشی اور تاریخ ہے وہ دوسرے پنڈت کی طیار کردہ پنچانگ سے منطبق نہیں ہوتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبی رسومات تمام شہروں میں ایک دن اور تاریخ کو منائے جاتے سے سخت دشواریوں سے اکثر دوچار ہونا پڑتا ہے، دو سو سال سے زائد زمانہ گزرا کہ راجہ جے سنگھ (۱۶۹۹ - ۱۷۴۳ء) والیٔ ریاست جے پور نے خود یہ بات محسوس کی کہ جنتریاں اور پنچانگ جو تیار کئے جاتے ہیں وہ بالعموم غلط ہوتے ہیں، جو اوقات سیارگان کے مطالع و مغارب کے ان میں درج کئے جاتے ہیں وہ عینی مشاہدات کے بالکل برعکس پائے جاتے ہیں نیز کسوف و خسوف کا جو وقت دیا جاتا ہے اور جرم نیرین کے گہن کی جو پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں وہ بھی تجربہ سے پوری نہیں اترتیں اس میں بھی اکثر کچھ نہ کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ راجہ موصوف کی نگاہیں اس کے نقائص کی طرف مائل ہو جائیں اور یہ بات محسوس کی کہ قدیم سدھانت سِروُمنی پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، اور قدیم مقررہ اصول و قواعد پر عمل کرنے سے یہ اختلاف پایا جاتا ہے۔

بھسکارہ [5] کے وقت سے اس میں نظر ثانی کا موقعہ اب تک نہ آیا، اور جب تک نظر ثانی سدھانت سرومنی میں نہ ہوگی یہ اختلاف بدستور قائم رہے گا۔ اس اختلاف کو دور کرنے کی غرض سے راجہ جے سنگھ نے محمد شاہ (۱۷۱۹ - ۱۷۴۸ء) کی اجازت سے رصدگاہیں دہلی۔ جے پور۔ بنارس و اجین میں قائم کرائیں تاکہ تقویم صحیح تیار کی جائیں، ان میں سے قدیم دہلی کا جنتر منتر ہے جو ۱۷۱۰ء میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ شاہی رصدگاہ اپنی طرز خاص کے لحاظ سے بہت ہی قدیم ہے۔ جس طرح گرینچ (Greenwich) کی شاہی رصدگاہ میں دائرۂ منطقۃ البروج اور التریمہ (Altazimuth) بڑے بڑے آلات ہیں اسی طرح دہلی کے جنتر منتر میں بھی اسی غرض و غایت کے لئے آلات رصد تیار کرلئے گئے تھے جو دائرہ منطقۃ البروج و التریمہ کی ضروریات کے قائم مقام تھے۔

بنارس اور دہلی کی رصدگاہیں کس مپرسی کی حالت میں رہ کر برباد ہو گئیں اور جے پور کی رصدگاہ اچھی حالت میں اب تک قائم ہے، اس سے ریاست کیا فائدہ اُٹھا رہی ہے ملک کو اس کا علم نہیں ہوتا اور عام طور پر پبلک اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہتی ہے۔

[6] نجوم، جوتش اور رمل سب کو معلوم ہے کہ یہ چیزیں ہندوستان سے کس قدر تعلق رکھتی ہیں، دولتِ عباسیہ کے دوسرے خلیفہ منصور ہی کے وقت سے جو ۱۳۶ھ میں تخت نشین ہوا عربی میں ان چیزوں کا رواج ہوا، منصور کو ان باتوں سے بڑی دلچسپی تھی چنانچہ بغداد کا شہر جب اُس نے بنوایا تو اُس کی ہر چیز زائچہ کھینچ کھینچ کر تیار کی گئی۔ دربار پر پہلے ایرانی منجموں کا قبضہ تھا پھر ہندوستانی جوتشیوں نے اپنا عمل دخل جمایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ منصور ہی کے زمانے میں اس فن پر ہندی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں ان جوتشی پنڈتوں میں سے عربوں میں سب سے مشہور نام کنکہ پنڈت کا ہے"

(نوٹ) [4] ملاحظہ ہو صفحہ [1] ڈائرکشنل اسٹرولاجی از ڈاکٹر وی۔ جی۔ ریلے ایل۔ ایم اینڈ ایس۔ ای۔ او پی۔ ایس [5] بھسکارہ سدھانت سرومنی کا مصنف ہے جس کو تقریباً چھ سو سال سے زائد زمانہ ہوا، [6] دیکھو صفحہ [153] "عرب اور ہند کے تعلقات" [7] ملاحظہ ہو [152] "عرب اور ہند کے تعلقات"

(باقی آیندہ)

فلکی اجمیری

"شاہکارِ فراق"

تصویر تیری دیکھ کے رونا وہ ہجر میں
رونے کے بعد پھر تری تصویر دیکھنا

فکر ایم اے

منچوریا میں چین و جاپان کی کشمکش

منچوریا میں چین و جاپان کی کشمکش برابر بڑھتی جا رہی ہے ابھی تو یہ جنگ بظاہر دو ہمسایہ قوموں کی باہمی نبرد آزمائی کی حیثیت رکھتی ہے لیکن ماہرین سیاست کو اندیشہ ہے کہ کہیں منچوریا میں چین و جاپان کی شرر بار توپیں کہیں آنے والی عالمگیر جنگ کو سلامی نہ دے رہی ہوں۔

منچوریا کی پیچیدہ سیاسیات کو سمجھنا آسان نہیں ہے موجودہ کشمکش کے اسباب و علل اور اس کے عقبی نتائج کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے ہمیں مختلف واقعات کی کڑیاں ملانا پڑیں گی۔

بیسویں صدی کے آغاز تک منچوریا پر روسی اثرات غالب تھے۔ ۱۹۰۵ء میں جنگ روس و جاپان کے خاتمہ پر معاہدہ "پورٹس ماؤتھ" کے ذریعہ روس نے اپنے حاصل کردہ حقوق جاپان کو دیدیے اور حکومت چین نے بھی اس معاہدہ پر مہر توثیق ثبت کی۔

معاہدہ پورٹس ماؤتھ کے ذریعہ جاپان کو منچوریا میں جو حقوق و اختیارات حاصل ہوئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت چین کے اندر ایک مستقل حکومت قائم کی جائے جس کا برائے نام شمار تو چینی ممالک محروسہ میں ہو لیکن جو حقیقت میں ماتحت جاپان کے ہو۔ جنوبی منچوریا ریلوے جس کا سلسلہ ڈیرن سے چانگ چن تک ہے روسیوں کے روپیہ اور محنت سے تیار ہوئی تھی لیکن جنگ روس و جاپان کے خاتمہ پر یہ جاپان کو مل گئی اور اس کے ساتھ ہی انہیں منچوریا کے پایۂ تخت مکڈن سے بندرگاہ انتنگ تک متذکرہ بالا ریلوے لائن کی ایک نئی شاخ نکالنے کا بھی حق حاصل ہو گیا۔

معاہدہ پورٹس ماؤتھ کی رو سے جاپان کو ایک اور خاص فائدہ یہ ہوا کہ جزیرہ نمائے سیاؤتنگ میں جنوبی منچوریا ریلوے کے اختتام پر ۱۴۴۱ مربع میل کا علاقہ کوانتنگ اسی طرح "پٹہ پر" مل گیا جس طرح نظام حیدرآباد کا علاقہ برار حکومت ہند کے پاس پٹہ پر ہے۔

منچوریا کا مجموعی رقبہ تین لاکھ بیاسی ہزار مربع میل ہے۔ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوانتنگ کا رقبہ بظاہر کوئی حقیقت نہیں رکھتا لیکن تجارتی اور بحری مفاد کے لحاظ سے یہ علاقہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اس کی بندرگاہ ڈیرن منچوریا میں تمام جاپانی توقعات اور امیدوں کا مرکز ہے۔ جاپان بظاہر کسی ممکن قیمت پر بھی اس سے دست بردار ہونا گوارا کرے گا۔ کچھ عرصہ کے بعد اگر منچوریا اور منگولیا کی حالت کچھ بھی سنبھل گئی تو ڈیرن اپنی تجارتی اہمیت میں شنگھائی سے بازی لیجائیگا۔ اور وادی یانگزی کے بیس کروڑ باشندے بیرونی دنیا سے ڈیرن ہی کے ذریعہ تجارت کرینگے علاوہ بریں اس علاقہ میں نہایت نفیس تیل نکلتا ہے۔

۱۹۱۵ء میں پٹہ ختم ہو جانے کے دن قریب آئے تو جاپان نے اپنے مشہور اکیس مطالبات کے ذریعہ چینی حکومت سے بزور قوت اس کی میعاد بڑھوالی۔ اس وقت یورپین ممالک عالمگیر جنگ میں مبتلا تھے اس لئے جاپان کو اور بھی اچھا موقع مل گیا۔

اس دوران میں جاپان نے اپنی اقتصادی تعمیر میں منچوریا کو اس قدر مدغم کرلیا کہ اگر اب وہ منچوریا میں اپنے حقوق سے دست بردار ہونا چاہے تو اس کے قومی مفاد پر زبردست اثر پڑے گا۔ اقتصادی اہمیت کے علاوہ جاپان منچوریا کو روس کے خلاف اپنی مدافعت کا پہلا محاذ سمجھتا ہے منچوریا زراعتی اور معدنی لحاظ سے بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ زمین سرسبز و شاداب ہے۔ دوسری چیزوں کے علاوہ سوئے کی پھلیاں اس قدر کثرت سے پیدا ہوتی ہیں کہ انہیں منچوریا کی زرعی دولت کہا جا سکتا ہے تمام دنیا میں جس قدر سوئے کی پھلیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا اسی فی صدی حصہ صرف منچوریا میں پیدا ہوتا ہے۔ معدنی لحاظ سے منچوریا میں لوہے اور کوئلے کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔

۱۹۱۵ء میں چین نے مجبور ہو کر جاپانی پٹوں کی پھر تجدید کردی اب کوانتنگ کے جاپانی پٹہ کی میعاد ۱۹۹۷ء میں جنوبی منچوریا ریلوے کی ۲۰۰۲ء اور انتنگ مکڈن ریلوے پٹہ کی میعاد ۲۰۰۷ء میں ختم ہوئی۔ علاوہ بریں اس سال جاپان نے منچوریا میں کان کھودنے اور زمینیں پٹہ پر حاصل کرنے اور دوسروں کو ٹھیکہ پر دینے کے حقوق بھی جبراً حاصل کر لئے یہ ہے مختصر الفاظ میں جاپان کی مشہور اکیس مطالبات کا خلاصہ۔ چین کے قومی جذبات اس المناک جاپانی جذبۂ ملوکیت کے ہمیشہ خلاف رہے ہیں ۱۹۱۷ء میں چین نے اپنی اندرونی بدنظمیوں سے مجبور ہو کر منچوریا میں جاپان کے یہ امتیازی حقوق بخوف جنگ منظور کر لئے لیکن اُسے اپنی مملکت میں ایک غیر قوم کی یہ مداخلت و غارتگرانہ دست برد بہت ناگوار ہے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو جاپان نے چینی سپاہیوں پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے افسروں کی زیر ہدایت دو ایک مقامات پر جنوبی منچوریا ریلوے کی پٹریاں اکھاڑ دیں معاہدہ پورٹس ماؤتھ کی رو سے جاپان کو ریل کے راستہ پر "محافظ دستہ" کے نام سے فوج رکھنے کا حق حاصل ہے اس الزام میں جاپانی ریلوے کے ان "محافظ دستوں" نے (جن کے قیام کا مقصد معاہدات کی رو سے صرف اس قدر ہے کہ وہ ریلوے لائن کی حفاظت کریں) چینیوں کے خلاف اس طرح جنگی کارروائی شروع کردی کہ گویا یہ ملک چینیوں کا نہیں بلکہ جاپانیوں کا ہے۔ ڈیرن سے چانگ چن کا جاپانی سپاہیوں کا تانتا بندھ گیا اور انہوں نے جنوبی و وسطی منچوریا کے تمام اہم مقامات پر قبضہ کرلیا۔

اس دن سے آج تک جنیوا۔ واشنگٹن اور ماسکو کے مسلسل انتباہ کے باوجود جاپان منچوری علاقوں پر قابض ہے انجمن اقوام کی کونسل نے اس کو ہدایت کی وہ ۱۶ نومبر تک اپنی فوجیں معاہدہ پورٹس ماؤتھ کی رو سے طے شدہ رقبہ کے اندر واپس بلالے لیکن جاپان نے کوئی سماعت نہ کی اور اس وقت بھی اس کی فوجیں جنوبی منچوریا ریلوے

کی شمالی حد سے تقریباً تین سو میل آگے تک بڑھی ہوئی ہیں۔

متحدہ ریاستہائے امریکہ نے برابر اس امر کی کوشش کی کہ جاپان آئین انصاف کی شاہراہ سے معزول نہ ہو۔ پہلے انجمن اقوام میں یہ تحریک اٹھانے کا خیال تھا کہ میثاق کیلاگ کا احترام مدنظر رکھا جائے جس کی رو سے لڑائیوں پر بندش کی گئی ہے لیکن اس سلسلہ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنگ کس وقت میں جنگ نہیں ہے؟ کیونکہ اگر منچوریا میں گزشتہ ماہ ستمبر سے چین اور جاپان کے درمیان کشمکش ہو رہی ہے لیکن دونوں کی سفارتی تعلقات منقطع نہیں ہوئے اور نہ دونوں حکومتوں نے باقاعدہ اعلان جنگ کیا۔ لہذا واشنگٹن میں نو دول کے باہمی میثاق پر زور دیا گیا جو ۱۹۲۲ء میں واشنگٹن کانفرنس کے موقع پر مرتب ہوا تھا اور جس کو بعض اوقات چین کیلئے "بین قومی منشور اعظم" کہا جاتا ہے۔

اس معاہدہ کے ذریعہ منچوریا پر چین کا فرض حکمرانی تسلیم کیا گیا ہے اور اس بات کی ذمہ داری کی گئی ہے کہ منچوریا کا دروازہ تمام اقوام عالم کی تجارت کے لئے مساویانہ طور پر کھلا رہے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جاپان کی ترکتازیوں سے نو دول یورپ کے متفقہ میثاق کی دھجیاں فضائے منچوریا میں اڑ رہی ہیں منچوریا کے مشرقی صوبہ کرین میں جاپانیوں نے اپنی جانب سے ایک گورنر مقرر کر دیا ہے مکڈن میں یوان جن کائی نامی ایک خوشنویس کو صدر حکومت بنا کر بٹھا دیا ہے۔ اور یہ بھی افواہ گرم ہے کہ منچوریا کے سابق تاجداری ہنری پو۔ پی کو جاپان منچوریا کے تخت پر دوبارہ بٹھانا چاہتا ہے۔

واقعات منچوریا سے روس کا تعلق ایک بالکل دوسری نوعیت کا ہے۔ نو دول یورپ کے متذکرہ بالا معاہدہ میں وہ شریک نہیں ہیں لیکن وہ اسے میثاق کیلاگ پر اس نے دستخط ——— دی کاغذ کے ایک پرزہ سے زیادہ نہیں سمجھتا اس لئے دوسرے دول مغرب کی طرح جاپان کے خلاف یہ اعتراض نہیں کہ وہ کسی معاہدہ یا میثاق کی خلاف ورزی کر رہا ہے بلکہ شمالی منچوریا کے جس کے علاقہ میں جاپان دست تطاول دراز کر رہا ہے۔ وہاں روس کے بعض مفاد ہیں مشہور جنوبی مشرقی ریلوے کا مستقر ہے وہ چین کے ساتھ ہی روس کی بھی ملکیت ہے اس طرح یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ منچوریا میں اس وقت چین جاپان اور روس کے خصوصاً اور بعض دوسری مغربی حکومتوں کے مفاد عموماً اپنا کام کر رہے ہیں چینیوں کو یہ فکر ہے کہ ان کا ملک غیروں کی دست برد سے بچے جاپان منچوریا پر زیادہ سے زیادہ قبضہ جمانا چاہتا ہے اور روس کو یہ فکر ہے کہ جاپان کے ہاتھوں منچوریا میں اس کے مفاد خاک میں نہ ملیں امریکہ وغیرہ دول مغرب میں بعض سے جاپان کو کاوش ہے بعض کو روس سے اور ممکن ہے کہ چند طاقتیں نیک نیتی کے ساتھ معاہدات کا احترام مدنظر رکھنا چاہتی ہوں۔

چین اور جاپان کی کشمکش کوریا کے ایک واقعہ سے معلوم ہوا تھا کہ وہاں دنیا میں جنہ چینی اور کورین باشندوں کی کچھ چپقلش ہوئی اس میں جاپانی پولیس اور منچوری فوج نے حصہ لیا اور اس طرح تمام کوریا میں چینیوں کے خلاف پروپیگنڈا شروع ہو گیا اور چین میں جاپانی مال کا بائیکاٹ ہونے لگا۔ ۱۸ ستمبر کو جاپان نے منچوریا میں جو مداخلت کی وہ در اصل کوریا کے اسی معمولی واقعہ کا شاخسانہ تھی

۱۹۱۵ء کے معاہدہ کی رو سے جاپان کو منچوریا میں زراعت کا حق حاصل ہے زمین پٹہ پر لینا بظاہر ایک معمولی بات ہے لیکن چین میں ایسی خاص اہمیت حاصل ہے قوانین ملکی کی رو سے سوائے مشنریوں کے چینی معاہدات کی رو سے خاص حقوق حاصل ہیں کوئی غیر ملکی باشندہ زمین پٹہ پر حاصل نہیں کر سکتا اور اہل چین اس بندش کے عاید کرنے میں حق بجانب بھی ہیں کیونکہ یہاں غیر ملکی باشندے چینی قانون اور عدالت کی دسترس سے باہر ہیں اور اگر کوئی غیر ملکی زمین حاصل کرے تو چینی حکومت اس کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتی بعض غیر ملکی باشندوں کو زمین پٹے پر حاصل کرنے اور دوسروں کو پٹے پر دینے کے جو اختیارات حاصل ہیں وہ چینیوں کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں کیونکہ اس طرح ان کی راہ میں شدید دشواریاں حائل ہو جاتی ہیں۔

جاپان کو شروع میں امید تھی کہ وہ اپنے کسانوں کی کثرت تعداد سے اس حصہ ملک پر تمام و کمال تسلط جما لیں گے لیکن انہیں مایوسی ہوئی منچوریا کے دو کروڑ ستر لاکھ باشندگان میں صرف ڈھائی لاکھ جاپانی ہیں اور ان میں بھی بڑا حصہ کاشتکاری نہیں کرتا بلکہ اسٹورکیپروں منیجروں اور ریلوے ملازموں کی حیثیت سے کام کرتا ہے منچوریا میں جاپانی کاشتکاروں کی تعداد بہت ہی کم اور برائے نام ہے اس کی ایک خاص وجہ ہے کہ جاپانی قوم فطری طور پر اپنے وطن سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتی پچھلے سال شمالی امریکہ میں جاپانیوں کی ہجرت کے متعلق ان دونوں ممالک میں کچھ کشیدگی ہوئی تھی غالباً ناظرین یہ خیال کریں کہ اگر جاپانی قوم ضرورت سے زیادہ "وطن پرست" واقع ہوئی ہے تو پھر یہ قبضہ کیوں ہوا تھا اس سلسلہ میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ۱۹۱۰ء لغایت ۱۹۱۹ء یہ دس سال جاپانیوں کی تاریخ میں ایسے ہیں کہ اس کے باشندوں نے سب سے زیادہ تعداد میں دوسرے مقامات پر ہجرت کی لیکن "عظیم الشان" مجموعی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار ہے! اور اس کے مقابلہ پر ان ہی دس برسوں کے اندر جاپان کی آبادی میں ساٹھ لاکھ کا اضافہ ہوا ایک جاپانی اپنے وطن کی نان خشک کو پردیس کی مکلف غذاؤں پر ترجیح دیتا ہے۔

اگر جاپانی باشندے انتہائی مجبوری کے عالم میں اپنے وطن سے باہر نکلیں بھی تو اقتصادی لحاظ سے منچوریا ان کے لئے زیادہ پرمشقت مقام نہیں جاپانی کاشتکار محنت میں چینیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ پردیسی جاپانیوں کی بسر اوقات کے لئے کافی نہیں لہذا جاپانی سب سے زیادہ برانہ مل جاتے ہیں۔

چینی مزدور جاپانی مزدوروں سے تو بازی لیجاتے ہیں لیکن کوریہ والوں سے انہیں منہ کی کھانا پڑتی ہے چینیوں کے مقابلہ میں کوریوں کی خوراک ارزاں ہے اس لئے وہ منچوریا کے چینی مزدوروں سے زیادہ کم اجرت پر کام کر سکتے ہیں علاوہ ازیں کورین کاشتکار چینی کاشتکاروں سے باعتبار قابلیت افضل ہیں۔

اس مقابلہ کا تعلق چونکہ براہ راست پیٹ سے ہے اس لئے چینی اور جاپانی مزدوروں اور چینی اور کورین مزدوروں کے درمیان معاندانہ جذبات برابر بڑھتے جاتے ہیں اس سال پیشتر تک چینیوں اور کوریوں کے تعلقات خوشگوار تھے لیکن کچھ تو جاپان کی ریشہ دوانیاں اور کچھ پیٹ کا سوال۔ اب ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے ہیں منچوریا میں اس وقت دس لاکھ کے قریب کورین باشندے ہیں اپنی کثرت آبادی کو دیکھتے ہوئے چینی باشندے بھی منچوریا میں ہجرت کے لئے مجبور ہو رہے ہیں اور منچوریا میں کورین اثرات غالب دیکھ کر ناراض ہوتے ہیں کیونکہ

سوالِ معیشت کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کورین قوم جاپان کے زیرِ نگین ہے
منچوریا میں کورین نے اقلیت کے اس اقتصادی سوال سے بہت زیادہ سیاسی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ چینی منچوریا میں کوریوں کے داخلہ کو جاپانیوں کا داخلہ سمجھتے ہیں اور ایک مصیبت یہ ہے کہ اگر کورین باشندے چینی قومیت بھی اختیار کر لیں تب بھی جاپان ان کو اپنی رعایا سمجھتا ہے۔ لہٰذا اہل کوریا اپنے اس حق سے اور بھی فائدہ اٹھاتے اور جاپانیوں کے آلۂ کار بنتے ہیں۔

متذکرہ بالا وجوہ سے تمام سمجھدار چینیوں کی یہ خواہش ہو رہی ہے کہ وہ جابرانہ معاہدات منسوخ کئے جائیں جو جاپان نے چین کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تسلیم کرا لئے تھے۔

جاپانیوں کے خیال میں معاہدات کے خلاف اس تحریک تنسیخ میں منچوریا کے مشہور جنگی سردار مارشل جنگ سولیان کا زبردست ہاتھ ہے اس مارشل کو جاپانیوں نے مکڈن میں داخل ہونے کی ممانعت کی تھی یہ نوجوان محب وطن اُس مشہور بوڑھے سردار چانگ سولن کا بیٹا ہے جس نے چینی حکومت سے اختلافات رکھنے کے باوجود جاپان کا آلۂ کار ہونا کبھی منظور نہ کیا۔ مارشل جنگ سولیان مادرِ وطن کی کچھ خدمت کرنا چاہتا ہے اور اس کا مقولہ ہے کہ چین میں صرف چینیوں ہی کو حق حکمرانی حاصل ہو سکتا ہے۔
مارشل مذکور نے منچوریا کے باشندوں کو حب وطن کا سبق پڑھایا اور ان کے رگ و ریشہ میں جاپانی امپیریلزم کے خلاف معاندانہ جذبات پیوست کر دئے باوجودیکہ نو ممالک کے عہد نامہ پر جاپان کے بھی دستخط ہیں۔ لیکن وہ منچوریا کو چین سے علیحدہ کرنا چاہتا ہے جب کبھی کسی منچوری سردار نے دیوارِ چین کے جنوبی معاملات سے سروکار رکھا تو جاپانی اس سے ناراض ہوئے۔ بوڑھے چانگ سولن نے جب چین کے معاملات میں حصہ نہیں لیا تو جاپان نے اس کو پکن نہ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ نوجوان جنگ سولن کے تعلقات چین کی قوم پرست جماعت اور کومن تان سے بہت مستحکم اور خوشگوار ہیں اس سے جاپانی اور بھی گھبرا رہے ہیں۔
منچوریا کا نوجوان طبقہ اپنے وطن میں جاپانی اقتدار کے سخت خلاف ہے اور ان کے دلوں میں یہ آگ آج سے نہیں بلکہ برسوں سے سلگ رہی ہے لیکن بعض بوڑھے سردار نوجوانوں کے جذبات کو قابو میں کئے ہوئے تھے۔ اب ملکی سیاسیات میں نوجوان پارٹی کا زیادہ اقتدار حاصل ہو رہا ہے اور ان کے سامنے بوڑھوں کی نہیں چلتی ہے۔ یہ زمانہ کا انقلاب دیکھ کر منچوریا کے چند بوڑھے سرداران جنگ نوجوان طبقہ کا ساتھ دینے پر رضامند ہو گئے ہیں اور اکثر نے گوشۂ عافیت اختیار کر لیا ہے
ابتدا میں نوجوان جنگ سولیان کو غیر معمولی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اس نے اپنے ملک کی سیاسیات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک عزیز دوست سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ زمانہ گزشتہ میں چینی حکام کچھ وقت سلطنت کی اطاعت میں صرف کرتے تھے کچھ وقت اپنے صوبجاتی سرداروں کی اطاعت میں اور کچھ وقت اپنے لئے روپیہ جمع کرنے میں لیکن اب یہ حال ہے کہ نہ انہیں مرکزی حکومت کی پروا کی اطاعت ہے نہ مقامی حکومتوں کا خیال اور وہ اپنا تمام تر وقت روپیہ فراہم کرنے میں صرف کرتے ہیں لیکن نوجوان جنگ سولیان اس افسوسناک صورتِ حال سے مایوس نہیں ہوا بلکہ وہ قوم پرور کوششوں میں برابر مصروف رہا اور آخر میں کامیابی نے اس کے قدم چوم لئے آج منچوریا میں جمود و اختلال کا پہلا سا رنگ نہیں۔

نوجوان دلوں میں قومی جذبات نہایت تیزی کے ساتھ نشو و نما پا رہے ہیں
حب وطن کے ان ہی جذبات سے متاثر ہو کر چینیوں نے ریلوے لائنیں نکالنے کا پروگرام مرتب کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے مجوزہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں چینیوں نے انتہائی ذہانت اور قابلیت کا ثبوت دیا ہے انہوں نے بعض شدید مواقعات کے باوجود منچوریا میں تقریباً آٹھ سو میل کے قریب ریلوے لائن اپنے سرمایہ سے تیار کی ہے اسپین مکڈن ریلوے چینیوں نے برطانوی سرمایہ سے تیار کی ہے۔ اس طرح اب چینی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ منچوریا میں اُن کی زیرِ ملکیت ریلوے لائنیں روس اور جاپان کی ریلوے لائنوں سے زیادہ طویل ہیں۔ اگر چینیوں کی راہ میں برابر دشواریاں حائل نہ کی جائیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک ریلوے کا تعلق ہے چین منچوریا میں اپنی غیر معمولی قابلیت و محنت کا ثبوت دے۔
اصل میں منچوریا میں چینی ریلوے لائنوں کا سلسلہ مارشل جنگ سولن نے شروع کیا تھا۔ مکڈن میں برسرِ اقتدار ہو کر اس کی خواہش تھی کہ وہ چینی مشرقی ریلوے سے بے نیاز ہو جائے۔ ۱۹۲۵ء میں جب ایک بغاوت رونما ہوئی تو چینی مشرقی ریلوے کے روسی منیجر نے مارشل فوجوں کا پیشگی کرایہ وصول کئے بغیر لیجانے سے انکار کر دیا تھا۔
اس واقعہ کا مارشل جنگ سولن پر بہت زیادہ اثر ہوا اس وقت اس نے کسی نہ کسی طرح اپنا کام نکال لیا لیکن اس کے بعد اس نے ریلوے لائن کی تیاری کا کام شروع کیا اور چینی مشرقی ریلوے کے متوازی بہت جلد ایک نئی لائن نکال کر وہ اول الذکر ریلوے لائن سے بے نیاز ہو گیا۔
اس اہم کام سے فارغ ہو کر اس نے فوراً ہی جنوبی منچوریا ریلوے کے متوازی بھی ایک نئی ریلوے لائن نکالنے کا ارادہ کیا اور پیپن مکڈن ریلوے سے سات میل کے فاصلہ پر بندرگاہ ہولوتاؤ میں ریلوے لائن کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ اس طرح نوجوان مارشل جنگ سولیان کی خواہش یہ تھی کہ ان کی مجوزہ ریلوے لائن ڈیرن کے جاپانی بندرگاہ سے بھی بالکل آزاد رہے نیا زنہ ہے اس نئی تجاویز سے جاپانی حلقوں میں اور بھی سراسیمگی پھیلی کیونکہ یہ جاپانیوں کے اقتصادی اور سیاسی مفاد سے متصادم ہو رہی تھیں۔
جاپان جانتا تھا کہ اگر جنوبی منچوریا ریلوے کے مقابلہ پر کوئی ریلوے لائن نکل آئی تو اس کے محاصل میں کمی ہو جائیگی اور وہ منچوریا میں تجارت کا بھی واحد ٹھیکہ دار نہ رہ سکے گا۔ علاوہ بریں مکڈن میں کسی مخالف فوج کا پہنچنا بہت آسان ہو جائیگا اسی لئے اس مجوزہ نئی ریلوے لائن کی شدید مخالفت شروع کی لیکن چونکہ محب وطن چینی جاپان کے سرمایہ سے بے نیاز ہو چکے تھے اس لئے انہوں نے جاپانی مخالفت کی ذرہ برابر پروا نہ کی اور ریلوے لائن تعمیر ہوتی رہی۔
۱۹۲۷ء میں جب اس نئی ریلوے لائن کا دوسرا دورِ تعمیر شروع ہوا تھا جاپان نے خطرے کا بگل بجایا کہ معاہدات کی رو سے چین کو جنوبی منچوریا ریلوے کے متوازی کوئی نئی ریلوے قائم کرنے کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے۔ مسٹر یوشی زادا جاپانی سفیر پیکن نے پوری قوت کے ساتھ چینی حکومت کے سامنے احتجاج کیا اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر چین نے اس ریلوے لائن کی تعمیر فوراً ہی نہ روک دی تو جاپان

اس کے خلاف اعلان جنگ کردے گا۔

اس موقع پر جاپان نے یہ سوال اُٹھایا کہ قدیم معاہدات کی خلاف ورزی کر کے چین جنوبی منچوریا ریلوے کے متوازی کوئی نئی ریلوے لائن تعمیر کرتا ہے تو جاپان کو بھی چینی مشرقی ریلوے کے متوازی ایک نئی ریلوے لائن نکالنے کا حق حاصل ہے۔ اس دوران میں بوڑھے منچوری سردار چنگ سولن کے انتقال سے جدید چینی ریلوے لائن کا مسئلہ معرضِ تعویق میں پڑ گیا ورنہ اب سے ڈھائی تین سال پیشتر ہی چین اور جاپان کی جنگ شروع ہو گئی ہوتی

(ترجمہ)

رُباعیاتِ آسی

ہمارے دیرینہ دوست حضرت مولانا عبدالباری آسی ہندوستان کے اُن پختہ فکر شعراء میں سے ہیں جن کا دنیائے ادب میں ایک خاص درجہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ جناب آسی کو رباعی گوئی میں بطورِ خاص ملکہ حاصل ہے کئی ہزار رباعیات اس وقت تک آپ نے کہی ہیں جن کا انتخاب عنقریب ادبی مرکز کی جانب سے شائع کرنے کی عزت حاصل کی جائے گی جناب آسی رباعی میں اپنے کسی خاص نظریۂ حیات یا مخصوص فلسفۂ زندگی یا اپنے پیغام کی ہم آہنگی و اعادہ کے لحاظ سے کہاں تک مستقل ہیں یہ تو انتخاب کے مطالعہ کے بعد ہی معلوم ہو سکیگا مگر مجھے جستہ جستہ لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہے اس لئے میں اپنی محدود واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے جس رباعی میں جس خیال کو ظاہر کرنا چاہا ہے قوت اور شیرینی کے ساتھ ظاہر کیا ہے اور وہ ایک قادر فن کی حیثیت سے کامیاب ہوئے ہیں۔ مگر عام طور پر اپنی رباعیات میں آپ کچھ خیام کے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

ساغر

ساقی کیوں لب پہ یہ فغاں رکھا ہے — کیوں شیشہ و جام کو نہاں رکھا ہے
یہ گوشۂ صحنِ باغ یہ عالم ہُو — اللہ بھلا یہاں کہاں رکھا ہے

دل میں تپِ عشق سے تعب پیدا کر — آئینِ وفا میں رہ ادب پیدا کر
جب کچھ بھی نہ ہو سکے تو کر خوب گناہ — رحمت کا غرض کوئی سبب پیدا کر

عبرت دل کو جگا نہیں دیتی ہے — قسمت کوئی پتا نہیں دیتی ہے
ہمت بڑھتی ہے جب خدا کی جانب — غفلت اُسے راستا نہیں دیتی ہے

لذت تکلیف میں اُٹھاتے جاؤ — نوحے کی دُھنوں میں نغمے گاتے جاؤ
عبرت کا سبق صحیفۂ فطرت سے — پڑھتے جاؤ مگر بُھلاتے جاؤ

سیماب نے کس سے بے قراری سیکھی — شبنم نے کہاں سے آہ و زاری سیکھی
کانٹوں نے خلش کا راز کیوں کر جانا — سب نے ایک ایک خُو تمہاری سیکھی

کُھلتا ہی نہیں کوئی طلسمات جہاں — مجبور نہ ہو تو کیا کرے پھر انساں
کچھ حد ہے فریب کی وہاں کے آسی — گھٹنے کے لئے جہاں بڑھے عمر رواں

ہو جاتا ہوں پست جب اُبھرتا ہوں میں — مغروریٔ نفسِ بد سے ڈرتا ہوں میں
پاتا ہوں خلوصِ توبہ جس دن دل میں — اُس روز گنہ ضرور کرتا ہوں میں

"آسی"

الہامات

مشاہیر شعراء کے تازہ افکار

شعراء خصوصاً غزل کے لئے میں نے بالائی عنوان کو مناسب ترین خیال کیا اور گو یہ میرے قدیم رسالے کی سرخی ہے مگر "ایشیا" میں بھی اسی کو قائم کرتا ہوں، ہر چند کہ غزلوں کے لئے بہت سے عنوانات تجویز ہو سکتے ہیں مگر اس عنوان سے کم از کم دور پیمانہ کی یاد تازہ ہو جائیگی اور نظر کے سامنے ذہنی تصور کی ان انقلاب کا بآسانی اندازہ ہو سکیگا جو اس سال کی مدت کے لحاظ سے غیر متوقع ہیں، **الہامات** میں ہر ماہ مشاہیر اساتذہ اور ائمہ شاعری کا تازہ کلام شائع ہوا کریگا جس کا معیار یہ ہرگز نہ ہوگا کہ ہر غزل ایک ہی اسلوب شاعری کا آئینہ ہو بلکہ ہر رنگ کی غزل شائع کی جائے گی جس سے یہ اندازہ ہوتا رہے گا کہ اردو شاعری میں اس وقت غزل کے کتنے جاریہ اسکول ہیں۔

ساغر نظامی

حضرت جگر مرادآبادی

حسن کس رنگ میں کھولے ہوئے آغوش نہیں
اس کو کیا کیجئے عرفان نہیں ہوش نہیں

رند جو مجھ کو سمجھتے ہیں انہیں ہوش نہیں
میکدہ ساز ہوں میں میکدہ بردوش نہیں

مٹ چکے ذہن سے سب یاد گزشتہ کے نقوش
پھر بھی اک چیز ہے ایسی کہ فراموش نہیں

ایک گوشہ میں سمٹ آئے ہیں دونوں عالم
میرا دامن ہے کسی اور کا آغوش نہیں

اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں
میری آغوش کو اب حسرت آغوش نہیں

حسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حسن
کونسی شے ہے جو آغوش در آغوش نہیں

عشق و وارفتگی عشق کا افسانہ کہاں
ہیں جہاں اب وہاں حسن کو بھی ہوش نہیں

تو بھی چاہے تو گوارا نہ کروں لطف وصال
تیرے آغوش کے قابل مرا آغوش نہیں

عشق گر حسن کے جلووں کا ہے مرہون کرم
حسن بھی عشق کے احساں سے سبکدوش نہیں

پاؤں اٹھ سکتے نہیں منزل جاناں کی طرف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

دل تو دل سنگ کو توڑو تو صدا دیتا ہے
چوٹ کھا کر کوئی بے حس بھی تو خاموش نہیں

ملکے اک بار گیا ہے کوئی جس دن سے جگر
مجھ کو یہ وہم ہے جیسے مرا آغوش نہیں

حضرت ثاقب لکھنوی

آئینۂ عبرت ہے مرا دل بھی جگر بھی ‏ ‏ اِک درد کی تصویر اِدھر بھی اُدھر بھی
لُٹ کر بھی وہی بھیڑ ہے پہلو میں غموں کی ‏ ‏ دِل کھو کے میں سمجھا کہ کوئی شے ہے جگر بھی
یارب یہ سکتِ دل کی صداؤں میں کہاں تھی
نالوں میں کچھ آواز ملاتا ہے جگر بھی

حضرت قرآن (خلد آشیاں)

قرآن نہ جانے قدم کیوں بڑھائے جاتے ہیں ‏ ‏ پلٹ کے جب اُسی مرکز پہ آئے جاتے ہیں
حیات و موت پہ پردے گرائے جاتے ہیں ‏ ‏ ہمارے راز ہمیں سے چھپائے جاتے ہیں
نضول موجبِ تہمت ہے دامنِ گلچیں ‏ ‏ یہ شعلے پردے سے خود باہر آئے جاتے ہیں
ابھی افق پہ ہویدا نہیں ستارۂ صبح ‏ ‏ مگر چراغ عبث جھلملائے جاتے ہیں
مآلِ کارِ محبت نہ پوچھ اے ہمدم ‏ ‏ کہیں یہ راز کسی کو بتائے جاتے ہیں
کمالِ بیخودیٔ عشق بھی خودی ہے قرآن
جنوں میں ہوش کے آثار پائے جاتے ہیں

حضرت احسن مارہروی

وہاں یہ حضرتِ دل بے بُلائے جاتے ہیں ‏ ‏ جہاں بلائے ہوئے بھی اُٹھائے جاتے ہیں

دلوں میں آرزوئیں شوقِ دید آنکھوں میں
کھلونے دے کے تماشے دکھائے جاتے ہیں

گھٹا گھٹا کے بڑھاتے ہیں ذوقِ نظارہ
اٹھا اٹھا کے وہ چلمن گرائے جاتے ہیں

نمودِ حشر نمائش ہے بھولے بھٹکوں کی
تمام عمر کے بچھڑے ملائے جاتے ہیں

حضرت ماہر القادری

نشاط و کیف کا عالم زمیں سے آسماں تک ہے
خدا معلوم! تیرے حسن کی دنیا کہاں تک ہے

محبت کو خیالِ ماسوا چھو بھی نہیں سکتا
ہوس کی جان پیمائی فقط سود و زیاں تک ہے

یہی طوفان مجھے آسودۂ ساحل بنائے گا
تلاطم میری کشتی کا شکستِ بادباں تک ہے

نظر آتا ہے کیوں ذرّوں میں عکسِ خطِ پیشانی
ابھی کچھ فاصلہ شاید جبیں سے آستاں تک ہے

تری مخمور آنکھوں کا تصور اے معاذ اللہ!
یہی محسوس ہوتا ہے کہ مستی لامکاں تک ہے

کوئی بچھڑے ہوؤں کی بات بھی سنتا نہیں ماہر
جرس کی مہربانی کارواں سے کارواں تک ہے

حضرت مولینا بیخود دہلوی

جو تماشا نظر آیا اُسے دیکھا سمجھا
جب سمجھ آگئی دنیا کو تماشا سمجھا

میں وہ ہوں حور کو جینے کا کھلونا سمجھا
باغِ جنت کو تری راہ میں کانٹا سمجھا

رازِ وحدت ہے زباں کا نہ دیکھا
میں بتا ہی نہیں سکتا کہ اسے کیا سمجھا

سنگِ در پر ترے سجدے کا شرف حاصل ہے
جس نے دیکھا مجھے وہ آئینہ سیما سمجھا

میں یہ سمجھا ہوں کہ سمجھیں نہ مری بات کو آپ — سر ہلا کر جو کہا آپ نے اچھا سمجھا

محوِ دیدار تھا میں ہوش کہاں تھا مجھکو — کوہ پر جو نظر آیا اُسے موسیٰ سمجھا

عشق کی شرح میں داخل ہے غلامی کا بیاں — اس کے ہر حکم کو میں اپنی تمنّا سمجھا

اثرِ حُسن کہوں یا کششِ عشق اسے — میں تماشائی تھا وہ مجھکو تماشا سمجھا

غیریت تک تھا پریشانی و فرقت کا گلا — کچھ شکایت ہی نہ تھی جب اُسے اپنا سمجھا

ایک وہ ہیں جنھیں دُنیا کی بہاریں ہیں نصیب — ایک میں ہوں قفسِ تنگ کو دُنیا سمجھا

میرا ہر شعر ہے اک رازِ حقیقت **بیخود**

میں ہوں اُردو کا نظیری مجھے تو کیا سمجھا

نواب جعفر علی خانصاحب آثر بی اے لکھنوی

مثالِ برگِ خزاں رسیدہ ہوا ہے زرد آفتاب کیسا — مگر قیامت قریب آئی، کھُلا ہے بندِ نقاب کیسا

دلِ ستمکش کو بجلیوں کا خزانہ جس نے بنا دیا ہے — تری نظر میں نہاں تھا ظالم یہ محشرِ اضطراب کیسا

ترے کرم پر کبھی ہے تکیہ، کبھی ہے خوفِ عتاب دل میں — یہی ہے جنت یہی ہے دوزخ، عذاب کیسا ثواب کیسا

میں اُن کے جلووں کا آئینہ ہوں، وہ میری حیرت کا آئینہ ہیں — جہاں یہ عالم ہو محویت کا، سوال کیسا جواب کیسا

کسی کو پیوندِ خاک کرکے پھر اُس کی تربت پہ رو رہے ہیں — ہوا یہ دنیائے عاشقی میں الٰہی! آج انقلاب کیسا

بجائے مے یاد میں کسی کی پیا ہے خونابِ دل وگرنہ

تمہاری آنکھوں سے آج ٹپکا اثر یہ رنگِ شراب کیسا

کتب موصولہ پر ایک نظر

کلیاتِ طغرائی

یہ مجموعہ حکیم الشعراء فیروز الدین احمد طغرائی مرحوم امرتسری کے اُردو فارسی کلام پر مشتمل ہے جسے ہمارے دوست صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ایم اے نے نہایت تہذیب کے ساتھ ترتیب دیکر طغرائی صاحب کے تلامذہ اور احباب کی متحدہ امداد و کوشش سے شائع کیا ہے شروع میں تبسم صاحب کا دیباچہ ہے اس کے بعد طغرائی صاحب کی تصویر ہے پھر سوانح حیات اور اس کے بعد اُردو کلام پر حکیم محمد حسین عرشیؔ اور فارسی کلام پر ممتاز حسین صاحب ایم اے کے سیر حاصل تبصرے ہیں۔ تمام کتاب پانچ حصوں میں تقسیم ہے پہلے حصّے میں متفرق اُردو نظمیں ہیں دوسرے میں اسلامی نظمیں تیسرے میں اُردو غزلیں چوتھے میں فارسی قصائد اور پانچویں حصّے میں فارسی غزلیں ہیں سائز ۲۷×۱۷/۸ کاغذ و کتابت اور طباعت خوبصورت ہے جلد مضبوط و حسین حجم ۲۲۰ صفحات اور قیمت دو روپے (عـ۲) ملنے کا پتہ:۔ پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور۔ ۱۹۲۵ء میں جناب طغرائی مرحوم سے امرتسر میں بذاتِ خود مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ طغرائی صاحب اور ان کی جماعت نے کمالِ محبت سے دعوت دی تھی اور گھنٹوں لطفِ سخن رہا تھا۔ نہایت شریف المزاج بزرگ تھے اور پنجاب کے اساتذہ میں ان کا درجہ کمال بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔ ان کے کلام میں صحتِ زبان زور اور اخلاقی پائی جاتی ہے۔ دقت یہ ہے کہ آرٹسٹ کا ارتقا حالات اور زمانے کی ساعدت سے بہت تعلق رکھتا ہے گو اس میں شک نہیں کہ حقیقی طور پر شاعر کی دماغی و روحانی ترتیب شاعر کی قوتِ فکر اور شاعر کا بنیادی مزاج کرتا ہے جس سے شعریت فطری کا تعلق ہوتا ہے۔ جہاں تک بنیادی مزاج کا تعلق ہے جناب طغرائی بلند پایہ شاعر تھے جہاں تک اسباب و مواقع کا تعلق ہے زمانے نے ان کا ساتھ نہیں دیا یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں مکمل طور پر شاعرانہ سرمستی اور گونج نہیں پائی جاتی البتہ دماغی طور پر جذبات و احساسات اور واقعات کو نظم کر دینے پر پورے قادر تھے جا بجا سرمستی و گونج بھی پائی جاتی ہے مثلاً

عیاں میں آج اپنا سوزِ نہاں کر کے چھوڑونگا ۔۔۔ جگر کے آبلوں کو آتش افشاں کر کے چھوڑونگا

ہنساؤنگا ہر اک بیدرد کو میں اپنے رونے پر ۔۔۔ ہویدا ارتباطِ برق و باراں کر کے چھوڑونگا

امل کی کشتِ مردہ کو کرونگا زندہ اشکوں سے ۔۔۔ اسی پانی سے کارِ آبِ حیواں کر کے چھوڑونگا

غزل و قصیدہ میں حکیم صاحب "قدیم اسکول" کے متبع تھے اور جدید رنگ کی نظمیں کہنے پر مکمل طور پر قادر چنانچہ ہلال کے عنوان سے جو نظم اس مجموعہ میں صفحہ ۱۳ پر درج ہے وہ ان کے کمالِ شاعرانہ کی آئینہ دار ہے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

ہر چند دیکھنے میں ذرا سا ہے ماند ہے ۔۔۔ رقاصۂ سپہر کے ماتھے کا چاند ہے

تہذیبِ بیان دیکھئے ؎

ہوتا ہے برہنہ جو ترا رُخ نقاب سے ۔۔۔ ملتا ہے رونمائی میں نورِ آفتاب سے

پھر فرماتے ہیں ؎

تو بھی حسین ہے دل بھی وفا کوش ہے ترا ۔۔۔ پھیلا ہوا ہے پاک سے آغوش ہے ترا

تمام نظم میں بہت روشن اور ذی روح تشبیہات ہیں اور اسلوبِ بیان مؤثر ہے لیکن ایک جگہ یہ بھی کہا ہے ؎

کشتی ہے تیرے ہاتھ میں گویا گدا ہے تو ۔۔۔ ہاں چشمِ آفتاب سے کچھ لے رہا ہے تو

مجھے معاف فرمایا جائے "ملتا ہے رونمائی میں نورِ آفتاب سے" کہنے کے بعد "ہلال" کو گدائے چشمِ آفتاب کہنا نظم کے وقار اور تسلسلِ نوعی کو مجروح کرتا ہے تبسم صاحب کو ترتیب کے وقت اس شعر کو نکال دینا چاہئے تھا۔ اسی نظم میں پھر ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

زینت فزائے عارضِ زیبائے شب ہے تو ۔۔۔ یعنی کہ گوشوارۂ لیلائے شب ہے تو

کئی نظموں میں جو ناصحانہ قسم کی ہیں حکیم صاحب موضوع کی جزئیات میں گم ہو گئے ہیں۔ اول تو شاعری اور نصیحت دو متضاد چیزیں ہیں دوسرے یاد رکھئے جب شاعر واعظ ہو جائیگا شاعر کے درجے سے گر جائیگا "ملک و مذہب" کے عنوان سے صفحہ ۶۸ پر جو نظم ہے اس کے بعد نعتیہ قصیدہ کے علاوہ ہرگز وہ قصائد شریک کتاب نہیں ہونے چاہئیں تھے جو بادشاہوں اور امراء کی ثنا میں تحریر ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ میں جانتا ہوں ان کی اشاعت سے مقصود قصیدہ گوئی کے رنگ کو دکھانا تھا لیکن اس کوشش میں جتنا عظیم نقصان ہو گیا۔ اس کا اندازہ مشکل ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قوم پرور اور ملک پرست کبھی بادشاہ کا قصیدہ خواں نہیں ہو سکتا۔

اُردو غزل میں بعض بعض جگہ دل جھوم جاتا ہے گو لفظ "حضور" آجکل متروک ہے لیکن شعر کے دلچسپ ہونے میں شک نہیں ؎

مجھ کو ہے ہر سبیلِ شکایت بھی ناگوار ۔۔۔ کیا فائدہ حضور کو ذکرِ رقیب سے

"رقیب" کا دوسرا قافیہ بھی خوب لکھا ہے ؎

محویتِ نظارۂ جاناں نہ پوچھئے ۔۔۔ اُٹھا گیا نہ بیٹھ کے بزمِ رقیب سے

صفحہ ۱۵۷ پہ بڑی معرکۃ الآرا غزل ہے

بہا کے لے ہی گئی بحرِ غم کی رو دل کو — یہ سیل وہ ہے کوئی جس کی روک تھام نہیں

نہ پوچھ غم کدۂ عشق کی بلا نوشی — بغیر خونِ جگر آبروئے جام نہیں

اسی طرح اور بھی غزلوں میں دلدوز اشعار پائے جاتے ہیں ؎

دل سے پیدا ہے مرے نغمۂ غم بے تحریک — یہ ہے وہ ساز کہ شرمندۂ مضراب نہیں

"اشک زیرِ مژگاں" کی کیا خوب تعبیر ہے ؎

دم ذرا لینے کو بیٹھے ہیں مسافر نوروز — اشک یہ ٹھیرے ہوئے سایۂ مژگاں میں نہیں

اور کچھ اس کے سوا فلسفۂ عشق نہیں — کر لیا دل میں کسی چیز نے گھر کہتے ہیں

عام طور پر طغرائی کی غزل کا ماحول قدیم سامانوں سے آراستہ ہے لیکن جذبات کی چاشنی جہاں سے بہت گہری ہے، فارسی غزل کی فضا بھی قدیم ہے لیکن زبان بہت نفیس اور سلیس ہے، اور اردو سے زیادہ فارسی میں برجستگی پائی جاتی ہے۔

وفا گویم، حیا دانم، ستم فہمم، جفا خوانم؟ — نگاہے را نیازم کز غلط انداختی رفتی

زدستارم چہ پرسی، در جنون و آبلہ پائی — کہ مے بندم بہ پا نیمے، دمے پیچم بہ سر نیمے

آخر میں متفرقات کے عنوان سے دو عربی نعتیہ نظموں پر خمسے ہیں اور چند اردو فارسی نظمیں ہیں لیکن بہر حال جو کچھ ہے القام اور اغلاط سے پاک ہے اور کیوں نہ ہو، طغرائی واقفِ فن اور اہلِ علم تھے۔ خود اپنے محتسب تھے شعر و ادب سے ذوق رکھنے والوں کو کلیاتِ طغرائی ضرور دیکھنی چاہئے۔

لطیفیات

جلد دوم

"زبان پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا"

کون کافر ہے جو لطیفی کے ذہین اور طباع ہونے سے انکار کر سکے، یہ نوجوان موسم بہار کی ایک بجلی ہے جس کی تاتمام جھلک ہی تمام کر دینے کو کافی ہے۔ لیکن میری آزادرائے یہ ہے کہ پنجاب کا آسمان اس برقِ لطیف کی جولانگاہِ اضطراب کے لئے مناسب و کافی نہیں۔

لطیفیات ایم حسن لطیفی بی اے کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کی ترتیب و اشاعت میں بہت جلدی کی گئی ہے یہ مجموعہ $\frac{20\times30}{16}$ ریڈر سائز پر طبع ہوا ہے اور اس کو جناب عارف بی اے نے ترتیب دیا ہے، صفحۂ اول ہی لطیفی کی ذہانت کا نقشِ اولیں ہے یعنی سرورق پر انہوں نے اپنے ستارہ کی تصویر دی ہے اس کے بعد انتساب ہے جو زبانِ اردو سے منتسب ہے۔ پھر اردو کے متعلق ایک نظم مصنف کی طرف سے ہے، اس کے بعد عارف صاحب کا دو صفحی دیباچہ ہے اس کے بعد لطیفی صاحب کی تصویر ہے جو اس مجموعہ کی قاتل ترین نظم ہے تصویر کے بعد لطیفی کا خیر مقدم کے عنوان سے حضرت اختر شیرانی کی ایک نظم ہے جو بہترین قصیدۂ اخلاص ہے مگر اس کتاب میں اس کی اشاعت قطعی بے محل ہے اس کے بعد فہرست ہے اور فہرست کے بعد کتاب مندرجۂ ذیل ابواب میں تقسیم ہے۔

پہلا باب ذاتی صفحہ ۱۳ سے ۲۵ تک جذباتی صفحہ ۲۸ سے صفحہ ۵۶ تک محاکاتیہ صفحہ ۵۷ سے ۹۷ تک مناظرہ صفحہ ۹۸ سے صفحہ ۱۳۴ تک فلسفیانہ اور سائنٹفک صفحہ ۱۳۵ سے ۱۵۲ تک سپورٹنگ بالکل ۱۵۴ سے ۱۸۴ تک سیاسی ۱۸۵ سے ۲۰۰ تک معاشرتی ۲۰۱ سے ۲۰۶ تک۔ اسلامی صفحہ ۲۰۷ سے ۲۵۶ تک انجامیہ صفحہ ۲۵۷ سے ۲۵۹ تک۔ اصل کتاب فارسی کی ایک نظم سے شروع ہوتی ہے جس کا عنوان "ہمہ از من" ہے یہ نظم بہت ہی خوب ہے یوں تو لطیفی کی بیشتر نظموں میں وہ شباب و سرمستی ملتی ہے جو فطرت کی طرف سے شاعر کے لئے سند سمجھی جاتی ہے لیکن ان اشعار میں تو خاص طور پر اک جذبِ مستی پایا جاتا ہے۔

دریں معمورۂ بے اعتباری اعتبار از من — کہ پیمانِ محبت پائدار و استوار از من

گدازِ شعلہ و آتش گدائے اخگرِ جانم — فروغِ آفتاب از من تب و تابِ شرار از من

نشاطِ ختن مے دریوزۂ عیشِ فرادانم — ملِ از من محفل از من، و دمے از من خمار از من

چمن صد پیرہن اندوزد از چاکِ گریبانم — گل از من خندہ از من رنگ و بو از من بہار از من

نظموں کے زیر تحت جو تاریخ اشاعت و نظم گوئی تحریر کی گئی ہے میرے خیال میں وہ طباعتی جمال کے دامن پر بدنما دھبہ ہے اور اسی طرح عنواناتِ نظم کے نیچے جو نوٹ یا اخبارات و افراد کی آرائے و اشارہ ہائے طباعت دئے گئے ہیں، وہ کتاب کی عظمت کو کم کرتے ہیں ہرگز ہرگز یہ حواشی نہیں ہونے چاہئے تھے۔

"سازِ خودی کی صدائے شکست" نظم بھی بہت بلند پایہ نظم ہے۔ اگر اس نظم کا انتخاب سختی سے ہوتا تو اور بھی بلند پایہ ہو جاتی۔ جابجا تیصوکی مصوری دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ لطیفی جیسے خوش مذاق شاعر نے کیونکر گوارا کی۔ میرے خیال میں اس فردوس میں یہ گلدستہ ہائے بے رنگ ہرگز نہ ہونے چاہئے تھے یاد رکھئے شعر و شاعری کی مجلدات میں باانتہائے سادگی سے کام لینا چاہئے باکمال رنگینی سے یہی وہ مقام ہے جہاں اعتدال جرم ہے۔

"سلام کہدینا" کے عنوان سے جو نظم صفحہ ۲۸ پر درج ہے وہ اچھی نظم ہے لیکن اس کا عدم کتاب کے وجود کے لئے بہتر تھا۔ ناتمام غزل کا یہ شعر کہ ؎

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں — اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا

خوب شعر ہے، یہ صحیح شاعری ہے۔ "جدائی" کے عنوان کے ماتحت جو نثر کا ایک شذرہ ہے وہ "نظمِ ماقبل نظم" کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا خوب ہے ؎

کسی کو آہ میں جی بھر کے پیار کر نہ سکا — مرے شباب کو تسکیں کی جستجو ہی رہی

بہت ہی لطیف چھینٹا ہے، اور تشنگیٔ شباب کی کیسی بہتر تفسیر ہے۔ یہ نظم نفسیاتِ فراق کے لحاظ سے برمحل ختم ہوتی ہے آخری شعر بہت ہی پاگل کر دینے والا ہے

مراد جو کہیں، دل کہیں، خیال کہیں — مری طرح نہ ہو غربت سے آشنا کوئی

"پریشانیٔ خواب" کے متعلق جو دو سطریں اختر صاحب شیرانی نے لکھی ہیں بہت روشن اور کیف آور ہیں لیکن یہاں نظم کے ساتھ ان کا شائع ہونا برمحل نہیں ہے۔ نظم بجائے خود

بہت بہتر ہے اور خصوصاً اُس کا یہ بند بہت ہی جذباتی ہے۔

جو چین تیرے تصور کی گود میں پائے
ترے خیال کے جھولے میں جسکو نیند آئے
وہ تاب بر ہمیٔ خواب کس طرح لائے؟
ترا خیال جب اس بے نوا سے چھن جائے

"مہ نیم" کے عنوان سے ایک مختصر سی نظم میں لطیفی نے کئی نشتر بھر دئے ہیں پہلا مصرعہ میری فہم سے بلند ہے مگر دوسرا مصرعہ ؎

پری تراش، و صنم ساز و بتگرے بنیم

بجائے خود ایک آفت ہے "مجھے بھول جاؤ" کے عنوان سے صفحہ ۴۶ پر بڑی مؤثر نظم ہے جس کی زبان و خیال میں یکسانیت ہے اس نظم میں شاعر لطیف جذبات نگاری میں بے حد کامیاب ہوا ہے نظم سادہ ہے شیریں ہے مؤثر ہے اور اُس جذباتی انقلاب کا ہلکا سا پتہ دیتی ہے جو برسوں سے بعد اُردو شاعری میں پیدا ہوا ہے ہم اس انقلاب کو "انقلاب روحانی" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اسلوب نظم تبسم لطیفی کا ہے اور سوزِ لطیف کی ہلکی چنگاری تبسم جیسی ہے۔

انتقاد کے وقت بہ حیثیت ایک نقاد کے صرف الفاظ تراکیب و زبان و محاورات کے محاسن و عیوب کو نہیں دیکھنا چاہئے، ایک شاعر کے کلامِ منظوم پر انتقاد کی اولین منزل یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ دماغ سے شعر کہتا ہے یا دل اور روح سے اور شعراء میں زیادہ افراد ایسے ہیں جو محض دماغی طور پر شاعر ہیں انکی وجہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد ہی غلط پڑتی ہے۔ یہ لوگ شاعروں اور ان کی ہوحق کو شاعری کا آغاز و انجام یقین کرتے ہیں اور اُن لوگوں کی طرف دوڑتے ہیں جو بذاتِ خود غلط بنیاد ہوتے ہیں لیکن تیس چالیس سال کی مشاقی جن کو الفاظ سے کھیلنے میں مذاق کر دیتی ہے چنانچہ بغیر یہ معلوم کئے کہ قدرت نے ہم کو شاعر بنایا ہے یا نہیں یہ گمراہِ شوق ایک عمر غلط جادہ پر سفر کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ مشاعروں میں غزلوں کی کامیابی ہی میں معراجِ شاعری کا راز ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ صحیح شاعر بننے کے لئے مطالعۂ فطرت کی اور تزکیۂ روح و دل کی ضرورت ہے جب تک دل کی آنکھیں نہیں کھلتیں کوئی شخص شاعری کے امکاں بوس عرش کے پایوں تک کو بھی نہیں پہنچ سکتا اور جب تک روح لذیذ اور فکر جولاں نہیں ہو جاتی کوئی طاقت مادرزاد شاعر کو بھی ترقی کے معراج تک نہیں پہنچا سکتی۔

میں ابھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ لطیفیات اغلاط و نقائص سے پاک ہے لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ لطیفی دل سے شعر کہتا ہے۔ (باقی۔باقی)

مندرجۂ ذیل کتابیں اور رسائل دفتر "ایشیا" میں وصول ہو چکے ہیں جن پر آئندہ ماہ سے مسلسل اظہارِ رائے کیا جائیگا۔

(۱) لطیفیات
(۲) فروغِ اُردو
(۳) قصیدہ شیخ فریدالدین عطار
(۴) بہاری بھکارن
(۵) صدائے ماہر
(۶) صراطِ مستقیم
(۷) طبی چٹکلے
(۸) خطبۂ مبارکہ (فارسی)
(۹) خطابۂ معجز نمائے (فارسی)
(۱۰) خطابۂ لطیفہ در لزوم عناصر عفیفہ (فارسی)
(۱۱) خطبۂ آقائے حاج امیر مرزا محمد رحیم ثقۃ الاسلام (فارسی)
(۱۲) مثنوی گلزارِ عظم
(۱۳) روحِ رواں
(۱۴) منتخباتِ ہندی کلام (۱۵) گہرستان

(رسائل)

دین و دنیا۔ شاہکار۔ عارف۔ رنگ بھومی (ہندی)۔ ادبی دنیا۔ تیج دہلی۔ دورِ جدید سالنامہ نیرنگِ خیال۔ سالنامہ ادبی دنیا۔ مستورات۔ انتخاب۔ ماہر۔ فلم لالف سفطرت لیبلے۔ نیرنگستان۔

ان رسائل اور کتب کے علاوہ میرا ارادہ ہے کہ میں بشرطِ فرصت اُن جاریہ رسائل کے متعلق بھی اظہارِ خیال کروں جو ایک مدت سے ادبِ اُردو کی خدمت کر رہے ہیں اور یہ دکھاؤں کہ وہ اپنی مساعی و اعمال کے لحاظ سے رجعت کر چکے ہیں یا ترقی۔

ساغر نظامی

۱۷

پیغامِ شباب

اے بے خبر و ماندۂ ہستی کب تک؟
ہستی کی بلندی میں بھی پستی کب تک؟
مشرق سے وہ گلبانگِ سحر اٹھی ہے
ہنگامِ صبوحی میں بھی مستی کب تک؟

ہشیار کہ ہمت کا نہ دامن چھوٹے
ہم سنگِ گراں بار کو پانی سمجھو
طوفانِ حوادث کو کہانی سمجھو
پھرتے ہوئے دریا کی روانی سمجھو

از
مظفر حسین شمیم

ادبستانِ ایشیا کی ایک عظیم الشان تصنیف

بادۂ مشرق

جس کی تیاری و تکمیل میں ہندوستان کے عظیم المرتبت امراء اور قائدین نے محبّت او رفیاضی سے حصہ لیا

اور جس کو امریکہ و ہندوستان کے ماہرفن
مصوروں نے اپنے کمالِ فن سے مرصّع کیا

انتسابِ جلیل

بنامِ اقدس امیر الامراء عالیجناب نواب میر یوسف علی خان بہادر سر سالار جنگ ثالث ادام اللہ اقبالہٗ

۷۲

ہمارے ممدوح امیر الامراء جناب نواب میر یوسف علی خان بہادر سر سالار جنگ ثالث نہ صرف مادّی لحاظ سے بلکہ اپنی روحانی منزلت و بزرگی خاندانی عظمت و تقدیس اور ادبی و علمی تبحّر کے لحاظ سے بھی امیر کبیر ہیں، آپ کے رفیع الشان خاندان کا سلسلہ حضرت اویس قرنیؓ سے ملتا ہے آپ کی دسویں پشت میں اویسؒ ثانی تھے جو مدینۂ منورہ میں اوقاف کے متولی تھے اور جو علی عادل شاہ والئ بیجاپور کے زمانے میں ہندوستان میں اپنے فرزند محمد علی کے ساتھ وارد ہوئے اور ہندوستان ہی میں سکونت اختیار کر لی۔

سلطنتِ عالیۂ دکن میں یہ خاندان اپنی قدامت اور عظمت، شجاعت، علمی تبحّر اور دولت و ثروت کے لحاظ سے ممتاز ترین خاندان خیال کیا جاتا ہے اور تاریخ دکن کا صفحہ صفحہ اس کے ذکرِ مبارک سے منور ہے جو اعزاز و اکرام اس عظیم القدر خاندان کو ریاستِ ابد قیام دکن میں حاصل ہے وہ دوسروں کو کم نصیب ہے۔

نواب میر یوسف علی خاں سر سالار جنگ بہادر ثالث سابق مدار المہام منیر الدولہ عماد السلطنۃ نواب میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی مرحوم کے اکلوتے فرزند

"ایشیا" میرٹھ

حضرت اشرف نواب میر یوسف علی خان بہادر سر سالار جنگ ثالث

جولائی ۱۹۳۶ء

اور منیر الملک غیور جنگ شجاع الدولہ نواب میر سعادت علی خاں مرحوم کے حقیقی بھتیجے اور مختار الملک میر تراب علی خاں سر سالار جنگ اول جی۔ سی ایس آئی سابق مدار المہام کے پوتے ہیں اور آپ عالی شان سالار جنگی خاندان دخانوادہ درگاہ قلی خان کے چشم و چراغ ہیں جب کی ضیا سے آج سرزمین دکن کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

ولادت

آپ کی ولادت مبارک دکن میں ۴ جون ۱۸۸۹ء مطابق یوم جمعہ ۱۴ شوال المکرم ۱۳۰۶ء (۶ امرداد ۱۲۹۸ف) کو ہوئی

تعلیم و تربیت

ایک ماہ کے بعد ہی آپ کے محترم بزرگوار کا وصال ہو گیا اس لئے حضور نظام (غفران مکان) نے آپ کی تربیت و تعلیم پر بطور خاص توجہ فرمائی ۱۳۱۶ء میں بہ تقریب جشن سالگرہ مبارک اعلیٰ حضرت حضور غفران مکان نے آپ کو خطاب خان بہادری و سالار جنگی ثالث و منصب دو ہزار و پانصد سوار و علم و نقارہ

عطائے منصب و اعزاز

کے عطائے منصب و اعزاز سے سرفراز فرمایا آپ نے دکن کے لائق ترین مغربی و مشرقی استادوں سے اکتساب علوم کیا اور مدرسۂ عالیہ میں شریک ہو کر اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم حاصل کی علوم

ماہر علوم و السنہ شرقیہ و غربیہ

مشرقی و مغربی میں آپ مہارت تامہ رکھتے ہیں اُردو فارسی عربی انگریزی اور فرانسیسی زبان میں اہل زبان کی طرح بات چیت فرماتے ہیں، اور ہر زبان میں آپ کی تحریر و تقریر بے حد دلچسپ اور گہر بار ہوتی ہے۔ ہر زبان کے ادب سے آپ کو بطور

علمی و ادبی ذوق

خاص دلچسپی ہے اور آپ کا علمی و ادبی ذوق نہایت بلند و ممتاز ہے مگر اُردو و فارسی ادب سے آپ کو خاص طور پر دلچسپی ہے، ہندوستان کے سیکڑوں ادیبوں اور شعراء کی سرپرستی فرماتے ہیں، سچ یہ ہے

علم پرستی و ادب نوازی

کہ علوم پرستی اور فنون نوازی کا ذوق آپ کو ورثہ میں ملا ہے اور اس ورثہ کو آپ نے کمال حفاظت سے محفوظ رکھا ہے، سخن فہمی میں آپ اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ میں نے ہندوستان کا گوشہ گوشہ

فنون لطیفہ کا نقاد اکبر

چھانا ہے اور اُن بہترین مراکز کو دیکھا ہے جہاں ہندوستان قدیم اور ایشیائے دیرین کے علوم اور فنون لطیفہ کے بہترین شاہکار جمع تھے لیکن جس قدر منتخب و عظیم الشان خزینہ قدیم قلمی نسخوں اور تصاویر و بتوں کا نواب سر سالار جنگ بہادر کے پاس ہے اس نیلگوں آسمان کے نیچے میری نگاہ سے نہیں گزرا بارہا حضور انور کی معیت کا شرف مجھ کو حاصل ہوا ہے۔ اور ایسے مواقع پر بھی میں شریک رہا ہوں جب نواب صاحب تصاویر اور قدیم قلمی نسخوں کی خرید و فروخت میں مصروف تھے، میں نے معلوم کیا کہ وہ ایشیائی آرٹ کے اس قدر زبردست نقاد ہیں کہ مصور کا کوئی خط ان کی نگاہ سے اپنی کم سوادی و کم نقشی کو محفوظ نہیں رکھ سکتا اُن کی نگاہ حسن کی گل چینی اور نقص کی گرفت میں کبھی تکلف نہیں کرتی۔ شعر و ادب کا مطالعہ بھی نہایت وسیع ہے۔ ہر مذہب، شاعری اور اس کے متعلقات سے بخوبی واقف ہونے اور انسانی نفسیات کے ماہر ہونے کی وجہ سے شاعر کے جذبہ و خیال کی گہرائیوں میں سانس لینے والے مفہوم کی تپش کو محسوس فرما لیتے ہیں

اجنٹا کے طلسمی غاروں کا مالک

قدرت نے ان کو پیدائشی آرٹسٹ اور آرٹ کا پجاری بنا کر دنیا میں پیدا کیا ہے۔ عجائبات عالم میں سے ایک عجیب یادگار کے وہ مالک ہیں گویا اجنٹا کے طلسمی غاروں کے بادشاہ ہیں۔ یہ کانیں اور حیرتناک غار آپ کی جاگیر میں واقع ہیں اور آپ کی جاگیر کا رقبہ (۱۴۸۰) مربع میل ہے۔ یعنی ہز ہائینس مہاراجہ پٹیالہ کی ریاست کے برابر ہے جاگیر کی آبادی ۱۹۱۱ء میں دو لاکھ اور کئی ہزار تھی، علاقہ مقبوضہ میں کئی عدالتیں اور جیل ہیں بعض جاگیر کی سالانہ آمدنی بارہ لاکھ پچاس ہزار ہے۔ آپ سلطنت دکن کے اُن جاگیرداروں میں ہیں جنہیں فوجی عدالتی اور کوتوالی کے کامل اختیارات حاصل ہیں۔

سلطنت عالیہ دکن کی مدار المہامی

۱۹۱۲ء میں راجہ راجایان ہز ایکسیلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ کے رخصت کے سلسلے میں تین سال کے لئے آپ عارضی مدار المہام مقرر ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ نے آپ کو مستقل مدار المہام مقرر فرما کر ایک لاکھ کا گراں بہا خلعت عطا فرما کر عظیم الشان اعزاز و منصب بخشا۔

عراق و عرب و ایران اور یورپ کی سیاحت

دسمبر ۱۹۱۴ء میں سرکار والا سے چھماہ کی رخصت لے کر خدمت متعلقہ سے علیحدگی اختیار کی اور عرب و ایران اور یورپ کے تمام شہروں کی سیاحت فرمائی۔ اور گو یہ سیاحت محض تفریحی حیثیت رکھتی تھی لیکن دنیا کی اس سیر سے جو عظیم الشان معلومات آپ نے حاصل فرمائیں وہ بجائے خود ایک زبردست ذوق اکتساب کی دلیل ہیں

عراق و عرب و ایران بیروت و شام و بیت المقدس کی سیاحت

۱۳۴۸ھ میں عراق و عرب، مصر و شام بیروت و بیت المقدس اور ایران کا سفر فرمایا اور زیارت ائمہ علیہم السلام سے مشرف ہوئے اس کے علاوہ تین مرتبہ یورپ کا سفر بھی فرمایا۔ ان سفروں نے آپ کے مشاہدہ اور عرفان کو وسیع تر کر دیا۔

اخلاق و محاسن کی رفعت

جس شخص نے اس امیر محترم کو دیکھا ہے اور ان ساغر صفت آنکھوں کو بھی دیکھا ہے جن میں اسلاف کی روح شرافت اور جلال کی بجلیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ سلیم الطبعی، فیاضی، سیرچشمی، دریادلی، شرافت، غریب پروری، کرم گستری، اولوالعزمی، عالی ہمتی اور عام جذبۂ سخاوت کا بہت قدیم اور گہرا تعلق سالار جنگ بہادر (ثالث) کی ذات اقدس سے ہے۔ ان کے ہاتھ اتنے ہی کشادہ اور دل اتنا ہی فراخ ہے جتنا ان کے اسلاف کا تھا۔ ان کے اطوار و اعمال میں وہی بلندی و رفعت اور مشرقی شان پائی جاتی ہے جو امرائے قدیم کا طرۂ امتیاز تھی۔ ان کی زندگی میں مغربیت کے تمام عناصر شامل ہیں لیکن ان کی روح خالص طور پر مشرقی ہے اخلاق و اطوار مشرقی ہیں اور وہ سرتاپا ایک "آئیڈیل مشرقی انسان" ہیں۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن سے متاثر ہو کر مصنف نے اپنی عمر شباب کا حاصل اس یوسف دکن کے نام منتسب کیا ہے اور اس انتساب پر مصنف کو تمام عمر ناز و افتخار رہیگا۔

ساغر نظامی

زعیم قوم پرور عالیجناب سیّد المحترم ڈاکٹر سیّد محمود مدظلہ العالی

ایم' اے' پی' ایچ' ڈی بار ایٹ لا

ڈاکٹر سید محمود جو اپنی بے لوثی، اخلاص، اور انسانیت کے اعلیٰ ترین جذبات کے سلسلے میں تمام ہندوستان میں شہرت رکھتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں قربانی' دردِ قومی اخوتِ انسانی اور اسلامی رواداری کے حقیقی مجسمے ہیں' سادہ مزاج' رفیع و مہذب۔ شہرت و نمائش سے ان کو حیرتناک طور پر نفور ہے۔ استغنا استغنا ان کی دولت و راحت ہے ان کی ملاقات کے بعد انسان کو اپنی پوشیدہ ترین خامیوں کا علم ہوجاتا ہے۔ وہ ہر شخص کے لئے ایک خاموش رہبر ہیں۔ ان کا علمی و ادبی ذوق نہایت پختہ و مکمل ہے۔ اس قحط کے زمانے میں وہ ایک راسخ اور صادق محب وطن ہیں اور ہندوستان و اسلام سے زیادہ کوئی چیز ان کو عزیز نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب دبستانِ ایشیا کی اس نادر تصنیف کی اشاعت کے سلسلے میں سب سے زیادہ اظہار احسان مندی کے حقدار ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کی وہ ذات گرامی ہے جس نے اس عمارت کی اولیں بنیاد رکھی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب اُن کے خلوص ہی کی برکت ہے کہ "باغِ مشرق" ایسی اہم کتاب تیار ہو کر ہندوستان کی ادبی فضاؤں میں داد و تحسین کا خراج حاصل کر رہی ہے' ورنہ جہاں تک غریب مصنف کا تعلق ہے یہ "جوئے شیر" لانا اُس شکستہ بازو کوہکن کا کام نہیں تھا۔

اگر ڈاکٹر صاحب قبلہ سیاسی دُنیا میں نہ آئے ہوتے تو وہ ہندوستان کے ادبی حلقوں کے بھی سرتاج ہوتے لیکن آج بھی ڈاکٹر صاحب کی اُن ادبی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جو اپنا خاص درجہ رکھتی ہیں۔

آپ کی مشہور تصانیف میں "خلافت اور انگلستان" انگریزی اُردو میں مسئلہ خلافت پر تاریخی و مذہبی و سیاسی غرضکہ ہر لحاظ سے ایک جامع ترین کتاب ہے۔ مطبوعہ تصانیف کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی بہت سی تصانیف شائع ہونے کے لئے محفوظ ہیں جو انشاءاللہ ادبی مرکز کی طرف سے شائع کی جائیں گی۔

ان تصانیف میں سے بعض اپنے مقاصد کے لحاظ سے بہت اونچی ہیں۔ مثلاً ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں جن ذہنی اور نفسیاتی اصولوں کو پیش نظر رکھکر ڈاکٹر محمود نے اپنی ایک معرکۃ الآرا تصنیف میں اظہار خیال فرمایا ہے وہ بالکل انوکھا و عجیب ہے۔

اس کے علاوہ آپ کی ایک تاریخی تالیف "شاہانِ مغلیہ کے عہد میں ہندو مسلم تعلقات" اپنی نوعیت کی زبردست کتاب ہے۔

تکمیل ہوجانے پر ڈاکٹر صاحب کی اجازت پر وہ کتاب بھی ادبی مرکز اپنی طرف سے شائع کرے گا۔

رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو بار ایٹ لا بہ القابہ

صدر ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد

ہندوستان میں بہت کم شخصیتیں ایسی ہیں جن کو ظاہری و باطنی دونوں حیثیتوں سے سچا ہندوستانی کہا جاسکے لیکن ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو حقیقی طور پر ایک سچے ہندوستانی ہیں جو مذہب' فرقہ اور سیاسی مصلحتوں سے آزاد ہو کر ایک آئیڈیل انسان ہیں ان کا دل ہر قوم کے لئے کھلا ہوا ہے اور ان کی ذاتِ گرامی ان پست نفسیات سے بہت اونچی ہے۔

آج وہ ہندوستان کی متحدہ تہذیب و روایات کی بزم قدیم کی آخری شمع ہیں جن کے بعد تاریکی ہی تاریکی ہے۔ اُن کی ذات ہندوستان میں اسلاف کی بزرگی و جامعیت کی ایک روشن مثال ہے ادبیات مشرق پر آنریبل سر تیج بہادر سپرو بہ القابہ کے جس قدر احسانات ہیں اور خصوصاً اردو ادب کی آبیاری آپ نے جس فراخ حوصلگی و اخلاص کے ساتھ فرمائی ہے۔ وہ آپ کو ادب ہندی

کے آسمان پر آفتاب نیم روز کی طرح تاباں و روشن رکھے گی اور امتداد کبھی اس کی شعاعوں کے نور کو کم کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ جہاں تک قانونی قابلیت و سیاسی اہلیت کا تعلق ہے ایک عالم رطب اللسان ہے لیکن آپ کی مسلمہ ادبی قابلیت و ذہانت سیاست و قانون دانی سے بالکل علیحدہ چیز ہے اور یہی وہ شے ہے جو آپ کو ایک ادبی انسان کا درجہ عطا فرماتی ہے آپ ایک نہایت مہذب، ہنس مکھ اور شریف الطبع انسان ہیں ——————— "بادۂ مشرق" کے آغاز کار کا سہرا اسی محترمات قدس کے سر ہے جس کے انتہا احسانات دنیائے ادب پر ہیں۔

بلبلِ ہند محترمہ مسز سروجنی دیوی (نائیڈو)

بلبلِ ہند مسز سروجنی دیوی جو عالمگیر شاعرانہ و ادیبانہ شہرت کی مالکہ ہیں اپنے اخلاق و محاسن طبعی کے لحاظ سے بھی دنیا کی اُن چند خواتین میں سے ایک کہی جا سکتی ہیں جن کا معصوم اور شیریں قلب انسانیت کے پاکیزہ جذبات سے لبریز ہے۔ اس فرقہ پرستی اور آپا دھاپی کے زمانے میں وہ محبت اور انسانیت کی حقیقی "دیوی" ہیں انکا دل دُنیا کے ہر آرٹسٹ اور اہل فن کے لئے یکساں طور پر فراخ اور وسیع ہے۔ وہ ایک صادق اور شریف دل خاتون ہیں اور خود ایک زبردست شاعرہ ہیں اس لئے وہ ہر آرٹسٹ اور شاعر کی روح کی عظمت اور اہل فن کی شخصیت کی اہمیت کا بآسانی اندازہ لگا لیتی ہیں۔ اُن کی ترکیب میں قومی یا فنی عصبیت کا ایک شمہ بھی نہیں۔ بلکہ ان کی تخمیر محبت، خلوص، احسان فرمائی، پرستش فن اور تبسم و ترنم کے اجزاء و عناصر سے ہوئی ہے۔ انگریزی زبان کی اس محترمہ بنگالی شاعرہ کی فطرت کی بلندی دیکھنے کے بعد اُردو زبان کے شعراء اور ان کی سیرت کی رذالتوں پر حیرت ہو سکتی ہے اور شاید بدی نفرت بھی جن کی ترکیب حسد، غیبت ——— محسن کشی، اور جنگ و نفرت کے اجزاء سے ہوئی ہے جن کے آرٹ کی روحانیت کا منتہا صرف یہ ہے کہ ایک دوسرے سے آپس میں حسد کریں اور جلتے جلاتے رہیں مگر سروجنی کی روح ایشیا کی اس مقدس ترین ہستی کی روح اپنے ہم فن اور ہم ذوق افراد کے لئے بغیر فرقہ و مذہب کے خیال کے محبت و رافت کے کیف سے یکساں طور پر سرشار ہے۔ اور وہ حقیقی طور پر ہندو مسلم اتحاد کا ایک مایۂ و حسین پرچم ہے جو ابدالآباد تک آزادئ ہند کی مضبوط چٹانوں پر قائم ہو کر لہراتا رہیگا اور آنے والی قوم اسکے سایہ میں سجدہ ریز ہو کر سروجنی کے قدموں کو بوسہ دے گی۔

وسیع برِ اعظم ایشیا کے ایک تاریخی ملک ہندوستان سے بلند ہونے والی اس آواز کو جو پُر کیف زندگی کا پیام ہے اور جو ہندوستان کے کلچر، ہندوستان کی تہذیب اور ہندوستان

جنھوں نے "بادۂ مشرق" کی طباعت کیلئے بھی بیش بہا مالی امداد فرمائی کی غلامی کے خلاف اک احتجاج ہے سب سے زیادہ طاقت پرواز اگر بخشی ہے تو وہ "عندلیب شکستہ پر" کی نغمہ ریز مصنفہ نے جو چمنستان ہند کی ایک لالہ نفس بلبل ہے اور جس کے نغمات اور جن سے نہ صرف ہندوستان کی فضائیں جھوم رہی ہیں۔ بلکہ ساری کائنات مست ہو گئی ہے۔

برادرِ محترم سیٹھ محمد علی نیار رئیس بمبئی

یہ باب المند بمبئی کے ایک مخلص ترین انسان ہیں اور طاقتور عملی شخصیت کے مالک ہیں۔ بمبئی کی کوئی جماعت ایسی نہیں جس کو محمد علی کی ہمدردیوں کی ضرورت نہ ہو۔ ایک شریف اور دیوانہ محبت اور مخلص شخص ہے اور جو ہندوستان و اسلام کی محبت میں سرشار ہے جس کا قلب آزادی اور محبتِ الٰہی سے مست ہے جو ہر لحاظ سے دنیا میں مسلمانوں کو باعلم باعزت آزادی پرست، ذی علم ذی ہنر اور ذی مرتبت دیکھنا چاہتا ہے جو ہر وقت ہندوستان کو آزاد دیکھنے کے لئے بے تاب ہے اور جو آزادی پسند جماعتوں کا خادم ہوکر مخدوم ہے۔ جو خود امی ہے لیکن جس کا دل علم و ادب کی پرستاری اور نوازش کے جذبے سے لبریز ہے۔ جو لوگ محمد علی کو جانتے ہیں اُن کو معلوم ہے کہ وہ بمبئی میں ایک آہنی طاقت کا مالک ہے اُس آہنی طاقت کا مالک ہے جو دیوانگی، عمل محبت اور سچائی کی عناصر سے مرکب ہوتی ہے

(ہاتی۔باتی)

سیٹھ محمد علی مینار (بمبئی کے نیشلسٹ لیڈر اور رئیس)
جنہوں نے بادۂ مشرق کی تکمیل میں گرانقدر مالی امداد دی

نوائے راز

(از ابوالفاضل راز چاندپوری)

اب وہ اگلا سا دل پُر جوش نہیں | بادہ نوشی بقدرِ ہوش نہیں
مطمئن ہوں بدورِ مجلسِ حال | فکر فردا و رنجِ دوش نہیں
لطفِ ساقی ہے ضامنِ انجام | اب مجھے فکرِ نائے و نوش نہیں
ملکِ فقر و فنا ہے ویرانہ | شہریارِ گلیم پوش نہیں
مدرسے میں ہے دورۂ من و تو | کیا یہاں کوئی مے فروش نہیں
قصہ خوانِ رموزِ کیف و کم! | خود فروشی دلیلِ ہوش نہیں
کفر و ایماں کا امتیاز بجا | رند مشرب ہوں، سخت کوش نہیں

کیا کہا اے حریفِ نکتہ سرا
راز خودبیں ہے، حق نیوش نہیں؟

"مطبوعاتِ ادبی مرکز"

حضرتِ ساغر نظامی
"صبوحی"

ہندوستان کے مشہور اور پختہ کار شاعر و ادیب حضرتِ ساغر نظامی کے چیدہ چیدہ اور منتخب غزلوں کا حسین اور خوبصورت مجموعہ جو کئی ہزار کی تعداد میں شائع ہوا تھا اور ایک سال کے اندر ہی فروخت ہوگیا۔ قیمت محض ۸ر علاوہ محصول۔

"کہکشاں"

حضرتِ ساغر نظامی جس طرح نظم پر قادر ہیں اور فنِ شعر میں ایک صاحبِ طرز کی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح نثر نگاری پر بھی ان کو مہارتِ تامہ حاصل ہے۔ کہکشاں ان کے ۲۱ افسانوں کا ضخیم مجموعہ ہے جو بہترین ادبِ لطیف پیش کرتا ہے۔ کہکشاں میں آرٹ اور طنزیات کا وہ لطیف سنگم ہوا ہے جو کسی دوسری کتاب میں نہیں پایا جاتا، زبان کی شوخی اور مستی حرف حرف میں کارفرما ہے سوسائٹی اور حالاتِ حاضرہ پر افسانوی انداز میں گہری تنقید پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کسی حیطۂ محدود میں گردش کرنے والا نہیں ہے بلکہ اس کا دل زندگی کی تمام چھوٹی بڑی باتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ کتابت و طباعت خوبصورت جلد مضبوط، سرورق سہ رنگا، قیمت مجلد عہ (علاوہ محصول) غیر مجلد عاہ

مہاتما رسکن

انگلستان کے مشہور ریفارمر جان رسکن کی مختصر لیکن مکمل سوانح عمری بچوں اور طلباء کے لئے مفید و کارآمد قیمت صرف ۴ر

طلوع

پنجاب کے ایک نوجوان شاعر ضیا فتح آبادی بی اے کے قطعات کا مجموعہ .... جو اُن کے مہذب خیالات کا آئینہ ہے، قیمت صرف ۶ر

بھکارن اور پجارن

حضرت ساغر نظامی کی دو شاہکار نظمیں جو ادبی مرکز کی کتابیں منگانے والوں کو مفت ارسال کی جاتی ہیں۔

بادۂ مشرق

اُردو ادب میں ہر لحاظ سے حیرت انگیز کتاب جو اپنے حسنِ ظاہری کے لحاظ سے موجودہ مطبوعہ کتابوں میں ناقابلِ مقابلہ ہے جس کے ۶۰۰ صفحات میں تفکر، تاثر، تغزل، وجدان و کیف، قومیت و اسلامیت کی روح کارفرما ہے اور پیغمبرِ اسلام کے علاوہ رام چندر جی، کرشن، مہاتما گوتم بدھ اور اکثر اسلامی و ہندوستانی قائدین پر ایسی نظمیں اس کتاب میں پائی جاتی ہیں جو اتحادِ اقوام کا سبب بننے کی طاقت رکھتی ہیں، شباب، آزادی، مسرت اور زندگی کا ایک متواج سمندر بادۂ مشرق کے صفحات میں موجیں مارتا ہے آپ ملاحظہ کریں گے تو اعتراف فرمائیں گے کہ ساغر نے اپنی اس کتاب سے ایشیا کی عظمت کو دوبالا کر دیا ہے بادۂ مشرق "اُردو شاعری میں عقیدہ، زبان، خیال اور اپنے پیغام کے لحاظ سے اولین کتاب ہے۔ یہ دُنیا کی چار زبانوں اُردو، ہندی، گجراتی اور انگریزی میں شائع ہوئی ہے اُردو ایڈیشن کی قیمت مجلد عہ علاوہ محصول، غیر مجلد للعہ

دیگر انشاپردازوں کے شاہکار

امام الہند علامہ ابوالکلام آزاد
"خونِ شہادت کے دو قطرے"

یہ مختصر رسالہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے عالمِ جوانی کا شاہکار ہے جو منصور و سرمد کے پُرخروش و مستند حالات پر مشتمل ہے اول تو موضوع ہی اپنی جگہ بہت پُرخروش ہے اُس پر مولانا آزاد کی پُرجوش ادبیت پڑھتے پڑھتے انسان جھوم جاتا ہے۔ قیمت صرف ۴ر علاوہ محصول

مولوی عبدالباری آسی
"تذکرۂ خندۂ گل"

کون ہے جو مولوی عبدالباری آسی الدنی کی ذات سے ناواقف ہو، آپ ہندوستان کے مشہور ادیب ہیں، یہ تذکرہ آپ ہی کی کاوشِ ترتیب کا نتیجہ ہے۔ جو اُردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات و منتخب کلام پر مشتمل ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تذکرہ اُردو زبان میں سب سے پہلی اور نئی چیز ہے۔ شیدایانِ ادب کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے قیمت للعہ علاوہ محصول۔

سید مقبول احمد بی اے
"فلسفۂ مذہب"

سید مقبول احمد صاحب کی یہ کتاب مذہب اور اس کے متعلقات پر غیر متعصبانہ نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہے اس کتاب میں مذہب اور اخلاق کی تشریح جدید اور ارتقائی نقطۂ نگاہ سے کی گئی ہے ہر معاملہ کو عقلی طور پر سمجھایا گیا ہے، مطالعہ کے قابل کتاب ہے اور بہت فلسفیانہ طور پر تحریر کی گئی ہے قیمت عہ علاوہ محصول

مفتی مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی
تعلیم الاسلام (ہر چہار حصہ)

اسلامی تعلیم کے متعلق یہ مختصر ترین رسالے ہیں، جو مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی مدظلہ کے زورِ قلم کا

نتیجہ ہیں مذہبیات میں مفتی صاحب کی شخصیت جس قدر بلند ہے اس کا ذکر لا حاصل ہے لیکن بطورِ خاص یہ رسالے اپنے اندر بہت کچھ رکھتے ہیں سب سے پہلے حصہ میں تعلیم الایمان یا اسلامی عقائد کے عنوان سے اسلام کی بنیادی بحث ہے جس کے سلسلے میں عقیدہ ملائکہ، صحائف رسول ورسالت، قیامت تقدیر، حیات بعد الموت، دوسرے شعبے میں تعلیم الارکان یا اسلامی اعمال کے ماتحت، نماز، وضو، غسل، مسح اور اس کی قسمیں، نجاستِ حقیقہ، استنجی، پانی کنویں وغیرہ کا بیان ہے تیسرے رسالے میں "تعلیم الایمان یا اسلامی عقائد" کے ماتحت توحید، فرشتے، صحائفِ الٰہی، رسالت صحابۂ کرام ولایت اور اولیا اللہ، معجزہ اور کرامت کا بیان ہے۔ اسی حصے کے دوسرے شعبہ میں "تعلیم الارکان یا اسلامی اعمال" کے ماتحت وضو کے باقی مسائل، فرائضِ وضو کے باقی مسائل، سنن وضو کے باقی مسائل، مستحباتِ وضو، نواقضِ وضو، غسل کے باقی مسائل، موزوں پر مسح کے باقی مسائل۔ نجاستِ حقیقہ اور اس کی طہارت کے باقی مسائل استنجے کے باقی مسائل، پانی اور کنوئیں کے باقی مسائل، بیان تیمم، نماز کی دوسری شرط، نماز کی تیسری شرط نماز کی چوتھی اور پانچویں وچھٹی وساتویں شرط، اذان کا بیان، نماز کے ارکان تکبیر تحریمہ، قیام، قرأت رکوع، سجدہ، قعدہ آخر واجباتِ نماز، سنت، مستحبات اور نماز پڑھنے کی پوری ترکیب کا مکمل بیان ہے۔ غرضکہ ایک مسلمان کے لئے ان تینوں رسالوں میں اسلامی معلومات کا پورا سامان ہے ہر مسلمان کو اس کی خریداری کرنی چاہئے۔ قیمت ہر سہ حصہ مع محصول ۱۴ر

حاجی عبدالمجید صاحب کاتب "خریطۂ نعت"

یہ ردیف وار نعتیہ دیوان ہے جو مولانا کاتب کی تصنیف ہے، اس مختصر دیوان کو پڑھکر محبتِ رسولؐ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کو اسے خریدنا چاہئے چیدہ نعتیہ کلام کا یہ بہترین مجموعہ ہے، قیمت مع محصول ۸ر

مولانا نیاز فتحپوری مدیر نگار "ایک شاعر کا انجام"

حضرت نیاز فتحپوری ہندوستان کی ان ہنگامہ خیز ہستیوں میں سے ہیں جن کی ہستی اردو ادب کی جان ہے، یہ مختصر افسانہ ان کے عہد شباب کا شاہکار ہے، اور اس قدر بلند چیز ہے کہ اب وہ خود بھی چاہیں تو ایسی معرکتہ الآرا کہانی نہیں لکھ سکتے۔ لفظ لفظ میں حرارتِ شباب پائی جاتی ہے۔ قیمت ۱۰ر علاوہ محصول

فراست الید

یہ مختصر کتاب بھی علامہ نیاز ہی کے دماغ و قلم کا نتیجہ ہے جو علم سمدرک (Palmistry) پر مشتمل ہے جس میں ہاتھ اور اس کی لکیروں کو دیکھکر ایک انسان کی سیرت اور اس کے ماضی و مستقبل پر حکم لگانے کے علم کو کہتے ہیں۔ اس علم کے متعلق یہ مختصر سی کتاب مکمل معلومات رکھتی ہے۔ (Palmistry) سے ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

مذاکراتِ نیاز

یہ حضرتِ نیاز کی ڈائری ہے یہ ان ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں نگار میں شائع ہوئے تھے۔ اور جن کو ملک نے بے حد پسند کیا تھا۔ یہ مضامین حضرت نیاز کی ارتقائی انشا کے شاہکار ہیں

جا بجا طنزیات کی گہری مگر مہذب چاشنی پائی جاتی ہے جو حضرتِ نیاز کی انشا پردازی کی خصوصیت ہے، حجم ۱۶۸ صفحات، قیمت عہ

جذباتِ بھاشا

اس کتاب میں ہندی دوہوں کو جمع کیا گیا ہے اور ہندی شاعری پر تنقید کی گئی ہے، اور خوب دادِ سخن دی ہے شروع میں خلیقی صاحب دہلوی کا دیباچہ ہے۔ اردو زبان کے لئے بہت ضروری کتاب ہے اور اس کو لکھ کر مولانا نیاز نے اپنی ہندوستانیت کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانیکے بعد

یہ بھی چند افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں پیروں اور مولویوں کی رعشہ براندام کردینے والی حرکات کا ذکر ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ آج سوسائٹی میں سب سے زیادہ کریہ مخلوق صرف مولوی اور پیر ہے، بہت دلچسپ کتاب ہے، ہر شخص کو دیکھنی چاہئے قیمت علاوہ محصول ۵ر

مادئین کا مذہب

یہ انگریزی سے ترجمہ ہے جس میں "چند گھنٹے حکمائے قدیم کی روحوں کے ساتھ" کے عنوان سے ایک سلوبِ تازہ کے ذریعہ ہیئتِ اجتماعی کے نقائص اور ضرورتِ انقلاب پر دلچسپ تبصرہ ہے بہت دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۱۲ر

جمالستان

یہ نگارستان کے بعد حضرت مولانا نیاز کے افسانوں کا دوسرا ضخیم مجموعہ ہے جو تقریباً پانچسو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر افسانہ پڑھنے کے قابل ہے، ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے نیاز کا جو درجہ ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر ادیب و ادب پرست کو جمالستان کا مطالعہ بمنزلہ فرض ہے اس کے مطالعہ سے ہر شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ نیاز اردو کا اسکوٹنین ہے۔ قیمت للعہ علاوہ محصول

ترغیباتِ جنسی

یہ بھی حضرتِ نیاز کی معرکتہ الآرا تالیف ہے جس میں تاریخی، علمی اور نفسیاتی نقطہ سے انسان کے میلانِ جنسی پر ایک بسیط نظر ڈالی گئی ہے۔ اس موضوع پر اردو میں اس سے قبل کوئی کتاب نہیں دیکھی گئی، فحاشی کی تعریف کے بعد فحاشی کی ابتدا اور اس کے اسباب سے بحث کی گئی ہے اور اس کے بعد پہلے باب میں "شادی" کے عنوان سے اس کے متعلقات سے بحث ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اقوام کے رسم و رواج کو تحریر کیا گیا ہے دوسرے باب میں "طلاق و خلع" کے ماتحت قدیم روم، قدیم ویلز، قدیم چین، قدیم جاپان وغیرہ میں طلاق و خلع کا ذکر کرتے ہوئے دنیا کے تمام بڑے ممالک کے حالیہ طرز طلاق و خلع کو دکھایا گیا ہے اس کے بعد کتاب مندرجۂ ذیل ابواب میں تقسیم ہے اور ہر عنوانِ باب کے ماتحت مختلف ضمنی عنوانات ہیں:۔

مذہبی فحاشیاں۔ فحاشی پر عمومی تبصرہ۔ استلذاذ بالمثل عورتیں اور استلذاذ بالمثل۔ استلذاذ بالمثل۔ استلذاذ بالوحوش۔ استلذاذ بالنفس۔ فحاشی عہدِ قدیم میں۔ فحاشی قرونِ وسطیٰ میں۔ عہدِ جدید اور فحاشی۔ اخلاقِ جنسی۔

ان تمام عنوانات کے ماتحت معلومات کی ایک دنیا ہے۔ اس موضوع پر آپ اس کتاب سے بہتر کتاب سارے اردو ادب میں نہیں دکھا سکتے قیمت علاوہ محصول ۸ر غیر مجلد سے ۶ر

سیّد فرید جعفری مچھلی شہری

"دل کی رانی"

سیّد فرید جعفری، ملک کے اُن نوجوان مگر پختہ کار ادیبوں میں سے ہیں جن کی کتابیں چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجاتی ہیں "دل کی رانی" ایک ہریجن کی کہانی" ان ہی کی ایک تصنیف ہے جس میں ایک ہریجن کی بپتا بیان کی گئی ہے جو بہت دردناک ہے زبان لطیف اور آسان ہے قیمت ۴ر علاوہ محصول

محبت کے پھول

یہ ایشیا کے شاعر اعظم ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور کے مشہور و مقبول ڈرامہ "رڈ آلینڈرس" کا آزاد ترجمہ ہے اور فرید صاحب ہی نے اس کو ترجمہ کیا ہے جس کا تعارف نامہ شوکت علی صاحب فہمی نے لکھا ہے اور تقریظ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے قلم سے ہے ٹیگور نے اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کی حریص ذہنیت پر روشنی ڈالی ہے ——— اور ٹیگور نے اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کی اُن خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے جنہیں عرفِ عام میں سرمایہ کی سرمستیاں اور مزدور طبقہ کی سرفروشیاں اور فاقہ مستیاں کہا جاتا ہے وہ اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کو نہایت بھڑکیلی بنا کر پیش کرتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۸

ابوالفاضل راز چاندپوری

"دُنیائے راز"

ہندوستان کے کہنہ مشق ادیب و روشن خیال شاعر حضرت مولانا ابوالفاضل راز چاندپوری کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کا مقدمہ مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر بی اے نے لکھا ہے۔ ساری کتاب سات ابواب میں تقسیم اور ۴۶ نظموں پر مشتمل ہے اور اس کی ہر نظم بتاتی ہے کہ راز جدید عہد کا بہترین نمایندہ ہے کتاب نقائص و معائب سے پاک ہے اور نکھری ہوئی لطیف شاعری کو پیش کرتی ہے، ہر شاعر اور شعر و سخن کے دلدادہ کو یہ مجموعہ ضرور دیکھنا چاہیئے۔ قیمت ۱۰ر علاوہ محصول۔

بشیر ملیح آبادی

حضرتِ جوش ملیح آبادی کے والد کا دیوان

کلامِ بشیر

ملک کے مشہور و معروف شاعر حضرتِ جوش ملیح آبادی کے والد کا کلام "کلامِ بشیر" کے نام سے شائع ہوچکا ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت فی جلد ۸ر علاوہ محصول

نسیم رضوانی

"تہذیبِ عمل"

عملی زندگی کی اصلاح کے لئے چند مفید مقالات کا مجموعہ، یہ اخلاقی کتاب ہے، بچوں اور طلبا کے لئے بے حد مفید ہے، اس کے مطالعہ سے انسان کے اخلاق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ہر فہیم باپ کو اپنے بچوں کے لئے یہ کتاب ضرور منگانی چاہیئے

قیمت ۶ر علاوہ محصول

مرزا جعفر علی خاں اثر بی، اے

"اثرستان"

ہندوستان کے مشہور اور مستند شاعر و ادیب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی بی، اے ڈپٹی کلکٹر کا دیوانِ غزلیات شروع میں نواب صاحب کی تصویر بھی شامل کتاب ہے۔ اثر صاحب کی شاعرانہ پوزیشن اس قدر اہم ہے کہ ہر شخص ان کے کلام کو استفادہ کے طور پر دیکھتا ہے، لیکن ان کے کلام میں ایک خاص رس اور جذبات کی گہری چاشنی اس درجہ پائی جاتی ہے، کہ دل ہر شعر پر بے چین اور مست ہوجاتا ہے۔ شعر و ادب کے دلدادگان کو یہ دیوان اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیئے

حجم ۱۵۰ صفحات قیمت عہ ر علاوہ محصول

باسط بسوانی

شاہدِ معنیٰ

جناب ماسٹر باسط بسوانی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے قاضی ظہیر الدین احمد صاحب بسوانی نے مرتب کیا ہے۔ دیکھنے اور پڑھنے کے قابل ہے قیمت مجلد عہ غیر مجلد عمر علاوہ محصول۔

حضرت شوکت تھانوی

طوفانِ تبسّم

شوکت صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ شوکت صاحب مزاح نگاروں کی اولین صف کے ادیب ہیں۔ اُن کے مزاح میں ایک لطیف شوخی اور مذاق پایا جاتا ہے۔ زبان آسان اور سادہ ہے دوسرے صفحہ ہی سے مذاق شروع ہوجاتا ہے اپنی بیوی کے نام آپ نے اپنے طوفان کو منسوب کیا ہے اس کے بعد فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کا دیباچہ ہے پھر مضامین شروع ہوتے ہیں ہر مضمون بجائے خود کشتِ زعفران ہے۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ شوکت کا طوفانِ تبسّم زندگی کے تمام غم اپنی رو میں بہا لیجاتا ہے، اس کے مطالعہ سے جو غیر فانی مسرت حاصل ہوتی ہے اس کے لحاظ سے ۱۲ر قیمت بہت ہی کم ہے (علاوہ محصول)

محمود الرحمٰن ندوی

"دولتِ غزنویہ"

مولوی محمود الرحمٰن صاحب ندوی کی تاریخی تالیف ہے جس میں تاریخی تحقیق و تدقیق کے بعد غازی سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے ولولہ انگیز مجاہدانہ دینی اور علمی کارنامے دکھائے گئے ہیں اور اُن تاریخی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے جو اسلام کے دشمنوں نے تاریخ میں پیدا کردی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزنوی خاندان کے متعلق یہ مکمل ترین تاریخ ہے۔ ہر مسلمان کیلئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے

حکیم یوسف حسن

"پروازِ خیال"

حکیم یوسف حسن صاحب مدیرِ اعلیٰ "نیرنگِ خیال" لاہور کے چار مختصر ڈراموں اور تین مکالموں کا مجموعہ ہے۔ نہایت خوبصورت اور نفیس طبع ہوا ہے۔ پروفیسر تاثیر ایم اے کے قلم سے دیباچہ ہے یہ ڈرامے اور مکالمے بے حد دلچسپ ہیں، زبان نہایت آسان اور دلچسپ ہے ہلکی سی چاشنی مزاح کی پائی جاتی ہے قیمت صرف ۵ر علاوہ محصول

ل۔ احمد اکبر آبادی

"لالۂ رُخ"

طامس مور کی مشہور مثنوی ہے اور انگریزی ادب میں اعلیٰ پایہ کی تصنیف خیال کی جاتی ہے، ملک کے مشہور ادیب لطیف الدین احمد اکبر آبادی نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے، ترجمہ بہ حیثیت ترجمہ بہت ہی بلند ہوا اور اس کا درجہ بھی اردو میں وہی ہے جو طامس مور کی مشہور مثنوی کا ہے۔ لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی کو جو مہارت ترجمہ میں حاصل ہے وہ ہندوستان کے کم ادیبوں کو میسر ہے "لالۂ رخ" نے اُردو ادب کی آغوش کو بہت بڑی دولتِ ادب سے معمور کیا ہے۔ زبان اس درجہ بلند اور شیریں ہے کہ پڑھتے پڑھتے انسان جھوم جاتا ہے، مور کی شاعری کی زبان کا ساتھ دیتی ہے آپ اس کو ضرور ملاحظہ کیجئے قیمت عمر علاوہ محصول

میر ولی اللہ

"ماہ و پرویں"

میر ولی اللہ کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ میر ولی اللہ بی، اے ایبٹ آباد (پنجاب) کے مشہور ادیب ہیں اور مزاحیہ مضامین لکھنے میں ان کو مہارتِ تامہ حاصل ہے۔ کتاب آٹھ مضامین پر مشتمل ہے اور ہر مضمون بجائے خود پڑھنے اور لطف لینے کے قابل ہے قیمت ۱۲ر علاوہ محصول۔

گناہ کی راتیں

ایم اسلم

ایم اسلم صاحب رئیس لاہور کے اخلاقی افسانوں کا مجموعہ ہے ایم اسلم صاحب پنجاب کے نہایت پختہ کار ادیبوں میں سے ہیں اور لاتعداد کتابوں کے مصنف ہیں۔ کتاب میں سات افسانے ہیں اور ہر افسانہ عبرت و ہیبت کا آئینہ ہے نوجوانوں کے لئے اس کے صفحات میں تعلیم اخلاق کے خزانے ہیں۔ اور مذبذب انسانوں کے لئے یہ مشعل ہدایت کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ بھی ضرور دیکھئے زبان لطیف اور دلچسپ ہے قیمت عہ علاوہ محصول۔

سرگزشتِ اسیر

ڈکٹر ہوگیو

سعادت حسن (مترجم)

وکٹر ہوگیو کی مشہور تصنیف (The Last days of the cande mned) کا کامیاب ترجمہ ہے جس میں تنسیخ سزائے موت کے معاشری اسباب سے بحث کی گئی ہے ڈکٹر کی یہ وہ معرکتہ الآرا کتاب ہے جس کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے سعادت حسن صاحب منٹو نے اس کا ترجمہ کرکے اردو ادب پر احسان کیا ہے۔ شروع میں مترجم کا ایک دیباچہ ہے جس میں کتاب اور صاحب کتاب کی ذات اور اسباب تحریر کا ذکر ہے، مترجم کے دیباچہ کے بعد مصنف یعنی خود ڈکٹر ہوگیو کا دیباچہ ہے اور اس کے بعد اصل کتاب ہے موجودہ دورِ انقلاب میں اس کتاب کا مطالعہ لازمی امر ہے اس لئے ہر شخص کو اپنی لائبریری میں سرگزشتِ اسیر کو ضرور جگہ دینی چاہئے۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

"موجودہ لندن کے اسرار"

نور الٰہی و محمد عمر

نور الٰہی و محمد عمر صاحب کی شاندار تصنیف ہے جس میں فلسفۂ جرائم پر نظر ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں جا بجا حیرت انگیز مقالات آتے ہیں اور لندن کی پراسرار زندگی کے مناظر انسان کے دماغ و دل کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں بہت دلچسپ اور حیرت ناک ہے قیمت صرف عہ

سیر المصنفین

سید محمد یحییٰ تنہا بی اے

اردو نثر نگاروں کا مکمل تذکرہ، ادب اردو میں اپنے موضوع پر سب سے اولین اور بہتر کتاب، مفید دلچسپ اور لبریز معلومات، اردو ادب کے شیدائیوں کیلئے ایک قیمتی اور بہترین تحفہ کوئی کتاب خانہ ہمارے خیال سے اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہئے، ادبی تنقید و تاریخ کی دنیا میں یہ شاہکار کا درجہ رکھتی ہے قیمت جلد اول ۱۲ جلد دوم ۸ علاوہ محصول۔

تاریخ امریکہ

حجم ۲۷۶ صفحات کاغذ بہترین اور طباعت وغیرہ خوب ہے اردو زبان میں یہ نہایت نادر تاریخی کتاب ہے۔ امریکہ کے جتنے متعلقات ہیں ان سب کا ذکر اور تاریخی و سیاسی لحاظ سے اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کا تصور امریکہ کا نام لیتے ہی انسان کو ہو سکتا ہے

قیمت ۱۲ علاوہ محصول۔

"ترانہ"

مرزا یاس عظیم آبادی

ہندوستان کے مشہور شاعر مرزا یاس یگانہ چنگیزی عظیم آبادی کی رباعیات کا مجموعہ ہے شروع میں یاس صاحب کا دلچسپ دیباچہ ہے۔ اس کے بعد رباعیاں ہیں، ہر رباعی بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے جس میں حقائق و معارف اور طنزیات کے دریا بھرے ہوئے ہیں اور واقعی رباعیات کا یہ مجموعہ اس قدر دلچسپ ہے کہ ہر صاحب ذوق کو اسے دیکھنا چاہئے۔ قیمت عمہ علاوہ محصول۔

فرانسیسی افسانے

فرانسیسی ادب کا بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو اس مختصر سی کتاب کو ضرور دیکھئے۔ قیمت صرف چار آنے (۴)

شیطان کی خالہ

یہ بھی ایک بے حد دلچسپ ناول ہے ضرور دیکھئے قیمت ۱۲

بیروزگاری کا علاج

آجکل سب سے زیادہ عظیم مسئلہ روزگار کا ہے، ہر شخص تلاش معاش میں سرگرداں نظر آتا ہے، اس کتاب کے ۱۲۸ صفحات ضرور ایک پریشانِ معاش کو شاہراہِ معاش دکھا سکتے ہیں۔ اگر اس میں جرأت مردانہ اور قوتِ ارادی کی روح موجود ہے۔

قیمت صرف آٹھ آنے (۸)

تاریخ مغربی یورپ

ڈاکٹر ابن حسن کی کتاب "History of Western Europe" کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ نہایت سبق آموز اس کتاب کے مطالعہ سے یورپ کے سیاسی اور معاشری معاملات سمجھ میں آ جاتے ہیں قیمت عہ علاوہ محصول۔

خیالات ارونگ

امریکہ کے نامور مصنف واشنگٹن ارونگ کے چند مضامین کا ترجمہ، انداز بیان دیکھنے کے قابل ہے اردو ادب کے فدا کاروں اور انشا پردازوں کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ فن کتاب نویسی، لٹریچر میں انقلاب، اور ایک شادی کا دلفریب انجام، یہ مضامین دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیمت صرف ۸ آنے۔

یہ اور اس کے علاوہ ہر مصنف کی کتابیں ملنے کا پتہ

ادبی مرکز ساغر بک ڈپو میرٹھ

آمر پھل

اولاد انسانی پریم کے باغ کا امر پھل ہے جس سے بڑھکر دنیا میں کوئی دولت نہیں اگر بے اولادی کی بدنصیبی عام ہو جائے تو انسانی نسل ہی ختم ہو جائے اور دنیا اندھیری کوٹھری میں تبدیل ہو جائے۔ اولاد ہی سے خاندانوں کا سلسلہ چلتا ہے اور یہی انسان کے دُکھ درد اور بڑھاپے میں سکھ اور سہارے کا باعث ہوتی ہے۔ مگر دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کو بعض جسمانی خامیوں کی وجہ سے اولاد نصیب نہیں ہوتی اُن لوگوں کے لئے آمر پھل امر خوشی کا پیغام ہے۔ اس کے استعمال سے خدا کے فضل و کرم سے شرطیہ نرینہ اولاد پیدا ہوتی ہے۔ ضرورتمند مندرجہ ذیل پتہ سے منگا سکتے ہیں قیمت معہ محصولڈاک مبلغ دس روپئے (عہ)

گروکل پور (میرٹھ) بذریعہ منیجر ساغر بکڈپو میرٹھ

مشہور قصبوں میں تھوک فروش ایجنٹوں کی ضرورت

حکیم۔ ڈاکٹر۔ وید۔ پروفیسر۔ وکیل۔ ایڈیٹر۔ رئیس غرضکہ ہر طبقہ نے

کیفیا

رجسٹرڈ ۱۱۵۸ ٹریڈ مارک لال گھوڑا

کو درد سر۔ درد کمر۔ درد اعصاب۔ درد ابرو۔ درد رحم۔ اعضا شکنی۔ نزلہ۔ زکام۔ جد وغیرہ امراض میں تجربہ کرنے کے بعد مفید و مجرب تسلیم کیا ہے اور سارٹیفکٹ مرحمت فرمائے ہیں "کیفیا" نے میرٹھ کی نوچندی میں بھی کمیٹی کی جانب سے سارٹیفکٹ حاصل کیا۔ ہر جگہ ایک آنہ فی پیکٹ۔ فی درجن پیکٹ دس آنہ کو۔ عطاروں، دوا فروشوں، پنساریوں سے ملتی ہے۔ اس لئے جہاں جہاں کیفیا کی ایجنسیاں نہیں ہیں وہاں ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ شرائط ایجنسی و نمونہ طلب کرنے پر مفت روانہ کیا جائیگا۔

منیجر:۔ کیفیا فارمیسی (رجسٹرڈ) میرٹھ

دولت کی کان ڈربی سویپ

مقدر کی آزمایش

پرنس آف ویلز کی دوڑ جس کی دنیا منتظر تھی

(سات روپیہ دو آنہ میں)

تیس لاکھ پونڈ تقریباً تین کروڑ روپیہ کے نقد انعامات

ڈربی آئرش ہوس سٹیپس سے دنیا کا ہر شخص اور بچہ بچہ واقف ہے اس کی تعریف لکھنا فضول ہے ناواقف لوگ کسی سے معلوم کرلیں اس کے سب سے بڑے مشہور چانس ڈربی کی تاریخ ۶ جون ۱۹۳۵ء ہے یہی وہ چانس ہے جس کی دنیا انتظار کر رہی تھی۔ جو صاحب ٹکٹ خریدنا چاہیں وہ مبلغ سات روپئے دو آنہ -/7/2 ذیل کے پتہ پر بھیجکر ٹکٹ منگا سکتے ہیں۔ قابل ایجنٹوں کی ہر جگہ ضرورت ہے۔ دیگر معلومات کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ آنا لازمی ہے۔ ٹکٹ جلد خریدیں ورنہ ختم ہونے پر روپیہ واپس جائے گا۔

نوٹ:۔ خواہشمند اصحاب جو اس وقت کسی وجہ سے ٹکٹ نہ خرید سکیں وہ ذیل کا پتہ آیندہ کے لئے نوٹ کرلیں ٹکٹ اس پتہ سے منگائیے گا۔

ایسٹرن مینی فیشل ڈپوٹ باغ اسٹریٹ علیگڑھ

اردو نظم کی لاجواب کتاب

بادۂ مشرق

شائع ہوگئی

پرنٹر و پبلشر: ساغر نظامی مطبوعہ ساغر پریس میرٹھ بہ اہتمام: اسد یار خاں اعظم

بغور دیکھ عجب کاریٔ حریفِ فرنگ | کہ خاکِ خشک سے پیدا ہے چشمۂ نوری
نصیب ہوئے کس میں جاگا غریب دہقاں کا | بنا ہے نخلِ تمنا ستونِ دستوری
اٹھا وُ تیشۂ فرہاد و مسندِ خسرو | چمک اُٹھا ہے زمانے میں بختِ مزدوری
شکستِ مذہب و ایماں میں خود ہی گم ہے خدا | کمالِ جوش میں ہے بندگی کی مقہوری
اُبج سہی مگر انسان سوزیاں تو مٹیں | وطن میں پھیل گئی موجِ روحِ جمہوری
رہا نہ خطرۂ سرمایہ داریٔ افراد | رہی نہ کوئی امیر و غریب میں دوری

اِک انقلابِ مسلسل کا دور ہے جاری
قبائے نو کہ ہے جسمِ قدیم پر بھاری

"مصر"

شکارِ مکر و دنائت فریب سے دل تنگ | چُبھا ہے جس کے کلیجہ میں حریت کا خدنگ
فراعنہ کی وہ اک سرزمینِ حسن و جمال | بجا رہی ہے قلو بطرہ جہاں دف و چنگ
حلول کرنے لگی سعدِ زاغلول کی روح | دماغ مصر ہے اور مستقل تخیلِ جنگ
وہ ایک حربۂ مغرب کا کشتۂ رنگیں | جو امتدادِ زمانہ سے ہو گیا بے رنگ
مجاہدینِ سلف کا وہ آئینہ بردار | ہے جس کے عزم کی رفعت کا آسماں ملنگ
اسی کے پاس ہے مشرق کے گلستاں کی کلید | خدا کرے کہ کبھی ایک ہوں سویز اور گنگ
ہر ایک غنچۂ خاموش آگ بن جائے | بہار غیر ہو اور شعلۂ فلک آہنگ

سویز پر ہو کبھی اختیار مشرق کا
اسے عبور کرے راہوار مشرق کا

"عربی"

وہ ایک مرکزِ انوارِ روحِ انسانی — جہانِ علم میں سب سے عظیم عرفانی

خدا نے جس کو دیا ہے جلال و عظمت و جاہ — عطا ہوئی جسے قدرت سے خود جہانبانی

علوم جس کے ہیں خادم فنون جس کے غلام — تمام جوہرِ ہستی کی روحِ لافانی

پیامِ صدق دیا جس نے سارے عالم کو — جہاں میں پھیل گئی جس سے روحِ ایمانی

مزارِ سیدِ کونینؐ کی محافظ قوم — خدا کے گھر کی میسر ہے جس کو دربانی

وہ قوم جس میں رسولِ خدا ہوئے پیدا — وہ قوم سر پہ رہا جس کے ظلِ سبحانی

وہ قوم حالِ زبوں بھی ہے جس کا نخلِ بہار — وہ قوم جس کا سکوں بھی ہے موجِ طوفانی

وہ جس کا سینہ امانت ہے دردِ ایماں کی
جو ایک آخری اُمید ہے مسلماں کی

"ترک"

ہر اک زبان پہ جہاں میں ہے داستانِ کمال — یہ ارضِ انقرہ ہے یا کہ آسمانِ کمال

وہ جس نے قوتِ بازو سے زندگی پائی — ہے جس کا آج قدم بوس آستانِ کمال

وہ مصطفےٰ کے مقدس وجود کی حامل — وہ قصہ خوانِ ترقی وہ ترجمانِ کمال

وہ جس کے خون سے رنگیں ہے باسفورس تک — بلند جس کے جہازوں پہ ہے نشانِ کمال

وہ قوم جس نے چلائے جہاز خشکی پر — فرازِ سینۂ ہستی میں تھی سنانِ کمال

نپولین ہے ہر اک فرد جس کا دنیا میں — وہ تیغ زن وہ مدبر وہ رازدانِ کمال
وہ لازوال جمال و جلال کی مالک — جہاں میں وہ ادبیات کا جہانِ کمال

وہ ایک شمع کہ جو آندھیوں میں تاباں ہے
وہ آفتاب گھٹاؤں میں جو درخشاں ہے

"عراق"

کنارِ غیر میں اک جسم عظمت و تمکین — کہ جیسے پنجۂ مضبوط میں ہو اک شاہین
ذرا گرفت ہوئی دستِ باغباں کی جو نرم — تو دیکھنا یہی پہنچے گا آسماں کے قریں
جھلک رہا ہے خطِ قسمتِ عراق سے — کہ جھک سکے گی نہ باطل کے سامنے یہ جبیں
وہ ایک سیرتِ انسان کا بہترین حامل — جفا شعار و وطن دوست حریت آگیں
زمانہ یاد رکھے میری پیش گوئی کو — کہ ہے عراق کی آئندہ زندگی زریں
اٹھاؤ قبر سے ہارون کو اور مامون کو — کہ پھر ہو بزم میں اک دورِ ساغرِ زریں
ہوا شراب میں ڈوبی ہوئی چلے ساغر — فضا تمام مئے ارغواں سے ہو رنگیں

نئی شراب سے دامن کو لالہ زار کریں
سرورِ تازہ سے پھر مقدمِ بہار کریں

"چینی"

وہ ایشیا کے چمن کی بہارِ گلشن زا — جسے ہے یاد ابھی تک پیام گوتم کا

ہر ایک گوشے میں جسکے قیامتیں ہیں نہاں — وہ اضطراب کا محشر وہ یاس کی دُنیا
بجھا سکے نہ جسے بادِ تند کے جھونکے — وہ ٹمٹماتا ہوا طاقِ ایشیا کا دیا
بساطِ بازیٔ اغیار پر اسیرِ فریب — وہ خانہ جنگیٔ پیہم کے جال کا پھندا
نگاہِ شوق ہے جاپان و روس کی جس پر — وہ دو رقیبوں کے مابین ایک محبوبا
وہ جس کو پیس دیا انقلابِ گردوں نے — وہ جس کا نقش مٹانے کے بعد بھی نہ مٹا
وہ جس پہ تنگ ہے عیش و نشاط کی دنیا — مگر ہے دل میں وہی کیفِ دورِ ماضی کا

چمک سے چین کے ارژنگ ہیں جواہر کی
نگاہ خیرہ ہے مغرب کے کیمیا گر کی

جاپانی

کمال قوتِ بازو پہ ہے مدارِ حیات — عمل ہی عزم کو کرتا ہے رُستگارِ حیات
کمالِ قوت و طاقت کو زندگی کہیئے — قوی ہی صرف ہے دنیا میں شہریارِ حیات
مگر خدا کے تخیل کو ترک کرنا بھی — نہیں ہے باعثِ افزونیٔ وقارِ حیات
یہ لفظ طی الدو کانوں میں مادیت کے — کہ نیستی کے سمندر پہ ہے مزارِ حیات
وہ ایک سلسلہ سیلابِ مادیت کا — وہ ایک مستقل آوازِ اضطرارِ حیات
وہ ایک محشرِ صنعت کا داورِ مغرور — وہ اک قیامتِ ہستی کا بیقرارِ حیات
وہ کامیاب جسے راس ہے تجارتِ عشق — وہ خوش نصیب جسے مل گیا نگارِ حیات

قمار خانۂ اقوام کا امیرِ کبیر
نہیں ہے جس کو خیالِ شکستِ دامنگیر

"غیر متمدّن قبائل"

(۱)

کمالِ علم ہے رحمت جہانِ جاں کیلئے — فسانہ گو کی ضرورت ہے داستاں کیلئے
مگر وہ علم نتیجہ ہو جس کا ظلم و جہول — ہے ایک لعنتِ ناپاک کُل جہاں کیلئے
غلام ساز اگر علم ہے تو لے انساں! — نہ وہ زمیں کیلئے ہے نہ آسماں کیلئے
نثار میرے دل و روح اُس جہالت پر — جو اک نظیر محبّت ہو انس و جاں کیلئے
دیارِ وحشیِ عریاں اُجڑ کے شہر بسیں — جوازِ قطع بیاباں ہو گلستاں کیلئے
زمیں کو خطۂ نوریں بنائیں جو ذرّے — وہ منتخب ہوں تجلائے آسماں کیلئے
کہاں رکیگا یہ سیلِ جنونِ فطرتیت — ہزار سر ہیں تمدُّن کے آستاں کیلئے

غلام ساز تمدُّن کا صید خانہ ہے
وسیع گلشنِ عالم بھی قید خانہ ہے

(۲)

سجا ہے خون سے انساں کے خانۂ تہذیب — کہ نعشِ سر ہے اور آستانۂ تہذیب
نیا اصول ہے ترویجِ علم و حکمت کا — ہے زیر سایۂ خنجر ترانۂ تہذیب
یہ عہدِ برق یہ انوار اور یہ اندھیر! — زبانِ سیف سُنائے فسانۂ تہذیب
غلام ساز کا مقصد غلام سازی ہے — مگر کیا ہے خرد نے بہانۂ تہذیب
وہ کُرد ہو کہ کوئی آفریدی و شامی — ہر ایک آج ہے اوچھا نشانۂ تہذیب

مقدمہ نہ قیامت کا ہوں یہ تمہید میں
کہ زلف جہل ہے اور سخت شانۂ تہذیب

سوادِ جہل سے ہے آہِ آتشیں پیدا
سُلگ اُٹھے نہ کہیں آشیانۂ تہذیب

ہے اِن کے خون سے پُر جامِ شرق و مغرب
شکارگاہِ کُل اقوامِ مشرق و مغرب

"سرِ دلبراں"

میں ذکر اس کا کروں کیا جو ہے مثیلِ نہنگ
بنائے نوحہ و ماتم بہ پردۂ دف و چنگ

وہ مستبد کہ زمانہ ہے جس کا شکوہ طراز
وہ جنگجو کہ خموشی ہے جس کی صوتِ جنگ

وہ ظالموں کا خدا ظلم پروروں کا خدا
وہ جس کے ظلم و ستم سے ہے ایشیا دل تنگ

جگر ہو چین کا یا دل ہو ترک و افغاں کا
ہر ایک سینہ میں پیوست ہے اسی کا خدنگ

نئے تمدن و تہذیب کا وہ دل دادہ
جسے محبتِ انساں ہے باعثِ صد ننگ

قمارخانۂ اقوام کا وہ صدر نشیں
بساطِ مشرق و مغرب ہے جس کی چال پہ دنگ

وہ پیر میکدۂ قیصری وہ میکش زر
کہ جس کے جام میں لبریز ہے مے صد رنگ

کوئی غریب سرِ رہگزر یہ کہتا تھا
کہ اس نے چوس لیا خون سارے شرق کا

(۲)

وہ ایک تاجرِ صد حیلہ باز و عربدہ ساز
ہوا و حرص و شہنشاہیت کا نغمہ طراز

وہ راہزن پسِ دیوارِ عظمت و حکمت
وہ خود ہی موجدِ قانون خود سیاست باز

وہ علم و حلم کے پردے میں وہ پیامِ استعار
وہ سیم و زر کے اجالوں میں ایک بادہ نواز

وہ جسکے زیر اثر ہند و مصر اور عراق
وہ جسکے زیر نظر ارض روم و شام و حجاز

محیطِ بحر و بر اس کا جلال طوفانی
غرورِ مغرب و مشرق وہ اک خدائے مجاز

وہ جس کا سرِ سیاست کوئی سمجھ نہ سکا
وہ جس کی ظاہری شانیں ہیں ایک عالم راز

وہ پاسبانِ کلیسا ندیمِ دیر و حرم
کہ ظلم جس کا ہے ایمان، جبر جس کی نماز

جہاں کو آتش و خوں میں ڈھکیلنے والا
وہ بربریتِ انساں سے کھیلنے والا

یہ بادہ خوار ہیں سب ان کا ایک ساقی ہے
جو اپنی قدرت و عظمت کے ساتھ باقی ہے

برابر اس کی نظر میں ہیں شاہ اور گدا
سب اس کو ایک ہیں ہندی ہے یا عراقی ہے

ہے صرف اس کے اشارے پہ قائم و باقی
کوئی نظام جو شخصی ہے یا وفاقی ہے

حصول کیف کو سمجھا ہے جاوداں سب نے
مگر در اصل یہ اک امرِ اتفاقی ہے

کوئی یہاں متردد ہے اور کوئی خاموش
کسی میں جذبۂ مغرورِ طمطراقی ہے

نشاطِ زیست کی بدمستیاں معاذ اللہ
ہے صلح کوش کوئی اور کوئی نفاقی ہے

یہاں ثبات کہاں جام و ساغر و مے کو
نظامِ میکدۂ دہر افتراقی ہے

نہ بادہ خوار رہیں گے نہ یہ صدا باقی
رہیگا صرف وہ ساقیِ میکدا باقی

اُسی کے نام پہ لبریز اپنے جام کرو
پھر ایک جشن محبت کا اہتمام کرو

شراب عشق و محبت ہو ہر پیالے میں
بقدرِ ذوق و مساوات انتظام کرو

بیگا خون یہ توپ و تفنگ سے کب تک؟ خدا کیواسطے اب بند قتلِ عام کرو
سکون و امن میں تسکینِ بحر و عالم ہے بلند زندگیِ جنگ کا مقام کرو
حدیثِ میکدہ چھیڑو نئے طریقے سے اب اس فسانۂ فرسودہ کو تمام کرو
پیو پلاؤ بہاؤ شرابِ گل افروز تمام عالمِ انساں کو لالہ فام کرو

شرابِ کیفِ اخوت سے مست ہو جاؤ
وفا پسند محبت پرست ہو جاؤ

ساغر نظامی

اقوال مہاتما گاندھی

تنقیدِ شاہدہ نفس کا ذریعہ ہوتی ہے۔
ترکِ املاک ـــــ کے لئے قطعی انقلابِ خیال کی ضرورت ہے۔
اگر انسان خاندان کے مفہوم کو وسیع کر دے تو اس کے ملک پر بھی اس کے گھر اور اس کے ہم وطنوں پر
بھی اہل خاندان ہونے کا انطباق ہو سکتا ہے۔
نفرت جرم سے کرو مجرم سے نہ کرو
اصل سوال یہ نہیں ہے کہ آدمی کیا چیزیں کھاتا پیتا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ وہ دماغ سے کیا بات نکالتا ہے
شاعر وہ ہے جو انسان کے دل میں سوئی ہوئی نیکیوں کو جگا دے۔
خیال پر پورا قابو "برہمچاریہ" کی جان ہے۔
کامل تسلیم و رضا کے بغیر خیال پر پورا قابو حاصل ہونا محال ہے۔
نیکی روح کی خلقی صفت ہے۔
فطرت سے ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے جتنے تجربے اور قربانیاں کی جائیں کم ہیں۔
تعلیم میں تہذیب کا خیال رکھنا سب سے مقدم ہے۔
تعمیرِ سیرت تعلیم کی بنیاد ہے۔
گناہ ہولناک شئے ہے۔
جو شخص دوسروں کو دھوکا دیتا ہے وہ ایک دن خود دھوکا کھاتا ہے۔
عہد ایسا ہونا چاہیے جس میں نفس لئیم کو بہانہ سازی کی گنجائش نہ رہے۔
کسرِ نفس ترکِ خودی کا نام ہے اور ترکِ خودی دراصل موکش (نجات) ہے۔
چھوٹی چھوٹی باتوں میں حقارت و دل آزاری کا برتاؤ ہو تو چپ چاپ سہہ لینا چاہیئے۔
نڈر ہونے کے ساتھ حفظِ مراتب کا بھی خیال رکھو یہ فرض ہے۔

جو اپنا فرض ادا کرتا ہے اس کا حق خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔
اُمیدیں پوری نہیں ہوتیں تو اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔
کسی چیز کی فکر نہ کرو!
یہ خیال کہ ہم حق کے راستے پر ہیں کبھی نہیں ہرا سکتا۔
جمہوریت کی اصلی ضمانت یہ ہے کہ لوگ انکو اپنا نمائندہ بنائیں جو نیک و سچے ہوں۔
یہ ہر قوم کا خداداد حق ہے کہ وہ عہد شکنی کی صورت میں حکومت کے ساتھ اتحادِ عمل سے انکار کر دے
ہماری خدمتِ وطن کا مقصد دوسروں کو لوٹنا نہیں ہے (البتہ) ہم خود لٹنا نہیں چاہتے۔
سچے کا ساتھی خدا ہے۔
کسرِ نفس ترکِ خودی کا نام ہے اور ترکِ خودی دراصل موکش (نجات) ہے یہ کوئی عمل نہیں ہے بلکہ وہ مقصد ہے جس کے لئے اور اعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر خدمت یا نجات کا طالب کسرِ نفس سے محروم ہے تو اس کی طلب جھوٹی ہے بغیر کسرِ نفس کے خدمت خود غرضی بن جاتی ہے۔
انسان کی زبان جب خدا کی کارسازیوں کو بیان کرتی ہے تو اسے ناقص طریقے سے بیان کرتی ہے۔
انسان کی جسمانی حالت بڑی حد تک اس کی نفسی کیفیت کی تابع ہے۔
روحانی قوت سے شب و روز جذبات کو مغلوب کرنا مشکل ہے اور جسمانی قوت سے دُنیا کو فتح کرنا سہل ہے۔
اپنے دشمنوں پر محبت کے ذریعے کامیابی حاصل کرو صداقت کا دھرم یہی ہے کہ دوستی کے ہاتھ کو کبھی نہ جھٹکو۔

قطب جنوبی میں نئی زمین کی تلاش

(F. Drake) فرانسس ڈریک نے قطب جنوبی میں سب سے پہلے قدم رکھا تھا۔ مگر وہ قطب جنوبی کی تمام سرزمین کو معلوم نہ کر سکا تھا اس لئے اب یہ دوسرا وفد انگلستان سے Britishgraham land (برٹش گریہم لینڈ وفد کے نام سے) Ex pedito پنولا (Penola) نامی جہاز میں بسرکردگی مسٹر جان رے مِل (J. Rymill) قطب جنوبی کو روانہ ہوا ہے۔ اس وفد کو یہ امید ہے کہ فاک لینڈ (Falkland) کے مشرق میں کم از کم ایک ہزار میل زمین نئی معلوم ہو جائیگی اور اس پر یہ اپنا قبضہ کر سکیں گے۔ اخبار لندن "ٹائمس" کا نامہ نگار خصوصی جو اس وفد کے ہمراہ ہے لکھتا ہے کہ :۔

۱۱ نومبر ۱۹۳۵ء کو پورے باسٹھ دن کے پانی پر چلنے کے بعد ہم مانٹی وڈیو (Monte vedo) پہنچے۔ مسٹر رے مِل کا ارادہ بالکل سیدھے جانے کا تھا مگر نہ چل۔ مڈیرا پر کچھ گھنٹہ اس لئے ٹھیرے کہ وہاں اُتر کر لندن سے لاسلکی کا سامان منگوانا تھا۔ یہاں سے ہم نے کھانے کا تازہ سامان اور پانی بھر لیا۔ میڈیرا سے روانہ ہو کر ہمیں ذرا سی تکلیف صرف خطِ استوا کے جنوب میں پیش آئی تھی پھر تو موسم ہر جگہ برابر خوشگوار رہا ہم نے تو پہلے ہی سے اپنے مُشیر مسٹر میک (Meek) کی ہدایات کے بموجب جہاز کا پچھلا حصہ برف کے مقابلہ کیلئے زیادہ مضبوط کر لیا تھا مگر جہاز میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوا اور (Trade winds) شمالی ہوا کے کم چلنے کی وجہ سے جہاز انجن کے ذریعہ چلایا گیا۔

یہ پہلے ہی سے طے کر لیا گیا تھا کہ اس وفد میں کوئی شخص تنخواہ دار نہ ہوگا اس لئے یہ جہاز لفٹنٹ آر۔ ای۔ ڈی رائڈر (Ryder) کے زیر حکم چلایا گیا۔ اور وفد کا کام مندرجہ ذیل اصحاب میں منقسم ہوا۔

مسٹر مارٹن۔ افسر انچارج چوکیداری و مشاہدۂ قطب۔ لفٹنٹ رائڈر ان کے نائب۔ لفٹنٹ مِلٹ چیف انجنیر اور مسٹر مُور (Moore) .... نائب انجنیر۔ لفٹنٹ ہکل جان لاسلکی کے ماہر مسٹر گُرنے معدنیات اور ارضیات کے ماہر۔ پادری فلیمنگ صاحب۔ وفد کے پیش نماز۔ مسٹر رابرٹس پرندوں کے ماہر۔ مسٹر ریلے۔ فلکیات اور موسم کے ماہر مسٹر۔ برٹرام نباتات اور حیوانات کے ماہر۔

ہر ایک کو ان میں سے چار چار گھنٹہ جہاز پر کام کرنا ہوتا ہے اور وہ کام یہ ہے کہ رات کو محض جہاز رانی اور دن کو جہاز کے رسّوں اور لوہے کے حصوں ستونوں اور بلیوں وغیرہ اور چھت کے تختوں پر تیل چربی رنگ وارنش ملیں۔

جب موسم اچھا ہوتا ہے اتوار کو تعطیل مناتے ہیں۔ علی الصباح نماز سے فارغ ہو کر دن بھر کپڑے دھوتے غسل کرتے۔ کپڑے سیتے اور روزنامچے لکھنے میں وقت خوب گزرتا ہے۔

ہم میں سے بہت سے جہاز رانی میں پہلے سے تجربہ کار نہیں ہیں تاہم بسا اوقات ہمارا جوش و خلوص ہماری ناتجربہ کاری اور بھونڈے پن پر اس طرح غالب آ جاتا ہے کہ ہمیں خود حیرت ہوتی ہے ہمارے وفد میں جو سائنس کے ماہر ہیں اُنہوں نے ابتداء ہی میں ہمیں جمع کر کے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کس کس کو کیا کیا کرنا ہوگا۔ کچھ دن ہوئے کہ قسم قسم کے رنگین پرندے چڑیاں۔ تتلیاں۔ بھونرے۔ مکھے ہمارے جہاز پر آکر بیٹھے تھے ان میں سے ایک کافی تعداد ہم نے پکڑ لی ہے۔ اس ماہ کے آخر تک ہم اُمید کرتے ہیں کہ اسٹنلی بندر پہنچ جائیں گے۔

عنایت علی بی اے

"(ترجمہ)"

کہنے کی باتیں

ایک روسی افسانے کا آزاد ترجمہ

مترجمہ
نروتم پرشاد ناگر

"یہ دلچسپ افسانہ انقلاب روس سے قبل کی سیاسی و مجلسی حالت کا آئینہ دار ہے اور اس فضا کو پیش کرتا ہے جو روس میں انقلاب ہونے سے پہلے تیار ہو رہی تھی یہ وہ وقت تھا جبکہ عوام و خواص میں ایک نئے خیال کی آفرینش نے بیتابی و بے چینی پیدا کردی تھی لیکن باوجود اسکے انقلاب کی تمام مشینری کا اخراج نہیں تھی اور لوگ تجربہ کے طور پر ترک اختیار کے پھیر میں پڑے ہوئے تھے۔ روس اور ہندوستان کے انقلاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ روس میں تمام جنگ شہنشاہیت کے خلاف تھی اور کارل مارکس کا نظریۂ اشتراکیت ایک نیا جمہوری نظام پیش کر رہا تھا۔ اس کا مقصد مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم کرنا تھا اور ایک عام مساواتی نظام جس کی بنا پر اقتصادی مساوات قائم ہو سکتے۔ لیکن ہندوستان میں انقلاب کی یہ نوعیت نہیں ہے اور عام طور پر ساری جنگ سرمایہ داری کے خلاف نہیں لڑی جا رہی ہے بلکہ محض آزادی اور غلامی کی جنگ ہے جس کے وجوہ و اسباب بہت کچھ اقتصادی ہیں۔ ہر چند کہ اس جنگ کی بنیاد ہی مقابلے اور برابری کے مضبوط احساس پر قائم ہے لیکن اشتراکیت پر ہرگز نہیں ہے۔ آزادی چاہنے والے انفرادی زمینداری کے خلاف جنگ نہیں کر رہے ہیں اور نہ ان کے محسوسات اس قدر ترقی یافتہ ہیں تاہم وہ جنگ مساوات اور مزدوروں اور غریبوں کے نام پر ہی کی جا رہی ہے۔ لیکن اس وقت تک عام طور پر انفرادی افضلیت کے زعم باطل کے سنگین بت کو قطعی طور پر پارہ پارہ نہیں کیا گیا ہے۔ ان حالات میں یہ افسانہ بہت ہی دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ اس فسانے کو انگریزی زبان سے ہمارے دوست مسٹر نروتم پرشاد ناگر نے کمال محنت سے ترجمہ کیا ہے۔ ناگر صاحب ہندی دنیا کے نہایت مقبول ادیب ہیں اور وشال بھارت جیسا مقبول و بلند رسالہ انکے مقالات احترام کے ساتھ شائع کرتا ہے۔ نروتم پرشاد صاحب ناگر نے "ایشیا" کیلئے ہندی لٹریچر کے بہترین نمونوں کو اردو میں منتقل کرنے کا ذمہ لیا ہے اور ان کی فرض شناسی سے مجھے یقین ہے کہ وہ ہر وقت اپنی ذمہ داری کو محسوس کرینگے کیونکہ وہ اہل دماغ، اہل قلم اور فرض شناس نوجوان ہیں"

"ساغر"

آٹون آیچ ایک سرکاری افسر تھا۔ روس اُن دنوں انقلاب کی آگ میں تپ رہا تھا۔ چاروں طرف سدھار اور پریورتن کی دھوم مچی ہوئی تھی روسی عوام کے رہنما نئے عقیدوں کا پروپیگنڈہ کر رہے تھے ان کی ہر ایک بات میں انسانیت، محبت اور بھائی چارے کی شیرینی ملی ہوتی تھی جو بغیر کسی رکاوٹ کے حلق سے اُتر کر رگ رگ میں دوڑ جاتی تھی۔ آٹون آیچ پر بھی ان عقائد کا اثر ہوا اثر ہی نہیں بلکہ وہ پسند بھی کرنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ انہیں عملی جامہ پہنا کر بھی دکھا دینا چاہتا تھا۔ لیکن خیال کو عمل بنانے کے لئے ابھی اُسے کوئی جائز موقع نہیں ملا تھا۔ اپنے دوستوں سے جو کہ عموماً سرکاری افسر ہی ہوتے تھے وہ اپنے خیالات کو ظاہر کیا کرتا تھا لیکن نہ وہ سب اس کی ہنسی اُڑاتے اور اس کو باتونی کہا کرتے تھے۔

آج اس کے ایک دوست نے اپنی سالگرہ کی خوشی میں اسے دعوت دی تھی اور بھی بہت سے حکام اس دعوت میں شریک ہوئے اور حسب معمول اچھا خاصہ میخانہ بھی جاری تھا خوب دور پر دور چل رہے تھے۔ عادت نہ ہونے پر بھی آٹون آیچ کو کئی گلاس پینے پڑے یہاں بھی انسانیت، محبت، بھائی چارہ اور اشتراکیت کی روحانی بحث شروع ہوگئی تھی۔

آٹون آیچ ایک طرف تھا اور باقی سب دوسری طرف، تمام مدعوین نے مل کر اس کا خوب مذاق اُڑایا۔ خوب بنایا اُن کا خیال تھا کہ یہ جہلا اور دہقانیوں کو بہکانے کی باتیں ہیں انہیں عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ کسوٹی پر اگر یہ سونا کھرا اُترے تب ہم جانیں، یوں باتیں بنانے سے کیا ہوتا ہے

آٹون آیچ جب دعوت گاہ سے چلنے لگا تو معلوم ہوا کہ اس کی گاڑی موجود نہیں ہے اُسے اطلاع دئے بغیر ہی اس کا نوکر اس کی گاڑی کہیں لے گیا ہے۔ اس کے دوستوں نے صلاح دی کہ نوکر کو پکڑ بلایا جائے اور اس کی گستاخی پر اس کے کوڑے لگائے جائیں۔ لیکن آٹون آیچ نے اس صلاح نیک کو ٹھکرا دیا اور پیدل چلنا ہی گوارا کیا۔

موسم اچھا تھا ہی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی، سر در گٹھ رہا تھا اور اس کے ساتھ نیرنگی تخیل کا طوفان۔

کتنی خوشگوار رات ہے اور اس خوشگوار رات کے اندھیرے میں یہ چھوٹے چھوٹے مکانات کتنے اچھے معلوم ہو رہے ہیں ان گھروں میں چھوٹے آدمی دفتروں کے کلرک اور لباطی وغیرہ رہتے ہونگے ان لوگوں سے اگر میں بھلے آدمیوں کی طرح رحم و محبت سے پیش آؤں تو کیا میری طرف رجوع نہ ہونگے کیا مجھ سے مخاطب نہ ہونگے ؟! ——— ہونگے، اور ضرور ہونگے بلکہ مجھ سے محبت کرنے لگیں گے لیکن مجھے یہ ہو کیا گیا ہے میں اپنے خیالات کو ترتیب بھی نہیں دے سکتا کمبخت شراب کا یہی اثر ہوتا ہے۔ میں اب کبھی نہیں پینے کا اور اس سے فائدہ ہی کیا ہے شام کو اُڑائی، خوش ہوگئے۔ صبح ہوئی توبہ کرنے لگے ——— لیکن میں چل تو ٹھیک رہا ہوں ——— میرے پاؤں تو نہیں لڑکھڑا رہے ہیں !؟!

یہ اور اسی قسم کے خیالات میں الجھا ہوا وہ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ اس کے کانوں میں گانے بجانے کی آواز آئی اس نے چاروں طرف دیکھا گلی کے اس طرف ایک ٹوٹے ہوئے مکان سے وہ آواز آرہی تھی دروازے پہ باہر سے کچھ عورتیں دروازے کی درازوں میں جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے، پاس ہی ایک سپاہی کھڑا تھا اس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آلون کے دفتر کے ایک چھوٹے سے، صرف دس روبل ماہوار پانے والے ایک کلرک سیلڈ یمو کی شادی کا جشن ہو رہا ہے۔

بھلا اس سے اچھا اور کونسا موقع ملیگا کہ میری جیسی حیثیت کا آدمی لاکھ بار شرکت کا پروانہ ملنے پر بھی سیلڈیمو جیسے معمولی آدمی (کہنا تو چاہئے جانور ہی) کے مکان پر نہیں جا سکتا لیکن میں اس ناممکن کو ممکن کرکے دکھاؤں گا اور سب کے روبرو ایک زندہ مثال پیش کروں گا۔

وہ اسی اُدھیڑ بن میں تھا اور اس کے علاوہ اپنے تخیل میں ایک دوسری ہی دنیا کی سیر کر رہا تھا نشے کی حالت میں اس کی خیالی دنیا کی دھندلی تصویریں سچی اور جیتی جاگتی تصویروں کے مانند

اس کے سامنے آنے لگیں؛ اس نے دیکھا کہ روس کی کایا پلٹ ہوگئی ہے اور آتشکدۂ انقلاب سے نکل کر وہ اور بھی کھرے سونے کی طرح چمکنے لگا ہے۔ زار کا ظالمانہ اور وحشیانہ دور ختم ہوچکا ہے اور انقلاب کی خوشی میں جابجا جشن ہائے مسرت منائے جارہے ہیں اور کہیں روس کے مقدس و محترم رہنماؤں کے ترانے گائے جارہے ہیں ــــــــــــ

یہی سب مناظر دیکھتا ہوا جارہا تھا کہ ایک جگہ رُکا یہاں اس کا ہی ذکر ہورہا تھا۔

ہاں اور اُس نے (یہاں اس کا نام لیا گیا) ہمارے لئے کیا کچھ قربانیاں نہ کیں اس کے بعد ایک معمولی ترین کلرک کی شادی میں شریک ہونے کے قصے کو بڑے دلچسپ طریقے اور خوبصورت لفاظی کے ساتھ سُنا۔"

یہ سب سن کر اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بہت بڑا آدمی ہوگیا ہے اور اس کا سر غرور سے بلند ہوگیا وہ آگے بڑھا چوراہے پر جاکر اس نے دیکھا اس کی ان قربانیوں کے عوض جو اس نے اپنے وطن کے لئے کی تھیں اس کا ایک بُت نصب کیا جارہا ہے

خیالات کی اسی دُنیا کی سیر کرتے ہوئے اُس نے عزم بالجزم کرلیا کہ وہ اس شادی میں ضرور شریک ہوگا اِسے ایسا محسوس ہوا کہ اپنے عقائد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس سے بہتر موقعہ اور کوئی نہ ملے گا اب اس کے خیالات کی پرواز کا رخ تبدیل ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ مکان کے اندر داخل ہوگیا ہے اس کے پہنچتے ہی گانا بجانا بند ہوگیا۔ سب کی سٹی گم ہوگئی۔ سیلڈ ونیمو کی تو یہ حالت ہوئی۔ وہ اس طرح حیرت میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا جیسے اسے لقوہ مار گیا ہو۔

"لیکن اس حالت میں میں زیادہ عرصہ تک ان کو نہیں رہنے دوں گا اور بہت جلد ان کے خوف کو اپنے پیار اور محبت بھری باتوں سے دور کردوں گا، میرے عقائد کی سچائی کو محسوس کرنے کے بعد وہ سب میرے ساتھ اسی طرح گھل مل کر باتیں کرینگے جس طرح کہ اپنے ہم پایہ آدمیوں سے کرتے ہیں!"

یہ سب باتیں سوچ کر وہ گھر میں داخل ہوا، اس کی فوجی وردی کو دیکھکر کسی کو اُسے ٹوکنے کی ہمت نہ پڑی۔ راستے کی چیزوں کو ٹھوکر سے دھر اُدھر ٹکراتے ہوئے (آٹون ایچ سے یہ تمام حرکتیں غیر ارادی طور پر بے خودی میں ہوئیں اسی لئے اُسے افسوس بھی ہوا) وہ اس مقام پر پہنچا جہاں گانا ہورہا تھا۔

جو کچھ اس کو اندیشہ تھا اور جو کچھ اُس نے سوچا تھا وہی ہوا، اُس پر نظر پڑتے ہی جو جہاں تھا وہیں ساکت ہوگیا۔ رقاص جوڑوں کے قدم خود بخود رُک گئے اور تمام لوگ اس نووارد کو دیکھنے لگے پھر آہستہ آہستہ عقب میں کھسکنے لگے لوگ جو نووارد کی اہمیت و حیثیت سے واقف نہیں تھے اور بے بہرہ تھے اُنہیں ہاتھ کے اشارے کپڑا کھینچ کر یا کہنی کے اشارے سے بتا دیا گیا کہ آنے والا ایک بڑا آدمی ہے، افسر ہے، ہوشیاری سے تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ جائے ــــــــ ۔ کھڑے ہوجاؤ کوئی بیہودگی نہ ہونے پائے۔

آٹون ایچ ابھی ڈیوڑھی کی چوکھٹ ہی پر کھڑا تھا اس کا ایک قدم ڈیوڑھی میں اور ایک آنگن میں تھا اور چند لمحوں تک تمام حاضرین سکتے کے عالم میں کھڑے رہے آخر ایک نوجوان جس کے بال بھورے اور ناک نکیلی تھی آگے بڑھا وہ مرعوب اور خوفزدہ نگاہ سے آٹون ایچ کو اس طرح دیکھنے لگا جس طرح کوئی کتا جس پر کوڑے پڑنے والے ہوں اپنے مالک کی طرف دیکھتا ہے

"کہو سیلڈ ونیمو کیسے ہو؟ مجھے پہچانتے تو ہوگے؟" آٹون ایچ نے کہا لیکن یہ کہنے کے ساتھ اُسے بے اختیارانہ طور پر محسوس ہوا کہ آغازِ گفتگو بیہودہ ہے اور اس کو ایسے بھدے طریقے سے بات چیت نہیں کرنی چاہئے۔

ہاں ــــــ سر ــــــ کا ــــــ ر ایلڈ ونیمو کی خوفزدہ زبان سے نکلا

اچھا میرے دوست! میرے یہاں آنے سے تمہیں حیرت تو ضرور ہوئی ہوگی!؟

سیلڈ ونیمو کوئی جواب نہ دے سکا، جواب دینے کے لئے اس کا دماغ کام ہی نہیں کررہا تھا۔ خوف زدہ باہر نکلی ہوئی آنکھوں سے وہ صرف آٹون ایچ کی طرف دیکھتا رہا گویا کوئی عظیم اور خطرناک آفت آنے والی ہے۔

سیلڈ ونیمو کی خاموشی سے آٹون ایچ کو اور بھی کشمکش میں ڈال دیا اور اس کی حالت کو اور بھی بے ڈھنگا بنا دیا۔ اُس نے محسوس کرلیا کہ اس کا یہاں آنا مناسب اور برمحل نہیں ہے اس احساس کے بعد اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ کمرہ کی ہر شے اُسے ایک غیر ضروری مہمان خیال کررہی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کو اندازہ ہوا کہ اس کا دماغ کچھ زیادہ چکرایا جارہا ہے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو بجا طور پر ادا نہیں کرسکتا۔ اس سے سڑک پر جن تصورات میں دل کو خوش کیا تھا اُن سب پر پانی پھرتا نظر آیا۔ وہ کچھ بے چین ہوگیا تھا لیکن پھر کچھ سنبھل کر اس نے کہا۔

میں سمجھتا ہوں میرا یہاں آنا آپ کو ناگوارِ خاطر نہ گزرا ہو گا۔ اگر میرے داخلے سے آپ لوگوں کو زحمت ہوئی ہو تو میں واپس چلا جاؤں"۔

سیلڈ ونیمو چونک پڑا، جیسے بیہوش انسان کو یکایک ہوش آجائے۔ اتنا بڑا مہمان گھر آیا ہے اور وہ اب تک کچھ نہیں کرسکا ہے اِس خیال کے آتے ہی اس نے خود کو اور قریب رکھے ہوئے صوفے کی طرف دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے اس نے کہا۔

"نہیں سرکار آپ نے مجھ ناچیز کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں قدم رنجہ فرما کر مجھے غیر معمولی عزت بخشی ہے۔

آٹون ایچ کے دل سے ایک بوجھ سا اتر گیا صوفے پر بیٹھکر اُسے کچھ تسکین محسوس ہوئی اس نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی اس کے علاوہ اور سب کھڑے تھے۔ یہ اُس کو برا معلوم ہوا ان سب کو اپنے عقائد سمجھانے کا اور ان عقیدوں کے عملی پہلوؤں کی زندہ مثال پیش کرنے کا موقع تو اچھا تھا لیکن بعد کوشش بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ کہنا چاہتا تھا مگر نہ کہہ سکا، وہ یہ تک طے نہ کرسکا کہ آخر وہ کہے کیا؟ اس کی زبان نے ایک حرف ادا کرنے سے انکار کردیا تھا اور یہی نہیں اس کا دماغ بھی اس کی زبان ہی کا ساتھ دے رہا تھا، عجیب کشمکش تھی۔

"اچھی آفت میں پھنسا، اس سے کیونکر چھٹکارا ہو"

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس عجیب حالت سے چھٹکارا پانے کے لئے اسے ایک سہارا مل گیا۔ یہ سہارا تھا دفتر کا ہیڈ کلرک جو ابھی سیلڈ ونیمو کے برابر آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ اُسے دیکھکر آٹون ایچ کو سکون ہوا، اس نے تسکین کا ایک سانس لیا۔

یہ نہ سمجھئے کہ دفتر کا ہیڈ کلرک اس کے دوستوں میں سے تھا، یہ بات نہیں ہے بلکہ "ضرورت ایجاد کی ماں" ہے وقتی طور پر اس کو دوست بنا لیا گیا اور اس کے بعد آٹون ایچ کا دل کھلا اور اُس نے گفتگو کرنی شروع کی۔

اسے جو کچھ کہنا ہوتا وہ ہیڈ کلرک سے کہتا اور ہیڈ کلرک دیگر مہمانوں تک اس کی بات پہنچا دیتا۔ بہ الفاظِ دیگر ہیڈ کلرک ہم وطن و ہم زبان ہونے کے باوجود اس کے اور دوسرے مہمانوں کے درمیان "ترجمان" کا کام کررہا تھا۔

اب کمرے میں بھی جان سی پڑنے لگی، تکلف کے پردے اُٹھ گئے۔ خوف نے اپنے پنجے ڈھیلے کرنے شروع کئے نووارد مہمان کی آمد میں اس کا استقبال کرنے کے لئے ہیڈ کلرک

کے لبوں پر ہلکے تبسم کی ایک جھلک نمودار ہوئی کتنی ہی نازنین جواب تک کھڑی تھیں بیٹھنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ ایک نے بڑی جرأت و ہمت سے کام لیکر اپنے رومال سے ہوا کرنی شروع کی بعض نے دبی ہوئی آواز میں گفتگو بھی کرنی شروع کی۔ ایک صاحب بہت زور سے بولنے لگے لیکن کمرہ بھر میں اپنی ہی آواز کو گونجتے ہوئے دیکھکر خاموش ہو گئے۔

اسی دوران میں ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی وہ قد کی چھوٹی اور بدن کی موٹی تھی گلے میں رومال اور سر پر ٹوپی پہنے ہوئے تھی جسے وہ عید اور شب برات کے دن ہی استعمال کرتی تھی اس کے ہاتھوں پر ایک گول تھالی تھی جس میں شراب کی دو بوتلیں اور دو گلاس رکھے تھے یہ بوتلیں بطور خاص و مہمانِ عزیز کے لئے منگائی گئی تھیں بقیہ پارٹی کا انتظام کیا گیا

آتون ایچ کے پاس پہنچکر اس نے کہا۔

سرکار نے میرے لڑکے کی شادی میں شرکت کرکے مجھے تاریخی اہمیت بخشی ہے جبتک اس خاندان میں کوئی نام لیوا باقی رہیگا، اُس وقت تک آپ کا نام زبانوں پر رہیگا آپ جیسے معزز اور عظیم ہستی کی میں خاطر تو کیا کر سکتی ہوں، پھر بھی جو روکھا سوکھا ہے اسے منظور فرماکر اس ناچیز کو عزت بخشئے۔

"اچھا تو تمہیں سیلڈ و نیمو کی والدہ ہو!؟

صوفے سے اُٹھتے ہوئے آٹون ایچ نے کہا۔

ہاں سرکار یہ میری ماں ہیں، سیلڈ و نیمو نے گردن جھکا کر کہا۔

"مجھے تم سے مل کر بہت مسرت ہوئی"

تو میں سمجھتی ہوں کہ میری درخواست منظور ہوئی سیلڈ و نیمو کی ماں نے گھٹنے جھکاتے ہوئے کہا سیلڈ و نیمو نے آگے بڑھکر بوتل اٹھالی اور ایک گلاس آٹون ایچ کو اور دوسرا ہیڈ کلرک کو پیش کیا

آٹون ایچ کا یہ ساتواں گلاس تھا نشہ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جیسے گھی کی آہوتی پڑ جائے، پیتے ہی نشہ تیز تر ہو گیا۔ پھر بھی ابھی کسر تھی۔ ایک آدھ گلاس کی نہیں بلکہ چند لمحوں کی، ان چند لمحوں کے گزرتے بھی دیر نہ لگی چنانچہ آٹون ایچ کو محسوس ہوا کہ اس کی زبان سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے ہیں۔ وہ کہنا کچھ چاہتا ہے اور نکلتا کچھ ہے اس کی زبان ہی نہیں ہوتی "سب ٹھیک ہو جائیگا" اور ایک گلاس ڈھال کر چڑھا گیا، وہ چاہتا تو نہیں تھا کہ زیادہ پیے مگر ان ہاتھوں کو کیا کرے جو خود بخود بوتل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ اس بیہوشی میں اس کو ہوش آیا اور اصلاح و ترقی محبت و اشتراکیت کے نظارے اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے اسے محسوس ہوا کہ اس وقت اگر اس کا کوئی دشمن بھی آ جاتا تو گلے لگا لیتا۔ اس نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اب وہ اپنی قوم کے لئے، اپنے ملک کے لئے۔۔ بہت کار آمد ثابت ہوگا۔

—————— آہستہ آہستہ محبت اُنس، اصلاح اور ترقی کی دنیا غائب ہو گئی صرف آٹون ایچ سامنے رکھی ہوئی میز کے سہارے پڑا رہ گیا پھر کچھ دیر کے بعد اس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا اس کے پاؤں نے کام نہ دیا اور وہ کرسی سے لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا۔

رنگ میں بھنگ ہو گئی، سیلڈ و نیمو کی بُری حالت تھی غریب نے سوچا تھا کہ بڑا افسر آیا ہے ممکن ہے کہ اس کی ذات سے اسے کچھ فائدہ ہو جائے اور بہت ممکن ہے کہ اس کا مستقبل سُدھر جائے اور اس کے دن پھر جائیں، یہی سب کچھ سوچکر اور مجبوراً بھی اس نے جیسے تیسے قرض دام لیکر اس کے لئے بڑھیا شراب منگائی لیکن اس کی امیدوں کا انجام اور اس کا متخیلہ فائدہ جس شکل میں نمودار ہوا اس کے لئے وہ تیار نہیں تھا —————— یہ سب کچھ دیکھکر اس نے اپنا سر پیٹ لیا اور اس کی حالت بہت بُری ہو گئی۔

سیلڈ و نیمو کی نوکری کو ابھی پانچ چھ مہینے ہی ہوئے تھے اس سے پیشتر اور اپنے باپ کے فوت ہو جانے کے بعد وہ اور اس کی ماں بے یار و مددگار رہ گئے تھے۔ انہیں اپنے مستقبل میں علاوہ تاریکی اور در در ٹھوکریں کھانے کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ غربت کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ گھاس پھونس مل جاتا کھا لیتے، کئی بار فاقوں کی بھی نوبت آئی گھومتے گھامتے زمانے کی خاک چھانتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے پیٹرس برگ آئے۔ یہاں سیلڈ و نیمو کو دس روبل ماہانہ پر ایک جگہ مل گئی۔ وہ خود دفتر جاتا تھا اور گھر پر اس کی ماں پڑوسیوں کے کپڑے دھویا کرتی تھی کیسی نہ کسی طرح شکم پُری ہو ہی جاتی تھی اور انہوں نے اپنی کفایت شعاری سے کام لیکر کچھ جمع بھی کر لیا تھا۔ پیٹرس برگ ہی میں سیلڈ و نیمو کے باپ کے ایک دوست رہتے تھے ان کی دو لڑکیاں تھیں، دُبلی پتلی اور بیمار سی بڑی بہت دُبلی اور کمزور تھی اس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا ہو رہا تھا اس وجہ سے اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی جہیز میں آنے والی ۴۰۰ روبل کی بڑی رقم اور ایک لکڑی کے خستہ حال مکان کے سبب سیلڈ و نیمو نے اس لڑکی سے شادی کرنا منظور کر لیا وہ جہیز کے لالچ سے اپنی ذات کو بری نہ کر سکا۔

شادی کی رسم اسی لکڑی کے مکان میں ادا کی گئی، سیلڈ و نیمو نے صرف دو مہمانوں کو دعوت شرکت دی تھی جن میں سے ایک ہیڈ کلرک تھا۔ دوسرے مہمان لڑکی کے والدین کی طرف سے بلائے گئے تھے۔ اور ان کی خاطر تواضع کا بار بھی انہیں کے ذمّہ تھا۔

سیلڈ و نیمو کے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں۔ جو کچھ تھا وہ یوں ہی چٹ پٹ میں اُٹھ گیا اسی حالت میں آ نمودار ہوئے آٹون ایچ جن کی خاطر تواضع کا زیر بار ہونا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے شیمپین کی دو بوتلوں کی اسے کتنی زبردست قیمت ادا کرنی پڑی ہوگی یہ بتانا مشکل ہے۔

ہاں۔ سیلڈ و نیمو کو سر پیٹتے ہوئے دیکھ کر اس کا قیاس البتہ کیا جا سکتا ہے۔

کسی نہ کسی بہانے یکے بعد دیگرے کل مہمان کھسک گئے صرف سیلڈ و نیمو اس کی ماں اور دلہن باقی رہ گئے۔ اس بلائے ناگہانی کا ظلم سہنے کے لئے ایک بڑا افسر فرش پر بیہوش پڑا ہے یہ کیونکر گوارا کیا جا سکتا ہے۔ سیلڈ و نیمو نے پہلے تو یہ سوچا کہ کسی ڈاکٹر کی مدد لی جائے مگر ڈاکٹر کی فیس کا خیال آتے ہی اُسے یہ ارادہ بدل دینا پڑا وہ فیس کہاں سے لائے؟ پیسہ کے لئے تو اُس نے نوکروں (جو اس کی سسرال کے لئے) تک کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ مگر وہ کہاں سے دیتے جبکہ جن کے پاس پیسہ تھا انہوں نے ہی قرض دینے سے انکار کر دیا تھا تو پھر کیا کیا جائے ہوش آنے پر جب سرکار اپنے آپ کو فرش پر پائینگے تو ان کے غصہ کا کیا عالم ہوگا؟ ... ایک بار اُس نے سوچا کہ دو کرسیوں کو ملا کر بستر بچھا دیا جائے لیکن یہ بھی ٹھیک نہ ہوگا۔ رات کو کوئی ایسی ویسی بات ہوئی اور اگر کرسیاں الگ ہو گئیں تو کیا ہوگا؟ لیکن کچھ تو ہونا ہی چاہیئے پاس والے کمرے میں دولہا دلہن کے لئے ایک خوبصورت و صاف بستر کا انتظام کیا گیا تھا۔ پلنگ پر تازہ خریدا ہوا گلابی رنگ کا نیا گدا بچھا ہوا تھا تکیے بھی ہلکے گلابی رنگ کے تھے اسی پر آٹون ایچ کو لٹا دیا گیا۔

دولہا اور دلہن کے لئے ایک دوسری کوٹھری میں دو کرسیوں پر پھٹا سا کپڑا بچھا کر انتظام کیا گیا تھا۔ گھر کے دوسرے آدمی رسوئی گھر میں فرش پر ہی پڑے رہے لیکن ان سب باتوں کا یہیں پر خاتمہ نہیں ہوا ابھی تھوڑی ہی رات گزری ہوگی کہ سیلڈ و نیمو

کوٹھری سے چیخ کی آواز سنائی پڑی۔ سوتے سوتے کرسیاں الگ ہوگئیں اور دولہا دُلہن پہلی رات کو ہی اپنی بینچ سے نیچے گر پڑے۔ دل ہی دل میں دُلہن نے سیلڈو نیمو کو اور اس سے زیادہ آٹون ایچ کو کتنا کوسا ہوگا اس کا قیاس آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

سیلڈو نیمو اُٹھ بیٹھا اُس کی نیند اُچٹ گئی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات بے ترتیبانہ طور پر آنے لگے جو آتے تھے اور منتشر ہو جاتے تھے۔ سامنے ہی بس کی بینچ دو کرسیاں۔ اس کے سارے ولولوں اور اُمنگوں کا خون کرنے کے بعد اُس کے دل کو نوچ رہی تھیں۔ ایک گھنٹہ تک اُس کی یہی کیفیت رہی اور نہ معلوم کب تک رہتی اگر صبح ہوتے ہوتے اُس کی آنکھ نہ لگ جاتیں۔

ادھر نرم بچھونے پر پڑے آٹون ایچ پر بھی بُری طرح بیتی۔ رہ رہ کر وہ رات بھر ہاتھ پاؤں پھینکتا رہا اور نہ معلوم کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ آخر کار جب صبح ہونے کو آئی تو اُس کا ہاتھ پاؤں پھینکنا اور بڑبڑانا بند ہوا۔ اُس کے بعد غالباً وہ پون گھنٹہ تک خوب گہری نیند سویا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب جب اُس کی آنکھ کھلی تو وہ بالکل ہوش میں تھا۔ لیکن اس کے سر میں بُری طرح درد ہو رہا تھا۔ اور مُنہ کا ذائقہ کچھ بگڑا ہوا سا معلوم ہوتا تھا وہ بستر پر بیٹھ گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سورج کی سنہری شعاعیں کھڑکی کی درازوں میں سے ہوتی ہوئی دیوار پر پڑ کر کانپ رہی تھیں۔ یکایک رات کی باتوں کا اُسے خیال آیا۔ اُس نے صاف طور پر محسوس کیا کہ سیلڈو نیمو کی شادی کے جشن کو خاک میں ملانے کا باعث وہی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اُسے اپنے وجود سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اور شرم کی وجہ سے اُس نے اپنا مُنہ ڈھانپ لیا اُس نے طے کیا کہ وہ چپ چاپ بغیر کسی سے ملے وہاں سے نکل جائیگا۔ کسی کے سامنے پڑنے کی اُسے ہمت نہیں ہو رہی تھی سامنے ہی اُس کے کپڑے رکھے تھے۔ انہیں پہننے کے لئے جیسے ہی وہ اُٹھا کہ سیلڈو نیمو کی بُڑھیا ماں نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ ایک ہاتھ میں پانی کا برتن اور کندھے پر انگوچھا ڈالے ہوئے تھی۔ انگوچھا اور پانی کو وہیں رکھتے ہوئے اُس نے کہا ارے! آپ جا کہاں رہے ہیں۔ پہلے ذرا مُنہ ہاتھ دھو لیجئے بعد میں کپڑے پہنئے گا۔

آٹون ایچ نے دیکھا کہ جیسا سمجھتا تھا ویسا نہیں ہوا۔ سیلڈو نیمو کی والدہ سے اُسے قطعی شرم محسوس نہیں ہوئی اُسے ایسا معلوم ہوا کہ دنیا میں صرف وہ ہی ایک ایسی ہے جس سے اسے شرم محسوس نہیں ہوگی۔ پھر اُس نے منہ ہاتھ دھونا شروع کیا۔ کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں صابون کی ایک ٹکیا لپٹی تھی، جو غالباً دُلہن کے لئے منگائی گئی تھی، آٹون ایچ کو دیدی گئی۔ ٹھنڈے پانی سے مُنہ ہاتھ دھونے کے بعد اس کی طبیعت اور تازہ ہوگئی جب اُس نے گھر سے باہر قدم رکھا تو اُسے ایسا محسوس ہوا ہر ایک شخص اُسے ہی دیکھ رہا ہے اور سیلڈو نیمو کی شادی کے جشن کو خاک میں ملانے کے لئے اسے نفرت انگیز نظر سے لعنت ملامت کر رہا ہے۔

دفتر جانے کا ذکر کیا پورے ایک ہفتہ آٹون ایچ اپنے گھر سے نہیں نکلا۔ اس ہفتہ میں اُسے جسمانی تکلیف تو کوئی نہیں ہوئی لیکن اُس کی مجروح روح نے اُسے بڑا تنگ کیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اُسے دوزخ میں ڈالدیا گیا ہے کئی بار اُس نے ارادہ کیا کہ دنیاوی جھگڑوں کو خیرباد کہہ فقیرانہ زندگی اختیار کر کے خدمتِ خلق میں اپنی باقی ماندہ زندگی گزار دے لیکن تھوڑی دیر بعد اُسے یہ سب باتیں بیہودہ حرکات معلوم ہوئیں۔ لوگ اُس کی باتوں کو سُنکر اور گزشتہ شب کی حرکتوں کا ذکر سُنکر کیا کہیں گے؟ اُسے کتنی حقارت کی نظر سے دیکھیں گے اور سب سے بڑھکر اُسے اپنے ہم افسروں کے سامنے کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا، کتنا نیچا دیکھنا پڑے گا۔ .... ان سب باتوں کا خیال آتے ہی وہ پھر اپنے آپ کو بھلا بُرا کہنے لگا۔ ایک بار اس نے نوکری سے استعفیٰ دینے کا بھی خیال کیا۔ لیکن یہ خیال بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا اس کے بعد اُس نے ارادہ کیا کہ جو کچھ ہو گیا ہے اُسے وہ بھول جانے کی کوشش کریگا اور کل ہی سے اپنے فرائض کے انجام دینے کے لئے دفتر جانے لگے گا۔

آٹون ایچ اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ کاغذات کی اُلٹ پلٹ میں وہ اپنے آپ کو ایک دم محو کر دینا چاہتا تھا کہ دفتر کا ہیڈ کلرک سرکاری کاغذات لئے ہوئے دفتر میں حاضر ہوا۔ آٹون ایچ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو روک لیا اور پھر جائز سنجیدگی کے ساتھ ہیڈ کلرک کو کاغذات کے متعلق جو سمجھانا تھا سمجھا دیا۔

ہیڈ کلرک وہاں سے جانا ہی چاہتا تھا۔ مگر جاتے جاتے ٹھہر گیا۔ مُڑ کر اُس نے کہا۔

"سرکار ایک گزارش اور ہے۔ سیلڈو نیمو اپنا تبادلہ کرانا چاہتا ہے۔

کہنے کو تو آٹون ایچ نے کہہ دیا۔ ہاں مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا میں ضرور کر دوں گا مگر سیلڈو نیمو کا نام سنتے ہی اُسے سب باتیں یاد آئیں۔ اب اُس کی شرم نے غصہ کی شکل اختیار کر لی۔ اُس نے کہا

کچھ نہیں! اس طرح کام نہیں چلے گا۔ مجھے خوب سختی سے کام لینا چاہئے۔ دراصل یہ سب منہ خرافات ہے میرے دوست ٹھیک کہتے تھے کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ انہیں عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ بلکہ انہیں عمل میں لانا بالکل ناممکن ہے۔ میری غلطی تھی جو میں ایسا سمجھا تھا —— بیشک —— میری غلطی تھی —— لیکن اب مجھے خوب سختی سے کام لینا چاہئے —— خوب سختی سے ——

اس کے بعد آٹون ایچ اپنے پُرانے دوستوں کی پُرانی پارٹی میں جا ملا۔ صرف کہنے کی باتوں کو، پھر کبھی دُہراتے ہوئے اُسے کسی شخص نے نہیں دیکھا۔

ارشاداتِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

آرزو کا ترک کرنا ہی تونگری ہے۔
باطل کی حکومت چند لمحوں تک قائم رہتی ہے۔
اور سچائی کی حکومت قیامت تک
مایوسی روح کے لئے موت ہے۔

درخت میں زبان
بہتے ہوئے چشمے میں کتاب
پتھر میں نصیحت
اور
ہر شے میں کوئی نہ کوئی حقیقت مخفی ہے
"شکسپیر"

مشرق کی ایک عظیم المرتبت و مایۂ ناز شاعرہ

بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو

جہاں تک دنیا کے بہترین علمی و ادبی حلقوں کا تعلق ہے بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو کی محترم و مایۂ ناز ہستی اب محتاجِ تعارف باقی نہیں رہی مشرق کی اس عظیم المرتبت اور مایۂ ناز شاعرہ کی عزت افزائی میں پوری وسعتِ قلبی اور فرض شناسی کا ثبوت دیا گیا ہے اسی سے ان کے ادب کو ایک لافانی شہرت حاصل ہو چکی ہے ایشیا میں ہندوستان کی کوئی انجمن اور کوئی چوٹی کی شخصیت ایسی نہیں جو سروجنی دیوی کی دلکشی شاعری کی پجاری نہ ہو اور فردوسِ مشرق کی کوئی دل ایسی باقی نہیں جو بلبلِ ہند کے پُر بہار اور رس بھرے گیتوں سے ایک ابدی کیف کے جھولے میں جھولتی نظر نہ آتی ہو۔ جہاں تک اردو دنیائے ادب کا تعلق ہے وہ اس "گیتوں کی رانی" نے گوشے گوشے کو متاثر کر دیا ہے پھر بھی اس کی رہبرانہ سیاسی حیثیت نے اس کی اصلی روح کو بے نقاب نہیں ہونے دیا اور عام طور پر ہم جس قدر ٹیگور کو جانتے ہیں سروجنی سے واقف نہیں یا یوں کہئے کہ ہم واقف ہونے کے جذبہ کی تشنگی سے مجبور ہو کر اپنے اشتیاق وافر کو پیش کر رہے ہیں۔ یہ تو واقعہ ضرور ہے کہ سر رابندرناتھ ٹیگور کی شاعرانہ شہرت کا راز یہی ہے کہ وہ سیاسی مناظر پر نظر نہیں آتے اور ان کو عملی سیاسیات سے دور کا بھی تعلق نہیں لیکن مسز نائیڈو ملک کی ہر عملی سیاست میں دخیل ہیں اور ان کو تمام ملک نہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے بلکہ سیاسی و وطنی رہبر کی حیثیت سے پہچانتا ہے ان کی سیاسی و عملی حیثیت اتنی ارفع ہو گئی ہے کہ شاعرانہ حیثیت کے آفتاب کی شعاعیں نور بیز نہیں ہوتیں۔

لیکن بہر حال اس مضمون میں ہم ان کی زندگی اور ان کی شاعری پر ایک جامع نظر ڈالنی چاہتے ہیں گو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم ان کو تمام و کمال سمجھ سکے ہیں مگر ہماری کوشش ہوگی کہ ہم مشرق کی اس عظیم المرتبت شاعرہ، ہندوستان کی اس آتش نفس عندلیب اور بنگال کی اس شیریں گلو اور دل سوز کوئل کے گیتوں سے حقیقی کیف کو سمجھیں اور سمجھائیں۔ اس مضمون کا پہلا حصہ ان کے سوانح حیات اور دوسرا ان کی شاعری پر مشتمل ہوگا۔

(۱)

شریمتی سروجنی دیوی ۱۸۷۹ء میں بنگال کے ایک معزز و باوقار برہمن خاندان میں بمقام ریاست حیدرآباد دکن پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام رگھوناتھ چٹو پادھیائے (چٹرجی) تھا جن کے خاندان کا قدیمی سلسلہ "برہم نگر" سے ملتا ہے۔ مسٹر رگھوناتھ چٹو پادھیائے نے ۱۸۷۱ء میں اڈنبرا یونیورسٹی سے ڈی۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس ہو کر حیدرآباد میں نظام کالج کھولا اور تمام عمر تعلیمی ترقی میں کوشاں رہے۔

شریمتی سروجنی دیوی کا اصلی وطن بنگالہ ہے لیکن ان کے خاندان کی مستقل بود و باش مدتوں سے حیدرآباد میں رہی ہے، جہاں ہر قوم کے افراد مسلمانوں کی شراکت و مجالست کے باعث بے تکلف اور شستہ اردو بولتے ہیں، چنانچہ رگھوناتھ چٹو پادھیائے بھی اپنی بیٹی سے شیر خوارگی کے زمانے میں بنگالی میں بات نہیں کی بلکہ ہمیشہ زبان اردو ہی میں گفتگو فرماتے تھے در اصل ان کی مادری اور اصلی زبان اردو ہی تھی اور وہ قدرتاً اس طرزِ عمل کے لئے مجبور تھے لیکن یہ ہندوستان کی ذہنی اور دماغی غلامی کا پُر شباب زمانہ تھا اور ہندوستانی زبانوں کو انگریزی زبان کے مقابلے میں کمتر سمجھا جاتا تھا۔ غالباً یہی صورت حال اس کی ذمہ دار ہے کہ زمانہ سروجنی کو انگریزی زبان کی شاعرہ کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے ورنہ ان کے اظہارِ خیال کے لئے بنگالی یا اردو زبان جسے ان کی مادری زبان سمجھنا چاہئے تنگ دامن اور غیر فطری نہ تھی سروجنی دیوی اپنی ماں کی مقدس کوکھ ہی سے ذہین اور فطین پیدا ہوئی تھیں اس لئے ان کے والدین نے تربیت و تعلیم کی طرف خاص توجہ دی، سروجنی دیوی کی تعلیم ابتدا سے انگریزی مدارس میں ہوئی، ابھی ان کی عمر بارہ برس کی بھی نہ تھی کہ مدراس یونیورسٹی سے میٹریکولیشن کے امتحان میں کامیابی حاصل کی یہ ان کی فطری ذہانت و جودت کا سب سے پہلا کارنامہ تھا جس نے ان کو تمام ملک میں مشہور کر دیا۔

جب سروجنی دیوی کی عمر سولہ برس کی ہوئی تو سرکار نظام کی طرف سے وظیفہ دیکر انگلستان بھیجی گئیں جہاں آپنے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی انگلستان میں آپنے اول اول کنگس (شاہی) کالج لندن میں تعلیم پائی اور پھر غیر معمولی ذہانت و فطانت کی وجہ سے ایک اجنبی زبان پر ان کو مادری زبان کی طرح کامل قدرت و مہارت حاصل ہو گئی۔

اعلیٰ تعلیم و تربیت کے بعد شاعری کے وہ فطری جذبات جو شاعرہ کے بطون و شعور پر طاری تھے، یقیناً بے تاب ہو جانے چاہئے تھے کیونکہ اظہارِ خیال کے لئے تربیت نطق اور ذخیرۂ الفاظ کے حصول کے بعد کوئی وجہ باقی نہیں رہتا۔ یہ حقیقت کسی دور میں بھی غلط نہیں ہوئی ہے اور نہ ہوگی کہ شاعر محض دل سے بن سکتا ہے۔ مگر محض دماغ سے کبھی نہیں بن سکتا۔ اگر سروجنی کے پہلو میں الوہیت کی ایک غیر فانی شمع روشن نہ ہوتی اگر اس کے دل میں محبتِ انسانی اور عشقِ الٰہی کی انگیٹھی نہ دہک رہی ہوتی تو ناممکن تھا کہ وہ "سروجنی" ہو سکتیں۔ ان کی روحانیت نے ان کی علمی قابلیت کو ذوقِ اظہار بخشا اور ان کے اظہارِ قابلیت نے ایک عالم کو مسحور کر لیا۔

۱۸۹۸ء میں سروجنی دیوی کے شوہر ہونے کا فخر ڈاکٹر نائیڈو کو حاصل ہوا۔ اس غیر فطری رشتۂ زوجیت سے سروجنی دیوی کی آزاد خیالی اور بلندی کا پتہ چلتا ہے۔ سروجنی دیوی چٹو پادھیائے

خاندان سے ہیں اور ڈاکٹر نائیڈو کا خاندان بالکل مختلف ہے لیکن یہ شاعرانہ اسپرٹ تھی جس نے فرسودگی، ذات پات، خاندان وغیرہ کی قیود کو توڑ کر ضمیر اور روح، محبت اور فطرت کے تقاضات کی بنا پر ایک نئی مثال قائم کی۔ ڈاکٹر نائیڈو جو نظام ڈومنین کے بہت بڑے ڈاکٹر ہیں نہایت آزاد خیال اور بلند انسان ہیں۔ مسز سروجنی نائیڈو کے بڑے صاحبزادے جو ابھی امریکہ سے ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری لیکر آئے ہیں بہت فہیم اور ہوشیار ڈاکٹر ہیں اور ان کے چھوٹے صاحبزادے مسٹر مینا ایک ذہین نوجوان ہیں جن کی انگریزی انشا پردازی ان کی برگزیدہ ماں کی طرح ہندوستان اور دوسرے ممالک سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ دو صاحبزادوں کے علاوہ مسز نائیڈو کی دو صاحبزادیاں بھی ہیں، اور پدمجا دونوں نہایت قابل اور ذہین ہیں۔ مس پدمجا شاعرہ بھی ہیں اور اپنی مادرِ محترم کی طرح انگریزی زبان میں بہت اچھے شعر کہتی ہیں۔ تمام دکن میں اس خاندان کی ذہانت اور فطانت کی دھوم ہے اور ہر شخص اس خاندان کے کمالات کے راگ الاپتا نظر آتا ہے۔

مسز سروجنی نائیڈو کی شاعری

مسز سروجنی نائیڈو نے بیس برس کی عمر ہونے سے قبل ہی ایک حسین مجموعہ "گولڈن تھریش ہولڈ" (آستانِ طلائی) یا فرشِ زریں" کے نام سے شائع کیا اور وہ بے حد مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ انگلستان کے شعراء کی صفِ اول میں ان کو جگہ دیدی گئی۔ مسز سروجنی دیوی نائیڈو نہایت وسیع النظر اور بلند معیار شاعرہ ہیں۔ آستانِ طلائی کو شائع کرتے وقت انہوں نے اپنے کمالِ فن کی بلند آہنگی سے کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد جو کام ان کی طرف سے پیش ہوا اس میں رفعت و شیرینی، بلند خیالی اور لذت کی فراوانی تھی۔

سروجنی کا طائرِ تخیل فطرت کے ہر منظر پر پروانہ وار رقص کرتا نظر آتا ہے! اور اس کو ہم جلیسی و فطرت نے اپنے فیض سے نطق و بیان کی وہ قوتیں بخش دی ہیں کہ فطرت کے خفی ترین خط کو بھی مصور کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ یہی وہ کمال ہے جو کسی شاعر کو علوم کے دروازوں پر دریوزہ گری کرنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ فطرت کا جمال شاعر کو نذر دیتا ہے مگر اردو زبان کے کتنے شاعر ایسے ہونگے جو صبح خیزی کے عادی ہوں اور جنہوں نے آفاق میں نیرنگیٔ سحر کا طلسمی و عجیب سماں دیکھا ہو، جنہوں نے طیور کے چہچہانے سے پہلے گوش برآواز ہو کر فطرت کا لطیف راگ سنا ہو۔

اُردو شاعری کا جہاں تک تعلق ہے اسے مثالی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ ابھی ابتدائی دور میں ہے اور تعمیر کی منزلوں سے گزر رہی ہو۔ اس کی تخلیق اور پھر اس کی تخلیق اور پھر اس کی مسلسل تعمیر و تشکیل کی جو تاریخ ہے وہ اس کے غیر معمولی ارتقا کو تو پیش کرتی ہے لیکن تکمیل کو پیش نہیں کرتی، یعنی اگر غور کیا جائے تو ابھی اس کا کوئی کلچر اور کوئی فضا ہی مرتب نہیں ہوئی۔ فارسی کے موثرات نے اس کو جس قالب میں ڈھال دیا اور عقائد نے جو صورت دی وہ نہ ہندوستانی تھی نہ ایرانی اور نہ آرین۔ بلکہ گستاخی نہ ہو تو اس کو نقالی سے تعبیر کرنے کو جی چاہتا ہے نقل سے کبھی روح متاثر نہیں ہو سکتی چنانچہ اُردو شاعری کی روح کم متاثر ہوئی اور فن کے لحاظ سے اُس نے اس لئے ترقی کی کہ اس کے پاس فصل کی تیاری کے لئے کھیت، تخم، اور تمام سامان فارسی زمینداران ادب سے مستعار مل چکا تھا لیکن اس کے بازوؤں اور قوتِ دماغی کو اگر اس باب میں جفاکشی کرنی پڑتی تو اس کی روح کے متاثر ہونے کا موقع تھا، مگر اس حال میں کیونکر ممکن تھا کہ اُردو شاعر کی روح (الا ماشاءاللہ) میں شاعری کی اصلی کیفیت پیدا ہوتی۔ پھر تہذیب کے تقاضے میں شاعری کو کمتر خیال کرنا یہ بجائے خود روح کے مضمحل کر دینے کے لئے کافی تھا۔ ایسی صورت میں مکمل اور اچھے شاعر پیدا ہوتے تو کیونکر ہوتے؟ تاہم فضا اور ماحول کی غلط سامانیوں کے باوجود فطرت نے اپنی رسالت کے فرائض ادا کئے اور چند لوگ اُردو میں ایسے پیدا ہوئے جو فطرت کے حقیقی پیامی تصور کئے جا سکتے ہیں۔

لیکن عام طور پر شاعری کے مفہوم اور فضا، رنگ و روپ، کلچر اور اسپرٹ میں خالص ہندوستانیت پیدا نہیں ہو سکی اور اُردو زبان کا شاعر اصلی کیفیت سے محروم رہا۔ نہ صرف محروم رہا بلکہ اُس میں کچھ مزاجی نقائص بھی پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی کمی اس میں خود اعتقادی اور شاعرانہ خودی کی ہے وہ ہمیشہ سوسائٹی کا غلام رہا۔ اور اس نے کبھی اپنی پہنی ہوئی زنجیروں کو خود نہیں توڑا۔ سوسائٹی نے اپنے ذوق کے مطابق اس کو مدت تک چلایا۔ تا آنکہ خود اس میں انقلاب پیدا نہیں ہوا شاعر نہیں بدلا۔ ایک وجہ اس کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُردو زبان میں سچے نقادوں کی کمی ہے۔ یہاں تنقید کا مقصد تعریف و تنقیص محض کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہاں اگر کسی شاعر کے کلام پر تنقید کی جائے تو وہ اس کو اپنی دشمنی تصور کرتا ہے اور سچ پوچھئے تو جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وہ بھی دشمنی ہی کی غرض سے کی بھی جاتی ہے۔ مگر زندہ اور مہذب ممالک میں یہ طریقہ نہیں لیکن بہر حال وہ مشرق ہو یا مغرب حقیقی شاعر کو خود اپنا نقاد ہونا چاہئے۔ اگر وہ خود اپنا نقاد ہوگا تو کسی نکتہ چین کی زبان نہیں کھل سکتی۔

مسز سروجنی نائیڈو سے انگلستان کے ایک انگریز نقاد مسٹر ریڈ میڈ گوس نے صاف کہدیا کہ اگر تم کو انگریزی شاعری میں اپنی مخصوص جگہ لینی ہے تو اپنے وطن اور اس کی خصوصیات کو نظر انداز نہ کرو انگریزی خیالات کو انگریزی میں دہرانے سے تم حقیقی شاعر نہیں بن سکتیں۔ بلکہ انگریزی میں ہندوستانی خیالات و جذبات کو پیش کرنے ہی سے تم مغرب میں اپنی مشرقی نثر اور شاعری کا پرچم لہرا سکتی ہو۔

وہ نقاد بہت بڑا نباض تھا جس نے یہ رائے دی اور وہ شاعرہ بہت بڑی عقیل تھی جس نے اس رائے کو سمجھا اور پھر اس کی شاعری تصنع کے تمام لباسوں کو چاک کر کے حقیقی رنگ میں جلوہ افروز ہو گئی۔

شاعر کے لئے محتاط اور متفکر ہونے کی ضرورت ہے۔ شاعروں اور کوی سملنوں کے شاعر وقتی واہ واہ حاصل کر سکتے ہیں مگر ان کی روح میں کیف نہیں پیدا ہو سکتا اور وہ عالمگیر حیثیت اختیار نہیں کر سکتے جو کافی ریاضتِ روحانی و دماغی کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ سروجنی کی شاعری ان ہنگامہ خیزیوں اور آفاقی اثرات سے آزاد تھی! اس کے سامعین مشرق و مغرب کے پختہ کار نقاد خوش ذوق طبقے تھے۔ اور اس کی اشاعت کے ذرائع وہ نہ تھے جو دہلی و لکھنؤ ہی کی قسمت ہیں! اس کی شاعری ہونٹوں پر رسمی لفظوں کو زبردستی پیدا کرنے سے تخیل اور روح کو رقصاں کر دینے میں مشاق ثابت ہوئی۔

اس کی شاعری کا پیکر روحانی وجد و رقص، کیف و سرور، رنگینیٔ بہار، درد و پیغامِ اتحاد اور ہندوستانی تقاضاتِ فطرت کی گہری اور لطیف نفسیات کے عناصر اور اجزاء سے مرکب ہوا ہے۔ وہ ایک شعلہ نفس عندلیب ہے جو اپنے چمن (ہندوستان) کی عظمت کے گیت سرشار ہو کر گاتی ہے۔

مادرِ وطن سے خطاب

اُٹھ مادرِ وطن!

جمود و تعطل کے ذلت آفریں خواب سے بیدار ہو، بادِ حوادث کے جھونکے تیرے گلشنِ شباب کو

ابھی تاراج نہیں کرسکے ہیں تو نئی نویلی دُلہن بنکر اپنے بطن سے نئی شوکتیں پیدا کر۔

پا بہ سلاسل قومیں غلامی کی ظلمت میں مصروفِ فغاں ہیں۔ اُٹھ اور انہیں امیدوں کے نئے سپیدۂ سحری کا جلوہ دکھادے

مادرِ ہند ——— اے مادرِ ہند تو کہاں سو رہی ہے، تیرے بچے پکار رہے ہیں۔ انہیں اپنی آواز سنادے

مادرِ وطن!
مستقبل تجھے پکار رہا ہے
عزت، شوکت، اور فتوحات تیرے قدموں پر قربان ہونے کے لئے تیار ہیں۔
اُٹھ لے نیند کی ماتی ماں اُٹھ
اپنے سر پر تاج رکھ لے۔ تو اقلیم ماضی کی ملکہ تھی۔

بہت بڑی دقت ہے کہ اُردو داں حضرات سروجنی کی اصلی روحِ شاعری کو معلوم نہیں کرسکتے ایک زبان سے دوسری زبان میں شعر کا ترجمہ کامیابی کے ساتھ مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے انگریزی زبان میں یہی نظم لرزہ براندام کردینے والی ہے اور اُردو کے قالب میں وہ بات باقی نہیں رہی۔ اصلی زبان میں شاعرہ کا جذبۂ محبتِ وطن الفاظ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اور اس نے جذبہ کی حاجت اور اظہارِ خیال کی ضرورت سے الفاظ تجویز کئے ہیں، مترجم کو تو اس کی ضرورت نہیں پڑی وہ تو سروجنی کی شاعری سے بحث کرنے کے لئے بیٹھا ہے۔

دیہاتی گانے نظم کرنے میں بھی سروجنی دیوی کو مہارت ہے ان گانوں کے پردے میں اپنے مادرِ وطن کے مصائب کے افسانے کہے ہیں۔ مسز نائیڈو فطرتِ انسانی کی ماہر ہیں۔ انکے کلام میں ہندی جذبات کی حرارت، ہندی قلب کا تموج، اور ہندی خیالات کی تحریک پائی جاتی ہے۔

یہاں تک کہنے کے بعد ہم اختر دہلوی کا ایک مختصر نوٹ شریکِ مضمون کرتے ہیں جو سروجنی دیوی کی شاعری پر مکمل نوٹ تو نہیں ہے لیکن اس کے مطالعہ سے ان کی شاعرانہ کمال کا اجمالی اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

"مسز نائیڈو کی شاعری بجائے خود ایک وسیع مضمون ہے اور چونکہ وہ تمام و کمال انگریزی زبان میں ہے! اس لئے اُردو میں اُس کی مفصل تنقید اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اول اُن اثرات کو واضح کیا جائے جو اُن کی شاعری پر تقابلی پرتو فگن ہوئے اس کے بعد اُن کی شاعری کا تقابل اور موازنہ دیگر انگریزی شعراء کے کلام کے ساتھ کرکے اُس کی خصوصیات کو واضح کیا جائے اور آخر میں یہ تعین کیا جائے کہ انگریزی نظم میں اُن کا پایہ کیا ہے ظاہر ہے کہ اگر اردو زبان میں ان تمام مباحث کے لئے وسعت بھی ہو تو وہ نقاد کہاں جو ان سے کشمکش کرسکے لہذا یہاں صرف اس قدر ہوسکتا ہے کہ ایک اجمالی تبصرہ ناظرین کے پیشکش کردیا جائے یہ بیان اوپر آچکا ہے کہ مسز نائیڈو کو اپنے طالبعمانہ قیام انگلستان میں اپنی علمی اور شاعرانہ استعداد کو ترقی دینے کے خاص مواقع نصیب رہے ہے۔ انگلستان میں اُس وقت سوئن برن موریس اور روزیٹی کا اثر غالب تھا اور انگریزی نظم میں نئی نئی گلکاریاں اور رنگ آمیزیاں ہوچکی تھیں۔ مذکورہ بالا شعراء اور ان کے معاصرین نے جو رنگ پیدا کردیا تھا وہ اگرچہ بہت مدت تک تو آسمانِ شاعری کے غروب کی شفق تھا جو انیسویں صدی کے شروع میں ورڈزورتھ بائرن اور شیلے کے عروج کے ساتھ طلوع ہوا تھا لیکن تاہم موسم خزاں کی کسی سہانی شام کی مانند نظر فریب ضرور تھا۔ ان شعراء کی سعی سے انگریزی شاعری نے زبان کے اعتبار سے نئی لطافتیں اختیار کرلیں جن سے شاعری موسیقی کے نصب العین کے قریب ہوگئی تھی، تخیل کے اعتبار سے اُس کی حدود مصوری کے قریب پہنچ گئی تھیں اور فن مصوری کے اصول شاعری میں جھلکتے نظر آتے تھے شاعری کو دیگر فنون لطیفہ سے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے، اور اس میں مصوری اور موسیقی دونوں کے اجزا ابتدا سے شامل رہے ہیں خصوصاً موسیقی اور شاعری کا قدیم اور قریبی رابطہ بالکل بیّن اور واضح ہے لیکن اس دور کے انگریزی شعراء کی غالباً سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ انہوں نے مصورانہ تخیلات کو سُریلے الفاظ میں منظوم کرنے کی خاص طور پر مہارت بہم پہنچائی تھی اس میلان کا اثر ہماری شاعرہ کے کلام پر بھی پڑا۔ اور جہاں تک وہ اثر مسز نائیڈو کی نظموں کو فردوس گوش بنانے میں مدد دیتا ہے۔ اُس کو مفید کہنے میں کوئی تامل نہیں ہوسکتا لیکن اس اثر کا ایک مضر پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ بعض دفعہ محض سُریلے الفاظ کو شاعرانہ کلام کا مترادف خیال کرلیا جاتا ہے یا پڑھنے والے کی توجہ الفاظ کے نغمہ میں اس قدر اُلجھ جاتی ہے کہ نظم کا مفہوم بالکل نظرانداز ہوجاتا ہے شاعری کا مدعا محض ایک نغمۂ صوت کی تخلیق نہیں، اس کا دائرۂ تخلیق اس سے بہت زیادہ وسیع ہے خوش آواز الفاظ کا بڑھا ہوا شوق بعض دفعہ شاعری کو محض لفاظی کے درجہ تک گرا دیتا ہے حق پسندی کا تقاضا اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور کرتا ہے کہ یہ مضر اثر بھی مسز سروجنی نائیڈو کی ابتدائی نظموں میں بالکل مفقود نہیں ہے۔

بادی النظر میں یہی امر کچھ کم حیرت خیز نہیں کہ کوئی ہندوستانی انگریزی میں شعر کہے۔ اصلی شاعری تمام و کمال فطرت پر مبنی ہے اور اُس کا اظہار فطری طور پر اپنی ہی زبان میں ہوسکتا ہے لیکن خواہ اسے ہنر کہئے یا عیب مگر یہ واقعہ ہے ہندوستانیوں کو غیر زبانوں کے اختیار کرنے اور اُن زبانوں کو اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں عرصۂ دراز سے ایک خاص ملکہ حاصل رہا ہے مثال کے طور پر فارسی کو لیجئے مسلمانوں کے عہد میں زبان نے وہ عروج پایا کہ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی کثرت سے فارسی شعر کہنے لگے اور ہندوستان کی فارسی شاعری کے متعلق شیخ علی حزیں جیسے تنگ خیال اہل زبان خواہ کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں اور "بوئے کچوری می آید" پھبتی اُڑائیں، لیکن اس ملک کے فارسی گو شعراء کے گروہ میں چند ایسے بھی ہیں جن کے کمال کی داد ہر ایک منصف مزاج شخص کو دینی پڑتی ہے۔ عربی فارسی سے زیادہ مشکل الحصول زبان ہے لیکن اطلاق ہندی ذہن عربی کے اختیار کرنے سے عاجز ثابت نہیں ہوا متعدد ہندوستانیوں نے عربی نظم و نثر میں قابل قدر سلیقہ دکھایا ہے۔ انگریزی تعلیم کے بنگال میں رواج پاتے ہی بنگالی شعراء کو انگریزی نظم کا شوق ہوگیا۔ اور ان میں کم از کم دو شاعر اس پایہ کے ہوئے کہ ان کا کلام اہل زبان کی نگاہ میں بھی وقیع قرار پایا ہے ان میں سے ایک (ڈیروزیو) تو مخلوط النسل ہونے کی وجہ سے انگریزی کو غالباً مادری زبان کی طرح استعمال کرتا تھا لیکن مِس تورودت خالص بنگالی ہونے کے اعتبار سے مسز سروجنی نائیڈو کی حقیقی پیشرو

تھیں۔ غرض کہ مسز سروجنی نائیڈو کی پیدائش سے بھی پہلے ہندوستان اور خصوصاً بنگال میں انگریزی شاعری کی رسم جاری ہو گئی تھی۔ علاوہ بریں اُن کی ابتدائی تعلیم کے متعلق جو کچھ مذکور ہو چکا ہے اُس کو خیال میں رکھتے ہوئے یہ حیرت کسی قدر کم ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ہندوستانی ہو کر انگریزی زبان پر ایسی قدرت کیونکر حاصل کی کہ اس میں اپنی شاعرانہ کمال کا اظہار کر سکیں۔ اُن کی انگریزی زباندانی کی پوری داد کوئی اہل زبان ہی دے سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک ایک ہندوستانی سمجھ سکتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ محاورات اور الفاظ دونوں پر اُن کو کامل تصرف حاصل ہے۔ اور ان کے استعمال میں کوئی ایسی خامی یا نقص نہیں نظر آتا جو اُن کے اظہار کمال میں مانع ہو سکے۔ انگریزی شعراء کے کلام پر اُن کو پورا عبور ہے۔ اور اُس کی بلاغتیں اُنکے اپنے کلام کی شکر ریزی میں مدد دیتی ہیں۔ شاید میرا یہ خیال غلط نہیں کہ وہ شیلے کے کلام کی خاص طور سے دلدادہ ہیں کیونکہ اُس کے کلام میں وہ نزاکت اور لطافت ہے جو بہ نسبت عام آدمیوں کے شعراء کو زیادہ اپنی جانب جذب کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ اب تک جو کچھ بیان ہوا اُس سے یہ قیاس کر لیا جائے کہ مسز نائیڈو کی شاعری انگریزی یا مغربی شاعری کا عکس ہے اور اس میں مشرقی رنگ کی کوئی آمیزش نہیں لیکن یہ قیاس صحیح نہیں کیونکہ اُنہوں نے مغربی شعراء کے ساتھ مشرقی شعراء کے مطالعہ کو بھی جاری رکھا ہے اور فارسی اور اُردو زبان کے شعراء کا کلام نہایت شوق و ذوق سے سنتی ہیں اور اپنی باریک بیں طبیعت سے اُس پر ایسی تنقید کرتی ہیں کہ بڑے بڑے شعر فہم محو حیرت ہو جاتے ہیں۔ اساتذہ اُردو میں غالب کا کلام خاص طور پر آپ کے مطبوع خاطر ہے اور عہد حاضر کے شعراء میں اقبال کے اشعار کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہیں ان دونوں شعراء کے خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مسز نائیڈو ایشیائی شاعری کے نکات سے کس درجہ واقف ہیں۔ راقم الحروف کو علم نہیں کہ سنسکرت اور ہندی شاعری سے واقفیت بہم پہنچانے کا اُن کو کہاں تک موقع ملا ہے لیکن اُن کی اپنی شاعری کے بعض پہلو ہندی شاعری سے نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ جس کی کچھ تشریح بعد میں کی جائے گی۔ فی الحال اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ مسز نائیڈو کی شاعری مغربیت اور مشرقیت دونوں کے اثرات سے مستفید ہوئی ہے متفرق نظموں کے علاوہ مسز نائیڈو نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۷ء تک تین مستقل مجموعے پانچ پانچ برس کے وقفہ سے شائع کر چکی ہیں۔ ان تینوں مجموعوں کے انگریزی ناموں کے ترجمے علی الترتیب اشاعت "طلائی آستانہ" "طائرِ وقت" اور "شکستہ پر" ہو سکتے ہیں، اور ایک حد تک یہ نام اُن نظموں کی نوعیت کے مظہر ہیں جو اُن کتابوں میں جمع کی گئی ہیں۔ "طلائی آستانہ" میں پندرہ سے لیکر پچیس برس کی عمر تک کے کلام کا انتخاب ہے ان نظموں میں شاعرہ نے دُنیا کی دلفریبیوں کے قصر طلائی کی دہلیز پر قدم رکھا ہے اور اُسے ہر ایک شئے اُس سنہری ملمع سے چمکتی ہوئی نظر آتی ہے جو عنفوانِ شباب میں اشیاء کے تاریک رُخ کو ہماری نگاہ سے پوشیدہ کر دیتا ہے ہندوستان کے کسی قدیمی شہر اور خصوصاً حیدرآباد جیسے شہر میں بیسیوں نظارے ایسے ہوتے ہیں جو شاعر کے نازک دماغ کو پراگندہ کر سکتے ہیں لیکن ابھی تک ہماری شاعرہ کی نگاہ ان ناگوار نظاروں پر سے اُچٹتی ہوئی گزر جاتی ہے اور

اس کی نظر صرف انہی چیزوں پر جمتی ہے جو اپنی خوشنمائی سے اُس کے دل کو خوش کر سکتی ہیں اور دل اس خوشی کا اظہار زبان سے ایسے نغموں میں کرتا ہے جو سامعہ کو ہندی ٹھمریوں سے زیادہ لذت بخشتے ہیں۔ مرور زمانہ کے ساتھ خیالات میں پختگی آ جاتی ہے اور شاعر کی نگاہ اشیاء کی ظاہری خوشنمائی سے تجاوز کر کے اُن کی باطنی حقیقت تک پہنچنے لگتی ہے اور اُس پر یہ حال منکشف ہوتا ہے کہ دُنیا صرف سہانے رنگوں اور سُریلی آوازوں سے مرکب نہیں بلکہ اس میں بہت سے بدنما رنگ اور کرخت سُر بھی ہیں جن کا مقابل ہمیں اپنے دلفریب خواب سے چونکا کر مجبور کرتا ہے کہ ہم اس دلق ملمع کو الٹ کر دیکھیں کہ اُس کا اصلی رُخ کیسا ہے اور اس بے سُرے نغمہ کو کان لگا کر سنیں اور غور کریں کہ آیا اُس کی کوئی لے ہے؟ "طائرِ وقت" کی نظمیں زبان و تخیل دونوں کے لحاظ سے اس کا پتہ دیتی ہیں کہ ہماری شاعرہ کے کلام میں اب وہ پختگی پیدا ہو گئی ہے جو فطرت کے غائر مطالعہ سے اخذ کی جاتی ہے۔ "شکستہ پر" میں یہ صفت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے اس عرصہ میں شاعرہ کو بعض ایسے ناگزیر صدمات پیش آتے ہیں جن سے دُنیا میں کوئی بشر مامون نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ عمومیت کے اعتبار سے موت اور زیست سے زیادہ دُنیا میں کوئی واقعہ پیش نظر نہیں رہتا لیکن کسی عزیز یا دوست کی موت اس عام واقعہ کو ایک مکاشفہ کی صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتی ہے اور خیال کو یہ کاوش ہوتی ہے کہ اس تغیر پذیر عالم میں اپنے لئے کوئی مستقر تلاش کرے۔ یہ تلاش ہم کو حقیقت کی طرف لے جاتی ہے اور ہمیں اپنی معصومیت کے زمانے کے بہت سے خواب ترک کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن یہ نقصان انجام کار میں نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ تخیل اور عقل میں ایک قسم کا توازن قائم ہو جاتا ہے جس پر شاعری کے صحیح عروج کا مدار ہے۔ اس آخری مجموعہ کا نام ہی شاہد ہے کہ اُس کے اشعار میں اُسی درد کا اظہار ہے جسے غالب نے "شکست کی آواز" کے نام سے موسوم کیا ہے ان اشعار میں روانی و صفائی ہے مگر ایسی روانی اور صفائی جو ایک آنسو کے رخسار پر بہنے کی یاد دلاتی ہے۔ ان میں نغمہ ہے لیکن وہ نغمہ جو آہ سرد کی طرح دل کے پار ہو جاتا ہے۔ خیالات کا ارتقاء مسز نائیڈو کی شاعری کی ظاہری شکل (یعنی جدت الفاظ و ترکیب) میں بھی مناسب تغیر پیدا کرتا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ سریلا پن جس کا ذکر آ چکا ہے اُن کی تمام شاعری میں قدر مشترک ہے لیکن جس طرح ہم نے اُن کی اولین نظموں کو ٹھمری سے مشابہت دی تھی اُسی استعارہ کو قائم رکھتے ہوئے۔ یہ کہنا چاہیئے کہ اُن کی آخری نظمیں خیال یا دھرپد سے مشابہ ہیں جن میں سریلا پن، رفعت اور شکوہ کے ساتھ نمودار ہو کر قلب کو مطمئن اور کانوں کو خوش کر دیتا ہے۔

ہندی راگ اور مسز نائیڈو کی شاعری کے درمیان جو تشبیہ قائم کی گئی ہے، وہ نہ صرف شاعری کی ظاہری شکل سے تعلق رکھتی ہے، بلکہ اُن جذبات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو اس کی تہ میں پوشیدہ ہیں۔ اُس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ محبت اُن جذبات میں جو شاعری کے محرک بن سکتے ہیں۔ سب سے قوی جذبہ ہے اور اگرچہ اور جذبات بھی شعر کا لباس پہن سکتے ہیں لیکن یہ لباس جیسا محبت کے جسم پر راست آتا ہے، ویسا کسی اور جذبہ پر نہیں کھلتا لیکن محبت کے ایک سے زیادہ رنگ ہیں۔ اور جو رنگ وہ ہندی شاعری (جس کے ضمن میں ہندی راگ بھی شامل ہے) میں دکھاتی ہے وہ مغربی رنگ شاعری میں شاذ مثالوں کو چھوڑ کر کہیں نظر نہیں آتا۔

مسز نائیڈو کی زبان اگرچہ انگریزی ہے لیکن اُن کا دل ہندی ہے اور اس دل میں جو جذبات ہیں وہ بھی ہندی ہیں۔ ہندی شاعری میں محبت کا اظہار ہمیشہ عورت کی جانب سے ہوتا ہے اور یہ نسوانی محبت اپنی مجازی صورتوں میں بھی اُس روحانی جذبہ سے معمور نظر آتی ہے جو اور زبانوں میں صرف مذہبی شاعری میں دکھائی دیتا ہے بلکہ ہندی شاعری میں پریم یعنی محبت بھگتی یعنی پرستش دونوں ایک دوسرے سے اس قدر پیوست پائے جاتے ہیں کہ ان دونوں جذبات میں کوئی مابہ الامتیاز قائم کرنا مشکل ہے۔ مسز نائیڈو کی شاعری میں جس محبت کی جھلک نظر آتی ہے وہ وہی محبت ہے جو بھگتی کی جانب لے جاتی ہے جس میں روحانی رفعت اور مذہبی جوش دونوں موجود ہیں جو ہمیشہ اخلاق کے دائرہ میں محصور اور مذہب کے احکام کے تابع رہتی ہے جس میں محبت کرنے والی اپنے محبوب کو ایک دیوتا اور خود کو اُس کا ادنیٰ پجاری تصور کرتی ہے جو موت کے سامنے بھی سرِ تسلیم خم نہیں کرتی بلکہ ستی کی چتا کے شعلوں کے ساتھ غرور سے اپنے سر کو آسمان تک بلند کرتی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جس محبت کو مسز نائیڈو کی شاعری سراہتی ہے وہ ایک معمولی ہندی عورت کی رسمی محبت ہے جو مذہب رواج ذات پات اور بیسیوں قیود سے پابند نظر آتی ہے بلکہ اُس میں وہ انفرادی قوت موجود ہے جو ضرورت کے وقت ہر قسم کی قیود اور بندشوں کو توڑ سکتی ہے۔

محبت کے علاوہ مسز نائیڈو کے اشعار میں دیگر سب اعلیٰ اور ارفع جذبات اور تحریکات سے کام لیا گیا ہے۔ حب وطن۔ شفقت مادری۔ انسانی ہمدردی غرضکہ کوئی بھی قابل قدر جذبہ ایسا نہیں جس کا اُن کی کسی نہ کسی نظم میں جلوہ نہ نظر آتا ہو۔ قدرتی مناظر سے دلبستگی شاعرانہ طبیعت کا لازمی جزو ہے لیکن مسز نائیڈو نے مناظر قدرت کو اپنی شاعری کا خاص موضوع قرار نہیں دیا۔ بلکہ ہمیشہ اس کو انسانی جذبات کی تصویر کے حاشیہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ البتہ ہر طبقہ اور ہر نوع کے انسانوں کے خیالات کی ترجمانی کرنے میں اُنہیں خاص ملکہ ہے اور اُن کی نظموں میں موذن کی اذان اور پجاری کے بھجن سے لیکر پنہاریوں کے گیت پالکی بردار کہاروں کے گانے اور فقیر کی صدا تک سب قسم کے نغمے موجود ہیں۔ اشیا کے رنگین اور نازک پہلو دیکھنے کا اُن کی آنکھ کو خاص ملکہ ہے اور بسا اوقات وہ چند فقروں یا چند لفظوں میں کسی واقعہ یا نظارہ کی پوری تصویر ہماری نگاہ کے سامنے کھینچ دیتی ہیں۔

ہندوستان کی عورتوں کے متعلق کبھی طنز اور کبھی حسرت کے لہجہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ اُن کی زندگی صرف تین اہم واقعات پر مشتمل ہوتی ہے یعنی پیدا ہوئیں بیاہ ہوا اور مر گئیں۔ کیا یہ بات بجائے خود تعجب خیز نہیں کہ ایسے درماندہ طبقہ میں سروجنی نائیڈو جیسی مجموعۂ کمالات خاتون کیسے پیدا ہو گئی؟ اس کو ہم معجزہ خیال کریں یا فطری اسباب کا نتیجہ۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ واقعہ صرف تعجب خیز ہی نہیں بلکہ اُمید افزا بھی ہے کہ اگر ہندوستانی عورتوں کو موافق حالات میسر آئیں تو وہ کیا کچھ کر سکتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک خاتون مسز سروجنی نائیڈو کے مانند خوشگو شاعر یا خوش بیان مقرر یا سیاسی مدبر بننے کی سعی لاحاصل کرے۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن کی رفیع الشان مثال سے سبق لیکر وہ کارکن اور فرض شناس انسان ہو جائیں اور یہ مثال ہمارے مردوں کے لئے بھی ایسی سبق آموز ہے جیسی کہ ہماری عورتوں کے لئے۔“

اب ہم آخر میں مسز نائیڈو کی شاعری کے چند منظوم و منثور ترجمے پیش کرتے ہیں ناظرین خود ان کے مطالعہ سے اندازہ کر لیں گے کہ مسز نائیڈو کی شاعری کس قدر پُردرد اور کیف آفریں و دل نواز ہے بعض ترجموں کے ساتھ ان کی نظمیں اصل زبان میں بھی شائع کی جاتی ہیں، تاکہ جو اجزا اور حقیقی کیف ترجمہ سے باقی رہ گیا ہے وہ بھی پیش نظر ہو جائے۔ سب سے پہلے ہم وہ معرکتہ الآرا قصیدہ نقل کرتے ہیں جو اعلےٰ حضرت نظامِ دکن خلد اللہ ملکہٗ کی شان میں مسز نائیڈو نے فرمایا ہے۔

شاہِ دکن کے حضور میں

سروجنی نائیڈو کی عقیدت کے پھول

بادشاہِ ذی وقار!

چند اشعار کا یہ ہدیۂ ناچیز گزارنے کیلئے حاضر ہوئی ہوں۔ دستِ کرم دراز کر کے انہیں شرفِ قبول اور مجھے وجۂ افتخار بخشئے۔

اے وہ کہ جس کے مرصع عطائے شاہی میں ایک شاعر کے گلہائے شہرت آویزاں ہیں! ——— ہاں وہ عصائے پُر وقار جس کے زیر حکم سلطنت کے جملہ مذاہب و اقوام ہم آہنگی و یکجہتی کے ساتھ دوش بدوش رہتے ہیں۔

خواہ وہ پیغمبر اسلام کے پیروانِ پُرجوش ہوں ——— جن کے تم سرتاج و حاکم ہو۔

یا وہ جن کی منور پیشانیوں پر ویدوں کے مقدس منتروں کے نقوش ہویدا ہیں!

اور ہاں وہ بھی جو خلیج فارس کو عبور کر کے برسوں گزرے یہاں آئے تھے اور تمہارے سایۂ عاطفت میں پناہ گزیں ہوئے تھے ——— وہ جو آفتاب کو معبود سمجھتے ہیں +

۵۰

بدوش رہتے ہیں۔

——آہ! وہ بھی جو اس یسوع ناصری کی پرستش کرتے ہیں جس نے جھیل "گلیلی" کی امواجِ نیم شبی کو اپنے مبارک قدموں سے عبور کیا تھا!
تیرے دربار کی شوکت و صولت دیکھکر بغداد کے پُر وقار درباروں اور خلفائے عباسیہ کی شان و شوکت کی داستانیں یاد آنے لگتی ہیں۔
آہ! صرف ایک جشن پر "الف لیلہ" کی ہزاروں شمعیں روشن کردی جاتی ہیں اور "ساقی" نغمہ سنج گلی کوچوں میں گاتا پھرتا ہے —— اور تیری غزلوں کے پیمانوں سے شرابِ تصوّف کے کیف پرور جرعے بھر بھر کر میکشانِ ادب کو پلاتا رہتا ہے!

پادشاہِ ذی وقار!

تیرا بارونق شہر اپنی جلو میں سرور و نشاط کی محفلیں لئے ہوئے ہے لیکن اس کے گرد سنجیدہ و کوہستانی سلسلہ ایک عالمِ سکوت میں کھڑا اس کی پاسبانی کر رہا ہے
تیری سلطنت کے دشت و بیاباں میں صدیوں کی تاریخ کے منتشر اوراق بکھرے پڑے ہیں، آہ! وہ مخزنِ تاریخ ہے۔ مدفنِ تاریخ ہے!
کھنڈروں۔ غیر آباد قلعوں اور مسمار شدہ عمارتوں پر مُرغانِ امن اپنے سفید پروں کو لئے ہوئے اُڑتے رہتے ہیں —— ہاں ان خاموش و سوگوار کھنڈروں میں تمہارے باوفا خدام جا بجا متعین ہیں —— ہاں وہ ماضی کے پاسباں جو آج تک سلطنت کے خزانہائے زر و جواہر اور فصلوں کے سنہری انباروں کی نگرانی میں دن رات لگے رہتے ہیں!

خدائے برتر تجھے مسرت بے پایاں عنایت کرے —— تیرے بازو میں قوت دے کہ وہ سچ کی حمایت اور بدی کی مخالفت میں ہمیشہ شمشیر بے نیام لئے مستعد رہیں
—— خدا کرے تو محاسن و مکارم اور شجاعت و قدر شناسی کے اوصافِ حمیدہ کی عزت افزائی کے لئے ہمیشہ زندہ رہے۔
ایمان کی سلامتی اور شعریت کی بقا کے لئے ہر وقت کوشاں رہو!!
خدا کرے کہ تیرے بارونق عہد کی جلوہ پاشیاں "نغماتِ اعمال" کو منور کردیں جو کبھی فردوسی نے گائے تھے! —— قومی دعائیں تیرا نام روشن ہوا —— پرچم ملی پر بھی تیرا ہی نشان جلوہ فگن ہو! —— ہر فردِ سلطنت کی زبان پر تیرے ہی گیت ہوں!!!

عندلیبِ شکستہ پر

شبِ طویلِ غم گئی — مسرّتوں کی لَو ہوئی
اُفق چمک اُٹھی ہے اب — نمودِ صبحِ نو ہوئی
رگوں میں خون پھر گیا — حیات گرم رو ہوئی۔ نمودِ صبحِ نو ہوئی
نمودِ صبحِ نو ہوئی — اُمید جلوہ گر ہوئی
مسرتوں کے گل کھلے — نسیم با ثمر ہوئی
بہار آگئی ہے پھر — خوشی پیام بر ہوئی۔ امید جلوہ گر ہوئی
اُمید جلوہ گر ہوئی — نئی زمین نیا وطن
مگر شکستہ پر ہے تو — اے عندلیبِ نغمہ زن
اے عندلیبِ نغمہ زن — عروس بن گیا چمن۔ مگر شکستہ پر ہے تو

THE BROKEN WING.

QUESTION.

The great dawn breaks, the mournful night is past
From her deep age-long sleep she wakes at last!
Sweet and long-slumbering buds of gladness ope
Fresh lips to the returning winds of hope.
Our eager hearts renew their radiant flight
Towards the glory of renascent light,
Life and our land await their destined spring
Song-bird why dost thou bear a broken wing?

ANSWER.

Shall spring that wakes mine ancient land again
Call to my wild and suffering heart in vain?
Or Fate's blind arrows still the pulsing note
Of my far-reaching, frail unconquered throat?
Or a weak bleeding pinion daunt or tire
My flight to the high realms of my desire?
Behold! I rise to meet the destined spring
And scale the stars upon my broken wing!

ECSTASY.

Heart, O my heart! lo, the springtime is waking
In meadow and grove.
Lo, the mellifluous **Koels** are making
Their paeans of love.
Behold the bright rivers and rills in their glancing,
Melodious flight.
Behold how the sumptuous peacocks are dancing
In rhythmic delight.

جواب

وہ روز و شب بدل گئے
خزاں کے دن نکل گئے
خوشی کا دور آ گیا
زمانہ اور آ گیا
تو پھر میں بے بصر ہوں کیا　　شکستہ اس قدر ہوں کیا!
کہ نغمہ زن نہ ہو سکوں　　کہ جان و دل نہ کھو سکوں
خوشی سے خوں نہ رو سکوں
جگر میں پھانس ہے تو کیا　　بہار جلوہ گر تو ہے!
میں نامرادِ غم سہی　　امید بارور تو ہے!
شکستہ ہے تو کیا ہوا　　اُڑیگا یہ کہ پر تو ہے!
یہی شکستہ پر مرا سوئے بہار لے چلا
لو دیکھنا یہی مجھے فلک کے پار لے چلا

کیفِ بہار

بہار اے دل! آ گئی چمن میں سبزہ زار میں
یہ کوئلوں کی بولیاں!
یہ زمزموں کی مستیاں!
یہ عشق کی کہانیاں، چڑھاؤ اور اُتار میں　　بہار اے دل! آ گئی چمن میں سبزہ زار میں
کنارِ جو کی مستیاں میں کس طرح کروں بیاں؟
وہ مور ناچنے لگے!
وہ مستِ نغمہ ہو گئے!
یہ نہر کی روانیاں، روانیوں میں شوخیاں　　کنارِ جو کی مستیاں میں کس طرح کروں بیاں؟
پھر اے دل حزیں! نہ کیوں غم اپنا ہم بھی بھول جائیں
جہاں تمام مست ہے

پیے ہوئے خوشی کی مے

پھر اب بھی کیوں ہمیں یہ غم، یہ رنج، یہ ستم اٹھائیں
اب آ، کہ اے دلِ حزیں! غم اپنا ہم بھی بھول جائیں

یہ زمزمہ طیور کا، یہ نغمے جوئبار کے
میں اور مستعار لائیں!
اُٹھ اور آج ہم بھی گائیں!

ذرا سنبھل، دلِ حزیں! کہ ہیں یہ دن بہار کے
کہ عمر ابھی پڑی ہے غم کی یاد کے لئے

کنول

حامد

خفتہ جہاں ہیں مارِ سرِ شاخ کو کنار
آہستہ رو پلنگ کے رستہ میں بار بار

ہیں شعلہ بار کرمکِ شب تاب اس قدر
روشن ہیں دور دور کی راہیں وہ پیچدار

بھٹکے ہوئے جہاں ہیں وحوشِ رمیدہ خو
اور ہیں سبک خرام غزالانِ شرمسار

دن ڈوبتا ہے گو، پہ عیاں ہے چمک نئی
ہیں تابناک طوطیوں کی کلغیاں ہزار

سننا ذرا!! کنول ہیں یہ بالائے سطحِ آب
جنبش میں جیسے ہو کوئی طنّاز محوِ خواب

قشقہ لگائے ماتھے پہ ہے چرخِ نیلوفر
یعنی یہ شان و شوکت و تمکین و کرّ و فر

جلوہ فگن اُدھر مہِ زرّیں نقاب ہے
اور خوفناک معبدِ صحرائی ہیں اِدھر

رقصاں جو بادِ تند بھی اب ہو کے نیمجان
غش کھا گئے "شب" کے قدموں پہ پٹکتی ہے اپنا سر

پُر رمز، کچھ سکوت میں آوازیں گاتی ہیں
خاموش!! دیوتاؤں پہ نذریں چڑھاتی ہیں

املتاس کا پھول

احسن

اے املتاس تجھے کیوں گلِ صحرا کہئے
صورتِ سبزہ ہے پامال مگر کیا کہئے

کوئی ٹوٹا ہوا تارا ہے تو اُفتادۂ خاک
یا تجھے طالعِ خوابیدہ ہمارا کہئے

جامِ زرّیں مے ہوش رُبا ہے گویا
یا تجھے شمع تہِ دامنِ صحرا کہئے

ساقِ سیمینِ پری کی ہے سنہری پازیب
موسمِ گل کا تجھے نقشِ کفِ پا کہئے

Shall we in the midst of life's exquisite chorus
Remember our grief
O heart when the rapturous season is o'er us
Of blossom and leaf?
Then joy from the birds and the streams let us borrow
O heart! let us sing
The years are before us for weeping and sorrow
To day it is spring!

LEILI.

The serpent are asleep among the poppies
The fireflies light the soundless panther's way
To tangled paths where shy gazelles are straying
And parrot plumes outshine the dying day
O soft! the lotus buds upon the stream
Are stirring like sweet maidens when they dream

A caste mark on the azure brows of Heaven
The golden moon burns sacred solemn bright
The winds are dancing in the forest temple
And swooning at the holy feet of Night
Hush! in the silence mystic voices sing
And make the gods their incense offering

GOLDEN CASSIA

O Brilliant blossoms that strew my way
You are only woodland flowers they say
But I sometimes think that perchance you are
Fragments of some new fallen star
Or golden lamps for a fairy shrine
Or golden pitchers for fairy wine

Perchance you are, O frail and sweet!
Bright anklet-bells from the wild spring's feet,
Or the gleaming tears some fair bride shed
Remembering her lost maidenhead.
But now, in the memoried dusk you seem
The glimmering ghosts of a by gone dream.

SUTTEE.

Lamp of my life, the lips of Death
Hath blown thee out with their sudden breath;
Naught shall revive thy vanished spark
Love, must I dwell in the living dark?

Tree of my life, Death's cruel foot
Hath crushed thee down to thy hidden root.
Nought shall restore thy glory fled
Shall the blossom live when the tree is dead?

Life of my life, Death's bitter sword
Hath severed us like a broken word.
Rent us in twain who are but one
Shall the flesh survive when the soul is gone?

THE HUSSAIN SAAGAR.

The youngdawn woos thee with his amorousgrace,
The journeying clouds of sunset pause and hover,
Drinking the beauty of thy luminous face,
But none thine inmost glory may discover,
For thine evasive silver doth enclose
What secret purple and what subtle rose
Responsive only to the wind, thy lover.
Only for him thy shining waves unfold
Translucent music answering his control;
Thou dost, like me, to one allegiance hold,
O lake, O living image of my soul.

سر بزانو ہے دامنِ محوِ خیالِ طفلی — ڈبڈبائے ہوئے اشکِ ستم آرا کہیے
شامِ غربت میں کوئی خوابِ پریشاں ہے تو — یا تجھے غولِ فریبندۂ صحرا کہیے

رونمائے پرطاؤس ہے تیرا جلوہ — دیدۂ آہوئے رم دیدہ کا نقشا کہیے
زردیٔ شکلِ رُخِ مجنوں ہے بیاباں میں تو — گرد آلودہ خمِ طرۂ لیلا کہیے
مثلِ داغِ جگرِ عاشقِ محزوں ہی تو — تجھ کو مغزِ سرِ آمادۂ سودا کہیے

ستی

اے شمعِ زندگانی! آخر لبِ اجل نے — یکبار جل بجھی تو اِس طرح تجھ کو پھونکا
ممکن نہیں کہ روشن پھر ہو شرار تیرا — اس تیرہ خاکداں میں کیونکر گزر ہو میرا
اے نخلِ زندگانی! پائے قضا نے تجھکو — افسوس بیخ و بن سے پامال کر کے چھوڑا
ممکن نہیں کہ پھر تو سرسبز و باروَر ہو — جو نخل سوکھ جائے دشوار ہے کہ تر ہو
اے وجہ زندگانی! تلخیٔ مرگ نے یوں — ہم کو کیا دوپارہ جوں لفظ ہوں شکستہ
فی الاصل ایک تھے ہم جب ہو چکی جدائی — بیجان ہو کے قالب باقی نہیں رہیگا

شباب

تالاب حسین ساگر

بہار وقتِ سحر تیری سادگی پہ نثار — غضب کا روپ ہے تجھ پر بلا کا تیرا نکھار
فدائے ناز و ادا مہر عالم آرا ہے — فلک پہ ابرِ بہاری کا بھی تو پیارا ہے
گھٹائیں چرخ پہ کیا جھوم جھوم آتی ہیں — ترے جمال سے سیراب ہو کے جاتی ہیں
جھلک ہے صرف ترے یہ نقاب سیمیں کی — خبر کسے ہے ترے جلوہ ہائے رنگیں کی
کھلا ہوا گل و ریحاں کا ایک گلشن ہے — بھرا ہوا دُر و مرجاں سے تیرا دامن ہے
غرض تجھے تو ہے بادِ نسیم سے الفت — اُسی کے واسطے سب وقف ہے تری دولت
طریقِ بندگیٔ عشق تجھ کو زیبا ہے — چلن وفا کا مرے دل نے تجھ سے سیکھا ہے
ستم نسیم کے گو بار بار سہتا ہے — اُسی کے نشۂ الفت میں چور رہتا ہے
ہوائے تازہ کا ہر دم تو ایسا مفتوں ہے — ہر ایک لہر میں آوازِ نَے کا افسوں ہے

۵۴

اشاروں پر جو ہوا کے ہمیشہ چلتا ہے سرودِ عشق ہر اک موج سے نکلتا ہے

زباں پہ دیکھ کے تجکو یہ مصرعہ تر ہے

حیاتِ تازہ کی صورت حسین ساگر ہے

نصیر

تقدیر

نارسائی سے تری بختِ سیہ کیا ہوگا مجھکو تجھ سے نہ کبھی شکوۂ بیجا ہوگا

میں نہ ہونگا کبھی امداد کا خواہاں تجھ سے تیرا اے بخت نہ احسان گوارا ہوگا

بن گیا ہے تو مری جان کا دشمن لیکن سر جدا ہو، نہ جدا سر سے یہ سودا ہوگا

ٹوٹ بھی جائیں اگر میری امیدوں کے طلسم کم نہ ہرگز یہ مرا ذوقِ تماشا ہوگا

مٹ گئے پیش نظر تھے جو مرقعے دلکش تیرے بس میں مگر دیدۂ بینا ہوگا

مل گئی خاک میں گو سلطنتِ وہم و خیال اس خرابے میں گراں مایہ خزانا ہوگا

کر دے بیگانہ مجھے نغمۂ شادی سے مگر یادِ ایام کا دلچسپ فسانا ہوگا

زمزمے آکے سنائے گی نسیمِ اشراق طبعِ مواج میں اک شور سا پیدا ہوگا

راگ موجوں کا سنونگا صفتِ تارِ رباب پیچ میں حلقۂ گرداب ترانا ہوگا

لاکھ تو لذتِ گفتار سے کر دے محروم لب پہ لیکن نہ کبھی حرفِ تمنا ہوگا

گنگ ہو جائے اگر میری زبانِ گویا دل نالاں صفتِ بلبلِ شیدا ہوگا

باغ میں نغمۂ پُر شور عنادل ہوں ہزار نالۂ دل کا مگر رنگ نرالا ہوگا

گو تپِ عشق سے نہ ہو طاقتِ رفتار مجھے فکرِ رنگیں سے زمانہ تہ و بالا ہوگا

بڑھکے ہے بادِ صبا سے یہ مرا توسنِ فکر گرم جولاں روشِ آہوئے صحرا ہوگا

آسماں رس فرسِ فکر رسا ہے میرا خاک سے اڑکے رواں تا بہ ثریا ہوگا

A CHALLENGE TO FATE.

Why will you vex me with your futile conflict
Why will you strive with me, O Foolish Fate?
You cannot break me with your poignant envy
You cannot slay me with your subtle hate
For all the cruel folly you pursue
I will not cry with suppliant hands to you

You may perchance wreck in your bitter malice
The radiant empire of mine eager eyes
Say, can you rob my memory's dear dominion
O'er sunlit mountains and sidereal skies?
In my enduring treasuries I hold
Their ageless splendour of unravished gold

You may usurp the kingdoms of my hearing
Say, shall my scatheless spirit cease to hear
The bridle rapture of the blowing valleys
The lyric pageant of the passing year
The sounding odes and singing harmonies
Of battling tempests and unconquered seas?

Yea, you may smite my mouth to throbbing silence
Pluck from my lips power of articulate words
Say, shall my heart lack its familiar language
While earth has nests for her mellifluous birds?
Shall my impassioned heart forget to sing
With the ten thousand voices of the spring?

Yea, you may quell my blood with sudden anguish
Fetter my limbs with some compelling pain
How will you daunt my free far-journeying fancy
That rides upon the pinions of the rain?
How will you tether my triumphant mind
Rival and fearless comrade of the wind?

آرزوئے دلِ ناکام ہے خود مثلِ حباب　　ٹوٹ کر قطرہ مگر شاملِ دریا ہوگا
نقش بر آب ہے ساری ہوسِ نام و نمود　　فکر کیا میرا مخالف جو ستارا ہوگا
تشنۂ غم کو ڈبو دوں میں نہ لطفِ عظیم　　نذرِ تسلیم ہمیشہ دلِ دانا ہوگا

گنہگارِ محبت

سفیر

اے مہ حسن و جمال اے بتِ خورشید عذار　　سیکڑوں آہوئے صحرا تری آنکھوں پہ نثار
جس طرح طائر بے خوف اڑا کرتے ہیں　　اڑ کے کر لیتے ہیں افلاکِ معلیٰ کا حصار
کی ہو میں نے نگۂ چشمِ محبت تم پر　　دردِ دل کا اگر اشکوں نے کیا ہو اظہار
جز نظارۂ رخِ روئے دلِ صد چاک نہ تھا　　شوقِ دیدار نے آنکھوں کو کیا تھا لاچار
میں نے مانا کہ گنہگارِ نظر بازی ہوں　　کیا کروں اس کو کہ مجبور تھے یہ دیدۂ زار

بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں ان کو
کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار

دستِ حسرت نے اگر کی ہو کوئی گستاخی　　ہو کے بیتاب بنے ہوں جو گلے کا ترے ہار
بادۂ شوقِ محبت میں اگر ہو کر مست　　ہو گئے ہوں یہ کبھی مائلِ آغوش و کنار
اپنے آغوشِ محبت میں تمہیں لے لیکر　　ہو کے بیتاب نکالے ہوں گر ارمانِ دو چار
صورتِ زلف یہ پہنچے ہوں اگر تا بہ کمر　　ہو کے قربان چھوئے ہوں جو تمہارے رخسار
نذر کرنے کے لئے لائے ہوں تحفے یہ اگر　　ریگ کی طرح کہ ممکن ہی نہیں جنکا شمار

بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں ان کو
کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار

لبِ عشاق نے کھینچی ہو اگر آہ کوئی　　ہو کے سرگرمِ فغاں دل کا نکالا ہو بخار
ہو کے مجبور اگر عرضِ تمنا کی ہو　　لبِ نازک سے جو بوسوں کا لیا ہو اقرار
ضبطِ الفت سے جو فرقت میں رہے ہو خاموش　　رخِ زیبا کی ثنا میں جو پڑھے ہوں اشعار
الغرض جوشِ محبت میں اگر مست ہو کر　　لے لئے ہوں لبِ نازک کے جو بوسے دو چار
ہو کے بیدرد نکالی ہو تمنا دل کی　　لبِ جاں بخش کو پہنچا ہو اگر کچھ آزار

بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں ان کو

THE SINS OF LOVE.

Forgive me the sins of mine eyes,
O Love, if they dared for a space
Invade the dear shrine of your face
With eager, insistent delight,
Like wild birds interpid of flight
That raid the high sanctuaried skies
O pardon the sin of mine eyes!

Forgive me the sin of my hands·········
Perchance they were bold overmuch
In their tremulous longing to touch
Your beautiful flesh, to caress,
To clasp you, O Love, and to bless
With gifts as uncounted as sands
O pardon the sin of my hands!

Forgive me the sin of my mouth,
O Love, if it wrought you a wrong,
With importunate silence or song
Assailed you, encircled, oppress'd,
And ravished your lips and your breast
To comfort its anguish of drouth
O pardon the sin of my mouth!

کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار

قصۂ درد و الم تم کو سنایا ہو اگر — آہیں بھر بھر کے نکالا ہو اگر دل کا غبار
ہو کے پامالِ جفا ہجر میں تڑپا ہو اگر — بیقراری میں رہا ہو نہ اگر صبر و قرار
نام اغیار کا لے لے کے شکایت کی ہو — نالہ بن بن کے سنائی ہو اگر حالتِ زار
داغہائے دلِ پُر درد کی تسکیں کیلئے — بن کے مظلوم ہوا ہو جو ترا شکوہ گزار
ہو کے مجبور تقاضائے محبت سے اگر — حسرت و یاس و تمنا کا کیا ہو اظہار

بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں اِن کو
کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار

وفا

Forgive me the sin of my heart,
If it trespassed against you and strove
To lure or to conquer your love
Its passionate love to appease
To solace its hunger and ease
The wound of its sorrow or smart
O pardon the sin of my heart!

سروجنی دیوی کی ملکی و قومی خدمات

یہ خیال غلط اور غیر مدبرانہ ہے کہ حقیقی شاعری قومی و ملکی خدمات میں شامل نہیں ہے مسز نائیڈو سب سے پہلے شاعر ہیں اور انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندوستان کی عظمت و بزرگی کا سکہ سارے جہان کے دلوں پر بٹھا دیا ہے آج دنیا کے ہر مہذب ملک میں مسز نائیڈو کی مستقل عزت و شہرت ہندوستان کے لئے طرۂ امتیاز کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن ان کی ادبی خدمات کے علاوہ ان کی سیاسی خدمات بھی کسی طرح کم نہیں ہیں۔ جنگ عظیم کے زمانے ہی سے سروجنی دیوی نے ملکی سیاسیات میں آزادانہ شرکت کر لی تھی اور ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کانگریس میں حکومت خود اختیاری کی تائید نہایت پرجوش اور زوردار الفاظ میں کی اسکے بعد تمام ملک میں دورہ کر کے اپنے کمال نطق نے محفل سیاست کو گرما دیا۔ ۱۹۱۷ء میں افریقی ہندوستانیوں کے متعلق الہ آباد میں جو تقریر سروجنی دیوی نے کی وہ بے حد متاثر کن تھی بحکم ۱۹۱۷ء کے آخر میں کلکتہ کانگریس میں بھی سروجنی دیوی نے حکومت خود مختاری کے رزولیوشن کی تائید کی ۱۹۱۸ء میں کانجیورم میں صوبہ کانفرنس کے صدارت کے فرائض آپ نے انجام دیئے۔ ستمبر ۱۹۱۸ء میں بمبئی کی اسپیشل کانگریس میں عورتوں کی رائے دہی کے حقوق کا رزولیوشن دوبارہ پیش کیا۔ اور دسمبر ۱۹۱۸ء میں آل انڈیا سوشل سروس کانفرنس کی صدارت کے فرائض آپ نے انجام دیئے۔

تحریکِ ترکِ موالات کے شروع ہوتے ہی مسز نائیڈو کی سیاسی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں اور آپ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں ہمہ تن محو ہو گئیں۔

۱۹۲۳ء میں لکھنؤ کانفرنس میں آپ نے اردو میں تقریر فرمائی ۱۹۲۴ء میں آپ جنوبی افریقہ تشریف لے گئیں اور مکمل دورے کے بعد ہندوستانیوں کی حالت کا اندازہ کیا۔ آپ نے کوکناڈا کانگریس کی صدارت بھی فرمائی۔

جب امریکہ کی بدشہرت خاتون مس میو نے اپنی کتاب مدر انڈیا شائع کی جس میں ہندوستان کے اخلاق تہذیب سیاست تمدن اور مذہب کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو ہندوستانیوں نے آپ کو اپنا سفیر بنا کر امریکہ بھیجا تاکہ آپ اس بے بنیاد اور لغو پروپیگنڈہ کی تخلیف کریں۔

۱۹۳۰ء میں تحریک نمک کے سلسلے میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد آپ بھی گرفتار ہو گئیں اور "بغاوتِ چمن" کے سلسلے میں اس عندلیب نغمہ پیرا نے چھ ماہ "زندان و قفس" کے مصائب برداشت کئے۔ رہائی کے بعد پھر بلبل ہند نے اپنی ذات کو قوم کی راہ میں ستیہ آگرہ کے لئے پیش کیا۔ گاندھی اروِن پیکٹ کے وقت مہاتما گاندھی کے ساتھ شریکِ مشورہ رہیں۔

۲۹ اگست کو دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے سلسلے میں مہاتما جی کے ہمراہ انگلستان گئیں جہاں آپ کا شاندار استقبال کیا گیا۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپسی کے بعد آپ بھی دوبارہ زعمائے قوم کے ساتھ گرفتار ہو گئیں مگر زندان میں بھی بخوشی و عافیت زندگی گزاری — یہ بلبل جہاں تھی وہیں گلستاں تھا۔ ۱۹۳۳ء میں جیل سے آپ بھی رہا کر دی گئیں۔ مہاتما گاندھی کے تاریخی برت کے موقع پر آپ نے تیمارداری کر کے اخلاص انسانیت اور ہمدردی کا ثبوت دیا۔ گاندھی جی حیدرآباد میں آپ کے دولتکدہ کے علاوہ کہیں قیام نہیں فرماتے

اخلاقی طور پر سروجنی قومی غیرت سیاسی استقلال و ایمان، حب الوطنی، ہندو مسلم اتحاد، نیک نیتی، اخلاص، محبت، شرافت، بلندی، اور انسانیتِ کبریٰ کی بہت عظیم مظہر ہیں۔ اور اس کی نظیر ہندوستان کی کسی قوم نے آج تک پیش نہیں کی۔

قومی و سیاسی طور پر سروجنی کی بڑائی اور اہمیت کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ وہ قومی پارلیمنٹ (آل انڈیا نیشنل کانگریس ورکنگ کمیٹی) کی رکن ہیں۔

مسٹر کوڈیل ([illegible]) نے اُن پختہ اینٹوں کا بغور معائنہ کیا جنہیں کلدانی ۱۰۶۳ سے ۷۶۲ قبل مسیح، کسوف و خسوف کی تاریخ لکھنے کے کام میں لایا کرتے تھے اور ان اینٹوں سے تمر کئے خطوط طول البلد کی کمی وزیادتی کی جداول کی تصحیح و دیگر مفید معلومات میں بہت کچھ مدد ملی، کلدانیوں سے رومیوں اور یونانیوں نے علم فلکیات سیکھا، اہل یونان نے مصریوں سے بھی استفادہ حاصل کیا۔

کلدانیہ۔ اسیریہ۔ بابل ہیئت و نجوم کے گہوارے رہ چکے ہیں۔ جہاں سن عیسوی سے بہت قبل سیارگان کا مشاہدہ کیا جاتا تھا اور علوم سیارگان سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے، بابل میں ۵۳۹ سال قبل مسیح دوازدہ بروج میں کسوف و خسوف کی تقسیم کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا۔ اور اہل بابل کا مبلغِ علم صرف سیارگان کے مشاہدہ اور اُنکے اثرات تک محدود رہا

یونان کا علم ہیئت و نجوم ہندوستان میں پانچویں چھٹی صدی بعد ولادت مسیح آیا۔ یونانیوں اور مسلمانوں کے حملہ کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، یہ قومیں اہل ہند سے باہم مل جل کر رہنے لگیں اور تبادلہ خیال کا موقعہ ملا تو ایک دوسرے کے تخیلات و مصطلحات علمیہ سے واقف ہو گئے اور یہی سبب ہے کہ اہل ہند کی تصانیف میں دوسری قوموں کے بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ موجودہ علم نجوم خالص ہندوستانی نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں کلدانی۔ مصری و یونانی کا بہت کچھ عنصر شامل ہو جانے سے مختلف اقوام کے تخیلات کا ایک مجموعہ بن گیا۔ جو آجکل مروج ہے [4]

عربوں نے یونانیوں کے علم فلکیات اپنی زبان میں منتقل کرکے اس کو ترقی دی، ہندوستانیوں اور سریانیوں سے بھی بہت کچھ سیکھا اور ان کے تصانیف کے تراجم کرکے اُن کی تصحیح کی اور اس کو ترقی پر پہنچایا، مسلمانوں کے فلکیات کے متعلق کارنامے مشہور ہیں، بطلیموس جدولین کو نہایت کاوش فکر و جانفشانی سے باریک کیا، نہ صرف یہی بلکہ چاند کی خرابیوں کا بھی پتہ چلایا، عربوں نے خط نصف النہار کے ذریعہ طول درجہ کا قانون بنایا بہت سی رسدگاہیں قائم کیں اور حرکات قمر کے لئے بہت سی جدولیں بنائیں یہاں تک کہ عرب یونانیوں سے علم فلکیات میں سبقت لے گئے۔ یونانیوں کی نگاہیں صرف نظریات تک محدود رہیں اور عربوں نے عملی طور پر حصہ لیا۔

پنچانگ (جنتری) میں سب سے بڑا نقص یہ پایا جاتا ہے کہ ایک میں جو تھتی اور تاریخ ہے وہ دوسرے پنڈت کی طیار کردہ پنچانگ سے منطبق نہیں ہوتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبی رسومات تمام شہروں میں ایک دن و تاریخ کو منائے جانے سے سخت دشواریوں سے اکثر دوچار ہونا پڑتا ہے، دو سو سال سے زائد زمانہ گزرا کہ راجہ جے سنگھ (۱۶۹۹-۱۷۴۳ء) والئ ریاست جے پور نے خود یہ بات محسوس کی کہ جنتریاں اور پنچانگ جو تیار کئے جاتے ہیں وہ بالعموم غلط ہوتے ہیں، جو اوقات سیارگان کے مطالع و مغارب کے ان میں درج کئے جاتے ہیں وہ عینی مشاہدات کے بالکل برعکس پائے جاتے ہیں نیز کسوف و خسوف کا جو وقت دیا جاتا ہے اور جرم نیرین کے گہن کی جو پیشین گوئیاں کیجاتی ہیں وہ بھی تجربہ سے پوری نہیں اُترتیں اس میں بھی اکثر کچھ نہ کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ راجہ موصوف کی نگاہیں اس کے نقائص کی طرف مائل ہو جائیں اور یہ بات محسوس کی کہ قدیم سدھانت سرومنی پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، اور قدیم مقررہ اصول و قواعد پر عمل کرنے سے یہ اختلاف پایا جاتا ہے۔

بھسکارہ [5] کے وقت سے اس میں نظر ثانی کا موقعہ اب تک نہ آیا، اور جب تک نظر ثانی سدھانت سرومنی میں نہ ہوگی یہ اختلاف بدستور قائم رہے گا۔ اس اختلاف کو دور کرنے کی غرض سے راجہ جے سنگھ نے محمد شاہ (۱۷۱۹-۱۷۴۸ء) کی اجازت سے رصدگاہیں دہلی۔ جے پور۔ بنارس و اجین میں قائم کرائیں تاکہ تقویم صحیح تیار کی جائیں، ان میں سے قدیم دہلی کا جنتر منتر ہے جو ۱۷۱۰ء میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ شاہی رصدگاہ اپنی طرز خاص کے لحاظ کر بہت ہی قدیم ہے۔ جس طرح گرینچ (Greenwich) کی شاہی رصدگاہ میں دائرۂ منطقۃ البروج اور الترنیمہ (Altazimuth) بڑے بڑے آلات ہیں اسی طرح دہلی کے جنتر منتر میں بھی اسی غرض و غایت کے لئے آلات رصد تیار کرائے گئے تھے جو دائرہ منطقۃ البروج والترنیمہ کی ضروریات کے قائم مقام تھے۔

بنارس اور دہلی کی رصدگاہیں کس مپرسی کی حالت میں رہ کر برباد ہو گئیں اور جے پور کی رصدگاہ اچھی حالت میں اب تک قائم ہے، اس سے ریاست کیا فائدہ اُٹھا رہی ہے پبلک کو اس کا علم نہیں ہوتا اور عام طور پر پبلک اس سے فائدہ اُٹھانے سے محروم ہی رہتی ہے۔

"[6] نجوم، جوتش اور رمل سب کو معلوم ہے کہ یہ چیزیں ہندوستان سے کس قدر تعلق رکھتی ہیں دولت عباسیہ کے دوسرے خلیفہ منصور ہی کے وقت سے جو ۱۳۶ھ میں تخت نشین ہوا عرب میں ان چیزوں کا رواج ہوا، منصور کو ان باتوں سے بڑی دلچسپی تھی چنانچہ بغداد کا شہر جب اُس نے بنوایا تو اُس کی ہر چیز زائچہ کھینچ کھینچ کر تیار کی گئی۔ دربار پر پہلے ایرانی منجموں کا قبضہ تھا پھر ہندوستانی جوتشیوں نے اپنا عمل دخل جمایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ منصور ہی کے زمانے میں اس فن پر ہندی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں ان جوتشی پنڈتوں میں سے عربوں میں سب سے مشہور نام کنکہ پنڈت کا ہے"

(نوٹ) [4] ملاحظہ ہو صفحہ ۱ ڈائرکٹ اسٹرولاجی از ڈاکٹر و.ی. جی. ریلے، ایل. ایم اینڈ ایس۔ ای۔ او پی۔ ایس [5] بھسکارہ سدھانت سرومنی کا مصنف ہے جن کو تقریباً چھ سو سال سے زائد زمانہ ہوا، [6] دیکھو صفحہ ۱۵۳ "عرب اور ہند کے تعلقات" [7] ملاحظہ ہو ۱۵۲ "عرب اور ہند کے تعلقات"

(باقی آیندہ)

فلکی اجمیری

"شاہکارِ فراق"

تصویر تیری دیکھ کے رونا وہ ہجر میں
رونے کے بعد پھر تری تصویر دیکھنا

فکر ایم اے

منچوریا میں چین و جاپان کی کشمکش

منچوریا میں چین و جاپان کی کشمکش برابر بڑھتی جا رہی ہے ابھی تو یہ جنگ بظاہر دو ہمسایہ قوموں کی باہمی نبرد آزمائی کی حیثیت رکھتی ہے لیکن ماہرین سیاست کو اندیشہ ہے کہ کہیں منچوریا میں چین و جاپان کی شرر بار توپیں کہیں آنے والی عالمگیر جنگ کو سلامی نہ دے رہی ہوں۔

منچوریا کی پیچیدہ سیاسیات کو سمجھنا آسان نہیں ہے موجودہ کشمکش کے اسباب و علل اور اس کے عقبی نتائج کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے ہمیں مختلف واقعات کی کڑیاں ملانا پڑیں گی۔

بیسویں صدی کے آغاز تک منچوریا پر روسی اثرات غالب تھے۔ ۱۹۰۵ء میں جنگ روس و جاپان کے خاتمہ پر معاہدہ "پورٹس ماؤتھ" کے ذریعہ روس نے اپنے حاصل کردہ حقوق جاپان کو دیدیے اور حکومت چین نے بھی اس معاہدہ پر مہر توثیق ثبت کی۔

معاہدہ پورٹس ماؤتھ کے ذریعہ جاپان کو منچوریا میں جو حقوق و اختیارات حاصل ہوئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت چین کے اندر ایک مستقل حکومت قائم کی جائے جس کا برائے نام شمار تو چینی ممالک محروسہ میں ہو لیکن جو حقیقت میں ماتحت جاپان کے ہو۔ جنوبی منچوریا ریلوے جس کا سلسلہ ڈیرن سے چانگ چن تک ہے روسیوں کے روپیہ اور محنت سے تیار ہوئی تھی لیکن جنگ روس و جاپان کے خاتمہ پر یہ جاپان کو مل گئی اور اس کے ساتھ ہی انہیں منچوریا کے پایۂ تخت مکڈن سے بندرگاہ انٹنگ تک متذکرہ بالا ریلوے لائن کی ایک نئی شاخ نکالنے کا بھی حق حاصل ہو گیا۔

معاہدہ پورٹس ماؤتھ کی رو سے جاپان کو ایک اور خاص فائدہ یہ ہوا کہ جزیرہ نمائے سیاؤتنگ میں جنوبی منچوریا ریلوے کے اختتام پر ۱۴۴۱ مربع میل کا علاقہ کوانٹنگ اسی طرح "پٹہ پر" مل گیا جس طرح نظام حیدرآباد کا علاقہ برار حکومت ہند کے پاس پٹہ پر ہے۔

منچوریا کا مجموعی رقبہ تین لاکھ بیاسی ہزار مربع میل ہے۔ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوانٹنگ کا رقبہ بظاہر کوئی حقیقت نہیں رکھتا لیکن تجارتی اور بحری مفاد کے لحاظ سے یہ علاقہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اس کی بندرگاہ ڈیرن منچوریا میں تمام جاپانی توقعات اور امیدوں کا مرکز ہے۔ جاپان بظاہر کسی ممکن قیمت پر بھی اس سے دستبردار ہونا گوارا کرے گا۔ کچھ عرصہ کے بعد اگر منچوریا اور منگولیا کی حالت کچھ بھی سنبھل گئی تو ڈیرن اپنی تجارتی اہمیت میں شنگھائی سے بازی لیجائیگا۔ اور وادی یانگزی کے بیس کروڑ باشندے بیرونی دنیا سے ڈیرن ہی کے ذریعہ تجارت کرینگے علاوہ بریں اس علاقہ میں نہایت نفیس تیل نکلتا ہے۔

۱۹۱۵ء میں پٹہ ختم ہو جانے کے دن قریب آئے تو جاپان نے اپنے مشہور اکیس مطالبات کے ذریعہ چینی حکومت سے بزور قوت اس کی میعاد بڑھوالی۔ اس وقت یوروپین ممالک عالمگیر جنگ میں مبتلا تھے اس لئے جاپان کو اور بھی اچھا موقع مل گیا۔

اس دوران میں جاپان نے اپنی اقتصادی تعمیر میں منچوریا کو اس قدر مدغم کر لیا کہ اگر اب وہ منچوریا میں اپنے حقوق سے دستبردار ہونا چاہے تو اس کے قومی مفاد پر زبردست اثر پڑے گا۔ اقتصادی اہمیت کے علاوہ جاپان منچوریا کو روس کے خلاف اپنی مدافعت کا پہلا محاذ سمجھتا ہے منچوریا زراعتی اور معدنی لحاظ سے بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ زمین سرسبز و شاداب ہے۔ دوسری چیزوں کے علاوہ سوئے کی پھلیاں اس قدر کثرت سے پیدا ہوتی ہیں کہ انہیں منچوریا کی زرعی دولت کہا جا سکتا ہے تمام دنیا میں جس قدر سوئے کی پھلیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا اسی فی صدی حصہ صرف منچوریا میں پیدا ہوتا ہے۔ معدنی لحاظ سے منچوریا میں لوہے اور کوئلے کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔

۱۹۱۵ء میں چین نے مجبور ہو کر جاپانی پٹوں کی پھر تجدید کر دی انٹنگ کے جاپانی پٹہ کی میعاد ۱۹۹۷ء میں جنوبی منچوریا ریلوے کی ۲۰۰۲ء اور انٹنگ مکڈن ریلوے پٹہ کی میعاد ۲۰۰۷ء میں ختم ہوتی۔ علاوہ بریں اس سال جاپان نے منچوریا میں کان کھودنے اور زمینیں پٹہ پر حاصل کرنے اور دوسروں کو پٹہ پر دینے کے حقوق بھی جبراً حاصل کر لئے یہ ہے مختصر الفاظ میں جاپان کی مشہور اکیس مطالبات کا خلاصہ۔ چین کے قومی جذبات اس المناک جاپانی جذبۂ ملوکیت کے ہمیشہ خلاف رہے ہیں ۱۹۱۷ء میں چین نے اپنی اندرونی بدنظمیوں سے مجبور ہو کر منچوریا میں جاپان کے یہ امتیازی حقوق بخوف جنگ ضرور منظور کئے لیکن اسے اپنی مملکت میں ایک غیر قوم کی یہ مداخلت و غارتگرانہ دست برد بہت ناگوار رہے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو جاپان نے چینی سپاہیوں پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے افسروں کی زیر ہدایت دو ایک مقامات پر جنوبی منچوریا ریلوے کی پٹریاں اکھاڑ دیں معاہدۂ پورٹس ماؤتھ کی رو سے جاپان کو ریل کے راستہ پر "محافظ دستہ" کے نام سے فوج رکھنے کا حق حاصل ہے اس الزام میں جاپانی ریلوے کے ان "محافظ دستوں" نے (جن کے قیام کا مقصد معاہدات کی رو سے صرف اس قدر ہے کہ وہ ریلوے لائن کی حفاظت کریں) چینیوں کے خلاف اس طرح جنگی کارروائی شروع کر دی کہ گویا یہ ملک چینیوں کا نہیں بلکہ جاپانیوں کا ہے۔ ڈیرن سے چانگ چن کا جاپانی سپاہیوں کا تانتا بندھ گیا اور انہوں نے جنوبی و وسطی منچوریا کے تمام اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔

اس دن سے آج تک جینوا۔ واشنگٹن اور ماسکو کے مسلسل انتباہ کے باوجود جاپان منچوری علاقوں پر قابض ہے انجمن اقوام کی کونسل نے اس کو ہدایت کی وہ ۱۶ نومبر تک اپنی فوجیں معاہدہ پورٹس ماؤتھ کی رو سے طے شدہ رقبہ کے اندر واپس بلالے لیکن جاپان نے کوئی سماعت نہ کی اور اس وقت بھی اس کی فوجیں جنوبی منچوریا ریلوے

کی شمالی حد سے تقریباً تین سو میل آگے تک بڑھی ہوئی ہیں۔

متحدہ ریاستہائے امریکہ نے برابر اس امر کی کوشش کی کہ جاپان آئین انصاف کی شاہراہ سے معزول نہ ہو۔ پہلے انجمن اقوام میں یہ تحریک اُٹھانے کا خیال تھا کہ میثاق کیلاگ کا احترام مدنظر رکھا جائے جس کی رو سے لڑائیوں پر بندش کی گئی ہے لیکن اس سلسلہ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنگ کس وقت میں جنگ نہیں ہے؟ کیونکہ اگرچہ منچوریا میں گزشتہ ماہ ستمبر سے چین اور جاپان کے درمیان کشمکش ہو رہی ہے لیکن دونوں کی سفارتی تعلقات منقطع نہیں ہوئے اور نہ دونوں حکومتوں نے باقاعدہ اعلان جنگ کیا۔ لہذا واشنگٹن میں نو دول کے باہمی میثاق پر زور دیا گیا جو ۱۹۲۲ء میں واشنگٹن کانفرنس کے موقع پر مرتب ہوا تھا اور جس کو بعض اوقات چین کیلئے "بین قومی منشور اعظم" کہا جاتا ہے۔

اس معاہدہ کے ذریعہ منچوریا پر چین کا فرض حکمرانی تسلیم کیا گیا ہے اور اس بات کی ذمہ داری کی گئی ہے کہ منچوریا کا دروازہ تمام اقوام عالم کی تجارت کے لئے مساویانہ طور پر کھلا رہے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جاپان کی ترکتازیوں سے نو دول یورپ کے متفقہ میثاق کی دھجیاں فضائے منچوریا میں اُڑ رہی ہیں منچوریا کے مشرقی صوبہ کرین میں جاپانیوں نے اپنی جانب سے ایک گورنر مقرر کر دیا ہے مکڈن میں یوان جن کائی نامی ایک خوشنویس کو صدر حکومت بنا کر بٹھا دیا ہے۔ اور یہ بھی افواہ گرم ہے کہ منچوریا کے سابق تاجدار ہنری یو۔ پی کو جاپان منچوریا کے تخت پر دوبارہ بٹھانا چاہتا ہے۔

واقعات منچوریات روس کا تعلق ایک بالکل دوسری نوعیت کا ہے۔

نو دول یورپ کے متذکرہ بالا معاہدہ میں وہ شریک نہیں

ـــــــ میثاق کیلاگ پر اس نے دستخط ـــــــ ہیں لیکن وہ اسے ردی کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ نہیں سمجھتا اس لئے دوسرے دول مغرب کی طرح جاپان کے خلاف یہ اعتراض نہیں کر وہ کسی معاہدہ یا میثاق کی خلاف ورزی کر رہا ہے بلکہ شمالی منچوریا کے جس کے علاقہ میں جاپان دست قطاول دراز کر رہا ہے۔ وہاں روس کے بعض مفاد ہیں بشمول جس چینی مشرقی ریلوے کا مستقر ہے وہ چین کے ساتھ ہی روس کی بھی ملکیت ہے اس طرح یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ منچوریا میں اس وقت چین جاپان اور روس کے خصوصاً اور بعض دوسری مغربی حکومتوں کے مفاد عموماً اپنا کام کر رہے ہیں چینیوں کو یہ فکر ہے کہ ان کا ملک غیروں کی دست برد سے بچے جاپان منچوریا پر زیادہ سے زیادہ قبضہ جمانا چاہتا ہے اور روس کو یہ فکر ہے کہ جاپان کے ہاتھوں منچوریا میں اس کے مفاد خاک میں نہ ملیں امریکہ وغیرہ دول مغرب میں بعض سے جاپان کو کاوش ہے بعض کو روس سے اور ممکن ہے کہ چند طاقتیں نیک نیتی کے ساتھ معاہدات کا احترام مدنظر رکھنا چاہتی ہوں۔

چین اور جاپان کی کشمکش کوریا کے ایک واقعہ سے معلوم ہوا تھا کہ ونپاؤں میں چند چینی اور کوریں باشندوں کی کچھ چپقلش ہوئی اس میں جاپانی پولیس اور منچوری فوج نے حصہ لیا اور اس طرح تمام کوریا میں چینیوں کے خلاف پروپیگنڈا شروع ہو گیا اور چین میں جاپانی مال کا بائیکاٹ ہونے لگا۔ ۱۸ ستمبر کو جاپان نے منچوریا میں جو مداخلت کی وہ در اصل کوریا کے اسی معمولی واقعہ کا شاخسانہ تھی

۱۹۱۵ء کے معاہدہ کی رو سے جاپان کو منچوریا میں زراعت کا حق حاصل ہے

زمین پٹہ پر لینا بظاہر ایک معمولی بات ہے لیکن چین میں ایسی خاص اہمیت حاصل ہے قوانین ملکی کی رو سے سوائے مشنریوں کے چینی معاہدات کی رو سے خاص حقوق حاصل ہیں کوئی غیر ملکی باشندہ زمین پٹہ پر حاصل نہیں کر سکتا اور اہل چین اس بندش کے عائد کرنے میں حق بجانب بھی ہیں کیونکہ یہاں غیر ملکی باشندے چینی قانون اور عدالت کی دسترس سے باہر ہیں اور اگر کوئی غیر ملکی زمین حاصل کرے تو چینی حکومت اس کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتی بعض غیر ملکی باشندوں کو زمین پٹے پر حاصل کرنے اور دوسروں کو پٹے پر دینے کے جو اختیارات حاصل ہیں وہ چینیوں کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں کیونکہ اس طرح ان کی راہ میں شدید دشواریاں حائل ہو جاتی ہیں۔

جاپان کو شروع میں امید تھی کہ وہ اپنے کسانوں کی کثرت تعداد سے اس حصہ ملک پر تمام و کمال تسلط جما لیں گے لیکن انہیں مایوسی ہوئی منچوریا کے دو کروڑ ستر لاکھ باشندگان میں صرف ڈھائی لاکھ جاپانی ہیں اور ان میں بھی بڑا حصہ کاشتکاری نہیں کرتا بلکہ اسٹورکیپروں منیجروں اور ریلوے ملازموں کی حیثیت سے کام کرتا ہے منچوریا میں جاپانی کاشتکاروں کی تعداد بہت ہی کم اور برائے نام ہے اس کی ایک خاص وجہ ہے کہ جاپانی قوم فطری طور پر اپنے وطن سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتی پچھلے سال شمالی امریکہ میں جاپانیوں کی ہجرت کے متعلق ان دونوں ممالک میں کچھ کشیدگی ہوئی تھی۔ خاید ناظرین یہ خیال کریں کہ اگر جاپانی قوم ضرورت سے زیادہ "وطن پرست" واقع ہوئی ہے تو پھر یہ قبضہ کیوں ہوا تھا اس سلسلہ میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ۱۹۱۰ء لغایت ۱۹۱۹ء یہ دس سال جاپانیوں کی تاریخ میں ایسے ہیں کہ اس کے باشندوں نے سب سے زیادہ تعداد میں دوسرے مقامات پر ہجرت کی لیکن "عظیم الشان" مجموعہ تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار ہے! اور اس کے مقابلہ پر ان ہی دس برسوں کے اندر جاپان کی آبادی میں ساٹھ لاکھ کا اضافہ ہوا ایک جاپانی اپنے وطن کی نان خشک کو پردیس کی مکلف غذاؤں پر ترجیح دیتا ہے۔

اگر جاپانی باشندے انتہائی مجبوری کے عالم میں اپنے وطن سے باہر نکلیں بھی تو اقتصادی لحاظ سے منچوریا ان کے لئے زیادہ پُر منفعت مقام نہیں جاپانی کاشتکار محنت میں چینیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ پردیسی جاپانیوں کی بسر اوقات کے لئے کافی نہیں لہذا جاپانی سب سے زیادہ برازیل جاتے ہیں۔

چینی مزدور جاپانی مزدوروں سے تو بازی لیجاتے ہیں لیکن کوریہ والوں سے انہیں منہ کی کھانا پڑتی ہے چینیوں کے مقابلہ میں کوریوں کی خوراک ارزاں ہے اس لئے وہ منچوریا کے چینی مزدوروں سے زیادہ کم اُجرت پر کام کر سکتے ہیں علاوہ ازیں کورین کاشتکار چینی کاشتکاروں سے باعتبار قابلیت افضل ہیں۔

اس مقابلہ کا تعلق چونکہ براہ راست پیٹ سے ہے اس لئے چینی اور جاپانی مزدوروں اور چینی اور کورین مزدوروں کے درمیان معاندانہ جذبات برابر بڑھتے جاتے ہیں اس سال پیشتر تک چینیوں اور کوریوں کے تعلقات خوشگوار تھے لیکن کچھ تو جاپان کی ریشہ دوانیاں اور کچھ پیٹ کا سوال۔ اب ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے ہیں منچوریا میں اس وقت دس لاکھ کے قریب کورین باشندے ہیں اپنی کثرت آبادی کو دیکھتے ہوئے چینی باشندے بھی منچوریا میں ہجرت کے لئے اب مجبور ہو رہے ہیں اور منچوریا میں کورین اثرات غالب دیکھ کر ناراض ہوتے ہیں کیونکہ

سوال معیشت کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کورین قوم جاپان کے زیرنگین ہے۔

منچوریا میں کورین نے اقلیت کے اس اقتصادی سوال سے بہت زیادہ سیاسی اہمیت حاصل کرلی ہے۔ چینی منچوریا میں کوریوں کے داخلہ کو جاپانیوں کا داخلہ سمجھتے ہیں اور ایک مصیبت یہ ہے کہ اگر کورین باشندے چینی قومیت بھی اختیار کرلیں تب بھی جاپان ان کو اپنی رعایا سمجھتا ہے۔ لہذا اہل کوریا اپنے اس حق سے اور بھی فائدہ اٹھاتے اور جاپانیوں کے آلہ کار بنتے ہیں۔

متذکرہ بالا وجوہ سے تمام سمجھدار چینیوں کی یہ خواہش ہو رہی ہے کہ وہ جابرانہ معاہدات منسوخ کئے جائیں جو جاپان نے چین کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تسلیم کرا لئے تھے۔

جاپانیوں کے خیال میں معاہدات کے خلاف اس تحریک تنسیخ میں منچوریا کے مشہور جنگی سردار مارشل جنگ سولیان کا زبردست ہاتھ ہے اس مارشل کو جاپانیوں نے مکڈن میں داخل ہونے کی ممانعت کردی ہے۔ یہ نوجوان محب وطن اس مشہور بوڑھے سردار چانگ سولن کا بیٹا ہے جس نے چینی حکومت سے اختلافات رکھنے کے باوجود جاپان کا آلہ کار ہونا کبھی منظور نہ کیا۔ مارشل جنگ سولیان مادر وطن کی کچھ خدمت کرنا چاہتا ہے اور اس کا مقولہ ہے کہ چین میں صرف چینیوں ہی کو حق حکمرانی حاصل ہوسکتا ہے۔

مارشل مذکور نے منچوریا کے باشندوں کو حب وطن کا سبق پڑھایا اور ان کے رگ و ریشہ میں جاپانی امپیریلزم کے خلاف معاندانہ جذبات پیوست کردئے باوجودیکہ نو ممالک کے عہد نامہ پر جاپان کے بھی دستخط ہیں۔ لیکن وہ منچوریا کو چین سے علیحدہ کرنا چاہتا ہے جب کبھی کسی منچوری سردار نے دیوار چین کے جنوبی معاملات سے سروکار رکھا تو جاپانی اس سے ناراض ہوئے۔ بوڑھے چانگ سولن نے جب چین کے معاملات میں حصہ نہیں لیا تو جاپان نے اس کو پیکن نہ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ نوجوان جنگ سولن کے تعلقات چین کی قوم پرست جماعت اور کومن تان سے بہت مستحکم اور خوشگوار ہیں اس سے جاپانی اور بھی گھبرا رہے ہیں۔

منچوریا کا نوجوان طبقہ اپنے وطن میں جاپانی اقتدار کے سخت خلاف ہے اور ان کے دلوں میں یہ آگ آج سے نہیں بلکہ برسوں سے سلگ رہی ہے لیکن بعض بوڑھے سردار نوجوانوں کے جذبات کو قابو میں کئے ہوئے تھے۔ اب ملکی سیاسیات میں نوجوان پارٹی کا زیادہ اقتدار حاصل ہو رہا ہے اور ان کے سامنے بوڑھوں کی نہیں چلتی ہے۔ یہ زمانہ کا انقلاب دیکھکر منچوریا کے چند بوڑھے سرداران جنگ نوجوان طبقہ کا ساتھ دینے پر رضامند ہوگئے ہیں اور اکثر نے گوشۂ عافیت اختیار کرلیا ہے۔

ابتدا میں نوجوان جنگ سولیان کو غیر معمولی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اس نے اپنے ملک کی سیاسیات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک عزیز دوست سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ زمانہ گزشتہ میں چینی حکام کچھ وقت سلطنت کی اطاعت میں صرف کرتے تھے کچھ وقت اپنے صوبجاتی سرداروں کی اطاعت میں اور کچھ وقت اپنے لئے روپیہ جمع کرنے میں لیکن اب یہ حال ہے کہ نہ انہیں مرکزی حکومت کی پروا یا اطاعت ہے نہ مقامی حکومتوں کا خیال اور وہ اپنا تمام تر وقت روپیہ فراہم کرنے میں صرف کرتے ہیں لیکن نوجوان جنگ سولیان اس افسوسناک صورت حال سے مایوس نہیں ہوا بلکہ وہ قوم پرور کوششوں میں برابر مصروف رہا اور آخر میں کامیابی نے اس کے قدم چوم لئے آج منچوریا میں جمود و اختلال کا پہلا سا رنگ نہیں۔

نوجوان دلوں میں قومی جذبات نہایت تیزی کے ساتھ نشوونما پا رہے ہیں حب وطن کے ان ہی جذبات سے متاثر ہوکر چینیوں نے ریلوے لائنیں نکالنے کا پروگرام مرتب کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے مجوزہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں چینیوں نے انتہائی ذہانت اور قابلیت کا ثبوت دیا ہے انہوں نے بعض شدید مواقعات کے باوجود منچوریا میں تقریباً آٹھ سو میل کے قریب ریلوے لائن اپنے سرمایہ سے تیار کی ہے اسپین مکڈن ریلوے چینیوں نے برطانوی سرمایہ سے تیار کی ہے۔ اس طرح اب چینی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ منچوریا میں اُن کی زیر ملکیت ریلوے لائنیں روس اور جاپان کی ریلوے لائنوں سے زیادہ طویل ہیں۔ اگر چینیوں کی راہ میں برابر دشواریاں حائل نہ کی جائیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ جہانتک ریلوے کا تعلق ہے چین منچوریا میں اپنی غیر معمولی قابلیت و محنت کا ثبوت دے۔

اصل میں منچوریا میں چینی ریلوے لائنوں کا سلسلہ مارشل جنگ سولن نے شروع کیا تھا۔ مکڈن میں برسر اقتدار ہوکر اس کی خواہش تھی کہ وہ چینی مشرقی ریلوے سے بے نیاز ہوجائے۔ ۱۹۲۵ء میں جب ایک بغاوت رونما ہوئی تو چینی مشرقی ریلوے کے روسی منیجر نے مارشل فوجوں کا پیشگی کرایہ وصول کئے بغیر جانے سے انکار کر دیا تھا۔

اس واقعہ کا مارشل جنگ سولن پر بہت زیادہ اثر ہوا اس وقت اس نے کسی نہ کسی طرح اپنا کام نکال لیا لیکن اس کے بعد اس نے ریلوے لائن کی تیاری کا کام شروع کیا اور چینی مشرقی ریلوے کے متوازی بہت جلد ایک نئی لائن نکال کر وہ اول الذکر ریلوے لائن سے بے نیاز ہوگیا۔

اس اہم کام سے فارغ ہوکر اس نے فوراً ہی جنوبی منچوریا ریلوے کے متوازی بھی ایک نئی ریلوے لائن نکالنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ مکڈن ریلوے سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر بندرگاہ ہولوتاؤ میں ریلوے لائن کی تعمیر کا کام شروع کردیا۔ اس طرح نوجوان مارشل جنگ سولیان کی خواہش یہ تھی کہ ان کی مجوزہ ریلوے لائن ڈیرن کے جاپانی بندرگاہ سے بھی بالکل آزاد و بے نیاز رہے۔ اس نئی تجاویز سے جاپانی حلقوں میں اور بھی سراسیمگی پھیلی کیونکہ یہ جاپانیوں کے اقتصادی اور سیاسی مفاد سے متصادم ہو رہی تھیں۔

جاپان جانتا تھا کہ اگر جنوبی منچوریا ریلوے کے مقابلہ پر کوئی ریلوے لائن نکل آئی تو اس کے محاصل میں کمی ہوجائیگی اور وہ منچوریا میں تجارت کا بھی واحد ٹھیکہ دار نہ رہ سکے گا۔ علاوہ بریں مکڈن میں کسی مخالف فوج کا پہنچنا بہت آسان ہوجائیگا اسی لئے اس مجوزہ نئی ریلوے لائن کی شدید مخالفت شروع کی لیکن چونکہ محب وطن چینی جاپان کے سرمایہ سے بے نیاز ہوچکے تھے اس لئے انہوں نے جاپانی مخالفت کی ذرہ برابر پروا نہ کی اور ریلوے لائن تعمیر ہوتی رہی۔

۱۹۲۷ء میں جب اس نئی ریلوے لائن کا دوسرا دور تعمیر شروع ہوا تو جاپان نے خطرے کا بگل بجایا کہ معاہدات کی رو سے چین کو جنوبی منچوریا ریلوے کے متوازی کوئی نئی ریلوے قائم کرنے کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے۔ مسٹر یوشی زادا جاپانی سفیر پیکن نے پوری قوت کے ساتھ چینی حکومت کے سامنے احتجاج کیا اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر چین نے اس ریلوے لائن کی تعمیر فوراً ہی نہ روک دی تو جاپان

اس کے خلاف اعلان جنگ کردے گا۔
اس موقع پر جاپان نے یہ سوال اٹھایا کہ قدیم معاہدات کی خلاف ورزی کر کے چین جنوبی منچوریا ریلوے کے متوازی کوئی نئی ریلوے لائن تعمیر کرتا ہے تو جاپان کو بھی جنوبی مشرقی ریلوے کے متوازی ایک نئی ریلوے لائن نکالنے کا حق حاصل ہے۔ اس دوران میں بوڑھے منچوری سردار چنگ سولن کے انتقال سے جدید چینی ریلوے لائن کا سلسلہ معرضِ تعویق میں پڑ گیا ورنہ اب سے ڈھائی تین سال پیشتر ہی چین اور جاپان کی جنگ شروع ہو گئی تھی۔
(ترجمہ)

رُباعیات آسی

ہمارے دوست حضرت مولانا عبدالباری آسی ہندوستان کے اُن پختہ فکر شعراء میں سے ہیں جن کا دنیائے ادب میں ایک خاص درجہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ جناب آسی کو رباعی گوئی میں بطورِ خاص ملکہ حاصل ہے۔ کئی ہزار رباعیات اس وقت تک کہہ چکے ہیں جن کا انتخاب عنقریب ادبی مرکز کی جانب سے شائع کرنے کی عزت حاصل کی جائے گی۔ جناب آسی رباعی میں اپنے کسی خاص نظریہ حیات یا مخصوص فلسفۂ زندگی یا اپنے پیغام کی ہم آہنگی و اعادہ کے لحاظ سے کہاں تک مستقل ہیں یہ تو انتخاب کے مطالعہ کے بعد ہی معلوم ہو سکیگا۔ مگر مجھے جستہ جستہ لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہے اس لئے میں اپنی محدود واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے جس رباعی میں جس خیال کو ظاہر کرنا چاہا ہے قوت اور شیرینی کے ساتھ ظاہر کیا ہے اور وہ ایک قادر فن کی حیثیت سے کامیاب ہوئے ہیں۔ مگر عام طور پر اپنی رباعیات میں آپ کچھ خیام کے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

ساغر

ساقی کیوں لب پہ یہ فغاں رکھا ہے　　کیوں شیشہ و جام کو نہاں رکھا ہے
یہ گوشۂ صحنِ باغ یہ عالم ہُو　　اللہ بھلا یہاں کہاں رکھا ہے

دل میں تپِ عشق سے تعب پیدا کر　　آئینِ وفا میں رہ ادب پیدا کر
جب کچھ بھی نہ ہو سکے تو کر خوب گناہ　　رحمت کا غرض کوئی سبب پیدا کر

عبرت دل کو جگا نہیں دیتی ہے　　قسمت کوئی پتا نہیں دیتی ہے
ہمت بڑھتی ہے جب خدا کی جانب　　غفلت اُسے راستا نہیں دیتی ہے

لذت تکلیف میں اُٹھاتے جاؤ　　نوحے کی دُھنوں میں نغمے گاتے جاؤ
عبرت کا سبق صحیفۂ فطرت سے　　پڑھتے جاؤ مگر بھلاتے جاؤ

سیماب نے کس سے بے قراری سیکھی　　شبنم نے کہاں سے آہ و زاری سیکھی
کانٹوں نے خلش کا راز کیوں کر جانا　　سب نے ایک ایک خو تمہاری سیکھی

کُھلتا ہی نہیں کوئی طلسمات جہاں　　مجبور نہ ہو تو کیا کرے پھر انساں
کچھ حد ہے فریب کی وہاں کے آسی　　گھٹنے کے لئے جہاں بڑھے عمرِ رواں

ہو جاتا ہوں پست جب اُبھرتا ہوں میں　　مغروریٔ نفسِ بد سے ڈرتا ہوں میں
پاتا ہوں خلوص تو یہ جس دن دل میں　　اُس روز گنہ ضرور کرتا ہوں میں

"آسی"

الہامات

مشاہیر شعراء کے تازہ افکار

شعر اور خصوصاً غزل کے لئے میں نے بالائی عنوان کو مناسب ترین خیال کیا اور گو یہ میرے قدیم رسالے کی سُرخی ہے مگر "ایشیا" میں بھی اسی کو قائم کرتا ہوں، چند کہ غزلوں کے لئے بہت سے عنوانات تجویز ہو سکتے ہیں مگر اس عنوان سے کم از کم دورِ پیمانہ کی یاد تازہ ہو جائیگی اور ناظرین کے ذہن و تصور کو اس انقلاب کا بہ آسانی اندازہ ہو سکیگا جو دس سال کی مدت کے لحاظ سے غیر متوقع نہیں ہے **الہامات** میں ہر ماہ مشاہیر اساتذہ اردو شاعری کا تازہ کلام شائع ہوا کریگا جس کا معیار یہ ہرگز نہ ہوگا کہ ہر غزل ایک ہی اسلوب شاعری کا آئینہ ہو بلکہ ہر رنگ کی غزل شائع کی جائے گی۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا رہے گا کہ اُردو شاعری میں اس وقت غزل کے کتنے جداگانہ اسکول ہیں۔

ساغر نظامی

حضرت جگر مرادآبادی

حُسن کس رنگ میں کھولے ہوئے آغوش نہیں
اس کو کیا کیجئے عرفان نہیں ہوش نہیں

رند جو مجھ کو سمجھتے ہیں انہیں ہوش نہیں
میکدہ ساز ہوں میں میکدہ بردوش نہیں

مٹ چکے ذہن سے سب یادِ گزشتہ کے نقوش
پھر بھی اک چیز ہے ایسی کہ فراموش نہیں

ایک گوشہ میں سمٹ آئے ہیں دونوں عالم
میرا دامن ہے کسی اور کا آغوش نہیں

اپنے ہی حُسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں
میری آغوش کو اب حسرتِ آغوش نہیں

حُسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حُسن
کونسی شے ہے جو آغوش در آغوش نہیں

عشق و وارفتگیٔ عشق کا افسانہ کہاں
میں جہاں اب ہوں وہاں حُسن کو بھی ہوش نہیں

تو بھی چاہے تو گوارا نہ کروں لطفِ وصال
تیرے آغوش کے قابل مرا آغوش نہیں

عشق گر حُسن کے جلووں کا ہے مرہونِ کرم
حسن بھی عشق کے احساں سے سبکدوش نہیں

پاؤں اٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کی طرف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

دل تو دل سنگ کو توڑو تو صدا دیتا ہے
چوٹ کھا کر کوئی بے حس بھی تو خاموش نہیں

مل کے اک بار گیا ہے کوئی جس دن سے جگر
مجھ کو یہ وہم ہے جیسے مرا آغوش نہیں

حضرت ثاقب لکھنوی

آئینۂ عبرت ہے مرا دل بھی جگر بھی — اِک درد کی تصویر اِدھر بھی اُدھر بھی

لُٹ کر بھی وہی بھیڑ ہے پہلو میں غموں کی — دِل کھو کے میں سمجھا کہ کوئی شے ہے جگر بھی

یارب یہ شکستِ دل کی صداؤں میں کہاں تھی

نالوں میں کچھ آواز ملاتا ہے جگر بھی

حضرت رِوآن (خلد آشیاں)

رِوآن نہ جانے قدم کیوں بڑھائے جاتے ہیں — پلٹ کے جب اُسی مرکز پہ آئے جاتے ہیں

حیات و موت پہ پردے گرائے جاتے ہیں — ہمارے راز ہمیں سے چھپائے جاتے ہیں

فضول موجبِ تہمت ہے دامنِ گلچیں — یہ شعلے پردے سے خود باہر آئے جاتے ہیں

ابھی افق پہ ہویدا نہیں ستارۂ صبح — مگر چراغ عبث جھلملائے جاتے ہیں

مآلِ کارِ محبت نہ پوچھ اے ہمدم — کہیں یہ راز کسی کو بتائے جاتے ہیں

کمالِ بیخودیٔ عشق بھی خودی ہے رِوآن

جنوں میں ہوش کے آثار پائے جاتے ہیں

حضرت احسن مارہروی

وہاں یہ حضرتِ دل بے بلائے جاتے ہیں — جہاں بلائے ہوئے بھی اُٹھائے جاتے ہیں

دلوں میں آرزوئیں شوقِ دید آنکھوں میں
کھلونے لے کے تماشے دکھائے جاتے ہیں
گھٹا گھٹا کے بڑھاتے ہیں ذوقِ نظارہ
اٹھا اٹھا کے وہ چلمن گرائے جاتے ہیں
نمودِ حشر نمائش ہے بھولے بھٹکوں کی
تمام عمر کے بچھڑے ملائے جاتے ہیں

حضرت ماہر القادری

نشاط و کیف کا عالم زمیں سے آسماں تک ہے
خدا معلوم! تیرے حُسن کی دُنیا کہاں تک ہے
محبت کو خیالِ ماسوا چھو بھی نہیں سکتا
ہوس کی جان پیمائی فقط سود و زیاں تک ہے
یہی طوفان مجھے آسودۂ ساحل بنائے گا
تلاطم میری کشتی کا شکستِ بادباں تک ہے
نظر آتا ہے کیوں ذرّوں میں عکسِ خطِ پیشانی
ابھی کچھ فاصلہ شاید جبیں سے آستاں تک ہے
تری مخمور آنکھوں کا تصور اے معاذ اللہ!
یہی محسوس ہوتا ہے کہ مستی لامکاں تک ہے
کوئی بچھڑے ہوؤں کی بات بھی سُنتا نہیں ماہر
جرس کی مہربانی کارواں سے کارواں تک ہے

حضرت مولینا بیخود دہلوی

جو تماشا نظر آیا اُسے دیکھا سمجھا
جب سمجھ آگئی دُنیا کو تماشا سمجھا
میں وہ ہوں حور کو چینی کا کھلونا سمجھا
باغِ جنت کو تری راہ میں کانٹا سمجھا
رازِ وحدت ہے زباں کا نہ دیگی اعلا
میں بتا ہی نہیں سکتا کہ اُسے کیا سمجھا
سنگِ در پر ترے سجدے کا شرف حاصل ہے
جس نے دیکھا مجھے وہ آئینہ سیا سمجھا

میں یہ سمجھا ہوں کہ سمجھیں نہ مری بات کو آپ | سر ہلا کر جو کہا آپ نے اچھا سمجھا

محوِ دیدار تھا میں ہوش کہاں تھا مجھکو | کوہ پر جو نظر آیا اُسے موسیٰ سمجھا

عشق کی شرح میں داخل ہے غلامی کا بیاں | اس کے ہر حکم کو میں اپنی تمنا سمجھا

اثرِ حسن کہوں یا کششِ عشق اسے | میں تماشائی تھا وہ مجھکو تماشا سمجھا

غیریت تک تھا پریشانی و فرقت کا گلا | کچھ شکایت ہی نہ تھی جب اُسے اپنا سمجھا

ایک وہ ہیں جنھیں دُنیا کی بہاریں ہیں نصیب | ایک میں ہوں قفسِ تنگ کو دُنیا سمجھا

میرا ہر شعر ہے اک رازِ حقیقت بیخودؔ
میں ہوں اُردو کا نظیریؔ مجھے تو کیا سمجھا

نواب جعفر علی خانصاحب اثرؔ بی اے لکھنوی

مثالِ برگِ خزاں رسیدہ ہوا ہے زرد آفتاب کیسا | مگر قیامت قریب آئی، کھلا ہے بندِ نقاب کیسا

دلِ ستمکش کو بجلیوں کا خزانہ جس نے بنا دیا ہے | تری نظر میں نہاں تھا ظالم یہ محشرِ اضطراب کیسا

ترے کرم پر کبھی ہے تکیہ، کبھی ہے خوفِ عتاب دل میں | یہی ہے جنت یہی ہے دوزخ، عذاب کیسا ثواب کیسا

میں اُن کے جلووں کا آئینہ ہوں، وہ میری حیرت کا آئینہ ہیں | جہاں یہ عالم ہو محویت کا، سوال کیسا جواب کیسا

کسی کو پیوند خاک کر کے پھر اُس کی تربت پہ رو رہے ہیں | ہوا یہ دنیائے عاشقی میں الٰہی! آج انقلاب کیسا

بجائے مے یاد میں کسی کی پیا ہے خونابِ دل وگرنہ
تمہاری آنکھوں سے آج ٹپکا اثرؔ یہ رنگِ شراب کیسا

کتب موصولہ پر ایک نظر

کلیاتِ طغرائی

یہ مجموعہ حکیم الشعراء فیروز الدین احمد طغرائی مرحوم امرتسری کے اُردو فارسی کلام پر مشتمل ہے جسے ہمارے دوست صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ایم اے نے نہایت تہذیب کے ساتھ ترتیب دیکر طغرائی صاحب کے تلامذہ اور احباب کی متحدہ امداد و کوشش سے شائع کیا ہے شروع میں تبسم صاحب کا دیباچہ ہے اس کے بعد طغرائی صاحب کی تصویر ہے پھر سوانح حیات اور اس کے بعد اُردو کلام پر حکیم محمد حسین عرشیؔ اور فارسی کلام پر ممتاز حسین صاحب ایم اے کے بیحد جامع تبصرے ہیں۔ تمام کتاب پانچ حصوں میں تقسیم ہے پہلے حصے میں متفرق اُردو نظمیں ہیں دوسرے میں اسلامی نظمیں تیسرے میں اُردو غزلیں چوتھے میں فارسی قصائد اور پانچویں حصے میں فارسی غزلیں ہیں سائز ۱۷×۲۷/۸ کاغذ و کتابت اور طباعت خوبصورت ہے جلد مضبوط و حسین حجم ۲۲۰ صفحات اور قیمت دو روپے (عہ) ملنے کا پتہ:۔ پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور۔ ۱۹۲۵ء میں جناب طغرائی مرحوم سے امرتسر میں بذاتِ خود مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ طغرائی صاحب اور ان کی جماعت نے کمالِ محبت سے دعوت دی تھی اور گھنٹوں لطفِ سخن رہا تھا۔ نہایت شریف المزاج بزرگ تھا اور پنجاب کے اساتذہ میں ان کا درجۂ کمال بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔ ان کے کلام میں صحتِ زبان زور اور اخلاقی پائی جاتی ہے۔ دقت یہ ہے کہ آرٹسٹ کا ارتقا حالات اور زمانے کی ساعدت سے بہت تعلق رکھتا ہے گو اس میں شک نہیں کہ حقیقی طور پر شاعر کی دماغی و روحانی ترتیب شاعر کی قوتِ فکر اور شاعر کا بنیادی مزاج کرتا ہے جس سے شعریت فطری کا تعلق ہوتا ہے۔ جہاں تک بنیادی مزاج کا تعلق ہے جناب طغرائی بلند پایہ شاعر تھے جہاں تک اسباب و مواقع کا تعلق ہے زمانے نے ان کا ساتھ نہیں دیا یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں کمل طور پر شاعرانہ سرمستی اور گونج نہیں پائی جاتی البتہ دماغی طور پر جذبات و احساسات اور واقعات کو نظم کر دینے پر پورے قادر تھے جا بجا سرمستی و گونج بھی پائی جاتی ہے مثلاً

عیاں میں آج اپنا سوزِ نہاں کر کے چھوڑونگا — جگر کے آبلوں کو آتش افشاں کر کے چھوڑونگا

ہنساؤنگا ہر اک بیدرد کو میں اپنے رونے پر — ہویدا ارتباطِ برق و باراں کر کے چھوڑونگا

اسی کی کشتِ مردہ کو کرونگا زندہ اشکوں سے — اسی پانی سے کارِ آبِ حیواں کر کے چھوڑونگا

غزل و قصیدہ میں حکیم صاحب "قدیم اسکول" کے متبع تھے اور جدید رنگ کی نظمیں کہنے پر مکمل طور پر قادر چنانچہ ہلال کے عنوان سے جو نظم اس مجموعہ میں صفحہ ۳۱ پر درج ہے وہ ان کے کمالِ شاعرانہ کی آئینہ دار ہے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

ہر چند دیکھنے میں ذرا سا ہے ماہ ہے — رقاصۂ سپہر کے ماتھے کا چاند ہے

تہذیبِ بیان دیکھئے ؎

ہوتا ہے برہنہ جو ترا رُخ نقاب سے — ملتا ہے رونمائی میں نورِ آفتاب سے

پھر فرماتے ہیں ؎

تو بھی حسین ہے، دل بھی وفا کوش ہے ترا — پھیلا ہوا ہیا کے سے آغوش ہے ترا

تمام نظم میں بہت روشن اور ذی روح تشبیہات ہیں اور اسلوبِ بیان مؤثر ہے لیکن ایک جگہ یہ بھی کہا ہے ؎

کشتی ہے تیرے ہاتھ میں گویا گدا ہے تو — ہاں چشمِ آفتاب سے کچھ لے رہا ہے تو

مجھے معاف فرمایا جائے "ملتا ہے رونمائی میں نورِ آفتاب سے" کہنے کے بعد "ہلال" کو گدائے چشمِ آفتاب کہنا نظم کے وقار اور تسلسلِ نوعی کو مجروح کرتا ہے تبسم صاحب کو ترتیب کے وقت اس شعر کو نکال دینا چاہئے تھا۔ اسی نظم میں پھر ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

زینت فزائے عارضِ زیبائے شب ہے تو — یعنی کہ گوشوارۂ لیلائے شب ہے، تو

کئی نظموں میں جو ناصحانہ قسم کی ہیں حکیم صاحب موضوع کی جزئیات میں گم ہو گئے ہیں۔ اول تو شاعری اور نصیحت دو متضاد چیزیں ہیں دوسرے یاد رکھئے جب شاعر واعظ ہو جائیگا شاعر کے درجہ سے گر جائیگا "ملکِ مذہب" کے عنوان سے صفحہ ۶۸ پر جو نظم ہے اس کے بعد نعتیہ قصیدہ کے علاوہ ہرگز وہ قصائد شریک کتاب نہیں ہونے چاہئیں جو بادشاہوں اور امراء کی ثنا میں تحریر ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ میں جانتا ہوں ان کی اشاعت سے مقصود قصیدہ گوئی کے رنگ کو دکھانا تھا لیکن اس کوشش میں جتنا عظیم نقصان ہوگیا۔ اس کا اندازہ مشکل ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قوم پرور اور ملک پرست کبھی بادشاہ کا قصیدہ خواں نہیں ہو سکتا۔

اُردو غزل میں بعض بعض جگہ دل جھوم جاتا ہے گو لفظ "حضور" آجکل متروک ہے لیکن شعر کے دلچسپ ہونے میں شک نہیں ؎

مجھ کو ہے ہر سبیلِ شکایت بھی ناگوار — کیا فائدہ حضور کو ذکرِ رقیب سے

"رقیب" کا دوسرا قافیہ بھی خوب لکھا ہے ؎

محویتِ نظارۂ جاناں نہ پوچھئے — اُٹھا گیا نہ بیٹھ کے بزمِ رقیب سے

صفحہ ۱۵۷ پر بڑی معرکتہ الآرا غزل ہے

بہا کے لے ہی گئی بحرِ غم کی رو دل کو — یہ سیل وہ ہے کوئی جس کی روک تھام نہیں
نہ پوچھ غم کدۂ عشق کی بلا نوشی — بغیر خونِ جگر آبروئے جام نہیں

اسی طرح اور بھی غزلوں میں دلدوز اشعار پائے جاتے ہیں ؎

دل سے پیدا ہے مرے نغمۂ غم بے تحریک — یہ ہے وہ ساز کہ شرمندۂ مضراب نہیں

"اشک نذیرِ مژگاں" کی کیا خوب تعبیر ہے ؎

دم ذرا لینے کو بیٹھے ہیں مسافر نوروز — اشک یہ ٹھیرے ہوئے سایۂ مژگاں میں نہیں

اور کچھ اس کے سوا فلسفۂ عشق نہیں — کر لیا دل میں کسی چیز نے گھر کتنے ہیں

عام طور پر طغرائی کی غزل کا ماحول قدیم سامانوں سے آراستہ ہے لیکن جذبات کی چاشنی جہاں ہے بہت گہری ہے، فارسی غزل کی فضا بھی قدیم ہے لیکن زبان بہت نفیس اور سلیس ہے، اور اردو سے زیادہ فارسی میں برجستگی پائی جاتی ہے

وفا گویم حیا دانم، ستم فہمم جفا خوانم؟ — نگاہے را نبازم کز غلط انداختی رفتی
زدستارم چہ پرسی، در جنون و آبلہ پائی — کہ مے بندم بہ پا نیمے، دمے پیچم بہ سر نیمے

آخر میں متفرقات کے عنوان سے دو عربی نعتیہ نظموں پر خمسے ہیں اور چند اردو فارسی نظمیں ہیں لیکن بہر حال جو کچھ ہے القام اور اغلاط سے پاک ہے اور کیوں نہ ہو، طغرائی واقفِ فن اور اہلِ علم تھے۔ خود اپنے محتسب تھے شعر و ادب سے ذوق رکھنے والوں کو "کلیاتِ طغرائی" ضرور دیکھنی چاہیئے۔

لطیفیات

جلد دوم

"زبان پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا"

کون کافر ہے جو لطیفی کے ذہین اور طباع ہونے سے انکار کر سکے، یہ نوجوان موسمِ بہار کی ایک بجلی ہے جس کی ناتمام جھلک ہی تمام کر دینے کو کافی ہے۔ لیکن میری آزادرائے یہ ہے کہ پنجاب کا آسمان اس برقِ لطیف کی جولانگاہِ اضطراب کے لئے مناسب و کافی نہیں۔

لطیفیات ایم حسن لطیفی بی اے کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کی ترتیب و اشاعت میں بہت جلدی کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ $\frac{20 \times 30}{16}$ ریڈر سائز پر طبع ہوا ہے اور اس کو جناب عارف بی اے نے ترتیب دیا ہے، صفحۂ اول ہی لطیفی کی ذہانت کا نقشِ اولیں ہے یعنی سرورق پر انہوں نے اپنے ستارہ کی تصویر دی ہے اس کے بعد انتساب ہے جو زبانِ اردو سے منتسب ہے۔ پھر اردو کے متعلق ایک نظم مصنف کی طرف سے ہے، اس کے بعد عارف صاحب کا دو صفحی دیباچہ ہے اس کے بعد لطیفی صاحب کی تصویر ہے جو اس مجموعہ کی قاتل ترین نظم ہے تصویر کے بعد لطیفی کا "خیر مقدم" کے عنوان سے حضرت اختر شیرانی کی ایک نظم ہے جو بہترین قصیدۂ اخلاص ہے مگر اس کتاب میں اس کی اشاعت قطعی بے محل ہے اس کے بعد فہرست ہے اور فہرست کے بعد کتاب مندرجۂ ذیل ابواب میں تقسیم ہے۔

پہلا باب ذاتی صفحہ ۱۳ سے ۳۵ تک۔ جذباتی صفحہ ۳۸ سے صفحہ ۵۶ تک محاکاتیہ صفحہ ۵۷ سے ۹۶ تک مناظرہ صفحہ ۹۸ سے صفحہ ۱۳۴ تک فلسفیانہ اور رائشٹک صفحہ ۱۳۵ سے ۱۵۲ تک۔ پوئٹک پالٹکس ۱۵۴ سے ۱۸۴ تک سیاسی ۱۸۵ سے ۲۰۰ تک معاشرتی ۲۰۱ سے ۲۰۶ تک۔ اسلامی صفحہ ۲۰۷ سے ۲۵۶ تک انجامیہ صفحہ ۲۵۷ سے ۲۵۸ تک۔ اصلِ کتاب فارسی کی ایک نظم سے شروع ہوتی ہے جس کا عنوان "ہمہ از من" ہے یہ نظم بہت ہی خوب ہے یوں تو لطیفی کی بیشتر نظموں میں وہ خمارِ بادۂ سرمستی ارزاں ہے جو فطرت کی طرف سے شاعر کے لئے سند سمجھی جاتی ہے لیکن ان اشعار میں تو خاص طور پر اک جذبِ مستی پایا جاتا ہے۔

دریں معمورۂ بے اعتباری اعتبار از من — کہ پیمانِ محبت پائدار و استوار از من
گدازِ شعلہ و آتش گدائے اخگرِ جانم — فروغِ التہاب از من، تب و تابِ شرار از من
نشاطِ جشن مے دریوزۂ عیشِ فراوانم — مل از من، محفل از من، دورِ مے از من، خمار از من
چمن صد پیرہن اندوز از چاکِ گریبانم — گل از من، خندہ از من، رنگ و بوئے نو بہار از من

نظموں کے زیرِ تحت جو تاریخِ اشاعت و نظم گوئی تحریر کی گئی ہے میرے خیال میں وہ طباعتی جمال کے دامن پر بدنما دھبہ ہے اور اسی طرح عنواناتِ نظم کے نیچے جو نوٹ یا اخبارات و افراد کی آرائے و اشارہ ہائے طباعت دئے گئے ہیں، وہ کتاب کی عظمت کو کم کرتے ہیں ہرگز ہرگز یہ حواشی نہیں ہونے چاہیئے تھے۔

"سازِ خودی کی صدائے شکست" نظم بھی بہت بلند پایہ نظم ہے۔ اگر اس نظم کا انتخاب سختی سے ہوتا تو اور بھی بلند پایہ ہو جاتی۔ جا بجا نیتصو کی مصوری دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ بدذوقی لطیفی جیسے خوش مذاق شاعر نے کیونکر گوارا کی۔ میرے خیال میں اس فردوس میں یہ گلدستہ ہائے بے رنگ ہرگز نہ ہونے چاہیئے تھے یاد رکھئے شعر و شاعری کی مجلدات میں بانتہائے سادگی سے کام لینا چاہیئے باکمال رنگینی سے یہی وہ مقام ہے جہاں اعتدال جرم ہے۔

"سلام کہدینا" کے عنوان سے جو نظم صفحہ ۲۸ پر درج ہے وہ اچھی نظم ہے لیکن اس کا عدم کتاب کے وجود کے لئے بہتر تھا۔ تاتمام غزل کا یہ شعر کہ ؎

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں — اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا

خوب شعر ہے، یہ صحیح شاعری ہے۔ "جدائی" کے عنوان کے ماتحت جو نثر کا ایک شذرہ ہے وہ "نظمِ ماقبل نظم" کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا خوب ہے ؎

کسی کو آہ میں جی بھر کے پیار کر نہ سکا — مرے شباب کو تسکیں کی جستجو ہی رہی

بہت ہی لطیف چھینٹا ہے اور تشنگیِ شباب کی کیسی بہتر تفسیر ہے۔
یہ نظم نفسیاتِ فراق کے لحاظ سے برمحل ختم ہوئی ہے آخری شعر بہت ہی پاگل کر دینے والا ہے

مراد جو کہیں، دل کہیں، خیال کہیں — مری طرح نہ ہو غربت سے آشنا کوئی

"پریشانیِ خواب" کے متعلق جو دو سطریں اختر صاحب شیرانی نے لکھی ہیں بہت روشن اور کیف آور ہیں لیکن یہاں نظم کے ساتھ ان کا شائع ہونا برمحل نہیں ہے۔ نظم بجائے خود

بہت بہتر ہے اور خصوصاً اُس کا یہ بند بہت ہی جذباتی ہے۔

جو چین تیرے تصوّر کی گود میں پائے
ترے خیال کے جھولے میں جسکو نیند آئے
وہ تابِ بر ہمیٔ خواب کس طرح لائے؟
ترا خیال جب اس بے نوا سے چھن جائے

"صنم" کے عنوان سے ایک مختصر سی نظم میں لطیفی نے کئی نشتر بھر دئے ہیں پہلا مصرعہ میری فہم سے بلند ہے مگر دوسرا مصرعہ ؎

پری تراش، وصنم ساز و بتگرے صنم

بجائے خود ایک آفت ہے "مجھے بھول جاؤ" کے عنوان سے صفحہ ۴۶ پر بڑی مؤثر نظم ہے جس کی زبان و خیال میں یکسانیت ہے اس نظم میں شاعر لطیف جذبات نگاری میں بے حد کامیاب ہوا ہے نظم سادہ ہے شیریں ہے مؤثر ہے اور اُس جذباتی انقلاب کا ہلکا سا پتہ دیتی ہے جو برسوں کے بعد اُردو شاعری میں پیدا ہوا ہے ہم اس انقلاب کو انقلابِ "روحانی" سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اسلوب نظم نظیر کا ہے اور سوزِ لطیف کی ہلکی چنگاری ہر جگہ ہے۔

انتقاد کے وقت بہ حیثیت ایک نقاد کے صرف الفاظ تراکیب و زبان محاورات کے محاسن و عیوب کو نہیں دیکھنا چاہئے، ایک شاعر کے کلامِ منظوم پر انتقاد کی اولین منزل یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ دماغ سے شعر کہتا ہے یا دل اور روح سے اور شعرا میں زیادہ افراد ایسے ہیں جو محض دماغی طور پر شاعر ہیں انکی وجہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد ہی غلط پڑتی ہے۔ یہ لوگ شاعروں اور ان کی ہوحق کو شاعری کا آغاز و انجام یقین کرتے ہیں اور اُن لوگوں کی طرف دوڑتے ہیں جو بذاتِ خود غلط بنیاد ہوتے ہیں لیکن تیس چالیس سال کی مشاقی جن کو الفاظ سے کھیلنے میں مذاق کر دیتی ہے چنانچہ بغیر یہ معلوم کئے کہ قدرت نے ہم کو شاعر بنایا ہے یا نہیں یہ گمراہِ شوق ایک عمر غلط جادہ پہ سفر کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ مشاعروں میں غزلوں کی کامیابی ہی میں معراجِ شاعری کا راز ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ صحیح شاعر بننے کے لئے مطالعۂ فطرت کی اور تزکیۂ روح دل کی ضرورت ہے جب تک دل کی آنکھیں نہیں کھلتیں کوئی شخص شاعری کے لامکاں بوس عرش کے پایوں تک کو بھی نہیں پہنچ سکتا اور جب تک روح لذیذ اور فکر جواں نہیں ہو جاتی کوئی طاقت مادر زاد شاعر کو بھی ترقی کے معراج تک نہیں پہنچا سکتی۔

میں ابھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ لطیفیات اغلاط و نقائص سے پاک ہے، لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ لطیفی دل سے شعر کہتا ہے۔ (باقی۔ باقی)

مندرجۂ ذیل کتابیں اور رسائل دفتر "ایشیا" میں وصول ہو چکے ہیں جن پر آئندہ ماہ سے مسلسل اظہارِ رائے کیا جائیگا۔

(۱) لطیفیات
(۲) فروغِ اُردو
(۳) قصیدہ شیخ فریدالدین عطار
(۴) بہار کی بھکارن
(۵) صدائے ماہر
(۶) صراطِ مستقیم
(۷) طبّی چٹکلے
(۸) خطبۂ مبارکہ (فارسی)
(۹) خطابۂ معجز نمائے (فارسی)
(۱۰) خطابۂ لطیفہ در لزوم عناصر عفیفہ (فارسی)
(۱۱) خطبۂ آقائے حاج میرزا محمد رحیم ثقۃ الاسلام (فارسی)
(۱۲) مثنوی گلزارِ علم
(۱۳) روحِ رواں
(۱۴) منتخباتِ ہندی کلام (۱۵) گہرستان

(رسائل)

دین و دنیا۔ شاہکار۔ عارف۔ رنگ بھومی (ہندی)۔ ادبی دنیا۔ تیج ویکلی۔ دورِ جدید سالنامہ نیرنگِ خیال۔ سالنامہ ادبی دُنیا۔ مستورات۔ انتخاب۔ ماہر۔ قلم لا لف سفطرت لیبلے۔ نیر نگستان۔

ان رسائل اور کتب کے علاوہ میرا ارادہ ہے کہ میں بشرط فرصت اُن جائزیہ رسائل کے متعلق بھی اظہارِ خیال کروں جو ایک مدت سے ادبِ اُردو کی خدمت کر رہے ہیں اور یہ دکھاؤں کہ وہ اپنی مساعی و اعمال کے لحاظ سے رجعت کر چکے ہیں یا ترقی۔

ساغر نظامی

پیغامِ شباب

از
مظفر حسین شمیم

اے بیخبر ماتمِ ہستی کب تک؟
ہستی کی بلندی میں یہ پستی کب تک؟
مشرق سے وہ گلگوں آفتاب ابھرتی ہے
ہنگامِ صبوحی میں یہ سستی کب تک؟

ہشیار کہ ہمت کا نہ دامن چھوٹے
ہاں سنگِ گراں بار کو پانی کر دو
طوفانِ حوادث کو کہانی کر دو
چڑھتے ہوئے دریا کی روانی کر دو

ادبستانِ ایشیا کی ایک عظیم الشان تصنیف

بادۂ مشرق

جس کی تیاری و تکمیل میں ہندوستان کے عظیم المرتبت امراء اور قائدین نے محبت اور فیاضی سے حصہ لیا

اور جس کو امریکہ و ہندوستان کے ماہر فن
مصوروں نے اپنے کمالِ فن سے مرصع کیا

انتسابِ جلیل

بنامِ اقدس امیر الامراء عالیجناب نواب میر یوسف علی خان بہادر سر سالار جنگ ثالث ادام اللہ اقبالہٗ

۷۲

ہمارے ممدوح امیر الامراء جناب نواب میر یوسف علی خان بہادر سر سالارِ جنگ ثالث نہ صرف مادّی لحاظ سے بلکہ اپنی روحانی منزلت و بزرگی خاندانی عظمت و تقدیس اور ادبی و علمی تبحّر کے لحاظ سے بھی امیر کبیر ہیں، آپ کے رفیع الشان خاندان کا سلسلہ حضرت ادیس قرنیؓ سے ملتا ہے آپ کی دسویں پشت میں ادیسؒ ثانی تھے جو مدینۂ منورہ میں اوقاف کے متولی تھے اور جو علی عادل شاہ والئ بیجاپور کے زمانے میں ہندوستان میں اپنے فرزند محمد علی کے ساتھ وارد ہوئے اور ہندوستان ہی میں سکونت اختیار کر لی۔

سلطنتِ عالیۂ دکن میں یہ خاندان اپنی قدامت اور عظمت، شجاعت علمی تبحر اور دولت و ثروت کے لحاظ سے ممتاز ترین خاندان خیال کیا جاتا ہے اور تاریخ دکن کا صفحہ صفحہ اس کے ذکرِ مبارک سے منور ہے جو اعزاز و اکرام اس عظیم القدر خاندان کو ریاستِ ابد قیام دکن میں حاصل ہے وہ دوسروں کو کم نصیب ہے۔

نواب میر یوسف علی خاں سر سالار جنگ بہادر ثالث سابق مدار المہام منیر الدولہ عماد السلطنۃ نواب میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی مرحوم کے اکلوتے فرزند

"ایشیا" میرٹھ

حضرت اشرف نواب میر یوسف علی خان بہادر سر سالار جنگ ثالث

جولائی ۱۹۲۶ء

اور منیر الملک غیور جنگ شجاع الدولہ نواب میر سعادت علی خاں مرحوم کے حقیقی بھتیجے اور مختار الملک میر تراب علی خاں سر سالار جنگ اول جی۔سی ایس آئی سابق مدار المہام کے پوتے ہیں اور

آپ عالی شان سالار جنگی خاندان و خانوادۂ درگاہ قلی خان کے چشم و چراغ ہیں جب کی ضیا سے آج سرزمینِ دکن کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

ولادت

آپ کی ولادتِ مبارک دکن میں ۴ جون ۱۸۸۹ء مطابق یوم جمعہ ۱۴ شوال المکرم ۱۳۰۶ھ (۶ امرداد ۱۲۹۸ف) کو ہوئی

تعلیم و تربیت

ایک ماہ کے بعد ہی آپ کے تم بزرگوار کا وصال ہو گیا اس لئے حضور نظام (غفران مکان) نے آپ کی تربیت و تعلیم پر بطور خاص توجہ فرمائی ۱۳۱۶ھ میں بہ تقریب جشن سالگرہ مبارک اعلیٰ حضرت حضور غفران مکان نے آپ کو خطاب خان بہادری و سالار جنگی ثالث و منصب دو ہزار و پانصد سوار و علم و نقارہ

عطائے منصب و اعزاز

کے عطائے منصب و اعزاز سے سرفراز فرمایا آپ نے دکن کے لائق ترین مغربی و مشرقی استادوں سے اکتسابِ علوم کیا اور مدرسۂ عالیہ میں شریک ہو کر اعلےٰ پیمانہ پر تعلیم حاصل کی علوم

ماہر علوم و السنۂ شرقیہ و غربیہ

مشرقی و مغربی میں آپ مہارتِ تامہ رکھتے ہیں اردو فارسی عربی انگریزی اور فرانسیسی زبان میں اہل زبان کی طرح بات چیت فرماتے ہیں، اور ہر زبان میں آپ کی تحریر و تقریر بے حد دلچسپ اور گہر بار ہوتی ہے۔ ہر زبان کے ادب سے آپ کو بطور

علمی و ادبی ذوق

خاص دلچسپی ہے اور آپ کا علمی و ادبی ذوق نہایت بلند و ممتاز ہے مگر اردو فارسی ادب سے آپ کو خاص طور پر دلچسپی ہے، ہندوستان کے سینکڑوں ادیبوں اور شعراء کی سرپرستی فرماتے ہیں، سچ یہ ہے

علم پرستی و ادب نوازی

کہ علوم پرستی اور فنون نوازی کا ذوق آپ کو ورثہ میں ملا ہے اور اس ورثہ کو آپ نے حفاظت سے محفوظ رکھا ہے، سخن فہمی میں آپ اپنی نظیر آپ ہی ہیں میں نے ہندوستان کا گوشہ گوشہ

فنون لطیفہ کا نقاد اکبر

چھانا ہے اور اس کے بہترین مراکز کو دیکھا ہے جہاں ہندوستان قدیم اور ایشیائے دیرین کے علوم اور فنون لطیفہ کے بہترین شاہکار جمع تھے لیکن جس قدر منتخب و عظیم الشان خزینہ قدیم قلمی نسخوں اور تصاویر و بتوں کا نواب سر سالار جنگ بہادر کے پاس ہے اس نیلگوں آسمان کے نیچے میری نگاہ سے نہیں گزرا بارہا حضورِ انور کی معیت کا شرف مجھ کو حاصل ہوا ہے۔ اور ایسے مواقع پر بھی میں شریک رہا ہوں جب نواب صاحب تصاویر اور قدیم قلمی نسخوں کی خرید و فروخت میں مصروف تھے، میں نے معلوم کیا کہ وہ ایشیائی آرٹ کے اس قدر زبردست نقاد ہیں کہ مصور کا کوئی خط ان کی نگاہ سے اپنی کم سوادی و کم نقشی کو محفوظ نہیں رکھ سکتا اُن کی نگاہ حسن کی گل چینی اور نقص کی گرفت میں کبھی تکلف نہیں کرتی شعر و ادب کا مطالعہ بھی نہایت وسیع ہے۔ ہر مذہب شاعری اور اس کے متعلقات سے بخوبی واقف ہونے اور انسانی نفسیات کے ماہر ہونے کی وجہ سے شاعر کے جذبہ و خیال کی گہرائیوں میں سانس لینے والے مفہوم کی تپش کو محسوس فرما لیتے ہیں

اجنٹا کے طلسمی غاروں کا مالک

قدرت نے ان کو پیدائشی آرسٹ اور آرٹ کا پجاری بنا کر دنیا میں پیدا کیا ہے۔ عجائبات عالم میں سے ایک عجیب یادگار کے وہ مالک ہیں گویا اجنٹا کے طلسمی غاروں کے بادشاہ ہیں۔ یہ کامیں اور حیرتناک غار آپ کی جاگیر میں واقع ہیں اور آپ کی جاگیر کا رقبہ (۱۴۸۰) مربع میل ہے۔ یعنی ہز ہائینس مہاراجہ پٹیالہ کی ریاست کے برابر ہے جاگیر کی آبادی ۱۹۱۱ء میں دو لاکھ اور کئی ہزار تھی، علاقہ مقبوضہ میں کئی عدالتیں اور جیل ہیں محض جاگیر کی سالانہ آمدنی بارہ لاکھ پچاس ہزار ہے۔ آپ سلطنتِ دکن کے اُن جاگیرداروں میں ہیں جنہیں فوجی عدالتی اور کوتوالی کے کامل اختیارات حاصل ہیں۔

سلطنت عالیہ دکن کی مدار المہامی

۱۹۱۲ء میں راجہ راجایان ہز ایکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ کے رخصت کے سلسلے میں تین سال کے لئے آپ عارضی مدار المہام مقرر ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ نے آپ کو مستقل مدار المہام مقرر فرما کر ایک لاکھ کا گراں بہا خلعت عطا فرما کر عظیم الشان اعزاز و منصب بخشا۔

عراق و عرب و ایران اور یورپ کی سیاحت

دسمبر ۱۹۱۴ء میں سرکارِ والا سے چھ ماہ کی رخصت لے کر خدمتِ متعلقہ سے علیحدگی اختیار کی اور عرب و ایران اور یورپ کے تمام شہروں کی سیاحت فرمائی۔ اور گو یہ سیاحت محض تفریحی حیثیت رکھتی تھی لیکن دنیا کی اس سیر سے جو عظیم الشان معلومات آپ نے حاصل فرمائیں وہ بجائے خود ایک زبردست ذوق اکتساب کی دلیل ہیں

عراق و عرب و ایران بیروت و شام و بیت المقدس کی سیاحت

۱۳۴۸ھ میں عراق و عرب مصر و شام بیروت و بیت المقدس اور ایران کا سفر فرمایا اور زیارتِ ائمہ علیہم السلام سے مشرف ہوئے اس کے علاوہ تین مرتبہ یورپ کا سفر بھی فرمایا۔ ان سفروں نے آپ کے مشاہدہ اور عرفان کو وسیع تر کر دیا۔

اخلاق و محاسن کی رفعت

جس شخص نے اس امیر محترم کو دیکھا ہے اور ان ساغر صفت آنکھوں کو بھی دیکھا ہے جن میں اسلاف کی روحِ شرافت اور جلال کی بجلیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ سلیم الطبعی، فیاضی، سیر چشمی، دریا دلی، شرافت، غریب پروری، کرم گستری، اولو العزمی، عالی ہمتی اور عام جذبۂ سخاوت کا بہت قدیم اور گہرا تعلق سالار جنگ بہادر (ثالث) کی ذاتِ اقدس سے ہے؛ ان کے ہاتھ اتنے ہی کشادہ اور دل اتنا ہی فراخ ہے جتنا ان کے اسلاف کا تھا۔ ان کے اطوار و اعمال میں وہی بلندی و رفعت اور مشرقی شان پائی جاتی ہے جو امرائے قدیم کا طرۂ امتیاز تھی۔ ان کی زندگی میں مغربیت کے تمام عناصر شامل ہیں لیکن ان کی روح خالص طور پر مشرقی ہے اخلاق و اطوار مشرقی ہیں اور وہ سرتاپا ایک "آئیڈیل مشرقی انسان" ہیں۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن سے متاثر ہو کر مصنف نے اپنی عمرِ شباب کا حاصل اس یوسفِ دکن کے نام منتسب کیا ہے اور اس انتساب پر مصنف کو تمام عمر ناز و افتخار رہیگا۔

ساغر نظامی

زعیمِ قوم پرور عالیجناب سیّد المحترم ڈاکٹر سیّد محمود مدظلہ العالے

ایم، اے، پی، ایچ ڈی بار ایٹ لا

ڈاکٹر سید محمود جو اپنی بے لوثی، اخلاص، اور انسانیت کے اعلیٰ ترین جذبات کے سلسلے میں تمام ہندوستان میں شہرت رکھتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں قربانی، دردِ قومی اخوتِ انسانی اور اسلامی رواداری کے حقیقی مجسمے ہیں، سادہ مزاج، رفیع و مہذب۔ شہرت و نمائش سے ان کو حیرتناک طور پر بُعد ہے۔ اکتفا استغنا ان کی دولت و راحت ہے ان کی ملاقات کے بعد انسان کو اپنی پوشیدہ ترین خامیوں کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ ہر شخص کے لئے ایک خاموش رہبر ہیں۔ ان کا علمی و ادبی ذوق نہایت پختہ و اکمل ہے۔ اس قحط کے زمانے میں وہ ایک راسخ اور صادق محب وطن ہیں اور ہندوستان و اسلام سے زیادہ کوئی چیز ان کو عزیز نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب دبستانِ ایشیا کی اس نادر تصنیف کی اشاعت کے سلسلے میں سب سے زیادہ اظہار احسان مندی کے حقدار ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کی وہ ذات گرامی ہے جس نے اس عمارت کی اولیں بنیاد رکھی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب اُن کے خلوص ہی کی برکت ہے کہ "بادۂ مشرق" ایسی اہم کتاب تیار ہو کر ہندوستان کی ادبی فضاؤں میں دادِ تحسین کا خراج حاصل کر رہی ہے، ورنہ جہاں تک غریب مصنف کا تعلق ہے یہ "جوئے شیر" لانا اُس شکستہ بازو کو ممکن کا کام نہیں تھا۔

اگر ڈاکٹر صاحب قبلہ سیاسی دُنیا میں مدآئے ہوتے تو وہ ہندوستان کے ادبی حلقوں کے بھی سرتاج ہوتے لیکن آج بھی ڈاکٹر صاحب کی اُن ادبی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو اپنا خاص درجہ رکھتی ہیں۔

آپ کی مشہور تصانیف میں "خلافت اور انگلستان" انگریزی اُردو میں مسئلہ خلافت پر تاریخی و مذہبی و سیاسی غرضکہ ہر لحاظ سے ایک جامع ترین کتاب ہے۔ مطبوعہ تصانیف کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی بہت سی تصانیف شائع ہونے کے لئے محفوظ ہیں جو انشاءاللہ ادبی مرکز کی طرف سے شائع کی جائیں گی۔

ان تصانیف میں سے بعض اپنے مقاصد کے لحاظ سے بہت اونچی ہیں۔ مثلاً ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں جن ذہنی اور نفسیاتی اصولوں کو پیش نظر رکھکر ڈاکٹر محمود نے اپنی ایک معرکۃ الآراء تصنیف میں اظہارِ خیال فرمایا ہے وہ بالکل انوکھا اور عجیب ہے۔

اس کے علاوہ آپ کی ایک تاریخی تالیف "شاہانِ مغلیہ کے عہد میں ہندو مسلم تعلقات" اپنی نوعیت کی زبردست کتاب ہے۔

تکمیل ہو جانے پر ڈاکٹر صاحب کی اجازت پر وہ کتاب بھی ادبی مرکز اپنی طرف سے شائع کرے گا۔

رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو بار ایٹ لا بہ القابہ

صدر ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد

ہندوستان میں بہت کم شخصیتیں ایسی ہیں جن کو ظاہری و باطنی دونوں حیثیتوں سے سچا ہندوستانی کہا جا سکے لیکن ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو حقیقی طور پر ایک سچے ہندوستانی ہیں جو مذہب، فرقہ اور سیاسی مصلحتوں سے آزاد ہو کر ایک آئیڈیل انسان ہیں ان کا دل ہر قوم کے لئے کھلا ہوا ہے اور ان کی ذاتِ گرامی ان پست تعصبات سے بہت اونچی ہے۔

آج وہ ہندوستان کی متحدہ تہذیب و روایات کی بزمِ قدیم کی آخری شمع ہیں جن کے بعد تاریکی ہی تاریکی ہے۔ اُن کی ذات ہندوستان میں اسلاف کی بزرگی و جامعیت کی ایک مثال ہے ادبیاتِ مشرق پر آنریبل سر تیج بہادر سپرو بہ القابہ کے جس قدر احسانات ہیں اظہر من الشمس ہیں۔ شعر و ادب کی آبیاری آپ نے جس فراخ حوصلگی و اخلاص کے ساتھ فرمائی ہے۔ وہ آپ کو ادب ہندوستانی

کے آسمان پر آفتاب نیم روز کی طرح تاباں و روشن رکھے گی اور امتداد کبھی اس کی شعاعوں کے نور کو کم کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ جہاں تک قانونی قابلیت اور سیاسی اہلیت کا تعلق ہے ایک عالم رطب اللسان ہے لیکن آپ کی مسلمہ ادبی قابلیت و ذہانت سیاست و قانون دانی سے بالکل علیحدہ چیز ہے اور یہی وہ شے ہے جو آپ کو ایک ادبی انسان کا درجہ عطا فرماتی ہے آپ ایک نہایت مہذب ہنس مکھ اور شریف الطبع انسان ہیں ——— "بادۂ مشرق" کے آغاز کار کا سہرا اسی ذات اقدس کے سر ہے جس کے انتہا احسانات دنیائے ادب پر ہیں۔

بلبلِ ہند محترمہ مسز سروجنی دیوی (نائیڈو)

جنہوں نے "بادۂ مشرق" کی طباعت کیلئے بمبئی سے بیش بہا مالی امداد فرمائی

بلبلِ ہند مسز سروجنی دیوی جو عالمگیر شاعرانہ و ادیبانہ شہرت کی مالکہ ہیں اپنے اخلاق و محاسنِ طبعی کے لحاظ سے بھی دنیا کی اُن چند خواتین میں سے ایک کہی جا سکتی ہیں جن کا معصوم اور سعید قلب انسانیت کے پاکیزہ جذبات سے لبریز ہے۔ اس فرقہ پرستی اور آپا دھاپی کے زمانے میں وہ محبت اور انسانیت کی حقیقی "دیوی" ہیں انکا دل دنیا کے ہر آرٹسٹ اور اہل فن کے لئے یکساں طور پر فراخ اور وسیع ہے۔ وہ ایک صادق اور شریف دل خاتون ہیں اور خود ایک زبردست شاعرہ ہیں اس لئے وہ ہر آرٹسٹ اور شاعر کی روح کی عظمت اور اہل فن کی شخصیت کی اہمیت کا بآسانی اندازہ لگا لیتی ہیں۔ اُن کی ترکیب میں قومی یا فنی عصبیت کا ایک شمہ بھی نہیں۔ بلکہ ان کی تخمیر محبت، خلوص، احسان فرمائی، پرستش فن اور تبسم و ترنم کے اجزاء و عناصر سے ہوئی ہے۔ انگریزی زبان کی اس محترمہ بنگالی شاعرہ کی فطرت کی بلندی دیکھنے کے بعد اردو زبان کے شعرا اور ان کی سیرت کی رذالتوں پر حیرت ہو سکتی ہے اور شاید بدی نفرت بھی جن کی ترکیب حسد، غیبت ——— محسن کشی، اور جنگ و نفرت کے اجزا سے ہوئی ہے جن کے آرٹ کی روحانیت کا منتہا صرف یہ ہے کہ ایک دوسرے سے آپس میں حسد کریں اور جلتے جلاتے رہیں مگر سروجنی کی روح ایشیا کی اس مقدس ترین ہستی کی روح اپنے ہم فن اور ہم ذوق افراد کے لئے بغیر فرقہ و مذہب کے خیال کے محبت و رافت کے کیف سے یکساں طور پر سرشار ہے۔ اور وہ حقیقی طور پر ہندو و مسلم اتحاد کا ایک ملیح و حسین پرچم ہے جو ابدالآباد تک آزادیٔ ہند کی مضبوط چٹانوں پر قائم ہو کر لہراتا رہیگا اور آنے والی قوم اسکے سایہ میں سجدہ ریز ہو کر سروجنی کے قدموں کو بوسہ دے گی۔

وسیع براعظم ایشیا کے ایک تاریخی ملک ہندوستان سے بلند ہونے والی اس آواز کو جو پُر کیف زندگی کا پیام ہے اور جو ہندوستان کے کلچر، ہندوستان کی تہذیب اور ہندوستان کی غلامی کے خلاف احتجاج ہے سب سے زیادہ طاقت پرواز اگر بخشی ہے تو وہ "عندلیب بستر پر" کی نغمہ ریز مصنفہ نے جو چمنستان ہند کی ایک لالہ نفس بلبل ہے اور جس کے نغمات اور جھموں سے نہ صرف ہندوستان کی فضائیں جھوم رہی ہیں۔ بلکہ ساری کائنات مست ہو گئی ہے۔

برادرِ محترم سیٹھ محمد علی نیار رئیس بمبئی

یہ بابُ الہند بمبئی کے ایک مخلص ترین انسان ہیں اور طاقتور عملی شخصیت کے مالک ہیں۔ بمبئی کی کوئی جماعت ایسی نہیں جس کو محمد علی کی ہمدردیوں کی ضرورت نہ ہو۔ ایک شریف اور دیوانۂ محبت اور مخلص شخص ہے اور جو ہندوستان و اسلام کی محبت میں سرشار ہے جس کا قلب آزادی اور محبتِ الٰہی سے مست ہے جو ہر لحاظ سے دُنیا میں مسلمانوں کو باعلم، باعزت آزادی پرست، ذی علم ذی ہنر اور ذی مرتبت دیکھنا چاہتا ہے جو ہر وقت ہندوستان کو آزاد دیکھنے کے لئے بے تاب ہے اور جو آزادی پسند جماعتوں کا خادم ہو کر مخدوم ہے۔ جو خود امّی ہے لیکن جس کا دل علم و ادب کی پرستاری اور نوازش کے جذبے سے لبریز ہے۔ جو لوگ محمد علی کو جانتے ہیں اُن کو معلوم ہے کہ وہ بمبئی میں ایک آہنی طاقت کا مالک ہے اس آہنی طاقت کا مالک ہے جو دیوانگی، عمل محبت اور سچائی کی عناصر سے مرکب ہوتی ہے

(باقی۔باقی)

سیٹھ محمد علی نیار (بمبئی کے نیشلسٹ لیڈر اور رئیس)
جنہوں نے بادۂ مشرق کی تکمیل میں گرانقدر مالی امداد دی۔

نوائے راز

(از ابوالفاضل سرآز چاندپوری)

اب وہ اگلا سا دل پر جوش نہیں — بادہ نوشی بقدرِ ہوش نہیں
مطمئن ہوں بدورِ مجلسِ حال — فکرِ فردا و رنجِ دوش نہیں
لُطفِ ساقی ہے ضامنِ انجام — اب مجھے فکرِ نائے و نوش نہیں
ملکِ فقر و فنا ہے ویرانہ — شہریارِ گلیم پوش نہیں
مدرسے میں ہے دورہ مَن و تو — کیا یہاں کوئی مے فروش نہیں
قصہ خوانِ رموزِ کیف و کم — خود فروشی دلیل ہوش نہیں
کفر و ایماں کا امتیاز بجا — رند مشرب ہوں، سخت کوش نہیں

کیا کہا اے حریفِ نکتہ سرا
سرآز خود بیں ہے، حق نیوش نہیں؟

"مطبوعاتِ ادبی مرکز"

حضرت ساغر نظامی — "صبوحی"

ہندوستان کے مشہور اور پختہ کار شاعر و ادیب حضرت ساغر نظامی کے چند چیدہ اور منتخب غزلوں کا حسین اور خوبصورت مجموعہ جو کئی ہزار کی تعداد میں شائع ہوا تھا اور ایک سال کے اندر ہی فروخت ہو گیا۔ قیمت محض ۸ر علاوہ محصول۔

"کہکشاں"

حضرت ساغر نظامی جس طرح نظم پر قادر ہیں اور فن شعر میں ایک صاحب طرز کی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح نثر نگاری پر بھی ان کو مہارت تامہ حاصل ہے۔ کہکشاں ان کے ۲۱ افسانوں کا حسین مجموعہ ہے جو بہترین ادب لطیف پیش کرتا ہے۔ کہکشاں میں آرٹ اور طنزیات کا وہ لطیف سنگم ہوا ہے جو کسی دوسری کتاب میں نہیں پایا جاتا' زبان کی شوخی اور مستی حرف حرف میں کارفرما ہے سوسائٹی اور حالات حاضرہ پر افسانوی انداز میں گہری تنقید پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کسی حیطۂ محدود میں گردش کرنے والا نہیں ہے بلکہ اس کا دل زندگی کی تمام چھوٹی بڑی باتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ کتابت و طباعت خوبصورت جلد مضبوط' سرورق سہ رنگا' قیمت مجلد عہ (علاوہ محصول غیر مجلد عاہ)

مہاتما رسکن

انگلستان کے مشہور ریفارمر جان رسکن کی مختصر لیکن مکمل سوانح عمری بچوں اور طلبا کے لئے مفید و کارآمد قیمت صرف ۴ر

طلوع

پنجاب کے ایک نوجوان شاعر ضیا فتح آبادی بی اے کے قطعات کا مجموعہ ...... جو اُن کے مہذب خیالات کا آئینہ ہے' قیمت صرف ۶ر

بھکارن اور پجارن حضرت ساغر نظامی کی دو شاہکار نظمیں جو ادبی مرکز کی کتابیں منگانے والوں کو مفت ارسال کی جاتی ہیں۔

بادۂ مشرق

اردو ادب میں ہر لحاظ سے حیرت انگیز کتاب جو اپنے حسن ظاہری کے لحاظ سے موجودہ مطبوعہ کتابوں میں ناقابل مقابلہ ہے' جس کے ۶۰۰ صفحات میں تفکر' تاثر' تغزل' وجدان و کیف قومیت و اسلامیت کی روح کارفرما ہے۔ پیغمبر اسلام کے علاوہ رام چندر جی کرشن مہاتما گوتم بدھ اور اکثر اسلامی و ہندوستانی قائدین پر ایسی نظمیں اس کتاب میں پائی جاتی ہیں جو اتحاد اقوام کا سبب بننے کی طاقت رکھتی ہیں' شباب' آزادی' مسرت اور زندگی کا ایک مواج سمندر بادۂ مشرق کے صفحات میں موجیں مارتا ہے آپ ملاحظہ کریں گے تو اعتراف فرمائیں گے کہ ساغر نے اپنی اس کتاب سے ایشیا کی عظمت کو دوبالا کر دیا ہے بادۂ مشرق "اردو شاعری میں عقیدہ' زبان' خیال اور اپنے پیغام کے لحاظ سے اولین کتاب ہے۔ یہ دنیا کی چار زبانوں اردو' ہندی' گجراتی اور انگریزی میں شائع ہوئی ہے اردو ایڈیشن کی قیمت مجلد عہ علاوہ محصول' غیر مجلد للعہ

دیگر انشا پردازوں کے شاہکار

امام الہند علامہ ابوالکلام آزاد — "خون شہادت کے دو قطرے"

یہ مختصر رسالہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے عالم جوانی کا شاہکار ہے جو منصور و سرمد کے پُرخروش و مستند حالات پر مشتمل ہے اول تو موضوع ہی اپنی جگہ بہت پُرخروش ہے اس پر مولانا آزاد کی پُرجوش ادبیت پڑھتے پڑھتے انسان جھوم جاتا ہے۔ قیمت صرف ۴ر علاوہ محصول

مولوی عبدالباری آسی — "تذکرۂ خندۂ گل"

کون ہے جو مولوی عبدالباری آسی الدنی کی ذات سے ناواقف ہو' آپ ہندوستان کے مشہور ادیب ہیں' یہ تذکرہ آپ ہی کی کاوش ترتیب کا نتیجہ ہے۔ جو اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات و منتخب کلام پر مشتمل ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تذکرہ اردو زبان میں سب سے پہلی اور نئی چیز ہے۔ شیدایانِ ادب کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے قیمت للعہ علاوہ محصول۔

سید مقبول احمد بی اے — "فلسفۂ مذہب"

سید مقبول احمد صاحب کی یہ کتاب مذہب اور اس کے متعلقات پر غیر فانیانہ نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہے اس کتاب میں مذہب اور اخلاق کی تشریح جدید اور ارتقائی نقطۂ نگاہ سے کی گئی ہے ہر معاملہ کو عقلی طور پر سمجھایا گیا ہے' مطالعہ کے قابل کتاب ہے اور بہت فلسفیانہ طور پر تحریر کی گئی ہے قیمت عہ علاوہ محصول

مفتی مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی — تعلیم الاسلام (ہر چہار حصہ)

اسلامی تعلیم کے متعلق یہ مختصر ترین رسالے ہیں' جو مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی مدظلہ کے زور قلم کا

تبجہ میں ندہبیات میں مفتی صاحب کی شخصیت جس قدر بلند ہے اس کا ذکر لا حاصل ہے لیکن بطور خاص یہ رسالے اپنے اندر بہت کچھ رکھتے ہیں سب سے پہلے حصہ میں تعلیم الایمان یا اسلامی عقائد کے عنوان سے اسلام کی بنیادی بحث ہے جس کے سلسلے میں عقیدہ ملائکہ، صحائف، رسول و رسالت، قیامت، تقدیر، حیات ابعدالموت، دوسرے شعبے میں تعلیم الارکان یا اسلامی اعمال کے ماتحت، نماز، وضو، غسل، مسح اور اس کی قسمیں، نجاستِ حقیقہ، استنجے، پانی کنوئیں وغیرہ کا بیان ہے تیسرے رسالے میں "تعلیم الایمان یا اسلامی عقائد" کے ماتحت توحید، فرشتے، صحائفِ الٰہی، رسالت، صحابۂ کرام، ولایت اور اولیا اللہ، معجزہ اور کرامت کا بیان ہے۔ اسی حصے کے دوسرے شعبہ میں "تعلیم الارکان یا اسلامی اعمال" کے ماتحت وضو کے باقی مسائل، فرائضِ وضو کے باقی مسائل، سنن وضو کے باقی مسائل، مستحباتِ وضو، نواقضِ وضو، غسل کے باقی مسائل، موزوں پر مسح کے باقی مسائل۔ نجاستِ حقیقہ اور اس کی طہارت کے باقی مسائل استنجے کے باقی مسائل، پانی اور کنوئیں کے باقی مسائل، بیان تیمم، نماز کی دوسری شرط، نماز کی تیسری شرط نماز کی چوتھی اور پانچویں وچھٹی وساتویں شرط، اذان کا بیان، نماز کے ارکان تکبیر تحریمہ، قیام، قرأت، رکوع، سجدہ، قعدۂ آخر، واجباتِ نماز، سنت، مستحبات اور نماز پڑھنے کی پوری ترکیب کا مکمل بیان ہے۔ غرضکہ ایک مسلمان کے لئے ان تینوں رسالوں میں اسلامی معلومات کا پورا سامان ہے ہر مسلمان کو اس کی خریداری کرنی چاہیئے۔ قیمت ہر حصہ مع محصول ۱۴ر

حاجی عبدالمجید صاحب کاتب "خریطۂ نعت"	یہ ردیف وار نعتیہ دیوان ہے جو مولانا کاتب کی تصنیف ہے، اس مختصر دیوان کو پڑھکر محبتِ رسولؐ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کو اسے خریدنا چاہیئے چیدہ

نعتیہ کلام کا یہ بہترین مجموعہ ہے، قیمت مع محصول ۸ر

مولانا نیاز فتحپوری مدیر نگار "ایک شاعر کا انجام"	حضرت نیاز فتحپوری ہندوستان کی ان ہنگامہ خیز ہستیوں میں سے ہیں، جن کی ہستی اردو ادب کی جان ہے، یہ مختصر افسانہ ان کے عہد شباب کا شاہکار ہے، اور اس قدر بلند چیز ہے کہ اب وہ خود بھی چاہیں

تو ایسی معرکتہ الآرا کہانی نہیں لکھ سکتے۔ لفظ لفظ میں حرارتِ شباب پائی جاتی ہے۔ قیمت ۱۰ر علاوہ محصول

فراست الید	یہ مختصر کتاب بھی علامہ نیاز ہی کے دماغ و قلم کا نتیجہ ہے جو علم سمدرک (Palmistry) پر مشتمل ہے ہتھیلیوں اور اس کی لکیروں کو دیکھکر ایک انسان کی سیرت اور اس کے ماضی و مستقبل

پر حکم لگانے کے علم کو کہتے ہیں۔ اس علم کے متعلق یہ مختصر سی کتاب مکمل معلومات رکھتی ہے۔ پامسٹری (Palmistry) سے ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

مذاکراتِ نیاز	یہ حضرتِ نیاز کی ڈائری ہے یہ ان ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۲۷ء و ۲۸ء و ۲۹ء میں نگار میں شائع ہوئے تھے۔

اور جن کو ملک نے بے حد پسند کیا تھا۔ یہ مضامین حضرت نیاز کی ارتقائی انشا کے شاہکار ہیں

جابجا طنزیات کی گہری گر مہذب چاشنی پائی جاتی ہے جو حضرتِ نیاز کی انشاپردازی کی خصوصیت ہے، حجم ۱۶۸ صفحات، قیمت عہ

جذباتِ بھاشا	اس کتاب میں ہندی دوہوں کو جمع کیا گیا ہے اور ہندی شاعری پر تنقید کی گئی ہے، اور خوب دادِ سخن دی ہے شروع میں خلیقی صاحب دہلوی کا دیباچہ ہے اردو زبان

کے لئے بہت ضروری کتاب ہے اور اس کو لکھ کر مولانا نیاز نے اپنی ہندوستانیت کا پورا پورا ثبوت دیا ہے، قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد	یہ بھی چند افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں پیروں اور مولویوں کی رعشہ براندام کردینے والی حرکات کا ذکر ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ آج سوسائٹی میں سب سے

زیادہ کریہ مخلوق صرف مولوی اور پیر ہے، بہت دلچسپ کتاب ہے، ہر شخص کو دیکھنی چاہیئے قیمت علاوہ محصول ۵ر

مادیین کا مذہب	یہ انگریزی سے ترجمہ ہے جس میں "چند گھنٹے حکمائے قدیم کی روحوں کے ساتھ" کے عنوان سے ایک سلوب تاریخ کے ذریعہ ہیئتِ اجتماعی کے نقائص اور ضرورتِ انقلاب

پر دلچسپ تبصرہ ہے بہت دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۴ر

جمالستان	یہ نگارستان کے بعد حضرت مولانا نیاز کے افسانوں کا دوسرا ضخیم مجموعہ ہے جو تقریباً پانچسو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر افسانہ پڑھنے کے قابل ہے، ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے نیاز کا جو

درجہ ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر ادیب و ادب پرست کو جمالستان کا مطالعہ بمنزلہ فرض ہے اس کے مطالعہ سے ہر شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ نیاز اردو کا اسکو تنین ہے۔ قیمت للعہ علاوہ محصول

ترغیباتِ جنسی	یہ بھی حضرتِ نیاز کی معرکتہ الآرا تالیف ہے جس میں تاریخی، علمی اور نفسیاتی نقطہ سے انسان کے میلانِ جنسی پر ایک بسیط نظر ڈالی گئی ہے۔ اس موضوع پر اردو میں اس سے قبل

کوئی کتاب نہیں دیکھی گئی، مخاشی کی تعریف کے بعد مخاشی کی ابتدا اور اس کے اسباب سے بحث کی گئی ہے اور اس کے بعد پہلے باب میں "شادی" کے عنوان سے اس کے متعلقات سے بحث ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اقوام کے رسم و رواج کو تحریر کیا گیا ہے دوسرے باب میں "طلاق و خلع" کے ماتحت قدیم روم، قدیم ویلز، قدیم چین، قدیم جاپان وغیرہ میں طلاق و خلع کا ذکر کرتے ہوئے دنیا کے تمام بڑے ممالک کے حالیہ طرزِ طلاق و خلع کو دکھایا گیا ہے اس کے بعد کتاب مندرجۂ ذیل ابواب میں تقسیم ہے اور ہر عنوانِ باب کے ماتحت مختلف ضمنی عنوانات ہیں:۔

مذہبی مخاشیاں۔ مخاشی پر عمومی تبصرہ۔ استلذاذ بالمثل۔ عورتیں اور استلذاذ بالمثل۔ استلذاذ بالمثل۔ استلذاذ بالوحوش۔ استلذاذ بالنفس۔ مخاشی عہدِ قدیم میں۔ مخاشی قرونِ وسطیٰ میں۔ عہدِ جدید اور مخاشی۔ اخلاقِ جنسی۔

ان تمام عنوانات کے ماتحت معلومات کی ایک دنیا ہے۔ اس موضوع پر آپ اس کتاب سے بہتر کتاب سارے اردو ادب میں نہیں دکھا سکتے قیمت علاوہ محصول ۸ر ہے غیر مجلد سے

سید فرید جعفری مچھلی شہری

"دل کی رانی"

سید فرید جعفری ملک کے اُن نوجوان مگر پختہ کار ادیبوں میں سے ہیں جن کی کتابیں چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں "دل کی رانی ایک ہریجن کی کہانی" ان ہی کی ایک تصنیف ہے جس میں ایک ہریجن کی بپتا بیان کی گئی ہے جو بہت دردناک ہے زبان لطیف و آسان ہے قیمت ۴ علاوہ محصول

محبت کے پھول

یہ ایشیا کے شاعر اعظم ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور کے مشہور و مقبول ڈرامہ "رڈ آلینڈرس" کا آزاد ترجمہ ہے اور فرید صاحب ہی نے اس کو ترجمہ کیا ہے جس کا تعارف نامہ شوکت علی صاحب فہمی نے لکھا ہے اور تقریظ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے قلم سے ہے ٹیگور نے اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کی حریص ذہنیت پر روشنی ڈالی ہے ——

—— اور ٹیگور نے اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کی اُن خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے جنہیں عرف عام میں سرمایہ کی سرمستیاں اور مزدور طبقہ کی سرفروشیاں اور فاقہ مستیاں کہا جاتا ہے وہ اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کو نہایت بے تکلفی بنا کر پیش کرتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۸

ابو الفاضل راز چاندپوری

"دنیائے راز"

ہندوستان کے کہنہ مشق ادیب و روشن خیال شاعر حضرت مولانا ابو الفاضل راز چاندپوری کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کا مقدمہ مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر بی اے نے لکھا ہے۔ ساری کتاب سات ابواب میں تقسیم اور ۲۴۶ نظموں پر مشتمل ہے اور اس کی ہر نظم بتاتی ہے کہ راز جدید عہد کا بہترین نمایندہ ہے کتاب نقائص و معائب سے پاک ہے اور نکھری ہوئی لطیف شاعری کو پیش کرتی ہے، ہر شاعر اور شعر و سخن کے دلدادہ کو یہ مجموعہ ضرور دیکھنا چاہیے۔ قیمت ۱۰ علاوہ محصول۔

بشیر ملیح آبادی

حضرت جوش ملیح آبادی کے والد کا دیوان

کلامِ بشیر

ملک کے مشہور و معروف شاعر حضرت جوش ملیح آبادی کے والد کا کلام "کلام بشیر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت فی جلد ۸ علاوہ محصول

نسیم رضوانی

"تہذیبِ عمل"

عملی زندگی کی اصلاح کے لئے چند مفید مقالات کا مجموعہ، یہ اخلاقی کتاب ہے، بچوں اور طلبا کے لئے بے حد مفید ہے، اس کے مطالعہ سے انسان کے اخلاق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ہر نیم باپ کو اپنے بچوں کے لئے یہ کتاب ضرور منگانی چاہیے

قیمت ۶ علاوہ محصول

مرزا جعفر علی خاں اثر بی اے

"اثرستان"

ہندوستان کے مشہور اور مستند شاعر و ادیب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی بی اے ڈپٹی کلکٹر کا دیوانِ غزلیات شروع میں نواب صاحب کی تصویر بھی شاملِ کتاب ہے۔ اثر صاحب کی شاعرانہ پوزیشن اس قدر اہم ہے کہ ہر شخص ان کے کلام کو استفادہ کے طور پر دیکھتا ہے، لیکن ان کے کلام میں ایک خاص رس اور جذبات کی گہری چاشنی اس درجہ پائی جاتی ہے، کہ دل ہر شعر پہ بے چین اور مست ہو جاتا ہے۔ شعر و ادب کے دلدادگان کو یہ دیوان اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیے

حجم ۱۵۰ صفحات قیمت عہ علاوہ محصول

باسط بسوانی

شاہدِ معنیٰ

جناب ماسٹر باسط بسوانی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے قاضی ظہیر الدین احمد صاحب بسوانی نے مرتب کیا ہے۔ دیکھنے اور پڑھنے کے قابل ہے قیمت مجلد عہ غیر مجلد عمہ علاوہ محصول۔

حضرت شوکت تھانوی

طوفانِ تبسم

شوکت صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ شوکت صاحب مزاح نگاروں کی اولین صف کے ادیب ہیں۔ اُن کے مزاح میں ایک لطیف شوخی اور مذاق پایا جاتا ہے۔ زبان آسان اور سادہ ہے دوسرے صفحہ ہی سے مذاق شروع ہو جاتا ہے اپنی بیوی کے نام آپ نے اپنے طوفان کو منسوب کیا ہے اس کے بعد فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کا دیباچہ ہے پھر مضامین شروع ہوتے ہیں، ہر مضمون بجائے خود کشتِ زعفران ہے۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ شوکت کا طوفانِ تبسم زندگی کے تمام غم اپنی رو میں بہا لیجاتا ہے، اس کے مطالعہ سے جو غیر فانی مسرت حاصل ہوتی ہے اس کے لحاظ سے ۸ قیمت بہت ہی کم ہے (علاوہ محصول)

محمود الرحمٰن ندوی

"دولتِ غزنویہ"

مولوی محمود الرحمٰن صاحب ندوی کی تاریخی تالیف ہے جس میں تاریخی تحقیق و تدقیق کے بعد غازی سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے ولولہ انگیز مجاہدانہ دینی اور علمی کارنامے دکھائے گئے ہیں اور اُن تاریخی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے جو اسلام کے دشمنوں نے تاریخ میں پیدا کر دی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزنوی خاندان کے متعلق یہ مکمل ترین تاریخ ہے۔ ہر مسلمان کیلئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے

حکیم یوسف حسن

"پروازِ خیال"

حکیم یوسف حسن صاحب مدیر اعلیٰ "نیرنگِ خیال" لاہور کے چار مختصر ڈراموں اور تین مکالموں کا مجموعہ ہے۔ نہایت خوبصورت اور نفیس طبع ہوا ہے پروفیسر تاثیر ایم اے کے قلم سے دیباچہ ہے یہ ڈرامے اور مکالمے بے حد دلچسپ ہیں، زبان نہایت آسان اور دلچسپ ہے ہلکی سی چاشنی مزاح کی پائی جاتی ہے قیمت صرف ۵ علاوہ محصول

ل۔ احمد اکبرآبادی

"لالہ رُخ"

طامس مور کی مشہور مثنوی ہے اور انگریزی ادب میں اعلیٰ پایہ کی تصنیف خیال کی جاتی ہے، ملک کے مشہور ادیب لطیف الدین احمد اکبرآبادی نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے" ترجمہ بہ حیثیت ترجمہ بہت ہی بلند ہوا اور اس کا درجہ بھی اردو میں وہی ہے جو طامس مور کی مشہور مثنوی کا ہے۔ لطیف الدین احمد صاحب اکبرآبادی کو جو مہارت ترجمہ میں حاصل ہے وہ ہندوستان کے کم ادیبوں کو نصیب ہے "لالہ رخ" نے اردو ادب کی آغوش کو بہت بڑی دولتِ ادب سے معمور کیا ہے۔ زبان اس درجہ بلند اور شیریں ہے کہ پڑھتے پڑھتے انسان جھوم جاتا ہے، مور کی شاعری کی زبان کا ساتھ دیتی ہے آپ اس کو ضرور ملاحظہ کیجئے قیمت عمہ علاوہ محصول

میر ولی اللہ

"ماہ و پرویں"

میر ولی اللہ کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ میر ولی اللہ بی اے ایبٹ آباد (پنجاب) کے مشہور ادیب ہیں اور مزاحیہ مضامین لکھنے میں ان کو مہارتِ تامہ حاصل ہے۔ کتاب آٹھ مضامین پر مشتمل ہے اور ہر مضمون بجائے خود پڑھنے اور لطف لینے کے قابل ہے قیمت ۱۲ علاوہ محصول۔

گناہ کی راتیں
ایم۔ اسلم

ایم۔ اسلم صاحب رئیس لاہور کے اخلاقی افسانوں کا مجموعہ ہے ایم۔ اسلم صاحب پنجاب کے نہایت پختہ کار ادیبوں میں سے ہیں اور لاتعداد کتابوں کے مصنف ہیں۔ کتاب میں سات افسانے ہیں اور ہر افسانہ عبرت و ہیبت کا آئینہ ہے نوجوانوں کے لئے اس کے صفحات میں تعلیم اخلاق کے خزانے ہیں۔ اور مہذب انسانوں کے لئے یہ مشعل ہدایت کا درجہ رکھتے ہیں آپ بھی ضرور دیکھئے زبان لطیف اور دلچسپ ہے قیمت عہ علاوہ محصول۔

سرگزشتِ اسیر
ڈکٹر ہوگیو
سعادت حسن (مترجم)

وکٹر ہوگیو کی مشہور تصنیف (The Laat days of the cande mned) کا کامیاب ترجمہ ہے جس میں تنسیخ سزائے موت کے معاشری اسباب سے بحث کی گئی ہے وکٹر کی یہ وہ معرکتہ الآرا کتاب ہے جس کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہوچکا ہے سعادت حسن صاحب منٹو نے اس کا ترجمہ کرکے اردو ادب پر احسان کیا ہے۔ شروع میں مترجم کا ایک دیباچہ ہے، جس میں کتاب اور صاحب کتاب کی ذات اور اسباب تحریر کا ذکر ہے، مترجم کے دیباچے کے بعد مصنف یعنی خود وکٹر ہوگیو کا دیباچہ ہے اور اس کے بعد اصل کتاب ہے موجودہ دور انقلاب میں اس کتاب کا مطالعہ لازمی امر ہے اس لئے ہر شخص کو اپنی لائبریری میں سرگزشت اسیر کو ضرور جگہ دینی چاہئے۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

"موجودہ لندن کے اسرار"
نور الٰہی و محمد عمر

نور الٰہی و محمد عمر صاحب کی شاندار تصنیف ہے جس میں فلسفۂ جرائم پر نظر ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں جا بجا حیرت انگیز مقالات آتے ہیں اور لندن کی پراسرار زندگی کے مناظر انسان کے دماغ و دل کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں بہت دلچسپ اور حیرت ناک ہے قیمت صرف عہ

سیر المصنفین
سید محمد یحییٰ تنہا بی۔ اے

اردو نثر نگاروں کا مکمل تذکرہ، ادب اردو میں اپنے موضوع پر سب سے اولین اور بہتر کتاب، مفید دلچسپ اور لبریز معلومات، اردو ادب کے شیدائیوں کیلئے ایک قیمتی اور بہترین تحفہ کوئی کتب خانہ ہمارے خیال سے اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہئے، ادبی تنقید و تاریخ کی دنیا میں یہ شاہکار کا درجہ رکھتی ہے قیمت جلد اول ؏، جلد دوم ؏ علاوہ محصول۔

تاریخ امریکہ

حجم ۲۷۶ صفحات کاغذ بہترین اور طباعت دیدہ زیب ہے اردو زبان میں یہ نہایت نادر تاریخی کتاب ہے۔ امریکہ کے جتنے متعلقات ہیں ان سب کا ذکر اور تاریخی و سیاسی لحاظ سے اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کا تصور امریکہ کا نام لیتے ہی انسان کو ہو سکتا ہے

قیمت ؏ علاوہ محصول۔

"ترانہ"
مرزا یاس عظیم آبادی

ہندوستان کے مشہور شاعر مرزا یاس یگانہ چنگیزی عظیم آبادی کی رباعیات کا مجموعہ ہے شروع میں یاس صاحب کا دلچسپ دیباچہ ہے۔ اس کے بعد رباعیات ہیں، ہر رباعی بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے جس میں حقائق و معارف اور طنزیات کے دریا بھرے ہوئے ہیں، اور واقعی رباعیات کا یہ مجموعہ اس قدر دلچسپ ہے کہ ہر صاحب ذوق کو اسے دیکھنا چاہئے۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

فرانسیسی افسانے

فرانسیسی ادب کا بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو اس مختصر سی کتاب کو ضرور دیکھئے۔ قیمت صرف چار آنے (۴ر)

شیطان کی خالہ

یہ بھی ایک بے حد دلچسپ ناول ہے ضرور دیکھئے قیمت ۱۲ر

بیروزگاری کا علاج

آجکل سب سے زیادہ عظیم مسئلہ روزگار کا ہے، ہر شخص تلاش معاش میں سرگرداں نظر آتا ہے، اس کتاب کے ۱۲۸ صفحات ضرور ایک پریشانِ معاش کو شاہراہِ معاش دکھا سکتے ہیں۔ اگر اس میں جرأت مردانہ اور قوتِ ارادی کی روح موجود ہے۔

قیمت صرف آٹھ آنے (۸ر)

تاریخ مغربی یورپ

ڈاکٹر ایرن ہن کی کتاب "History of Western Europe" کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ نہایت سبق آموز اس کتاب کے مطالعہ سے یورپ کے سیاسی اور معاشری معاملات سمجھ میں آجاتے ہیں قیمت ؏ علاوہ محصول۔

خیالات ارونگ

امریکہ کے نامور مصنف واشنگٹن ارونگ کے چند مضامین کا ترجمہ، انداز بیان دیکھنے کے قابل ہے اردو ادب کے فداکاروں اور انشا پردازوں کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ فن کتاب نویسی، لٹریچر میں انقلاب، اور ایک شادی کا دلفریب انجام، یہ مضامین دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیمت صرف ۸ آنے۔

یہ اور اس کے علاوہ ہر مصنف کی کتابیں ملنے کا پتہ

ادبی مرکز ساغر بک ڈپو میرٹھ

پرنٹر و پبلشر: ساغر نظامی   مطبوعہ ساغر پریس میرٹھ   بہ اہتمام: اسد یار خاں اعظم

شباب آزادی، مسرت اور زندگی کا موج [illegible] سمندر "بادۂ مشرق" کے ۰۰۰ صفحات پر موجیں [illegible] ہے۔ آپ مطالعہ فرمائیں گے تو اعتراف فرمائیں گے کہ ساغر نے بھی اس کتاب سے ایشیا کی عظمت کو دوبالا کر دیا ہے جو اردو شاعری میں عقیدہ، زبان، خیال اور اپنے پیغام کے لحاظ اولین کتاب ہے اور جو ظاہری حسن و جمال کے لحاظ سے بھی ایک بہترین چیز ہے۔

ہندوستان بادۂ مشرق کے مصنف کیلئے مندرجہ ذیل رائے رکھتا ہے

امام الہند علامہ ابوالکلام آزاد :-

صرف ساغر کا طرزِ بیان نصف شاعری ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی :-

"ساغر صاحب کی عمر چھوٹی ہے مگر انہوں نے شاعری میں بڑا کمال پیدا کیا ہے۔ ساغر صاحب کا کلام بہتر میں چھپا ہے۔ ایسی عجیب و غریب صفات کا مجموعہ اردو زبان میں بہت کم چھپا ہوگا۔"

مولوی عبدالحق صاحب بی اے (علیگ) سکریٹری انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن

"ساغر اردو کے جدید شعراء میں سے ہیں جن پر اردو شاعری کے جدید تغیر کا اثر نمایاں ہے اور جو اپنا اثر دوسروں پر ڈال رہے ہیں۔"

"ساغر کے کلام کی بہت بڑی خصوصیت اس کا ترنم اور موسیقیت ہے۔ یہ بات شاید اس وقت کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں۔"

ڈاکٹر سید محمود ایم اے پی ایچ ڈی :-

[illegible] نظموں سے [illegible] ہندوستان [illegible] ہوتی ہے۔

روزنامہ "اجمل" بمبئی

ساغر صاحب ہندوستان [illegible] چند ممتاز شعراء میں سے ہیں [illegible]

نواب جمشید علی خاں بہادر

"ساغر دنیائے شاعری کا مجدد ہے۔"

راؤ عبدالحمید خاں صاحب ایم ایل سی

"ساغر اردو افقِ ادب کا روشن ستارہ ہے۔"

بلبلِ ہند محترمہ مسز سروجنی نائیڈو

"ساغر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی نظموں کے لئے ہندوستانی زندگی، ہندوستانی تجربات اور ہندوستانی جذبات کے عام عنوانات کو منتخب کرتا ہے اور ان کی ادائیگی کے لئے ایسے سلیس اور دلکش الفاظ استعمال کرتا ہے جو عوام الناس کی روزمرہ بول چال سے بیشتر مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کا تخیل تمام تر ہندوستانی مناظر اور ہندوستانی روایات سے ماخوذ ہوتا ہے اور بحور کے اوزان نے ہندوستان کے قدیم دیسی گیتوں کے اوزان کو بکمال خوش اسلوبی اپنے اندر قبول کر لیا ہے۔

ساغر نے زمانہ حال کی اردو شاعری میں زبان کی نرمی اور دل فریب شیرینی پیدا کر دی ہے جس میں ہندی الفاظ یکرنگی کے ساتھ بغیر کسی اجنبیت فارسی منظومات کی شکل تر مقررہ بندشوں میں گھل مل جاتے ہیں۔ [illegible] جناب ساغر شباب سے سرشار ہو کر قدم بڑھاتا ہے اور زندگی کے متعلق اس کا تمام طرزِ عمل شباب کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ "شباب" تاریخ، رومانیت، امید اور آزادی وطن کے جذبات سے مملو ہے۔ ساغر کا ریشہ ریشہ ہندوستانی ہے اس کی شاعری مادرِ وطن ہی سے ماخوذ ہے اور مادرِ وطن ہی سے اس کا انتساب ہے۔"

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی

ساغر کا کلام [illegible] اقبال اور حافظ [illegible] کلام بتاتے [illegible] مسلمان قوم کے [illegible] پیدا کرنیوالے ساغر ہیں [illegible] احباب [illegible]

بغور دیکھ عجب کاریٔ حریفِ فرنگ
کہ خاکِ خشک سے پیدا ہے چشمۂ نوری

نصیبِ روس میں جاگا غریب دہقاں کا
بنا ہے نخلِ تمنا ستونِ دستوری

اٹھا وُہ تیشۂ فرہاد و مسندِ خسرو
چمک اُٹھا ہے زمانے میں بختِ مزدوری

شکستِ مذہب و ایماں میں غوغہ ہی گم ہے خدا
کمال جوش میں ہے بندگی کی مقہوری

اُپج سہی مگر انسان سوزیاں تو نہیں
وطن میں پھیل گئی موجِ روحِ جمہوری

رہا نہ خطرۂ سرمایہ داریٔ افراد
رہی نہ کوئی امیر و غریب میں دوری

اِک انقلابِ مسلسل کا دور ہے جاری
قبائے نو کہ ہے جسمِ قدیم پر بھاری

"مصری"

شکارِ مکر و دنائت فریب سے دل تنگ
چبھا ہے جس کے کلیجہ میں حریت کا خدنگ

فراعنہ کی وہ اک سرزمینِ حسن و جمال
بجا رہی ہے قلوبطرہ جہاں دف و چنگ

حلول کرنے لگی سعدِ زاغلول کی روح
دماغ مصر ہے اور مستقل تخیلِ جنگ

وہ ایک حربۂ مغرب کا کشتۂ رنگیں
جو استراد زمانہ سے ہوگیا بے رنگ

مجاہدینِ سلف کا وہ آئینہ بردار
ہے جسکے عزم کی رفعت کا آسماں پلنگ

اسی کے پاس ہے مشرق کے گلستاں کی کلید
خدا کرے کہ کبھی ایک ہوں سویز اور گنگ

ہر ایک غنچۂ خاموش آگ بن جائے
بہار غیر ہوا اور شعلۂ فلک آہنگ

سویز پر ہو کبھی اختیار مشرق کا
اسے عبور کرے راہوار مشرق کا

"عربی"

وہ ایک مرکزِ انوارِ روحِ انسانی ۔۔۔ جہانِ علم میں سب سے عظیم عرفانی
خدا نے جس کو دیا ہے جلالِ عظمت و جاہ ۔۔۔ عطا ہوئی جسے قدرت سے خود جہانبانی
علوم جس کے ہیں خادم فنون جس کے غلام ۔۔۔ تمام جوہرِ ہستی کی روحِ لافانی
پیامِ صدق دیا جس نے سارے عالم کو ۔۔۔ جہاں میں پھیل گئی جس سے روحِ ایمانی
مزارِ سیدِ کونینؐ کی محافظ قوم ۔۔۔ خدا کے گھر کی میسر ہے جس کو دربانی
وہ قوم جس میں رسولِ خداؐ ہوئے پیدا ۔۔۔ وہ قوم سر پہ رہا جس کے ظلِ سبحانی
وہ قوم حالِ زبوں بھی ہے جس کا نخلِ بہار ۔۔۔ وہ قوم جس کا سکوں بھی ہے موجِ طوفانی

وہ جس کا سینہ امانت ہے دردِ ایماں کی
جو ایک آخری اُمید ہے مسلماں کی

"ترک"

ہر اک زبان پہ جہاں میں ہے داستانِ کمال ۔۔۔ یہ ارضِ انقرہ ہے یا کہ آسمانِ کمال
وہ جس نے قوتِ بازو سے زندگی پائی ۔۔۔ ہے جس کا آج قدم بوس آستانِ کمال
وہ مصطفےٰ کے مقدس وجود کی حامل ۔۔۔ وہ قصہ خوانِ ترقی وہ ترجمانِ کمال
وہ جس کے خون سے رنگیں ہے باسفورس تک ۔۔۔ بلند جس کے جہازوں پہ ہے نشانِ کمال
وہ قوم جس نے چلائے جہاز خشکی پر ۔۔۔ فرازِ سینۂ ہستی میں تھی سنانِ کمال

نپولین ہے ہر اک فرد جس کا دنیا میں | وہ تیغ زن وہ مدبر وہ رازدانِ کمال
وہ لازوال جمال و جلال کی مالک | جہاں ہیں وہ ادبیات کا جہانِ کمال

وہ ایک شمع کہ جو آندھیوں میں تاباں ہے
وہ آفتاب گھٹاؤں میں جو درخشاں ہے

"عراق"

کنارِ غیر میں اک جسم عظمت و تمکین | کہ جیسے پنجۂ مضبوط میں ہو اِک شاہین
ذرا گرفت ہوئی دستِ باغباں کی جو نرم | تو دیکھنا یہی پہنچے گا آسماں کے قرین
جھلک رہا ہے خطِ قسمتِ عراق سے | کہ جھک سکے گی نہ باطل کے سامنے یہ جبیں
وہ ایک سیرتِ انسان کا بہترین حامل | جفا شعار و وطن دوست حریت آگیں
زمانہ یاد رکھے میری پیش گوئی کو | کہ ہے عراق کی آیندہ زندگی زریں
اُٹھا دو قبر سے ہارون کو اور مامون کو | کہ پھر ہو بزم میں اک دورِ ساغرِ زریں
ہوا شراب میں ڈوبی ہوئی چلے ساغر | فضا تمام مے ارغواں سے ہو رنگیں

نئی شراب سے دامن کو لالہ زار کریں
سرورِ تازہ سے پھر مقدمِ بہار کریں

"چینی"

وہ ایشیا کے چمن کی بہارِ گلشن زا | جسے ہے یاد ابھی تک پیام گوتم کا

ہر ایک گوشے میں جسکے قیامتیں ہیں نہاں — وہ اضطراب کا محشر وہ یاس کی دُنیا

بجھا سکے نہ جسے بادِ تند کے جھونکے — وہ ٹمٹماتا ہوا طاق ایشیا کا دیا

بساطِ بازیٔ اغیار پر اسیرِ فریب — وہ خانہ جنگیِ پیہم کے جال کا پھندا

نگاہِ شوق ہے جاپان و روس کی جس پر — وہ دور رقیبوں کے مابین ایک محبوبا

وہ جس کو پیس دیا انقلابِ گردوں نے — وہ جس کا نقش مٹانے کے بعد بھی نہ مٹا

وہ جس پہ تنگ ہے عیش و نشاط کی دنیا — مگر ہے دل میں وہی کیف دورِ ماضی کا

چمک سے چین کے ارژنگ میں جواہر کی
نگاہ خیرہ ہے مغرب کے کیمیا گر کی

جاپانی

کمال قوتِ بازو پہ ہے مدارِ حیات — عمل ہی عزم کو کرتا ہے رستگارِ حیات

کمالِ قوت و طاقت کو زندگی کہیئے — قوی ہی صرف ہے دنیا میں شہریارِ حیات

مگر خدا کے تخیل کو ترک کرنا بھی — نہیں ہے باعثِ افزونیِ وقارِ حیات

یہ لفظ طوالدو کانوں میں مادیت کے — کہ نیستی کے سمندر پہ ہے مزارِ حیات

وہ ایک سلسلہ سیلابِ مادیت کا — وہ ایک مستقل آوازِ اضطرارِ حیات

وہ ایک محشرِ صنعت کا داورِ مغرور — وہ اک قیامتِ ہستی کا بیقرارِ حیات

وہ کامیاب جسے راس ہے تجارتِ عشق — وہ خوش نصیب جسے مل گیا نگارِ حیات

قمار خانۂ اقوام کا امیرِ کبیر
نہیں ہے جس کو خیالِ شکست دامنگیر

"غیر متمدن قبائل"

(۱)

کمالِ علم ہے رحمت جہانِ جاں کیلئے
فسانہ گو کی ضرورت ہے، داستاں کیلئے

مگر وہ علم نتیجہ ہو جس کا ظلم و جہول
ہے ایک لعنتِ ناپاک کُل جہاں کیلئے

غلام ساز اگر علم ہے تو اے انسان!
نہ وہ زمیں کیلئے ہے نہ آسماں کیلئے

نثار میرے دل و روح اُس جہالت پر
جو اک نظیر محبت ہو انس و جاں کیلئے

دیارِ وحشیٔ عریاں اُجڑ کے شہر بسیں
جوازِ قطع بیاباں ہو گلستاں کیلئے

زمیں کو خطۂ نوریں بنائیں جو ذرے
وہ منتخب ہوں تجلائے آسماں کیلئے

کہاں رکیگا یہ سیلِ جنونِ شہریت
ہزار سر ہیں تمدّن کے آستاں کیلئے

غلام ساز تمدُّن کا صید خانہ ہے
وسیع گلشنِ عالم بھی قید خانہ ہے

(۲)

سجا ہے خون سے انساں کے خانۂ تہذیب
کہ نعشِ سر پہ ہے اور آستانۂ تہذیب

نیا اصول ہے ترویجِ علم و حکمت کا
ہے زیر سایۂ خنجر ترانۂ تہذیب

یہ عہدِ برق یہ انوار اور یہ اندھیر!
زبانِ سیف سُنائے فسانۂ تہذیب

غلام ساز کا مقصد غلام سازی ہے
مگر کیا ہے خرد نے بہانۂ تہذیب

وہ کُرد ہو کہ کوئی آفریدی و شامی
ہر ایک آج ہے اوچھا نشانۂ تہذیب

مقدمہ نہ قیامت کا ہوں یہ تمہیدیں | کہ زلفِ جہل ہے اور سخت شانۂ تہذیب
سوادِ جہل سے ہے آہِ آتشیں پیدا | سُلگ اُٹھے نہ کہیں آشیانۂ تہذیب

ہے اِن کے خون سے پُر جامِ شرق و مغرب
شکارگاہِ کُل اقوامِ مشرق و مغرب

"سرِ دلبراں"

میں ذکر اس کا کروں کیا جو ہے مثیلِ نہنگ | بنائے نوحہ و ماتم بہ پردۂ دف و چنگ
وہ مستبد کہ زمانہ ہے جس کا شکوہ طراز | وہ جنگجو کہ خموشی ہے جس کی صوتِ جنگ
وہ ظالموں کا خدا ظلم پروروں کا خدا | وہ جس کے ظلم و ستم سے ہے ایشیا دل تنگ
جگر ہو چین کا یا دل ہو ترک و افغاں کا | ہر ایک سینہ میں پیوست ہے اسی کا خدنگ
نئے تمدن و تہذیب کا وہ دل دادہ | جسے محبتِ انساں ہے باعثِ صد ننگ
قمارخانۂ اقوام کا وہ صدر نشیں | بساطِ مشرق و مغرب ہے جس کی چال پہ دنگ
وہ پیرِ میکدۂ قیصری وہ میکش زر | کہ جس کے جام میں لبریز ہے مئے صد رنگ

کوئی غریب سرِ رہگزر یہ کہتا تھا
کہ اس نے چوس لیا خون سارے مشرق کا

(۲)

وہ ایک تاجرِ صد حیلہ باز و عربدہ ساز | ہوا و حرص و شہنشاہیت کا نغمہ طراز
وہ راہزن پسِ دیوارِ عظمت و حکمت | وہ خود ہی موجدِ قانون خود سیاست باز

وہ علم و حلم کے پردے میں دیوِ استعمار — وہ سیم و زر کے اجالوں میں ایک بادہ نواز

وہ جس کے زیرِ اثر ہند و مصر اور عراق — وہ جس کے زیرِ نظر ارضِ روم و شام و حجاز

محیطِ بحر و بر اس کا جلالِ طوفانی — غرورِ مغرب و مشرق وہ اک خدائے مجاز

وہ جس کا سحرِ سیاست کوئی سمجھ نہ سکا — وہ جس کی ظاہری شانیں ہیں ایک عالمِ راز

وہ پاسبانِ کلیسا ندیمِ دیر و حرم — کہ ظلم جس کا ہے ایمان، جبر جس کی نماز

جہاں کو آتش و خوں میں ڈھکیلنے والا
وہ بربریتِ انساں سے کھیلنے والا

یہ بادہ خوار ہیں سب ان کا ایک ساقی ہے — جو اپنی قدرت و عظمت کے ساتھ باقی ہے

برابر اس کی نظر میں ہیں شاہ اور گدا — سب اس کو ایک ہیں ہندی ہے یا عراقی ہے

ہے صرف اس کے اشارے پہ قائم و باقی — کوئی نظام جو شخصی ہے یا وفاقی ہے

حصولِ کیف کو سمجھا ہے جاوداں سب نے — مگر در اصل یہ اک امرِ اتفاقی ہے

کوئی یہاں متردد ہے اور کوئی خاموش — کسی میں جذبۂ مغرور و طمطراقی ہے

نشاطِ زیست کی بدمستیاں معاذ اللہ — ہے صلح کوش کوئی اور کوئی نفاقی ہے

یہاں ثبات کہاں جام و ساغر و مے کو — نظامِ میکدۂ دہر افتراقی ہے

نہ بادہ خوار رہیں گے نہ یہ صدا باقی
رہیگا صرف وہ ساقیِ میکدا باقی

اُسی کے نام پہ لبریز اپنے جام کرو — پھر ایک جشنِ محبت کا اہتمام کرو

شرابِ عشق و محبت ہو ہر پیالے میں — بقدرِ ذوق و مساوات انتظام کرو

بہیگا خون یہ توپ و تفنگ سے کب تک؟ خدا کیواسطے اب بند قتلِ عام کرو
سکون و امن میں تسکینِ ہر دو عالم ہے بلند زندگیٔ جنگ کا مقام کرو
حدیثِ میکدہ چھیڑو نئے طریقے سے اب اس فسانۂ فرسودہ کو تمام کرو
پیو پلاؤ بہاؤ شرابِ گل افروز تمام عالمِ انساں کو لالہ فام کرو

شرابِ کیفِ اُخوت سے مست ہو جاؤ
وفا پسند محبت پرست ہو جاؤ

ساغر نظامی

اقوال مہاتما گاندھی

تنقید شاید نفس کا ذریعہ ہوتی ہے۔
ترکِ املاک —— کے لئے قطعی انقلابِ خیال کی ضرورت ہے۔
اگر انسان خاندان کے مفہوم کو وسیع کر دے تو اس کے ملک پر بھی اس کے گھر اور اس کے ہم وطنوں پر بھی اہلِ خاندان ہونے کا انطباق ہو سکتا ہے۔
نفرت جرم سے کرو مجرم سے نہ کرو
اصل سوال یہ نہیں ہے کہ آدمی کیا چیزیں کھاتا پیتا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ وہ دماغ سے کیا بات نکالتا ہے
شاعر وہ ہے جو انسان کے دل میں سوئی ہوئی نیکیوں کو جگا دے۔
خیال پر پورا قابو "برہمچاریہ" کی جان ہے۔
کامل تسلیم و رضا کے بغیر خیال پر پورا قابو حاصل ہونا محال ہے۔
نیکی روح کی خلقی صفت ہے۔
فطرت سے ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے جتنے تجربے اور قربانیاں کی جائیں کم ہیں۔
تعلیم میں تہذیب کا خیال رکھنا سب سے مقدم ہے۔
تعمیرِ سیرت تعلیم کی بنیاد ہے۔
گناہ ہولناک شئے ہے۔
جو شخص دوسروں کو دھوکا دیتا ہے وہ ایک دن خود دھوکا کھاتا ہے۔
عہد ایسا ہونا چاہئے جس میں نفس لئیم کو بہانہ سازی کی گنجائش نہ رہے۔
کسرِ نفس ترکِ خودی کا نام ہے اور ترکِ خودی در اصل موکش (نجات) ہے۔
چھوٹی چھوٹی باتوں میں حقارت اور دل آزاری کا برتاؤ ہو تو چپ چاپ سہہ لینا چاہئے۔
نڈر ہونے کے ساتھ حفظِ مراتب کا بھی خیال رکھو یہ فرض ہے۔

جو اپنا فرض ادا کرتا ہے اس کا حق خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔
اُمیدیں پوری نہیں ہوتیں تو اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔
کسی چیز کی فکر نہ کرو!
یہ خیال کہ ہم حق کے راستے پر ہیں کبھی نہیں ہرا سکتا۔
جمہوریت کی اصلی ضمانت یہ ہے کہ لوگ انکو اپنا نمایندہ بنائیں جو نیک اور سچے ہوں۔
یہ ہر قوم کا خداداد حق ہے کہ وہ عہد شکنی کی صورت میں حکومت کے ساتھ اتحادِ عمل سے انکار کر دے
ہماری خدمتِ وطن کا مقصد دوسروں کو لوٹنا نہیں ہے (البتہ) ہم خود لٹنا نہیں چاہتے۔
سچے کا ساتھی خدا ہے۔
کسرِ نفس ترکِ خودی کا نام ہے اور ترکِ خودی در اصل موکش (نجات) ہے یہ کوئی عمل نہیں ہے بلکہ وہ مقصد ہے جس کے لئے اور اعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر خدمت یا نجات کا طالب کسرِ نفس سے محروم ہے تو اس کی طلب جھوٹی ہے۔ بغیر کسرِ نفس کے خدمت خود غرضی بن جاتی ہے۔
انسان کی زبان جب خدا کی کارسازیوں کو بیان کرتی ہے تو اسے ناقص طریقے سے بیان کرتی ہے۔
انسان کی جسمانی حالت بڑی حد تک اس کی نفسی کیفیت کی تابع ہے۔
روحانی قوت سے شب و روز جذبات کو مغلوب کرنا مشکل ہے اور جسمانی قوت سے دُنیا کو فتح کرنا سہل ہے۔
اپنے دشمنوں پر محبت کے ذریعے کامیابی حاصل کرو صداقت کا دھرم یہی ہے کہ دوستی کے ہاتھ کو کبھی نہ جھٹکو۔

قطب جنوبی میں نئی زمین کی تلاش

(F. Drake) فرانسس ڈریک نے قطب جنوبی میں سب سے پہلے قدم رکھا تھا۔ مگر وہ قطب جنوبی کی تمام سرزمین کو معلوم نہ کر سکا تھا اس لئے اب یہ دوسرا وفد انگلستان سے British graham land Expeditor (برٹش گریہم لینڈ وفد کے نام سے) پنولا (Penola) نامی جہاز میں بسر کردگی مسٹر جان ریمل (J. Reymill) قطب جنوبی کو روانہ ہوا ہے۔ اس وفد کو یہ اُمید ہے کہ فاک لینڈ (Falkland) کے مشرق میں کم از کم ایک ہزار میل زمین نئی معلوم ہو جائیگی اور اس پر یہ اپنا قبضہ کر سکیں گے۔ اخبار لندن ٹائمس" کا نامہ نگار خصوصی جو اس وفد کے ہمراہ ہے لکھتا ہے کہ:۔

۱۱ نومبر ۱۹۳۵ء کو پورے باسٹھ دن کے پانی پر چلنے کے بعد ہم مانٹی ویڈیو (Monte vedo) پہنچے۔ مسٹر ریمل کا ارادہ بالکل سیدھے جانے کا تھا مگر نہ چل۔ مڈیرا پر کچھ گھنٹہ اس لئے ٹھیرے کہ وہاں اُتر کر لندن سے لاسلکی کا سامان منگوانا تھا۔ یہاں سے ہم نے کھانے کا تازہ سامان اور پانی بھر لیا۔ میڈیرا سے روانہ ہوکر ہمیں ذراسی تکلیف صرف خطِ استوا کے جنوب میں پیش آئی تھی پھر تو موسم ہر جگہ برابر خوشگوار رہا ہم نے تو پہلے ہی سے اپنے مُشیر مسٹر میک (Meek) کی ہدایات کے بموجب جہاز کا پچھلا حصہ برف کے مقابلہ کیلئے زیادہ مضبوط کر لیا تھا مگر جہاز میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوا اور (Trade winds) شمالی ہوا کے کم چلنے کی وجہ سے جہاز انجن کے ذریعہ چلایا گیا۔

یہ پہلے ہی سے طے کر لیا گیا تھا کہ اس وفد میں کوئی شخص تنخواہ دار نہ ہوگا اس لئے یہ جہاز لفٹنٹ آر۔ ای۔ ڈی رائڈر (Ryder) کے زیر حکم چلایا گیا، اور وفد کا کام مندرجہ ذیل اصحاب میں منقسم ہوا۔

مسٹر مارٹن۔ افسر انچارج چوکیداری و مشاہدۂ قطب۔ لفٹنٹ رائڈر انکے نائب۔ لفٹنٹ مِلٹ چیف انجنیر اور مسٹر مُور (Moore) .... نائب انجنیر۔ لفٹنٹ ہکل جان لاسلکی کے ماہر مسٹر گُرنے معدنیات اور ارضیات کے ماہر۔ پادری فلیمنگ صاحب۔ وفد کے پیش نماز۔ مسٹر رابرٹس پرندوں کے ماہر۔ مسٹر ریلے۔ فلکیات اور موسم کے ماہر مسٹر۔ برٹرام نباتات اور حیوانات کے ماہر۔

ہر ایک کو ان میں سے چار چار گھنٹہ جہاز پر کام کرنا ہوتا ہے اور وہ کام یہ ہے کہ رات کو محض جہاز رانی اور دن کو جہاز کے رسّوں اور لوہے کے حصوں ستونوں اور بلیوں وغیرہ اور چھت کے تختوں پر تیل، چربی رنگ وارنش ملیں۔

جب موسم اچھا ہوتا ہے اتوار کو تعطیل مناتے ہیں۔ علی الصباح نماز سے فارغ ہو کر دن بھر کپڑے دھوئے غسل کرنے۔ کپڑے سینے اور روزنامچے لکھنے میں وقت خوب گزرتا ہے۔

ہم میں سے بہت سے جہاز رانی میں پہلے سے تجربہ کار نہیں ہیں تاہم بسا اوقات ہمارا جوش و خلوص ہماری ناتجربہ کاری اور بھونڈے پن پر اس طرح غالب آجاتا ہے کہ ہمیں خود حیرت ہوتی ہے ہمارے وفد میں جو سائنس کے ماہر ہیں انہوں نے ابتداہی میں ہمیں جمع کر کے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کس کس کو کیا کیا کرنا ہوگا۔ کچھ دن ہوئے کہ قسم قسم کے رنگین پرندے چڑیاں۔ تتلیاں۔ بھونرے۔ مکھے ہمارے جہاز پر آکر بیٹھے تھے ان میں سے ایک کافی تعداد ہم نے پکڑ لی ہے۔ اس ماہ کے آخر تک ہم اُمید کرتے ہیں کہ اسٹنلی بندر پر پہنچ جائیں گے۔

عنایت علی بی اے

"(ترجمہ)"

کہنے کی باتیں

ھلکا

ایک روسی افسانے کا آزاد ترجمہ

مترجمہ
نروتم پرشاد ناگر

"یہ دلچسپ افسانہ انقلاب روس سے قبل کی سیاسی و مجلسی حالات کا آئینہ دار ہے اور اس فضا کو پیش کرتا ہے جو روس میں انقلاب ہونے سے پہلے تیار ہو رہی تھی یہ وہ وقت تھا جبکہ عوام و خواص میں ایک نئے خیال کی آفرینش نے بے تابی و بے چینی پیدا کردی تھی لیکن باوجود اسکے انقلاب کی تمام مشینری کا اخراج نہیں تھی اور لوگ تجربہ کے طور پر ترک اختیار کے پھیر میں پڑے ہوئے تھے۔ روس اور ہندوستان کے انقلاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ روس میں تمام جنگ شہنشاہیت کے خلاف تھی اور کارل مارکس کا نظریہ اشتراکیت ایک نیا جمہوری نظام پیش کر رہا تھا۔ اس کا مقصد مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم کرنا تھا اور ایک عام مساواتی نظام جس کی بنا پر اقتصادی مساوات قائم ہو سکے۔ لیکن ہندوستان میں انقلاب کی یہ نوعیت نہیں ہے اور عام طور پر ساری جنگ سرمایہ داری کے خلاف نہیں لڑی جاری ہے بلکہ محض آزادی اور غلامی کی جنگ ہے جس کے وجوہ اب بہت کچھ اقتصادی ہیں۔ ہرچند کہ اس جنگ کی بنیاد ہی مقابلے اور برابری کے مضبوط احساس پر قائم ہے لیکن اشتراکیت پر ہرگز نہیں ہے آزادی چاہنے والے انفرادی زمینداری کے خلاف جنگ نہیں کر رہے ہیں اور نہ ان کے محسوسات اس قدر ترقی یافتہ ہیں تاہم وہ جنگ مساوات اور مزدوروں اور غریبوں کے نام پر ہی کی جا رہی ہے، لیکن اس وقت تک عام طور پر انفرادی افضلیت کے زعم باطل کے سنگین بت کو قطعی طور پر پارہ پارہ نہیں کیا گیا ہے۔ ان حالات میں یہ افسانہ بہت ہی دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ اس افسانے کو انگریزی زبان سے ہمارے دوست مسٹر نروتم پرشاد ناگر نے کمال محنت سے ترجمہ کیا ہے۔ ناگر صاحب ہندی دنیا کے نہایت مقبول ادیب ہیں اور وشال بھارت جیسا مقبول اور بلند رسالہ انکے مقالات احترام کے ساتھ شائع کرتا ہے۔ نروتم پرشاد صاحب ناگر نے "ایشیا" کیلئے ہندی لٹریچر کے بہترین نمونوں کو اردو میں منتقل کرنے کا ذمہ لیا ہے اور ان کی فرض شناسی سے مجھے یقین ہے کہ وہ ہر وقت اپنی ذمہ داری کو محسوس کرینگے۔ کیونکہ وہ اہل دماغ، اہل قلم اور فرض شناس نوجوان ہیں"

"ساغر"

آٹون ایچ ایک سرکاری افسر تھا۔ روس ان دنوں انقلاب کی آگ میں تپ رہا تھا۔ چاروں طرف سدھار اور پریورتن کی دھوم مچی ہوئی تھی روسی عوام کے رہنما نئے عقیدوں کا پروپیگنڈہ کر رہے تھے ان کی ہر ایک بات میں انسانیت، محبت اور بھائی چارے کی شیرینی ملی ہوئی تھی جو بغیر کسی رکاوٹ کے حلق سے اتر کر رگ رگ میں دوڑ جاتی تھی۔ آٹون ایچ پر بھی ان عقائد کا اثر ہوا۔ اثر ہی نہیں بلکہ وہ پسند بھی کرنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ انہیں عملی جامہ پہنا کر بھی دکھا دینا چاہتا تھا۔ لیکن خیال کو عمل بنانے کے لئے ابھی اسے کوئی جائز موقع نہیں ملا تھا۔ اپنے دوستوں سے جو کہ عموماً سرکاری افسر ہی ہوتے تھے وہ اپنے خیالات کو ظاہر کیا کرتا تھا لیکن وہ سب اس کی ہنسی اڑاتے اور اس کو باتونی کہا کرتے تھے۔

آج اس کے ایک دوست نے اپنی سالگرہ کی خوشی میں اسے دعوت دی تھی اور بھی بہت سے حکام اس دعوت میں شریک ہوئے اور حسب معمول اچھا خاصہ میخانہ بھی جاری تھا خوب دور پر دور چل رہے تھے۔ عادت نہ ہونے پر بھی آٹون ایچ کو کئی گلاس پینے پڑے یہاں بھی انسانیت، محبت، بھائی چارہ اور اشتراکیت کی روحانی بحث شروع ہو گئی تھی

آٹون ایچ ایک طرف تھا اور باقی سب دوسری طرف، تمام مدعوین نے مل کر اس کا خوب مذاق اڑایا۔ خوب بنایا۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ جہلاء اور دہقانیوں کو بہکانے کی باتیں ہیں انہیں عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ کسوٹی پر اگر یہ سونا کھرا اترے تب ہم جانیں، یوں باتیں بنانے سے کیا ہوتا ہے

آٹون ایچ جب دعوت گاہ سے چلنے لگا تو معلوم ہوا کہ اس کی گاڑی موجود نہیں ہے اسے اطلاع دئے بغیر ہی اس کا نوکر اس کی گاڑی کہیں لے گیا ہے۔ اس کے دوستوں نے صلاح دی کہ نوکر کو پکڑ بلایا جائے اور اس کی گستاخی پر اس کے کوڑے لگائے جائیں۔ لیکن آٹون ایچ نے اس صلاح نیک کو ٹھکرا دیا اور پیدل چلنا ہی گوارا کیا۔

موسم اچھا تھا ہی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی، سر درد کر رہا تھا اور اس کے ساتھ نیرنگی تخیل کا طوفان۔

کتنی خوشگوار رات ہے اور اس خوشگوار رات کے اندھیرے میں یہ چھوٹے چھوٹے مکانات کتنے اچھے معلوم ہو رہے ہیں ان گھروں میں چھوٹے آدمی دفتروں کے کلرک اور بساطی وغیرہ رہتے ہونگے ان لوگوں سے اگر میں بھلے آدمیوں کی طرح رحم و محبت سے پیش آؤں تو کیا یہ میری طرف رجوع نہ ہونگے کیا مجھ سے مخاطب نہ ہونگے ؟! ———— ہونگے، اور ضرور ہونگے بلکہ مجھ سے محبت کرنے لگیں گے لیکن مجھے یہ ہو کیا گیا ہے میں اپنے خیالات کو ترتیب بھی نہیں دے سکتا کمبخت شراب کا یہی اثر ہوتا ہے۔ میں اب کبھی نہیں پینے کا اور اس سے فائدہ ہی کیا ہے شام کو اڑائی، خوش ہو گئے۔ صبح ہوئی تو بہ کرنے لگے ———— لیکن میں چل تو ٹھیک رہا ہوں ———— میرے پاؤں تو نہیں لڑکھڑا رہے ہیں !؟!

یہ اور اسی قسم کے خیالات میں الجھا ہوا وہ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ اس کے کانوں میں گانے بجانے کی آواز آئی اس نے چاروں طرف دیکھا گلی کے اس طرف ایک ٹوٹے ہوئے مکان سے وہ آواز آرہی تھی دروازے پر باہر سے کچھ عورتیں دروازے کی درازوں میں جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے، پاس ہی ایک سپاہی کھڑا تھا اس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آٹون کے دفتر کے ایک چھوٹے سے، صرف دس روبل ماہوار پانے والے ایک کلرک سیلڈونیمو کی شادی کا جشن ہو رہا ہے۔

بھلا اس سے اچھا اور کونسا موقع ملیگا کہ میری جیسی حیثیت کا آدمی لاکھ بار شرکت کا پروانہ پانے پر بھی سیلڈنیمو جیسے معمولی آدمی (کہنا تو چاہیئے جانور ہی) کے مکان پر نہیں جا سکتا لیکن میں اس ناممکن کو ممکن کرکے دکھاؤں گا اور سب کے روبرو ایک زندہ مثال پیش کروں گا۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا اور اس کے علاوہ اپنے تخیل میں ایک دوسری ہی دنیا کی سیر کر رہا تھا نشے کی حالت میں اس کی خیالی دنیا کی دھندلی تصویریں سچی اور جیتی جاگتی تصویروں کے مانند

اس کے سامنے آنے لگیں۔ اس نے دیکھا کہ روس کی کایا پلٹ ہو گئی ہے اور آتشکدۂ انقلاب سے نکل کر وہ اور بھی کھرے سونے کی طرح چمکنے رگا ہے۔ زار کا ظالمانہ اور وحشیانہ دور ختم ہو چکا ہے اور انقلاب کی خوشی میں جا بجا جشن ہائے مسرت منائے جا رہے ہیں اور کہیں روس کے مقدس و محترم رہنماؤں کے ترانے گائے جا رہے ہیں ——————

یہی سب مناظر دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہ ایک جگہ رُکا یہاں اس کا ہی ذکر ہو رہا تھا۔

"ہاں اور اُس نے (یہاں اس کا نام لیا گیا) ہمارے لئے کیا کچھ قربانیاں نہ کیں اس کے بعد ایک معمولی ترین کلرک کی شادی میں شریک ہونے کے قصے کو بڑے دلچسپ طریقے اور خوبصورت لفاظی کے ساتھ سُنا۔"

یہ سب سن کر اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے اور اس کا سر غرور سے بلند ہو گیا وہ آگے بڑھا چوراہے پر جا کر اس نے دیکھا اس کی ان قربانیوں کے عوض جو اس نے اپنے وطن کے لئے کی تھیں اس کا ایک بُت نصب کیا جا رہا ہے

خیالات کی اسی دُنیا کی سیر کرتے ہوئے اُس نے عزم بالجزم کر لیا کہ وہ اس شادی میں ضرور شریک ہوگا اِسے ایسا محسوس ہوا کہ اپنے عقائد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس سے بہتر موقعہ اور کوئی نہ ملے گا اب اس کے خیالات کی پرواز کا رُخ تبدیل ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ مکان کے اندر داخل ہو گیا ہے اس کے پہنچتے ہی گانا بجانا بند ہو گیا۔ سب کی سٹی گم ہو گئی۔ سیلڈ ونیمو کی تو یہ حالت ہوئی۔ وہ اس طرح حیرت میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا جیسے اسے لقوہ مار گیا ہو۔

"لیکن اس حالت میں میں زیادہ عرصہ تک ان کو نہیں رہنے دوں گا اور بہت جلد ان کے خوف کو اپنے پیار اور محبت بھری باتوں سے دور کر دونگا' میرے عقائد کی سچائی کو محسوس کرنے کے بعد وہ سب میرے ساتھ اسی طرح گھُل مِل کر باتیں کرینگے جس طرح کہ اپنے ہم پایہ آدمیوں سے کرتے ہیں۔"

یہ سب باتیں سوچ کر وہ گھر میں داخل ہوا، اس کی فوجی وردی کو دیکھ کر کسی کو اُسے ٹوکنے کی ہمت نہ پڑی۔ راستے کی چیزوں کو ٹھوکر سے اِدھر اُدھر ٹھکراتے ہوئے (آئون ایچ سے یہ تمام حرکتیں غیر ارادی طور پر بے خودی میں ہوئیں اسی لئے اُسے افسوس بھی ہوا) وہ اس مقام پر پہنچا جہاں گانا ہو رہا تھا۔

جو کچھ اس کو اندیشہ تھا اور جو کچھ اُس نے سوچا تھا وہی ہوا' اُس پر نظر پڑتے ہی جو جہاں تھا وہیں ساکت ہو گیا۔ رقاص جوڑوں کے قدم خود بخود رُک گئے اور تمام لوگ اس نووارد کو دیکھنے لگے پھر آہستہ آہستہ عقب میں کھسکنے لگے لوگ جو نووارد کی اہمیت و حیثیت سے واقف نہیں تھے اور بے بہرہ تھے اُنہیں ہاتھ کے اشارے سے کپڑا کھینچ کر آنکھوں کے اشارے سے بتا دیا گیا کہ آنے والا ایک بڑا آدمی ہے' افسر ہے' ہوشیاری سے تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ جائے —————— کھڑے ہو جاؤ کوئی بیہودگی نہ ہونے پائے۔

آئون ایچ ابھی ڈیوڑھی کی چوکھٹ ہی پر کھڑا تھا اس کا ایک قدم ڈیوڑھی میں اور ایک آنگن میں تھا اور چند لمحوں تک تمام حاضرین سکتے کے عالم میں کھڑے رہے آخر ایک نوجوان جس کے بال بھورے اور ناک نکیلی تھی آگے بڑھا وہ مرعوب اور خوفزدہ نگاہ سے آئون ایچ کو اس طرح دیکھنے لگا جس طرح کوئی کتا جس پر کوڑے پڑنے والے ہوں اپنے مالک کی طرف دیکھتا ہے

"کہو سیلڈ ونیمو کیسے ہو؟ مجھے پہچانتے تو ہو گے؟" آئون ایچ نے کہا لیکن یہ کہنے کے ساتھ اُسے بے اختیارانہ طور پر محسوس ہوا کہ آغازِ گفتگو بیہودہ ہے اور اس کو ایسے بھدے طریقے سے بات چیت نہیں کرنی چاہیئے۔

"ہاں —— سر —— کار ——" سیلڈ ونیمو کی خوفزدہ زبان سے نکلا

"اچھا میرے دوست! میرے یہاں آنے سے تمہیں حیرت تو ضرور ہوئی ہوگی!؟"

سیلڈ ونیمو کوئی جواب نہ دے سکا' جواب دینے کے لئے اس کا دماغ کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ خوف زدہ باہر نکلی ہوئی آنکھوں سے وہ صرف آئون ایچ کی طرف دیکھتا رہا گویا کوئی عظیم اور خطرناک آفت آنے والی ہے۔

سیلڈ ونیمو کی خاموشی سے آئون ایچ کو اور بھی کشمکش میں ڈال دیا اور اس کی حالت کو اور بھی بے ڈھنگا بنا دیا۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ اس کا یہاں آنا مناسب اور برمحل نہیں ہے اس احساس کے بعد اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ کمرہ کی ہر شے اُسے ایک غیر ضروری مہمان خیال کر رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کو اندازہ ہوا کہ اس کا دماغ کچھ زیادہ چکرایا جا رہا ہے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو بجا طور پر ادا نہیں کر سکتا۔ اُس نے سڑک پر جن تصورات میں دل کو خوش کیا تھا اُن سب پر پانی پھرتا نظر آیا۔ وہ کچھ بے چین ہو کر اُٹھا لیکن پھر کچھ سنبھل کر اس نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں میرا یہاں آنا آپ کو ناگوار خاطر نہ گزرا ہو گا۔ اگر میرے داخلہ کی وجہ سے آپ لوگوں کو زحمت ہوئی ہو تو میں واپس چلا جاؤں"۔

سیلڈ ونیمو چونک پڑا' جیسے بیہوش انسان کو یکایک ہوش آ جائے۔ اتنا بڑا مہمان گھر آیا ہے اور وہ اب تک کچھ نہیں کر سکا ہے اِس خیال کے آتے ہی اس نے خود کو اور قریب رکھے ہوئے صوفے کی طرف دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے اس نے کہا۔

"نہیں سرکار آپ نے مجھ ناچیز کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں قدم رنجہ فرما کر مجھے غیر معمولی عزت بخشی ہے۔"

آئون ایچ کے دل سے ایک بوجھ سا اتر گیا صوفے پر بیٹھ کر اُسے کچھ تسکین محسوس ہوئی اس نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی اس کے علاوہ اور سب کھڑے تھے۔ یہ اُس کو بُرا معلوم ہوا ان سب کو اپنے عقائد سمجھانے کا اور ان عقیدوں کے عملی پہلوؤں کی زندہ مثال پیش کرنے کا موقع تو اچھا تھا لیکن بعد کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ کہنا چاہتا تھا مگر نہ کہہ سکا' وہ یہ تک طے نہ کر سکا کہ آخر وہ کہے کیا؟ اس کی زبان نے ایک حرف ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہی نہیں اس کا دماغ بھی اس کی زبان ہی کا ساتھ دے رہا تھا' عجیب کشمکش تھی۔

"اچھی آفت میں پھنسا' اس سے کیونکر چھٹکارا ہو"

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس عجیب حالت سے چھٹکارا پانے کے لئے اسے ایک سہارا مل گیا۔ یہ سہارا تھا دفتر کا ہیڈ کلرک جو ابھی سیلڈ ونیمو کے برابر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُسے دیکھ کر آئون ایچ کو سکون ہوا' اس نے تسکین کا ایک سانس لیا۔

یہ نہ سمجھئے کہ دفتر کا ہیڈ کلرک اس کے دوستوں میں سے تھا' یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ "ضرورت ایجاد کی ماں" ہے وقتی طور پر اس کو دوست بنا لیا گیا اور اس کے بعد آئون ایچ کا دل کھلا اور اُس نے گفتگو کرنی شروع کی۔

اسے جو کچھ کہنا ہوتا وہ ہیڈ کلرک سے کہتا اور ہیڈ کلرک دیگر مہمانوں تک اس کی بات پہنچا دیتا۔ بہ الفاظِ دیگر ہیڈ کلرک ہم وطن و ہم زبان ہونے کے باوجود اس کے اور دوسرے مہمانوں کے درمیان "ترجمان" کا کام کر رہا تھا۔

اب کمرے میں بھی جان سی پڑنے لگی' تکلف کے پردے اُٹھ گئے۔ خوف نے اپنے پنجے ڈھیلے کرنے شروع کئے نووارد مہمان کی آمد میں اس کا استقبال کرنے کے لئے ہیڈ کلرک

کے لبوں پر ہلکے تبسم کی ایک جھلک نمودار ہوئی کتنی ہی نازنین جواب تک کھڑی تھیں بیٹھنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ ایک نے بڑی جرأت و ہمت سے کام لیکر اپنے رومال سے ہوا کرنی شروع کی بعض نے دبی ہوئی آواز میں گفتگو بھی کرنی شروع کی۔ ایک صاحب بہت زور سے بولنے لگے لیکن کمرہ بھر میں اپنی ہی آواز کو گونجتے ہوئے دیکھکر خاموش ہو گئے۔

اسی دوران میں ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی وہ قد کی چھوٹی اور بدن کی موٹی تھی گلے میں رومال اور سر پر ٹوپی پہنے ہوئے تھی جسے وہ عید اور شب برات کے دن ہی استعمال کرتی تھی اس کے ہاتھوں پر ایک گول تھالی تھی جس میں شراب کی دو بوتلیں اور دو گلاس رکھے تھے یہ بوتلیں بطور خاص دو مہمانان عزیز کے لئے منگائی گئی تھیں بقیہ کا الگ انتظام کیا گیا تھا آٹون ایچ کے پاس پہنچکر اس نے کہا۔

سرکار نے میرے لڑکے کی شادی میں شرکت کر کے مجھے تاریخی اہمیت بخشی ہے جب تک اس خاندان میں کوئی نام لیوا باقی رہیگا، اُس وقت تک آپ کا نام زبانوں پر رہیگا آپ جیسے معزز اور عظیم ہستی کی میں خاطر تو کیا کر سکتی ہوں، پھر بھی جو روکھا سوکھا ہے اسے منظور فرما کر اس ناچیز کو عزت بخشئے۔

"اچھا تو تمہیں سیلڈونیمو کی والدہ ہو!؟
صوفے سے اُٹھتے ہوئے آٹون ایچ نے کہا۔

ہاں سرکار یہ میری ماں ہیں، سیلڈونیمو نے گردن جھکا کر کہا۔
"مجھے تم سے مل کر بہت مسرت ہوئی"

تو میں سمجھتی ہوں کہ میری درخواست منظور ہوئی، سیلڈونیمو کی ماں نے گھٹنے جھکاتے ہوئے کہا سیلڈونیمو نے آگے بڑھکر بوتل اٹھالی اور ایک گلاس آٹون ایچ کو اور دوسرا ہیڈ کلرک کو پیش کیا آٹون ایچ کا یہ ساتواں گلاس تھا نشہ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جیسے گھی کی آہوتی پڑ جائے، پیتے ہی نشہ تیز تر ہو گیا۔ پھر بھی ابھی کسر تھی۔ ایک آدھ گلاس کی نہیں بلکہ چند لمحوں کی، ان چند لمحوں کے گزرتے بھی دیر نہ لگی چنانچہ آٹون ایچ کو محسوس ہوا کہ اس کی زبان سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے ہیں۔ وہ کہنا کچھ چاہتا ہے اور نکلتا کچھ ہے اس کی زبان ہی نہیں اُٹھتی "سب ٹھیک ہو جائیگا" اور ایک گلاس ڈھال کر چڑھا گیا، وہ چاہتا تو نہیں تھا کہ زیادہ پئے مگر ان ہاتھوں کو کیا کرے جو خود بخود بوتل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ اس بیہوشی میں اس کو ہوش آیا، اصلاح و ترقی محبت واشتراکیت کے نظارے اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے اسے محسوس ہوا کہ اس وقت اگر اس کا کوئی دشمن بھی آجاتا تو گلے لگا لیتا۔ اس نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اب وہ اپنی قوم کے لئے، اپنے ملک کے لئے۔۔ بہت کارآمد ثابت ہوگا۔

———— آہستہ آہستہ محبت اُنس، اصلاح اور ترقی کی دُنیا غائب ہو گئی صرف آٹون ایچ سامنے رکھی ہوئی میز کے سہارے پڑا رہ گیا پھر کچھ دیر کے بعد اس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا اس کے پاؤں نے کام نہ دیا اور وہ کرسی سے لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا۔

رنگ میں بھنگ ہو گئی، سیلڈونیمو کی بُری حالت تھی غریب نے سوچا تھا کہ بڑا افسر آیا ہے ممکن ہے کہ اس کی ذات سے اسے کچھ فائدہ ہو جائے اور بہت ممکن ہے کہ اس کا مستقبل سُدھر جائے اور اس کے دن پھر جائیں، یہی سب کچھ سوچکر اور سمجھ کر ہی اُس نے جیسے تیسے قرض دام لیکر اس کے لئے بڑھیا شراب منگائی لیکن اس کی امیدوں کا انجام اور اس کا متخیلہ فائدہ جس شکل میں نمودار ہوا اس کے لئے وہ تیار نہیں تھا ———— یہ سب کچھ دیکھکر اس نے اپنا سر پیٹ لیا اور اس کی حالت بہت بُری ہو گئی۔

سیلڈونیمو کی نوکری کو ابھی پانچ چھ مہینے ہی ہوئے تھے اس سے پیشتر اور اپنے باپ کے فوت ہو جانے کے بعد وہ اور اس کی ماں بے یار و مددگار رہ گئے تھے۔ انہیں اپنے مستقبل میں علاوہ تاریکی اور در در ٹھوکریں کھانے کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ غربت کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ گھاس پھونس مل جاتا، کھا لیتے، کئی بار فاقوں کی بھی نوبت آئی، گھومتے گھامتے، زمانے کی خاک چھانتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے پیٹرس برگ آئے۔ یہاں سیلڈونیمو کو دس روبل ماہانہ پر ایک جگہ مل گئی۔ وہ خود دفتر جاتا تھا اور گھر پر اس کی ماں پڑوسیوں کے کپڑے دھویا کرتی تھی کسی نہ کسی طرح شکم پُری ہو ہی جاتی تھی اور انہوں نے اپنی کفایت شعاری سے کام لیکر کچھ جمع بھی کر لیا تھا۔ پیٹرس برگ ہی میں سیلڈونیمو کے باپ کے ایک دوست رہتے تھے ان کی دو لڑکیاں تھیں، دُبلی پتلی اور بیمار سی بڑی بہت دُبلی اور کمزور تھی اس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا ہو رہا تھا اس وجہ سے اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی جہیز میں آنے والی ۴۰۰ روبل کی بڑی رقم اور ایک لکڑی کے خستہ حال مکان کے سبب سے سیلڈونیمو نے اس لڑکی سے شادی کرنا منظور کر لیا وہ جہیز کے لالچ سے اپنی ذات کو بری نہ کر سکا۔

شادی کی رسم اسی لکڑی کے مکان میں ادا کی گئی، سیلڈونیمو نے صرف دو مہمانوں کو دعوت شرکت دی تھی جن میں سے ایک ہیڈ کلرک تھا۔ دوسرے مہمان لڑکی کے والدین کی طرف سے بلائے گئے تھے۔ اور ان کی خاطر تواضع کا بار بھی انہیں کے ذمّہ تھا۔ سیلڈونیمو کے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں۔ جو کچھ تھا وہ یوں ہی چٹ پٹ میں اُٹھ گیا اسی حالت میں آ نمودار ہوئے آٹون ایچ جن کی خاطر تواضع کا زیر بار ہونا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے شیمپین کی دو بوتلوں کی اسے کتنی زبردست قیمت ادا کرنی پڑی ہوگی یہ بتانا مشکل ہے۔
ہاں۔ سیلڈونیمو کو سر پیٹتے ہوئے دیکھ کر اس کا قیاس البتہ کیا جا سکتا ہے۔

———— ⁂ ————

کسی نہ کسی بہانے یکے بعد دیگرے کل مہمان کھسک گئے صرف سیلڈونیمو اس کی ماں اور دلہن باقی رہ گئے۔ اس بلائے ناگہانی کا ظلم سہنے کے لئے ایک بڑا افسر فرش پر بیہوش پڑا ہے یہ کیونکر گوارا کیا جا سکتا ہے۔ سیلڈونیمو نے پہلے تو یہ سوچا کہ کسی ڈاکٹر کی مدد لی جائے مگر ڈاکٹر کی فیس کا خیال آتے ہی اُسے یہ ارادہ بدل دینا پڑا وہ فیس کہاں سے لائے؟ پیسہ کے لئے تو اُس نے نوکروں (جو اُس کی سسرال کے تھے) تک کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ مگر وہ کہاں سے دیتے جبکہ جن کے پاس پیسہ تھا انہوں نے ہی قرض دینے سے انکار کر دیا تھا تو پھر کیا کیا جائے ہوش آنے پر جب سرکار اپنے آپ کو فرش پر پائینگے تو ان کے غصہ کا کیا عالم ہوگا؟۔۔۔ ایک بار اُس نے سوچا کہ دو کرسیوں کو ملا کر بستر بچھا دیا جائے لیکن یہ بھی ٹھیک نہ ہوگا۔ رات کو کوئی ایسی ویسی بات ہوئی اور اگر کرسیاں الگ ہو گئیں تو کیا ہوگا؟ لیکن کچھ تو ہونا ہی چاہئے۔ پاس والے کمرے میں دولہا دلہن کے لئے ایک خوبصورت اور صاف بستر کا انتظام کیا گیا تھا۔ پلنگ پر تازہ خریدا ہوا گلابی رنگ کا نیا گدا بچھا ہوا تھا۔ تکیے بھی ہلکے گلابی رنگ کے تھے اسی پر آٹون ایچ کو لٹا دیا گیا۔

دولہا اور دلہن کے لئے ایک دوسری کوٹھری میں دو کرسیوں پر پھٹا سا کپڑا بچھا کر انتظام کیا گیا تھا۔ گھر کے دوسرے آدمی رسوئی گھر میں فرش پر ہی پڑے رہے لیکن ان سب باتوں کا یہیں پر خاتمہ نہیں ہوا ابھی تھوڑی ہی رات گزری ہوگی کہ سیلڈونیمو کی

کوٹھری سے چیخ کی آواز سنائی پڑی۔ سوتے سوتے کرسیاں الگ ہوگئیں اور بیچاری دلہن پہلی رات کو ہی اپنی بینچ سے نیچے گر پڑے۔ دل ہی دل میں دلہن نے سیلڈ ونیمو کو اور اس سے زیادہ آٹون آیچ کو کتنا کوسا ہوگا اس کا قیاس آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

سیلڈ ونیمو اُٹھ بیٹھا اُس کی نیند اُچٹ گئی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات بے ترتیبانہ طور پر آنے لگے جو آتے تھے اور منتشر ہو جاتے تھے۔ سامنے ہی اس کی بینچ دو کرسیاں۔ اس کے سارے ولولوں اور اُمنگوں کا خون کرنے کے بعد اُس کے دل کو نوچ رہی تھیں۔ ایک گھنٹہ تک اُس کی یہی کیفیت رہی اور نہ معلوم کب تک رہتی اگر صبح ہوتے ہوتے اُس کی آنکھ نہ لگ جاتیں۔

ادھر نرم بچھونے پر پڑے آٹون آیچ پر بھی بُری طرح بیتی۔ رہ رہ کر وہ رات بھر ہاتھ پاؤں پھینکتا رہا اور نہ معلوم کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ آخر کار جب صبح ہونے کو آئی تو اُس کا ہاتھ پاؤں پھینکنا اور بڑبڑانا بند ہوا۔ اُس کے بعد غالباً وہ پون گھنٹہ تک خوب گہری نیند سویا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب جب اُس کی آنکھ کھلی تو وہ بالکل ہوش میں تھا۔ لیکن اس کا سر بُری طرح درد کر رہا تھا۔ اور مُنہ کا ذائقہ کچھ بگڑا ہوا سا معلوم ہوتا تھا

وہ بستر پر بیٹھ گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سورج کی سنہری شعاعیں کھڑکی کی درازوں میں سے ہوتی ہوئی دیوار پر پڑ کر کانپ رہی تھیں۔ یکایک رات کی باتوں کا اُسے خیال آیا۔ اُس نے صاف طور پر محسوس کیا کہ سیلڈ ونیمو کی شادی کے جشن کو خاک میں ملانے کا باعث وہی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اُسے اپنے وجود سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اور شرم کی وجہ سے اس نے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ اُس نے طے کیا کہ وہ چپ چاپ بغیر کسی سے ملے وہاں سے نکل جائیگا۔ کسی کے سامنے پڑنے کی اُسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ سامنے ہی اُس کے کپڑے رکھے تھے۔ انہیں پہننے کے لئے جیسے ہی وہ اُٹھا کہ سیلڈ ونیمو کی بُڑھیا ماں نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ ایک ہاتھ میں پانی کا برتن اور کندھے پر انگوچھا ڈالے ہوئے تھی۔ انگوچھا اور پانی کو وہیں رکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ ارے! آپ جا کہاں رہے ہیں۔ پہلے ذرا منہ ہاتھ دھو لیجئے بعد میں کپڑے پہنئے گا۔

آٹون آیچ نے دیکھا کہ وہ جیسا سمجھتا تھا ویسا نہیں ہوا۔ سیلڈ ونیمو کی والدہ سے اُسے قطعی شرم محسوس نہیں ہوئی اُسے ایسا معلوم ہوا کہ دنیا میں صرف وہ ہی ایک ایسی ہے جس سے اسے شرم محسوس نہیں ہوگی۔ پھر اُس نے منہ ہاتھ دھونا شروع کیا۔ کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں صابون کی ایک ٹکیا لپٹی تھی، جو غالباً دلہن کے لئے منگائی گئی تھی، آٹون آیچ کو دیدی گئی۔ ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس کی طبیعت اور تازہ ہوگئی جب اُس نے گھر سے باہر قدم رکھا تو اُسے ایسا محسوس ہوا ہر ایک شخص اُسے ہی دیکھ رہا ہے اور سیلڈ ونیمو کی شادی کے جشن کو خاک میں ملانے کے لئے اسے نفرت انگیز نظر سے لعنت ملامت کر رہا ہے۔

دفتر جانے کا ذکر کیا پورے ایک ہفتہ آٹون آیچ اپنے گھر سے نہیں نکلا۔ اس ہفتہ میں اُسے جسمانی تکلیف تو کوئی نہیں ہوئی لیکن اُس کی مجروح روح نے اُسے بڑا تنگ کیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اُسے دوزخ میں ڈالدیا گیا ہے کئی بار اُس نے ارادہ کیا کہ دنیاوی جھگڑوں کو خیرباد کہہ فقیرانہ زندگی اختیار کرکے خدمت خلق میں اپنی باقی ماندہ زندگی گزار دے لیکن تھوڑی دیر بعد اُسے یہ سب باتیں بیہودہ حرکات معلوم ہوئیں۔ لوگ اُس کی باتوں کو سُنکر اور گزشتہ شب کی حرکتوں کا ذکر سُنکر کیا کہیں گے؟ اُسے کتنی حقارت کی نظر سے دیکھیں گے اور سب سے بڑھکر اُسے اپنے ہم افسروں کے سامنے کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا، کتنا نیچا دیکھنا پڑے گا۔۔

.... ان سب باتوں کا خیال آتے ہی وہ پھر اپنے آپ کو بھلا بُرا کہنے لگا۔ ایک بار اس نے نوکری سے استعفیٰ دینے کا بھی خیال کیا۔ لیکن یہ خیال بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا اس کے بعد اُس نے ارادہ کیا کہ جو کچھ ہوگیا ہے اُسے وہ بھول جانے کی کوشش کریگا اور کل ہی سے اپنے فرائض کے انجام دینے کے لئے دفتر جانے لگے گا۔

آٹون آیچ اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ کاغذات کی اُلٹ پلٹ میں وہ اپنے آپ کو ایک دم محو کر دینا چاہتا تھا کہ دفتر کا ہیڈ کلرک سرکاری کاغذات لئے ہوئے دفتر میں حاضر ہوا۔ آٹون آیچ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو روک لیا اور پھر جائز سنجیدگی کے ساتھ ہیڈ کلرک کو کاغذات کے متعلق جو سمجھانا تھا سمجھا دیا۔

ہیڈ کلرک وہاں سے جانا ہی چاہتا تھا۔ مگر جاتے جاتے ٹھہر گیا۔ مُڑ کر اُس نے کہا۔

"سرکار ایک گزارش اور ہے۔ سیلڈ ونیمو اپنا تبادلہ کرانا چاہتا ہے۔"

کہنے کو تو آٹون آیچ نے کہدیا۔ ہاں مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا میں ضرور کردوں گا مگر سیلڈ ونیمو کا نام سنتے ہی اُسے سب باتیں یاد آگئیں۔ اب اُس کی شرم نے غصہ کی شکل اختیار کرلی۔ اُس نے کہا

کچھ نہیں! اس طرح کام نہیں چلے گا۔ مجھے خوب سختی سے کام لینا چاہئیے۔ دراصل یہ سب مزخرافات ہے میرے دوست ٹھیک کہتے تھے کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ انہیں عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ بلکہ انہیں عمل میں لانا بالکل ناممکن ہے۔ میری غلطی تھی جو میں ایسا سمجھا تھا ——— بیشک ——— میری غلطی تھی ——— لیکن اب مجھے خوب سختی سے کام لینا چاہئیے ——— خوب سختی سے ———

اس کے بعد آٹون آیچ اپنے پُرانے دوستوں کی پُرانی پارٹی میں جا ملا۔ صرف کہنے کی باتوں کو 'پھر کبھی' دہراتے ہوئے اُسے کسی شخص نے نہیں دیکھا۔

ارشاداتِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

آرزو کا ترک کرنا ہی تونگری ہے۔
باطل کی حکومت چند لمحوں تک قائم رہتی ہے۔
اور سچائی کی حکومت قیامت تک
مایوسی روح کے لئے موت ہے۔

درخت میں زبان
بہتے ہوئے چشمے میں کتاب
پتھر میں نصیحت
اور
ہر شے میں کوئی نہ کوئی حقیقت مخفی ہے
"شکسپیر"

مشرق کی ایک عظیم المرتبت و مایۂ ناز شاعرہ

بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو

جہاں تک دنیا کے بہترین علمی و ادبی حلقوں کا تعلق ہے "بلبلِ ہند" مسز سروجنی نائیڈو کی محترم و مایۂ ناز ہستی اب محتاج تعارف باقی نہیں رہی۔ مشرق کی اس عظیم المرتبت اور مایۂ ناز شاعرہ کی عزت افزائی میں پوری وسعتِ قلبی اور فرض شناسی کا ثبوت دیا گیا ہے اسی سے ان کے ادب کو ایک لافانی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ ایشیا میں ہندوستان کی کوئی انجمن اور کوئی چھوٹی سی شخصیت ایسی نہیں جو سروجنی دیوی کی ذی کشش شاعری کی پجاری نہ ہو اور فردوسِ مشرق کی کوئی روش ایسی باقی نہیں جو "بلبل ہند" کے پُر بہار اور رس بھرے گیتوں سے ایک ابدی کیف کے جھولے میں جھولتی نظر نہ آتی ہو۔ جہاں تک اردو دنیائے ادب کا تعلق ہے وہ اس "گیتوں کی رانی" نے گوشے گوشے کو متاثر کر دیا ہے پھر بھی اس کی رہبرانہ سیاسی حیثیت نے اس کی اصلی روح کو بے نقاب نہیں ہونے دیا اور عام طور پر ہم جس قدر ٹیگور کو جانتے ہیں سروجنی سے واقف نہیں یا یوں کہئے کہ ہم واقف ہونے کے جذبہ کی تشنگی سے مجبور ہو کر اپنے اشتیاق وافر کو پیش کر رہے ہیں۔ یہ تو واقعہ ضرور ہے کہ سر رابندرناتھ ٹیگور کی شاعرانہ شہرت کا راز یہی ہے کہ وہ سیاسی مناظر پر نظر نہیں آتے اور ان کو عملی سیاست سے دور کا بھی تعلق نہیں لیکن مسز نائیڈو ملک کی ہر عملی سیاست میں دخیل ہیں اور ان کو تمام ملک نہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے بلکہ سیاسی و وطنی رہبر کی حیثیت سے پہچانتا ہے ان کی سیاسی و عملی حیثیت اتنی ارفع ہو گئی ہے کہ شاعرانہ حیثیت کے آفتاب کی شعاعیں نور بیز نہیں ہوتیں۔

لیکن بہر حال اس مضمون میں ہم ان کی زندگی اور ان کی شاعری پر ایک جامع نظر ڈالنی چاہتے ہیں گو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم ان کو تمام و کمال سمجھ سکے ہیں مگر ہماری کوشش ہو گی کہ ہم مشرق کی اس عظیم المرتبت شاعرہ، ہندوستان کی اس آتش نفس عندلیب اور بنگال کی اس شیریں گلو اور دل سوز کوئل کے گیتوں کے حقیقی کیف کو سمجھیں اور سمجھائیں۔ اس مضمون کا پہلا حصہ ان کے سوانحِ حیات اور دوسرا ان کی شاعری پر مشتمل ہو گا۔

(۱)

شریمتی سروجنی دیوی ۱۸۷۹ء میں بنگال کے ایک معزز و با وقار برہمن خاندان میں بمقام ریاست حیدر آباد دکن پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام رگھوناتھ چٹوپادھیائے (چٹرجی) تھا جن کے خاندان کا قدیمی سلسلہ "برہم نگر" سے ملتا ہے۔ مسٹر رگھوناتھ چٹوپادھیائے نے ۱۸۷۸ء میں اڈنبرا یونیورسٹی سے ڈی ایس سی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس ہو کر حیدر آباد میں نظام کالج کھولا اور تمام عمر تعلیمی ترقی میں کوشاں رہے۔

شریمتی سروجنی دیوی کا اصلی وطن بنگالہ ہے لیکن ان کے خاندان کی مستقل بود و باش مدتوں سے حیدر آباد میں ہے، جہاں ہر قوم کے افراد مسلمانوں کی مشارکت و مجالست کے اثر سے بے تکلف اور شستہ اردو بولتے ہیں، چنانچہ رگھوناتھ چٹوپادھیائے بھی اپنی بیٹی سے شیر خوارگی کے زمانے میں بنگالی میں بات نہیں کی بلکہ ہمیشہ زبان اردو ہی میں گفتگو فرماتے تھے در اصل ان کی مادری اور اصلی زبان اردو ہی تھی اور وہ قدرتاً اس طرزِ عمل کے لئے مجبور تھے لیکن یہ ہندوستان کی ذہنی اور دماغی غلامی کا پُر شباب زمانہ تھا اور ہندوستانی زبانوں کو انگریزی زبان کے مقابلے میں کمتر سمجھا جاتا تھا۔ غالباً یہی صورت حال اس کی ذمہ دار ہے کہ زمانہ سروجنی کو انگریزی زبان کی شاعرہ کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے ورنہ ان کے اظہارِ خیال کے لئے بنگالی یا اردو زبان جسے ان کی مادری زبان سمجھنا چاہیے تنگ دامن اور غیر فطری نہ تھی سروجنی دیوی اپنی ماں کی مقدس کوکھ ہی سے ذہین اور فطین پیدا ہوئی تھیں اس لئے ان کے والدین نے تربیت و تعلیم کی طرف خاص توجہ دی، سروجنی دیوی کی تعلیم ابتداہی سے انگریزی مدارس میں ہوئی، ابھی ان کی عمر بارہ برس کی بھی نہ تھی کہ مدراس یونیورسٹی سے میٹریکولیشن کے امتحان میں کامیابی حاصل کی یہ ان کی فطری ذہانت اور جودت کا سب سے پہلا کارنامہ تھا جس نے ان کو تمام ملک میں مشہور کر دیا۔

جب سروجنی دیوی کی عمر سولہ برس کی ہوئی تو سرکار نظام کی طرف سے وظیفہ دیکر انگلستان بھیجی گئیں جہاں آپنے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی انگلستان میں آپنے اوّل اوّل کنگس (شاہی) کالج لندن میں تعلیم پائی اور پھر غیر معمولی ذہانت و فطانت کی وجہ سے ایک اجنبی زبان پر ان کو مادری زبان کی طرح کامل قدرت و مہارت حاصل ہو گئی۔

اعلیٰ تعلیم و تربیت کے بعد شاعری کے وہ فطری جذبات جو شاعرہ کے بطون و شعور پر طاری تھے، یقیناً بے تاب ہو جانے چاہئے تھے کیونکہ اظہارِ خیال کے لئے تربیتِ نطق اور ذخیرۂ الفاظ کے حصول کے بعد کوئی وجہ باقی نہیں رہتا۔ یہ حقیقت کسی دور میں بھی غلط نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو گی کہ شاعر محض دل سے بن سکتا ہے۔ مگر محض دماغ سے کبھی نہیں بن سکتا۔ اگر سروجنی کے پہلو میں الوہیت کی ایک غیر فانی شمع روشن نہ ہوتی اگر اس کے دل میں محبتِ انسانی اور عشقِ الٰہی کی انگیٹھی نہ دہک رہی ہوتی تو ناممکن تھا کہ وہ "سروجنی" ہو سکتیں۔ ان کی روحانیت نے ان کی علمی قابلیت کو ذوقِ اظہار بخشا اور ان کے اظہارِ قابلیت نے ایک عالم کو مسحور کر لیا۔

۱۸۹۸ء میں سروجنی دیوی کے شوہر ہونے کا فخر ڈاکٹر نائیڈو کو حاصل ہوا۔ اس غیر علاقائی رشتۂ زوجیت سے سروجنی دیوی کی آزاد خیالی اور بلندی کا پتہ چلتا ہے۔ سروجنی دیوی چٹوپادھیائے

خاندان سے ہیں اور ڈاکٹر نائیڈو کا خاندان بالکل مختلف ہے لیکن یہ شاعرانہ اسپرٹ تھی جس نے فرسودگی، ذات پات، خاندان وغیرہ کی قیود کو توڑ کر ضمیر اور روح، محبت اور فطرت کے تقاضات کی بنا پر ایک نئی مثال قائم کی۔ ڈاکٹر نائیڈو جو نظام دومنین کے بہت بڑے ڈاکٹر ہیں نہایت آزاد خیال اور بلند انسان ہیں۔ مسز سروجنی نائیڈو کے بڑے صاحبزادے جو ابھی امریکہ سے ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری لیکر آئے ہیں بہت فہیم اور ہوشیار ڈاکٹر ہیں اور ان کے چھوٹے صاحبزادے مسٹر مینا ایک ذہین نوجوان ہیں جن کی انگریزی انشا پردازی ان کی برگزیدہ ماں کی طرح ہندوستان اور دوسرے ممالک سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے دو صاحبزادوں کے علاوہ مسز نائیڈو کی دو صاحبزادیاں بھی ہیں، اور پدمجہ دونوں نہایت قابل اور ذہین ہیں۔ مس پدمجہ شاعرہ بھی ہیں اور اپنی والدہ محترمہ کی طرح انگریزی زبان میں بہت اچھے شعر کہتی ہیں۔ تمام دکن میں اس خاندان کی ذہانت اور فطانت کی دھوم ہے اور ہر شخص اس خاندان کے کمالات کے راگ الاپتا نظر آتا ہے۔

مسز سروجنی نائیڈو کی شاعری

مسز سروجنی نائیڈو نے بیس برس کی عمر ہونے سے قبل ہی ایک حسین مجموعہ "گولڈن تھریش ہولڈ" (آستانِ طلائی) یا "فرشِ زریں" کے نام سے شائع کیا اور وہ بے حد مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ انگلستان کے شعراء کی صفِ اوّل میں ان کو جگہ دیدی گئی۔ مسز سروجنی دیوی نائیڈو وہ نہایت وسیع النظر اور بلند معیار شاعرہ ہیں، "آستانِ طلائی" کو شائع کرتے وقت انہوں نے اپنے کمالِ فن کی بلند آہنگی سے کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد جو کام ان کی طرف سے پیش ہوا اس میں رفعت و شیرینی، بلند خیالی اور لذت کی فراوانی تھی۔

سروجنی کا طائرِ تخیل فطرت کے ہر منظر پر پروانہ وار رقص کرتا نظر آتا ہے! اور اس کو ہم جلیسی و فطرت نے اپنے فیض سے نطق و بیان کی وہ قوتیں بخش دی ہیں کہ فطرت کے خفی ترین خط کو بھی مصور کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ یہی وہ کمال ہے جو کسی شاعر کو علوم کے دروازوں پر دریوزہ گری کرنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ فطرت کا جمال شاعر کو نذر دیتا ہے مگر اُردو زبان کے کتنے شاعر ایسے ہونگے جو صبح خیزی کے عادی ہوں اور جنہوں نے آفاق میں نیرنگیٔ سحر کا طلسمی و عجیب سماں دیکھا ہو، جنہوں نے طیور کے چہچہانے سے پہلے گوش بر آواز ہو کر فطرت کا لطیف راگ سُنا ہو۔

اُردو شاعری کا جہاں تک تعلق ہے اسے مثالی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ ابھی اوّلیں دور میں ہے اور تعمیر کی منزلوں سے گزر رہی ہو۔ اس کی تخلیق اور پھر اس کی تخلیق اور پھر اس کی مسلسل تعمیر و تشکیل کی جو تاریخ ہے وہ اس کے غیر معمولی ارتقا کو تو پیش کرتی ہے لیکن تکمیل کو پیش نہیں کرتی، یعنی اگر غور کیا جائے تو ابھی اس کا کوئی کلچر اور کوئی فضا ہی مرتب نہیں ہوئی۔ فارسی کے موثرات نے اس کو جس قالب میں ڈھال دیا اور عقائد نے جو صورت دی وہ نہ ہندوستانی تھی نہ ایرانی اور نہ آرین۔ بلکہ گستاخی نہ ہو تو اس کو نقالی سے تعبیر کرنے کو جی چاہتا ہے نقل سے کبھی روح متاثر نہیں ہو سکتی چنانچہ اُردو شاعری کی روح کم متاثر ہوئی اور فن کے لحاظ سے اُس نے اس لئے ترقی کی کہ اس کے پاس فصل کی تیاری کے لئے کھیت، تخم اور تمام سامان فارسی زمینداران ادب سے مستعار مل چکا تھا لیکن اس کے بازوؤں اور قوتِ دماغی کو اگر اس باب میں جفاکشی کرنی پڑتی تو اس کی روح کے متاثر ہونے کا موقع تھا، مگر اس حال میں کیونکر ممکن تھا کہ اُردو شاعری کی روح (الا ماشاءاللہ) میں شاعری کی اصلی کیفیت پیدا ہوتی۔ پھر مذہب کے مقابلے میں شاعری کو کمتر خیال کرنا یہ بجائے خود روح کے مضمحل کر دینے کے لئے کافی تھا۔ ایسی صورت میں مکمل اور اچھے شاعر پیدا ہوتے تو کیونکر ہوتے؟ تاہم فضا اور ماحول کی غلط سامانیوں کے باوجود فطرت نے اپنی رسالت کے فرائض ادا کئے اور چند لوگ اُردو میں ایسے پیدا ہوئے جو فطرت کے حقیقی پیامی تصور کئے جا سکتے ہیں۔

لیکن عام طور پر شاعری کے مفہوم اور فضا، رنگ و روپ، کلچر اور اسپرٹ میں خالص ہندوستانیت پیدا نہیں ہو سکی اور اُردو زبان کا شاعر اصلی کیفیت سے محروم رہا۔ نہ صرف محروم رہا بلکہ اس میں مزاجی نقائص بھی پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی کمی اس میں خود انتقادی اور شاعرانہ خودی کی ہے وہ ہمیشہ سوسائٹی کا غلام رہا۔ اور اس نے کبھی اپنی پہنی ہوئی زنجیروں کو خود نہیں توڑا۔ سوسائٹی نے اپنے ذوق کے مطابق اس کو مدت تک چلایا۔ تا آنکہ خود اس میں انقلاب پیدا نہیں ہوا یا شاعر نہیں لایا۔ ایک وجہ اس کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُردو زبان میں سچے نقادوں کی کمی ہے۔ یہاں تنقید کا مقصد تعریف و تنقیص محض کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہاں اگر کسی شاعر کے کلام پر تنقید کی جائے تو وہ اس کو اپنی دشمنی تصور کرتا ہے اور سچ پوچھئے تو جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وہ بھی دشمنی ہی کی غرض سے کی بھی جاتی ہے۔ مگر زندہ اور مہذب ممالک میں یہ طریقہ نہیں لیکن بہر حال وہ مشرق ہو یا مغرب حقیقی شاعر کو خود اپنا نقاد ہونا چاہئے۔ اگر وہ خود اپنا نقاد ہوگا تو کسی نکتہ چین کی زبان نہیں کھل سکتی۔

مسز سروجنی نائیڈو سے انگلستان کے ایک انگریز نقاد مسٹر ریڈ میٹرگوس نے صاف کہدیا کہ اگر تم کو انگریزی شاعری میں اپنی مخصوص جگہ لینی ہے تو اپنے وطن اور اس کی خصوصیات کو نظر انداز نہ کرو انگریزی خیالات کو انگریزی میں دُہرانے سے تم حقیقی شاعر نہیں بن سکتیں۔ بلکہ انگریزی میں ہندوستانی خیالات و جذبات کو پیش کرنے ہی سے تم مغرب میں اپنی مشرقی نثر اور شاعری کا پرچم لہرا سکتی ہو۔

وہ نقاد بہت بڑا ناقد تھا جس نے یہ رائے دی اور وہ شاعرہ بہت بڑی عقیل تھی جس نے اس رائے کو سمجھا اور پھر اس کی شاعری تصنع کے تمام لباسوں کو چاک کر کے حقیقی رنگ میں جلوہ افروز ہو گئی۔

شاعر کے لئے محتاط اور متفکر ہونے کی ضرورت ہے۔ مشاعروں اور کوی سملنوں کے شاعر وقتی واہ واہ حاصل کر سکتے ہیں مگر ان کی روح میں کیف نہیں پیدا ہو سکتا اور وہ عالمگیر حیثیت اختیار نہیں کر سکتے جو کافی ریاضتِ روحانی و دماغی کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ سروجنی کی شاعری ان ہنگامہ خیزیوں اور آفاقی اثرات سے آزاد تھی۔ اس کے سامعین مشرق و مغرب کے پختہ کار نقاد خوش ذوق طبقے تھے۔ اور اس کی اشاعت کے ذرائع وہ نہ تھے جو دہلی و لکھنؤ کی قسمت ہیں اس کی شاعری ہونٹوں پر رسمی لفظوں کو زبردستی پیدا کرنے سے تجمل اور روح کو قصاں کر دینے میں مشاق ثابت ہوئی۔

اس کی شاعری کا پیکر، روحانی وجد و رقص، کیف و سرور، رنگینیٔ بہار، درد و پیغامِ اتحاد اور ہندوستانی تقاضاتِ فطرت کی گہری اور لطیف نفسیات کے عناصر اور اجزاء سے مرکب ہوا ہے۔ وہ ایک شعلہ نفس عندلیب ہے جو اپنے چمن (ہندوستان) کی عظمت کے گیت سرشار ہو کر گاتی ہے۔

مادرِ وطن سے خطاب

اُٹھ مادرِ وطن!

جمود و تعطل کے ذلت آفریں خواب سے بیدار ہو، بادِ حوادث کے جھونکے تیرے گلشنِ شباب کو

ابھی تاراج نہیں کرسکے ہیں تو نئی نویلی دُلہن بنکر اپنے بطن سے نئی شوکتیں پیدا کر۔

پا بہ سلاسل قومیں غلامی کی ظلمت میں مصروفِ فغاں ہیں۔ اُٹھ اور انہیں امیدوں کے نئے سپیدۂ سحری کا جلوہ دکھادے

مادرِ ہند ـــــــ اے مادرِ ہند تو کہاں سورہی ہے، تیرے بچے پکار رہے ہیں۔ انہیں اپنی آواز سنادے

مادرِ وطن!
مستقبل تجھے پکار رہا ہے
عزت، شوکت، اور فتوحات تیرے قدموں پر قربان ہونے کے لئے تیار ہیں۔
اُٹھ اے نیند کی ماتی ماں اُٹھ
اپنے سر پر تاج رکھ لے۔ تو اقلیم ماضی کی ملکہ تھی۔

بہت بڑی دقت ہے کہ اُردو داں حضرات سروجنی کی اصلی روحِ شاعری کو معلوم نہیں کرسکتے ایک زبان سے دوسری زبان میں شعر کا ترجمہ کامیابی کے ساتھ مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے انگریزی زبان میں یہی نظم لرزہ براندام کردینے والی ہے اور اُردو کے قالب میں وہ بات باقی نہیں رہی۔ اصلی زبان میں شاعرہ کا جذبۂ محبتِ وطن الفاظ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اور اس نے جذبہ کی حاجت اور اظہارِ خیال کی ضرورت سے الفاظ تجویز کئے ہیں۔ مترجم کو تو اس کی ضرورت نہیں پڑی وہ تو سروجنی کی شاعری سے بحث کرنے کے لئے بیٹھا ہے۔

دیہاتی گانے نظم کرنے میں بھی سروجنی دیوی کو مہارت ہے ان گانوں کے پردے میں اپنے مادرِ وطن کے مصائب کے افسانے کہے ہیں۔ مسز نائیڈو فطرتِ انسانی کی ماہر ہیں انکے کلام میں ہندی جذبات کی حرارت، ہندی قلب کا تموج، اور ہندی خیالات کی تحریک پائی جاتی ہے۔

یہاں تک کہنے کے بعد ہم اختر دہلوی کا ایک مختصر نوٹ شریکِ مضمون کرتے ہیں جو سروجنی دیوی کی شاعری پر مکمل نوٹ تو نہیں ہے لیکن اس کے مطالعہ سے ان کی شاعرانہ کمال کا اجمالی اندازہ ضرور ہوجاتا ہے۔

"مسز نائیڈو کی شاعری بجائے خود ایک وسیع مضمون ہے اور چونکہ وہ تمام وکمال انگریزی زبان میں ہے۔ اس لئے اُردو میں اُس کی مفصل تنقید اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس کے لئے ضرور ہے کہ اول اُن اثرات کو واضح کیا جائے جو اُن کی شاعری گلکار تقابیر پر تو فگن ہوئے اس کے بعد اُن کی شاعری کا تقابل اور موازنہ دیگر انگریزی شعراء کے کلام کے ساتھ کرکے اُس کی خصوصیات کو واضح کیا جائے اور آخر میں یہ تعین کیا جائے کہ انگریزی نظم میں اُن کا پایہ کیا ہے ظاہر ہے کہ اگر اردو زبان میں ان تمام مباحث کے لئے وسعت بھی ہو تو وہ نقاد کہاں جو ان سے کشمکش کرسکے لہٰذا یہاں صرف اس قدر ہوسکتا ہے کہ ایک اجمالی تبصرہ ناظرین کے پیشکش کردیا جائے یہ بیان اوپر آچکا ہے کہ مسز نائیڈو کو اپنے طالبعمانہ قیام انگلستان میں اپنی علمی اور شاعرانہ استعداد کو ترقی دینے کے خاص مواقع نصیب رہے ہے۔ انگلستان میں اُس وقت سوئن برن موریس اور روزیٹی کا اثر غالب تھا اور انگریزی نظم میں نئی نئی گلکاریاں اور رنگ آمیزیاں ہوچکی تھیں۔ مذکورہ بالا شعراء اور ان کے معاصرین نے جو رنگ پیدا کردیا تھا وہ اگرچہ بہت حد تک تو اُس نئی شاعری کے غروب کی شفق تھا جو انیسویں صدی کے شروع میں ورڈزورتھ بائرن اور شیلے کے عروج کے ساتھ طلوع ہوا تھا لیکن تاہم موسمِ خزاں کی کسی سہانی شام کی مانند نظر فریب ضرور تھا۔ ان شعراء کی سعی سے انگریزی شاعری نے زبان کے اعتبار سے نئی لطافتیں اختیار کرلیں جن سے شاعری موسیقی کے نصب العین کے قریب ہوگئی تھی تخیل کے اعتبار سے اُس کی حدود مصوری کے قریب پہنچ گئی تھیں اور فنِ مصوری کے اصول شاعری میں جھلکتے نظر آتے تھے شاعری کو دیگر فنونِ لطیفہ سے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے، اور اس میں مصوری اور موسیقی دونوں کے اجزا ابتداء سے شامل رہے ہیں خصوصاً موسیقی اور شاعری کا قدیم اور قریبی رابطہ بالکل بیّن اور واضح ہے لیکن اس دور کے انگریزی شعراء کی غالباً سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اُنہوں نے مصورانہ تخیلات کو سُریلے الفاظ میں منظوم کرنے کی خاص طور پر مہارت بہم پہنچائی تھی اس میلان کا اثر ہماری شاعرہ کے کلام پر بھی پڑا۔ اور جہاں تک وہ اثر مسز نائیڈو کی نظموں کو فردوسِ گوش بنانے میں مدد دیتا ہے۔ اُس کو مفید کہنے میں کوئی تامل نہیں ہوسکتا لیکن اس اثر کا ایک مضر پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ بعض دفعہ محض سُریلے الفاظ کو شاعرانہ کلام کا مترادف خیال کرلیا جاتا ہے یا پڑھنے والے کی توجہ الفاظ کے نغمہ میں اس قدر اُلجھ جاتی ہے کہ نظم کا مفہوم بالکل نظرانداز ہوجاتا ہے۔ شاعری کا مدعا محض ایک نغمۂ صوت کی تخلیق نہیں، اس کا دائرۂ تخلیق اس سے بہت زیادہ وسیع ہے خوش آواز الفاظ کا بڑھا ہوا شوق بعض دفعہ شاعری کو محض لفاظی کے درجہ تک گرادیتا ہے۔ حق پسندی کا تقاضا اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور کرتا ہے کہ یہ مضر اثر بھی مسز سروجنی نائیڈو کی ابتدائی نظموں میں بالکل مفقود نہیں ہے۔

بادی النظر میں یہی امر کچھ کم حیرت خیز نہیں کہ کوئی ہندوستانی انگریزی میں شعر کہے۔ اصلی شاعری تمام وکمال فطرت پر مبنی ہے اور اُس کا اظہار فطری طور پر اپنی ہی زبان میں ہوسکتا ہے لیکن خواہ اسے ہُنر کہئے یا عیب مگر یہ واقعہ ہے ہندوستانیوں کو غیر زبانوں کے اختیار کرنے اور اُن زبانوں کو اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں عرصۂ دراز سے ایک خاص ملکہ حاصل رہا ہے مثال کے طور پر فارسی کو لیجئے مسلمانوں کے عہد میں زبان نے وہ عروج پایا کہ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی کثرت سے فارسی شعر کہنے لگے اور ہندوستان کی فارسی شاعری کے متعلق شیخ علی حزیں جیسے تنگ خیال اہلِ زبان خواہ کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں اور "بوئے کچوری می آید" پھبتی اُڑائیں، لیکن اس ملک کے فارسی گو شعراء کے گروہ میں چند ایسے بھی ہیں جن کے کمال کی داد ہر ایک منصف مزاج شخص کو دینی پڑتی ہے۔ عربی فارسی سے زیادہ مشکل الحصول زبان ہے لیکن نطقِ ہندی لحنِ نجدی کے اختیار کرنے سے عاجز ثابت نہیں ہوا متعدد ہندوستانیوں نے عربی نظم ونثر میں قابل قدر سلیقہ دکھایا ہے۔ انگریزی تعلیم کے بنگال میں رواج پاتے ہی بنگالی شعراء کو انگریزی نظم کا شوق ہوگیا۔ اور ان میں کم ازکم دو شاعر اس پایہ کے ہوئے کہ ان کا کلام اہلِ زبان کی نگاہ میں بھی وقیع قرار پایا ہے۔ ان میں سے ایک (ڈیروزیو) تو مخلوط النسل ہونے کی وجہ سے انگریزی کو غالباً مادری زبان کی طرح استعمال کرتا تھا لیکن مس تورو دت خالص بنگالی ہونے کے اعتبار سے مسز سروجنی نائیڈو کی حقیقی پیشرو

تھیں۔ غرض کہ مسز سروجنی نائیڈو کی پیدائش سے بھی پہلے ہندوستان اور خصوصاً بنگال میں انگریزی شاعری کی رسم جاری ہو گئی تھی۔ علاوہ بریں اُن کی ابتدائی تعلیم کے متعلق جو کچھ مذکور ہو چکا ہے اُس کو خیال میں رکھتے ہوئے یہ حیرت کسی قدر کم ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ہندوستانی ہو کر انگریزی زبان پر ایسی قدرت کیونکر حاصل کی کہ اس میں اپنی شاعرانہ کمال کا اظہار کر سکیں۔ اُن کی انگریزی زباندانی کی پوری داد کوئی اہل زبان ہی دے سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک ایک ہندوستانی سمجھ سکتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ محاورات اور الفاظ دونوں پر اُن کو کامل تصرف حاصل ہے۔ اور اُن کے استعمال میں کوئی ایسی خامی یا نقص نہیں نظر آتا جو اُن کے اظہار کمال میں مانع ہو سکے سانگریزی شعراء کے کلام پر اُن کو پورا عبور ہے۔ اور اُس کی ملاوٹیں اُنکے اپنے کلام کی شکر ریزی میں مدد دیتی ہیں۔ شاید میرا یہ خیال غلط نہیں کہ وہ شیلے کے کلام کی خاص طور سے دلدادہ ہیں کیونکہ اُس کے کلام میں وہ نزاکت اور لطافت ہے جو بہ نسبت عام آدمیوں کے شعراء کو زیادہ اپنی جانب جذب کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ اب تک جو کچھ بیان ہوا اُس سے یہ قیاس کر لیا جائے کہ مسز نائیڈو کی شاعری انگریزی یا مغربی شاعری کا عکس ہے اور اس میں مشرقی رنگ کی کوئی آمیزش نہیں لیکن یہ قیاس صحیح نہیں کیونکہ اُنہوں نے مغربی شعراء کے ساتھ مشرقی شعراء کے مطالعہ کو بھی جاری رکھا ہے اور فارسی اور اُردو زبان کے شعراء کا کلام نہایت شوق و ذوق سے سنتی ہیں اور اپنی باریک بیں طبیعت سے اُس پر ایسی تنقید کرتی ہیں کہ بڑے بڑے شعر فہم محو حیرت ہو جاتے ہیں۔ اساتذہ اُردو میں غالب کا کلام خاص طور پر آپ کے مطبوع خاطر ہے اور عہد حاضر کے شعراء میں اقبال کے اشعار کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہیں ان دونوں شعراء کے خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مسز نائیڈو ایشیائی شاعری کے نکات سے کس درجہ واقف ہیں۔ راقم الحروف کو علم نہیں کہ سنسکرت اور ہندی شاعری سے واقفیت بہم پہنچانے کا اُن کو کہاں تک موقع ملا ہے لیکن اُن کی اپنی شاعری کے بعض پہلو ہندی شاعری سے نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ جس کی کچھ تشریح بعد میں کی جائے گی۔ فی الحال اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ مسز نائیڈو کی شاعری مغربیت اور مشرقیت دونوں کے اثرات سے مستفید ہوئی ہے متفرق نظموں کے علاوہ مسز نائیڈو نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۷ء تک تین مستقل مجموعے پانچ پانچ برس کے وقفہ سے شائع کر چکی ہیں۔ ان تینوں مجموعوں کے انگریزی ناموں کے ترجمے علی الترتیب اشاعت "طلائی آستانہ" "طائر وقت" اور "شکستہ پر" ہو سکتے ہیں، اور ایک حد تک یہ نام اُن نظموں کی نوعیت کے مظہر ہیں جو ان کتابوں میں جمع کی گئی ہیں۔ "طلائی آستانہ" میں پندرہ سے لیکر پچیس برس کی عمر تک کے کلام کا انتخاب ہے ان نظموں میں شاعرہ نے دُنیا کی دلفریبیوں کے قصر طلائی کی دہلیز پر قدم رکھا ہے اور اُسے ہر ایک شئے اُس سنہری ملمع سے چمکتی ہوئی نظر آتی ہے جو عنفوانِ شباب میں اشیاء کے تاریک رخ کو ہماری نگاہ سے پوشیدہ کر دیتا ہے ہندوستان کے کسی قدیمی شہر اور خصوصاً حیدرآباد جیسے شہر میں بیسیوں منظر ایسے ہوتے ہیں جو شاعر کے نازک دماغ کو پراگندہ کر سکتے ہیں لیکن ابھی تک ہماری شاعرہ کی نگاہ ان ناگوار نظاروں پر سے اُچٹتی ہوئی گزر جاتی ہے اور

اس کی نظر صرف انہی چیزوں پر جمتی ہے جو اپنی خوشنمائی سے اُس کے دل کو خوش کر سکتی ہیں "اور دل اس خوشی کا اظہار زبان سے ایسے نغموں میں کرتا ہے جو سامعہ کو ہندی ٹھمریوں سے زیادہ لذت بخشتے ہیں۔ مرور زمانہ کے ساتھ خیالات میں پختگی آجاتی ہے اور شاعر کی نگاہ اشیاء کی ظاہری خوشنمائی سے تجاوز کر کے اُن کی باطنی حقیقت تک پہنچنے لگتی ہے اور اُس پر یہ حال منکشف ہوتا ہے کہ دُنیا صرف سُہانے رنگوں اور سُریلی آوازوں سے مرکب نہیں بلکہ اس میں بہت سے بدنما رنگ اور کرخت سُر بھی ہیں جن کا تقابل ہمیں اپنے دلفریب خواب سے چونکا کر مجبور کرتا ہے کہ ہم اس دلق ملمع کو اُلٹ کر دیکھیں کہ اُس کا اُلٹا رخ کیسا ہے اور اس بے سُرے نغمہ کو کان لگا کر سنیں اور غور کریں کہ آیا اُس کی کوئی لے ہے؟ "طائر وقت" کی نظمیں زبان و تخیل دونوں کے لحاظ سے اس کا پتہ دیتی ہیں کہ ہماری شاعرہ کے کلام میں اب وہ پختگی پیدا ہو گئی ہے جو فطرت کے غائر مطالعہ سے اخذ کی جاتی ہے۔ "شکستہ پر" میں یہ صفت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے اس عرصہ میں شاعرہ کو بعض ایسے ناگزیر صدمات پیش آتے ہیں جن سے دُنیا میں کوئی بشر مامون نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ عمومیت کے اعتبار سے موت اور زیست سے زیادہ دُنیا میں کوئی واقعہ پیش نظر نہیں رہتا لیکن کسی عزیز یا دوست کی موت اس عام واقعہ کو ایک مکاشفہ کی صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے اور خیال کو یہ کاوش ہوتی ہے کہ اس تغیر پذیر عالم میں اپنے لئے کوئی مستقر تلاش کرے۔ یہ تلاش ہم کو حقیقت کی طرف لے جاتی ہے اور ہمیں اپنی معصومیت کے زمانے کے بہت سے خواب ترک کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن یہ نقصان انجام کار میں نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ تخیل اور عقل میں ایک قسم کا توازن قائم ہو جاتا ہے جس پر شاعری کے صحیح عروج کا مدار ہے۔ اس آخری مجموعہ کا نام ہی شاہد ہے کہ اُس کے اشعار میں اُسی درد کا اظہار ہے جسے غالب نے "شکست کی آواز" کے نام سے موسوم کیا ہے ان اشعار میں روانی و صفائی ہے مگر ایسی روانی اور صفائی جو ایک آنسو کے رخسار پر بہنے کی یاد دلاتی ہے۔ ان میں نغمہ ہے لیکن وہ نغمہ جو آہ سرد کی طرح دل کے پار ہو جاتا ہے خیالات کا ارتقا مسز نائیڈو کی شاعری کی ظاہری شکل (یعنی بندش الفاظ و ترکیب) میں بھی مناسب تغیر پیدا کرتا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ سریلا پن جس کا ذکر آچکا ہے اُن کی تمام شاعری میں قدر مشترک ہے لیکن جس طرح میں نے اُن کی اولیں نظموں کو ٹھمری سے مشابہت دی تھی اُسی استعارہ کو قائم رکھتے ہوئے۔ یہ کہنا چاہیئے کہ اُن کی آخری نظمیں خیال یا دھرپد سے مشابہ ہیں جن میں سریلا پن، رفعت اور شکوہ کے ساتھ نمودار ہو کر قلب کو مطمئن اور کانوں کو خوش کر دیتا ہے۔

ہندی راگ اور مسز نائیڈو کی شاعری کے درمیان جو تشبیہ قائم کی گئی ہے، وہ نہ صرف شاعری کی ظاہری شکل سے تعلق رکھتی ہے، بلکہ اُن جذبات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو اس کی تہ میں پوشیدہ ہیں۔ اُس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ محبت اُن جذبات میں جو شاعری کے محرک بن سکتے ہیں۔ سب سے قوی جذبہ ہے اور اگرچہ اور جذبات بھی شعر کا لباس پہن سکتے ہیں لیکن یہ لباس جیسا محبت کے جسم پر راست آتا ہے، ویسا کسی اور جذبہ پر نہیں کھلتا لیکن محبت کے ایک سے زیادہ رنگ ہیں۔ اور جو رنگ وہ ہندی شاعری (جس کے ضمن میں ہندی راگ بھی شامل ہے) میں دکھاتی ہے وہ مغربی رنگ شاعری میں شاذ مثالوں کو چھوڑ کر کہیں نظر نہیں آتا۔

مسز نائیڈو کی زبان اگرچہ انگریزی ہے لیکن اُن کا دل ہندی ہے اور اس دل میں جو جذبات ہیں وہ بھی ہندی ہیں۔ ہندی شاعری میں محبت کا اظہار ہمیشہ عورت کی جانب سے ہوتا ہے اور یہ نسوانی محبت اپنی مجازی صورتوں میں بھی اُس روحانی جذبہ سے معمور نظر آتی ہے جو اور زبانوں میں صرف مذہبی شاعری میں دکھائی دیتا ہے بلکہ ہندی شاعری میں پریم یعنی محبت بھگتی یعنی پرستش دونوں ایک دوسرے سے اس قدر پیوست پائے جاتے ہیں کہ ان دونوں جذبات میں کوئی مابہ الامتیاز قائم کرنا مشکل ہے۔ مسز نائیڈو کی شاعری میں جس محبت کی جھلک نظر آتی ہے وہ وہی محبت ہے جو بھگتی کی جانب لے جاتی ہے جس میں روحانی رفعت اور مذہبی جوش دونوں موجود ہیں جو ہمیشہ اخلاق کے دائرہ میں محصور اور مذہب کے احکام کے تابع رہتی ہے جس میں محبت کرنے والی اپنے محبوب کو ایک دیوتا اور خود کو اُس کا ادنیٰ پجاری تصور کرتی ہے جو موت کے سامنے بھی سر تسلیم خم نہیں کرتی بلکہ ستی کی چتا کے شعلوں کے ساتھ غرور سے اپنے سر کو آسمان تک بلند کرتی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جس محبت کو مسز نائیڈو کی شاعری سراہتی ہے وہ ایک معمولی ہندی عورت کی رسمی محبت ہے جو مذہب رواج ذات پات اور بیسیوں قیود سے پابند نظر آتی ہے بلکہ اُس میں وہ انفرادی قوت موجود ہے جو ضرورت کے وقت ہر قسم کی قیود اور بندشوں کو توڑ سکتی ہے۔

محبت کے علاوہ مسز نائیڈو کے اشعار میں دیگر سب اعلیٰ اور ارفع جذبات اور تحریکات سے کام لیا گیا ہے۔ حب وطن۔ شفقت مادری۔ انسانی ہمدردی غرضکہ کوئی بھی قابل قدر جذبہ ایسا نہیں جس کا اُن کی کسی نہ کسی نظم میں جلوہ نہ نظر آتا ہو۔ قدرتی مناظر سے دلبستگی شاعرانہ طبیعت کا لازمی جزو ہے لیکن مسز نائیڈو نے مناظر قدرت کو اپنی شاعری کا خاص موضوع قرار نہیں دیا۔ بلکہ ہمیشہ اس کو انسانی جذبات کی تصویر کے حاشیہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ البتہ ہر طبقہ اور ہر نوع کے انسانوں کے خیالات کی ترجمانی کرنے میں اُنہیں خاص ملکہ ہے اور اُن کی نظموں میں موذن کی اذان اور پجاری کے بھجن سے لیکر پنہاریوں کے گیت پالکی بردار کہاروں کے گانے اور فقیر کی صدا تک سب قسم کے نغمے موجود ہیں۔ اشیا کے رنگین اور نمایاں پہلو دیکھنے کا اُن کی آنکھ کو خاص ملکہ ہے اور بسا اوقات وہ چند فقروں یا چند لفظوں میں کسی واقعہ یا نظارہ کی پوری تصویر ہماری نگاہ کے سامنے کھینچ دیتی ہیں۔

ہندوستان کی عورتوں کے متعلق کبھی طنز اور کبھی حسرت کے لہجہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ اُن کی زندگی صرف تین اہم واقعات پر مشتمل ہوتی ہے یعنی پیدا ہوئیں۔ بیاہ ہوا اور مر گئیں۔ کیا یہ بات بجائے خود تعجب خیز نہیں کہ ایسے درماندہ طبقہ میں سروجنی نائیڈو جیسی مجموعۂ کمالات خاتون کیسے پیدا ہو گئی؟ اس کو ہم معجزہ خیال کریں یا فطری اسباب کا نتیجہ۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ واقعہ صرف تعجب خیز ہی نہیں بلکہ اُمید افزا بھی ہے کہ اگر ہندوستانی عورتوں کو موافق حالات میسر آئیں تو وہ کیا کچھ کر سکتی ہیں۔ یہ ضرور نہیں کہ ہر ایک خاتون مسز سروجنی نائیڈو کے مانند خوشگو شاعر یا خوش بیان مقرر یا سیاسی مدبر بننے کی سعی لاحاصل کرے۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن کی رفیع الشان مثال سے سبق لیکر وہ کارکن اور فرض شناس انسان ہو جائیں اور یہ مثال ہمارے مردوں کے لئے بھی ایسی سبق آموز ہے جیسی کہ ہماری عورتوں کے لئے۔"

اب ہم آخر میں مسز نائیڈو کی شاعری کے چند منظوم و منثور ترجمے پیش کرتے ہیں ناظرین خود ان کے مطالعہ سے اندازہ کرلیں گے کہ مسز نائیڈو کی شاعری کس قدر پُردرد اور کیف آفریں و دل نواز ہے بعض ترجموں کے ساتھ ان کی نظمیں اصل زبان میں بھی شائع کی جاتی ہیں، تاکہ جو اجزا اور حقیقی کیف ترجمہ سے باقی رہ گیا ہے وہ بھی پیش نظر ہو جائے سب سے پہلے ہم وہ معرکتہ الآرا قصیدہ نقل کرتے ہیں جو اعلیٰ حضرت نظامِ دکن خلد اللہ ملکہٗ کی شان میں مسز نائیڈو نے فرمایا ہے۔

شاہِ دکن کے حضور میں

سروجنی نائیڈو کی عقیدت کے پھول

بادشاہِ ذی وقار!

چند اشعار کا یہ ہدیۂ ناچیز گزارنے کیلئے حاضر ہوئی ہوں۔ دستِ کرم دراز کرکے انہیں شرفِ قبول اور مجھے وجہ افتخار بخشئے۔

اے وہ کہ جس کے مرصع عطائے شاہی میں ایک شاعر کے گلہائے "شہرت" آویزاں ہیں! ——— ہاں وہ عصائے پُروقار جس کے زیر حکم سلطنت کے جملہ مذاہب و اقوام ہم آہنگی و یکجہتی کے ساتھ دوش بدوش رہتے ہیں۔

خواہ وہ پیغمبر اسلام کے پیروانِ پرجوش ہوں ——— جن کے تم سرتاج و حاکم ہو۔

یا وہ جن کی منور پیشانیوں پر بیدوں کے مقدس منتروں کے نقوش ہُویدا ہیں!

اور ہاں وہ بھی جو خلیج فارس کو عبور کرکے برسوں گزرے یہاں آئے تھے اور تمہارے سایۂ عاطفت میں پناہ گزیں ہوئے تھے ——— وہ جو آفتاب کو معبود سمجھتے ہیں +

روش رہتے ہیں۔

——— آہ! وہ بھی، جو اس یسوع ناصری کی پرستش کرتے ہیں جس نے جھیلؔ گلیلی" کی امواجِ نیم شبی کو اپنے مبارک قدموں سے عبور کیا تھا!

تیرے دربار کی شوکت و صولت دیکھکر بغداد کے پُر وقار درباروں اور خلفائے عبّاسیہ کی شان و شوکت کی داستانیں یاد آنے لگتی ہیں۔

آہ! صرف ایک جشن پر" الف لیلہ" کی ہزاروں شمعیں روشن کردی جاتی ہیں اور "ساقی" نغمہ سنج گلی کوچوں میں گاتا پھرتا ہے ——— اور تیری غزلوں کے پیمانوں سے شرابِ تصوّف کے کیف پرور جرعے بھر بھر کر میکشانِ ادب کو پلاتا رہتا ہے!

پادشاہِ ذی وقار!

تیرا بارونق شہر اپنی جلو میں سرور و نشاط کی محفلیں لئے ہوئے ہے لیکن اس کے گرد سنجیدہ و کوہستانی سلسلہ ایک عالمِ سکوت میں کھڑا اس کی پاسبانی کر رہا ہے

تیری سلطنت کے دشت و بیاباں میں صدیوں کی تاریخ کے منتشر اوراق بکھرے پڑے ہیں آہ! وہ مخزنِ تاریخ ہے۔ مدفنِ تاریخ ہے!

کھنڈروں۔ غیر آباد قلعوں اور مسمار شدہ عمارتوں پر مُرغانِ امن اپنے سفید پروں کو لئے ہوئے اُڑتے رہتے ہیں ——— ہاں ان خاموش و سوگوار کھنڈروں میں تمہارے باوفا خدام جا بجا متعین ہیں ——— ہاں وہ ماضی کے پاسباں جو آجتک سلطنت کے خزانہائے زر و جواہر اور فصلوں کے سُنہری انباروں کی نگرانی میں دن رات لگے رہتے ہیں!

خدائے برتر تجھے مسرت بے پایاں عنایت کرے ——— تیرے بازو میں قوت دے کہ وہ سچ کی حمایت اور بدی کی مخالفت میں ہمیشہ شمشیرِ بے نیام لئے مستعد رہیں ——— خدا کرے تو محاسن و مکارم اور شجاعت و قدر شناسی کے اوصافِ حمیدہ کی عزت افزائی کے لئے ہمیشہ زندہ رہے۔

ایمان کی سلامتی اور شعریت کی بقا کے لئے ہر وقت کوشاں رہو!!

خدا کرے کہ تیرے بارونق عہد کی جلوہ پاشیاں" نغماتِ اعمال" کو منور کردیں جو کبھی فردوسی نے گائے تھے! ——— قومی دعا میں تیرا نام روشن ہوا ——— پرچمِ ملّی پر بھی تیرا ہی نشان جلوہ فگن ہو! ——— ہر فردِ سلطنت کی زبان پر تیرے ہی گیت ہوں!!!

عندلیبِ شکستہ پر

شبِ طویلِ غم گئی — مسرّتوں کی لَو ہوئی
اُفق چمک اُٹھی ہے اور — نمودِ صبحِ نو ہوئی
رگوں میں خون پھر گیا — حیات گرم رَو ہوئی۔ نمودِ صبحِ نو ہوئی
نمودِ صبحِ نو ہوئی — اُمید جلوہ گر ہوئی
مسرتوں کے گل کھلے — نسیم با ثمر ہوئی
بہار آگئی ہے پھر — خوشی پیام بر ہوئی۔ امید جلوہ گر ہوئی
اُمید جلوہ گر ہوئی — نئی زمین نیا وطن
مگر شکستہ پر ہے تو — اے عندلیبِ نغمہ زن
اے عندلیبِ نغمہ زن — عروس بن گیا چمن۔ مگر شکستہ پر ہے تو

THE BROKEN WING

QUESTION

The great dawn breaks, the mournful night is past
From her deep age-long sleep she wakes at last!
Sweet and long-slumbering buds of gladness ope
Fresh lips to the returning winds of hope
Our eager hearts renew their radiant flight
Towards the glory of renascent light
Life and our land await their destined spring
Song-bird why dost thou bear a broken wing?

ANSWER.

Shall spring that wakes mine ancient land again
Call to my wild and suffering heart in vain?
Or Fate's blind arrows still the pulsing note
Of my far-reaching, frail unconquered throat?
Or a weak bleeding pinion daunt or tire
My flight to the high realms of my desire?
Behold! I rise to meet the destined spring
And scale the stars upon my broken wing!

ECSTASY.

Heart, O my heart! lo, the springtime is waking
In meadow and grove.
Lo, the mellifluous **Koels** are making
Their paeans of love.
Behold the bright rivers and rills in their glancing,
Melodious flight,
Behold how the sumptuous peacocks are dancing
In rhythmic delight.

جواب

وہ روز و شب بدل گئے
خزاں کے دن نکل گئے
خوشی کا دور آگیا
زمانہ اور آگیا
تو پھر میں بے بصر ہوں کیا   شکستہ اس قدر ہوں کیا!
کہ نغمہ زن نہ ہو سکوں   کہ جان و دل نہ کھو سکوں
خوشی سے خوں نہ رو سکوں
جگر میں پھانس ہے تو کیا   بہار جلوہ گر۔ تو ہے!
میں نامرادِ غم سہی   امید بارور تو ہے!
شکستہ ہے تو کیا ہوا   اُڑیگا یہ کہ پر تو ہے!
یہی شکستہ پر مرا سوئے بہار لے چلا
لو دیکھنا یہی مجھے فلک کے پار لے چلا

کیفِ بہار

بہار اے دل! آگئی چمن میں سبزہ زار میں
یہ کوئلوں کی بولیاں!
یہ زمزموں کی مستیاں!
یہ عشق کی کہانیاں، چڑھاؤ اور اُتار میں   بہار اے دل! آگئی چمن میں سبزہ زار میں
کنار جو کی مستیاں میں کس طرح کروں بیاں؟
وہ مور ناچنے لگے!
وہ مستِ نغمہ ہوگئے!
یہ نہر کی روانیاں روانیوں میں شوخیاں   کنار جو کی مستیاں میں کس طرح کروں بیاں؟
پھر اے دلِ حزیں! نہ کیوں غم اپنا ہم بھی بھول جائیں
جہاں تمام مست ہے

Shall we in the midst of life's exquisite chorus
Remember our grief,
O heart, when the rapturous season is o'er us
Of blossom and leaf?
Then joy from the birds and the streams let us borrow
O heart! let us sing
The years are before us for weeping and sorrow
To day it is spring!

پیے ہوئے خوشی کی مے
پھر اب بھی کیوں ہمیں یہ غم یہ رنج یہ ستم اٹھائیں — اب آ کہ اے دل حزیں! غم اپنا ہم بھی بھول جائیں
یہ زمزمہ طیور کا یہ نغمے جوئبار کے
چل، اور مستعار لائیں!
اٹھ، اور آج ہم بھی گائیں!
ذرا سنبھل، دل حزیں! کہ ہیں یہ دن بہار کے — کہ عمر ابھی پڑی ہے غم کی یاد کے لئے

حامد

LEILI.

The serpents are asleep among the poppies
The fireflies light the soundless panther's way
To tangled paths where shy gazelles are straying
And parrot plumes outshine the dying day
O soft! the lotus buds upon the stream
Are stirring like sweet maidens when they dream

A caste mark on the azure brows of Heaven
The golden moon burns sacred, solemn, bright
The winds are dancing in the forest temple
And swooning at the holy feet of Night
Hush! in the silence mystic voices sing
And make the gods their incense offering.

کنول

خفتہ جہاں ہیں مار سرِ شاخ کو کنار — آہستہ رو پلنگ کے رستہ میں بار بار
ہیں شعلہ بار کرمکِ شب تاب اس قدر — روشن ہیں دور دور کی راہیں وہ پیچدار
بھٹکے ہوئے جہاں ہیں وحوش رمیدہ خو — اور ہیں سبک خرام غزالانِ شرمسار
دن ڈوبتا ہے گو، یہ عیاں ہے، چمک فزا — ہیں تابناک طوطیوں کی کلغیاں ہزار
سننا ذرا!! کنول ہیں یہ بالائے سطح آب
جنبش میں جیسے ہو کوئی طنّاز محوِ خواب
قشقہ لگائے ماتھے پہ ہے چرخ نیلوفر! — یعنی بہ شان و شوکت و تمکین و کرّ و فر
جلوہ فگن ادھر مہ زرّیں نقاب ہے — اور خوفناک معبد صحرائی ہیں ادھر
رقصاں جو بادِ تند بھی اب ہو کے نیم جان — غش کھا گئے "شب" کے قدموں پہ رکھتی ہے اپنا سر
پُر رمز، کچھ سکوت میں آوازیں گاتی ہیں
خاموش!! دیوتاؤں پہ نذریں چڑھاتی ہیں

احسن

GOLDEN CASSIA

O Brilliant blossoms that strew my way
You are only woodland flowers they say
But I sometimes think that perchance you are
Fragrants of some new fallen star
Or golden lamps for a fairy shrine
Or golden pitchers for fairy wine

املتاس کا پھول

اے املتاس تجھے کیوں گُلِ صحرا کہئے — صورتِ سبزہ ہے پامال مگر کیا کہئے
کوئی ٹوٹا ہوا تارا ہے تو اُفتادۂ خاک — یا تجھے طالع خوابیدہ ہمارا کہئے
جام زرّیں مئے ہوش رُبا ہے گویا — یا تجھے شمع تہِ دامنِ صحرا کہئے
ساقِ سیمینِ پری کی ہے سنہری پازیب — موسمِ گل کا تجھے نقشِ کفِ پا کہئے

Perchance you are O frail and sweet!
Bright anklet-bells from the wild spring's feet,
Or the gleaming tears some fair bride shed
Remembering her lost maidenhead
But now in the memoried dusk you seem
The glimmering ghosts of a by-gone dream

•

SUTTEE.

Lamp of my life the lips of Death
Hath blown thee out with their sudden breath
Naught shall revive thy vanished spark
Love must I dwell in the living dark?

Tree of my life Death's cruel foot
Hath crushed thee down to thy hidden root
Nought shall restore thy glory fled
Shall the blossom live when the tree is dead?

Life of my life Death's bitter sword
Hath severed us like a broken word
Rent us in twain who are but one
Shall the flesh survive when the soul is gone?

•-•-•

THE HUSSAIN SAAGAR.

The youngdawn woos thee with his amorousgrace,
The journeying clouds of sunset pause and hover
Drinking the beauty of thy luminous face
But none thine inmost glory may discover
For thine evasive silver doth enclose
What secret purple and what subtle rose
Responsive only to the wind thy lover
Only for him thy shining waves unfold
Translucent music answering his control
Thou dost, like me to one allegiance hold,
O lake, O living image of my soul

سرِ بزانو ہے دلہن محوِ خیالِ طفلی — ڈبڈبائے ہوئے اشکِ ستم آرا کہیئے
شامِ غربت ہیں کوئی خوابِ پریشاں ہے تو — یا تجھے غولِ فریبندۂ صحرا کہیئے

رونمائے پرطاؤس ہے تیرا جلوہ — دیدۂ آہوئے رم دیدہ کا نقشا کہیئے
زرد شکلِ رُخِ مجنوں ہے بیاباں ہیں تو — گرد آلودہ خمِ طرۂ لیلا کہیئے
مثلِ داغِ جگرِ عاشقِ محزوں ہی تو — تجھ کو مغزِ سرِ آمادۂ سودا کہیئے

ستی

اے شمعِ زندگانی! آخر لبِ اجل نے — یک بار جل بجھی تو اسطرح تجھ کو پھونکا
ممکن نہیں کہ روشن پھر ہو شرار تیرا — اس تیرہ خاکداں میں کیونکر گزر ہو میرا
اے نخلِ زندگانی! پائے قضا نے تجھکو — افسوس بیخ و بن سے پامال کرکے چھوڑا
ممکن نہیں کہ پھر تو سرسبز بارور ہو — جو نخل سوکھ جائے دشوار ہے کہ تر ہو
اے وجہِ زندگانی! تلخیٔ مرگ نے یوں — ہم کو کیا دوبارہ جوں نسخہ ہو شکستہ
فی الاصل ایک تھے ہم جب ہو چکی جدائی — بیجان ہو کے قالب باقی نہیں رہیگا

شباب

تالاب حسین ساگر

بہار وقتِ سحر تیری سادگی پہ نثار — غضب کا روپ ہے تجھ پر بلا کا تیرا نکھار
فدائے ناز و ادا مہرِ عالم آرا ہے — فلک پہ ابرِ بہاری کا بھی تو پیارا ہے
گھٹائیں چرخ پہ کیا جھوم جھوم آتی ہیں — ترے جمال سے سیراب ہو کے جاتی ہیں
جھلک ہے صرف ترے یہ نقابِ سیمیں کی — خبر کسے ہے ترے جلوہ ہائے رنگیں کی
کھلا ہوا گل و ریحاں کا ایک گلشن ہے — بھرا ہوا دُرِ و مرجاں سے تیرا دامن ہے
غرض تجھے تو ہے بادِ نسیم سے اُلفت — اُسی کے واسطے سب وقف ہے تری دولت
طریقِ بندگیٔ عشق تجھ کو زیبا ہے — چلن وفا کا مرے دل نے تجھ سے سیکھا ہے
ستم نسیم کے گو بار بار سہتا ہے — اُسی کے نشۂ الفت میں چور رہتا ہے
ہوائے تازہ کا ہر دم تو ایسا مفتوں ہے — ہر ایک لہر میں آوازِ نَے کا افسوں ہے

اشاروں پہ جو ہوا کے ہمیشہ چلتا ہے — سرودِ عشق ہر اک موج سے نکلتا ہے
زباں پہ دیکھ کے تجکو یہ مصرعہ تر ہے
حیاتِ تازہ کی صورت حسین ساگر ہے

نصیر

تقدیر

نارسائی سے تری بخت سیہ کیا ہوگا — مجھکو تجھ سے نہ کبھی شکوۂ بیجا ہوگا
میں نہ ہونگا کبھی امداد کا خواہاں تجھ سے — تیرا اے بخت نہ احسان گوارا ہوگا
بن گیا ہے تو مری جان کا دشمن لیکن — سر جدا ہو، نہ جدا سر سے یہ سودا ہوگا

ٹوٹ بھی جائیں اگر میری امیدوں کے طلسم — کم نہ ہرگز یہ مرا ذوق تماشا ہوگا
مٹ گئے پیش نظر تھے جو مرقعے دلکش — تیرے بس میں مگر دیدۂ بینا ہوگا
مل گئی خاک میں گو سلطنتِ وہم و خیال — اس خرابے میں گراں مایہ خزانا ہوگا

کر دے بیگانہ مجھے نغمۂ شادی سے مگر — یادِ ایّام کا دلچسپ فسانا ہوگا
زمزمے آکے سنائے گی نسیم اشراق — طبعِ موّاج میں اک شور سا پیدا ہوگا
راگ موجوں کا سنوں گا صفتِ تارِ رباب — پیچ میں حلقۂ گرداب ترانا ہوگا

لاکھ تو لذتِ گفتار سے کر دے محروم — لب پہ لیکن نہ کبھی حرفِ تمنا ہوگا
گنگ ہو جائے اگر میری زبانِ گویا — دلِ نالاں صفتِ بلبلِ شیدا ہوگا
باغ میں نغمۂ پُرشور عنادل ہوں ہزار — نالۂ دل کا مگر رنگ نرالا ہوگا

گو تپِ غم سے نہ ہو طاقتِ رفتار مجھے — فکرِ رنگیں سے زمانہ تہ و بالا ہوگا
بڑھ کے ہے بادِ صبا سے یہ مرا توسنِ فکر — گرم جولاں روشِ آہوئے صحرا ہوگا
آسماں رس فرسِ فکرِ رسا ہے میرا — خاک سے اُڑ کے رواں تا بہ ثریا ہوگا

A CHALLENGE TO FATE.

Why will you vex me with your futile conflict
Why will you strive with me, O Foolish Fate?
You cannot break me with your poignant envy
You cannot slay me with your subtle hate
For all the cruel folly you pursue
I will not cry with suppliant hands to you

You may perchance wreck in your bitter malice
The radiant empire of mine eager eyes
Say, can you rob my memory's dear dominion
O'er sunlit mountains and sidereal skies?
In my enduring treasuries I hold
Their ageless splendour of unravished gold

You may usurp the kingdoms of mp hearing
Say, shall my scatheless spirit cease to hear
The bridle rapture of the blowing valleys
The lyric pageant of the passing year
The sounding odes and surging harmonies
Of battling tempests and unconquered seas?

Yea, you may smite my mouth to throbbing silence
Pluck from my lips power of articulate words
Say, shall my heart lack its familiar language
While earth has nests for her mellifluous birds?
Shall my impassioned heart forget to sing
With the ten thousand voices of the spring?

Yea, you may quell my blood with sudden anguish
Fetter my limbs with some compelling pain
How will you daunt my free far-journeying fancy
That rides upon the pinions of the rain?
How will you tether my triumphant mind,
Rival and fearless comrade of the wind?

آرزوئے دل ناکام ہے خود مثلِ حباب ٹوٹ کر قطرہ مگر شاملِ دریا ہوگا
نقش برآب سے ساری ہوس نام و نمود فکر کیا میرا مخالف جو ستارا ہوگا
قطرۂ غم کو ڈبو دوں میں نہ لطفِ عمیم نذرِ تسلیم ہمیشہ دلِ دانا ہوگا

گنہگارِ محبّت

سفیر

اے مہ حسن و جمال اے بتِ خورشید عذار سیکڑوں آہوئے صحرا تری آنکھوں پہ نثار
جس طرح طائر بے خوف اُڑا کرتے ہیں اُڑکے کر لیتے ہیں افلاک معلّیٰ کا حصار
کی ہو میں نے نگۂ چشم محبت تم پر دردِ دل کا اگر اشکوں نے کیا ہو اظہار
جز نظارۂ رفوئے دلِ صد چاک نہ تھا شوقِ دیدار نے آنکھوں کو کیا تھا لاچار
میں نے مانا کہ گنہگارِ نظر بازی ہوں کیا کروں اس کو کہ مجبور تھے یہ دیدۂ زار
بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں اِن کو
کون کرتا ہے محبّت کو خطاؤں میں شمار

دستِ حسرت نے اگر کی ہو کوئی گستاخی ہو کے بیتاب بنے ہوں جو گلے کا ترے ہار
بادۂ شوقِ محبت میں اگر ہو کر مست ہو گئے ہوں یہ کبھی مائلِ آغوش و کنار
اپنے آغوشِ محبت میں تمہیں لے لیکر ہو کے بیتاب نکالے ہوں گر ارمان دو چار
صورتِ نف یہ پہنچے ہوں اگر تابہ کمر ہو کے قربان چھوئے ہوں جو تمہارے رخسار
نذر کرنے کے لئے لائے ہوں تحفے یہ اگر ریگ کی طرح کہ ممکن ہی نہیں جنکا شمار
بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں اِن کو
کون کرتا ہے محبّت کو خطاؤں میں شمار

لبِ عشاق نے کھینچی ہو اگر آہ کوئی ہو کے سرگرمِ فغاں دل کا نکالا ہو بخار
ہو کے مجبور اگر عرضِ تمنّا کی ہو لبِ نازک سے جو بوسوں کا لیا ہو اقرار
ضبط الفت سے جو فرقت میں رہے ہو خاموش رخِ زیبا کی ثنا میں جو پڑھے ہوں اشعار
الغرض جوشِ محبت میں اگر مست ہو کر لے لئے ہوں لبِ نازک کے جو بوسے دو چار
ہو کے بیدرد نکالی ہو تمنا دل کی لبِ جاں بخش کو پہنچا ہو اگر کچھ آزار
بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں اِن کو

THE SINS OF LOVE.

Forgive me the sins of mine eyes,
O Love, if they dared for a space
Invade the dear shrine of your face
With eager, insistent delight,
Like wild birds intrepid of flight
That raid the high sanctuaried skies
O pardon the sin of mine eyes!

Forgive me the sin of my hands
Perchance they were bold overmuch
In their tremulous longing to touch
Your beautiful flesh, to caress,
To clasp you, O Love, and to bless
With gifts as uncounted as sands
O pardon the sin of my hands!

Forgive me the sin of my mouth.
O Love, if it wrought you a wrong,
With importunate silence or song
Assailed you, encircled, oppress'd,
And ravished your lips and your breast
To comfort its anguish of drouth
O pardon the sin of my mouth!

کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار

قصۂ دردو الم تم کو سنایا ہو اگر — آہیں بھر بھر کے نکالا ہو اگر دل کا غبار
ہو کے پامالِ جفا، ہجر میں تڑپا ہو اگر — بیقراری میں رہا ہو نہ اگر صبر و قرار
نام اغیار کا لے لے کے شکایت کی ہو — نالہ بن بن کے سنائی ہو اگر حالتِ زار
داغہائے دلِ پُر درد کی تسکیں کیلئے — بن کے مظلوم ہوا ہو جو ترا شکوہ گزار
ہو کے بے صبر تقاضائے محبت سے اگر — حسرت و یاس و تمنا کا کیا ہو اظہار

بخشدو تم جو سمجھتے ہو خطائیں ان کو
کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار

وفا

Forgive me the sin of my heart,
If it trespassed against you and strove
To lure or to conquer your love
Its passionate love to appease
To solace its hunger and ease
The wound of its sorrow or smart
O pardon the sin of my heart!

سروجنی دیوی کی ملکی و قومی خدمات

یہ خیال غلط اور غیر مدبرانہ ہے کہ حقیقی شاعری قومی و ملکی خدمات میں شامل نہیں ہے مسز نائیڈو سب سے پہلے شاعر ہیں اور انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندوستان کی عظمت و بزرگی کا سکہ سارے جہان کے دلوں پر بٹھایا ہے آج دنیا کے ہر مہذب ملک میں مسز نائیڈو کی مستقل عزت و شہرت ہندوستان کے لئے طرۂ امتیاز کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن ان کی ادبی خدمات کے علاوہ ان کی سیاسی خدمات بھی کسی طرح کم نہیں ہیں۔ جنگ عظیم کے زمانے ہی سے سروجنی دیوی نے ملکی سیاست میں آزادانہ شرکت کر لی تھی اور ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کانگریس میں حکومتِ خود اختیاری کی تائید نہایت پرجوش اور زور دار الفاظ میں کی اسکے بعد تمام ملک میں دورہ کر کے اپنے کمالِ نطق نے محفلِ سیاست کو گرما دیا، ۱۹۱۷ء میں افریقی ہندوستانیوں کے متعلق الہ آباد میں جو تقریر سروجنی دیوی نے کی وہ بے حد متاثر کن تھی ۱۹۱۷ء کے آخر میں کلکتہ کانگریس میں بھی سروجنی دیوی نے حکومت خود مختاری کے رزولیوشن کی تائید کی ۱۹۱۸ء میں کانجیورم میں صوبہ کانفرنس کے صدارت کے فرائض آپ نے انجام دیئے۔ ستمبر ۱۹۱۸ء میں بمبئی کی اسپیشل کانگریس میں عورتوں کی رائے دہی کے حقوق کا رزولیوشن دوبارہ پیش کیا۔ اور دسمبر ۱۹۱۸ء میں آل انڈیا سوشل سروس کانفرنس کی صدارت کے فرائض آپ نے انجام دیئے۔

تحریکِ ترکِ موالات کے شروع ہوتے ہی مسز نائیڈو کی سیاسی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں، اور آپ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں ہمہ تن محو ہو گئیں،

۱۹۲۲ء میں لکھنؤ کانفرنس میں آپ نے اردو میں تقریر فرمائی ۱۹۲۴ء میں آپ جنوبی افریقہ تشریف لے گئیں اور مکمل دورے کے بعد ہندوستانیوں کی حالت کا اندازہ کیا۔ آپ نے کوکناڈا کانگریس کی صدارت بھی فرمائی۔

جب امریکہ کی بدشہرت خاتون مس میو نے اپنی کتاب مدر انڈیا شائع کی جس میں ہندوستان کے اخلاق تہذیب سیاست تمدن اور مذہب کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو ہندوستانیوں نے آپ کو اپنا سفیر بنا کر امریکہ بھیجا تاکہ آپ اس بے بنیاد اور لغو پروپیگنڈہ کی تخلیف کریں۔

۱۹۳۰ء میں تحریک نمک کے سلسلے میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد آپ بھی گرفتار ہو گئیں اور "بغاوتِ چمن" کے سلسلے میں اس عندلیب نغمہ پیرا نے چھ ماہ "زندان و قفس" کے مصائب برداشت کئے۔ رہائی کے بعد پھر بلبلِ ہند نے اپنی ذات کو قوم کی راہ میں ستیہ آگرہ کے لئے پیش کیا۔ گاندھی اروِن پیکٹ کے وقت مہاتما گاندھی کے ساتھ شریکِ مشورہ رہیں۔

۲۹ اگست کو دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے سلسلے میں مہاتما جی کے ہمراہ انگلستان گئیں جہاں آپ کا شاندار استقبال کیا گیا۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپسی کے بعد آپ بھی دوبارہ زعمائے قوم کے ساتھ گرفتار ہو گئیں مگر زندان میں بھی بخوشی و عافیت زندگی گزاری ——— یہ بلبل جہاں تھی وہیں گلستاں تھا۔ ۱۹۳۳ء میں جیل سے آپ بھی رہا کر دی گئیں۔ مہاتما گاندھی کے تاریخی برت کے موقع پر آپ نے تیمارداری کر کے اخلاص انسانیت اور ہمدردی کا ثبوت دیا۔ گاندھی جی حیدرآباد میں آپ کے دولتکدہ کے علاوہ کہیں قیام نہیں فرماتے

اخلاقی طور پر سروجنی قومی غیرت سیاسی استقلال و ایمان حب الوطنی، ہندو مسلم اتحاد نیک نیتی، اخلاص، محبت، شرافت، بلندی، اور انسانیتِ کبریٰ کی بہت عظیم مظہر ہیں۔ اور اس کی نظیر ہندوستان کی کسی قوم نے آجتک پیش نہیں کی۔

قومی و سیاسی طور پر سروجنی کی بڑائی اور اہمیت کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ وہ قومی پارلیمنٹ (آل انڈیا نیشنل کانگریس ورکنگ کمیٹی) کی رکن ہیں۔

تاریخِ علم ہیئت و تنجیم پر ایک نظر

پہلی قسط

تاریخ کی ورق گردانی اور سفر ناموں کے مشاہدہ سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اہل چین علم ہیئت سے ۲۸۵۷ سال قبل مسیح واقف ہوچکے تھے، فوہی (Fo-Hi) جس کا عہد حکومت ۲۸۵۷ قبل مسیح ہے، ماہرین فلکیات کا قدر شناس تھا، اس نے علم ہیئت کی ترقی و احیا دہی میں کافی دلچسپی سے کام لیا، اس زمانہ میں ہیئت کے ابتدائی اصولوں سے کام لیا جاتا تھا، دوسرے فرمانروا ہونگ ٹی (Hong ti) نے جس کا زمانہ ۲۶۰۸ قبل مسیح ہے، ایک رصد گاہ چین میں بنوائی، اہل چین اہل یونان سے ۲۰۰۰ سال قبل علم ہیئت سے واقف ہو چکے تھے[1]

ہندوستان میں علم ہیئت و تنجیم کی قدامت کا پتہ زمانۂ وید سے چلتا ہے، اور یہ وید کا ایک جزسمجھا جاتا تھا، تمام جوتش شاستر میں شمس و قمر کی رفتار کا بیان موجود ہے۔ اتھرو وید جوتش کا زمانہ جیسا کہ مسٹر ڈکیسٹ اور اس کے دیگر ہمنوا و معاصرین بیان کرتے ہیں ۹۰۰ سے ۱۵۰۰ سال قبل مسیح ہے اس میں کوئی بیان بروج کے متعلق نہیں کیا گیا ہے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اہل ہند بروج سے ناواقف تھے، یہ سچ ہے کہ اُس وقت تک دوازدہ بروج کی تقسیم سے اہل ہند ناآشنا تھے، لیکن منازل قمر اور اُس کے اثرات سے ضرور واقف تھے

پانچویں و چھٹی صدی میں آریہ بھٹ۔ ورمہر۔ برہم گپت۔ بھاسکر آچاریہ وغیرہ مشہور ہیئت داں گزرے ہیں۔ ان کی تصانیف چھٹی صدی بعد مسیح کی ہیں، ورمہر کی تصانیف کے علاوہ کسی اور مصنف کی لکھی ہوئی کتاب میں علم تنجیم پر بحث نہیں ملتی، ورمہر ہی ایک ایسا مصنف ہے جس نے جا بجا اپنی تصانیف میں علم نجوم پر بحث کی ہے

وید سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اہل ہند ہزارہا سال قبل مسیح نیرین کی رفتار سے واقف تھے اور اس کا علم ہونا ان کے لئے یوں ضروری ہوگیا کہ سالانہ قربانیوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے نظام اوقات کی تعین میں مدد ملتی رہے، اسی باعث وہ نیرین کی رفتار کو بغور ملاحظہ کرتے رہے، صرف نیرین تک اُن کی نگاہیں محدود نہ تھیں بلکہ مریخ مشتری و زحل وغیرہ کی رفتار سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔

علم تنجیم ورمہر کے زمانہ سے اپنے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اوج ترقی پر پہنچ گیا ورمہر ہندوستانی ہیئت دانوں کے دور آخر میں سب سے نامور مصنف گزرا ہے، اور وہ اکثر اپنی تصانیف میں پچھلے مصنفین کے حوالے دیتا ہے مثلاً گرگ وغیرہ جو بہت قدیم علم نجوم و ہیئت کے ماہر گزرے ہیں۔

سکندر اعظم نے چوتھی صدی قبل مسیح جب ہندوستان فتح کیا تھا وہ تاریخ یونان میں علم و تمدن کا بہتر زمانہ سمجھا جاتا تھا، یونان کے ماہرین علوم سالہا سال تک ہندوستان میں رہے اور زبان کی اجنبیت و بیگانگی نے دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے علوم و فنون سے کچھ عرصہ تک متمتع ہونے سے محروم رکھا، چھٹی صدی بعد مسیح ورمہر کے زمانہ میں جب زبان کی اجنبیت دور ہونے لگی اور ایک نے دوسرے کے علم و فن سے استفادہ حاصل کیا، تو یونانی مصطلحات علمیہ ہندوستانی زبان میں اور ہندوستان کے یونانی زبان میں استعمال ہونے لگیں، ورمہر و نیز دیگر ہندوستانی مصنفین ہیئت کی تصانیف سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ انہوں نے بہت سے یونانی مصطلحات علم ہیئت و نجوم اپنی تصانیف میں بلا کسی تعصب استعمال کئے ہیں۔

مسٹر ویش نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بارہ بروج کی تقسیم اور منازل قمر کے اشکال اہل ہند نے یونانیوں سے لئے ہیں، ورمہر اپنی تصنیف رتن مالا میں بارہ بروج کی تقسیم "یاونا" (yavana) (ممکن ہے "اعوان" کی بگڑی ہوئی شکل ہو) ایک ملیچھ[2] مسلمان کے حوالہ سے بتاتا ہے، حالانکہ اس زمانہ میں کسی مسلمان کا ہندوستان آنا ثابت نہیں، اور چھٹی صدی بعد مسیح اسلام کا آغاز ہوتا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مسلمان کون تھا۔

مسٹر ویش[3] نے یونانی و ہندوستانی بروج کے نام جو ملتے جلتے ہیں اُن کی ایک فہرست مرتب کی ہے اس میں سے چند بطور مثال یہاں بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

---

[1] دیکھو ہسٹری آف ماسٹرونومیکل کانفرنیس۔ کیلاڈی صفحہ ۱۹۵۔ [2] دیکھو برہت جاتک انگلش ایڈیشن از سورج نرائن بی اے ایڈیٹر اسٹرولوجیکل میگزین۔ [3] دیکھو سالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی مطبوعہ ۱۸۹۳ء ترجمہ بزبین

یونانی نام بروج	عربی نام	ہندوستانی نام بروج
کری اوس (Krios)	حمل	کریا (Kirya)
لیؤن (Leon)	اسد	لیا (Leya)
پارتھی نوس (Parthenos)	سنبلہ	پارٹینا (Partina)

مسٹر ولیش لکھتے ہیں کہ یہی مصطلحات ورہمہر کی تصانیف علم ہیئت و نجوم میں بھی استعمال کئے گئے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ یونانیوں سے لئے گئے ہیں یہی الفاظ یونانیوں کے ہاں بھی چوتھی صدی میں مستعمل تھے اور ہندوستان میں چوتھی یا پانچویں صدی بعد مسیح ان الفاظ و مصطلحات کا رواج ہوا اور اسی زمانے سے سیارگان کی رفتار کے بابت تاریخی ثبوت ملتا ہے' اور یہ کہ کتنے عرصہ کے بعد اہل ہند نے زائچہ بنانا شروع کیا۔ اس کے بارہ میں کوئی صحیح تاریخی ثبوت کا پتہ نہیں چلتا' ایک دکھنی شاعر اپنی ایک نظم میں جو تامل (Tamil) زبان میں ہے بیان کرتا ہے کہ مدُورا کے نزدیک دریائے "ویگی" میں طغیانی آئی اور صبح آفتاب کے طلوع سے قبل خسوف واقع ہوا' اس وقت مریخ برج حمل میں' عطارد جوزا میں' اور زحل برج قوس و جدی کے مابین تھا' ریاضیات فلکیات سے یہ زمانہ ۴۲۳ بعد مسیح یوم جمعہ' علی الصباح واقع ہوتا ہے' اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دکھن میں اہل ہنود ۱۵۰ سال قبل مسیح زائچہ بنانا جانتے تھے نہ کہ یونانیوں سے زائچہ بنانا سیکھا یہ صحیح مگر یہ ایک شاعرانہ تخیل سے زائد وقعت نہیں رکھتا' کوئی تاریخی ثبوت نہیں' ویدانگ جوتش کی روسے یہ بات مشہور ہے اور یہ بہت ہی قدیم زمانہ ہے جبکہ اہل ہند سیارگان کی رفتار کا مشاہدہ کیا کرتے تھے اور ان کی رفتار سے اچھی طرح واقف ہوگئے تھے شمس و قمر کی رفتار' ریاضی کے اصول سے نکالنا جانتے تھے سال' ماہ' تھتی' منازل قمر وغیرہ کے معلوم کرنے میں وہ کسی دوسری قوم کے رہین منت نہیں بلکہ دو ہزار سال قبل واقف ہو چکے تھے

(باقی صفحہ ٦٠ پر ملاحظہ کیجئے)

تبسُّم

سنجیدگی نے اُن کی لُوٹا مرا تبسُّم	گہرائیوں سے دل کی اُبھرا ہوا تبسُّم
وہ میری التجا سے پھیری ہوئی نگاہیں	وہ نازکی لب سے چھلکا ہوا تبسُّم
اس حُسن کی ادا کو کیا فتحِ عشق سمجھوں	گھٹتی ہوئی نگاہیں بڑھتا ہوا تبسُّم
جس طرح رفتہ رفتہ مہر سحر کی تابش	یوں اُن پہ ہلکے ہلکے چھاتا گیا تبسُّم
پہلے تو مسکرائے بے اختیار مجھ پر	چہرے کا رنگ بنکر پھر اُڑ گیا تبسُّم
محفل میں سب کے دعوے تصدیق ہو رہے ہیں	اُڑتی ہوئی نگاہیں چلتا ہوا تبسُّم
رنگِ شفق میں جیسے ڈوبا ہوا ہو دریا	وہ اُن پہ سر سے پا تک چھایا ہوا تبسُّم
وہ ان کا عزمِ محفل وحدت میں شوقِ کثرت	آئینے کے مقابل جھجکا ہوا تبسُّم

افسردگی میں دل کی ڈوبا ہوا ہوں میکش
ورنہ خیال میں ہے بے انتہا تبسُّم

محمد علی شاہ میکش اکبرآبادی

مسٹر کوڈیل (Maunder ?) نے اُن پختہ اینٹوں کا بغور معائنہ کیا جنہیں کلدانی ۱۰۶۳ سے ۷۶۲ قبل مسیح، کسوف و خسوف کی تاریخ لکھنے کے کام میں لایا کرتے تھے اور ان اینٹوں سے قمر کے خطوط طول البلد کی کمی و زیادتی کی جداول کی تصحیح و دیگر مفید معلومات میں بہت کچھ مدد ملی، کلدانیوں سے رومیوں اور یونانیوں نے علم فلکیات سیکھا، اہل یونان نے مصریوں سے بھی استفادہ حاصل کیا،

کلدانیہ۔ اسیریہ۔ بابل ہیئت و نجوم کے گہوارے رہ چکے ہیں۔ جہاں سن عیسوی سے بہت قبل سیارگان کا مشاہدہ کیا جاتا تھا اور علوم سیارگان سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے، بابل میں ۵۳۹ سال قبل مسیح دوازدہ بروج میں کسوف و خسوف کی تقسیم کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا۔ اور اہل بابل کا مبلغ علم صرف سیارگان کے مشاہدہ اور اُنکے اثرات تک محدود رہا

یونان کا علم ہیئت و نجوم ہندوستان میں پانچویں چھٹی صدی بعد ولادت مسیح آیا۔ یونانیوں اور مسلمانوں کے حملہ کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، یہ قومیں اہل ہند سے باہم مل جل کر رہنے لگیں اور تبادلہ خیال کا موقعہ ملا تو ایک دوسرے کے تخیلات و مصطلحات علمیہ سے واقف ہو گئے اور یہی سبب ہے کہ اہل ہند کی تصانیف میں دوسری قوموں کے بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ موجودہ علم نجوم خالص ہندوستانی نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں کلدانی۔ مصری و یونانی کا بہت کچھ عنصر شامل ہو جانے سے مختلف اقوام کے تخیلات کا ایک مجموعہ بن گیا۔ جو آجکل مروج ہے [4]

عربوں نے یونانیوں کے علم فلکیات اپنی زبان میں منتقل کر کے اس کو ترقی دی، ہندوستانیوں اور سریانیوں سے بھی بہت کچھ سیکھا اور ان کے تصانیف کے تراجم کر کے اُن کی تصحیح کی اور اس کو ترقی پر پہنچایا مسلمانوں کے فلکیات کے متعلق کارنامے مشہور ہیں، بطلیموس جدولین کو نہایت کاوش فکر و جانفشانی سے باریک کیا، نہ صرف یہی بلکہ چاند کی خرابیوں کا بھی پتہ چلایا، عربوں نے خط نصف النہار کے ذریعہ طول درجہ کا قانون بنایا بہت سی رسدگاہیں قائم کیں اور حرکات قمر کے لئے بہت سی جدولیں بنائیں یہاں تک کہ عرب یونانیوں سے علم فلکیات میں سبقت لے گئے۔ یونانیوں کی نگاہیں صرف نظریات تک محدود رہیں اور عربوں نے عملی طور پر حصہ لیا۔

پنچانگ (جنتری) میں سب سے بڑا نقص یہ پایا جاتا ہے کہ ایک ہی جوتشی اور تاریخ ہے وہ دوسرے پنڈت کی طیار کردہ پنچانگ سے منطبق نہیں ہوتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبی رسومات تمام شہروں میں ایک دن اور تاریخ کو منائے جانے سے سخت دشواریوں سے اکثر دوچار ہونا پڑتا ہے، دو سو سال سے زائد زمانہ گزرا کہ راجہ جے سنگھ (۱۶۹۹-۱۷۴۳ء) والئ ریاست جے پور نے خود یہ بات محسوس کی کہ جنتریاں اور پنچانگ جو تیار کئے جاتے ہیں وہ بالعموم غلط ہوتے ہیں، جو اوقات سیارگان کے مطالع و مغارب کے ان میں درج کئے جاتے ہیں وہ عینی مشاہدات کے بالکل برعکس پائے جاتے ہیں، نیز کسوف و خسوف کا جو وقت دیا جاتا ہے اور جرم نیرین کے گہن کی جو پیشین گوئیاں کیجاتی ہیں وہ بھی تجربہ سے پوری نہیں اترتیں اس میں بھی اکثر کچھ نہ کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔

راجہ موصوف کی نگاہیں اس کے نقائص کی طرف مائل ہو جائیں اور یہ بات محسوس کی کہ قدیم سدھانت سرومنی پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، اور قدیم مقررہ اصول و قواعد پر عمل کرنے سے یہ اختلاف پایا جاتا ہے۔

بھسکارہ [5] کے وقت سے اس میں نظر ثانی کا موقعہ اب تک نہ آیا، اور جب تک نظر ثانی سدھانت سرومنی میں نہ ہو گی یہ اختلاف بدستور قائم رہے گا۔ اس اختلاف کو دور کرنے کی غرض سے راجہ جے سنگھ نے محمد شاہ (۱۷۱۹-۱۷۴۸ء) کی اجازت سے رصدگاہیں دہلی۔ جے پور۔ بنارس و اجین میں قائم کرائیں تاکہ تقویم صحیح تیار کی جائیں، ان میں سے قدیم دہلی کا جنتر منتر ہے جو ۱۷۱۰ء میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ شاہی رصدگاہ اپنی طرز خاص کے لحاظ کر بہت ہی قدیم ہے۔ جس طرح گرینچ (Greenwich) کی شاہی رصدگاہ میں دائرہ منطقۃ البروج اور الترتیمہ (Altazimuth) بڑے بڑے آلات ہیں اسی طرح دہلی کے جنتر منتر میں بھی اسی غرض و غایت کے لئے آلات رصد تیار کرائے گئے تھے جو دائرہ منطقۃ البروج و الترتیمہ کی ضروریات کے قائم مقام تھے۔

بنارس اور دہلی کی رصدگاہیں کس مپرسی کی حالت میں رہ کر برباد ہو گئیں اور جے پور کی رصدگاہ اچھی حالت میں اب تک قائم ہے، اس سے ریاست کیا فائدہ اُٹھا رہی ہے پبلک کو اس کا علم نہیں ہوتا اور عام طور پر پبلک اس سے فائدہ اُٹھانے سے محروم ہی رہتی ہے۔

علم [6] نجوم، جوتش اور رمل سب کو معلوم ہے کہ یہ چیزیں ہندوستان سے کس قدر تعلق رکھتی ہیں دولت عباسیہ کے دوسرے خلیفہ منصور ہی کے وقت سے جو ۱۳۶ھ میں تخت نشین ہوا عرب میں ان چیزوں کا رواج ہوا، منصور کو ان باتوں سے بڑی دلچسپی تھی چنانچہ بغداد کا شہر جب اُس نے بنوایا تو اُس کی ہر چیز زائچہ کھینچ کھینچ کر تیار کی گئی۔ دربار پر پہلے ایرانی منجموں کا قبضہ تھا پھر ہندوستانی جوتشیوں نے اپنا عمل دخل جمایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ منصور ہی کے زمانے میں اس فن پر ہندی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں ان جوتشی پنڈتوں میں سے عربوں میں سب سے مشہور نام کنکہ پنڈت کا ہے [7]"

(نوٹ) [4] ملاحظہ ہو صفحہ ۱ ڈائرکشل اسٹرولاجی از ڈائرکٹر دی۔ جی۔ ریلے، ایل۔ ایم اینڈ ایس۔ ای۔ او، پی۔ ایس [5] بھسکارہ سدھانت سرومنی کا مصنف ہے جس کو تقریباً چھ سو سال سے زائد زمانہ ہوا، [6] دیکھو صفحہ ۱۵۳ "عرب اور ہند کے تعلقات" [7] ملاحظہ ہو ۱۵۲ "عرب اور ہند کے تعلقات"

(باقی آئندہ)

فلکی اجمیری

"شاہکارِ فراق"

تصویر تیری دیکھ کے رونا وہ ہجر میں
رونے کے بعد پھر تری تصویر دیکھنا

فکر ایم اے

منچوریا میں چین و جاپان کی کشمکش

منچوریا میں چین و جاپان کی کشمکش برابر بڑھتی جا رہی ہے ابھی تو یہ جنگ بظاہر دو ہمسایہ قوموں کی باہمی نبرد آزمائی کی حیثیت رکھتی ہے لیکن ماہرین سیاست کو اندیشہ ہے کہ کہیں منچوریا میں چین و جاپان کی شرر بار توپیں کہیں آنے والی عالمگیر جنگ کو سلامی نہ دے رہی ہوں۔

منچوریا کی پیچیدہ سیاسیات کو سمجھنا آسان نہیں ہے موجودہ کشمکش کے اسباب و علل اور اس کے عقبی نتائج کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے ہمیں مختلف واقعات کی کڑیاں ملانا پڑیں گی۔

بیسویں صدی کے آغاز تک منچوریا پر روسی اثرات غالب تھے۔ ۱۹۰۵ء میں جنگ روس و جاپان کے خاتمہ پر معاہدہ "پورٹس ماؤتھ" کے ذریعہ روس نے اپنے حاصل کردہ حقوق جاپان کو دیدئے اور حکومت چین نے بھی اس معاہدہ پر مہر توثیق ثبت کی۔

معاہدہ پورٹس ماؤتھ کے ذریعہ جاپان کو منچوریا میں جو حقوق و اختیارات حاصل ہوئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت چین کے اندر ایک مستقل حکومت قائم کی جائے جس کا برائے نام شمار تو چینی ممالک محروسہ میں ہو لیکن جو حقیقت میں ماتحت جاپان کے ہو۔ جنوبی منچوریا ریلوے جس کا سلسلہ ڈیرن سے چانگ چن تک ہے روسیوں کے روپیہ اور محنت سے تیار ہوئی تھی لیکن جنگ روس و جاپان کے خاتمہ پر یہ جاپان کو مل گئی اور اس کے ساتھ ہی انہیں منچوریا کے پایۂ تخت مکڈن سے بندرگاہ انتنگ تک متذکرہ بالا ریلوے لائن کی ایک نئی شاخ نکالنے کا بھی حق حاصل ہو گیا۔

معاہدہ پورٹس ماؤتھ کی رو سے جاپان کو ایک اور خاص فائدہ یہ ہوا کہ جزیرہ نمائے سیاؤتنگ میں جنوبی منچوریا ریلوے کے اختتام پر ۱۲۴۱ مربع میل کا علاقہ کوانتنگ اسی طرح "پٹہ پر" مل گیا جس طرح نظام حیدرآباد کا علاقہ برار حکومت ہند کے پاس پٹہ پر ہے۔

منچوریا کا مجموعی رقبہ تین لاکھ بیاسی ہزار مربع میل ہے۔ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوانتنگ کا رقبہ بظاہر کوئی حقیقت نہیں رکھتا لیکن تجارتی اور بحری مفاد کے لحاظ سے یہ علاقہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اس کی بندرگاہ ڈیرن منچوریا میں تمام جاپانی توقعات اور امیدوں کا مرکز ہے۔ جاپان بظاہر کسی ممکن قیمت پر بھی اس سے دست بردار ہونا گوارا کریگا۔ کچھ عرصہ کے بعد اگر منچوریا اور منگولیا کی حالت کچھ بھی سنبھل گئی تو ڈیرن اپنی تجارتی اہمیت میں شنگھائی سے بازی لیجائیگا۔ اور وادی یانگسی کے بیس کروڑ باشندے بیرونی دنیا سے ڈیرن ہی کے ذریعہ تجارت کرینگے۔ علاوہ بریں اس علاقہ میں نہایت نفیس تیل نکلتا ہے۔

۱۹۱۵ء میں پٹہ ختم ہو جانے کے دن قریب آئے تو جاپان نے اپنے مشہور اکیس مطالبات کے ذریعہ چینی حکومت سے بزور قوت اس کی میعاد بڑھوالی۔ اس وقت یورپین ممالک عالمگیر جنگ میں مبتلا تھے اس لئے جاپان کو اور بھی اچھا موقع مل گیا۔

اس دوران میں جاپان نے اپنی اقتصادی تعمیر میں منچوریا کو اس قدر مدغم کر لیا کہ اگر اب وہ منچوریا میں اپنے حقوق سے دستبردار ہونا چاہے تو اس کے قومی مفاد پر زبردست اثر پڑے گا۔ اقتصادی اہمیت کے علاوہ جاپان منچوریا کو روس کے خلاف اپنی مدافعت کا پہلا محاذ سمجھتا ہے منچوریا زراعتی اور معدنی لحاظ سے بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ زمین سرسبز و شاداب ہے۔ دوسری چیزوں کے علاوہ سوئے کی پھلیاں اس قدر کثرت سے پیدا ہوتی ہیں کہ انہیں منچوریا کی زرعتی دولت کہا جا سکتا ہے تمام دنیا میں جس قدر سوئے کی پھلیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا اسی فی صدی حصہ صرف منچوریا میں پیدا ہوتا ہے۔ معدنی لحاظ سے منچوریا میں لوہے اور کوئلے کی بڑی قیمتی کانیں ہیں۔

۱۹۱۵ء میں چین نے مجبور ہو کر جاپانی پٹوں کی پھر تجدید کر دی اور کوانتنگ کے جاپانی پٹہ کی میعاد ۱۹۹۷ء میں جنوبی منچوریا ریلوے کی ۲۰۰۲ء اور انتنگ مکڈن ریلوے پٹہ کی میعاد ۲۰۰۷ء میں ختم ہوگی۔ علاوہ بریں اس سال جاپان نے منچوریا میں کانیں کھودنے اور زمینیں پٹہ پر حاصل کرنے اور دوسروں کو ٹھیکے دینے کے حقوق بھی جبراً حاصل کر لئے یہ ہے مختصر الفاظ میں جاپان کی مشہور اکیس مطالبات کا خلاصہ۔ چین کے قومی جذبات اس الملک جاپانی جذبۂ ملوکیت کے ہمیشہ خلاف رہے ہیں ۱۹۱۷ء میں چین نے اپنی اندرونی بدنظمیوں سے مجبور ہو کر منچوریا میں جاپان کے یہ امتیازی حقوق بخوف جنگ مزید منظور کئے لیکن اسے اپنی مملکت میں غیر قوم کی یہ مداخلت و غارتگرانہ دست برد بہت ناگوار رہی۔

۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو جاپان نے چینی سپاہیوں پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے افسروں کی زیر ہدایت دو ایک مقامات پر جنوبی منچوریا ریلوے کی پٹریاں اکھاڑ دیں معاہدہ پورٹس ماؤتھ کی رو سے جاپان کو ریل کے راستہ پر "محافظ دستہ" کے نام سے فوج رکھنے کا حق حاصل ہے اس الزام میں جاپانی ریلوے کے ان "محافظ دستوں" نے (جن کے قیام کا مقصد معاہدات کی رو سے صرف اس قدر ہے کہ وہ ریلوے لائن کی حفاظت کریں) چینیوں کے خلاف اس طرح جنگی کارروائی شروع کر دی کہ گویا یہ ملک چینیوں کا نہیں بلکہ جاپانیوں کا ہے۔ ڈیرن سے چانگ چن کا جاپانی سپاہیوں کا تانتا بندھ گیا اور انہوں نے جنوبی و وسطی منچوریا کے تمام اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔

اس دن سے آج تک جینوا۔ واشنگٹن اور ماسکو کے مسلسل انتباہ کے باوجود جاپان منچوریا کے علاقوں پر قابض ہے انجمن اقوام کی کونسل نے اس کو ہدایت کی وہ ۱۶ نومبر تک اپنی فوجیں معاہدہ پورٹس ماؤتھ کی رو سے طے شدہ رقبہ کے اندر واپس بلا لے لیکن جاپان نے کوئی سماعت نہ کی اور اس وقت بھی اس کی فوجیں جنوبی منچوریا ریلوے

کی شمالی حد سے تقریباً تین سو میل آگے تک بڑھی ہوئی ہیں۔
متحدہ ریاستہائے امریکہ نے برابر اس امر کی کوشش کی کہ جاپان آئین انصاف کی شاہراہ سے معزول نہ ہو۔ پہلے انجمن اقوام میں یہ تحریک اٹھانے کا خیال تھا کہ میثاق کیلاگ کا احترام مدنظر رکھا جائے جس کی رو سے لڑائیوں پر بندش کی گئی ہے لیکن اس سلسلہ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنگ کس وقت میں جنگ نہیں ہے؟ کیونکہ اگرچہ منچوریا میں گزشتہ ماہ ستمبر سے چین اور جاپان کے درمیان کشمکش ہو رہی ہے لیکن دونوں کی سفارتی تعلقات منقطع نہیں ہوئے اور نہ دونوں حکومتوں نے باقاعدہ اعلان جنگ کیا۔ لہذا واشنگٹن میں نو دول کے باہمی میثاق پر زور دیا گیا جو ۱۹۲۲ء میں واشنگٹن کانفرنس کے موقع پر مرتب ہوا تھا اور جس کو بعض اوقات چین کیلئے "بین قومی منشور اعظم" کہا جاتا ہے۔

اس معاہدہ کے ذریعہ منچوریا پر چین کا فرض حکمرانی تسلیم کیا گیا ہے اور اس بات کی ذمہ داری کی گئی ہے کہ منچوریا کا دروازہ تمام اقوام عالم کی تجارت کے لئے مساویانہ طور پر کھلا رہے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جاپان کی ترکتازیوں سے نو دول یورپ کے متفقہ میثاق کی دھجیاں فضائے منچوریا میں اڑ رہی ہیں منچوریا کے مشرقی صوبہ کرین میں جاپانیوں نے اپنی جانب سے ایک گورنر مقرر کر دیا ہے مکڈن میں یوان جن کائی نامی ایک خوشنولیس کو صدر حکومت بنا کر بٹھا دیا ہے۔ اور یہ بھی افواہ گرم ہے کہ منچوریا کے سابق تاجدار ہنری یو۔پی کو جاپان منچوریا کے تخت پر دوبارہ بٹھانا چاہتا ہے۔

واقعات منچوریا سے روس کا تعلق ایک بالکل دوسری نوعیت کا ہے۔
نو دول یورپ کے متذکرہ بالا معاہدہ میں وہ شریک نہیں
——— میثاق کیلاگ پر اس نے دستخط ہیں لیکن وہ اسے
دی کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ نہیں سمجھتا اس لئے دوسرے دول مغرب کی طرح جاپان کے خلاف یہ اعتراض نہیں کہ وہ کسی معاہدہ یا میثاق کی خلاف ورزی کر رہا ہے بلکہ شمالی منچوریا کے جس کے علاقہ میں جاپان دست تطاول دراز کر رہا ہے وہاں روس کے بعض مفاد ہیں۔ شہر جس چینی مشرقی ریلوے کا مستقر ہے وہ چین کے ساتھ ہی روس کی بھی ملکیت ہے اس طرح یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ منچوریا میں اس وقت چین جاپان اور روس کے خصوصاً اور بعض دوسری مغربی حکومتوں کے مفاد عموماً اپنا کام کر رہے ہیں چینیوں کو یہ فکر ہے کہ ان کا ملک غیروں کی دست برد سے بچے جاپان منچوریا پر زیادہ سے زیادہ قبضہ جمانا چاہتا ہے اور روس کو یہ فکر ہے کہ جاپان کے ہاتھوں منچوریا میں اس کے مفاد خاک میں نہ ملیں امریکہ وغیرہ دول مغرب میں بعض سے جاپان کو کاوش ہے بعض کو روس سے اور ممکن ہے کہ چند طاقتیں نیک نیتی کے ساتھ معاہدات کا احترام مدنظر رکھنا چاہتی ہوں۔

چین اور جاپان کی کشمکش کوریا کے ایک واقعہ سے معلوم ہوا تھا کہ دنیا دوں میں چند چینی اور کورین باشندوں کی کچھ چپقلش ہوئی اس میں جاپانی پولیس اور منچوری فوج نے حصہ لیا اور اس طرح تمام کوریا میں چینیوں کے خلاف پروپیگنڈا شروع ہو گیا اور چین میں جاپانی مال کا بائیکاٹ ہونے لگا۔ ۱۸ ستمبر کو جاپان نے منچوریا میں جو مداخلت کی وہ در اصل کوریا کے اسی معمولی واقعہ کا شاخسانہ تھی

۱۹۱۵ء کے معاہدہ کی رو سے جاپان کو منچوریا میں زراعت کا حق حاصل ہے زمین پٹہ پر لینا بظاہر ایک معمولی بات ہے لیکن چین میں ایسی خاص اہمیت حاصل ہے قوانین ملکی کی رو سے سوائے مشنریوں کے چینی معاہدات کی رو سے خاص حقوق حاصل ہیں کوئی غیر ملکی باشندہ زمین پٹہ پر حاصل نہیں کر سکتا اور اہل چین اس بندش کے عائد کرنے میں حق بجانب بھی ہیں کیونکہ یہاں غیر ملکی باشندے چینی قانون اور عدالت کی دسترس سے باہر ہیں اور اگر کوئی غیر ملکی زمین حاصل کرے تو چینی حکومت اس کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتی بعض غیر ملکی باشندوں کو زمین پٹے پر حاصل کرنے اور دوسروں کو پٹے پر دینے کے جو اختیارات حاصل ہیں وہ چینیوں کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں کیونکہ اس طرح ان کی راہ میں شدید دشواریاں حائل ہو جاتی ہیں۔

جاپان کو شروع میں امید تھی کہ وہ اپنے کسانوں کی کثرت تعداد سے اس حصہ ملک پر تمام و کمال تسلط جما لیں گے لیکن انہیں مایوسی ہوئی منچوریا کے دو کروڑ ستر لاکھ باشندگان میں صرف ڈھائی لاکھ جاپانی ہیں اور ان میں بھی بڑا حصہ کاشتکاری نہیں کرتا بلکہ اسٹورکیپروں منیجروں اور ریلوے ملازموں کی حیثیت سے کام کرتا ہے منچوریا میں جاپانی کاشتکاروں کی تعداد بہت ہی کم اور برائے نام ہے اس کی ایک خاص وجہ ہے کہ جاپانی قوم فطری طور پر اپنے وطن سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتی پچھلے سال شمالی امریکہ میں جاپانیوں کی ہجرت کے متعلق ان دونوں ممالک میں کچھ کشیدگی ہوئی تھی شاید ناظرین یہ خیال کریں کہ اگر جاپانی قوم ضرورت سے زیادہ "وطن پرست" واقع ہوئی ہے تو پھر یہ قبضہ کیوں ہوا تھا اس سلسلہ میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ۱۹۱۰ء لغایت ۱۹۱۹ء یہ دس سال جاپانیوں کی تاریخ میں ایسے ہیں کہ اس کے باشندوں نے سب سے زیادہ تعداد میں دوسرے مقامات پر ہجرت کی لیکن "عظیم الشان" مجموعہ تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار ہے اور اس کے مقابلہ پر ان ہی دس برسوں کے اندر جاپان کی آبادی میں ساٹھ لاکھ کا اضافہ ہوا ایک جاپانی اپنے وطن کی نان خشک کو پردیس کی مکلف غذاؤں پر ترجیح دیتا ہے۔

اگر جاپانی باشندے انتہائی مجبوری کے عالم میں اپنے وطن سے باہر نکلیں بھی تو اقتصادی لحاظ سے منچوریا ان کے لئے زیادہ پر منفعت مقام نہیں جاپانی کاشتکار محنت میں چینیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ پردیسی جاپانیوں کی بسر اوقات کے لئے کافی نہیں لہذا جاپانی سب سے زیادہ برانہ مل جاتے ہیں۔

چینی مزدور جاپانی مزدوروں سے تو بازی لیجاتے ہیں لیکن کوریہ والوں سے انہیں منہ کی کھانا پڑتی ہے چینیوں کے مقابلہ میں کوریوں کی خوراک ارزاں ہے اس لئے وہ منچوریا کے چینی مزدوروں سے زیادہ کم اجرت پر کام کر سکتے ہیں علاوہ ازیں کورین کاشتکار چینی کاشتکاروں سے باعتبار قابلیت افضل ہیں۔

اس مقابلہ کا تعلق چونکہ براہ راست پیٹ سے ہے اس لئے چینی اور جاپانی مزدوروں اور چینی اور کورین مزدوروں کے درمیان معاندانہ جذبات برابر بڑھتے جاتے ہیں اس سال پیشتر تک چینیوں اور کوریوں کے تعلقات خوشگوار تھے لیکن کچھ تو جاپان کی ریشہ دوانیاں اور کچھ پیٹ کا سوال۔ اب ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے ہیں منچوریا میں اس وقت دس لاکھ کے قریب کورین باشندے ہیں اپنی کثرت آبادی کو دیکھتے ہوئے چینی باشندے بھی منچوریا میں ہجرت کے لئے اب مجبور ہو رہے ہیں اور منچوریا میں کورین اثرات غالب دیکھ کر ناراض ہوتے ہیں کیونکہ

سوال معیشت کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کورین قوم جاپان کے زیرنگین ہے منچوریا میں کورین نے اقلیت کے اس اقتصادی سوال سے بہت زیادہ سیاسی اہمیت حاصل کرلی ہے۔ چینی منچوریا میں کوریوں کے داخلہ کو جاپانیوں کا داخلہ سمجھتے ہیں اور ایک مصیبت یہ ہے کہ اگر کورین باشندے چینی قومیت بھی اختیار کرلیں تب بھی جاپان ان کو اپنی رعایا سمجھتا ہے۔ لہذا اہل کوریا اپنے اس حق سے اور بھی فائدہ اٹھاتے اور جاپانیوں کے آلہ کار بنتے ہیں۔

متذکرہ بالا وجوہ سے تمام سمجھدار چینیوں کی یہ خواہش ہو رہی ہے کہ وہ جابرانہ معاہدات منسوخ کئے جائیں جو جاپان نے چین کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تسلیم کرا لئے تھے۔

جاپانیوں کے خیال میں معاہدات کے خلاف اس تحریک تنسیخ میں منچوریا کے مشہور جنگی سردار مارشل چنگ سولیان کا زبردست ہاتھ ہے اس مارشل کو جاپانیوں نے مکڈن میں داخل ہونے کی ممانعت کردی ہے یہ نوجوان محب وطن اس مشہور بوڑھے سردار چانگ سولن کا بیٹا ہے جس نے چینی حکومت سے اختلافات رکھنے کے باوجود جاپان کا آلہ کار ہونا کبھی منظور نہ کیا۔ مارشل چنگ سولیان مادر وطن کی کچھ خدمت کرنا چاہتا ہے اور اس کا مقولہ ہے کہ چین میں صرف چینیوں ہی کو حق حکمرانی حاصل ہو سکتا ہے۔

مارشل مذکور نے منچوریا کے باشندوں کو حب وطن کا سبق پڑھایا اور ان کے رگ وریشہ میں جاپانی امپیریلزم کے خلاف معاندانہ جذبات پیوست کر دئے باوجودیکہ نو ممالک کے عہد نامہ پر جاپان کے بھی دستخط ہیں۔ لیکن وہ منچوریا کو چین سے علیحدہ کرنا چاہتا ہے جب کبھی کسی منچوری سردار نے دیوار چین کے جنوبی معاملات سے سروکار رکھا تو جاپانی اس سے ناراض ہوئے۔ بوڑھے چانگ سولن نے جب چین کے معاملات میں حصہ نہیں لیا تو جاپان نے اس کو پیکن نہ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ نوجوان چنگ سولن کے تعلقات چین کی قوم پرست جماعت اور کومن تان سے بہت مستحکم اور خوشگوار ہیں اس سے جاپانی اور بھی گھبرا رہے ہیں۔

منچوریا کا نوجوان طبقہ اپنے وطن میں جاپانی اقتدار کے سخت خلاف ہے اور ان کے دلوں میں یہ آگ آج سے نہیں بلکہ برسوں سے سلگ رہی ہے لیکن بعض بوڑھے سردار نوجوانوں کے جذبات کو قابو میں کئے ہوئے تھے۔ اب ملکی سیاسیات میں نوجوان پارٹی کا زیادہ اقتدار حاصل ہو رہا ہے اور ان کے سامنے بوڑھوں کی نہیں چلتی ہے۔ یہ زمانہ کا انقلاب دیکھکر منچوریا کے چند بوڑھے سرداران جنگ نوجوان طبقہ کا ساتھ دینے پر رضامند ہو گئے ہیں اور اکثر نے گوشۂ عافیت اختیار کر لیا ہے

ابتدا میں نوجوان چنگ سولیان کو غیر معمولی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اس نے اپنے ملک کی سیاسیات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک عزیز دوست سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ زمانہ گزشتہ میں چینی حکام کچھ وقت سلطنت کی اطاعت میں صرف کرتے تھے کچھ وقت اپنے صوبجاتی سرداروں کی اطاعت میں اور کچھ وقت اپنے لئے روپیہ جمع کرنے میں لیکن اب یہ حال ہے کہ نہ انہیں مرکزی حکومت کی پروا کی اطاعت ہے نہ مقامی حکومتوں کا خیال اور وہ اپنا تمامتر وقت روپیہ فراہم کرنے میں صرف کرتے ہیں لیکن نوجوان چنگ سولیان اس افسوسناک صورت حال سے مایوس نہیں ہوا بلکہ وہ قوم پرور کوششوں میں برابر مصروف رہا اور آخر میں کامیابی نے اس کے قدم چوم لئے آج منچوریا میں جمود و اختلال کا پہلا سا رنگ نہیں۔

نوجوان دلوں میں قومی جذبات نہایت تیزی کے ساتھ نشو ونما پا رہے ہیں حب وطن کے ان ہی جذبات سے متاثر ہو کر چینیوں نے ریلوے لائنیں نکالنے کا پروگرام مرتب کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے مجوزہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں چینیوں نے انتہائی ذہانت اور قابلیت کا ثبوت دیا ہے انہوں نے بعض شدید مواقعات کے باوجود منچوریا میں تقریباً آٹھ سو میل کے قریب ریلوے لائن اپنے سرمایہ سے تیار کی ہے اسپین کوڈن ریلوے چینیوں نے برطانوی سرمایہ سے تیار کی ہے۔ اس طرح اب چینی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ منچوریا میں اُن کی زیر ملکیت ریلوے لائنیں روس اور جاپان کی ریلوے لائنوں سے زیادہ طویل ہیں۔ اگر چینیوں کی راہ میں برابر دشواریاں حائل نہ کی جائیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ جہانتک ریلوے کا تعلق ہے چین منچوریا میں اپنی غیر معمولی قابلیت و محنت کا ثبوت دے۔

اصل میں منچوریا میں چینی ریلوے لائنوں کا سلسلہ مارشل چنگ سولن نے شروع کیا تھا۔ مکڈن میں برسر اقتدار ہو کر اس کی خواہش تھی کہ وہ چینی مشرقی ریلوے سے بے نیاز ہو جائے۔ ۱۹۲۵ء میں جب ایک بغاوت رونما ہوئی تو چینی مشرقی ریلوے کے روسی منیجر نے مارشل فوجوں کو پیشگی کرایہ وصول کئے بغیر لیجانے سے انکار کر دیا تھا۔

اس واقعہ کا مارشل چنگ سولن پر بہت زیادہ اثر ہوا اس وقت اس نے کسی نہ کسی طرح اپنا کام نکال لیا لیکن اس کے بعد اس نے ریلوے لائن کی تیاری کا کام شروع کیا اور چینی مشرقی ریلوے کے متوازی بہت جلد ایک نئی لائن نکال کر وہ اول الذکر ریلوے لائن سے بے نیاز ہو گیا۔

اس اہم کام سے فارغ ہو کر اس نے فوراً ہی جنوبی منچوریا ریلوے کے متوازی بھی ایک نئی ریلوے لائن نکالنے کا ارادہ کیا اور پیپن مکڈن ریلوے سے ۶۰ میل کے فاصلہ پر بندرگاہ ہولوتاؤ میں ریلوے لائن کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ اس طرح نوجوان مارشل جنگ سولیان کی خواہش یہ تھی کہ ان کی مجوزہ ریلوے لائن ڈیرن کے جاپانی بندرگاہ سے بھی بالکل آزاد دے نیاز رہے اس نئی تجاویز سے جاپانی حلقوں میں اور بھی سراسیمگی پھیلی کیونکہ یہ جاپانیوں کے اقتصادی اور سیاسی مفاد سے متصادم ہو رہی تھیں۔

جاپان جانتا تھا کہ اگر جنوبی منچوریا ریلوے کے مقابلہ پر کوئی ریلوے لائن نکل آئی تو اس کے محاصل میں کمی ہو جائیگی اور وہ منچوریا میں تجارت کا بھی واحد ٹھیکہ دار نہ رہ سکے گا۔ علاوہ بریں مکڈن میں کسی مخالف فوج کا پہنچنا بہت آسان ہو جائیگا اسی لئے اس مجوزہ نئی ریلوے لائن کی شدید مخالفت شروع کی لیکن چونکہ محب وطن چینی جاپان کے سرمایہ سے بے نیاز ہو چکے تھے اس لئے انہوں نے جاپانی مخالفت کی ذرہ برابر پروا نہ کی اور ریلوے لائن تعمیر ہوتی رہی۔

۱۹۲۶ء میں جب اس نئی ریلوے لائن کا دوسرا دور تعمیر شروع ہوا تو جاپان نے خطرے کا بگل بجایا کہ معاہدات کی رو سے چین کو جنوبی منچوریا ریلوے کے متوازی کوئی نئی ریلوے قائم کرنے کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے۔ مسٹر یوشی زادا جاپانی سفیر پیکن نے پوری قوت کے ساتھ چینی حکومت کے سامنے احتجاج کیا اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر چین نے اس ریلوے لائن کی تعمیر فوراً ہی نہ روک دی تو جاپان

اس کے خلاف اعلان جنگ کر دے گا۔

اس موقع پر جاپان نے یہ سوال اٹھایا کہ قدیم معاہدات کی خلاف ورزی کر کے چین جنوبی منچوریا ریلوے کے متوازی کوئی نئی ریلوے لائن تعمیر کرتا ہے تو جاپان کو بھی جنوبی مشرقی ریلوے کے متوازی ایک نئی ریلوے لائن نکالنے کا حق حاصل ہے لیکن دوران میں بوڑھے منچوری سردار چنگ سولن کے انتقال سے جدید چینی ریلوے لائن کا مسئلہ معرض تعویق میں پڑ گیا ورنہ اب سے ڈھائی تین سال پیشتر ہی چین اور جاپان کی جنگ شروع ہو جاتی

(ترجمہ)

رُباعیاتِ آسی

ہمارے دوست حضرت مولانا عبدالباری آسی ہندوستان کے اُن پختہ فکر شعراء میں سے ہیں جن کا دنیائے ادب میں ایک خاص درجہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ جناب آسی کو رباعی گوئی میں بطورِ خاص ملکہ حاصل ہے۔ کئی ہزار رباعیات اس وقت تک آپ نے کہی ہیں جن کا انتخاب عنقریب ادبی مرکز کی جانب سے شائع کرنے کی عزت حاصل کی جائے گی۔ جناب آسی رباعی میں اپنے کسی خاص نظریہ حیات یا مخصوص فلسفۂ زندگی یا اپنے پیغام کی ہم آہنگی و اعادہ کے لحاظ سے کہاں تک مستقل ہیں یہ تو انتخاب کے مطالعہ کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا مگر مجھے جستہ جستہ لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہے اس لئے میں اپنی محدود واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے جس رباعی میں جس خیال کو ظاہر کرنا چاہا ہے قوت اور شیرینی کے ساتھ ظاہر کیا ہے اور وہ ایک قادر فن کی حیثیت سے کامیاب ہوئے ہیں۔ مگر عام طور پر اپنی رباعیات میں آپ کچھ خیام کے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

ساغر

ساقی کیوں لب پہ یہ فغاں رکھا ہے — کیوں شیشہ و جام کو نہاں رکھا ہے
یہ گوشۂ صحنِ باغ یہ عالم ہُو — اللہ بھلا یہاں کہاں رکھا ہے

دل میں تپِ عشق سے تعب پیدا کر — آئینِ وفا میں رہ ادب پیدا کر
جب کچھ بھی نہ ہو سکے تو کر خوب گناہ — رحمت کا غرض کوئی سبب پیدا کر

عبرت دل کو جگا نہیں دیتی ہے — قسمت کوئی پتا نہیں دیتی ہے
ہمت بڑھتی ہے جب خدا کی جانب — غفلت اُسے راستا نہیں دیتی ہے

لذتِ تکلیف میں اُٹھاتے جاؤ — نوحے کی دُھنوں میں نغمے گاتے جاؤ
عبرت کا سبق صحیفۂ فطرت سے — پڑھتے جاؤ مگر بھلاتے جاؤ

سیماب نے کس سے بے قراری سیکھی — شبنم نے کہاں سے آہ و زاری سیکھی
کانٹوں نے خلش کا راز کیوں کر جانا — سب نے ایک ایک خُو تمہاری سیکھی

کُھلتا ہی نہیں کوئی طلسمات جہاں — مجبور نہ ہو تو کیا کرے پھر انساں
کچھ حد ہے فریب کی وہاں کے آسی — گھٹنے کے لئے جہاں بڑھے عمرِ رواں

ہو جاتا ہوں پست جب اُبھرتا ہوں میں — مغروریٔ نفسِ بد سے ڈرتا ہوں میں
پاتا ہوں خلوصِ توبہ جس دن دل میں — اُس روز گنہ ضرور کرتا ہوں میں

"آسی"

الہامات

مشاہیر شعراء کے تازہ افکار

شعراور خصوصاً غزل کے لئے میں نے بالائی عنوان کو مناسب ترین خیال کیا اور گو یہ میرے قدیم رسالے کی سُرخی ہے مگر "ایشیا" میں بھی اسی کو قائم کرتا ہوں ہر چند کہ غزلوں کے لئے بہت سے عنوانات تجویز ہو سکتے ہیں مگر اس عنوان سے کم از کم دورِ پیمانہ کی یاد تازہ ہو جائیگی اور ناظرین کے ذہن میں تصور کو اس انقلاب کا بآسانی اندازہ ہو سکیگا جو اس سال کی مدت کے لحاظ سے غیر متوقع نہیں ہے

الہامات میں ہر ماہ مشاہیر اساتذہ اور نو مشق شاعری کا تازہ کلام شائع ہوا کریگا جس کا معیار یہ ہرگز نہ ہوگا کہ ہر غزل ایک ہی اسلوبِ شاعری کا آئینہ ہو بلکہ ہر رنگ کی غزل شائع کی جائے گی جس سے یہ اندازہ ہوتا رہے گا کہ اردو شاعری میں اس وقت غزل کے کتنے جاریہ اسکول ہیں۔

ساغر نظامی

حضرت جگر مرادآبادی

حُسن کس رنگ میں کھولے ہوئے آغوش نہیں
اس کو کیا کیجئے عرفان نہیں ہوش نہیں

رند جو مجھ کو سمجھتے ہیں اُنہیں ہوش نہیں
میکدہ ساز ہوں میں میکدہ بردوش نہیں

مٹ چکے ذہن سے سب یادِ گزشتہ کے نقوش
پھر بھی اک چیز ہے ایسی کہ فراموش نہیں

ایک گوشہ میں سمٹ آئے ہیں دونوں عالم
میرا دامن ہے کسی اور کا آغوش نہیں

اپنے ہی حُسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں
میری آغوش کو اب حسرتِ آغوش نہیں

حُسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حُسن
کونسی شے ہے جو آغوش در آغوش نہیں

عشق و وارفتگیٔ عشق کا افسانہ کہاں
میں جہاں اب ہوں وہاں حُسن کو بھی ہوش نہیں

تو بھی چاہے تو گوارا نہ کروں لطفِ وصال
تیرے آغوش کے قابل مرا آغوش نہیں

عشق گر حُسن کے جلووں کا ہے مرہونِ کرم
حسن بھی عشق کے احساں سے سبکدوش نہیں

پاؤں اُٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کی طرف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

دل تو دل سنگ کو توڑو تو صدا دیتا ہے
چوٹ کھا کر کوئی بے حس بھی تو خاموش نہیں

ملکے اک بار گیا ہے کوئی جس دن سے جگر
مجھ کو یہ وہم ہے جیسے مرا آغوش نہیں

حضرت ثاقب لکھنوی

آئینۂ عبرت ہے مرا دل بھی جگر بھی　　اِک درد کی تصویر اِدھر بھی اُدھر بھی

لُٹ کر بھی وہی بھیڑ ہے پہلو میں غموں کی　　دِل کھو کے میں سمجھا کہ کوئی شے ہے جگر بھی

یارب یہ سکت دل کی صداؤں میں کہاں تھی
نالوں میں کچھ آواز ملاتا ہے جگر بھی

حضرتِ رواں (خلد آشیاں)

رواں نہ جانے قدم کیوں بڑھائے جاتے ہیں　　پلٹ کے جب اُسی مرکز پہ آئے جاتے ہیں

حیات و موت پہ پردے گرائے جاتے ہیں　　ہمارے راز ہمیں سے چھپائے جاتے ہیں

فضول موجبِ تہمت ہے دامنِ گلچیں　　یہ شعلے پردے سے خود باہر آئے جاتے ہیں

ابھی افق پہ ہویدا نہیں ستارۂ صبح　　مگر چراغ عبث جھلملائے جاتے ہیں

مآلِ کارِ محبت نہ پوچھ اے ہمدم　　کہیں یہ راز کسی کو بتائے جاتے ہیں

کمالِ بیخودیٔ عشق بھی خودی ہے رواں
جنوں میں ہوش کے آثار پائے جاتے ہیں

حضرت احسن مارہروی

وہاں یہ حضرتِ دل بے بُلائے جاتے ہیں　　جہاں بلائے ہوئے بھی اُٹھائے جاتے ہیں

دلوں میں آرزوئیں شوقِ دید آنکھوں میں — کھلونے دے کے تماشے دکھائے جاتے ہیں

گھٹا گھٹا کے بڑھاتے ہیں ذوقِ نظارہ — اُٹھا اُٹھا کے وہ چلمن گرائے جاتے ہیں

نمودِ حشر نمائش ہے بھولے بھٹکوں کی

تمام عمر کے بچھڑے ملائے جاتے ہیں

حضرت ماہر القادری

نشاط و کیف کا عالم زمیں سے آسماں تک ہے — خدا معلوم! تیرے حُسن کی دُنیا کہاں تک ہے

محبت کو خیالِ ماسوا چھو بھی نہیں سکتا — ہوس کی جان پیمائی فقط سود و زیاں تک ہے

یہی طوفان مجھے آسودۂ ساحل بنائے گا، — تلاطم میری کشتی کا شکستِ بادباں تک ہے

نظر آتا ہے کیوں ذرّوں میں عکسِ خطِ پیشانی — ابھی کچھ فاصلہ شاید جبیں سے آستاں تک ہے

تری مخمُور آنکھوں کا تصوّر اے معاذ اللہ! — یہی محسوس ہوتا ہے کہ مستی لامکاں تک ہے

کوئی بچھڑے ہوؤں کی بات بھی سنتا نہیں ماہر — جرس کی مہربانی کارواں سے کارواں تک ہے

حضرت مولینا بیخود دہلوی

جو تماشا نظر آیا اُسے دیکھا سمجھا — جب سمجھ آگئی دُنیا کو تماشا سمجھا

بیروہ ہوں حور کو چینی کا کھلونا سمجھا — باغِ جنّت کو تری راہ میں کانٹا سمجھا

رازِ وحدت ہے زباں کا تم دیگی صلا — میں بتا ہی نہیں سکتا کہ اُسے کیا سمجھا

سنگِ در پر ترے سجدے کا شرف حاصل ہے — جس نے دیکھا مجھے وہ آئینہ سیما سمجھا

میں یہ سمجھا ہوں کہ سمجھیں نہ مری بات کو آپ ‏ ‏ سر ہلا کر جو کہا آپ نے اچھا سمجھا

محوِ دیدار تھا میں ہوش کہاں تھا مجھکو ‏ ‏ کوہ پر جو نظر آیا اُسے موسیٰ سمجھا

عشق کی شرح میں داخل ہی غلامی کا بیاں ‏ ‏ اس کے ہر حکم کو میں اپنی تمنّا سمجھا

اثرِ حُسن کہوں یا کششِ عشق اسے ‏ ‏ میں تماشائی تھا وہ مجھکو تماشا سمجھا

غیریت تک تھا پریشانی و فرقت کا گلا ‏ ‏ کچھ شکایت ہی نہ تھی جب اُسے اپنا سمجھا

ایک وہ ہیں جنہیں دُنیا کی بہاریں ہیں نصیب ‏ ‏ ایک میں ہوں قفسِ تنگ کو دُنیا سمجھا

میرا ہر شعر ہے اک رازِ حقیقت **بیخودؔ**
میں ہوں اُردو کا نظیریؔ مجھے تو کیا سمجھا

نواب جعفر علی خانصاحب اثرؔ بی، اے لکھنوی

مثالِ برگِ خزاں رسیدہ ہوا ہے زرد آفتاب کیسا ‏ ‏ مگر قیامت قریب آئی، کھُلا ہے بندِ نقاب کیسا

دلِ ستمکش کو بجلیوں کا خزانہ جس نے بنا دیا ہے ‏ ‏ تری نظر میں نہاں تھا ظالم یہ محشرِ اضطراب کیسا

ترے کرم پر کبھی ہے تکیہ کبھی ہے خوفِ عتاب دل میں ‏ ‏ یہی ہے جنت یہی ہے دوزخ، عذاب کیسا ثواب کیسا

میں اُن کے جلووں کا آئینہ ہوں، وہ میری حیرت کا آئینہ ہیں ‏ ‏ جہاں یہ عالم ہو محویت کا، سوال کیسا جواب کیسا

کسی کو پیوندِ خاک کر کے پھر اُس کی تربت پہ رو رہے ہیں ‏ ‏ ہوا یہ دنیائے عاشقی میں الٰہی! آج انقلاب کیسا

بجائے مے یاد میں کسی کی پیا ہے خونابِ دل وگرنہ
تمہاری آنکھوں سے آج ٹپکا اثرؔ یہ رنگِ شراب کیسا

کتب موصولہ پر ایک نظر

کلیاتِ طغرائی

یہ مجموعہ حکیم الشعراء فیروزالدین احمد طغرائی مرحوم امرتسری کے اُردو فارسی کلام پر مشتمل ہے جسے ہمارے دوست صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ایم اے نے نہایت تہذیب کے ساتھ ترتیب دیکر طغرائی صاحب کے تلامذہ اور احباب کی متحدہ امداد و کوشش سے شائع کیا ہے شروع میں تبسم صاحب کا دیباچہ ہے اس کے بعد طغرائی صاحب کی تصویر ہے پھر سوانح حیات اور اس کے بعد اُردو کلام پر حکیم محمد حسین عرشی اور فارسی کلام پر ممتاز حسین صاحب ایم اے کے بر محل تبصرے ہیں۔ تمام کتاب پانچ حصوں میں تقسیم ہے پہلے حصے میں متفرق اُردو نظمیں ہیں دوسرے میں اسلامی نظمیں تیسرے میں اُردو غزلیں چوتھے میں فارسی قصائد اور پانچویں حصے میں فارسی غزلیں ہیں سائز ۱۷×۲۷/۸ کاغذ و کتابت اور طباعت خوبصورت ہے جلد مضبوط و حسین حجم ۲۲۰ صفحات اور قیمت دو روپے (عہ) ملنے کا پتہ:۔ پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور۔ ۱۹۲۵ء میں جناب طغرائی مرحوم سے امرتسر میں بذات خود مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ طغرائی صاحب اور ان کی جماعت نے کمالِ محبت سے دعوت دی تھی اور گھنٹوں لطفِ سخن رہا تھا۔ نہایت شریف المزاج بزرگ تھے اور پنجاب کے اساتذہ میں ان کا درجۂ کمال بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔ ان کے کلام میں صحتِ زبان زورِ اور اخلاقی پائی جاتی ہے۔ دقت یہ ہے کہ آرٹسٹ کا ارتقا حالات اور زمانے سے ساعدت سے بہت تعلق رکھتا ہے گو اس میں شک نہیں کہ حقیقی طور پر شاعر کی دماغی و روحانی تربیت شاعر کی قوتِ فکر اور شاعر کا بنیادی مزاج کرتا ہے جس سے شعریت فطری کا تعلق ہوتا ہے۔ جہاں تک بنیادی مزاج کا تعلق ہے جناب طغرائی بلند پایہ شاعر تھے جہاں تک اسباب و مواقع کا تعلق ہے زمانے نے ان کا ساتھ نہیں دیا یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں مکمل طور پر شاعرانہ سرمستی اور گونج نہیں پائی جاتی البتہ دماغی طور پر جذبات و احساسات اور واقعات کو نظم کر دینے پر پورے قادر تھے جا بجا سرمستی و گونج بھی پائی جاتی ہے مثلاً

عیاں میں آج اپنا سوزِ نہاں کر کے چھوڑونگا
جگر کے آبلوں کو آتش افشاں کر کے چھوڑونگا

ہنساؤنگا ہر اک بیدرد کو میں اپنے رونے پر
ہویدا ارتباطِ برق و باراں کر کے چھوڑونگا

امل کی کشتِ مردہ کو کرونگا زندہ اشکوں سے
اسی پانی سے کارِ آبِ حیواں کر کے چھوڑونگا

غزل و قصیدہ میں حکیم صاحب "قدیم اسکول" کے متبع تھے اور جدید رنگ کی نظمیں کہنے پر مکمل طور پر قادر چنانچہ ہلال کے عنوان سے جو نظم اس مجموعہ میں صفحہ ۳۱ پر درج ہے وہ ان کے کمالِ شاعرانہ کی آئینہ دار ہے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

ہر چند دیکھنے میں ذرا سا ہے ماہ ہے
رقاصۂ سپہر کے ماتھے کا چاند ہے

تہذیبِ بیان دیکھئے ؎

ہوتا ہے برہنہ جو ترا رُخ نقاب سے
ملتا ہے رونمائی میں نورِ آفتاب سے

پھر فرماتے ہیں ؎

تو بھی حسین ہے، دل بھی وفا کوش ہے ترا
پھیلا ہوا سپاک سے آغوش ہے ترا

تمام نظم میں بہت روشن اور ذی روح تشبیہات ہیں اور اسلوبِ بیان مؤثر ہے لیکن ایک جگہ یہ بھی کہا ہے ؎

کشتی ہے تیرے ہاتھ میں گویا گدا ہے تو
ہاں چشمِ آفتاب سے کچھ لے رہا ہے تو

مجھے معاف فرمایا جائے "ملتا ہے رونمائی میں نورِ آفتاب سے" کہنے کے بعد "ہلال" کو گدائے چشمِ آفتاب کہنا نظم کے وقار اور تسلسل نوعی کو مجروح کرتا ہے تبسم صاحب کو ترتیب کے وقت اس شعر کو نکال دینا چاہیئے تھا۔ اسی نظم میں پھر ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

زینت فزائے عارضِ زیبائے شب ہے تو
یعنی کہ گوشوارۂ لیلائے شب ہے، تو

کئی نظموں میں جو ناصحانہ قسم کی ہیں حکیم صاحب موضوع کی جزئیات میں گم ہو گئے ہیں۔ اول تو شاعری اور نصیحت دو متضاد چیزیں ہیں دوسرے یاد رکھئے جب شاعر واعظ ہو جائیگا شاعر کے درجے سے گر جائیگا "ملکی مذہب" کے عنوان سے صفحہ ۶۸ پر جو نظم ہے اس کے بعد نعتیہ قصیدہ کے علاوہ ہرگز وہ قصائد شریک کتاب نہیں ہونے چاہئیں تھے جو بادشاہوں اور امراء کی ثنا میں تحریر ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ میں جانتا ہوں ان کی اشاعت سے مقصود قصیدہ گوئی کے رنگ کو دکھانا تھا لیکن اس کوشش میں جتنا عظیم نقصان ہو گیا۔ اس کا اندازہ مشکل ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قوم پرور اور ملک پرست کبھی بادشاہ کا قصیدہ خواں نہیں ہو سکتا۔

اُردو غزل میں بعض بعض جگہ دل جھوم جاتا ہے گو لفظ "حضور" آجکل متروک ہے لیکن شعر کے دلچسپ ہونے میں شک نہیں ؎

مجھ کو ہے ہر سبیلِ شکایت بھی ناگوار
کیا فائدہ حضور کو ذکرِ رقیب سے

"رقیب" کا دوسرا قافیہ بھی خوب لکھا ہے ؎

محویتِ نظارۂ جاناں نہ پوچھئے
اُٹھا گیا نہ بیٹھ کے بزمِ رقیب سے

صفحہ ۱۵۷ پر بڑی معرکتہ الآرا غزل ہے

"ایشیا" میرٹھ

بہا کے لے ہی گئی بحرِ غم کی رَو دل کو — یہ سیل وہ ہے کوئی جس کی روک تھام نہیں
نہ پوچھ غم کدۂ عشق کی بلا نوشی — بغیر خونِ جگر آبروئے جام نہیں

اسی طرح اور بھی غزلوں میں دل درد اشعار پائے جاتے ہیں ؎

دل سے پیدا ہے مرے نغمۂ غم بے تحریک — یہ ہے وہ ساز کہ شرمندۂ مضراب نہیں

"اشک زیرِ مژگاں" کی کیا خوب تعبیر ہے ؎

دم ذرا لینے کو بیٹھے ہیں مسافر نوروز — اشک یہ ٹھیرے ہوئے سایۂ مژگاں میں نہیں

اور کچھ اس کے سوا فلسفۂ عشق نہیں — کر لیا دل میں کسی چیز نے گھر کہتے ہیں

عام طور پر طغرائی کی غزل کا ماحول قدیم سامانوں سے آراستہ ہے لیکن جذبات کی چاشنی جہاں ہے بہت گہری ہے، فارسی غزل کی فضا بھی قدیم ہے لیکن زبان بہت نفیس اور سلیس ہے اور اردو سے زیادہ فارسی میں برجستگی پائی جاتی ہے

وفا گویم حیا دنم، ستم فہمم جفا خوانم؟ — نگاہے را نیازم کز غلط انداختی رفتی
نو دستارم چہ پرسی، در جنون و آبلہ پائی — کہ مے بندم بہ پائیمے، دمے پیچم بہ سر نیمے

آخر میں متفرقات کے عنوان سے دو عربی نعتیہ نظموں پر خمسے ہیں اور چند اردو فارسی نظمیں ہیں لیکن بہر حال جو کچھ ہے اسقام اور اغلاط سے پاک ہے اور کیوں نہ ہو طغرائی واقف فن اور اہل علم تھے۔ خود اپنے محتسب تھے شعر و ادب سے ذوق رکھنے والوں کو کلیات طغرائی ضرور دیکھنی چاہئے۔

لطیفیات
جلد دوم

"زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا" ——

کون کافر ہے جو لطیفی کے ذہین اور طباع ہونے سے انکار کر سکے، یہ نوجوان موسم بہار کی ایک بجلی ہے جس کی ناتمام جھلک ہی تمام کر دینے کو کافی ہے۔ لیکن میری آزاد رائے یہ ہے کہ پنجاب کا آسمان اس برقِ لطیف کی جولانگاہِ اضطراب کے لئے مناسب و کافی نہیں۔

لطیفیات ایم حسن لطیفی بی اے کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کی ترتیب و اشاعت میں بہت جلدی کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ $\frac{20 \times 30}{16}$ ریڈر سائز پر طبع ہوا ہے اور اس کو جناب عارف بی اے نے ترتیب دیا ہے، صفحۂ اول ہی لطیفی کی ذہانت کا نقشِ اولیں ہے یعنی سرورق پر انہوں نے اپنے ستارہ کی تصویر دی ہے اس کے بعد انتساب ہے جو زبانِ اردو سے منتسب ہے۔ پھر اردو کے متعلق ایک نظم مصنف کی طرف سے ہے، اس کے بعد عارف صاحب کا دو صفحی دیباچہ ہے اس کے بعد لطیفی صاحب کی تصویر ہے جو اس مجموعہ کی قاتل ترین نظم ہے تصویر کے بعد لطیفی کا خیر مقدم کے عنوان سے حضرت اختر شیرانی کی ایک نظم ہے جو بہترین قصیدۂ اخلاص ہے مگر اس کتاب میں اس کی اشاعت قطعی بے محل ہے اس کے بعد فہرست ہے اور فہرست کے بعد کتاب مندرجۂ ذیل ابواب میں تقسیم ہے۔

پہلا باب ذاتی صفحہ ۱۳ سے ۳۵ تک جذباتی صفحہ ۳۸ سے صفحہ ۶۵ تک محاکاتیہ صفحہ ۶۷ سے ۹۶ تک مناظریہ صفحہ ۹۸ سے صفحہ ۱۳۴ تک فلسفیانہ اور سائنٹفک صفحہ ۱۳۵ سے ۱۵۲ تک پیوٹک پالٹک ۱۵۴ سے ۱۸۴ تک سیاسی ۱۸۵ سے ۲۰۰ تک معاشرتی ۲۰۱ سے ۲۰۶ تک۔ اسلامی صفحہ ۲۰۷ سے ۲۵۶ تک انجامیہ صفحہ ۲۵۷ سے ۲۵۸ تک۔ اصلِ کتاب فارسی کی ایک نظم سے شروع ہوتی ہے جس کا عنوان "ہمہ از من" ہے یہ نظم بہت ہی خوب ہے یوں تو لطیفی کی بیشتر نظموں میں وہ شباب و سرمستی ملتا ہے جو فطرت کی طرف سے شاعر کے لئے سند سمجھی جاتی ہے لیکن ان اشعار میں تو خاص طور پر اک جذبِ مستی پایا جاتا ہے۔

دریں معمورۂ بے اعتباری اعتبار از من — کہ پیمانِ محبت پائدار و استوار از من
گدازِ شعلہ و آتش گدائے اخگرِ جانم — فروغِ التہاب از من، تب و تابِ شرار از من
نشاطِ جشن مے دریوزۂ عیشِ فراوانم — مل از من، محفل از من، دور مے از من خمار از من
چمن صد پیرہن اندوز از چاکِ گریبانم — گل از من، خندہ از من رنگ و بو از من بہار از من

نظموں کے زیر تحت جو تاریخ اشاعت و نظم گوئی تحریر کی گئی ہے میرے خیال میں وہ طباعتی جمال کے دامن پر بدنما دھبہ ہے اور اسی طرح عنواناتِ نظم کے نیچے جو نوٹ یا اخبارات و افراد کی آرائے و اشارہ ہائے طباعت دئے گئے ہیں، وہ کتاب کی عظمت کو کم کرتے ہیں ہرگز ہرگز یہ حواشی نہیں ہونے چاہئے تھے۔

"سازِ خودی کی صدائے شکست" نظم بھی بہت بلند پایہ نظم ہے۔ اگر اس نظم کا انتخاب سختی سے ہوتا تو اور بھی بلند پایہ ہو جاتی۔ جابجا نیتھو کی مصوری دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ بدذوقی لطیفی جیسے خوش مذاق شاعر نے کیونکر گوارا کی۔ میرے خیال میں اس فردوس میں یہ گلدستہ ہائے بے رنگ ہرگز نہ ہونے چاہئے تھے یاد رکھئے شعر و شاعری کی مجلدات میں با انتہائے سادگی سے کام لینا چاہئے با کمال رنگینی سے یہی وہ مقام ہے جہاں اعتدال جرم ہے۔

"سلام کہدینا" کے عنوان سے جو نظم صفحہ ۲۸ پر درج ہے وہ اچھی نظم ہے لیکن اس کا عدم کتاب کے وجود کے لئے بہتر تھا۔ ناتمام غزل کا یہ شعر کہ ؎

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں — اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا

خوب شعر ہے، یہ صحیح شاعری ہے۔ "جدائی" کے عنوان کے ماتحت جو نثر کا ایک شذرہ ہے وہ "نظمِ ماقبل نظم" کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا خوب ہے ؎

کسی کو آہ میں جی بھر کے پیار کر نہ سکا — مرے شباب کو تسکیں کی جستجو ہی رہی

بہت ہی لطیف چھینٹا ہے، اور تشنگی شباب کی کیسی بہتر تعبیر ہے۔
یہ نظم نفسیاتِ فراق کے لحاظ سے برمحل ختم ہوئی ہے آخری شعر بہت ہی پاگل کر دینے والا ہے

مرا وجود کہیں، دل کہیں، خیال کہیں — مری طرح نہ ہو غربت سے آشنا کوئی

"پریشانی خواب" کے متعلق جو دو سطریں اختر صاحب شیرانی نے لکھی ہیں بہت روشن اور کیف آور ہیں لیکن یہاں نظم کے ساتھ ان کا شائع ہونا برمحل نہیں ہے۔ نظم بجائے خود

بہت بہتر ہے اور خصوصاً اُس کا یہ بند بہت ہی جذباتی ہے۔

جو چین تیرے تصور کی گود میں پائے
ترے خیال کے جھولے میں جسکو نیند آئے
وہ تاب بر ہمیٔ خواب کس طرح لائے؟
ترا خیال جب اس بے نوا سے چھن جائے

"مہ مبین" کے عنوان سے ایک مختصر سی نظم میں لطیفی نے کئی نشتر بھر دئے ہیں گو پہلا مصرعہ میری فہم سے بلند ہے مگر دوسرا مصرعہ ؎

پری تراش، وصنم ساز وبت گرے مبین

بجائے خود ایک آفت ہے "مجھے بھول جاؤ" کے عنوان سے صفحہ ۶۴ پر بڑی مؤثر نظم ہے جس کی زبان وخیال میں یکسانیت ہے اس نظم میں شاعر لطیف جذبات نگاری میں کامیاب ہوا ہے۔ نظم سادہ ہے شیریں ہے مؤثر ہے اور اُس جذباتی انقلاب کا ہلکا سا پتہ دیتی ہے جو برسوں کے بعد اُردو شاعری میں پیدا ہوا ہے ہم اس انقلاب کو انقلاب "روحانی" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اسلوب نظم نظیر کا ہے اور سوزِ لطیف کی ہلکی چنگاری میر جیسی ہے۔

انتقاد کے وقت بہ حیثیت ایک نقاد کے صرف الفاظ تراکیب وزبان ومحاورات کے محاسن ومعیوب کو نہیں دیکھنا چاہئے' ایک شاعر کے کلامِ منظوم پر انتقاد کی اولین منزل یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ دماغ سے شعر کہتا ہے یا دل اور روح سے اور شعرا میں زیادہ افراد ایسے ہیں جو محض دماغی طور پر شاعر ہیں انکی وجہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد ہی غلط پڑتی ہے۔ یہ لوگ مشاعروں اور ان کی ہوحق کو شاعری کا آغاز وانجام یقین کرتے ہیں اور اُن لوگوں کی طرف دوڑتے ہیں جو بذاتِ خود غلط بنیاد ہوتے ہیں لیکن تیس چالیس سال کی مشاقی جن کو الفاظ سے کھیلنے میں مشّاق کر دیتی ہے چنانچہ بغیر یہ معلوم کئے کہ قدرت نے ہم کو شاعر بنایا ہے یا نہیں یہ گمراہ شوق ایک عمر غلط جادہ پہ سفر کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ مشاعروں میں غزلوں کی کامیابی ہی میں معراجِ شاعری کا راز ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ صحیح شاعر بننے کے لئے مطالعۂ فطرت کی اور تزکیۂ روح دل کی ضرورت ہے

جب تک دل کی آنکھیں نہیں کھلتیں کوئی شخص شاعری کے امکاں بوس عرش کے پایوں تک کو بھی نہیں پہنچ سکتا اور جب تک روح لذیذ ادر فکر جواں نہیں ہو جاتی کوئی طاقت مادرزاد شاعر کو بھی ترقی کے معراج تک نہیں پہنچا سکتی۔

میں ابھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ لطیفیات اغلاط ونقائص سے پاک ہے، لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ لطیفی دل سے شعر کہتا ہے۔ (باقی۔ باقی)

مندرجۂ ذیل کتابیں اور رسائل دفتر "ایشیا" میں وصول ہو چکے ہیں جن پر آئندہ ماہ سے مسلسل اظہارِ رائے کیا جائیگا۔

(۱) لطیفیات
(۲) فروغِ اُردو
(۳) قصیدہ شیخ فریدالدین عطار
(۴) بہارکی بھکارن
(۵) صدائے ماہر
(۶) صراطِ مستقیم
(۷) طبّی چٹکلے
(۸) خطبۂ مبارکہ (فارسی)
(۹) خطابۂ معجز نمائے (فارسی)
(۱۰) خطابۂ لطیفہ در لزوم عناصر عفیفہ (فارسی)
(۱۱) خطبۂ آقائے حاج میرزا محمد رحیم ثقۃ الاسلام (فارسی)
(۱۲) مثنوی گلزارِ علم
(۱۳) روحِ رواں
(۱۴) منتخباتِ ہندی کلام (۱۵) گہرستان

(رسائل)

دین ودنیا۔ شاہکار۔ عارف۔ رنگ بھومی (ہندی)۔ ادبی دنیا۔ تیج دہلی۔ دورِ جدید سالنامہ نیرنگِ خیال۔ سالنامہ ادبی دُنیا۔ مستورات۔ انتخاب۔ ماہر۔ قلم لالہٗ مغفرت لیلےٰ۔ نیرنگستان۔

ان رسائل اور کتب کے علاوہ میرا ارادہ ہے کہ میں بشرطِ فرصت اُن جائزیہ رسائل کے متعلق بھی اظہارِ خیال کروں جو ایک مدت سے ادبِ اُردو کی خدمت کر رہے ہیں اور یہ دکھاؤں کہ وہ اپنی مساعی واعمال کے لحاظ سے رجعت کر چکے ہیں یا ترقی۔

ساغر نظامی

پیغامِ شباب

اے پیچ و تابِ ہستی کب تک؟
ہستی کی بلندی میں یہ پستی کب تک؟
مشرق سے وہ گلابی سی آگ اترتی ہے
ہنگامِ صبوحی میں یہ مستی کب تک؟

ہشیار! کہ ہمت کا نہ دامن چھوٹے
ہم سنگِ گراں بار کو پانی سمجھو
طوفانِ حوادث کو کہانی سمجھو
چڑھتے ہوئے دریا کو روانی سمجھو

از
مظفر حسین شمیم

ادبستانِ ایشیا کی ایک عظیم الشان تصنیف

بادۂ مشرق

جس کی تیاری و تکمیل میں ہندوستان کے عظیم المرتبت امراء اور قائدین نے محبّت اور فیاضی سے حصہ لیا

اور جس کو امریکہ و ہندوستان کے ماہرِ فن
مصوروں نے اپنے کمالِ فن سے مُرقّع کیا

حضرتِ اشرف نواب میر یوسف علی خان بہادر سر سالار جنگ ثالث

انتسابِ جلیل

بنامِ اقدس امیر الامراء عالیجناب نواب میر یوسف علی خان بہادر سر سالار جنگ ثالث ادام اللہ اقبالہٗ

۴۲

ہمارے ممدوح امیر الامراء جناب نواب میر یوسف علی خان بہادر سر سالار جنگ ثالث نہ صرف مادّی لحاظ سے بلکہ اپنی روحانی منزلت و بزرگی خاندانی عظمت و تقدیس اور ادبی و علمی تبحّر کے لحاظ سے بھی امیر کبیر ہیں، آپ کے رفیع الشان خاندان کا سلسلہ حضرت اویس قرنیؓ سے ملتا ہے آپ کی دسویں پشت میں اویسؒ ثانی تھے جو مدینہ منورہ میں اوقاف کے متولی تھے اور جو علی عادل شاہ والیٔ بیجاپور کے زمانے میں ہندوستان میں اپنے فرزند محمد علی کے ساتھ وارد ہوئے اور ہندوستان ہی میں سکونت اختیار کر لی۔

سلطنتِ عالیہ دکن میں یہ خاندان اپنی قدامت اور عظمت، شجاعت علمی تبحّر اور دولت و ثروت کے لحاظ سے ممتاز ترین خاندان خیال کیا جاتا ہے اور تاریخ دکن کا صفحہ صفحہ اس کے ذکر مبارک سے منور ہے جو اعزاز و اکرام اس عظیم القدر خاندان کو ریاستِ ابد قیام دکن میں حاصل ہے وہ دوسروں کو کم نصیب ہے۔

نواب میر یوسف علی خاں سر سالار جنگ بہادر ثالث سابق مدار المہام منیر الدولہ عماد السلطنة نواب میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی مرحوم کے اکلوتے فرزند

"ایشیا" میرٹھ

جولائی ۱۹۳۵ء

اد۔ منیر الملک غیور جنگ شجاع الدولہ نواب میر سعادت علی خاں مرحوم کے حقیقی بھتیجے اور مختار الملک میر تراب علی خاں سر سالار جنگ اول جی۔سی۔ ایس آئی سابق مدار المہام کے پوتے ہیں اور آپ عالی شان سالار جنگی خاندان و خانوادہ درگاہ قلی خان کے چشم و چراغ ہیں جن کی ضیا سے آج سرزمینِ دکن کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

ولادت

آپ کی ولادت مبارک دکن میں ۴ جون ۱۸۸۹ء مطابق یوم جمعہ ۱۴ شوال المکرم ۱۳۰۶ھ (۶ امرداد ۱۲۹۸ف) کو ہوئی

تعلیم و تربیت

ایک ماہ کے بعد ہی آپ کے عم بزرگوار کا وصال ہو گیا اس لئے حضور نظام (غفران مکان) نے آپ کی تربیت و تعلیم پر بطور خاص توجہ فرمائی ۱۳۱۶ھ میں بہ تقریب جشن سالگرہ مبارک اعلیٰ حضرت حضور غفران مکان نے آپ کو خطاب خان بہادری و سالار جنگی ثالث و منصب دو ہزار و پانصد سوار و علم و نقارہ

عطائے منصب و اعزاز

کے عطائے منصب و اعزاز سے سرفراز فرمایا آپ نے دکن کے لائق ترین مغربی و مشرقی استادوں سے اکتسابِ علوم کیا اور مدرسہ عالیہ میں شریک ہو کر اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم حاصل کی علوم

ماہر علوم و السنہ شرقیہ و غربیہ

مشرقی و مغربی میں آپ مہارتِ تامہ رکھتے ہیں اردو فارسی عربی انگریزی اور فرانسیسی زبان میں اہل زبان کی طرح بات چیت فرماتے ہیں، اور ہر زبان میں آپ کی تحریر و تقریر بے حد دلچسپ اور گہر بار ہوتی ہے۔ ہر زبان کے ادب سے آپ کو بطور

علمی و ادبی ذوق

خاص دلچسپی ہے اور آپ کا علمی و ادبی ذوق نہایت بلند و ممتاز ہے مگر اردو و فارسی ادب سے آپ کو خاص طور پر دلچسپی ہے، ہندوستان کے سینکڑوں ادیبوں اور شعراء کی سرپرستی فرماتے ہیں، سچ یہ ہے

علم پرستی و ادب نوازی

کہ علوم پرستی اور فنون نوازی کا ذوق آپ کو ورثہ میں ملا ہے اور اس ورثہ کو آپ نے حفاظت سے محفوظ رکھا ہے، سخن فہمی میں آپ اپنی نظیر آپ ہی ہیں، میں نے ہندوستان کا گوشہ گوشہ

فنون لطیفہ کا نقادِ اکبر

چھانا ہے اور اُن بہترین مراکز کو دیکھا ہے جہاں ہندوستان قدیم اور ایشیائے دیرین کے علوم اور فنون لطیفہ کے بہترین شاہکار جمع تھے لیکن جس قدر منتخب و عظیم الشان خزینہ قدیم قلمی نسخوں اور تصاویر و بتوں کا نواب سر سالار جنگ بہادر کے پاس ہے اس نیلگوں آسمان کے نیچے میری نگاہ سے نہیں گزرا بارہا حضورِ انور کی معیت کا شرف مجھ کو حاصل ہوا ہے۔ اور ایسے مواقع پر بھی میں شریک رہا ہوں جب نواب صاحب تصاویر اور قدیم قلمی نسخوں کی خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ میں نے معلوم کیا کہ وہ ایشیائی آرٹ کے اس قدر زبردست نقاد ہیں کہ مصور کا کوئی خط ان کی نگاہ سے اپنی کم سوادی و کم نقشی کو محفوظ نہیں رکھ سکتا اُن کی نگاہ حسن کی نکتہ چینی اور نقص کی گرفت میں کبھی تکلف نہیں کرتی، شعر و ادب کا مطالعہ بھی نہایت وسیع ہے۔ ہر مذہب، شاعری اور اس کے متعلقات سے بخوبی واقف ہونے اور انسانی نفسیات کے ماہر ہونے کی وجہ سے شاعر کے جذبہ و خیال کی گہرائیوں میں سانس لینے والے مفہوم کی تپش کو محسوس فرما لیتے ہیں

اجنٹا کے طلسمی غاروں کا مالک

قدرت نے ان کو پیدائشی آرٹسٹ، آرٹ کا پجاری بنا کر دنیا میں پیدا کیا ہے۔ عجائبات عالم میں سے ایک عجیب یادگار کے وہ مالک ہیں گویا اجنٹا کے طلسمی غاروں کے بادشاہ ہیں۔ یہ کانیں اور حیرتناک غار آپ کی جاگیر میں واقع ہیں اور آپ کی جاگیر کا رقبہ (۱۴۸۰) مربع میل ہے۔ یعنی ہز ہائینس مہاراجہ پٹیالہ کی ریاست کے برابر ہے جاگیر کی آبادی ۱۹۱۱ء میں دو لاکھ اور کئی ہزار تھی، علاقہ مقبوضہ میں کئی عدالتیں اور جیل ہیں محض جاگیر کی سالانہ آمدنی بارہ لاکھ پچاس ہزار ہے۔ آپ سلطنتِ دکن کے اُن جاگیرداروں میں ہیں جنہیں فوجی عدالتی اور کوتوالی کے کامل اختیارات حاصل ہیں۔

سلطنت عالیہ دکن کی مدار المہامی

۱۹۱۲ء میں راجہ راجایان ہز ایکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ کے رخصت کے سلسلے میں تین سال کے لئے آپ عارضی مدار المہام مقرر ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے آپ کو مستقل مدار المہام مقرر فرما کر ایک لاکھ کا گراں بہا خلعت عطا فرما کر عظیم الشان اعزاز و منصب بخشا۔

عراق و عرب و ایران اور یورپ کی سیاحت

دسمبر ۱۹۱۴ء میں سرکار والا نے چھ ماہ کی رخصت لے کر خدمتِ متعلقہ سے علیحدگی اختیار کی اور عرب و ایران اور یورپ کے تمام شہروں کی سیاحت فرمائی۔ اور گو یہ سیاحت محض تفریحی حیثیت رکھتی تھی لیکن دنیا کی اس سیر سے جو عظیم الشان معلومات آپ نے حاصل فرمائیں وہ بجائے خود ایک زبردست ذوق اکتساب کی دلیل ہیں

عراق و عرب و ایران بیروت و شام و بیت المقدس کی سیاحت

۱۳۴۸ھ میں عراق و عرب، مصر و شام بیروت و بیت المقدس اور ایران کا سفر فرمایا اور زیارتِ ائمہ علیہم السلام سے مشرف ہوئے اس کے علاوہ تین مرتبہ یورپ کا سفر بھی فرمایا۔ ان سفروں نے آپ کے مشاہدہ اور عرفان کو وسیع تر کر دیا۔

اخلاق و محاسن کی رفعت

جس شخص نے اس امیر محترم کو دیکھا ہے اور ان ساغر صفت آنکھوں کو بھی دیکھا ہے جن میں اسلاف کی روح شرافت اور جلال کی بجلیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ سلیم الطبعی، فیاضی، سیر چشمی، دریا دلی، شرافت، شریف پروری، کرم گستری، الوالعزمی، عالی ہمتی اور عام جذبۂ سخاوت کا بہت قدیم اور گہرا تعلق سالار جنگ بہادر (ثالث) کی ذات اقدس سے ہے: ان کے ہاتھ اتنے ہی کشادہ ہیں اور دل اتنا ہی فراخ ہے جتنا ان کے اسلاف کا تھا۔ ان کے اطوار و اعمال میں وہی بلندی و رفعت اور مشرقی شان پائی جاتی ہے جو امرائے قدیم کا طرۂ امتیاز تھی۔ ان کی زندگی میں مغربیت کے تمام عناصر شامل ہیں لیکن ان کی روح خالص طور پر مشرقی ہے اخلاق و اطوار مشرقی ہیں اور وہ سرتا پا ایک "آئیڈیل مشرقی انسان" ہیں۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن سے متاثر ہو کر عقیدت نے اپنی عمرِ شباب کا حاصل اس یوسفِ دکن کے نام منتسب کیا ہے اور اس انتساب پر مصنف کو تمام عمر ناز و افتخار رہیگا۔

ساغر نظامی

زعیم قوم پرور عالیجناب سیّد المحترم ڈاکٹر سیّد محمود مدظلہ العالی

ایم، اے، پی، ایچ ڈی، بار ایٹ لا

ڈاکٹر سید محمود جو اپنی بے لوثی، اخلاص، اور انسانیت کے اعلیٰ ترین جذبات کے سلسلے میں تمام ہندوستان میں شہرت رکھتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں قربانی، دردِ قومی، اخوتِ انسانی اور اسلامی رواداری کے حقیقی مجسمے ہیں، سادہ مزاج، رنجیدہ و مہذب۔ شہرت و نمائش سے ان کو حیرتناک طور پر بُعد ہے۔ استغنا استغنا ان کی دولت و راحت ہے ان کی ملاقات کے بعد انسان کو اپنی پوشیدہ ترین خامیوں کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ ہر شخص کے لئے ایک خاموش رہبر ہیں۔ ان کا علمی و ادبی ذوق نہایت پختہ و مکمل ہے۔ اس قحط کے زمانے میں وہ ایک راسخ اور صادق محب وطن ہیں اور ہندوستان و اسلام سے زیادہ کوئی چیز ان کو عزیز نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب دبستانِ ایشیا کی اس نادر تصنیف کی اشاعت کے سلسلے میں سب سے زیادہ اظہار احسان مندی کے حقدار ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کی وہ ذات گرامی ہے جس نے اس عمارت کی اولیں بنیاد رکھی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب اُن کے خلوص ہی کی برکت ہے کہ "باغِ مشرق" ایسی اہم کتاب تیار ہو کر ہندوستان کی ادبی فضاؤں میں داد و تحسین کا خراج حاصل کر رہی ہے، ورنہ جہاں تک غریب مصنف کا تعلق ہے یہ "جوئے شیر" لانا اُس شکستہ بازو کو ہکن کا کام نہیں تھا۔

اگر ڈاکٹر صاحب قبلہ سیاسی دُنیا میں مدآئے ہوتے تو وہ ہندوستان کے ادبی حلقوں کے بھی سرتاج ہوتے لیکن آج بھی ڈاکٹر صاحب کی اُن ادبی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جو اپنا خاص درجہ رکھتی ہیں۔

آپ کی مشہور تصانیف میں "خلافت اور انگلستان" انگریزی اُردو میں مسئلہ خلافت پر تاریخی و مذہبی و سیاسی غرضکہ ہر لحاظ سے ایک جامع ترین کتاب ہے۔ مطبوعہ تصانیف کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی بہت سی تصانیف شائع ہونے کے لئے محفوظ ہیں جو انشاءاللہ ادبی مرکز کی طرف سے شائع کی جائیں گی۔

ان تصانیف میں سے بعض اپنے مقاصد کے لحاظ سے بہت اونچی ہیں۔ مثلاً ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں جن ذہنی اور نفسیاتی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ڈاکٹر محمود نے اپنی ایک معرکۃ الآرا تصنیف میں اظہارِ خیال فرمایا ہے وہ بالکل انوکھا اور عجیب ہے۔

اس کے علاوہ آپ کی ایک تاریخی تالیف "شاہانِ مغلیہ کے عہد میں ہندو مسلم تعلقات" اپنی نوعیت کی زبردست کتاب ہے۔

تکمیل ہو جانے پر ڈاکٹر صاحب کی اجازت پر وہ کتاب بھی ادبی مرکز اپنی طرف سے شائع کرے گا۔

رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو بار ایٹ لا بہ القابہ

صدر ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد

ہندوستان میں بہت کم شخصیتیں ایسی ہیں جن کو ظاہری و باطنی دونوں حیثیتوں سے سچا ہندوستانی کہا جا سکے لیکن ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو حقیقی طور پر ایک سچے ہندوستانی ہیں جو مذہب، فرقہ اور سیاسی مصلحتوں سے آزاد ہو کر ایک آئیڈیل انسان ہیں ان کا دل ہر قوم کے لئے کھلا ہوا ہے اور ان کی ذاتِ گرامی ان پست تعصبات سے بہت اونچی ہے۔

آج وہ ہندوستان کی متحدہ تہذیب و روایات کی بزم قدیم کی آخری شمع ہیں جن کے بعد تاریکی ہی تاریکی ہے۔ اُن کی ذات ہندوستان میں اسلاف کی بزرگی و جامعیت کی ایک زندہ مثال ہے ادبیاتِ مشرق پر آنریبل سر تیج بہادر سپرو بہ القابہ کے جس قدر احسانات ہیں اور خصوصاً اردو ادب کی آبیاری آپ نے جس فراخ حوصلگی و اخلاص کے ساتھ فرمائی ہے۔ وہ آپ کو ادب اردو کی

کے آسمان پر آفتاب نیم روز کی طرح تاباں و روشن رکھے گی اور امتداد کبھی اس کی شعاعوں کے نور کو کم کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ جہاں تک قانونی قابلیت اور سیاسی اہلیت کا تعلق ہے ایک عالم رطب اللسان ہے لیکن آپ کی مسلمہ ادبی قابلیت و ذہانت سیاست و قانون دانی سے بالکل علیحدہ چیز ہے اور یہی وہ شے ہے جو آپ کو ایک ادبی

انسان کا درجہ عطا فرماتی ہے آپ ایک نہایت مہذب ہنس مکھ اور شریف الطبع انسان ہیں ——— "بادۂ مشرق" کے آغاز کار کا سہرا اسی ذاتِ اقدس کے سر ہے جس کے انتہا احسانات دنیائے ادب پر ہیں۔

بلبلِ ہند محترمہ مسز سروجنی دیوی (نائیڈو)

بلبلِ ہند مسز سروجنی دیوی جو عالمگیر شاعرانہ و ادیبانہ شہرت کی مالکہ ہیں اپنے اخلاق و محاسنِ طبعی کے لحاظ سے بھی دنیا کی اُن چند خواتین میں سے ایک کہی جاسکتی ہیں جن کا معصوم و سفیریں قلب انسانیت کے پاکیزہ جذبات سے لبریز ہے۔ اس فرقہ پرستی اور آپا دھاپی کے زمانے میں وہ محبت اور انسانیت کی حقیقی "دیوی" ہیں انکا دل دنیا کے ہر آرٹسٹ اور اہل فن کے لئے یکساں طور پر فراخ اور وسیع ہے۔ وہ ایک صادق اور شریف دل خاتون ہیں اور خود ایک زبردست شاعرہ ہیں اس لئے وہ ہر آرٹسٹ اور شاعر کی روح کی عظمت اور اہل فن کی شخصیت کی اہمیت کا بآسانی اندازہ لگا لیتی ہیں۔ اُن کی ترکیب میں قومی یا فنی عصبیت کا ایک شمہ بھی نہیں۔ بلکہ ان کی تخمیر محبت، خلوص، احسان فرمائی، پرستشِ فن اور تبسم و ترنم کے اجزاء و عناصر سے ہوئی ہے۔ انگریزی زبان کی اس محترمہ بنگالی شاعرہ کی فطرت کی بلندی دیکھنے کے بعد اردو زبان کے شعراء اور ان کی سیرت کی رذالتوں پر حیرت ہو سکتی ہے اور شاید بدی نفرت بھی جن کی ترکیب حسد، غیبت ——— محسن کشی، اور جنگ و نفرت کے اجزاء سے ہوئی ہے جن کے آرٹ کی روحانیت کا منتہا صرف یہ ہے کہ ایک دوسرے سے آپس میں حسد کریں اور جلتے جلاتے رہیں مگر سروجنی کی روح ایشیا کی اس مقدس ترین ہستی کی روح اپنے ہم فن اور ہم ذوق افراد کے لئے بغیر فرقہ و مذہب کے خیال کے محبت و رافت کے کیف سے یکساں طور پر سرشار ہے۔ اور وہ حقیقی طور پر ہندو و مسلم اتحاد کا ایک ملیح و حسین پرچم ہے جو ابد الاباد تک آزادیٔ ہند کی مضبوط چٹانوں پر قائم ہو کر لہراتا رہیگا اور آنے والی قوم اسکے سایہ میں سجدہ ریز ہو کر سروجنی کے قدموں کو بوسہ دے گی۔

وسیع براعظم ایشیا کے ایک تاریخی ملک ہندوستان سے بلند ہونے والی اس آواز کو جو پُر کیف زندگی کا پیام ہے اور جو ہندوستان کے کلچر، ہندوستان کی تہذیب اور ہندوستان

جنہوں نے "بادۂ مشرق" کی طباعت کیلئے بھی بیش بہا مالی امداد فرمائی

کی غلامی کے خلاف اک احتجاج ہے سب سے زیادہ طاقت پرواز اگر بخشتی ہے تو وہ "عندلیبِ شکستہ پر" کی نغمہ ریز مصنفہ نے جو چمنستان ہند کی ایک لالہ نفس بلبل ہے اور جس کے نغمات اور جھونکوں سے نہ صرف ہندوستان کی فضائیں جھوم رہی ہیں۔ بلکہ ساری کائنات مست ہو گئی ہے۔

برادرِ محترم سیٹھ محمد علی نیار رئیس بمبئی

سیٹھ محمد علی نیار (بمبئی کے نیشلسٹ لیڈر اور رئیس)
جنہوں نے بادۂ مشرق کی تکمیل میں گرانقدر مالی امداد دی۔

یہ باب المند بمبئی کے ایک مخلص ترین انسان ہیں اور طاقتور عملی شخصیت کے مالک ہیں۔ بمبئی کی کوئی جماعت ایسی نہیں جس کو محمد علی کی ہمدردیوں کی ضرورت نہ ہو۔ ایک شریف اور دیوانۂ محبت اور مخلص شخص ہے اور جو ہندوستان و اسلام کی محبت میں سرشار ہے جس کا قلب آزادی اور محبتِ الٰہی سے مست ہے جو ہر لحاظ سے دُنیا میں مسلمانوں کو باعلم، باعزت آزادی پرست، ذی علم ذی ہنر اور ذی مرتبت دیکھنا چاہتا ہے جو ہر وقت ہندوستان کو آزاد دیکھنے کے لئے بے تاب ہے اور جو آزادی پسند جماعتوں کا خادم ہو کر مخدوم ہے۔ جو خود امّی ہے لیکن جس کا دل علم و ادب کی پرستاری اور نوازش کے جذبے سے لبریز ہے جو لوگ محمد علی کو جانتے ہیں اُن کو معلوم ہے کہ وہ بمبئی میں ایک آہنی طاقت کا مالک ہے اس آہنی طاقت کا مالک ہے جو دیوانگیٔ عمل محبت اور سچائی کی عناصر سے مرکب ہوتی ہے

(باقی۔باقی)

نوائے راز

(از ابوالفاضل رازؔ چاندپوری)

اب وہ اگلا سا دل پر جوش نہیں ۔۔۔ بادہ نوشی بقدرِ ہوش نہیں
مطمئن ہوں بدورِ مجلسِ حال ۔۔۔ فکرِ فردا و رنجِ دوش نہیں
لطفِ ساقی ہے ضامنِ انجام ۔۔۔ اب مجھے فکرِ نائے و نوش نہیں
ملکِ فقر و فنا ہے ویرانہ ۔۔۔ شہریارِ گلیم پوش نہیں
مدرسے میں ہے دورۂ من و تو ۔۔۔ کیا یہاں کوئی مے فروش نہیں
قصہ خوانِ رموزِ کیف و کم! ۔۔۔ خود فروشی دلیل ہوش نہیں
کفر و ایماں کا امتیاز بجا ۔۔۔ رند مشرب ہوں، سخت کوش نہیں

کیا کہا اے حریفِ نکتہ سرا
رازؔ خود بیں ہے، حق نیوش نہیں؟

"مطبوعاتِ ادبی مرکز"

حضرت ساغر نظامی — "صبوحی"

ہندوستان کے مشہور اور پختہ کار شاعر و ادیب حضرت ساغر نظامی کے چند چیدہ اور منتخب غزلوں کا حسین اور خوبصورت مجموعہ جو کئی ہزار کی تعداد میں شائع ہوا تھا اور ایک سال کے اندر ہی ختم ہوگیا۔ قیمت محض ۸ر علاوہ محصول۔

"کہکشاں"

حضرتِ ساغر نظامی جس طرح نظم پر قادر ہیں اور فنِ شعر میں ایک صاحبِ طرز کی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح نثر نگاری پر بھی ان کو مہارتِ تامہ حاصل ہے۔ کہکشاں ان کے ۲۱ افسانوں کا ضخیم مجموعہ ہے جو بہترین ادبِ لطیف پیش کرتا ہے۔ کہکشاں میں آرٹ اور رطنزیات کا وہ لطیف سنگم ہوا ہے جو کسی دوسری کتاب میں نہیں پایا جاتا' زبان کی شوخی اور مستی حرف حرف میں کارفرما ہے سوسائٹی اور حالاتِ حاضرہ پر افسانوی انداز میں گہری تنقید پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کسی حیطۂ محدود میں گردش کرنے والا نہیں ہے بلکہ اس کا دل زندگی کی تمام چھوٹی بڑی باتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ کتابت وطباعت خوبصورت جلد مضبوط' سرورق سہ رنگا' قیمت مجلد عہ (علاوہ محصول غیر مجلد عاصہ

مہاتما رسکن

انگلستان کے مشہور ریفارمر جان رسکن کی مختصر لیکن مکمل سوانحعمری' بچوں اور طلباء کے لئے مفید و کارآمد قیمت صرف ۴ر

طلوع

پنجاب کے ایک نوجوان شاعر ضیا فتح آبادی بی اے کے قطعات کا مجموعہ ...... جو اُن کے مہذب خیالات کا آئینہ ہے' قیمت صرف ۶ر

بھکارن اور پجارن

حضرت ساغر نظامی کی دو شاہکار نظمیں جو ادبی مرکز کی کتابیں منگانے والوں کو مفت ارسال کی جاتی ہیں۔

بادۂ مشرق

اُردو ادب میں ہر لحاظ سے حیرت انگیز کتاب جو اپنے حسنِ ظاہری کے لحاظ سے موجودہ نظم کی کتابوں میں ناقابلِ مقابلہ ہے' جس کے ۶۰۰ صفحات میں تفکر' تاثر' تغزل' وجدان وکیف' قومیت و اسلامیت کی روح کارفرما ہے اور پیغمبرِ اسلام کے علاوہ رام چندر جی' کرشن' مہاتما گوتم بدھ اور اکثر اسلامی و ہندوستانی قائدین پر ایسی نظمیں اس کتاب میں پائی جاتی ہیں جو اتحادِ اقوام کا سبب بننے کی طاقت رکھتی ہیں' شباب' آزادی' مسرت اور زندگی کا ایک متواج سمندر بادۂ مشرق کے صفحات میں موجیں مارتا ہے آپ ملاحظہ کرینگے تو اعتراف فرمائیں گے کہ ساغر نے اپنی اس کتاب سے ایشیا کی عظمت کو دوبالا کر دیا ہے بادۂ مشرق "اُردو شاعری میں عقیدہ' زبان' خیال اور اپنے پیغام کے لحاظ سے اولین کتاب ہے۔ یہ دُنیا کی چار زبانوں اُردو' ہندی' گجراتی اور انگریزی میں شائع ہوئی ہے اُردو ایڈیشن کی قیمت مجلد صہ علاوہ محصول' غیر مجلد للعہ

دیگر انشا پردازوں کے شاہکار

امام الہند علامہ ابوالکلام آزاد — "خونِ شہادت کے دو قطرے"

یہ مختصر رسالہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے عالمِ جوانی کا شاہکار ہے جو منصور و سرمدؔ کے پُرخروش و مستند حالات پر مشتمل ہے اول تو موضوع ہی اپنی جگہ بہت پُرخروش ہے اس پر مولانا آزاد کی پُرجوش ادبیت پڑھتے پڑھتے انسان جھوم جاتا ہے۔ قیمت صرف ۴ر علاوہ محصول

مولوی عبدالباری آسی — "تذکرۂ خندۂ گل"

کون ہے جو مولوی عبدالباری آسی الدنی کی ذات سے ناواقف ہو' آپ ہندوستان کے مشہور ادیب ہیں' یہ تذکرہ آپ ہی کی کاوشِ ترتیب کا نتیجہ ہے۔ جو اُردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات و منتخب کلام پر مشتمل ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تذکرہ اُردو زبان میں سب سے پہلی اور نئی چیز ہے۔ شیدایانِ ادب کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے قیمت للعہ علاوہ محصول۔

سید مقبول احمد بی اے — "فلسفۂ مذہب"

سید مقبول احمد صاحب کی یہ کتاب مذہب اور اس کے متعلقات پر غیر ملّایانہ نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہے اس کتاب میں مذہب اور اخلاق کی تشریح جدید اور ارتقائی نقطۂ نگاہ سے کی گئی ہے ہر معاملہ کو عقلی طور پر سمجھایا گیا ہے' مطالعہ کے قابل کتاب ہے اور بہت فلسفیانہ طور پر تحریر کی گئی ہے قیمت عہ ر علاوہ محصول

مفتی مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی — تعلیم الاسلام (ہر چہار حصہ)

اسلامی تعلیم کے متعلق یہ مختصر ترین رسالے ہیں' جو مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی مدظلہ کے زورِ قلم کا

تیسرے حصہ میں مذہبیات میں مفتی صاحب کی شخصیت جس قدر بلند ہے اس کا ذکر لا حاصل ہے، لیکن بطور خاص یہ رسالے اپنے اندر بہت کچھ رکھتے ہیں سب سے پہلے حصہ میں "تعلیم الایمان یا اسلامی عقائد" کے عنوان سے اسلام کی بنیادی بحث ہے جس کے سلسلے میں عقیدہ ملائکہ، صحائف رسول و رسالت، قیامت تقدیر، حیات بعد الموت، دوسرے شعبے میں "تعلیم الارکان یا اسلامی اعمال" کے ماتحت، نماز، وضو، غسل، مسح اور اس کی تسمیہ، نجاستِ حقیقہ، استنجی، پانی کنویں وغیرہ کا بیان ہے تیسرے رسالے میں "تعلیم الایمان یا اسلامی عقائد" کے ماتحت توحید، فرشتے، صحائفِ الٰہی، رسالت، صحابہ کرام، ولایت اور اولیاء اللہ، معجزہ اور کرامت کا بیان ہے اسی حصے کے دوسرے شعبہ میں "تعلیم الارکان یا اسلامی اعمال" کے ماتحت وضو کے باقی مسائل، فرائضِ وضو کے باقی مسائل، سنن وضو کے باقی مسائل، مستحباتِ وضو، نواقضِ وضو، غسل کے باقی مسائل، موزوں پر مسح کے باقی مسائل۔ نجاستِ حقیقہ اور اس کی طہارت کے باقی مسائل استنجے کے باقی مسائل، پانی اور کنوئیں کے باقی مسائل، بیان تیمم، نماز کی دوسری شرط، نماز کی تیسری شرط نماز کی چوتھی اور پانچویں وچھٹی و ساتویں شرط، اذان کا بیان، نماز کے ارکان تکبیر تحریمہ، قیام، قرأت، رکوع، سجدہ، قعدہ آخر، واجباتِ نماز، سنت، مستحبات اور نماز پڑھنے کی پوری ترکیب کا مکمل بیان ہے۔ غرضکہ ایک مسلمان کے لئے ان تینوں رسالوں میں اسلامی معلومات کا پورا سامان ہے ہر مسلمان کو اس کی خریداری کرنی چاہئے۔ قیمت ہر حصہ مع محصول ۱۴؍

حاجی عبدالمجید صاحب کاتب

"خریطۂ نعت"

یہ ردیف وار نعتیہ دیوان ہے جو مولانا کاتب کی تصنیف ہے، اس مختصر دیوان کو پڑھکر محبتِ رسولؐ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کو اسے خریدنا چاہئے، چیدہ نعتیہ کلام کا یہ بہترین مجموعہ ہے، قیمت مع محصول ۸؍

مولانا نیاز فتحپوری مدیر نگار

"ایک شاعر کا انجام"

حضرت نیاز فتحپوری ہندوستان کی ان ہنگامہ خیز ہستیوں میں سے ہیں، جن کی ہستی اردو ادب کی جان ہے یہ مختصر افسانہ ان کے عہدِ شباب کا شاہکار ہے، اور اس قدر بلند چیز ہے کہ اب وہ خود بھی چاہیں تو ایسی معرکتہ الآرا کہانی نہیں لکھ سکتے۔ لفظ لفظ میں حرارتِ شباب پائی جاتی ہے۔ قیمت ۱۰؍ علاوہ محصول

فراست الید

یہ مختصر کتاب بھی علامہ نیاز ہی کے دماغ و قلم کا نتیجہ ہے جو علم سمدرک (Palmistry) پر مشتمل ہے جو علامت اور اس کی لکیروں کو دیکھکر ایک انسان کی سیرت اور اس کے ماضی و مستقبل پر حکم لگانے کے علم کو کہتے ہیں۔ اس علم کے متعلق یہ مختصر سی کتاب مکمل معلومات رکھتی ہے۔ (Palmistry) سے ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۸؍

مذاکراتِ نیاز

یہ حضرتِ نیاز کی ڈائری ہے یہ ان ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں نگار میں شائع ہوئے تھے اور جن کو ملک نے بے حد پسند کیا تھا۔ یہ مضامین حضرت نیاز کی ارتقائی انشا کے شاہکار ہیں

جا بجا طنزیات کی گہری مگر مہذب چاشنی پائی جاتی ہے جو حضرتِ نیاز کی انشا پردازی کی خصوصیت ہے، حجم ۱۶۸ صفحات، قیمت ۸؍

جذباتِ بھاشا

اس کتاب میں ہندی دوہوں کو جمع کیا گیا ہے اور ہندی شاعری پر تنقید کی گئی ہے، اور خوب خوب دادِ سخن دی ہے شروع میں خلیقی صاحب دہلوی کا دیباچہ ہے اردو زبان کے لئے بہت ضروری کتاب ہے اور اس کو لکھ کر مولانا نیاز نے اپنی ہندوستانیت کا پورا پورا ثبوت دیا ہے، قیمت ۱۲؍ علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

یہ بھی چند افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں پیروں اور مولویوں کی رعشہ بر اندام کر دینے والی حرکات کا ذکر ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ آج سوسائٹی میں سب سے زیادہ کریہ مخلوق صرف مولوی اور پیر ہے، بہت دلچسپ کتاب ہے، ہر شخص کو دیکھنی چاہئے قیمت علاوہ محصول ۵؍

مادئین کا مذہب

یہ انگریزی سے ترجمہ ہے جس میں "چند گھنٹے حکمائے قدیم کی روحوں کے ساتھ" کے عنوان سے ایک سلوبنیت کے ذریعہ ہیئتِ اجتماعی کے نقائص اور ضرورتِ انقلاب پر دلچسپ تبصرہ ہے، بہت دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۸؍

جمالستان

یہ نگارستان کے بعد حضرت مولانا نیاز کے افسانوں کا دوسرا ضخیم مجموعہ ہے جو تقریباً پانچسو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر افسانہ پڑھنے کے قابل ہے، ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے نیاز کا جو درجہ ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر ادیب و ادب پرست کو جمالستان کا مطالعہ بمنزلہ فرض ہے اس کے مطالعہ سے ہر شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ نیاز اردو کا استونین ہے۔ قیمت للعہ علاوہ محصول

ترغیباتِ جنسی

یہ بھی حضرتِ نیاز کی معرکتہ الآرا تالیف ہے جس میں تاریخی، علمی اور نفسیاتی نقطہ سے انسان کے میلانِ جنسی پر ایک بسیط نظر ڈالی گئی ہے۔ اس موضوع پر اردو میں اس سے قبل کوئی کتاب نہیں دیکھی گئی، فحاشی کی تعریف کے بعد فحاشی کی ابتدا اور اس کے اسباب سے بحث کی گئی ہے اور اس کے بعد پہلے باب میں "شادی" کے عنوان سے اس کے متعلقات سے بحث ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اقوام کے رسم و رواج کو تحریر کیا گیا ہے دوسرے باب میں "طلاق و خلع" کے ماتحت قدیم روم، قدیم ویلز، قدیم چین، قدیم جاپان وغیرہ میں طلاق و خلع کا ذکر کرتے ہوئے دنیا کے تمام بڑے ممالک کے حالیہ طرز طلاق و خلع کو دکھایا گیا ہے اس کے بعد کتاب مندرجہ ذیل ابواب میں تقسیم ہے اور ہر عنوانِ باب کے ماتحت مختلف ضمنی عنوانات ہیں :-

مذہبی فحاشیاں۔ فحاشی پر عمومی تبصرہ۔ استلذاذ بالمثل یعنی عورتیں اور استلذاذ بالمثل۔ استلذاذ بالمثل۔ استلذاذ بالوحوش۔ استلذاذ بالنفس۔ فحاشی عہدِ قدیم میں۔ فحاشی قرونِ وسطیٰ میں۔ عہدِ جدید اور فحاشی۔ اخلاقِ جنسی۔

ان تمام عنوانات کے ماتحت معلومات کی ایک دنیا ہے۔ اس موضوع پر آپ اس کتاب سے بہتر کتاب سارے اردو ادب میں نہیں دکھا سکتے قیمت علاوہ محصول ۸؍ غیر مجلد ہے ؍

سید فرید جعفری مچھلی شہری

"دل کی رانی"

سید فرید جعفری ملک کے اُن نوجوان مگر پختہ کار ادیبوں میں سے ہیں جن کی کتابیں چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں "دل کی رانی" ایک ہریجن کی کہانی" ان ہی کی ایک تصنیف ہے جس میں ایک ہریجن کی بپتا بیان کی گئی ہے جو بہت دردناک ہے زبان لطیف اور آسان ہے قیمت ۴ علاوہ محصول

محبت کے پھول

یہ ایشیا کے شاعر اعظم ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے مشہور و مقبول ڈرامہ "رڈ آلینڈرس" کا آزاد ترجمہ ہے اور فرید صاحب ہی نے اس کو ترجمہ کیا ہے جس کا تعارف نامہ شوکت علی صاحب فہمی نے لکھا ہے اور تقریظ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے قلم سے ہے ٹیگور نے اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کی حریص ذہنیت پر روشنی ڈالی ہے

اور ٹیگور نے اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کی اُن خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے جنہیں عرفِ عام میں سرمایہ کی سرمستیاں اور مزدور طبقہ کی سرفروشیاں اور فاقہ مستیاں کہا جاتا ہے وہ اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کو نہایت بھڑکیلی بنا کر پیش کرتا ہے قیمت علاوہ محصول ۸

ابو الفاضل راز چاند پوری

"دُنیائے راز"

ہندوستان کے کہنہ مشق ادیب اور روشن خیال شاعر حضرت مولانا ابو الفاضل راز چاند پوری کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کا مقدمہ مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر بی اے نے لکھا ہے۔ ساری کتاب سات ابواب میں تقسیم اور ۱۴۶ نظموں پر مشتمل ہے اور اس کی ہر نظم بتاتی ہے کہ راز جدید عہد کا بہترین نمایندہ ہے کتاب نقائص و معائب سے پاک ہے اور نکھری ہوئی لطیف شاعری کو پیش کرتی ہے، ہر شاعر اور شعر و سخن کے دلدادہ کو یہ مجموعہ ضرور دیکھنا چاہئے۔ قیمت ۱۰ علاوہ محصول۔

بشیر ملیح آبادی

حضرت جوش ملیح آبادی کے والد کا دیوان

کلامِ بشیر

ملک کے مشہور و معروف شاعر حضرت جوش ملیح آبادی کے والد کا کلام "کلام بشیر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت فی جلد ۸ علاوہ محصول

نسیم رضوانی

"تہذیبِ عمل"

عملی زندگی کی اصلاح کے لئے چند مفید مقالات کا مجموعہ، یہ اخلاقی کتاب ہے، بچوں اور طلبا کے لئے بے حد مفید ہے، اس کے مطالعہ سے انسان کے اخلاق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ہر نیم یا باپ کو اپنے بچوں کے لئے یہ کتاب ضرور منگانی چاہئے

قیمت ۶ علاوہ محصول

مرزا جعفر علی خاں اثر بی اے

"اثرستان"

ہندوستان کے مشہور اور مستند شاعر و ادیب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی بی اے ڈپٹی کلکٹر کا دیوانِ غزلیات شروع میں نواب صاحب کی تصویر بھی شامل کتاب ہے۔ اثر صاحب کی شاعرانہ پوزیشن اس قدر اہم ہے کہ ہر شخص ان کے کلام کو استفادہ کے طور پر دیکھتا ہے، لیکن ان کے کلام میں ایک خاص رس اور جذبات کی گہری چاشنی اس درجہ پائی جاتی ہے، کہ دل ہر شعر پر بے چین اور مست ہو جاتا ہے۔ شعر و ادب کے دلدادگان کو یہ دیوان اپنے پاس ضرور رکھنا چاہئے

حجم ۱۵۰ صفحات قیمت عہ علاوہ محصول

باسط لسوانی

شاہدِ معنیٰ

جناب ماسٹر باسط لسوانی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے قاضی ظہیر الدین احمد صاحب لسوانی نے مرتب کیا ہے۔ دیکھنے اور پڑھنے کے قابل ہے قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ علاوہ محصول۔

حضرت شوکت تھانوی

طوفانِ تبسم

شوکت صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ شوکت صاحب مزاح نگاروں کی اولین صف کے ادیب ہیں۔ اُن کے مزاح میں ایک لطیف شوخی اور مذاق پایا جاتا ہے۔ زبان آسان اور سادہ ہے دوسرے صفحہ ہی سے مذاق شروع ہو جاتا ہے اپنی بیوی کے نام آپ نے اپنے طوفان کو منسوب کیا ہے اس کے بعد فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کا دیباچہ ہے پھر مضامین شروع ہوتے ہیں ہر مضمون بجائے خود کشتِ زعفران ہے۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ شوکت کا طوفان تبسم زندگی کے تمام غم اپنی رو میں بہا لیجاتا ہے، اس کے مطالعہ سے جو غیر فانی مسرت حاصل ہوتی ہے اس کے لحاظ سے عہ قیمت بہت ہی کم ہے (علاوہ محصول)

محمود الرحمٰن ندوی

"دولتِ غزنویہ"

مولوی محمود الرحمٰن صاحب ندوی کی تاریخی تالیف ہے جس میں تاریخی تحقیق و تدقیق کے بعد غازی سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے ولولہ انگیز مجاہدانہ دینی اور علمی کارنامے دکھائے گئے ہیں اور اُن تاریخی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے جو اسلام کے دشمنوں نے تاریخ میں پیدا کر دیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزنوی خاندان کے متعلق یہ مکمل ترین تاریخ ہے۔ ہر مسلمان کیلئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے

حکیم یوسف حسن

"پروازِ خیال"

حکیم یوسف حسن صاحب مدیر اعلیٰ "نیرنگِ خیال" لاہور کے چار مختصر ڈراموں اور تین مکالموں کا مجموعہ ہے۔ نہایت خوابصورت اور نفیس طبع ہوا ہے۔ پروفیسر تاثیر ایم اے کے قلم سے دیباچہ ہے یہ ڈرامے اور مکالمے بے حد دلچسپ ہیں، زبان نہایت آسان اور دلچسپ ہے ہلکی سی چاشنی مزاح کی پائی جاتی ہے قیمت صرف ۵ علاوہ محصول

ل۔ احمد اکبر آبادی

"لالہ رُخ"

طامس مور کی مشہور مثنوی ہے، اور انگریزی ادب میں اعلیٰ پایہ کی تصنیف خیال کی جاتی ہے، ملک کے مشہور ادیب لطیف الدین احمد اکبر آبادی نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے، ترجمہ بہ حیثیت ترجمہ بہت ہی بلند ہوا اور اس کا درجہ بھی اردو میں وہی ہے جو طامس مور کی مشہور مثنوی کا ہے۔ لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی کو جو مہارت ترجمہ میں حاصل ہے وہ ہندوستان کے کم ادیبوں کو نصیب ہے "لالہ رخ" نے اُردو ادب کی آغوش کو بہت بڑی دولتِ ادب سے معمور کیا ہے۔ زبان اس درجہ بلند اور شیریں ہے کہ پڑھتے پڑھتے انسان جھوم جاتا ہے، مور کی شاعری کی زبان کا ساتھ دیتی ہے آپ اس کو ضرور ملاحظہ کیجئے قیمت عہ علاوہ محصول

میر ولی اللہ

"ماہ و پروین"

میر ولی اللہ کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ میر ولی اللہ بی اے ایبٹ آباد (پنجاب) کے مشہور ادیب ہیں اور مزاحیہ مضامین لکھنے میں ان کو مہارتِ تامہ حاصل ہے۔ کتاب آٹھ مضامین پر مشتمل ہے اور ہر مضمون بجائے خود پڑھنے اور لطف لینے کے قابل ہے قیمت ۱۲ علاوہ محصول۔

گناہ کی راتیں

ایم اسلم

ایم اسلم صاحب رئیس لاہور کے اخلاقی افسانوں کا مجموعہ ہے ایم اسلم صاحب پنجاب کے نہایت پختہ کار ادیبوں میں سے ہیں اور لاتعداد کتابوں کے مصنف ہیں۔ کتاب میں سات افسانے ہیں اور ہر افسانہ عبرت و ہیبت کا آئینہ ہے نوجوانوں کے لئے اس کے صفحات میں تعلیم اخلاق کے خزانے ہیں۔ اور مذبذب انسانوں کے لئے یہ مشعل ہدایت کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ بھی ضرور دیکھئے زبان لطیف اور دلچسپ ہے قیمت عہ علاوہ محصول۔

سرگزشتِ اسیر

وکٹر ہوگو

سعادت حسن (مترجم)

وکٹر ہوگو کی مشہور تصنیف The Last days of the condemned) کا کامیاب ترجمہ ہے جس میں تنسیخ سزائے موت کے معاشری اسباب سے بحث کی گئی ہے وکٹر کی یہ وہ معرکتہ الآرا کتاب ہے جس کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے سعادت حسن صاحب منٹو نے اس کا ترجمہ کر کے اردو ادب پر احسان کیا ہے۔ شروع میں مترجم کا ایک دیباچہ ہے جس میں کتاب اور صاحب کتاب کی ذات اور اسباب تحریر کا ذکر ہے، مترجم کے دیباچے کے بعد مصنف یعنی خود وکٹر ہوگو کا دیباچہ ہے اور اس کے بعد اصل کتاب ہے موجودہ دور انقلاب میں اس کتاب کا مطالعہ لازمی امر ہے اس لئے ہر شخص کو اپنی لائبریری میں سرگزشت اسیر کو ضرور جگہ دینی چاہیے۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

"موجودہ لندن کے اسرار"

نور الٰہی و محمد عمر

نور الٰہی و محمد عمر صاحب کی شاندار تصنیف ہے جس میں فلسفہ جرائم پر نظر ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں جا بجا حیرت انگیز مقالات آتے ہیں اور لندن کی پر اسرار زندگی کے مناظر انسان کے دماغ و دل کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں بہت دلچسپ اور حیرت ناک ہے۔ قیمت صرف عہ

سیر المصنفین

سید محمد یحییٰ تنہا بی اے

اردو نثر نگاروں کا مکمل تذکرہ، ادب اردو میں اپنے موضوع پر سب سے اولین اور بہتر کتاب، مفید دلچسپ اور لبریز معلومات، اردو ادب کے شیدائیوں کیلئے ایک قیمتی اور بہترین تحفہ کوئی کتاب خانہ ہمارے خیال سے اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہیے، ادبی تنقید و تاریخ کی دنیا میں یہ شاہکار کا درجہ رکھتی ہے قیمت جلد اول عہ جلد دوم عہ علاوہ محصول۔

تاریخ امریکہ

حجم ۲۷۶ صفحات کاغذ بہترین اور طباعت وغیرہ خوب ہے اردو زبان میں یہ نہایت نادر تاریخی کتاب ہے۔ امریکہ کے جتنے متعلقات ہیں ان سب کا ذکر اور تاریخی و سیاسی لحاظ سے اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کا تصور امریکہ کا نام لیتے ہی انسان کو ہو سکتا ہے قیمت عہ علاوہ محصول۔

"ترانہ"

مرزا یاس عظیم آبادی

ہندوستان کے مشہور شاعر مرزا یاس یگانہ چنگیزی عظیم آبادی کی رباعیات کا مجموعہ ہے شروع میں یاس صاحب کا دلچسپ دیباچہ ہے۔ اس کے بعد رباعیاں ہیں، ہر رباعی بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے جس میں حقائق و معارف اور طنزیات کے دریا بھرے ہوئے ہیں، اور واقعی رباعیات کا یہ مجموعہ اس قدر دلچسپ ہے کہ ہر صاحب ذوق کو اسے دیکھنا چاہیئے۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

فرانسیسی افسانے

فرانسیسی ادب کا بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو اس مختصر سی کتاب کو ضرور دیکھئے۔ قیمت صرف چار آنے (۴)

شیطان کی خالہ

یہ بھی ایک بے حد دلچسپ ناول ہے ضرور دیکھئے قیمت ۱۲

بیروزگاری کا علاج

آجکل سب سے زیادہ عظیم مسئلہ روزگار کا ہے، ہر شخص تلاش معاش میں سرگرداں نظر آتا ہے، اس کتاب کے ۱۲۸ صفحات ضرور ایک پریشانِ معاش کو شاہراہِ معاش دکھا سکتے ہیں۔ اگر اس میں جرأت مردانہ اور قوتِ ارادی کی روح موجود ہے۔

قیمت صرف آٹھ آنے (۸)

تاریخ مغربی یورپ

ڈاکٹر رابن سن کی کتاب "History of Western Europe" کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ نہایت سبق آموز اس کتاب کے مطالعہ سے یورپ کے سیاسی اور معاشری معاملات سمجھ میں آ جاتے ہیں قیمت عہ علاوہ محصول۔

خیالات ارونگ

امریکہ کے نامور مصنف واشنگٹن ارونگ کے چند مضامین کا ترجمہ، انداز بیان دیکھنے کے قابل ہے اردو ادب کے فدا کاروں اور انشا پردازوں کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ فن کتاب نویسی، لٹریچر میں انقلاب، اور ایک شادی کا دلفریب انجام، یہ مضامین دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیمت صرف ۸ آنے۔

یہ اور اس کے علاوہ ہر مصنف کی کتابیں ملنے کا پتہ

ادبی مرکز ساغر بک ڈپو میرٹھ

اردو نظم کی لاجواب کتاب
بادۂ مشرق
شائع ہو گئی

پرنٹر و پبلشر: ساغر نظامی مطبوعہ ساغر پریس میرٹھ بہ اہتمام: اسد یار خاں اعظم

رجسٹرڈ نمبر ال ۴۷۶

ادبی مرکز کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

فردوس کشمیر میں سپیدے کے درختوں کا ایک منظر

موجودہ نمبر کے چند مضمون نگار

- سر پی سی رائے
- سید محمد یحییٰ میرٹھی
- سر امین بنرجی
- خواجہ مسعود علی ذوقی بی۔اے
- ضیا فتح آبادی ایم اے
- لطیفی بی اے
- منظر اکبر آبادی
- نواب جعفر علیخان اثر بی۔اے
- ابن الحسن فکر ایم اے
- کیف مُرادآبادی

فی پرچہ ۸/

مدیر
ساغر نظامی

ادبی مرکز میرٹھ

ادبی مرکز میرٹھ سے ایک بلند ہفتہ وار سیاسی و ادبی اخبار
آفتاب
کا طلوع
زیر ادارت
عالیجناب پنڈت گوپی ناتھ سنہابی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ ایڈووکیٹ۔ سابق مدیر روزنامہ "قوم" میرٹھ
مدت سے ایک ایسے اخبار کی ضرورت کو محسوس کیا جا رہا تھا جو شہر اور ملک کی صحیح نمائندگی کے فرائض ادا کرے۔ ہم نے باوجود چند در چند ذمہ داریوں کے بالآخر اپنے سر ایک ہفتہ وار اخبار کی ذمہ داری کا بار بھی اپنے کاندھوں پر لے لیا۔ اور دارالاشاعت ساغر پریس سے ایک بلند معیار ہفتہ وار جاری کر دیا تاکہ شہر اور ملک کی خدمت کی جا سکے
آفتاب اپنی اصابت رائے، مضامین، سیاسی مقالات، طباعت، اور اپنے اٹھان کے لحاظ سے بہت پسند کیا گیا ہے۔ ملک کے بہترین انشا پرداز و شعرا کے مقالات اور نظمیں، دلچسپ افسانے، انسانی فطرت میں رفعت پیدا کرنے والے اقوال، لطائف و ظرائف، غرضکہ ہر وہ عنصر جو ایک ہفتہ وار اخبار کے لئے ضروری ہے "آفتاب" میں نہایت تکمیل کے ساتھ پایا جاتا ہے۔
قیمت سالانہ (سے ۳ ر) علاوہ محصول - فی پرچہ ایک آنہ ار
ملنے کا پتہ :-
دارالاشاعت ادبی مرکز (ساغر پریس)
سی پٹ بازار۔ میرٹھ

عروس
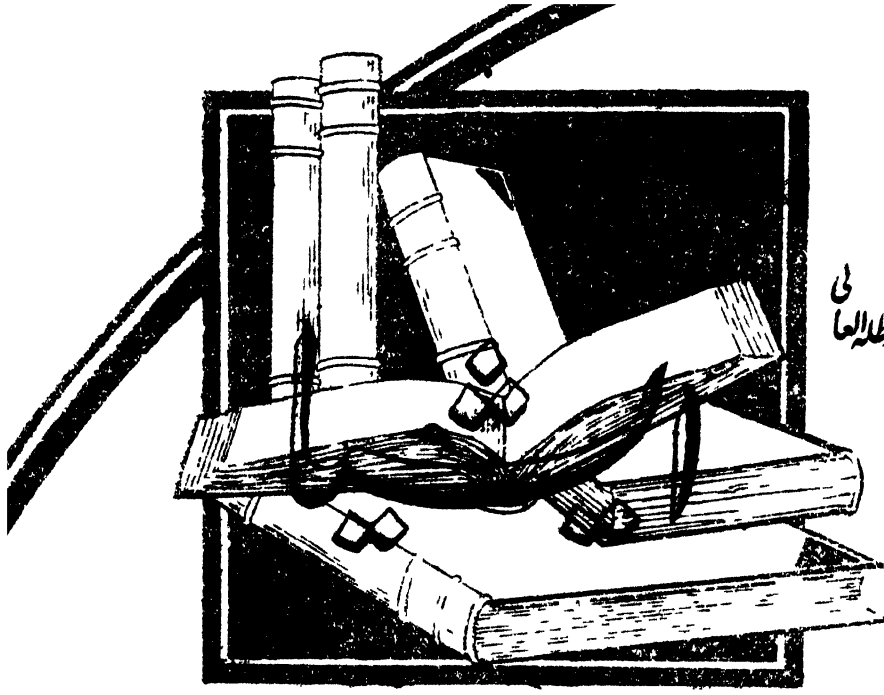
زیر سرپرستی

عالیجناب ڈاکٹر سیّد محمود مدظلہ العالی

ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی

بار ایٹ لا

حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ کا پیغام ایشیا کے نام

او چین۔ او جاپان۔ او ترکی۔ او ایران۔ او تاتاری۔ او افغانی۔ او عرب۔ او ہندوستانی۔ اپنی ایشیا کو نہ بھول۔ اپنی اصلیت سے بے رُخ نہ بن۔ بکھرنے کا وقت ختم کردے ملنے اور ایک ہوجانیکا زمانہ بلالے۔ ایسا ہو سکتا ہے ایسا ہی۔ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوگا۔

آؤ ایسا کریں۔ آؤ ایسا ہوتا دیکھیں۔ آؤ ایشیا کو اپنے گاندھی اور اپنے جواہر لال کو دکھائیں جو ایشیا کے تن من دھن کو ایک کرنے والے ہیں۔ اللہ۔ یزداں۔ اوم۔ بدھ کے متحدہ علم کو بلند کرو۔ اور دنیا میں بلند اور اونچے ہو جاؤ۔ ان سے بھی اونچے جو تم کو سب سے نیچا بنانے کے رات دن کام کرتے رہتے ہیں۔

—— صبح ہوئی ایشیا جاگی "

ادبی مرکز میرٹھ

عروس

السّلام اے وطن اے زمینِ وطن، آسمانِ وطن، اے جہانِ وطن

(۱)

تیری گودی میں پل کر ہوئی میں جواں

خوش بیاں

شادماں

کامراں

گل چکاں

تیرے پھولوں سے مہکا مرا گلستاں

تیری گلیوں سے گزرا مرا کارواں

نغمہ خواں نغمہ زن

السّلام اے وطن، اے زمینِ وطن، آسمانِ وطن، اے جہانِ وطن

(۲)

تیری تسکین گاہوں سے مجھکو ملی

زندگی

بیخودی

تازگی

خوشدلی

تیرے معصوم محلوں میں برسوں رہی

تیرے رنگین باغوں میں اکثر پھری

گلفشاں، خندہ زن

السّلام اے وطن، اے زمینِ وطن، آسمانِ وطن، اے جہانِ وطن

میری آزادیوں کے زمانے گئے

زمزمے

ولولے

چہچہے

ہو چکے

میں تو ہوتی ہوں رخصت تری بزم سے

یا الٰہی یونہی تو ہمیشہ رہے

خندہ رو خندہ زن

السّلام اے وطن، اے زمینِ وطن، آسمانِ وطن، اے جہانِ وطن

ساغر نظامی

فہرست مضامین

ایشیا بابت ماہ اگست ۱۹۳۵ء

جلد (۱) نمبر (۲)

تصاویر

(۱) سہ رنگی تصویر "عروس" (۲) ہٹالسٹائی (۳) واجد علی شاہ بادشاہ اودھ (۴) شاہ جہان اعظم (۵) مسز اینی بیسنٹ (۶) جنت کشمیر کا ایک فردوسی منظر (۷) ڈل میں مرغان آبی کی بہار (۸) کشمیر میں سپیدوں کے درختوں کا ایک منظر۔

اذکار و مباحث

ایشیا کا پہلا پرچہ شایع ہوا اور وہ بھی شایع نہ ہونے کی طرح کیونکہ باوجود مسلسل تقاضوں کے رجسٹرڈ نمبر ہمیں اُس وقت موصول ہوا جب پرچہ کو پریس سے نکلے دو ہفتے سے بھی زیادہ ہو گئے تھے چنانچہ ہم سوائے چند احباب کے یا چند خاص اخبارات کے پہلا پرچہ اس آزادی سے کہیں روانہ نہیں کر سکے جو ایک نئے پرچہ کیلئے ضروری ہے۔ یہاں تک کہ کئی ایسے احباب بھی رہ گئے جن کے پاس پرچہ پہونچنا نہایت ضروری تھا۔ شکایت نامے آئے لیکن اس اثنا میں چونکہ دوسرا پرچہ تیار ہو رہا تھا یہی مناسب سمجھا گیا کہ پہلا پرچہ روانہ نہ کیا جائے۔ اس محدود اشاعت و تشہیر کے باوجود یہ معلوم کرکے ہمیں بہت مسرّت ہے کہ ایشیا کا خیر مقدم تمام دنیائے ادب اُردو نے نہایت فراخدلی سے کیا ہے۔ ہر ڈاک اپنے ساتھ دو ایک ایسے خطوط ضرور لاتی ہے جس میں ہماری روحانی مسرّت کا سامان موجود ہوتا ہے کیونکہ ہمارے لئے اس سے زیادہ روحانی مسرّت کیا ہو سکتی ہے کہ ہماری مساعی کو قبولیت کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔ ملک کے ممتاز و موقر رسائل و اخبارات نے بھی بہت حوصلہ افزا ریویوز کئے ہیں۔ ہم ان آراء اور ریویوز کا محدود انتخاب اسی پرچہ میں "ایشیا کا خیر مقدم" کے عنوان سے شایع کر رہے ہیں اور تمام احباب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ایشیا ابھی اس معیاری بلندی پر نہیں پہونچ سکا ہے جس پہ ہم اسے دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔

ساغر صاحب کی شدید علالت

تقریباً ۵ ماہ سے ساغر صاحب نظامی علیل تھے لیکن وہ عفریتِ مرض سے برابر کشتی میں کامیاب ہوتے رہے۔ اور کاموں میں کسی قسم کا اختلال واقع نہیں ہوا مگر بالآخر مرض کے ایک ناقابل برداشت مقابلہ نے ان کو مغلوب کر دیا۔ اوران کی حالت اواخر اگست سے شروع ستمبر

یک ایسی مایوس کن ہوگئی کہ کل متعلقین اُن کی زندگی کو خطرہ میں سمجھنے لگے۔ تمام کاموں کا توازن غائب ہو گیا۔ اور وہ کام جو وقت پر مکمل ہونے تھے۔ نہ صرف نامکمل رہ گئے بلکہ ان کی طرف توجہ بھی ممکن نہ ہو سکی۔

اس وقت بھی جبکہ موجودہ نمبر شایع ہو رہا ہے وہ بستر مرض سے اُٹھنے کے بھی نا قابل ہیں۔ اور اُن سے اس نمبر میں بہت کم مشورہ لیا گیا ہے مگر محض اس لئے کہ ملک میں بے اعتمادی اور بے اعتباری زیادہ پھیل گئی ہے۔ التوا کی پالیسی کو ہم غلط خیال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اگست نمبر کی اشاعت کو لازمی خیال کیا۔ یہ نمبر شایع کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد ستمبر نمبر بھی شایع کیا جائیگا۔ خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ اسوقت ساغر صاحب اس قابل ہو سکیں گے کہ اسکے متعلق ان سے مشورہ کیا جا سکے۔ آخر میں ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ تاخیر ان اسباب و وجوہ کی بنا پر معرضِ شہود میں نہیں آئی ہے جو اکثر رسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایشیا مستقل بنیادوں پر شایع ہوا ہے۔ اس کے مستقل انتظامات ہیں۔ اس کا اپنا مطبع ہے۔ اپنے کارکن ہیں۔ لیکن وقتی طور پر ساغر صاحب کی شدید علالت نے یہ ایک بدمزگی پیدا کر دی۔ سو امید ہے کہ یہ باقی نہیں رہے گی۔ اور ایشیا اپنے پورے کمال و جمال کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت کریگا۔

اس تاخیر سے جو قدرت کی طرف سے ہے ہم کو سخت افسوس ہے اور ہم اپنے ناظرین سے معافی خواہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ایسے قدرتی موانعات سے ایشیا کو محفوظ رہنے کے لئے خلوص دل سے دعا فرمائیں۔

مظلوم ابی سینا

ازمنہ قدیم میں جب ہوسِ ملک گیری کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور فاتح اعظم ہونا شہنشاہیت کے بلند ترین لوازمات میں سے شمار کیا جاتا تھا۔ اسوقت اگر Caligula کیلیگولا اور Nero نیرو اپنے جبر و تشدد کی ایک تاریخ مرتب کر گئے تو اس عہد کی بلند ذہنیت کے مطابق جبکہ قومی اور شدید انسان شدت و جبر کے بغیر متاثر ہونا اپنی توہین خیال کرتا تھا کوئی غیر فطری اور عجیب و غریب بات نہ تھی کیونکہ ہر زمانہ کا ایک ماحول ہوتا ہے لیکن آج جبکہ انسان کو مہذب اور متمدن ہونے کا دعویٰ ہے اور وہ صحائفِ آسمانی تمام اخلاقی مذاہب اور بیش ہو چکنے والے کل اخلاقی اور اصلاحی فلسفوں اور نظریوں کے نتائج کے طور پر اپنے وجود کو اشرف المخلوقیت کا مجسمہ سمجھتا ہے۔ اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہونا جو امنِ انسانی کے شیرازہ کو پارہ پارہ کر دیں اس کی تمام مدنیت اور اس کے تمام اخلاقی ارتقا کا تار و پود بکھیرے دیتی ہیں۔

گزشتہ جنگ عظیم کے بعد جو اپنے عالمگیر اور منحوس نتائج کے لحاظ سے اتنی عظیم تھی کہ دنیا ابھی تک اسکے اثرات سے آزاد نہیں ہوئی ہے۔ آج یورپ کی پھر ایک کوشش ہے کہ خود کو ایک ویسی ہی شدید جنگ کے جہنم میں جھونک دے۔ ابی سینیا۔ مظلوم اور بے دست و پا ابی سینیا اٹلی جابر او مقتدر اٹلی کے تنازعہ کا ذکر ایشیا کے گزشتہ نمبر میں کیا جا چکا ہے لیکن ڈیڑھ ماہ کے عرصہ میں حالات نے اسقدر نازک صورت اختیار کر لی ہے کہ اس کا تذکرہ اس نمبر میں خود بخود آیا جاتا ہے۔

اسوقت تمام دنیا کی نگاہیں ابی سینیا اور اٹلی پر مرکوز ہیں۔ شاہ نگاری اور مسولینی کی حرکات کا نہایت غور و فکر سے مطالعہ کیا جا رہا ہے کوئی رسالہ کوئی اخبار یا کوئی انجمن دنیا کے کسی کونے میں ایسی نہیں ہے جس میں اٹلی کے ڈکٹیٹر کے تشدد اور شاہ حبش کی مظلومیت کا ذکر نہ آتا ہو ہر وقت اور ہر جگہ اس سوال پر غور کیا جاتا ہے کہ کس طریقہ سے آنیوالی عظیم الشان اور خطرناک تباہی کو روکا جائے۔ صرف غور ہی نہیں کیا جاتا بلکہ ہر وہ ممکن کوشش بھی کی جا رہی ہے۔ جو اس خطرے کے انسداد میں معاون و مددگار ہو سکتی ہے۔

گزشتہ پرچے میں ہم بتا چکے ہیں کہ مسولینی کیوں ابی سینیا پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور Keelog pamm کو نظر انداز کر رہا ہے گزشتہ چند سال میں اٹلی کی آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ اٹلی کی زمین میں نہیں سما سکتی اب اسی سوال کو حل کرنے کے لئے یورپ کا مدبر اعظم چاہتا ہے کہ سرزمین حبش کو اپنی y amloe بنائے مگر تمام دنیا جانتی ہے اور وہ خود بھی جانتا ہے کہ یہ حل ناقابلِ تسلیم ہے اور نہ ہی کسی صورت میں تسلیم کیا جا سکتا ہے ۔ اسی چیز کو سمجھتے ہوئے اس نے اعلان کیا تھا کہ اہلِ حبش بربریت پیشہ قوم ہے اور اس کا یورپ جیسی مہذب قوم سے بالکل ملحق ہونا اہلِ یورپ کیلئے خطرناک ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس قوم کو کسی طریقہ سے مہذب بنایا جائے ۔ اس اعلان کی غرض و غایت سوائے اس کے اور کچھ نظر نہیں آتی کہ مسولینی اہل یورپ کے جذبات کو فضول ابھارنا چاہتا تھا ۔ مگر شکر ہے کہ وہ بظاہر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا اور کسی قوم نے اس کے بیان کو صحیح تسلیم نہیں کیا اور ایسا ہو بھی کیونکر سکتا تھا جب ہر شخص پر اچھی طرح واضح ہے کہ موجودہ بادشاہ کی نگرانی میں حبش نے قابلِ رشک ترقی کی ہے اور اب اس قوم کو غیر مہذب اور غیر متمدن کہنا صریح غلطی ہے ۔ اس سلسلے میں شری یت سی ۔ ایف اینڈریوز کا مضمون نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے ۔ اس بصیرت افروز مضمون میں عینی مشاہدے کی بنا پر بتایا گیا ہے کہ اہلِ حبش مہذب، مدبر اور جنگجو انسان ہیں ۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہی اٹلی جواب ابی سینیا کے نمائندوں سے انجمنِ اقوام کو خالی کر دینے کا بار بار مطالبہ کر رہا ہے ابی سینیا کا نام انجمن کی رکنیت کیلئے کیوں تجویز کرتا ؟ امر واقع یہ ہے کہ مسولینی بالکل جھکنا نہیں چاہتا جھکنا تو ایک طرف وہ جنگ کے بغیر کسی نفع بخش صلح کرنے پر بھی راضی نہیں ہے ۔ وہ لڑنا چاہتا ہے اور ہر وقت لڑنے کے لئے تیار ہے ۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ چار ستمبر کو انجمن اقوام کا اجلاس شروع ہوتے ہی حالات تسلی بخش صورت اختیار کر لیں گے اور ایڈن اور ایم لیول جیسے مدبر اور پُر اثر ہستیوں کی مخلصانہ اور مصلحانہ کوششیں بار ور ہونگی مگر افسوس ہے کہ تجربہ بالکل اسکے خلاف ثابت ہوا ہے ۔ ادھر جنیوا میں انجمنِ اقوام اور پانچ طاقتوں کی ایک خاص کمیٹی جو انگلینڈ ، فرانس ، ترکی ، پولینڈ اور اسپین کے نمائندوں پر مشتمل ہے یہ کوشش کر رہی ہے کہ صورتِ حال کو بہتر بنانے کی کوئی تجویز سوچے اور اٹلی کا نمائندہ بیرن الیاسی بار بار یہ امید اور اطمینان دلا رہا ہے کہ اٹلی انجمن سے جدا نہ ہوگا اور اسوقت تک کوئی قدم نہ اٹھائے گا جبتک انجمن اپنا آخری فیصلہ نہ دیدے اور دوسری طرف مسولینی فوجوں کو جمع کرنے اور انکو ابی سینیا میں روانہ کرنے میں ہمہ تن مصروف ہے ۔ ابھی ابھی اس نے ایک اعلان شایع کیا ہے کہ وہ دن بہت نزدیک ہے جب تمام فاسسٹوں کو فوراً لڑائی کے لئے تیار ہو جانا پڑے گا اور اس موقع کا اشارہ ڈھول وغیرہ کی آوازوں سے کیا جائیگا ۔ اسکے علاوہ معلوم ہوا ہے کہ اٹلی پوشیدہ طور سے بھی فوج واسلحہ روانہ کر رہا ہے ان حالات کے زیر اثر جبکہ اٹلی جنگ پر تلا ہوا ہے پانچ طاقتوں کی خاص کمیٹی نے اپنی ناکامی کا اعلان کر دیا ہے ۔ صلح کی تمام کوششیں تمام ختم کر دیگئی ہیں اور نہیں معلوم کہ کتنے گھنٹے میں جنگ شروع ہو جائے اگر خدانخواستہ یہ جنگ شروع ہو گئی تو یقیناً کچھ عرصہ کے بعد اسکو گزشتہ جنگ عظیم کیطرح جنگ عظیم بنا دیا جائیگا ۔ کیونکہ مسولینی کے قبضہ میں ابی سینیا کا آجانا اس بات کی دلیل ہے کہ یورپ میں توازنِ قوت قایم نہیں رہا ۔ اور برطانیہ کسی حالت میں بھی اس چیز کو برداشت نہیں کر سکتا جبکہ خود ابی سینیا میں اس کے حقوق خطرے میں ہیں ۔ اگر اس موقع پر بھی کوئی چیز اس جنگ عظیم کو روک سکتی ہے تو وہ تمام حکومتوں کی آخری اور متحدہ کوشش ہے ۔ اٹلی تمام دنیا کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتا مگر اسکو کیا کہا جائے کہ امریکہ نے غیر جانبدارانہ پوزیشن اختیار کر لی ہے اور ہٹلر مسولینی کی مدد کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے ۔ لیکن بہرحال ابھی وہ جہنم جس میں مشرق کی ایک قدیم ترین سلطنت کو بھسم کرنیکی فکر کیجا رہی ہے پوری کوشش کیساتھ دہکایا جا رہا ہے مگر حالات آخری نقطہ تک نہیں پہونچے ہیں کیونکہ ہر یوروپی سلطنت اپنے مفاد اور اپنے معاملات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسی جنگ کے معاقبات پر غور کر رہی ہے کوئی شک نہیں کہ محض اٹلی آسانی سے اس جنگ کو نہیں لڑ سکتا بلکہ اسکو ان ہمسایہ یوروپی طاقتوں کا خیال کرنا پڑیگا جو اٹلی ہی کی طرح اپنے مفاد اور اپنے تحفظ کا قدرتی طور پر خیال کرنے پر مجبور ہیں ۔ ہم بنی نوع انسان کی ترقی اور انسانی تہذیب و حیات کے لئے اس جنگ کو نہایت مضر اور خطرناک خیال کرتے ہیں اور خدا سے ہماری دعا ہے کہ وہ دنیا کو اس جنگ سے محفوظ رکھے ۔ تاکہ نہ صرف ایک بے دست و پا مظلوم کی زندگی خطرے سے محفوظ ہو جائے بلکہ دنیا ایک آنے والی جنگ عظیم سے محفوظ ہو جائے ۔

"اسسٹنٹ ایڈیٹر"

ماہنامہ "ایشیا" کا خیر مقدم

ادارہ کی طرف سے ایشیا کے متعلق آراء حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ کیونکہ وہ رائے ہی کیا جو کوشش اور تحریک کے بعد ظاہر کی جائے۔ جن احباب اور بزرگوں نے ایشیا کو دیکھکر اور متاثر ہوکر اپنی آراء کا بیتابانہ اظہار فرمایا ہے ان کے خطوط کا وہ اقتباس جو ایشیا سے تعلق رکھتا ہے ذیل میں بعینہ درج کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہیگا تاکہ ہمیں اپنے نقائص اور محاسن کا اندازہ ہوتا رہے۔ اور ہم اپنے دوستوں کے مشوروں سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔

سید اظہار الحسن صاحب بی۔اے ایل ایل بی (علیگ)

ساغر صاحب

آپ کا حسین وجمیل رسالہ آپ کی نفاست پسندی کا آئینہ دار ہے۔ ماشاءاللہ دیکھنے سے نظر لگتی ہے اردو رسالوں کی دنیا میں "ایشیا" نے ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ خدا اسے پروان چڑھائے صورت اور سیرت دونوں کے اعتبار سے "ایشیا" اپنا جواب آپ ہے۔ اردو میں خیر سے رسالے تو سینکڑوں نکل رہے ہیں لیکن ہندوستان کے ماڈرن ریویو یا انگلستان کے ریویو آف دی ریویز کا مثیل اردو دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے "ایشیا" سے کچھ امید ہوتی ہے۔ لیکن ابھی اردو والے اس بلند معیار کیلیے تیار معلوم نہیں ہوتے۔ سنجیدہ علمی، معاشرتی اور سیاسی مضامین اور نظموں کی گنجائش کہاں غزل کا دور ختم ہوا تو ادب لطیف کی باری آئی۔ آپ کو دقتیں تو بہت پیش آئیں گی لیکن ہمت نہ ہارئے اور اس انداز تحریر سے ایشیا کو بچائیے جو "اردوئے جدید" اور "منثور شاعری" کے نام سے رسوا ہے۔ اردو ہندوستان کی لینگوا فرینکا ہونیکا خواب دیکھ رہی ہے دیکھئے اس خواب کی تعبیر کیا نکلتی ہے۔ نامانوس ترکیبیں اور ثقیل الفاظ علمیت کے آئینہ دار نہیں ہوتے۔ فارسی کی شیریں بندشوں اور ترکیبوں کے ساتھ ہندی کے سُریلے الفاظ اور لطیف جذبات سے بھی ناآشنا نہ رہنا چاہیئے۔

اگر ناگوار نہ ہو تو ایک بات عرض کردوں "ایشیا" میں مطبوعہ چیزیں نہ چھپنی چاہیں۔ خواہ وہ آپ ہی کی کیوں نہ ہوں "پٹ مندر کے کھول پجاری" والی نظم ایشیا سے پہلے "نیرنگ خیال" میں شائع ہو چکی ہے۔ الہامات کے عنوان سے جناب جگر مرادآبادی کی غزل میں یہ شعر

دل تو دل سنگ کو توڑو تو نکلتی ہے صدا، چوٹ کھا کر کوئی بے حس بھی تو خاموش نہیں

مرحوم عیاں میرٹھی کا ہے۔ میں مرادآباد کے مشاعرہ میں موجود تھا جب جگر و عیاں نے اس زمین میں غزلیں پڑھی تھیں۔ یہ شعر عیاں کی غزل میں تھا۔ مشاعرہ کے گلدستہ میں دونوں کی غزلیں شائع ہوچکی ہیں۔ اس میں بھی یہ شعر عیاں ہی کی غزل میں چھپا ہے۔ غالباً غزل بھیجنے والے صاحب سے سہو ہوا اور اگر جگر صاحب نے خود ہی یہ غزل بھیجی ہے تو سرقہ بالجبر تو کیا کہیئے ہاں ان کی بیخودی کا نتیجہ ضرور ہے مجھ سے اگر "ایشیا" کی کوئی خدمت ہو سکی تو مسرت ہوگی۔ انشاءاللہ کوئی مضمون عنقریب حاضر کرونگا۔

سید عنایت علی بی۔اے (علیگ) رضوی اجمیری

"ایشیا" کا پہلا نمبر میرے سامنے ہے۔ اس یادآوری کا شکریہ۔ اس کا سرورق۔ دریا کے

ساغر

گھاٹ پر دگویا گوتم بدھ کا پرعظمت اور پرشکوہ عکس۔ سیڑھیوں کے دونوں جانب خوشنما لیمپوں کی شماتی ہوئی روشنی۔ گھاٹ کے پیچھے نہایت سرسبز و شاداب باغیچہ اور عکس کے قلب میں بخط کوفی ماہنامہ کا نام "ایشیا" عکس کی پشت سے سورج کے طلوع کا وہ نقشہ جس سے صبح صادق پر صبح کا سہانا سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ چیزیں ایک ہی نظر کے بعد خیال کو ایک لمحہ میں دوسری طرف منتقل کر دیتی ہیں یعنی "مشرقی علم و ادب کے آفتاب کے طلوع کا خیال"۔ اور اس کے ساتھ ہی خیام العصر حضرت ساغر نظامی کا مسکراتا ہوا گر پرشکوہ مجسمہ نگاہوں میں پھر جاتا ہے۔

ابھی رسالہ پر ایک ہی نظر پڑی تھی کہ خیالات بالا نے شوق اور اشتیاق کو گدگدانا شروع کر دیا۔ پہلا ورق الٹا تو

"زبان اردو میں سب سے پہلا بین الاقوامی رسالہ مشرق اور ہندوستان کی آزادی اور عظمت کا واحد علمبردار" پڑھا۔ بے مدمسرت ہوئی۔ واقعی ہندوستان سے اردو زبان میں اس پایہ کی وسعت نظری سے کسی رسالے نے آجتک کام نہیں لیا ہے اور نہ اپنا نصب العین اسقدر وسیع قرار دیا۔ یہ ایڈیٹر کی دریادلی اور وسعت قلبی کا ثبوت ہے اور مقاصد کا اسقدر بلند ہونا بلند خیالی کی دلیل ہے۔ موجودہ مشرقی فضا میں ایسے جریدہ کی سخت ضرورت تھی۔ خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے حضرت ساغر کو یہ توفیق عطا کی کہ انہوں نے اسطرف اپنا پہلا قدم رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مبارک کام کے لیئے حضرت ساغر کی ذات ہر لحاظ سے موزوں ہے جن کا ایمان محبت اور عالمگیر بلکہ ہمہ گیر محبت ہے۔ کیونکہ ایسے مردانہ عظیم کام بغیر "محبت" اور "ہمہ گیری محبت" کے ہرگز ہرگز انجام نہیں پاسکتے ہیں اور یہ حضرت ساغر کی ہمہ گیر محبت ہی کا نتیجہ ہے کہ اشارہ عدد مستقل ادبی رفقاء کے ناموں کی بہت دوسرے صفحہ پر نظر آتی ہے۔

رسالہ بلحاظ کتابت، طباعت، کاغذ اور سائز کے اپنی طرز کا بالکل انوکھا ہے۔ نہایت دیدہ زیب حسین۔ خوشنما اور رنگین۔

باعتبار مضامین یہ رسالہ عظمت، حکمت، فلسفہ، سیاسی گہری معلومات، رومان، جغرافیہ، تاریخ، معلومات، ہیئت، فلکیات، لٹریچر، ادب لطیف، انشاء اور اعلیٰ پیمانہ کی شاعری سے لبریز ہے۔ اس کے الہامات کو پڑھکر انسان خود فراموشی کے عالم تحیر میں دیر تک گم ہو جاتا ہے

عصر جدید کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس رسالہ میں غور و فکر کیلیے بلکہ یوں کہیئے روح کو بیدار رکھنے کا پورا سامان نہایت خوبی کے ساتھ اور پورے طور پر فراہم اور مہیا کیا گیا ہے۔

اس رسالہ کو پڑھکر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ رسالہ کسی طرح تجارتی اغراض کی بنا پر یا پیٹ بھرنے اور کمائی کا ٹھیکرا بناکر جاری کیا گیا ہے۔ بلکہ حقیقت میں اس کا ایک مقصد معلوم ہوتا ہے اور ایک معیار۔ اور مقصد اور معیار ہر ایک نہایت اشرف۔ بلند و اعلیٰ اور نفع بخش۔ سبحان اللہ! البتہ یہ ایک دوسری حقیقت ہے کہ سوقیت اور رکیک سوا ہے چونکہ یہ رسالہ بالکل مبرّا اور منزّہ ہے۔ اسلیئے اس کو وہ لوگ جن کو مذاق سلیم اور علم کا کافی حصّہ نہیں ملا ہے نہ تو پسند ہی کر سکتے ہیں اور نہ پھر اس کی قدر کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو اس رسالہ کے اجراء پر دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ "نشاط آغاز" سے مسرور ہیں اور میں "دعاہائے استحکام ابدی" میں مصروف ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ رسالہ آپ کی زندگی بھر آپ کی اولاد اور آپ کے بعد ہزاروں سال تک اسی شان سے جاری رہے۔ آمین ثم آمین۔

عالیجناب نواب جعفر علی خانصاحب اثرؔ بی اے لکھنوی

اثر نواز تسلیم

خط ملا ایشیا دیدہ زیب ہوا ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ خدا آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے

مہتمم صاحب مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

اکثر حضرات نے اس رسالہ (ایشیا) کو بہت ہی پسند کیا ہے۔

عالیجناب شیخ افتخار الرسول صاحب بار ایٹ لا

رسالہ ایشیا کو دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں یہ واحد رسالہ ہے جس میں جدتیں پائی جاتی ہیں۔ اردو کی جو خدمت آپ کر رہے ہیں خدا جزائے خیر دے

"تیج ویکلی" دہلی

"ایشیا" نام کا ایک ماہانہ علمی و ادبی رسالہ جناب ساغرؔ نظامی نے ادبی مرکز میرٹھ سے جاری کیا ہے۔ اس کے سرپرست جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب ہیں اور ادبی رفقاء میں ملک کے اکثر اہل قلم شامل ہیں۔ اسوقت پہلا پرچہ (جولائی) ہمارے زیر نظر ہے اور اسے دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے ماہناموں میں "ایشیا" ایک امتیازی شان و حیثیت رکھتا ہے۔ مضامین بلند پایہ۔ نظمیں دلکش اور عمر خیام کی ایک رباعی کا تصویری تخیل بہت دلچسپ ہے۔ ترتیب بھی قابل داد ہے اور چند صفحات پر مسز سروجنی نائیڈو کی انگریزی نظموں کا ترجمہ اصل کے پہلو بہ پہلو دو رنگوں میں چھاپا گیا ہے۔ رسالہ کی تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ ہے۔ صفحات ۸۰ کاغذ نہایت عمدہ اور کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے۔ ہم ساغرؔ صاحب کو اس ادبی خدمت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ایشیا اسی شان سے ترقی کریگا۔

"نیرنگ خیال" لاہور کا تبصرہ

ناظرین نیرنگ خیال یہ سنکر خوش ہونگے کہ ہمارے شاعر خصوصی لسان القوم حضرت ساغرؔ نظامی نے میرٹھ سے ایک نہایت اعلیٰ معیار کا علمی و ادبی اور سیاسی ماہنامہ کا اجراء کیا ہے جس میں بین الاقوامی سیاست پر بحث و انتقاد ہوا کریگا اور ساتھ ہی ساتھ مشرقی فنون لطیفہ اور اقوام مشرق میں ایک کلچرل اتحاد کا تصور بھی پیش ہوگا۔ جولائی میں ایشیا کا پہلا پرچہ شائع ہوا ہے جو ہمارے پیش نظر ہے۔ اس میں نہایت بلند معیار کے سیاسی مقالات ہیں دلکش افسانے ہیں اور روح پرور نظمیں ہیں۔ خصوصاً علامہ مولوی نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا۔ مسٹر ظہیر حسین رضوی۔ سید عنایت علی بی اے علیگ اور فلکی اجمیری کے مقالات نہایت بصیرت افروز ہیں۔ دوسرے مضامین نگاروں اور شعرائے کرام میں مہاراجہ سرکشن پرشاد۔ رازؔ چاندپوری۔ سرگباشی رواں مرحوم۔ فکرؔ ایم اے۔ جگرؔ مرادآبادی آسیؔ لکھنوی اور سید فریدؔ جعفری کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ حضرت ساغرؔ کا میخانۂ اقوام خوب ہے لیکن رسالہ کا ادبی حصّہ ابھی تشنہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حضرت ساغرؔ کی ادب نواز طبیعت آئندہ پرچوں میں اس کمی کو پورا کر دیگی۔ رسالہ مصوّر ہے اور اس پہلے نمبر میں ایک سہ رنگی تصویر کے علاوہ چھ سات اور فوٹو بلاک کی تصاویر بھی ہیں۔ سرورق ایشیا کے عنوان کو دیکھتے ہوئے خوب ہے اور خصوصاً سرورق کا چوتھا صفحہ جس پر اتحاد ملی و قومی کا متحدہ نقش ہے اور ایک سانپ اور بین بھی مدیر کی حب الوطنی کے ترجمان ہیں۔ امید ہے کہ سیاسیات حاضرہ پر دلچسپی رکھنے والے اصحاب حضرت ساغرؔ کی پورے طور پر ہمت افزائی فرمائیں گے۔ "ایشیا" ہماری برادری کا رسالہ ہے اسلیئے اسے ہمارے طبقے میں اخلاقی طور پر بھی مقبول ہونا چاہیئے

ابو الفاضل حضرت مولانا رازؔ چاندپوری

"ایشیا" کا پہلا نمبر وصول ہوا اس عنایت خاص کا شکر گزار ہوں۔ سبحان اللہ ظاہری صورت کس قدر جاذب نظر ہے معنوی حسن کی داد صرف اہل دل ہی دے سکتے ہیں۔ اردو رسائل میں "ایشیا" ایک قابل قدر اضافہ ہے اور ظاہری و باطنی محاسن کے لحاظ سے کامیاب ہے۔ خدا کرے کہ یہ مقبول خاص و عام ہو اور آپ کو اپنی کاوش کا پورا پورا صلہ ملے۔

خیر سگال رازؔ چاندپوری

حامد علی صاحب گردشؔ

"ایشیا" کا پہلا نمبر زیر نظر ہے۔ ادبی مضامین نہایت محققانہ ہیں۔ مقالات علمیہ پر از معلومات اور دلچسپ ہیں نظم و نثر دونوں کا معیار نہایت بلند و پر کیف ہے۔ تصاویر بھی اچھی ہیں۔ میں قلبی مسرت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ مستقبل اپنے اعلیٰ معیار کے مطابق شاندار کامیابی نصیب ہو۔ میں اپنے تمام نوجوان دوستوں سے اس کے مطالعہ کی پر زور سفارش کرتے ہوئے وعدہ کرتا ہوں کہ اسکو اپنی حقیر خدمات پیش کرتا رہونگا۔

حامد علی گردش

منظور احمد صاحب بی ایس سی (آنرز) مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

اگست کے نیرنگ خیال میں آپکے موقر جریدہ پر تبصرہ بہت غور سے پڑھا میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ پڑھا کہ "ایشیا" نے زبان اردو کی اس افسوسناک کمی کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے جس کو اردو کی دنیا عرصے سے محسوس کر رہی تھی اردو زبان میں بین الملی لٹریچر کا فقدان افسانہ بیکسی سے کسی طرح کم نہیں۔ میدان صحافت میں ہمارے ملکی جرائد جسقدر پیچھے ہیں اس کا صحیح اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہماری مادری زبان جو فی الحقیقت ہندوستان بھر کی واحد زبان ہے۔ ابھی تک ان سیاسی، علمی اور فنی ذخائر سے محروم ہے۔ جو یورپ کی زندہ زبانوں کا سرمایۂ ناز ہے۔ مجھے ساغرؔ صاحب کے جذبات اور تجربۂ علمی کی بنا پر یہ کہنے میں قطعاً تکلف نہیں کہ آپ کا ماہنامہ ترقی کریگا اور علمی دنیا کا ایک درخشندہ ستارہ ہوگا۔

منظور احمد

حضرت وصلؔ بلگرامی

حضرت آسیؔ کے پاس دو منٹ کیلئے "ایشیا" کا جلوہ دیکھا میں آپکو اس کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ وصلؔ

پنڈت اندرجیت شرما

"ایشیا" خوب ہے مجھے فخر ہے کہ میرے وطن سے ایک ایسے رسالے کا اجرا ہوا ہے جس کا شمار انشاءاللہ ہندوستان کے ممتاز رسائل میں ہوگا۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

"گاہ گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را"

ہندو مسلم تعلقات کی سچی تاریخ

ہندو رعیت اور مسلم حکمرانوں کی حیرتناک سیاسی و مذہبی رواداری

مترجمہ
سید محمد یحییٰ
میرٹھی

مرتبہ
حقیقت نگار
سرپی سی رائے

"اگست ۱۹۳۵ء کا ایشیا" سرپی سی رائے کے ایک تاریخی و تحقیقی مضمون سے شروع ہوتا ہے جو بنگالی اور انگریزی ادب کا ماہر مشہور انشاپرداز اور ہندوستان کے اکابرین میں ایک بلند مرتبت شخصیت ہیں یہ مضمون نہ صرف تحقیقی ادب کا شاہکار ہے بلکہ اپنے مقصد کے لحاظ سے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ اسکے فاضل مترجم میرے دوست سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی ہیں جو میرٹھ کے علمی و ادبی حلقوں میں خاص درجہ رکھتے ہیں اور جن کو ترجمہ کرنے میں مہارت تامہ حاصل ہے محض اس وجہ سے آپ شکریہ کے حقدار ہیں کہ باوجود چند در چند روحانی اذیتوں کے آپ نے اس تحقیقی مضمون کا ترجمہ فرمایا ستمبر کیلئے آپ نے آسکر وائلڈ کے مشہور ناول ——— "ڈورین گرے" کا ترجمہ کیا ہے جس کیلئے میں شکریہ پیشیں ادا کرتا ہوں۔ ساغر

"نظام حکومت سے مذہب کا کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ یہ محض نجی زندگی کا معاملہ یا یوں کہئے کہ پرائیویٹ زندگی کی دلچسپی تک محدود تھا۔

"علاؤالدین خلجی سلطان دہلی (۱۲۹۵ سے ۱۳۱۴ تک) کے اصول مسلمہ" (الفنسٹن)

"شیر شاہ (۱۵۴۲ - ۱۵۴۵) کا مقصد یہ تھا کہ سلطنت میں روح دنیاداری پیدا کرے اور مذہب کو پس پشت رکھے۔ مذہب کو وہ افراد کا نجی معاملہ سمجھتا تھا جس کا اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں" (کے۔ قانون گوئے۔ 'شیر شاہ')

"جب ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ منظر ہند پر نمودار ہوا تو پیشوا باجی راؤ نے ہوس ملک گیری کی جملہ تدابیر کو ملتوی کر دیا۔

" وہ لکھتا ہے کہ اب ہمارے خانگی تنازعات ہیچ ہیں۔ ہندوستان میں صرف ایک ہی دشمن ہے...... دکن کی کل قوت' ہندو اور مسلمان' سب کو اکٹھا ہو جانا چاہیئے"
(گرانٹ ڈوف: تاریخ مرہٹہ)

چودھویں صدی عیسوی سے لیکر جبکہ مسلمانوں کی قوت نہ صرف شمالی ہند بلکہ دکن میں بھی مستحکم ہو چکی تھی بیسویں صدی کے طلوع تک ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ ان چھ صدیوں کی طویل مدت میں فرقہ وارانہ عصبیت عملی طور پر مفقود تھی۔ گو بظاہر یہ بات تعجب خیز ہے لیکن دراصل فرقہ پرستی دور حاضر کی اختراع ہے جو سیاسی اغراض کی تکمیل کی خاطر پیدا کی گئی ہے۔ ذیل میں الفنسٹن کی 'تاریخ ہند' کے بعض اقتباسات جن کو 'کاول' نے ۱۸۸۹ء میں مرتب کیا تھا درج کئے جاتے ہیں۔

"ہندوؤں کو کسی قدر نظر حقارت سے دیکھا جاتا تھا لیکن اس میں خصومت کا پہلو نہ تھا یہ سچ ہے کہ ان پر جزیہ عائد کیا گیا اور بعض نفرت انگیز امتیازات بھی موجود تھے لیکن امور مذہبی کی تعمیل میں ان سے کوئی تعارض نہیں کیا جاتا تھا جن ہندوؤں کا ذکر فوجی حکام کی حیثیت میں کیا گیا ہے وہ غالباً زمیندار ہونگے جو سپاہ امدادی کے سردار بنادئے گئے ہونگے لیکن ان کا تقرر براہ راست بادشاہ کی طرف سے نہیں ہوتا تھا تاہم اس میں شک نہیں کہ حکومت کے شعبۂ نظامت (سول محکمہ) کے بہت سے مناصب پر ہندوؤں کا تقرر کیا جاتا تھا۔ بالخصوص محکمۂ مال اور اکاؤنٹ میں ان کی کافی تعداد موجود تھی .... مبارک خلجی (۱۳۱۷-۱۳۲۱ء) کے دور حکومت میں دربار کی ذہنیت اور انتظام مملکت ہندوانہ طرز پر تھا۔

شیر شاہ کی افواج میں ہندو بعض اہم مناصب پر مامور تھے۔ اس پالیسی کو اُس نے اپنی عملی زندگی کے آغاز سے ہی اختیار کیا تھا۔ شیر شاہ کے بہترین سپہ سالاروں میں سے برہم جیت بھی ایک تھا۔ چونسہ اور بلگرام کی جنگوں کے بعد ہمایوں کے تعاقب میں اسی کو بھیجا گیا۔ یہ حقیقت ہمارے علم میں ہے کہ محمود غزنوی کے عہد حکومت میں بھی مسلم سپاہ میں ہندوؤں کو بھرتی ہونے کی اجازت تھی۔

"شیر شاہ ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے سلطنت ہند کو رضا عوام کے مطابق قائم کیا کین کہتا ہے کہ کسی حکومت نے حتیٰ کہ حکومت برطانیہ نے بھی اتنی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا جتنا کہ اس پٹھان نے'

"محمد عادل شاہ (۱۵۵۳ء) نے اپنی حکومت کا انتظام ہیمو کے سپرد کر دیا تھا ہیمو ہندو تھا جو کسی زمانہ میں دوکانداری کرتا تھا اور اس کی شکل و صورت اس کی ذات سے بھی زیادہ مکروہ تھی۔ لیکن باوجود ان تمام ظاہری خامیوں کے اس میں اتنی کافی دماغی اور ذہنی قوت موجود تھی کہ وہ اپنے عروج کو مغرور اور فوجی امراء کے حلقہ میں قائم و ثابت رکھ سکا اور حکومت کو ایسی حالت میں پراگندگی و زوال سے بچا لیا۔ جبکہ وہ بادشاہ وقت کی بے اعتدالیوں اور حماقتوں کی وجہ سے روبہ تنزل ہو چکی تھی"

شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ میں بھی سلطنت کے نہایت اہم مناصب پر ہندو مامور

تھے۔ بنگال میں اورنگ زیب کے نائب السلطنت مرشد قلی خاں کے زیر حکومت ہندو شعبۂ نظامت کے جملہ اہم انتظامی مناصب کے اجارہ دار بن گئے تھے اور اس کے علاوہ اہم فوجی مناصب پر بھی وہ فائز تھے۔ اگر شہنشاہ کے دل میں ہندوؤں کی طرف سے نفرت کا فطری جذبہ موجود ہوتا تو وہ نہ صرف بتدریج اس اجارہ کو توڑنے کی کوشش کرتا بلکہ اپنے گورنر کے اس طریقۂ عمل پر سختی کے ساتھ سرزنش بھی کرتا۔ خاص دہلی میں محکمۂ مال کا حقیقی افسر اعلیٰ ایک ہندو تھا۔

"جب جعفر خاں وزیر اعظم بنایا گیا جس عہدہ پر وہ جنگ جانشینی کے دوران میں بھی برقرار رہا تو حقیقی طور پر محکمۂ مال کا انتظام تجربہ کار رگھوناتھ کھتری نائب دیوان الملقب بہ رایان کے ہاتھ میں تھا۔ اورنگ زیب نے تخت و تاج پر قبضہ کرنے کے بعد بھی دیوانی کے اس انتظام کو برقرار رکھا اور ۱۸ جون ۱۶۵۸ء میں رگھوناتھ کو راجہ کا خطاب دے کر زمرۂ امرا میں شامل کرلیا۔ . . . . یہ شخص دیانت داری و ایمانداری کے زریں اوصاف کارمنصبی میں انہماک اور انتظام سلطنت کی اعلیٰ قابلیتوں سے متصف تھا۔" (جے این سرکار: اورنگ زیب حصۂ سوم صفحہ ۷۲)

عام طور پر مشہور ہے کہ اورنگ زیب نے تعصب اور تنگدلی کی وجہ سے اپنی ہندو رعایا کو مخالف کرلیا۔ لیکن اس کے دور حکومت میں بھی کسی جگہ اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ مذہب کی وجہ سے کسی ایک بھی ہندو کو سزائے موت یا قید سے دوچار ہونا پڑا ہو اور یا اس کے مال و زر پر محصول عائد کیا گیا ہو، اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانہ میں کسی ایک فرد کو بھی اپنے آباؤ اجداد کے طریقے کے ——— مطابق علانیہ عبادت کرنے سے منع کیا گیا ہو۔" (الفنسٹن۔ تاریخ ہند)

اورنگ زیب کو جب مرہٹہ سردار سیواجی کے خلاف جو ہندو قومیت کا علمبردار تھا جنگ کرنی پڑی تو راجپوت راجہ جسونت سنگھ اور اس کے بعد جے سنگھ کی فوجی خدمات حاصل کرنے میں اس نے ذرہ برابر تامل نہ کیا۔ یہ سچ ہے کہ توازن قائم رکھنے کی غرض سے وقتاً فوقتاً دلیر خاں کو ان کے عقب میں بھیجتا رہا لیکن یہ محض اس کے شکی مزاج ہونے کی دلیل تھی۔ ہندو سپہ سالاروں کے مقابلہ میں وہ اپنے بیٹوں (شہزادہ معظم۔ اکبر وغیرہ وغیرہ) کی جانب سے زیادہ مشتبہ رہتا تھا۔ اس کے سر پر یہ خوف بھوت کی طرح سوار تھا کہ مبادا اس کی اولاد اس کی قائم کی ہوئی مثال پر عملدرآمد کر بیٹھے۔ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد سلطنت مغلیہ کی جمعیت پریشان ہوگئی تو ہندوؤں نے بڑی سرعت کے ساتھ انتظام مملکت میں خواہ خود مختار سردار بن کر خواہ مسلمان شہزادوں کے ماتحت فوجی کمانداروں کی حیثیت سے بالادستی حاصل کرلی۔

ہندوؤں کی رواداری کے سلسلہ میں میں پارسیوں کی تاریخ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ آٹھویں صدی عیسوی میں جب ایران پر عربوں کا تسلط ہوگیا تو پارسی لوگ جو قدیم فارس والوں کی اولاد میں سے تھے اپنے ملک سے ہجرت کرکے ہندوستان میں آباد ہوگئے۔ پہلے پہل ان لوگوں نے گجرات کے ساحل پر بمقام "سنجان" قدم رکھا۔ یہاں ہندو حکمرانوں نے بڑی فراخدلی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔

ہندوؤں کی فراخدلی کی متعدد مثالوں میں ایک مثال خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اورنگ زیب کے بیٹے محمد اکبر نے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور سعی پیہم کی کہ راجپوتوں کی اعانت سے تخت و تاج پر قبضہ کرلے۔ شہزادہ کو بُری طرح ناکامی سے دوچار ہونا پڑا لیکن راجپوت سردار درگا داس بڑی دلیری کے ساتھ تمام خطرات سے گزرتا ہوا حرماں نصیب شہزادہ کو مرہٹہ راجہ شمبھوجی کے دربار میں لے گیا۔ اورنگ زیب کو یہ تشویش تھی کہ اپنے پوتے اور پوتی کو واپس حاصل کرے اس لئے اس نے درگا داس سے صلح کی۔ ذیل میں ان شہزادگان کی واپسی کا نقشہ پیش کرتا ہوں:-

"جب ۱۶۸۱ء میں اکبر اس ملک سے فرار ہوا تو کمسن بچے راہ کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے قابل نہ تھے۔ شہزادہ بلند اختر اور شہزادی صفیۃ النساء جو دونوں نابالغ تھے ماڑواڑ میں اکبر کے راٹھور دوستوں کے پاس چھوڑ دئے گئے۔ درگا داس نے ان کو ایک غیر معلوم اور ناقابل گذر مقام پر گردھر جوشی کے زیر اہتمام رکھا۔ ۱۶۸۱ء سے ۱۶۹۶ء تک ان کی پرورش نہ صرف صحت و اخلاق کے اعتبار سے بڑی توجہ اور انہماک کے ساتھ کی گئی بلکہ مذہب اسلام کے مطابق ان کو تعلیم دی گئی۔" (جے این سرکار: اورنگ زیب حصۂ پنجم صفحات ۲۸۱ و ۲۸۲)

اب خاص اپنے گھر کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ بنگال میں فرقہ پرستی قطعاً معدوم تھی۔ بنگال کے خود مختار پٹھان سلاطین بنگالی زبان کے بڑے سرپرست ہوتے تھے۔ 'ودیاپتی' نے اپنی غیر فانی نظم میں انہیں سلاطین میں سے ایک حکمراں کی عظمت و شوکت کے گیت گائے ہیں۔ بنگال کے زمیندار کم و بیش قرون وسطیٰ کے یورپی جاگیرداروں کے مانند ہوتے تھے۔ 'بارہ بھنیا' یعنی بارہ نیم آزاد نواب شاہی خزانہ میں مقررہ مالگزاری ادا کرنے پر قطعاً آزاد چھوڑ دئے گئے تھے اور جب کبھی صدر مقام پر مغل یا پٹھان حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی تو مالگذاری بھی ادا نہ کی جاتی تھی۔ داخلی نظم و نسق میں کسی قسم کا تعارض نہیں کیا جاتا تھا۔

بیشتر مقدمات پنچایت کے ذریعہ طے پاتے تھے جس کو فریقین کی مرضی کے مطابق چُنا جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے مقدمات کی سماعت دیہات کی پنچایتیں کرتی تھیں جن کے فیصلے قطعی اور اٹل ہوتے تھے۔

'بارہ بھنیا' میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور اس ترجیح کا سبب 'رابرٹ' لارڈ کلائیو کی سوانح حیات مطبوعہ ۱۸۳۶ء جلد اول مصنفہ جنرل سرجان میلکم کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے۔

"باوجودیکہ مسلمان حکمرانوں نے ہندو راجاؤں کی جگہ لی لیکن مالیات کا بندوبست اور داخلی حکمت عملی کے ان تمام جزئیات کا انتظام جن پر کسی حکومت کے چلائے جانے کا مدار ہوتا ہے تقریباً انہیں ہاتھوں میں رہا جن میں مسلمانوں نے پایا تھا۔ ایک ہندو بحیثیت وزیر، یا نائب خزانۂ عامرہ کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا اور اس منصب جلیلہ کی وجہ سے اس کا تعلق ملک کے بڑے بڑے ساہوکاروں اور دولتمند ہندوؤں سے قائم رہتا تھا۔

"ایک نہایت ذہین اور زود فہم مسلمان شہزادہ سے جب یہ دریافت کیا گیا کہ وہ ہندو اہلکاروں اور رعایا کو مسلمانوں پر کیوں ترجیح دیتا ہے تو اس نے جواب میں کہا کہ مسلمان چھلنی (غربال) کی مانند ہے جو کچھ اس میں ڈالا جاتا ہے وہ خارج ہوجاتا ہے۔ برخلاف اس کے ہندو کی مثال اسپنج کی سی ہے جو کچھ اس میں ڈالا جاتا ہے اس کو وہ محفوظ رکھتا ہے اور نچوڑنے پر جذب کی ہوئی چیز کو واپس دیدیتا ہے۔"

"لیکن اس کے علاوہ دیگر اسباب تھے جو اس امر کے مقتضی ہوئے کہ مسلمان حکمراں

اپنے درباروں اور سپاہ میں ہندوؤں کو ملازم رکھیں اور ان کی ہمت افزائی کرتے رہیں۔ خاص اپنے عزیزوں اور اپنی نسل کے سرداروں اور رعایا کی ہوسناکیوں اور شورشوں کے انسداد کرنے کے اور توازن قائم رکھنے کے لئے مسلمان حکمران ہندوؤں کو اپنی ملازمت میں رکھتے تھے یہ احساس تخت دہلی پر بیٹھنے والے شاہانِ ذی وقار سے لیکر جن کا دبدبہ وطاقت نصف النہار پر تھا۔ چھوٹے سے چھوٹے سردار کے دل میں کارفرما تھا۔ اس احساس کی تعمیل اور وہ اثر و رسوخ جو ہندوؤں کو اپنی دولت اور ذاتی محاسن کی وجہ سے میسر تھا بڑی حد تک مسلمان حکومت کے آسانی کے ساتھ قائم ہونے اور مدت دراز تک باقی رہنے کا باعث ہوا۔ ہر جدید مسلم حکومت سے ہندو حکمران اور اس کے مصاحبین کی علیحدگی کے ماسوا کوئی بڑا تغیر نہیں ہوتا تھا چھوٹے درجہ کے راجگان ہندو حاکم اعلیٰ کی بجائے مسلمان حکمرانوں کی اطاعت قبول کر لیتے اور اس کو خراج دینے لگتے تھے ماسوا اس کے ان کی حالت وران کی مقامی قوت و اقتدار علیٰ حالہٖ باقی رہتا تھا۔

" ہندو وزراء اور افسران نے کاہل اور عیاش مغل بادشاہ کی جس قدر مفید طریقہ پر خدمات انجام دی ہیں وہ غالباً خاص اپنی نسل کے حکمران کی نہ دیتے۔ اور چونکہ مکمل طور پر مذہبی آزادی موجود تھی۔ اور ان کے قدیم اور محترم رسم ورواج پر شاذ و نادر ہی حملہ کیا جاتا تھا اس لئے ہندو قوم کا دیگر امور میں باہمی اختلاف و نزاع ان کو کسی ایسی سعی میں متحد نہ ہونے دیتا تھا جس کے ذریعے وہ فاتحین کو ملک سے خارج کر سکتے۔ ان فاتحین نے مختلف اغراض کے ماتحت بجز نام کے تقریباً تمام قوت و اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں دے رکھا تھا۔" (عبارت مندرجہ بالا میں جلی حرف میری طرف سے ہیں)

مرشد قلی خاں نے اپنی صوبہ داری کے دوران میں معتبر ہندوؤں کو اپنا مشیر بنایا اور محکمہ مال کے عہدے ان کو عطا کئے۔ ان معتمدین میں سے درپا نرائن بھوپتی رائے۔ کشور رائے۔ جسونت رائے اور رگھونندن خاص ممتاز اشخاص تھے اعلےٰ فوجی مناصب کا دروازہ بھی ہندوؤں کے لئے کھلا ہوا تھا۔ لاہوری مل اور دلیپ سنگھ اگرچہ ہندو تھے لیکن ان کو باغی ہندوؤں کے خلاف بطور کمانڈر افواج بھیجا گیا تھا۔ زمینداروں میں رام جیون اور اس کا دست راست دیا رام نیز رگھو رام اہم فوجی عہدوں پر مامور تھے۔

علی وردی خاں کے عہد نوابی میں ایک ہندو مسمّی نندلال اوائل حکومت میں سپاہ نوابی کے اعلیٰ ترین عہدہ پر فائز تھا۔ راجہ جانکی رام نواب کا سب سے زیادہ معتمد مشیر تھا اور راجہ مذکور کے بیٹے راجہ درلابھ رام و راجہ رام نرائن مساوی طور پر اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے محکمۂ مال میں چنمائے رائے۔ ویدت۔ کیرتی چند۔ چنتامنی داس۔ اور گوکل چند سب سے پیش پیش اور ممتاز افراد گزرے ہیں۔ ڈھاکہ کے راجہ راج بلبھ نہایت ادنیٰ اور معمولی حیثیت سے ترقی کر کے نائب صوبہ داری کے منصب جلیلہ تک پہنچ گئے۔ راجہ رام سیاسی گفت و شنید میں ایک طرح پر بطور سفیر کام کیا کرتا تھا۔ دیوان منک چند اور امید رام نہایت اہم اور خاص عہدوں پر مامور تھے۔ ہندو نہ صرف مالی معاملات میں معزز و ممتاز حیثیت رکھتے تھے بلکہ فوجی عہدے بھی اکثر ان کے سپرد کئے جاتے تھے۔ درلابھ رام۔ مانک چند اور ان کے بعد موہن لال[1]

اور شیام سندر نے میدان جنگ میں خوب خوب دادِ شجاعت دی تھی۔

نواب علی وردی خاں کی حقیقی مشکل یہ تھی کہ اس کے مسلم معتمدین نے اس کے خلاف نمک حرامی اور غداری کی۔ ان لوگوں نے علی وردی کی اطاعت سے روگرداں ہونے اور مرہٹوں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے میں ذرہ برابر پس و پیش نہ کیا۔ اس کل دور میں مذہبی تعصب یا فرقہ پرستی کا شائبہ بھی نہ ملے گا بلکہ ہر جگہ ذاتی اغراض کارفرما نظر آئیں گے۔

ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی سے لیکر جنگ پلاسی تک کے مسلم دورِ حکومت میں بنگال کے ہندوؤں کو یہ محسوس کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا گیا کہ وہ کسی اجنبی عملداری کے ماتحت ہیں۔ فوجی اور سول ہر قسم کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں کے دروازے ان کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ یہ حقیقت بھی قابل لحاظ ہے کہ باستثنائے راجہ بیربھوم جتنے بڑے زمیندار تھے وہ سب کے سب ہندو تھے۔ "بنگال میں نوابی عمل" کا مصنف کالی پرسن بنرجی لکھتا ہے کہ مسلمانوں کے حصہ میں کل زمینداری کا سولھواں حصہ آیا تھا)

"تاریخ ہند کا سرسری اور سطحی مطالعہ کرنے والا اس خیال سے متاثر ہو سکتا ہے کہ تنہا اکبر ہی وہ شخص تھا جس نے مذہبی رواداری اختیار کی اور انتظام سلطنت میں ہندوؤں کے تعاون کو حاصل کیا لیکن یہ بتایا جا چکا ہے کہ علاؤالدین خلجی کے عہد فرمانروائی سے بعد تک کبھی کوئی ہندو نظام سلطنت میں محرومی کا شکار نہیں بنایا گیا۔

ماسوا اس کے یہ حقیقت بھی کثیر شواہد کی بنا پر بالکل روشن ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی جمعیت ملی نہ تھی۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنے ہم مذہبوں کے خلاف ہندو راجگان سے ایسے عہدنامے کئے جو باہمی دفاع و اقدام جارحانہ پر مشتمل تھے اور اسی طرح ہندوؤں نے مسلمان سے بحیثیت مسلمان کبھی شمہ برابر فرقہ پرستی کا اظہار نہیں ہوا۔

قدیم الایام سے ہندو بیرونی حملوں کا شکار بنتے چلے آئے .... لیکن ایسا ہوتا تھا کہ غیر ملکی فاتحین ہندوؤں کی ہیئت اجتماعیہ (سوسائٹی) میں کلیتاً جذب ہو کر رہ جاتے تھے۔ مثلاً سیتھین لوگ۔ لیکن مسلمانوں کے لئے اس طرح جذب ہونا ممکن نہ تھا۔

" مسلم تہذیب چونکہ ممتاز تھی اور انفرادیت (Individuality) رکھتی تھی اسی لئے وہ ہندو تہذیب میں فنا ہونے سے بچ گئی۔ مسلمان بادشاہ اپنی جنگوں کو جہاد فی سبیل اللہ سے تعبیر کرتے۔ مندروں کو مسمار کرتے اور ہندوؤں کو مسلمان بناتے اور ان پر ظلم و ستم کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان دو بڑی قوموں کے درمیان رواداری کا جذبہ پیدا ہوا۔ شاہانِ اسلام نے ہندو وزراء کو ملازمت میں رکھا۔ ہندو سرداروں کی امداد حاصل کی۔ ہندو خواتین سے شادیاں کیں اور ہندو ادبیات بالخصوص دیسی زبانوں کی سرپرستی فرمائی۔ سلطنت وجیانگر کے ہندو راجگان مسلمان سپاہیوں کو ملازم رکھتے تھے اُن کو اراضیات عطا کرتے ان کے لئے مساجد تعمیر کرتے اور ان کے مذہب کا احترام کرتے تھے۔ مسلم سلاطین بھی ہندو سپاہیوں کو ملازم رکھا کرتے تھے۔ لشکری ہندو اور مسلمانوں کے باہمی اختلاط نے ان کی زبانوں کو مخلوط کر دیا اور نتیجہ میں اُردو زبان کا ظہور ہوا۔ کاشمیر کے مسلم بادشاہ زین العابدین نے ہندوؤں کو سلطنت میں عہدے عطا فرمائے اور روادارانہ پالیسی پر عمل کیا علیٰ ہٰذا القیاس بنگال کا حسین شاہ بھی فراخدل تھا۔ بنگالی زبان نے سنسکرت کی قیود سے آزاد ہو کر بے روک ٹوک ترقی کی اس کے لئے وہ حسین شاہ اور نصرت شاہ کی بے انتہا مرہون منت ہے

91

[1] جب میر جعفر سپاہ کثیر کے ساتھ نواب سراج الدولہ کی افواج سے جدا ہونے پر راضی ہو گیا۔ تو بنگالی ہندو موہن لال اور بنگالی مسلمان میر مدن ہی تھے جنہوں نے نواب کو نہ چھوڑا اور میدان جنگ میں بڑی دلیری کے ساتھ تبرد آزما ہوئے لیکن افسوس کہ تقدیر کو پلٹ نہ سکے۔

بنگالی رامائن مصنفہ کرتی واس اور مہابھارت مصنفہ کاسی داس ایسی کتابیں ہیں جو بنگالیوں کے گھر گھر میں رائج ہیں۔ وِدیاپتی اور چنڈی داس شعرائے باکمال نے اپنی اچھوتی نظموں سے نغمہ ریزیاں کیں۔

"وسیع الخیال مصلحین نے مذہب کی اصل روح کو لوگوں تک پہنچایا اور مذہب کے فرسودہ رسم و قیود اور ذات پات کے سنگین قوانین سے بالاتر ہو کر مساوات اور بزرگی و عظمت انسان من حیث الانسان کی تبلیغ کی۔ رامانند، رامانج کا ماننے والا اور اعلیٰ ذات برہمن تھا اس نے ہندی زبان میں تمام ذات کے لوگوں حتیٰ کہ چماروں تک میں رام اور سیتا کے مسلک کی تبلیغ کی اس کے مشہور چیلے رائے داس اور کبیر تھے۔ کبیر ذات کا نوربافٖ تھا اس کی تعلیم تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کا خدا ایک ہے۔ رام اور رحیم میں کوئی فرق نہیں اور در اصل تمام مذاہب برابر ہیں۔ مہاراشٹرا میں نام دیو مرہٹی زبان میں پرچار کیا کرتا تھا کہ ہندوؤں کا بھگوان اور مسلمانوں کا اللہ خدائے واحد ہے 'نام دیو' اور برہمن مُنی 'اکناتھ' دونوں اچھوتوں سے آزادانہ ملتے جلتے تھے اور عظمت و شرف انسانی بحیثیت انسان کا سبق لوگوں کو سکھاتے تھے۔ بنگال کے 'بال' پرچار کیا کرتے تھے کہ آدمی انسان ہے اور مذہب ذات پات سے بالاتر ہے 'چیتنیہ' نے اپنے بھگتی مشرب سے بنگال اور نادیہ کو بھر دیا۔ مساوات کی تعلیم دی' اس کے چیلوں میں مسلمان بھی مل گئے۔ ولبھ اچاریہ نے شمالی ہند میں 'وشنو' مسلک کو قائم کیا نانک نے تعلیم دی کہ حق و صداقت اسلام اور ہندو دھرم میں یکساں طور پر موجود ہے ذات پات کے امتیازات کو مٹایا اور عالمگیر رواداری کی تبلیغ کی۔ اس کے زمرہ مریدین میں بہت سے مسلمان تھے۔" (کے۔ پی۔ مترا: تاریخ ہند برائے امتحان میٹرکولیشن صفحات از ۱۱۲ تا ۱۱۵)

حقیقت یہ ہے کہ ہندو مسلم نااتفاقی زمانۂ حال کی پیداوار ہے تیس سال قبل اس کا وجود شاذ و نادر ہی ملیگا۔ میرے زمانۂ طفولیت میں جب درگا پوجا کا تہوار ہوتا تھا تو میرے والد، دادا اور پردادا۔ گادی پور (جو ہمارے موضع کے قریب واقع ہے) کے قاضیوں کو جاترا میں شرکت کی غرض سے مدعو کیا کرتے تھے اور وہ ہمیشہ اس دعوت پر لبیک کہا کرتے تھے بنگال میں ہر جگہ یہی کیفیت تھی۔ ان دونوں بڑے فرقوں کے مابین مخلصانہ اور کریمانہ تعلقات قائم تھے۔

براڈلے برٹ نے ۱۹۰۶ء میں ان دونوں فرقوں کے باہمی خوشگوار تعلقات کا تذکرہ اپنی کتاب 'مشرقی دار الخلافہ کی رومانیت' میں اس طرح کرتا ہے۔

"شیخ محمد یوسف کے مزار پر ہندو بھی ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں جب کسان کو فصل کا اندیشہ ہوتا ہے تو مٹھی بھر چاول مزار پر چڑھاتا ہے۔ اگر اس کا بچہ بیمار ہو یا مویشی کسی مرض میں مبتلا ہو جائے تو بطور کفارہ درگاہ کو نذر دیتا ہے اگر فصل اچھی ہوئی تو اظہار شکر گزاری کے لئے ایک گٹھڑی چاول سیدھا کھیت سے لیجا کر ہدیتہً مزار پر چڑھاتا ہے خوشی ہو یا غم اس ولی اللہ کا مزار عوام کی داخلی زندگی میں اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔

"کچھ فاصلہ پر کھیتوں کے اُس پار اکل صاحب کا مزار ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس مزار کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ جب کبھی بچے مہلک امراض میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو اُن کے والدین ان کے بالوں کی 'چوٹی' مزار پر چڑھاتے ہیں۔" ذیل کے اقتباس کا بھی مقابلہ کیجئے۔"

"ہندو اور مسلمانوں میں شاذ و نادر ہی جھگڑے ہوتے ہیں۔ دونوں جماعتیں مکمل سکون اور اتفاق کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں۔ ہر دو جماعت کے افراد کی اکثریت تعصبات پر اس حد تک قابو یافتہ ہو گئے ہیں کہ سب ایک ہی حقہ پی لیتے ہیں۔" (ٹیلر: تذکرہ ڈھاکہ ۱۸۴۰ء صفحہ ۲۵۷)

جہاں تک مذہبی رواداری کا تعلق ہے یورپ اور ہندوستان کا مقابلہ کافی بصیرت افروز ہے۔ کچھ زمانہ قبل تک یورپ کی تاریخ نفرت انگیز مذہبی ستم آرائیوں کی داستان رہی ہے نہ صرف صلیبی مجاہدین' جن کو پطرس راہب (پیٹر وی ہرمٹ)' اور اس جیسے لوگوں نے اپنی شعلہ بار بددعاؤں اور فصیح و بلیغ خطابت سے اکسایا، مقدس قبر مسیح کو کفار کے قبضہ سے بحال کرنے کی خاطر سینہ فگار، محرومیوں اور مصائب کا شکار ہوئے بلکہ صدیوں تک یورپ کا سینہ اُن خونریز اور طولانی جنگوں سے پاش پاش اور داغدار رہا جن کی بنیاد مذہبی تعلیمات پر قائم کی گئی تھی۔

اب ذرا یورپ کے تاجداروں کا مقابلہ ان کے ہندوستانی معاصرین سے کیجئے۔

"یہ بات بلا وجہ نہ تھی کہ چارلس پنجم نے اپنی زندگی کے خاتمہ پر فخریہ کہا کہ اس نے اپنے ملک کو ہمیشہ ملک پر ترجیح دی اور یہ کہ اس کی تمناؤں کا مقصد اولیں عیسائیت کے مفاد کو برقرار رکھنا تھا۔ جس جوش و خروش کے ساتھ وہ اپنے ملک کی خاطر نبرد آزما رہا اس کا اظہار اس کی ان شدید کوششوں سے ہوتا ہے جو ممالک تحت البحر (ہالینڈ، بلجیم، ڈنمارک) میں بدعت و زندقہ کے خلاف وہ عمل میں لایا۔ ہمعصر اور مستند راویوں کا بیان ہے کہ چارلس پنجم کے عہد حکمرانی میں نیدرلینڈ (بلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک) کے پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان انسانوں کو مذہبی اختلاف کی بنا پر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ .... ۱۵۲۰ء اور ۱۵۵۰ء کے درمیان اس نے مسلسل قوانین شائع کئے جن کا منشا یہ تھا کہ بدعت و زندقہ کے مجرمین کے سر اڑا دئے جائیں یا زندہ جلا دیا جائے یا ان کو زندہ دفن کر دیا جائے" (تاریخ تہذیب مصنفہ بکل)

"ڈچ لوگ اصلاح شدہ تعلیم کو اختیار کرنا چاہتے تھے اور ان میں سے اکثر نے اس کو اختیار بھی کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ فلپ (۱۵۵۵ء سے ۱۵۹۸ء تک) نے ان کے خلاف وحشیانہ جنگ چھیڑ دی جس کے شعلے تیس سال تک بھڑکتے رہے اور جس کو اس نے تادم واپسیں جاری رکھا کیونکہ وہ عزم مصمم کر چکا تھا کہ اس مذہب کو فنا کر کے چھوڑیگا۔ اس کا فرمان تھا کہ ہر وہ بدعتی جو توبہ کرنے سے انکار کرے نذر آتش کر دیا جائے مظلومین 'نیدرلینڈ' کی تعداد کا صحیح علم ہمارے پاس موجود نہیں لیکن 'الوا' نے فاتحانہ طور پر فخریہ کہا تھا کہ پانچ یا چھ سال کی عملداری میں اس نے اسی ہزار سے زائد انسانوں کو بیرحمی کے ساتھ تہ تیغ کیا ہے" (آئبیڈ)

اس ہیبتناک داستان کے مقابلہ میں ہندوستان نمایاں طور پر پاک اور درخشاں نظر آتا ہے۔ ساحل مالابار کے اندرونی حصہ میں مسلمانوں کی یورشیں کامیاب نہ ہو سکیں اور اس علاقہ کے ہندو راجگان کامل طور پر آزاد رہے' لیکن ان کی روح رواداری تحسین و ستائش کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ پہلی اور دوسری صدی میں جب شام کے عیسائیوں نے علاقہ کوچین اور ٹراونکور میں پہلے پہل قدم رکھا تو ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ لوگوں نے آؤ بھگت کی اور مذہبی رسومات کو بلا روک ٹوک ادا کرنے کی اجازت دیدی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹراونکور کی آبادی کا پورا ایک تہائی حصہ عیسوی مذہب کا پیرو ہے۔ جب پارسی خاص اپنے وطن میں مظالم سے تنگ آکر ساحل بمبئی کی طرف روانہ ہوئے تو جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ ہندو راجہ نے

اُن کو پناہ دی۔

اور ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں چودھویں صدی اور اس کے مابعد محض مذہب کی بنا پر ہندوؤں کے لئے حقوق شہریت پر پابندیاں یا محرومیاں عائد نہیں کی گئیں۔ اور حکمرانوں کی پالیسی میں فراخدلی اور رواداری کی روح کا غلبہ تھا۔ برخلاف اس کے کچھ دنوں پہلے تک انگلستان میں نہ صرف کیتھولک فرقہ بلکہ کلیسائے انگلستان سے اختلاف رکھنے والے پروٹسٹنٹ فرقے بھی محرومیوں کا شکار بنائے جاتے رہے ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس سے انگلستان کی تاریخ دستوری کا ہر مطالعہ کرنے والا آگاہ ہے۔

"ٹسٹ ایکٹ" (جو چارلس دوم کے عہد میں نافذ کیا گیا تھا) ایک ایسی کسوٹی تھی جس کے ذریعہ سے تمام کیتھولک عیسائی سرکاری عہدوں سے محروم کر دئے گئے۔ اس ایکٹ سے مقصد تھا اور اس کا منتہا یہ تھا کہ وہ تمام عہدہ دار جو در پردہ کیتھولک عقائد رکھتے تھے اپنے اصل رنگ میں ظاہر ہو جائیں۔

رائے عامّہ کو متاثر کرنے اور آئندہ ترقی کے لئے نہایت ضروری وہ قدم تھا جو مذہبی رواداری کی طرف اٹھایا گیا۔ بالآخر ۱۸۲۸ء میں ٹسٹ ایکٹ منسوخ کیا گیا اور دوسرے سال اس سے بھی زیادہ اہم قانون "آزادیٔ فرقہ کیتھولک" منظور کیا گیا۔

اس قانون آزادی نے کیتھولک فرقے کے لوگوں کو پارلیمنٹ کے ہر دو ایوان کی ممبری اور باستثناء چند حکومت کے جملہ عہدوں پر تقرری کے حقوق عطا کئے۔ اس سلسلہ میں مزید اصلاحات کی زیادہ ضرورت باقی نہ رہی لیکن ۱۸۵۸ء تک یہودیوں کو پارلیمنٹ میں داخلہ کی اجازت نہ ملی اور ۱۸۷۱ء تک "نان کنفارمسٹ (وہ پروٹسٹنٹ فرقے جو کلیسائے انگلستان سے متفق نہ تھے) فرقوں کو یونیورسٹیوں میں مساوی حقوق حاصل تھے۔

(اقتباس از تاریخ دستوری انگلستان مصنفہ جارج برٹن ایڈمس۔ ایڈیشن ۱۹۲۳ء)

ایک فرانسیسی فلسفی نے سچ کہا ہے:۔

"ان صفات کے یہ دو امیر البحر فرمانروا 'انٹونئس پائیس' اور 'مارکس آرلیئس' گزرے ہیں جنھوں نے دُنیا کی سب سے بڑی اور عدیم المثال سلطنت پر حکومت کی ہے۔ تختِ سلطنت پر ایسی موروثی عقل و دانش کی نظیر تاریخ میں صرف ایک ہی ملتی ہے۔ وہ بابر۔ ہمایوں اور اکبر کا سلسلہ ہے۔ اکبر بادشاہ 'مارکس آرلیئس' سے بے انتہا مشابہت رکھتا ہے۔"

افکارِ محمود

تخیّل میں جب حد سے گزر جاتا ہوں — عالم نیا ہوتا ہے جدھر جاتا ہوں
ہر نقش سے کھینچتا ہوں دلکش تصویر — اور پھر اسی تصویر سے ڈر جاتا ہوں

بے مہروں سے چاہ کر کے رہ جاتا ہوں — حسرت سے نگاہ کر کے رہ جاتا ہوں
ہنستے ہوئے دیکھتا ہوں جب کلیوں کو — گلشن میں اک آہ کر کے رہ جاتا ہوں

گر حُسن کی تشریح رقم ہو جائے — دوزخ بھی نمونۂ ارم ہو جائے
تخلیق کے پردے سے اُٹھا دوں جو نقاب — دُنیائے جمال اسی میں ضم ہو جائے

اندیشۂ فردا میں عبث روتا ہے — تقدیر کی لوح کوئی یوں دھوتا ہے
جینا ہے تو تقدیر پرستی سے نکل — پھر دیکھ کہ تدبیر سے کیا ہوتا ہے

محمود اسرائیلی

آفتاب

عشق کو دل سے تعلق دل کو سوزِ غم سے ربط — فطرتِ مے نوش کو آئینِ کیف و کم سے ربط

ہے ازل سے نیستی کو ہستیِ آدم سے ربط — اور شعاعِ آفتابِ صبح کو شبنم سے ربط

آہ کیا شے ہے یہ فطرت کے "تعلق" کا نظام

سب اسی کا عکس ہیں کیا روز و شب کیا صبح و شام

مالنوں کو گلستاں میں پھول چنتے دیکھ کر — کونپلوں کو باغ میں سر اپنا دھنتے دیکھ کر

اور پپیہوں کو غم سوزاں سے بھنتے دیکھ کر — کوہساروں کو حدیثِ عشق سنتے دیکھ کر

صبحدم سینہ فلک کا درد سے شق ہو گیا

فرطِ حیرت سے مہِ نو کا منہ فق ہو گیا

بربطِ نوریں پہ بھیروں راگنی گاتا ہوا — ساز سے کرنوں کے روشن راگ برساتا ہوا

اپنی موسیقی سے دنیا بھر کو گرماتا ہوا — زندگی کی موج ہر اک شے میں دوڑاتا ہوا

پردۂ مشرق سے ساقیِ سحر پیدا ہوا

بادۂ مشرق بدست و نغمہ گر پیدا ہوا

دیر میں ناقوس مندر میں گجر بجنے لگا — میکدہ میں حلقۂ زنجیرِ در بجنے لگا

جنبشِ مضراب سے سازِ سحر بجنے لگا — خود بخود سازِ خموش بحر و بر بجنے لگا

روحِ ہستی جاگ کر محوِ ترنم ہو گئی

زندگی بیدار ہو کر رقص میں گم ہو گئی

لالہ و سرو و سمن نخل و شجر روشن ہوئے — سبزۂ کاہیدہ پر لعل و گہر روشن ہوئے

صحنِ کعبہ مندروں کے بام و در روشن ہوئے — کوہ و صحرا دیر و کعبہ بحر و بر روشن ہوئے

آسماں روشن ہوا اور خاکداں روشن ہوا!

پرتوِ انوار سے سارا جہاں روشن ہوا

اے نقیبِ صبح اے سرچشمۂ امواجِ نور — اے کلید خمستانِ صبح، ساقی بغرور

ہے شعاعِ گرم تیری لمعۂ صد برقِ طور — تیرے دم سے ہر رگِ ہستی میں اک موجِ فتور

ذرّہ ذرّہ زندگی کے نور سے تابندہ ہے

زندگی تابندہ ہے تابندگی رخشندہ ہے

گوہرِ شبنم کے قطرے موتیوں کا یہ کھار — یہ عروسِ صبح کے سینے پہ ہیروں کی بہار

یہ سمندر یہ بیاباں یہ چمن یہ کوہسار — یہ مرقص ندیاں گاتے ہوئے یہ آبشار

سب کو تو نے روشنی دی جگمگانے کے لئے

قاسمِ انوار ہے تو اک زمانے کے لئے

جادۂ افلاک کے اے مرکبِ نوریں رکاب — اے زمیں کی نوجوانی آسمانوں کے شباب

عالمِ موجود میں تیرا نہیں کوئی جواب — خاک ہیں تیرے قدم کی کہکشاں و ماہتاب

قلبِ فطرت کا جحیم افروز انگارہ ہے تو

پھوٹ کر مرکز سے میدانوں میں آوارہ ہے تو

ناظرِ عالم ہے تو اک آتشیں منظر ہے تو — جوہرِ آئینہ ہے آئینۂ جوہر ہے تو
فطرتاً نظّارۂ خاموش کا خوگر ہے تو — دہر کی تاریخِ پارینہ کا اک دفتر ہے تو
تیری کرنیں رازدارِ عظمتِ دیرینہ ہیں
تیرے جلوے یادگارِ عشرتِ دوشینہ ہیں

روشنی تیری متاعِ خانۂ آشفتہ حال — تیری کرنیں ہیں کسانوں کیلئے تاروں کی شال
اور مزدوروں کو پچھلی رات سے تیرا خیال — شب سے ہے منعم کے دل پر بھی تری مہرِ جلال
تو قریبِ دور کے احساس سے آزاد ہے
خواجہ و مزدور کے احساس سے آزاد ہے

ہر کرن تیری ہے دنیا کو پیامِ زرنگار — خمستانِ انجم و کوکب کا جامِ زرنگار
خود کلیمِ زرنگار و خود کلامِ زرنگار — اک خطیبِ زرنگار اور اک امامِ زرنگار
اپنا خطبہ کیف میں جس وقت فرماتا ہے تو
دہر کو سیلابِ زرّیں میں ڈبو جاتا ہے تو

غنچۂ و یاسمن، گل کا تبسم رقص میں — تیری خاطر ہے بہارِ رنگ و بوئے گم رقص میں
ہے سمندر اور سمندر کا تلاطم رقص میں — خاکداں کا ذکر کیا، ہے بزمِ انجم رقص میں
اک جہاں تیرے لئے شام و سحر آوارہ ہے
تو ہے قائم اپنے مرکز پر مگر سیارہ ہے

صبح کے ہلکے دھندلکے میں پری پیکر ہے تو — یا عروسِ صبح کا اک زرفشاں جھومر ہے تو
یا برہمن کی جبیں کا قشقۂ انور ہے تو — یا فلک کے ہاتھ میں سونے کا اک ساغر ہے تو
یا کسی شاعر کے دل کا داغ ہے دہکا ہوا
یا بہشتِ حسن کا اک پھول ہے مہکا ہوا

سوئے مغرب جا رہا ہے رنگ برساتا ہوا — جیسے اک مزدور دن بھر کا تھکا ہارا ہوا
سرخ آغوشِ شفق میں شعلہ ساں بھڑکا ہوا — جس طرح کوئی سپاہی خون میں ڈوبا ہوا
نونہالانِ چمن کے خون سے رنگیں ہے تو
کیا شہیدانِ وطن کے خون سے رنگیں ہے تو

غنچہ و گل ہوں رہا اور آشیاں آزاد ہو — بلبلیں آزاد ہوں اور گلستاں آزاد ہو
ایشیا آزاد ہو ہندوستاں آزاد ہو — پنجۂ ظلم و ستم سے کل جہاں آزاد ہو

ہم بھی ہوں آزاد تیری ہی شعاعوں کی طرح
اور دنیا میں رہیں زندہ شجاعوں کی طرح

ساغر نظامی

پیاروں کی امانت

نفیسہ اپنی تمام عمر میں اپنے ضلع سے باہر نہیں گئی تھی لیکن اب شوہر کی ملازمت کی وجہ سے ناگزیر تھا کہ وہ اپنے نوجوان بیٹوں کو ساتھ لیکر وطن کو خیرباد کہے۔ گو وہ بچی نہیں تھی لیکن ماں بھائی اور محلہ والوں سے رخصت ہوتے وقت وہ نو بچوں کی ماں ہوتے ہوئے اپنے سب سے چھوٹے بچے کی طرح بے اختیار رو رہی تھی۔ اس کے شاعر بیٹے کے کمرے میں اسباب کے پلندے اور بکس بے ترتیبی کے ساتھ بکھرے ہوئے تھے۔ اسی انبار میں ایک طرف اس کی بیٹی شاہجہاں کی ہفت رنگ بلی "یاسمن" اپنے بچوں کو چاٹ رہی تھی۔ جسے ساتھ لیجانے کے متعلق شاہجہاں کے باپ نے ایک قطعی انکاری فیصلہ کر دیا تھا۔ شاہجہاں جی کے پاس آئی اور بولی۔ تو ہوا یاسمن یہیں رہجائیگی؟ ہاں بہن کیا کریں "اُن" کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا! ؟

اونہہ ہونہہ، ہم تو لے چلیں گے۔ ساری عمر ساتھ رہی اب کیوں چھوٹ جائے شاہجہاں نے روہانسے ہوکر کہا، نفیسہ بولی بیٹی چلو لو وہ تمہارے بھائی جان بھی آگئے۔ اسباب اُٹھنے لگا گھوڑا گاڑی تیار کھڑی ہے۔

اس نے یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ نفیسہ کا شاعر بیٹا کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ اس وقت ضد کی ضرورت نہیں ہے میں چند روز کے بعد آؤں گا اور یاسمن کو معہ بچوں کے حفاظت کے ساتھ سہارنپور لے جاؤں گا۔ رات ہی اس نے بچے دئے ہیں اس حالت میں یکو نکر لیجایا جا سکتا ہے۔ لیجانا ممکن بھی تھی مگر میاں کی مرضی نہیں ہے۔ یہ کہکر اس نے بکس اور پلندے اُٹھانے شروع کئے۔ یاسمن نے ایک حسرت بھری نگاہ سکندر پر ڈالی اور کہا "میاؤں" اس ایک آواز سے جو مخلصانہ، پاکیزہ بن محبت اور فراق کے اثرات سے بھری ہوئی تھی، سکندر کی تمام ہستی لرز گئی۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور سینہ ایک آگ سے دہکنے لگا وہ اپنے خیال میں یاسمن سے گفتگو کرنے لگا۔

میری پیاری تو میرے وطن کے سارے اعزا اور دوستوں سے مقدس و پاک ہے تیرا دل حیوان ہوکر انسان کی محبت سے لبریز ہے آہ اس شہر کا "رئیس اعظم" جس کی قبائے عزت اخیار کی بدمعاشوں کے ہاتھوں دھجیاں ہورہی تھی جس کے اقتدارات نے مدافعت کرنے سے جواب دے دیا تھا۔ میں نے جس کے لئے اپنی ہستی کو خطرے میں ڈالکر سارے وطن کو دشمن بنالیا مگر اس کو بچایا وہ انسان ہوکر مجھے دور سے ایک الوداعی کارڈ بھی نہیں لکھتا اور تو حیوان ہوکر اپنی دردناک آواز سے میرا دامن پکڑتی ہے۔ میرا وہ عزیز جس کے بغیر میں ٹھنڈے پانی کا ایک قطرہ اور روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے حلق سے نیچے نہیں اتار سکتا تھا جو اعزا میں میرے لئے سب سے افضل تھا جس کا خیال میرے سینے کے تمام بسط و کشاد کو گھیرے ہوئے تھا اور جس کی عظمت میرے ایک باپ اور استاد سے کم نہ تھی وہ مجھ سے چلتے وقت بات نہیں کرتا۔ وہ احباب جن کے استقبال میں میں سرنگوں ہو جاتا تھا جو صبح سے شام تک میرے قصیدہ گو تھے آہ ان میں سے ایک بھی جو مجھ سے حقیقی طور پر کہتا کہ تم کیوں جا رہے ہو یہ دنیا یہ انسان اس ایک لمحہ میں اس ایک لمحہ میں جو تیری نگاہ حسرت خیز کو میرے متاثر ہونے کے لئے چھوڑ گیا ہے۔ میری نگاہوں سے مینارۂ عظیم کی چھتری کی طرح ابدی طور پر گر گئی ہے۔ آ میں اپنے آنسو تیرے بالوں میں جذب کروں یہ دوستوں کے رومال عزیزوں کے دامنوں اور بہنوں کے دوپٹوں سے زیادہ جاذب ہیں۔ تیری آنکھوں کی شعاعیں جو حسرت کے نور سے ایک دائرہ غمگیں بنی ہوئی ہیں۔ اس "رئیس اعظم" کے خزینوں اور دفینوں سے زیادہ قیمتی ہیں جو کمینہ، سفلہ پرور اور احسان فراموش ہے جس کی سیہ کاریاں اندیش زن فطرت تیرے تیز پنجوں اور مہلک دانتوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ اپنے تنفس کی موسیقی کو میرے بہرے کانوں کے قریب کردے جو دنیا اور انسان کے حیوانی سلوک سے مانوس ہوگئے ہیں میں آج اس منزل حیات پر ہوں کہ مجھے انسانی رخساروں، آوازوں اور انسانی وجود سے زیادہ تیری غیر پاکیزہ موچھوں کے بالوں اور کرخت تنفس میں تسکین محسوس ہوتی ہے۔" یکایک یاسمن کے نوزائیدہ بچے متحرک ہوکر اس کی آغوش میں کلبلائے اور وہ ان میں سے ایک کو چاٹنے لگی۔ سکندر نے دل میں کہا اگر محبت کی کوئی پوشیدہ زبان ہے تو میں نے یاسمن سے سب کچھ کہدیا ہے۔ یہ کہکر وہ بکس اور پلندے لئے ہوئے کمرے سے باہر ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کھڑکیوں اور دروازوں میں جھکی ہوئی لڑکیوں اور بوڑھی عورتوں کی ہلکی ہلکی چیخوں اور تیزی سے بہے ہوئے آنسوؤں میں نفیسہ کی گاڑی روانہ ہوگئی۔ "دقتی تاثر" دروازے پر دہاڑیں مار رہا تھا اور سچی محبت بنگلے کے ایک کمرے میں بند تھی۔

(۲)

دوسرے دن نفیسہ کی ماں "یاسمن" کو پیاروں کی امانت سمجھ کر اپنے گھر لے آئی جہاں صرف وہ تھی اور اس کے دونوں جوان بیٹے یا نفیسہ کی یاد ... یاسمن کے بند آنکھوں والے بچے اور آنسوؤں کی وہ جھڑی جو یاسمن کے نرم بالوں یا قدرت کی نازک ترین صنعت یاسمن کے نوزائیدہ بچوں کی پشت پر پڑ رہی تھی۔ نفیسہ کی ماں یاسمن اور اس کے خاندان کی حفاظت میں ہمہ تن محو تھی اور اس کی توجہ اس طرف اس درجہ مبذول تھی گویا یاسمن نفیسہ ہے اور اس کے بچے نفیسہ کے بچے۔ لیکن یاسمن کی طبع اس ماحول کے لئے بیتاب نظر آرہی تھی جس میں اس کے لئے معصوم بچوں کے گیت، شاہجہاں کی گود، ایک نوجوان شاعر کی محبت اور ہمدردی کی سی تسکین تھی۔ وہ رسیوں سے باندھ دی جاتی مگر انہیں توڑ کر اسی بنگلہ میں پہنچ جاتی جس میں اب ایک دوسرا خاندان آباد تھا۔ مگر اس کی نگاہیں مایوس ہو جاتیں اور وہ گردن ڈالے اپنی گداز دم کی بیکسی کے ساتھ پھر حمید کے مکان پر آجاتی۔

کوئی انسان ہوتا تو اس بے معنی شغل میں وقت خراب نہ کرتا۔ لیکن وہ بلی تھی جس کے دماغ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ بہت کچھ انسان سے مشابہت رکھتا ہے تاہم وہ انسان نہ تھی۔ اسے انسانی نطق و فہم کی برکتوں سے قدرت نے محروم کرکے ایک جانور بنایا تھا

لیکن آہ اس کا دل انسانوں کے دوروں سے بہتر تھا وہ اپنے ہمدم و دمساز انسانی خاندان کی جستجو میں تھی آخر وہ کہاں گیا جس کی آغوش میں میں زندگی گزارتی تھی۔ وہ لڑکے کہاں ہیں جو میرے بچوں کو اپنے بوسوں سے پاکیزہ کرتے تھے اور جو مجھے اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے۔ اور شاہجہاں! آہ وہ ایک دفعہ پھر مجھے مل جائے تو میں اس کے دوپٹے پر آخری نیند لے لوں یا اپنے شاعر کے معطر لحاف میں خاموشی سے ابدی طور پر سو جاؤں تاکہ یہ خدشہ ہی نہ رہے کہ میں کبھی ان سے علیحدہ بھی ہو سکتی ہوں۔ اس کی نگاہوں اس کی چال اس کی بیتابی افسردگی اور بے کیف آنکھوں سے ان اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ اس نے کھانا پینا بالکل ترک کر دیا تھا وہ نہ دودھ پیتی تھی نہ پانی نہ گوشت کھاتی تھی نہ روٹی لیکن بنگلے کے چکر ضرور کاٹتی تھی جس کے متعلق انسان بھول چکے تھے کہ یہاں کوئی مایۂ ناز خاندان رہتا تھا البتہ سارے انبوہ انسانی میں نفیسہ کی ماں ایک ایسی خاتون تھی جس کا دل غم سے بیٹھا جاتا تھا جو بیٹی کی جدائی میں ہر وقت آنسو بہاتی تھی اور بطور بسہر اگر اس کے پاس کوئی شغل تھا تو وہ "پیاروں کی امانت" یعنی یاسمن اور اس کے بچے۔

(۳)

کچھ دن کے بعد حمیدہ کا بڑا نواسہ سکندر اپنے وطن آیا۔ یاسمن اسکے پاؤں سے لپٹ گئی۔ اس کا دل بھر آیا کیونکہ نانی کے آنسوؤں اور بلی کے استقبال کے علاوہ ان عزیزان محبت میں سے کوئی نہ تھا جو اس کی آواز پر سر جھکاتے تھے اور جن کے لئے اس نے ایوان خلوص و محبت کا ہر دروازہ کھول رکھا تھا۔ آہ انسان کتنا خود غرض ہے اور کتنا دشمنِ محبت" ساری کائنات میں اس فقرے کی تشہیر کر دیتا کہ انسان اپنی جنس کے فریب سے آگاہ ہو جائیں۔

سکندر سے اس کی بزرگ نانی نے کہا۔ "بیٹے کیا اپنی امانت لینے کے لئے آئے ہو تو کیا تم سچ مچ یاسمن اور اس کے بچوں کو لیجاؤ گے جن کی آنکھیں ابھی کھلی ہیں اور جن کے نام میں نے تمہارے ناموں پر رکھے ہیں۔ جب ان میں سے بھورا بچہ میرے قریب آتا ہے تو میں خیال کرتی ہوں چھوٹا نیصر میری طرف آ رہا ہے اور جب وہ میرے پاؤں کو مس کرتا ہے تو میں اسے گود میں اٹھا لیتی ہوں اور چومتی ہوں۔ کیا تم ان بوسوں کا خاتمہ کرنا چاہتے ہو؟"

نہیں نہیں سکندر نے متاثر ہو کر کہا' میں تو یہاں سے دور سفر پر جا رہا ہوں اس دورہ میں یاسمن اور اس کے بچوں کو نہ لے جا سکوں گا۔ مگر شاہجہاں اور نیصر اس کے لئے بہت بیچین ہیں اس لئے کبھی نہ کبھی لے ضرور جاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر ہونے لگا یاسمن نے وہی حسرت خیز نگاہ اس پر پھر ڈالی۔ سکندر نے ایک آہ سرد بھری اور فطرت کے بھید دل پر غور و فکر کرتا ہوا سفر پر روانہ ہو گیا۔ آہ محبت کتنی محدود ہے اور کس درجہ لامحدود۔

(۴)

سفر سے واپس آنے پر سہارنپور میں جہاں اب اس کے والدین کی مستقل رہائش تھی سکندر اپنی میز پر بیٹھا ہوا ایک تصنیف کے مسودات پر نظر ثانی کر رہا تھا کہ اس کے وطن سے ایک مکتوب آیا جس میں لکھا تھا۔

"آج صبح محلہ کے ایک مکان کے صحن میں یاسمن شہتیروں کے انبار میں مردہ لٹکی ہوئی پائی گئی اس کی موت اتفاقیہ واقع ہوئی اور غالباً اس طرح کہ کل شب کو وہ رسّی توڑ کر حسب عادت آپ کے بنگلے کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں شہتیروں کے انبار سے گزری۔ رسّی کا بڑا حصہ اس کے گلے میں لٹک رہا تھا جو ایک شہتیر میں کسی طرح الجھ گیا اور جب اس نے بستی کی طرف جست کی تو پھندہ سخت ہو گیا۔ اسے پھانسی لگ گئی۔ افسوس اس کی موت ایک افسوسناک موت کی طرح اہم محسوس کی جا رہی ہے۔" ———————

سکندر نے فرطِ غم سے مسودہ پھینک دیا اور متحیر رہ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دنیا کے محبوب ترین فرد کا انتقال ہو گیا وہ یاسمن کے مرنے کی اطلاع سے کائنات میں ایک خاص کمی محسوس کر رہا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ آج اس کا وطن محبت سے خالی ہو گیا ہے۔ اس نے کہا "آہ یاسمن" تو ہماری جستجو میں بجائے ہم تک آنے کے خدا تک پہنچ گئی۔ تیری محبت لازوال اور تیرا اُنسِ حیوانی عشقِ انسانی سے بالاتر تھا۔ اور ہمیشہ رہیگا اگر میں تیری موت کے وقت تجھ سے قریب ہوتا تو۔۔ تیری کھال حاصل کر کے اس کا ایک تاج بنواتا اور اسے محفوظ کر لیتا لوگوں کو دکھاتا اور کہتا کہ اے انسانو یہ اس چوپائے کی کھال ہے جو محبت کی راہ میں شہید ہو گیا۔ آہ تیرے بچے وہ میرے بیٹے ہیں میں انہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔ یہ کہکر وہ اُٹھا اور اسباب درست کرنے لگا۔ علی الصباح جبکہ درختوں کی شاخوں میں صبح کی ہواؤں نے گیت گانے شروع نہیں کئے تھے آسمان پر ستارۂ صبح جگمگا رہا تھا اور ہلکی ہلکی چاندنی سے کائنات منور تھی کوٹھوں پر لڑکیاں کام کاج کے لئے نہیں چڑھی تھیں سکندر اپنے وطن کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۵)

حمیدہ نفیسہ کی ماں بیٹھی ہوئی رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی "میں سکندر کو کیا جواب دونگی آہ پیاروں کی امانت محفوظ نہ رہ سکی۔ آہ وہ سات رنگ کی چنبیلی' نرم بالوں والی شریف شیریں محبت کی بندی ہائے کیسی لٹکی کی لٹکی رہ گئی ——— اس گھر والوں نے اس کی تڑپ اور جھٹکاوں پر بھی توجہ نہ کی۔ آہ محبت کرنے والا بے زبان حیوان پھانسی پا رہا تھا اور انسان دیکھ رہا تھا۔ خدا انہیں غارت کرے اُٹھتے بیٹھتے اور اس کا پھندا کھول دیتے ——— جو کچھ بھی ہو مگر اب میں نفیسہ اور اس کے بچوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ ان کی پیاری چنبیلی مجھ سے ضائع ہو گئی اور اس کے بعد ایک بچہ بھی اور اب ایک پیچش میں مبتلا ہے کیا اچھا ہوتا جو میں اس امانت کو لینے سے انکار کر دیتی۔" وہ یہیں تک کہنے پائی تھی کہ سکندر مکان میں داخل ہوا اور بستر ایک طرف رکھ کر بولا۔ نانی جی کیا "یاسمن" واقعی مر گئی؟!

اس سوال کے جواب میں ضعیف خاتون کا مسلسل گریہ تھا اور سکندر کا شانہ اس وقت یاسمن کا غم اس طرح ہو رہا تھا گویا وہ خاندان کی ایک لڑکی تھی جسے موت نے ضائع کر دیا تھا۔

(۶)

دوسرے دن سکندر وطن سے واپس ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ الہ آباد سے اسے ایک تار ملا جس کی تعمیل میں اُسے فوراً الہ آباد روانہ ہو جانا پڑا اور پیاروں کی امانت پھر وطن میں رہ گئی جس میں قدرت نے خیانت کر دی تھی اور جو مزید خیانت کے لئے آمادہ نظر آتی تھی دو تین دن کے بعد سکندر الہ آباد سے واپس ہوا۔ یاسمن کا مریض بچہ اپنی ماں کے پاس پہنچ چکا تھا اور بزرگ حمیدہ کے آنسو ابھی اس کی آنکھوں میں بھی خشک نہ ہوئے تھے بیٹی کی جدائی کا غم اور پیاروں کی امانت کی ابتری ایک ضعیف و زخم خوردہ دل میں ناسور ڈالے دیتی تھی۔ آخر وہ وقت آ گیا جب یاسمن کے دو بچے سکندر کی خریدی ہوئی ٹوکری میں بٹھائے گئے اور بزرگ حمیدہ نے انہیں اس طرح پیار کیا۔ اس طرح آنسو بہائے جس طرح اپنے پیارے نواسوں سے رخصت ہوتے وقت بہائے تھے۔

سکندر آہستہ آہستہ تانگے کی طرف بڑھ رہا تھا، دل کا کٹورہ آنسوؤں سے لبریز تھا اور خیال میں یاسمن پھانسی پر لٹکی ہوئی تھی جس کی نکلی ہوئی آنکھوں سے وہ حسرت خیز

حسرت بھری نگاہ برس کر سکندر کے کلیجے میں پیوست ہوئی جاتی تھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ تم کیوں جا رہے ہو اور کہاں جا رہے ہو۔ اے میرے خوبصورت شاعر!

آہ! سکندر کا سینہ گرمیٔ تاثیر سے پھک گیا اس نے ان انسانوں پر ایک متبسم نگاہ ڈالی جو اس سے دنیا سازانہ اخلاقی باتیں کر کے مجلسی ہوس کی تکمیل کر رہے تھے۔

سکندر کے خیال میں ان کی یہ حیوانیت ناقابل جواب تھی مگر یاسمن کی روح تھی اور گفتگو کا لامتناہی سلسلہ اس کا دل رو رہا تھا۔ روح دہاڑیں مار رہی تھی اور پیاروں کی امانت کا کارواں لٹ لٹا کر منزل کی طرف رواں تھا۔

ساغر نظامی

باخبری اور بے خبری

میں سوچتا ہوں کہ

انسان جب بے خبر ہوتا ہے تو باخبر ہوتا ہے ـــــ یا ـــــ جب باخبر ہوتا ہے تو بے خبر ہوتا ہے ـــــ یا اگر ـــــ جب باخبر ہوتا ہے تو باخبر ہوتا ہے اور جب بے خبر تھا ـــــ تو ـــــ انسان اپنی تمام مساعی اور ان کے نتائج کا عارف کیوں نہیں ہے؟

رات ایک بزرگ نے مجھ سے یہ فرمایا کہ ـــــ "آفتاب پر نگاہ ڈالنے والے اگر ایک ذرہ کو دیکھ لیں تو عمر بھر ہوش نہ آئے" ـــــ میں نے سوچا ـــــ کیا ان کا مطلب یہ ہے کہ ـــــ "انسان جب بے خبر ہوتا ہے تو آفتاب اس کے سامنے ذرہ کی برابر ہوتا ہے اور جب وہ باخبر ہوتا ہے تو ہر ذرہ اس کے لئے آفتاب ہو جاتا ہے" ـــــ مگر اسی وقت کسی نے یہ کیا کہا تھا کہ ـــــ "انسان جب آفتاب یا ذرہ پر نگاہ ڈالتا ہے تو وہ نہ بے خبر ہوتا ہے نہ باخبر۔ یہ سب نگاہ اٹھانے سے پہلے کی باتیں ہیں" ـــــ کیا سچ ہے؟

تمام جاندار اور بے جان موجودات عالم ـــــ سوائے انسان کے ـــــ اپنے مقاصد حیات میں یکسو ہیں ـــــ تو ـــــ کیا یہ امر اس وجہ سے ہے کہ تمام موجودات عالم یا تو بے خبر ہیں یا باخبر۔ انسان باخبر بھی ہے اور بے خبر بھی

کچھ دن ہوئے ایک مجذوب سر راہ مل گئے تھے فرمانے لگے ـــــ باخبری کا کمال یہ ہے کہ انسان صرف وہی دیکھے جو اسے دکھایا جائے وہی سنے جو اسے سنایا جائے اور وہی محسوس کرے جو اسے محسوس کرایا جائے ـــــ مگر خدا جانے کیوں جب میں نے ان سے ضمناً عرض کیا کہ ـــــ "یہ انسان کی باخبری ہوگی یا بے خبری" ـــــ تو وہ مسکرا کر چلے گئے ـــــ میں اب یہ غور کر رہا ہوں کہ خود ان کا عالم کیا تھا۔ ـــــ "بے خبری یا باخبری" ـــــ

انسانوں کی ایک بڑی جماعت اس رائے سے متفق ہے کہ ـــــ "کا نراکہ خبر شد خبرش باز نیامد" ـــــ اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ جب کوئی انسان باخبر ہوتا ہے تو دنیا اس سے بے خبر ہو جاتی ہے؟ ـــــ اگر یہی ہے تو کیا جب وہ بے خبر ہوتا ہے تو دنیا اس سے باخبر ہوتی ہے؟ نہ جانے اہل دنیا بے خبری اور باخبری کو کیا سمجھتے ہیں؟

وہ کونسی منزل ہے جو باخبری اور بے خبری میں امتیاز پیدا کرتی ہے ـــــ اور ـــــ وہ کونسا مقام ہے جہاں بے خبری اور باخبری میں کوئی امتیاز ہی نہیں رہتا ـــــ میں تمام رات اسی خیال میں گم رہا ـــــ پچھلے پہر کو ایک ستارہ ٹوٹا اور مجھے ہنستا ہوا نظروں سے غائب ہو گیا۔ اگر رات کو بے خبری اور دن کو باخبری تصور کر لیا جائے تو صبح کاذب وہ منزل ہے جہاں بے خبری اور باخبری میں کوئی امتیاز نہیں رہتا ـــــ اور ـــــ صبح صادق وہ منزل ہے جو بے خبری اور باخبری میں امتیاز کرتی ہے ـــــ مگر ـــــ میں ابھی تک یہ نہیں سمجھا کہ وہ ستارہ صبح کاذب اور صبح صادق دونوں سے پہلے ہی کیوں ٹوٹ گیا؟

ایک رات جب میں ایک سنیما سے آ رہا تھا تو مجھے ایک بزرگ اسی تماشہ گاہ سے نکلتے ہوئے ملے ـــــ گم تھے بالکل ـــــ اسقدر گم کہ ماحول کے ذرے تک متاثر تھے ـــــ میں نے کہا ـــــ "کیا حال ہے"؟ کہنے لگے ـــــ "بے خبر ہوا جا رہا ہوں کچھ خبر لینے اس تماشا گاہ میں آیا تھا مگر یہاں بھی سب بے خبر نکلے"

میں نے کہا ـــــ "اب کیا مقام ہے آپ کا"؟

کہنے لگے ـــــ "ابھی تو کچھ کچھ خبر ہے!"

میں نے کہا ـــــ "خبر میں بے خبری کا کیا خوف"

کہنے لگے ـــــ "اندیشہ ہے"

میں نے کہا ـــــ "اندیشہ بے خبری میں ہوتا ہے نہ کہ باخبری میں"

کہنے لگے ـــــ "بے خبروں کو ہوتا ہوگا"

میں نے کہا ـــــ "باخبر کے لئے"

وہ مسکرائے اور فرمایا کہ "تم نے میرا ایک بڑا مقام طے کرا دیا"

میں آج تک یہی سوچ رہا ہوں کہ وہ کون سا مقام تھا جو میں نے طے کرا دیا اور کس طرح طے کرا دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ان کی باخبری میری بے خبری کا انتظار کر رہی تھی؟

کیف مراد آبادی

مقامِ حیرت

گلشنِ دہر ہے خاموش ہوائیں خاموش
سازِ فطرت کی طلبگار نوائیں خاموش
حُسن خاموش ہے اور اس کی ضیائیں خاموش
جس طرف جاتا ہوں ملتی ہیں فضائیں خاموش
کہیں آواز نہیں

موج دریا ہے کہیں اور نہ ساحل ہے کہیں
نہ کہیں گل ہیں نہ غنچے ہیں نہ برگِ رنگیں
نہ کہیں سازِ طرب ہے نہ نوائے شیریں
ہر طرف عالمِ حیرت کا ہے نقشِ رنگیں
آسماں ہے نہ زمیں

عالم آئینہ ہے، ہر شاخ و شجر آئینہ
رنگِ شام آئینہ ہے نورِ سحر آئینہ
انجم و شمس ہیں آئینے قمر آئینہ
جس طرف آنکھ اُٹھاتا ہوں اُدھر آئینہ
اور کہیں عکس نہیں

پرتوِ مہرِ حقیقت سے درخشاں ہوں میں
کیفِ نظّارہ سے فردوس بداماں ہوں میں
کثرتِ جلوہ سے ہم رنگِ گلستاں ہوں میں
کتنے رنگین حجابات میں پنہاں ہوں میں
کس جہاں کا ہوں کہیں

اللہ اللہ رے مرے جوشِ جنوں کا عالم
پاؤں رکھتا ہوں کہیں اور کہیں پڑتے ہیں قدم
کس طرف جاتا ہوں، ہے کون سی یہ منزلِ غم؟
غمِ اُلفت کی قسم جلوۂ جاناں کی قسم
مجھے کچھ ہوش نہیں

نہ تصوّر ہے مقیّد نہ تماشا محدود
ہے محیطِ دو جہاں میری نظر کا مقصود
ذرّہ ذرّہ میں ہے تنویرِ جمالِ معبود
ایسے میں کیا خبر بندگی و ہوشِ سجود
کیسا سر کیسی جبیں

ذوقِ عرفانِ حقیقت کی اسی منزل میں
جادۂ رفعت و عظمت کی اسی منزل میں
غلطم رہِ حیرت کی اسی منزل میں
مجھ کو ڈر ہے کہ محبت کی اسی منزل میں
گم نہ ہو جاؤں کہیں

متین الحق کیف مراد آبادی

ایشیا میں دو نئی تحریکات کے آثار

"اتحاد بین المسلمین" اور "اتحاد بین المشرق"

از سر البین بنرجی

ہندوستان اور تمام ایشیا کا امن خطرہ میں

اگرچہ وسطی ایشیا کے متعلق اخبارات میں اطلاعات شائع ہو رہی ہیں مگر کاشغر سے جو خطرہ نظر آرہا ہے اس کی طرف عوام کی توجہ منعطف نہیں ہے، کاشغر سوویٹ روس سے تقریباً ۱۵۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے ماضی قریب میں اس علاقہ کے اندر مسلم جمہوریت قائم کرنے کی جو کوششیں کی گئیں ان کی اہمیت بہت عظیم ہے، لیکن بظاہر لوگوں کو ان کی اہمیت کا اندازہ ہونا ناممکن نہیں ہے باوجود اس کے یہ کہنا مشکل ہے کہ وسط ایشیا میں مسلم شہنشاہیت کا یہ قیام ایشیا میں پین اسلامک تحریک کا در پردہ آغاز ہے۔

میں ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد کے مسائل کے متعلق پوری پوری واقفیت نہیں رکھتا لیکن میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت ایشیا کے مختلف ممالک میں جو واقعات رونما ہو رہے ہیں ان کو تاریخی نقطہ نگاہ سے دیکھنا خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ان واقعات سے نہایت دور رس اور اہم نتیجے رونما ہونے کے عظیم امکانات کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اس وقت جبکہ یورپ کے تمام ممالک میں اقتصادی جنگ شروع ہے تخفیف اسلحہ کانفرنس کے بے سود بحث مباحثہ نے مختلف مغربی اقوام کے حوصلے بڑھا دیئے ہیں۔ اور وہ ہر ممکن طریقے سے فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں سنہ ۱۹۳۴ء میں یورپ میں دو اہم کانفرنسیں ہوئیں۔ ایک روم اور دوسری انگورا میں۔ میری مراد روم میں ہرہٹلر اور مسولینی اور دوسری ایران میں شاہ ایران اور کمال پاشا کی ملاقات سے ہے۔ ان ڈکٹیٹروں نے اپنی زبردست شخصیت سے اپنے ممالک میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا ہے۔

اس سلسلے میں اس غیر معمولی تقریر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ جو چند ماہ ہوئے مسولینی نے کی تھی اور جس میں اٹلی کی سلطنت کو وسیع کرنے کے متعلق اپنے خواب اور مشرق میں اٹلی کے اثر و رسوخ کو وسیع کرنے کے امکانات کا ذکر کیا تھا۔ اس تقریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسولینی سکندر اعظم اور دنیا کے دیگر بڑے بڑے فاتحین کے سے ارادے رکھتا ہے۔

ممکن ہے تاریخ اپنا اعادہ کرے، اور کون جانتا ہے کہ ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں ایک نئی رومن سلطنت قائم ہو جائے جو نہ صرف مشرق قریب اور مشرقی افریقہ ہی میں پھیل جائے بلکہ ایشیا کے وسط تک پہنچ جائے ان حالات میں اس وقت دو یورپین ڈکٹیٹروں کے دماغوں میں اپنی سلطنت کو وسیع کرنے اور نئی بستیاں بسانے کی دھن سمائی ہوئی ہے یہ اتحاد ایک ایسی بڑی اہمیت رکھتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرق اور ایشیا کے اندر مستقبل قریب میں کیا ظہور پذیر ہونے والا ہے۔

شاہ ایران کو درۂ دانیال کے معاینہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی اور اخبارات میں بیان کیا گیا تھا کہ ایک نئے مشرقی معاہدہ پر غور و خوض کیا جا رہا ہے جس میں ٹرکی۔ ایران۔ افغانستان اور عراق شامل ہوں گے۔ چونکہ ان ممالک اور سوویٹ روس کے درمیان تجارتی تعلقات تسلی بخش نہیں۔ اس لئے تجارت کو فروغ دینے کے لئے ان کے درمیان اقتصادی معاہدوں پر بحث مباحثے ہو رہے ہیں۔ کمال پاشا اور رضا شاہ کے درمیان ملاقات ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ ایک سو سال سے ان ہر دو ممالک کے درمیان جو تعلقات چلے آتے ہیں۔ ان سے یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ ٹرکی اور ایران کسی ایسے معاہدے میں شریک ہونے کو تیار نہ ہوں گے جو ان کی اپنی اپنی حدود سے باہر ان کے لئے معاہدہ ثابت ہو۔

بظاہر تو اس کانفرنس کا مدعا باہمی اقتصادی مفاہمت معلوم ہوتا ہے۔ مگر سیاسی دنیا کا اس نتیجہ پر پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں، کہ اس کا کوئی خاص گہرا مطلب ہے۔

یورپ میں ہٹلر اور مسولینی کی اور ایشیا میں رضا شاہ اور کمال پاشا کی ملاقات ایک ایسی بات ہے جس سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے۔ کہ اب کیا کیا واقعات رونما ہوں گے۔ روس جو صدیوں سے ——— ظلم کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اب اٹھ رہا ہے خواب غفلت سے بیدار ہو رہا ہے اور اپنے گرد و پیش کے حالات کا مطالعہ کر رہا ہے۔ سوویٹ روس کی سرحدیں جنوب مغربی حدود پر ایک طرف چینی ترکستان۔ افغانستان کے شمالی حدود سے اور چترال اور گلگت کے اوپر ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد سے ملتی ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ چین کے علاقہ اور مانچوریا نیز مشرق بعید کے سمندروں میں روس کا اثر و رسوخ پھیلا ہوا ہے، حال ہی میں ایک جاپانی اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی تھی۔ کہ چینی ترکستان میں روس اپنے پاؤں جمانا چاہتا ہے۔ جاپان کی یہ حسرت ہے کہ ہر جگہ اپنا اقتدار قائم کرے۔ اس سے برطانوی اور ہندوستانی پبلک کے دلوں میں کئی قسم کے شکوک پیدا ہو رہے ہیں۔ حال ہی میں ٹوکیو سے کئی قسم کی افواہیں پھیلائی گئی ہیں۔ ایک چینی ترکستان میں کسی مسلم حکومت کو اسلحہ اور بارود کی بہم رسانی کے متعلق تھی اور دوسری ہندوستان اور تبت میں کمیونسٹ سرگرمیوں کے لئے ان علاقوں میں ایک زبردست سازش قائم کرنے کے متعلق تھی۔

پان اسلامک اور پان ایشیاٹک تحریکیں

میں نے اپنی کتاب میں ہندوستان کے چند واقعات کا ذکر کرتے ہوئے مشرق میں جاپان کی زیر سرکردگی پان ایشیاٹک تحریک اور مغرب میں مسلمان حکومتوں کی زیر رہنمائی پان اسلامک تحریک کے امکان کا ذکر کیا تھا۔ ان ہر دو

درمیان بالشویک روس وسط ایشیا میں اپنی کاربرآری کے لئے حالات کے مطابق قدم اٹھائیگا جاپان اس کا حامی ہے۔ کہ مغربی اقوام کو ایشیائی اقوام کی آزادی میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں ہونا چاہئے جس سے اس کا مدعا محض یہ ہے کہ اسے ایشیا میں من مانی کارروائیاں کرنے کی اجازت ہونی چاہئے حال ہی میں پان ایشیا ٹک تحریک کے متعلق اخبارات میں ایک نوٹس شائع ہوا تھا۔ جاپان کی یہ خواہش ہے کہ مانچوکوؤ سے یہ تحریک شروع ہو اور اس سے تمام ایشیائی ممالک میں جاپانی تہذیب پھیلائی جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا مختلف اقوام کے درمیان جنگ ..... مشرق میں شروع ہوگی. اگر واقعی یہ خیال درست ہو تو کیوں نہ خطرناک جنگ سے بچنے کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں خدشہ یہ ہے۔ کہ اس جنگ میں شاید انگلستان اور دیگر کئی یورپین ممالک کو دیڑے تو اس جنگ میں ہندوستان ہی سب جھگڑے کی بنا ہوگا۔ ...... میں نے ایک رسالہ میں کشمیر کی موجودہ فرنٹیر پالیسی کے متعلق —— یہ تجویز کی تھی۔ کہ برطانوی گورنمنٹ اور مہاراجہ کشمیر کے درمیان نیا معاہدہ طے ہونا چاہئے۔ جس کی رو سے کشمیر اور اس کے ..... کی مشترکہ ذمہ داری کی جگہ زبردست برطانوی کنٹرول قائم کیا جائے۔ کاشغر کی بغاوت نے جس میں شاید بالشویکوں کا ہاتھ ۔نہیں۔ وسط ایشیا کی کئی مسلم سلطنتوں میں زبردست بے چینی پھیلا دی ہے۔ اگر شمالی مغربی سرحد میں برطانیہ کی موجودہ پالیسی میں موجودہ صورت حالات اور آیندہ ظہور پذیر ہونے والے اتفاقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترمیم نہ کی گئی تو یہ بے چینی بڑھتی جائے گی۔ اور جن علاقوں میں یہ پھیلے گی۔ ممکن ہے کہ وہ مشرق اور مغرب کی مختلف طاقتوں کے لئے میدان جنگ بنیں۔

کشمیر کی سرحد کے خاکہ کا مطالعہ کرنے سے چند اہم نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ریاست شمال کی جانب قراقرم کی بلند پہاڑیوں کی وجہ سے مگر کوئی شخص وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ اگر وسط ایشیا میں جنگ چھڑ جائے۔ تو کشمیر مشرقی اور مغربی سرحدوں پر کس حد تک اپنی حفاظت کرنے کے قابل ہے۔ گلگت کے پولٹیکل ڈسٹرکٹ کے جو صوبہ کشمیر کا حصہ ہونے کی صورت میں دربار اور گورنمنٹ ہند کے ماتحت ہیں۔ شمال میں ہندوکش پہاڑ ہے جو افغانستان کو کشمیر سے علیحدہ کرتا ہے مغرب میں چترال واقع ہے۔ خود گلگت کی گزشتہ تاریخ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ یہ پولٹیکل ایجنسی کا فوجی اور ایڈمنسٹریٹو ہیڈ کوارٹر ہے اس ایجنسی میں ہنزا اور ناگر کی ریاستیں وغیرہ شامل ہیں۔ ہنزا اور ناگر کے جو مہاراجہ کشمیر کو تھوڑا بہت خراج ادا کرتی ہیں۔ گزشتہ رویہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر باہر سے کوئی سلطنت ان پر دباؤ ڈالے تو انہیں جلدی سے اپنے دام میں پھنسا سکتی ہے۔ تو اس سے نہ صرف یارقند کے شمال میں بلکہ چینی علاقے اور افغانستان کی سرحد پر بھی قضیہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں ہنزا اور ناگر کی ریاستوں میں بغاوت کے بعد مہاراجہ کشمیر نے ان ہر دو ریاستوں کو نئی سندیں عطا کیں۔

چترال اب کشمیر کے علاقے میں نہیں وہاں ایک علیحدہ پولٹیکل ایجنسی ہے۔ اور اس پر برطانیہ کا مکمل فوجی تسلط ہے۔ یہاں برٹش انڈین افواج رہتی ہیں ان علاقوں کے فوجی نظم و نسق اور سرحدی تحفظ کے متعلق اخراجات کی تقسیم کے سلسلے میں اکثر معاملات ایسے ہوتے ہیں جس سے ہر دو حکومتوں کے درمیان اکثر اوقات جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ گلگت ایجنسی میں مقیم افواج دربار کشمیر کی ہیں۔ اور گورنمنٹ ہند انہیں اسلحہ وغیرہ بہم پہنچاتی اور نصف اخراجات برداشت کرتی ہے موجودہ حالات میں یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر وسط ایشیا میں گڑبڑ کی وجہ سے کبھی جنگ ہوئی، تو مغرب پر افغان سرحد شمال میں سرحد یارقند اور مشرق پر چینی ترکستان کی طرف سے دباؤ ڈالا جائے گا۔

یہ ٹھیک ہے کہ روس ایک یورپین ملک ہے۔ مگر اس کی قسمت کا دارومدار ایشیائی مقبوضات پر ہے اس کی یہ خواہش ہے کہ "ایشیا" میں اپنے علاقوں کو وسیع کرے ان حالات میں یہ صاف ظاہر ہے کہ بالآخر روس اور جاپان کے درمیان زبردست تصادم ہوگا کیونکہ دونوں کی آنکھیں وسط ایشیا پر لگی ہوئی ہیں اس کے علاوہ روس اپنی افواج کو اسی طرح سے منظم کر رہا ہے۔ اپنے اندرونی معاملات کو اس طریقہ سے سلجھا رہا ہے۔ کہ وہ کسی وقت جاپان کے ساتھ اپنی دیرینہ عداوت کا بدلہ لے سکے۔ وہ ابھی تک اس بات کو نہیں بھولا کہ جاپان نے اسے زبردست شکست دی تھی۔ گزشتہ صدی سے دنیا کی تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا جس نے مشرقی لوگوں کی نظروں میں یورپین اقوام کے وقار کو اس قدر کم کیا ہو جس قدر روس کی شکست اور جاپان کی فتح نے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ ایشیا میں آیندہ جنگ کا بیج مانچوریا کے مسائل میں ہے یہ مسائل روس اور جاپان اور خاصکر چین کے لئے عظیم اہمیت رکھتے ہیں۔ جو لوگ گزشتہ ۲ سال سے جاپان کے حالات کا مطالعہ کر رہے ہیں وہ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے علاقہ میں توسیع کے لئے اپنی پالیسی کو کس طرح نشوونما دینا چاہتا ہے۔

نکولاس روزویلٹ اپنی مشہور کتاب "بے چین بحرالکاہل" میں ایشیا کے تسلط کے متعلق روس اور جاپان کے منصوبوں کے بارے میں پالیسیوں کے تصادم پر اظہار خیالات کرتے ہوئے چند اہم امور پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مشہور روسی جرنیل سکوبلاف کی ایک تقریر سے مندرجہ ذیل اقتباس "مجھے اس بات کا کوئی امکان معلوم نہیں ہوتا کہ مسلم حکومت مستقبل قریب میں پان اسلام ازم کے خواب کو چھوڑ کر روس کے زیر نگیں آنا قبول کرے گی۔ برخلاف اس کے یہ ممکن ہے۔ کہ ایشیا میں تسلط کے لئے روس جاپان اور ان مسلم حکومتوں کے درمیان زبردست تصادم ہوگا جس کا بالآخر مقصد یہ ہوگا کہ ہندوستان پر قبضہ کیا جائے"۔ غور کے قابل ہے۔

یہ حالات جلدی ظہور پذیر ہوں یا انہیں کئی سال لگیں بہرحال ہندوستان کا مستقبل۔ اس کی آئینی ترقی اور تمام ملک میں فیڈرل حکومت کا قیام یہ ایسی باتیں ہیں جن کا فیصلہ اس وقت تک اچھی طرح سے نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ایشیا کے تمام مسائل پر نہایت سنجیدگی سے غور و خوض نہ کیا جائے۔ اور وسط ایشیا پر جنگ کے بادلوں کو بغور نہ دیکھ لیا جائے۔ ممکن ہے کہ ایک دن یہ بادل ایک عظیم طوفان کا موجب ثابت ہوں۔

ان تمام مسائل کا فوری حل نہایت ہی ضروری ہے۔ مگر یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے۔ جبکہ برطانیہ اور ہندوستان کے والیان ریاست کے درمیان معاہدوں اور سندات میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں۔ جہاں تک وسط ایشیا کے مسائل کا تعلق ہے۔ موجودہ معاہدے بالکل بے سود ہیں ...... سرکردہ والیان ریاست کو وہی درجہ دیا جائے۔ جو نیپال کو دیا گیا ہے اور خواہ ہندوستان پر مشرق سے حملہ ہو یا مغرب سے باہر کی آزاد مسلمان سلطنتیں حملہ کریں ان سب کی مشترکہ ذمہ داری ہو۔ اور وہ سب ملکر ہندوستان کے تحفظ کے لئے لڑیں۔

سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے۔ کہ انگلستان ہندوستانیوں کے دلوں میں جذبۂ قوم پرستی کی ہر ممکن ذریعے سے حوصلہ افزائی کرے۔ اور یہ کوشش کرے۔ کہ ان میں یہ شک ہرگز نہ رہے۔ کہ برطانیہ "پھوٹ ڈال کر حکومت کرو" اور ایک فرقے کو دوسرے کے ساتھ لڑانے کی پالیسی پر عمل کرنا چاہتا ہے اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کا آپس میں کوئی سمجھوتہ نہ ہوا اور ان کے درمیان خلیج وسیع ہو گئی۔ تو تمام ایشیا اور خاصکر ہندوستان کا امن خطرہ میں پڑ جائے گا۔ ممکن ہے کہ جاپان ہند وجذبات کا فائدہ اٹھائے۔ ان کی خوشامد کرے۔ انہیں آزادی دلانے کا وعدہ دیکر ان کی حمایت کرنے کی کوشش کرے۔

ادھر دوسری طرف آزاد مسلمان حکومتیں مسلم ریاستوں کی خوشامد کریں اور انہیں وہی درجہ دلانے کا وعدہ کریں۔ جو خود انہیں حاصل ہے۔ اور اس طرح قدیم مغلیہ خاندان کی شان و شوکت کے سبز باغ دکھائیں۔

ان حالات میں اس وقت انگلستان کے سر عظیم ذمہ داری ہے ورنہ صرف ایشیا ہی کی طرف

بلکہ ہندوستان کی طرف بھی صحیح قدم اٹھانے کے لئے ڈپلومیسی اور فوجی صائب رائے کی ضرورت ہے۔ انگلستان اس وقت ایشیا کے معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار نہیں کر سکتا اسے کوشش کرنی چاہیے کہ نہ صرف والیان ریاست ہائے بلکہ ہندو مسلم لیڈروں کی بھی حمایت حاصل کرے۔ پان ایشیاٹک اور پان اسلامک تحاریک کے خطرے کا مقابل سی صورت میں ہو سکتا ہے۔ کہ کوئی متحدہ کارروائی کی جائے۔ جس میں والیان ریاست اور ہندوستان کے تمام لوگ اپنے اختلافات کو دور کر کے برطانیہ کے ساتھ تعاون کریں اور تمام ایشیا میں امن قائم رکھنے اور ہندوستان کی یکجہتی قائم رکھنے کے لئے ایک مرکز پر جمع ہو جائیں۔

(ترجمہ از سر ایلبن بنرجی)

اک نیا جنگی محاذ تاریخ کی روشنی میں

"ابی سینیا"

تہذیب سے دور تمدن سے نا آشنا تاریک افریقہ کے مشرقی ساحل پر حبشیوں کا ایک ملک ہے جسے "ابی سینیا" کہتے ہیں۔

ابی سینیا کا طرز حکومت شخصی اور کلیتاً خود مختار آزاد ہے شاہ اتھوپیا (ابی سینیا) راس تفاری میکونن (جی۔ سی۔ بی۔ جی۔ سی۔ ایم ایل۔ ایل۔ ڈی) نے ملکہ زوڈیٹو کے بعد اس افریقی خود مختار سلطنت کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

راس تفاری کی عمر اس وقت بیالیس سال ہے متوسط قد گورا رنگ چہرے کے گرد گھنی ڈاڑھی اور قیصر ولیم کی سی مونچھیں ہیں۔ قامت میں شاہی تمکنت اور رفتار میں فوجی وقار ہے یہ ایک خاموش آدمی ہیں بہت کم بولتے ہیں اور کام بہت زیادہ کرتے ہیں باہر کی مہذب دنیا کے اثرات سے بے خوف دن رات اپنی قدامت پرست قوم کو جدید اصول تمدن و معاشرت سے . . . . روشناس کرانے اور جدید سیاست و قیادت کے آئین کو عملاً بروئے کار لانے کی انتہائی جد و جہد کر رہے ہیں۔

مینلک ثانی نے جب اطالیہ کو آدوا پر شکست دی تو اسی سلسلہ میں راس تفاری کے باپ کو (جو اس وقت ایک صوبے دار تھے) ایک سیاسی وفد کا صدر بنا کر یورپ بھیجا گیا۔ موجودہ شہنشاہ بھی اپنے والد کے ہمراہ یورپ چلے گئے۔ جہاں ان کو فرانسیسی سیکھنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ وہ اس اجنبی زبان پر اسی قدر حاوی ہیں جس قدر کہ اپنی مادری زبان امہارک پر (امہارک عربی کی ایک شاخ ہے) اس تعلیم و تربیت کی وجہ سے انہوں نے معاملات سلطنت کی چند در چند مشکلات پر فتح پائی اور اتھوپیا کی قومی ترقی اور "مجلس اقوام" کی شرکت کے سلسلہ میں اس سے بہت بڑی مدد ملی۔

یورپ میں بادشاہ ہونا اور اتھوپیا میں بادشاہ ہونا دو متضاد ذمہ داریاں ہیں۔ راس تفاری ان ذمہ داریوں کے بوجھ کے علاوہ مفتی اعظم، صدارت عدلیہ، سپہ سالاری افواج اور وزیر خارجہ و داخلہ کے فرائض کا بار بھی اپنے دوش پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور روزانہ پندرہ گھنٹہ کام کر کے دنیا کے سامنے ایک قابل تقلید مثال پیش کرتے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں انہوں نے یورپ میں ایک طویل سفر کیا تاجداران سینیائی کا یہ پہلا حکمران تھا جس نے اپنے حدود مملکت سے باہر قدم رکھا مغرب کے حیرت انگیز تمدن کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا اور اس کی ایجادات و اختراعات کو نہایت دلچسپی سے دیکھا اور اب اس کو ملک میں رائج دیکھنے اور اپنے ایک کروڑ سینائیوں کو بام ترقی پر پہنچانے کی آرزو جس شدت سے ان کے سینے میں پیدا ہوئی ہے طول و عرض عالم میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے اور اس کے صلے میں قوم اپنے محبوب فرمانروا کی اس درجہ مطیع ہے کہ اس کی ایک جنبش ابرو پر قربان ہونے کو تیار رہے۔

دارالخلافہ عدیس ابابا (نیا پھول) ایک بلند مقام پر واقع ہے۔ آب و ہوا نہایت عمدہ اور صاف ہے . . . سرد راتیں اور چمکدار سورج کی شعاعیں ناقابل برداشت نہیں ہوتیں شاہراہ عام پر حبشی سفید سوتی لبادوں میں نظر آتے ہیں۔ یہ عام طور پر برہنہ پا اور کھلے سر رہتے ہیں بعض اوقات چپل اور سرخ ترکی ٹوپیاں نظر آتی ہیں لیکن عربی عماموں کا استعمال عام ہے۔ ملک بھر میں بارہ زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن قومی زبان امہارک ہے جو عربی سے پیدا ہوئی ہے یہاں کی معاشرت و تہذیب پر اب بھی اسلامی رنگ غالب ہے۔

تجارت ترکوں، آرمینیوں اور ہندیوں کے ہاتھ میں ہے حبشی اس سے بہت کم مستفید ہوتے ہیں ٹیلیگراف ٹیلیفون اور موٹر گاڑیاں بھی آگئی ہیں۔ نئی سڑکیں، مدارس اور شفا خانے بھی کافی تعداد میں موجود ہیں شہر میں روشنی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے رات میں باہر نکلنے کی ممانعت ہے اجنبیوں کیلئے شب گردی ممنوع ہے کوئی سینیائی بغیر بادشاہ کے حکم کے پھانسی نہیں پا سکتا اور نہ یہاں کوئی منظوری اس وقت تک نہیں دی جا سکتی۔ جب تک کہ بادشاہ مسودے خود نہ دیکھ لے اور دستخط نہ کرے۔ ملک کے قدیم رواج کے مطابق ہر ملکی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے بادشاہ کی "حضوری" کا مطالبہ کرے۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ دنیا کا یہ قدیم ترین ملک جس کو حضرت سلیمان علیہ السلام سے نسبت دی جاتی ہے ایک طرف تو اپنے رسم و رواج کا سختی سے پابند اور اپنی قدیم روایات پر شدت سے کاربند ہے اور دوسری طرف جدید اصلاحات کو بہت آسانی سے قبول کرتا جاتا ہے۔ غالباً یہ سب صحیح رہنمائی اور سچی قیادت کی کرشمہ سازی ہے۔

رموزِ محبت

جب آنکھ کھول کے دیکھا تو ہو گیا مستور — یہ میرا دیدۂ بینا ترا حجاب ہوا
تو چھپ گیا مہ و انجم میں، لالہ و گل میں — ہر ایک جلوۂ رنگیں ترا نقاب ہوا

جب آنکھ بند ہوئی تو ہی جلوہ آرا تھا

میری زبان کھلی شرحِ عاشقی کیلئے — میرا بیان تھا مرقع مری خجالت کا
ہر ایک حرف میں تھا غیریت کا افسانہ — میری زبان نے کیا خون میری محبت کا

میرے سکوت میں طوفانِ عشق برپا تھا

میرے حواس رہے تیرے وصل میں حائل — جو بیخودی میں ہوا غرق تو ملا مجھ کو
عجیب شے ہے محبت میں خود فراموشی — فنا ہوا تو ملی لذتِ بقا مجھکو

میرا وجود ہی اے دوست ایک پردا تھا

اشکِ وفا

تمہارے شوق میں جب عالمِ مستی میں گاتا ہوں — جہاں کی روح کے خوابیدہ نغموں کو جگاتا ہوں
فضائیں غرق ہو جاتی ہیں رنگ و نور و مستی میں — بپا ہوتا ہے رقصِ شادمانی بزمِ ہستی میں

میرا ہر نغمہ گویا اک گلستانِ محبت ہے

تمہارے ہجر میں جب نالہ و فریاد کرتا ہوں — جہانِ رنگ و بو کو دور سے آباد کرتا ہوں
گلستانوں پہ چھا جاتی ہے پھر افسردگی میری — فضاؤں میں سما جاتی ہے گویا بے دلی میری

میری آہوں میں اک دنیائے درد و یاس و حسرت ہے

ہجومِ غم میں لیکن جب کبھی آنسو بہاتا ہوں — میں اپنی روح کو سرچشمۂ انوار پاتا ہوں
غبارِ رنج و غم قلب و جگر سے دور ہوتا ہے — میری ہستی کا ہر ذرہ ریاضِ طور ہوتا ہے

میرے اشکِ وفا میں لذتِ بارانِ رحمت ہے

اختر صہبائی

سقراط:- اور ہم اس کے متعلق کیا کہا کرتے تھے؟ کیا وہ شخص جو نہایت تندہی سے تحصیل علم کی منازل طے کر رہا ہے تمام آدمیوں کی تعریف، الزام اور آراء کا خیال کرے گا یا صرف اُس شخص کے کہنے پر توجہ دے گا جو ایک حکیم یا ایک معلم ہے؟

کریٹو:- وہ صرف ایک شخص کی طرف متوجہ ہوگا

سقراط:- تو پھر اسے اس ایک شخص کی تعریف سے خوش اور تنقیص سے خوفزدہ ہونا چاہیئے نہ کہ ہر شخص کی۔

کریٹو:- ظاہر ہے۔

سقراط:- ہاں لیکن اگر وہ اس ایک شخص سے منحرف ہو کر اُس کی آراء کو نظر انداز کر دے اور اُن بہت سے شخصوں کا احترام کرے جو اُس کے معاملہ کو بالکل نہیں سمجھتے تو کیا اس غلطی کی سزا اُسے نہیں بھگتنی ہوگی؟

کریٹو:- بالیقین اُسے بھگتنی ہوگی۔

سقراط:- اور یہ سزا اُسے کس طریقہ سے دی جائیگی؟ اور اُس کو کس قسم کی تکلیف ہوگی؟

کریٹو:- بلاشک جسمانی اذیت۔

سقراط:- ٹھیک کہتے ہو تم اور کریٹو کیا ہر چیز میں ایسا نہیں ہوتا؟ اور اس لئے حق و باطل، کمینہ اور ذی عزت، اچھے اور بُرے کے سوال کے تجزیے میں جو اس وقت ہمارے زیر نظر ہے کیا ہمیں بہت سے لوگوں کی رائے پر عمل کرنا ہے یا صرف اُس ایک شخص کی رائے پر (اگر ہم اُسکو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں) جو ان معاملات کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور کیا ہمیں اُس ایک شخص سے زیادہ ڈرنا اور شرمانا چاہیئے یا بہت سے اشخاص سے؟ کیونکہ اگر ہم اُس پر عمل نہیں کرینگے تو ہم اپنا وہ حصہ جس کے متعلق ہم کہا کرتے تھے کہ نیکی سے مضبوط اور بدی سے کمزور ہوتا ہے بالکل ضائع کر دیں گے کیا یہ بعینہ درست نہیں ہے؟

کریٹو:- ہاں سقراط میں تم سے متفق ہوں۔

سقراط:- اب اگر ہم ناخواندہ اور نیم العلم اشخاص کی آراء کو سُنکر اُس حصہ کو ضائع کر دیں تو کیا ہمارا جینا قابل تسلیم ہے۔ کیوں۔ وہ حصہ جسم ہی تو ہے نا؟

کریٹو:- بے شک۔

سقراط:- کیا مضمحل اور بیمار جسم کے ساتھ زندہ رہنا واجب ہے؟

کریٹو:- نہیں ہرگز نہیں۔

سقراط:- تو کیا پھر اس حصہ کو ضائع کر کے جو باطل سے کمزور اور حق سے مضبوط ہوتا ہے ہمارا جینا صحیح ہے؟ یا ہم اُس حصے کو جس کا تعلق نیک و بد سے ہے جسم سے کم وقعت دیتے ہیں؟

کریٹو:- نہیں بالکل نہیں۔

سقراط:- لیکن زیادہ وقعت؟

کریٹو:- ہاں بہت زیادہ۔

سقراط:- تو میرے عزیز دوست ہم کو اُس بات پر بالکل توجہ نہیں دینی چاہیئے کہ ہمارے متعلق لوگ کیا کہتے ہیں۔ بلکہ ہمیں صرف اُس شخص کا پاس ہونا چاہیئے جو نیک و بد کو سمجھتا ہے اور سچائی کی حقیقت سے واقف ہے۔ پس نیک و بد کے سلسلے میں تمہارا یہ کہنا ہے کہ لوگوں کی آراء پر متوجہ ہونا ٹھیک نہیں لیکن تم کہو گے کہ دُنیا ہمیں پھانسی کے تختہ پر چڑھا سکتی ہے۔

کریٹو:- ہاں یہ ظاہر ہے اور ایسا کہا جا سکتا ہے سقراط۔

سقراط:- بجا لیکن پیارے دوست میرے خیال میں ہم اُسی نتیجہ پر پہنچے ہیں جو ہم بہت عرصہ پہلے اخذ کر چکے ہیں۔ اب غور کرو کہ کیا ہم ابھی تک اس نظریے پر کاربند ہیں کہ ہمیں زندگی پر نہیں بلکہ اچھی زندگی پر زیادہ زور دینا چاہیئے؟

کریٹو:- ہاں ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔

سقراط:- اور اچھی طرح رہنا اور عزت اور نیکی کی زندگی بسر کرنا ایک ہی بات ہے؟

کریٹو:- بے شک۔

سقراط:- ان باتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اہل ایتھنز کی اجازت کے بغیر میرا قید خانے سے نکل بھاگنا مناسب ہے یا نامناسب۔ اگر یہ صحیح ہو تو ہم ایسا کرنے کی کوشش کریں ورنہ اُس کا خیال بھی چھوڑ دیں۔ میں جانتا ہوں کہ مصارف، شہرت اور میرے بچوں کی پرداخت جس کے متعلق تم متفکر ہو کریٹو ہمارے اُن بہت سے دوستوں کے خیالات اور افکار کا نتیجہ ہیں جو آسانی سے لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں اور جو انسانوں کو زندہ بھی کر دیں اگر زندہ کرنا اُن کی قوت سے باہر نہ ہو۔ لیکن استدلال ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیں صرف اس سوال پر غور کرنا چاہیئے کہ کیا ہم اُن لوگوں کا شکریہ ادا کرنے میں حق بجانب ہونگے جو مجھے بچاتے ہیں میری امداد کرینگے؟ اور کیا ایسا کرنا ہمارے لئے نامناسب تو نہیں ہوگا؟ اگر یہ نامناسب ہوگا تو ہمیں یہاں رہنے میں موت اور دوسری تکالیف کا غم نہیں کرنا چاہیئے۔

کریٹو:- میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہتے ہو سقراط لیکن ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

سقراط:- آؤ ہم دونوں اِس سوال کو حل کریں اور اگر میں کوئی غیر واجب بات کہوں تو تُم اسے رد کر دو میں مطمئن ہو جاؤں گا۔ اور اگر تم میری باتوں کو رد نہ کر سکو تو مجھ سے نہ کہنا کہ اہل ایتھنز کی اجازت کے بغیر قید خانے سے بھاگ جاؤ۔ میں تمہاری مرضی سے کام کرنا چاہتا ہوں اور یہ نہیں چاہتا کہ تم مجھے غلط فہمی میں مبتلا سمجھو۔ لیکن اب مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم میرے سوالات کا نہایت سوچ سمجھ کر جواب دو گے؟

کریٹو:- میں کوشش کروں گا۔

سقراط:- کیا ہمیں دیدہ دانستہ کبھی بھی قصوروار نہیں بننا چاہیئے یا کیا ہم بعض حالات میں گناہ کا ارتکاب کر سکتے ہیں اور بعض میں نہیں جیسا کہ ہم گزشتہ زمانے میں فیصلہ کر چکے ہیں کیا گناہ کا ارتکاب کرنا کبھی اچھا اور ذی عزت ہے؟ کیا ان چند ایام میں ہم اپنے تمام گزشتہ نتائج کو فراموش کر چکے ہیں؟ اس ضعیفی کے عالم میں بہت دن گزرے جب ہم نہایت سنجیدگی سے کسی مسئلہ پر غور کیا کرتے تھے۔ کیا ہم نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ ہم بچوں سے بہتر نہیں تھے؟ اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دُنیا ہم سے متفق ہو یا مخالف ہم ہمیشہ سچائی کے راستہ پر گامزن رہے ہیں۔ کیا گناہ ایک بُری اور ملعون چیز نہیں خواہ ہم سچائی کا پاس کرتے ہوئے گنہگار کو موت سے کم یا زیادہ سزا ہی کیوں نہ دیں؟ کیا ہم دونوں اس پر متفق ہیں؟

کریٹو:- ہاں،

سقراط:- تو ہمیں کبھی گناہ نہیں کرنا چاہیئے۔

کریٹو:- ہرگز نہیں۔

سقراط:- اور نہ ہمیں گناہ کا بدلہ گناہ میں دینا چاہیئے۔ جیسا کہ دُنیا کا خیال ہے۔

کریٹو:۔ ہرگز نہیں۔

سقراط:۔ اچھا کریٹو اب یہ بتاؤ کہ ہمیں کسی کو نقصان پہنچانا واجب ہے؟

کریٹو:۔ یقیناً نہیں سقراط۔

سقراط:۔ اور کیا گناہ کا بدلہ گناہ نہیں ہے؟

کریٹو:۔ نہیں۔

سقراط:۔ کیونکہ گناہ کا بدلہ گناہ کی صورت میں دینا یا کسی شخص کو نقصان پہنچانا دو مختلف چیزیں نہیں ہیں

کریٹو:۔ بے شک

سقراط:۔ تو ہمیں گناہ کی سزا گناہ سے نہیں دینی چاہیئے اور نہ کسی کو نقصان ہی پہنچانا چاہیئے خواہ وہ ہم کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچائے لیکن ایسا کہنے میں کریٹو خیال رکھو کہ تم حد سے نہ گزر جاؤ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بہت کم لوگ اس رائے سے متفق ہونگے اور اس سے مخالف اور متفق لوگوں میں سوائے نفرت کے اور کوئی جذبہ نہیں پایا جاتا۔ کیا تم اچھی طرح غور کرکے مجھ سے اتفاق رائے کرتے ہو؟ اور کیا ہمیں اس اصول سے آگے بڑھنا چاہیئے کہ گناہ کرنا۔ یا گناہ کا بدلہ گناہ میں دینا یا کسی ایسے شخص کو نقصان پہنچانا جس نے ہمیں نقصان پہنچایا ہو کسی حالت میں بھی ثواب نہیں ہے۔ یا تم مجھ سے اختلاف رکھتے ہو۔ میں عرصہ سے اِس پر یقین رکھتا ہوں۔ لیکن اگر تم کو اس میں شک ہے تو مجھے سمجھاؤ اور اگر تم میری رائے سے اتفاق کرتے ہو تو میں اپنا دوسرا نکتہ بیان کروں

کریٹو:۔ ہاں مجھے تم سے اتفاق ہے اور میں اس پر یقین رکھتا ہوں۔ اپنا دوسرا نکتہ کہو۔

سقراط:۔ تو پھر میرا دوسرا نکتہ نہیں بلکہ میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ایک شخص کو ان اصولوں پر کاربند رہنا چاہیئے یا ان سے بالکل بے نیاز ہو جانا چاہیئے؟

کریٹو:۔ کاربند رہنا ہی واجب ہے۔

سقراط:۔ تو پھر غور کرو کہ اگر میں حکومت کی اجازت کے بغیر یہاں سے بھاگ جاؤں تو کیا میں اُن اشخاص کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ جنہیں مجھے نقصان نہیں پہنچانا چاہیئے؟ کیا اِس صورت میں میں اپنے اصولوں پر کاربند رہونگا؟

کریٹو:۔ میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا سقراط میں کچھ نہیں سمجھتا۔

سقراط:۔ فرض کرو کہ اگر میرے فرار ہونے کے موقع پر حکومت اور قوانین مجھ سے آکر یہ سوال کریں کہ ہمیں بتاؤ سقراط تم کیا سوچ رہے ہو؟ کیا تم فرار ہونا چاہتے ہو اور اس طرح قانون و ملک کو تباہ کرنے کے آرزومند ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ سلطنت زندہ رہ سکتی ہے جس میں قانون کی عزت نہیں کی جاتی اور اس پر عمل نہیں کیا جاتا؟ تو پھر کریٹو ہم ان سوالات کا کیا جواب دینگے؟ قانون کی حمایت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ کیا میں یہ جواب دونگا کہ حکومت نے میرے متعلق غلط فیصلہ کیا ہے؟ کیا ہمارا جواب یہی ہوگا؟

کریٹو:۔ یقیناً سقراط

سقراط:۔ اور فرض کرو کہ قوانین یہ جواب دیں کہ کیا ہمارا معاہدہ یہی تھا؟ یا یہ کہ تم حکومت کے ہر فیصلے کو تسلیم کر دگے؟ اور اگر ہم اس جواب کو نہ سمجھیں گے تو پھر یہ کہا جائیگا کہ سقراط اِن الفاظ پر تعجب نہ کرو بلکہ جواب دو۔ تم خود سوال کرنے اور جواب دینے میں ماہر ہو۔ ہمارے خلاف تمہیں کیا کہنا ہے اور شہر کے خلاف تمہیں کیا شکایت ہے کہ تم ہم سب کو تباہ کرنا چاہتے ہو۔ کیا ہم تمہارے والدین نہیں ہیں۔ ہمارے ذریعہ ہی تمہارے باپ نے تمہاری ماں کے ساتھ شادی کی اور تمہیں پیدا کیا۔ ہمیں بتاؤ کہ کیا تمہیں قوانین شادی سے کوئی شکایت ہے؟ میرا جواب ہوگا کہ نہیں مجھے کوئی شکایت نہیں ہے یا تمہیں ان قوانین سے گلہ ہے جن کے ذریعہ بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے اور تم نے بھی تعلیم حاصل کی ہے؟ کیا ہم نے تمہارے باپ کو یہ حکم دے کر تمہیں فن موسیقی اور ورزش میں تعلیم دے کر کوئی گناہ کیا تھا؟ بالکل نہیں میرا جواب ہوگا۔ تو پھر جب دُنیا میں تمہاری پرداخت ہماری زیر نگرانی ہوئی تو تم کیسے انکار کر سکتے ہو کہ تم اپنے آبا و اجداد کی طرح ہمارے بچے اور غلام نہیں ہو؟ اور اگر ایسا ہو بھی تو کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہارے حقوق اور ہمارے حقوق ایک ہی پایہ کے ہیں۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ اگر ہم کچھ کریں تو تم اُس کا ترکی بہ ترکی جواب دینے میں حق بجانب ہو؟ تمہارے باپ کے حقوق تم سے زیادہ تھے اور اگر تم کسی کے غلام ہوتے تو تمہارا آقا بھی تم سے زیادہ حقوق رکھتا اگر وہ تم سے بُرا سلوک کرتا تو تمہیں جواب دینا واجب نہیں تھا۔ اور اگر وہ تم کو پیٹتا تو تمہیں اُس کو پیٹنا نازیبا تھا اور اگر وہ تم کو نقصان پہنچاتا تو تمہارا اُس کو نقصان پہنچانا کسی صورت میں بھی مناسب نہیں تھا اور کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اپنے ملک اور قوانین کو جواب دے سکتے ہو؟ اگر ہم تمہیں برباد کرنا چاہیں کیونکہ ہم یہی ٹھیک سمجھتے ہیں تو کیا تم بھی ہم کو اور اپنے ملک کو تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروگے حالانکہ تم سچائی کے اتنے بڑے حامی ہو یا تم یہ نہیں سمجھتے ہو کہ تمہارا ملک جس کی دیوتا بھی عزت کرتے ہیں تمہارے باپ اور تمہاری ماں اور تمہارے آبا و اجداد سے بہت زیادہ قابل احترام متبرک اور پاک ہے اور تمہارا حقیقی فرض ہے کہ اُس کی عزت کرو اُس کے احکام بجا لاؤ اور اُس کی طرف اُسی طرح رجوع کرو جس طرح تم اپنے باپ سے ناراضگی کے عالم میں رجوع ہوتے ہو یا اُس کا حکم بجا لانے کے لئے تیار رہو یا اُس سے معافی مانگ لو۔ اور اگر وہ تم کو سزا دے تو اُس کو خوشی سے برداشت کرو۔ اگر وہ جنگ میں لڑنے اور مرنے کے لئے بھیجے تو بھی انکار نہ کرو۔ یہ ہے تمہارا فرض۔ تمہیں اپنے فرض کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ جنگ و عدالت میں جو کچھ تمہارا ملک اور قوانین تمہیں حکم دیں تمہیں وہی کرنا لازم ہے یا اُنہیں مطمئن کرو کہ اُن کے احکام نازیبا ہیں مگر اپنے باپ یا اپنی ماں کے خلاف ہتھیار اُٹھانا خدا کے قانون کے خلاف چلنا ہے اور اپنے ملک کے خلاف علم احتجاج بلند کرنا تو اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اس چیز کا ہم کیا جواب دینگے کریٹو ہمارا جواب اثبات میں ہوگا یا نفی میں؟

کریٹو:۔ میرا خیال ہے اثبات میں۔

سقراط:۔ تو غور کرو کریٹو! شاید وہ کہیں گے کہ ہم ٹھیک کہتے ہیں کہ تم فرار ہو کر ہمیں نقصان پہنچا رہے ہو۔ ہم تم کو دُنیا میں لائے ہم نے تمہاری پرداخت کی ہم نے تمہیں تعلیم دی اور ہم نے تم کو اور دوسرے ہر شہری کو اپنی اچھی چیزوں میں سے حصہ دیا۔ پھر بھی ہم اعلان کرتے ہیں کہ اگر ایتھنز کا کوئی آدمی ہم سے مطمئن نہیں ہے وہ اپنا سامان لیکر جہاں جی چاہے جا سکتا ہے۔ ہم ہر اُس شخص کو یہ موقع دیتے ہیں جو بالغ ہو کر اس سے فائدہ اُٹھانا چاہے۔ اگر وہ ہم سے اور شہر سے مطمئن نہیں ہے تو ہم میں سے کوئی بھی اُس کو کسی دوسری جگہ جانے سے نہیں روکے گا خواہ وہ ایتھنز کی نوآبادی ہو یا کوئی غیر ملک۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ہم کو اور نظام شہر کو دیکھ لینے کے باوجود یہاں ٹھہرتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ہمارے ہر حکم کو بجا لائے۔ اور اگر وہ حکم عدولی کرتا ہے تو وہ تین گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ پہلا گناہ یہ ہے کہ وہ اپنے

والدین کا احترام نہیں کرتا کیونکہ ہم اُس کے والدین ہی تو ہیں۔ دوسرا گناہ یہ ہے کہ وہ اُسے پالنے والوں کے ساتھ اچھا اور بہتر سلوک روا نہیں رکھتا کیونکہ ہم ہی نے تو اُسے پالا ہے۔ تیسرا گناہ یہ ہے کہ وہ ہمارا فرمانبردار بن کر بھی ہم سے بغاوت کرتا ہے۔ یہ بتانے کے بغیر کہ ہم غلطی پر ہیں۔ حالانکہ ہم اُسے مجبور نہیں کرتے کہ ہمارے حکم پر ہی چلے ہم اُس کے سامنے دو چیزیں پیش کرتے ہیں ہم پر یقین لائے یا ہم پر ثابت کر دے کہ ہم غلط ہیں۔ لیکن وہ ان میں سے کوئی چیز بھی پسند نہیں کرتا۔

یہ وہ الزام ہیں جو ایتھنز کے دوسرے رہنے والوں سے بھی زیادہ تم پر عائد ہونگے اگر تم اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کروگے اور اگر ہم پوچھیں گے کہ کیوں؟ تو وہ صحیح جواب دینگے کہ میں نے خود کو دوسرے شخصوں سے زیادہ اُن کا غلام بنا یا تھا۔ وہ کہیں گے سقراط ہم بہت زبردست ثبوت رکھتے ہیں کہ تم کو ہم پر یقین تھا۔ اگر دوسرے باشندوں سے زیادہ ہم سے مطمئن نہ ہوتے تو ہم ہرگز اُن سے زیادہ دیر تک یہاں نہ ٹھہرتے۔ سوائے ایک مرتبہ ایتھنز کے کھیلوں اور فوجی خدمات کے سلسلے میں تیوہاروں پر بھی ایتھنز سے باہر نہیں گئے۔ دوسرے اشخاص کی طرح تم نے کبھی سفر نہیں کئے۔ تم نے دوسرے شہروں کے قوانین معلوم کرنے کی کبھی خواہش ظاہر نہیں کی تم ہم سے اور ہمارے شہر سے مطمئن تھے۔ پس تم نے ہم کو ترجیح دی ہماری حکومت منظور کی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم نے یہاں بچے پیدا کئے۔ اور اس جگہ کو اس کا اہل سمجھا۔ علاوہ ازیں اگر تم چاہتے تو اس مقدمے میں جلا وطنی کی درخواست کرسکتے تھے۔ اور اس وقت ریاست تمہیں جلا وطن ہونے کی اجازت دیدیتی۔ لیکن اب تم بغیر اُس کی مرضی کے یہ کام کرنا چاہتے ہو۔ اُس وقت تم نے مرجانے ہی میں عزت سمجھی۔ تم نے کہا تھا کہ تم جلا وطنی پر موت کو ترجیح دیتے ہو۔ اور اب تمہیں اپنے الفاظ کا کچھ پاس نہیں ہے۔ تم قانون کی عزت نہیں کرتے ہو۔ کیونکہ تم ہمکو تباہ کرنا چاہتے ہو۔ اور تم ایک بے کس غلام کی طرح کام کر رہے ہو اور اُس معاہدے کو جس میں تم نے ہماری حکومت کے مطابق چلنے کا اقرار کیا تھا توڑ کر بھاگ جانا چاہتے ہو۔ اس لئے سب سے پہلے اس بات کا جواب دو کہ کیا ہم یہ کہنے میں کہ تم نے صرف الفاظ میں نہیں بلکہ عملی طور پر بھی ہمارے احکام بجالانے کا وعدہ کیا تھا صحیح ہے یا غلط؟ ہم کیا جواب دینگے کریٹو! کیا ہمیں اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرنا ہوگا؟

کریٹو:- ضرور سقراط!

سقراط:- پھر وہ کہیں گے کیا تم اُن عہد و پیمان کو نہیں توڑ رہے ہو جو تم نے ہمارے ساتھ کئے تھے۔ اور تم کو زبردستی یا دھوکے سے یہ کام کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ اور نہ تم نے جلدی میں ایسا کیا تھا۔ ستر سال کی طویل مدت اور اس عرصہ میں اگر تم ہم سے مطمئن نہ ہوتے یا معاہدہ تمہاری حسب مرضی نہ ہوتا تو تم کسی دوسری جگہ جاسکتے تھے۔ لیکن تم نے (Lacedaemon) کو پسند نہیں کیا نہ کریٹ کو حالانکہ تم کہا کرتے ہو کہ وہاں کی حکومت بہت اچھی ہے یا کسی دوسری ریاست (Boeotia) یا (Megara) کو۔ تم نابینا اور مفلوج .... اشخاص سے بھی کم مرتبہ ایتھنز سے باہر گئے صاف طور سے دوسرے لوگوں سے بڑھکر تم اس ملک اور اس ملک کے قانون سے مطمئن تھے کیونکہ قانون سے محروم ریاست سے کوئی مطمئن نہیں ہوسکتا۔ اور کیا اب تم اپنے معاہدے پر کاربند نہ رہوگے؟ اگر تم ہماری رائے پوچھو تو تمہیں کاربند رہنا چاہیئے سقراط اور یہاں سے فرار ہونا مناسب نہیں۔

غور کرو کہ اس طرح اپنے معاہدے کو توڑ کر تم خود کو اور اپنے دوستوں کو کیا فائدہ پہنچاؤگے؟ بہت اغلب ہے کہ تمہارے دوستوں کو بھی جلا وطن ہونا پڑے یا وہ شہریوں کے حقوق سے محروم ہوجائیں یا ان کی جائیدادیں ضبط کرلی جائیں ہاں تم کسی پڑوسی ریاست میں جاسکتے ہو مثلاً (Thebes) یا (Megara) میں کیونکہ یہ دونوں اچھی حکومت کے زیر اثر ہیں۔ لیکن سقراط تم جمہوریت کے دشمن کی حیثیت رکھوگے اور ہر وہ شخص جو اپنے ملک کی عزت کرتا ہے تم کو حقیر نگاہوں سے دیکھے گا اور یہ سمجھے گا کہ تم قانون کے توڑنے والے ہو۔ اور اس طرح تم ججوں کی رائے کو صحیح ثابت کروگے اور یہ معلوم ہوگا کہ ان کی تجویز کردہ سزا تمہارے لئے مناسب تھی کیونکہ قانون کے خلاف چلنے والا انسان نوجوانوں اور بے وقوف لوگوں کو ورغلانے کے الزام کا شکار آسانی سے بنایا جاسکتا ہے تو کیا تم اچھی حکومتوں اور مہذب انسانوں کو چھوڑ دوگے؟ اور کیا ایسا کرنے کے بعد تمہارا جینا بھی کوئی جینا ہوگا؟ یا کیا تم ان آدمیوں سے بغیر کوئی شرم محسوس کئے ان موضوعات پر جن کے متعلق تم یہاں گفتگو کرتے ہو؟ بحث کروگے۔ کیا تم ان سے کہوگے کہ ثواب، انصاف اور انسٹی ــــ ٹیوشن اور قوانین انسان کے لئے بہترین نعمتیں ہیں؟ اور کیا تم نہیں سمجھتے کہ سقراط کے لئے یہ بہت شرمناک چیز ہوگی؟ تم کو ایسا ہی سمجھنا چاہیئے۔ لیکن تم ان مقاموں کو چھوڑ کر کریٹو کے دوستوں کے پاس .... چلے جاؤگے اور وہ۔ تمہاری فراری کا حال سُنکر ممکن ہے تمہیں ایک کسان کے لباس میں یا کسی ایسے لباس میں جو فراری پہنتے ہیں اور بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ دیکھکر خوش ہوں لیکن کیا کوئی شخص یہ سوال نہ کرے گا کہ تم جیسا بوڑھا آدمی جو مرنے کے قریب ہے اس قدر زندگی کو کیوں پیار کرتا ہے کہ اُس کے لئے قانون کی بھی پرواہ نہیں کرتا اگر تم اُنہیں ناراض نہیں کروگے تو شاید کوئی یہ سوال نہ کرے لیکن اس کے برعکس سقراط تمہیں بہت کچھ سُننا ہوگا۔ تم اپنی تمام زندگی انسانوں کی خوشامد اور غلامی میں گزار دوگے۔ اور (Thessaly) میں خور و نوش کے علاوہ تم کروگے ہی کیا؟ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کہ تم تفریح کے طور پر (Thessaly) تھیسلے گئے ہو۔ اور پھر ثواب اور انصاف کے مباحثے کیا ہونگے؟ لیکن کیا تم اپنے بچوں کی خاطر زندہ رہنا چاہتے ہو کیا تم ان کو اپنے ساتھ تھیسلے لے جاؤگے اور وہاں ان کی پرداخت کروگے اور تعلیم دوگے؟ کیا تم اُن کو اُن کے ملک سے باہر نکال دوگے تاکہ تم اُن پر کرم فرماسکو؟ یا فرض کرو کہ تم اُن کو ایتھنز ہی میں چھوڑ دو کیا وہ تمہاری زندگی میں بہتر تعلیم حاصل کرلینگے اگرچہ تم اُن کے ساتھ نہیں رہوگے؟ ہاں تمہارے دوست اُن کا خیال رکھیں گے۔ کیا تمہارے دوست صرف اُس حالت میں ایسا کرینگے جب تم تھیسلے جاؤگے اور جب تم (Hades) جاؤگے تو کیا وہ جو خود کو تمہارا دوست بتاتے ہیں اور کچھ کرنے کے قابل ہیں۔ یہ ہمدردی کرنے سے انکار کردیں گے، تمہیں ایسا نہیں سمجھنا چاہیئے۔

نہیں سقراط ہم نے تمہیں پالا ہے ہماری نصیحت پر غور کرو۔ اپنے بچوں اور اپنی زندگی اور کسی دوسری چیز کو انصاف پر ترجیح نہ دو کہ جب تم عقبےٰ کی عدالت کے سامنے پیش کئے جاؤگے تو اپنی صفائی میں کچھ پیش کرسکو۔ یہ ظاہر ہے کہ اس زندگی میں تم یا تمہارا کوئی دوست ہوگا نہ منصف ہوگا۔ اگر تم یہ کام کروگے تو نہ یہ پاک کام ہوگا

اور نہ تم مرنے کے بعد ہی خوش ہو سکو گے۔ اب تم کو قانون نے نہیں بلکہ انسانوں نے نقصان پہنچایا ہے لیکن اگر تم عیب کا جواب عیب میں اور نقصان کا بدلہ نقصان میں اس شرمناک طریقہ پر دو گے اور اپنے عہد و پیمان کو توڑو گے اور ان کو نقصان پہنچاؤ گے جنہیں تم کو نقصان پہنچانا واجب نہیں یعنی خود کو اور اپنے دوستوں کو اور اپنے ملک کو اور ہم کو اور اس طرح بچ جاؤ گے تو جب تک تم زندہ رہو گے ہم تم سے ناراض رہینگے اور جب تم مر جاؤ گے تو ہمارے بھائی عقبیٰ کے قوانین تمہیں خوش آمدید نہیں کہیں گے کیونکہ ان کو معلوم ہو گا کہ دنیا میں تم نے ہم کو مٹانے کی ہر کوشش کی ہماری بات سنو اور کریٹو کے کہنے میں نہ آؤ۔

تم کو معلوم ہونا چاہئے میرے عزیز کریٹو یہ وہ آواز ہے جسے میں سن رہا ہوں جس طرح (Corybantes) کے پجاری عالم جوش میں بانسری کی تانیں سنتے ہیں۔ اور یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ دوسرا کوئی لفظ سنائی نہیں دیتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم میرے ارادے میں لغزش پیدا کرنا چاہو گے تو تمہاری ہر سعی بے سود ہو گی۔ بہر حال اگر تمہارا خیال ہے کہ تم کامیاب ہو سکتے ہو تو میں تمہاری باتیں سننے کے لئے تیار ہوں۔

کریٹو:۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا سقراط!

سقراط:۔ تو پھر اس معاملہ کو یہیں چھوڑ دو کریٹو اور جیسا میں کہتا ہوں ویسا ہی کرو کیونکہ خدا ہمیں بھی ہدایت کرتا ہے۔

ترجمہ

ضیا فتح آبادی۔ ایم۔ اے

نیکی اور بدی

میں سوچتا ہوں کہ
اسوقت دنیا میں ایک فیصدی انسان نیکی کا پرستار ہے اور ننانوے فیصدی انسان بدی کی طرف مائل ہیں —— تو کیا —— بدی کے اثرات نیکی کے اثرات سے قوی تر ہیں؟ —— یا —— بدی انسان کی فطرت ہے اور نیکی اکتساب؟

کچھ دیوانے یہ کہا کرتے ہیں کہ گناہ اور تقدس میں امتیاز انسان نے خود کیا ہے —— غالباً یہ امتیاز کسی مقصود کے ماتحت کیا ہو گا —— کیا وہ مقصود پورا ہوا؟

ایک مجذوب نے ایک دفعہ مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ ہم خود کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ سعی اور اس کے مقاصد خود امتیاز پیدا کر دیتے ہیں —— مجھے ہنسی آ گئی —— سعی اور اس کے مقاصد قائم کرنے والے کیا اس سے بے خبر رہتے ہیں کہ ان کی راہ عمل کن کن مقامات سے گذریگی۔ اگر بے خبر نہیں ہوتے تو امتیاز کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے

نیکی اور بدی کی تعریف یہ کیا بری ہے —— انسان کا ہوش تمام بدی اور بیخودی تمام تر نیکی عمل تو بیخودی میں بھی ہو سکتا ہے —— اور پھر —— اس کے اثرات اتنے خوفناک نہیں ہوتے

پرسوں ایک مداری نے میرے ہاتھ میں پتھر کا ایک ٹکڑا دیا اور پھر مجھ سے لیکر اسے ہوا میں غائب کر دیا کہیں یہ نیکی اور بدی کا تماشا بھی ایسا ہی تو نہیں ہے؟ انسان جو کچھ کر رہا ہے کر بھی رہا ہے؟ —— یا —— صرف اس فریب میں مبتلا ہے کہ کر رہا ہے؟ —— نیکی نیکی ہے بھی اور بدی بدی ہو بھی سکتی ہے —— یا —— کچھ بھی نہیں ہے —— اور اگر —— کچھ بھی نہیں ہے تو آخر کس طرح؟

اگر ہم نیکی سے آشنا نہ ہوتے تو کیا بدی نیکی نہ ہوتی؟ —— اور اگر —— ہر بدی کو نیکی قرار دیدیا جائے تو انسانی زندگی اپنے مقاصد میں کیسو نہ ہو جائے؟ ——

کل نہ جانے یہ کون کہہ رہا تھا کہ یوں کیوں نہیں کہتے —— "اگر ہم بدی سے آشنا نہ ہوتے تو ......" —— میں اول تو یہ غور کرتا ہوں کہ اگر انسان اعتقادات کا مرید نہ ہوتا تو نظام عالم میں کیا کمی آ جاتی —— پھر یہ سوچتا ہوں کہ یوں بھی مان لیا جائے —— تو —— بدی نیکی نہ ہوتی نیکی بدی نہ ہو جاتی۔ پھر ایسا کیوں نہ ہوا؟

جنگ باطل کی حمایت میں بدی —— اور —— حق کی حمایت میں نیکی! کیا بدی اور نیکی کی حقیقت یہی ہے کہ ایک ہی فعل متضاد مقاصد کو بھی پورا کر سکتے ہیں؟ —— یا —— مقاصد افعال کی فطرت کو بھی تبدیل کر دیتے ہیں؟

نیکی اور بدی سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ انسان اپنے افعال پر بھی قادر ہے اگر قادر ہے تو اس کی ہر بدی بھی نیکی —— اور اگر —— قادر نہیں ہے تو کسی بدی کی ذمہ داری اس پر نہیں آتی —— مگر —— ہر بدی نیکی کیوں؟ —— اور —— ہر بدی کی ذمہ داری سے بریت آخر کس طرح؟

ایک سال ہوا ایک "محفل رقص" میں کوئی بزرگ آ گئے —— لوگ ذرا چونکے تو فرمانے لگے کہ —— نیکی اور بدی کا انحصار ضمیر اور نفس پر ہے۔ دنیا میں کبھی ایسا نہ ہوا ہو گا کہ انسان نے گناہ کے اقدام سے پہلے گناہ نہ محسوس کیا ہو —— اس پر ایک مورخ صاحب نے فوراً جواب دیا —— "اور ایسا کب ہوا کہ انسان کو گناہ اور تقدیس سے بالکل ناواقف رکھا گیا ہو۔ یہ احساس گناہ جسے آپ ضمیر سے منسوب کرتے ہیں خود انسان کی تربیت کا رہین منت ہوتا ہے! دیکھتے نہیں انسان کو افعال کی نیکی اور بدی سے اسوقت تک متواتر آگاہ کیا جاتا ہے۔ جبتک وہ افعال کی ان صلاحیتوں سے واقف ہو جائے جو انہیں بدی اور نیکی میں تبدیل کرتی ہیں" —— میں نے خیال کیا —— ایک عقیدہ نیکی اور بدی کے احساس اور دوسرا نیکی اور بدی کی تعلیم سے تعلق رکھتا ہے

روندی پڑی ہیں خاک پہ نیکی کی قوتیں — اور حکمراں ہے فتنۂ باطل کی سرکشی
بکری کی کھال اوڑھ کے خونخوار بھیڑیے — انسان کے لہو سے بجھاتے ہیں تشنگی
پنہاں ہیں دوستی کے تبسم میں نیشتر — خنجر ہے آستیں میں بہ دمِ صلح و آشتی
اُگتے ہیں خار لالۂ رنگیں کے بھیس میں — شیرینیوں کی تہہ میں ہے تلخی چھپی ہوئی
پیشانیوں پہ غازۂ معصومیت کی ضو — سینوں میں ہولناک عداوت کی تیرگی
چڑھتی ہے بھینٹ آتشِ سرمایہ دار پر — مزدورِ فاقہ مست کے چہرے کی روشنی
جھلسی ہوئی ہے آتشِ دولت کی آنچ سے — افلاس کے لبوں کی درخشاں شگفتگی
ناداریوں کے قحط سے فاقوں کے ظلم سے — پھیکی ہے گلرخوں کے تبسم کی چاندنی
ہر لذتِ حیات میں شامل ہے زہرِ غم — غالب نشاطِ زیست پہ ہے رنجِ مفلسی

شام و سحر حریمِ امارت کے سائے میں
ہوتی ہے سیم و زر کے خداؤں کی بندگی

(خواجہ) مسعود علی ذوقی بی اے (علیگ)

مشرق اور ضبطِ تولید کا نظریّہ

BIRTH CONTROL

(از ملّا واحدی صاحب)

اولاد کو روکنے کے لئے دوائیں اور آلات استعمال کرنا میرے نزدیک تمام مذاہب کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ اسلام کی تعلیمات کا تجزیہ کیا جائے تو غالباً منعِ اولاد قتلِ اولاد کا مرادف ثابت ہوگا۔ ہندوؤں میں برہمچرج اور عیسائیوں وغیرہ میں رہبانیت کا رواج رہا ہے اور اب بھی کسی نہ کسی حد تک ہے لیکن برہمچرج اور عیسائیوں وغیرہ میں رہبانیت کی غرض ضبطِ اولاد نہیں بلکہ ضبطِ نفس ہے۔

کمزور اور بیمار عورتوں کا جہاں تک تعلق ہے میں بھی ان مردوں کو برتھ کنٹرول کلنک کے محرک ہی کی طرح بُرا کہنے کو تیار ہوں جو کمزور اور بیمار عورتوں کو اولاد پیدا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ میں انہیں ظالم ہی نہیں، لامذہب یا کم از کم مذہب کو بدنام کرنے والے کا خطاب دیتا ہوں لیکن کمزور اور بیمار عورتوں کے معاملہ میں بھی مجھے برتھ کنٹرول کرنے سے اتفاق نہیں دل میں رکھتا ہوں۔ رہ گئی بچّوں کی پرورش تو اس کی بابت اپنے بچپن میں خود میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو غیروں کو کھلا کر اور غیروں کو پہنا کر خوش ہوا کرتے تھے۔ آج سے ہزاروں برس پہلے نہیں جبکہ حضرت ابراہیم اجنبی مسافروں کے دسترخوان پر بٹھائے بغیر کبھی کوئی وقت ٹکڑا نہیں توڑتے تھے۔ آج سے صرف چالیس برس پہلے اور اسی شہر میں جو اب تدبرست تہذیب اور نفس پرور تمدن کا مرکز بنتا جاتا ہے میں نے قدیم مشرقی تہذیب کو آخری سانس لیتے دیکھا ہے۔ پھر بیس سال پہلے تک میں نے دیکھا ہے کہ غیر تو چھوٹ گئے تھے غیر تو غیر ہو گئے تھے لیکن بہن بھائی اور قریبی عزیزوں کا ہر کمانے والے کی کمائی میں حصّہ تھا اور وہ کمانے والا بھاگوان تصوّر کیا جاتا تھا جس کی کمائی میں دوسروں کا ساجھا ہوتا تھا۔ مگر آج؟

آج میں دیکھتا ہوں کہ لوگ اپنی کمائی میں اپنے بچّوں کو بھی شریک کرنا نہیں چاہتے کیا ضبطِ ولادت کی تجویز میں یہی جذبہ کام نہیں کر رہا ہے؟ وہ احساسات جو بچّوں کی وجہ سے غربا کے اندر پیدا ہوا کرتے ہیں انہیں میں تمام ...... لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں کیونکہ میں بھی غریب ہوں امرائے شہر نے وہ احساسات سُنے ہیں۔ مجھ پر اور میری جماعت اور میرے طبقہ پر طاری رہتے ہیں۔ ایک غریب جب اپنے اور امیروں کے بچّوں کا موازنہ کرتا ہے اور جب اس کے بچے امیر بچّوں کی حرص میں اس سے عمدہ عمدہ غذائیں اور عمدہ عمدہ لباس مانگتے ہیں اور جب غریب کے ہونہار بچّہ کو امیر کے مٹھس بچّہ کے برابر سامان تعلیم میسّر نہیں آتے تو غریب کے دل میں ایک آگ بھڑکتی ہے۔ میرے دل میں ایک آگ بھڑکتی ہے جو میری رگوں میں دوڑنے والے خون کو اسٹیم سے بدل دیتی ہے اور میں اس بڑھاپے میں بارہ بارہ اور چودہ چودہ گھنٹے کام کرنے لگتا ہوں۔ کیا دولتمندوں میں یہ اسٹیم ہے؟ کیا لاولدوں میں یہ اسٹیم ہے؟ کیا بے فکری سے گزارنے والوں میں یہ اسٹیم ہے؟ اس آگ کو باقی رہنے دو جس سے یہ اسٹیم بنتی ہے۔ غربت کے باعث اپنے بچّوں کی ضرورتیں پوری نہ کر سکنے کی وجہ سے جو بے چینی پیدا ہوتی ہے اُسے مت مٹاؤ۔ یہ بے چینی اور یہ اضطراب اور یہ تڑپ مبارک ہے۔ اسی تڑپ کے کسی گوشہ میں ہماری سربلندی پنہاں ہے یہی آگ گرم ہونے والے پانی کو ایک دن اونچا کرے گی اور ٹھنڈا پانی نیچے آ جائے گا۔ سمجھدارو! اس آگ کو بھڑکاؤ کہ یہ ایک گھر سے دوسرے گھر میں اور دوسرے گھر سے تیسرے گھر میں پہنچے۔ امیرو! تم بھی روزے رکھو کہ تمہیں غریبوں کی فاقہ کشی کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سارے ملک میں بچّوں کی تکلیفوں کے سبب واحد روح دوڑ جائے۔ میں تمہارے بچّوں کے لئے کڑھوں اور تم میرے بچّوں کے لئے کڑھو۔ مجھے تم سے ہمدردی ہو جائے اور تمہیں مجھ سے ہمدردی ہو جائے اولاد والے ہی اولاد والوں سے ہمدردی کر سکتے ہیں۔

میں خوب سوچ کر اور غور کر کے کہتا ہوں کہ اپنے بچّوں کو دُنیا میں آنے سے ہرگز نہ روکو اور ان کی تکلیفوں سے نہ گھبراؤ اور ان کی تکلیفوں سے تمہیں تکلیف ہو تو اس کی پرواہ نہ کرو تمہارے بچے تم میں قوتِ عمل پیدا کرتے ہیں۔ اور تمہارے تکلیف اٹھانے والے بچے ہی دُنیا میں کچھ کر سکیں گے۔ گدے دار کوچوں اور کرسیوں پر کودنے والے اور قالینوں اور غالیچوں پر کھیلنے والے بچّوں سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہئے۔ غریبوں کے بچّوں اور غریبوں ہی کے ہاتھ سے ملک کی ہر مصیبت کا خاتمہ ہوگا۔

"برتھ کنٹرول کلنک" کے محرکوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کو ترقی یافتہ ممالک کا ساتھ دینا چاہئے اور محض تجربہ کے لئے عارضی طور پر "برتھ کنٹرول کلنک" کھول دینا چاہئے جہاں عورتوں کو برتھ کنٹرول کے طریقے سکھائے جائیں اور جہاں سے برتھ کنٹرول کرنے کی تبلیغ کی جائے۔

میں اپنے عزیز دوستوں کے سامنے قرآن و حدیث یا وید و انجیل کے حوالہ سے نہیں ترقی یافتہ ممالک کے صحائفِ قدسی ہی کے ذریعہ ثابت کروں گا کہ تجربہ کرنے والوں نے برتھ کنٹرول کا تجربہ کر لیا ہے اور ہمیں اور آپ کو مزید تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے قریباً ڈیڑھ سو سال سے برتھ کنٹرول کی وبا یورپ و امریکہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ ساٹھ سال گزر گئے کہ دواؤں اور آلات سے برتھ کنٹرول کرنے کا تجربہ جاری ہے۔ ڈیڑھ سو سال اور ساٹھ سال کا زمانہ تجربہ کے لئے ناکافی نہیں ہوتا۔ پھر یہ تجربہ جاہل اور غیر مہذب اور محکوم و غلام ہندوستانیوں نے نہیں کیا۔ روشن دماغ علمبرداران تہذیب و تمدن اور آزادوں کی قوم نے کیا ہے۔ انہوں نے کیا تجربہ کیا ہے؟ اور بالآخر وہ کس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ انہی کی زبان سے سُن لیجئے۔

انگلستان کا نیشنل برتھ ریٹ کمیشن جس میں بڑے بڑے ماہرینِ طب و سائنس شامل ہیں اپنی ایک رپورٹ میں لکھتا ہے کہ:۔

"برطانیہ کو شرحِ پیدائش کی کمی پر تشویش کی نظر رکھنی چاہئے اور اس کمی کو روکنے کے لئے بعض تدابیر اختیار کرنی چاہئیں"۔

111

سر جارج نیومن، جو انگلستان کی وزارت صحت کے چیف میڈیکل افسر ہیں کہتے ہیں کہ:
"اگر شرح پیدائش کی روز افزوں کمی کو نہ روکا گیا تو برطانیہ ایک چوتھے درجہ کی طاقت رہ جائے گی۔"

فرانس کے مدبروں کا خیال ہے کہ شرح پیدائش کا زوال فرانسیسی قوم کا زوال ہے فرانس کی حکومت زیادہ بچے پیدا کرنے والے گھرانوں کو مالی امداد دے رہی ہے۔ اس نے ان پر سے ٹیکس کا بار ہلکا کر دیا ہے۔ ان کی تنخواہیں اور مزدوریاں بڑھا دی ہیں ان سے ریل کا کرایہ کم لیا جاتا ہے۔

جرمنی نے عورتوں کو دفتروں اور کارخانوں سے نکال دیا ہے تاکہ وہ گھروں میں جا کر بیٹھیں اور گھریلو عورتوں کی سی زندگی بسر کریں۔ ایک بچہ کے باپ سے وہاں انکم ٹیکس میں پندرہ فی صدی رعایت کی جاتی ہے۔ دو بچوں کے باپ سے پینتیس فیصدی۔ تین بچوں کے باپ سے پچپن فیصدی۔ چار بچوں کے باپ سے پچھتر فیصدی۔ پانچ بچوں کے باپ سے پچانوے فیصدی اور چھ بچے ہو جائیں تو پھر انکم ٹیکس لیا ہی نہیں جاتا۔

میں اور مثالیں بھی دے سکتا ہوں لیکن ....

.... ترقی یافتہ ممالک کی تقلید اور تجربہ کرنے کی نسبت مختصراً بس اتنا اور کہتا ہوں کہ کسی ایسے ملک کی حکومت نے جہاں حکومت ملک کے باشندوں کی ہو کبھی برتھ کنٹرول کو جائز نہیں سمجھا۔ البتہ انگلستان اپنی قوم کی برتھ کنٹرول کی دیوانگی کو بڑے اہتمام سے دبانے کی سعی میں ضرور مصروف ہیں اور ترقی یافتہ قوموں کی خود بھی آنکھیں کھل گئی ہیں اور munnriage Loa ns (قرضہائے شادی) ɛeague of notinal life (جمعیت حیات قومی)

....

وغیرہ ناموں سے زبردست تحریکیں یورپ و امریکہ میں برتھ کنٹرول کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔

ہندوستان میں تو ادنےٰ طبقہ برتھ کنٹرول کیا کرے گا یورپ و امریکہ میں بھی ادنیٰ طبقہ برتھ کنٹرول سے دور رہا ہے۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ پسماندوں کی پسماندگی اور مفلسوں کی مفلسی کو دور کرنے کے لئے برتھ کنٹرول کلنک قائم کرنے کی ضرورت ہے لیکن کہنے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ برتھ کنٹرول کرنے پر کتنا خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پسماندہ اور مفلس اس خرچ کو برداشت نہیں کر سکتے۔

یہ سب بہانے ہیں۔ امراء کا طبقہ جوانی اور عیش و عشرت کو حتی المقدور دائم رکھنے کے لئے برتھ کنٹرول کرتا ہے اور صاف لفظوں میں یوں سنیئے کہ بچوں کے وجود کو عیاشیوں میں حارج پا کر چاہتا ہے کہ بچوں کے بکھیڑے میں نہ پھنسے۔ برتھ کنٹرول کرنے والے عموماً وہ لوگ ہیں جن کی فقط دو موٹروں کی قیمت میں غریب کا نہیں خود ان موٹر والے ہی کا بچہ پل کر جوان ہو سکتا ہے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بن سکتا ہے۔

امراء کے طبقہ کے بعد متوسطین کا طبقہ ہے جس کی عادت جاریہ ہے کہ امراء کے طبقہ کی تقلید کرے اور اپنے سکون کو تباہ و برباد کر ڈالے یہ طبقہ متوسطین برتھ کنٹرول کے مرض میں دوسرے نمبر پر مبتلا ہے۔ ہندوستان کا ذکر نہیں کر رہا ہوں متمدن اور ترقی یافتہ ممالک کا ذکر کر رہا ہوں وہاں بس انہی دو طبقوں نے اس سعادت کو حاصل کیا ہے تیسرا طبقہ یعنی پسماندہ اور مفلس لوگوں کا طبقہ جس کے نام پر برتھ کنٹرول کی تحریک جاری کی گئی ہے اس سے یکسر محروم ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مہذب و ترقی یافتہ ممالک کو شکایت ہے کہ ان میں اعلیٰ طبقہ اور اوسط طبقہ گھٹ رہا ہے اور ادنےٰ طبقہ بڑھ رہا ہے کیا وہی ہندوستان میں برتھ کنٹرول کلنک بنوانے والے یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں اچھے گھرانے ختم ہو جائیں اور ایک ہی طبقہ کا ...... دور دورہ ہو جائے۔

تین چیزیں ہیں جو انسان کو برائی اور بدکاری سے باز رکھا کرتی ہیں اول مذہبیت، دوسرے شرم و حیا تیسرے ہمجنسوں کی طعنہ زنی۔

مذہبیت سب کو معلوم ہے کہ کس حال میں ہے۔ خدا کا تصور باقی اور قائم ہوتا تو اتنے بحث و مباحثہ کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بس خدا کے بھروسہ کا نام لے دیتا اور برتھ کنٹرول کلنک کی عمارت دھم سے آپڑتی۔ شرم و حیا بھی تیز رفتاری کے ساتھ رخصت ہو رہی ہے عورت و مرد کا ملنا جلنا اور اختلاط اب معیوب نہیں ہے لہذا صرف تیسری چیز رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے مرد یا عورت بدکاری سے بچ سکتے ہیں یعنی ہمجنسوں کی طعنہ زنی۔ سوسائٹی کا خوف۔ برتھ کنٹرول کلنک بن گیا تو یہ خوف بھی جاتا رہے گا۔ بچہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہی نہ ہوگا تو بدکاری سے بچنے کی ضرورت کیا ہے۔ برتھ کنٹرول کلنک سے بدکاری کے لائسنس ملا کرینگے جب کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ شہوتیں بدکاری نہ پھیلنے دے اور اس بات کو اپنے فرائض میں بڑھا لے ....

.... مگر بدکاری کے ساتھ امراض خبیثہ کا پھیلنا لازم ہے اور امراض خبیثہ کی روک تھام انسانی فرائض میں پہلے سے داخل ہے۔

تیسرا نقص برتھ کنٹرول کا میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ برتھ کنٹرول کرنے سے یعنی بچوں کی پیدائش روکنے سے ہماری منزلی زندگی خراب ہو جائے گی۔ اولاد ماں باپ کے تعلقات کو مستحکم کرنے میں سب سے بڑی معاون ہوتی ہے۔ میاں بیوی کے پیروں میں اولاد ایسی بیڑیاں ڈال دیتی ہے جو عمر بھر نہیں ٹوٹتیں۔ حال ہی میں ایک دن کے اندر انگلستان کی ایک عدالت طلاق نے ایک سو پندرہ نکاح فسخ کرائے ہیں اور یہ ایک سو پندرہ جوڑے سب کے سب بے اولاد تھے۔

آندھیوں سے ڈر کر درخت کٹوا ڈالنا یا شکر آنے سے گھبرا کر پیشاب بند کر دینا کسی عقلمند کے نزدیک عقلمندی نہیں ہے اسی طرح بچوں کی پرورش نہ کر سکنے کے خیال سے بچوں کو پیدا نہ ہونے دینا بھی عقلمندی نہیں قرار پا سکتا۔ آمدنی بڑھایئے اور خرچ گھٹانے کی ضرورت ہو تو اور خرچ گھٹایئے۔ وسکی اور شمپین کی ایک بوتل کے بدلہ ایک بچہ کی کئی دن کی خوراک آ سکتی ہے ایک سوٹ کی قیمت سے ایک بچہ کی زندگی بچ جانی ممکن ہے کلبوں کی فیسیں دینی اور گھوڑ دوڑوں کے ٹکٹ خریدنے بند کیجئے سینکڑوں بچے ان بچتوں سے تندرستی حاصل کر سکتے ہیں۔

ان خیالات اور ان توجیہات کو پیش کر کے میں برتھ کنٹرول کلنک قائم کرنے کا مخالف ہوں

(واحدی)

کشمیر میں سپیدوں کے درختوں کا ایک منظر

نپولین کی بھاوج

یوں تو بنی نوعِ انسان کی ہر دو صنف کو قدرت نے شہرت کی خواہش اور عظمت وجاہ کی طلب کا جذبہ ودیعت کیا ہے۔ مگر عورت فطرتاً مرد سے کہیں زیادہ شہرت و عظمت کی طالب بنائی گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض عورتوں کا ماحول و تربیت انھیں اس پوشیدہ آرزو کو محدود رکھنے پر مجبور کر دے۔ یا انھیں اس قسم کا موقعہ ہی نہ ملے کہ وہ اپنی تمنا کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ عورت اس جذبہ سے قطعی بیگانہ رہ کر زندگی گذار سکے اگر کسی عورت کو زمین کا کوئی خطہ اپنی قوتوں کے تصرّف کے لئے نہیں ملتا تو وہ انسانوں کے دلوں پر اپنے حسن و جمال کی بے پناہ قوتوں کے ذریعہ حکمرانی کی سعی کرتی ہے۔ یہ بھی اُسکی فطرت ہے کہ وہ اس قسم کے "بندگانِ جمال" انسانوں کے دائرے کو ہمیشہ وسیع ترین حیثیت میں دیکھنا چاہتی ہے۔ لیکن اگر کسی سبب سے وہ زیادہ انسانوں کو "گرفتارِ حسن" نہیں کر سکتی یا نہیں کرنا چاہتی تو ایسا تو کبھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک انسان کے دل کو بھی مسحور کرنے کی کوشش نہ کرے۔ عورت کے پاس اپنی اس تمنا کو کامیاب اور فاتح بنانے کا صرف ایک ذریعہ ہے ... "محبت".... ! حصولِ مدعا کے لئے اکثر اُسے خود بھی گرفتارِ محبت ہونا پڑ جاتا ہے۔ مگر یہ اُس کے لئے کوئی تکلیف دہ بات نہیں ہوتی۔ کیونکہ جہاں وہ قدرت کی طرف سے ایسی پُر فریب تجلیوں کی مالک بنائی گئی ہے جو مرد کو اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے پر مجبور کر دیتی ہیں وہاں وہ ایک ایسا دل بھی پہلو میں لے کر آئی ہے جو محبت اور صرف محبت سے وابستہ رہنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر عورت کی زندگی سے محبت (چاہے وہ فریب محبت ہی کیوں نہ ہو) کے تعلق کو بالکل علیحدہ کر لیا جائے تو وہ زندہ نہیں رہ سکتی محبت اس کے خمیر میں شامل ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ عورت نے "اپنے جنونِ حکمرانی" کو کامیاب بنانے میں محبت سے بہت مدد لی ہے۔ اس نے بڑے بڑے سلاطین۔ بڑے بڑے بہادر اور انسانیت کے پیکروں کو خرابِ محبت بنا کر اپنی طلبِ عظمت کو پورا کیا ہے۔ تاریخ عالم ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

ایلزبتھ پیٹیرسن بھی "ایک عورت" تھی۔ اور ایسی ہی عورت جس میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ابھی ابھی میں نے عرض کیں۔ تقریباً سوا سو سال کا عرصہ ہوا ہوگا۔ جب وہ امریکہ کے ایک شہر بالٹیمور میں ایک معصوم مگر شریر بچی کی طرح درختوں کے نیچے کھیلتی پھرتی تھی اُس کے باپ کا نام پیٹرسن تھا۔ جو امریکہ کے معزز لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا لوگ اُسے اکثر واشنگٹن۔ جفرسن اور لیفیٹ کی دعوتوں میں شریک دیکھتے تھے......

ایلزبتھ اس زمانہ میں بھی نہایت حسین و دلفریب بچی تھی۔ اس کا رنگ ملیح تھا اور قد میانہ اُس کی مخمور آنکھیں وہ بڑی بڑی اور سیاہ آنکھیں جب ہنگامِ تبسم اس کے ہونٹوں کے ساتھ مسکرایا کرتی تھیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو جام ہیں جن سے شراب چھلکی پڑتی ہے حسن و جمال کی اِن لطافتوں کے ساتھ قدرت نے اس کی فطرت میں ایک لطیف سی تلخی بھی شامل کر دی تھی جو ایک طرف تو تلخی تھی مگر دوسری طرف اسکی تمام ترقیوں کی ضامن

یعنی وہ ضدی تھی اور اکثر اس کی ضد بدمزاجی میں تبدیل ہو جایا کرتی تھی قدرت کا نظام تو دیکھئے۔ ایلزبتھ کو بچپن ہی سے حکمرانی کا شوق تھا۔ وہ اکثر ایسے کھیل کھیلا کرتی تھی جن میں ملکہ بننا پڑتا تھا۔ گھنے پیڑوں کے سائے میں وہ اپنی بہن بھائیوں کے ساتھ اس طرح کھیلتی گویا وہ واقعی ملکہ ہے۔ اُس کی اس پوشیدہ فطرت کا یہ اثر ہوتا تھا کہ اُس کے بہن بھائی بھی اپنے آپ کو ڈیوک اور رڈچز سے کم نہیں سمجھا کرتے تھے ایلزبتھ کا بچپن کا نام "بیٹسی" تھا۔ اور کافی عمر تک اُسے اسی نام سے پکارا جاتا رہا

دن گذرتے گئے "بیٹسی" آہستہ آہستہ جوان ہونا شروع ہوئی۔ جیسے گلاب کی کلی تیوں سے آہستہ آہستہ پھوٹتی ہے۔ جب شباب اُس کی معصوم صورت میں ہلکا ہلکا سرخ رنگ بھر رہا تھا تو قدرت مسکرا رہی تھی۔ یعنی تقدیر کے سامنے ایک نیا پروگرام تھا۔ وہاں ایک عورت کے جنونِ حکمرانی کی داستان تیار ہو رہی تھی

آہ۔ دنیا میں کیا ہزاروں عورتیں ایسی نہ ہوں گی۔ جن کی آرزوئیں کبھی اپنی حد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ اور جن کے عظیم ارادے ہمیشہ تشنۂ تکمیل ہی رہے۔ ایلزبتھ کی داستانِ زندگی بھی کچھ اسی طرح مرتب کی جا رہی تھی۔ جوں جوں ایلزبتھ کے حسن و جمال میں اضافہ ہوتا گیا اتنی ہی اس کی خصوصیات نمایاں ہوتی چلی گئیں۔ اس کی فطری "طلبِ حکمرانی" بھی اور اس کی وہ ضد بھی جو اسے میدانِ عمل سے کبھی پیچھے نہیں ہٹنے دینا چاہتی تھی ادھر اُس کا باپ مسٹر پیٹرسن بھی جو ایک رئیس و با اثر آدمی تھا برابر ترقی کر رہا تھا اور اس طرح ایلزبتھ کی خاندانی حیثیت بھی روز بروز عروج کی طرف مائل تھی

یہ ایلزبتھ کی فطری خواہشِ حکمرانی ہی تھی کہ شباب کی منزل میں قدم رکھنے کے بعد اُسے جب کبھی اپنی شادی کا خیال آیا تو اس نے اپنے تصور میں ہمیشہ کسی بڑے انسان کو جگہ دی اور ہمیشہ ایسے ہی انسانوں کو ترجیح دی جو دولت و ثروت۔ حکومت و عظمت کے مالک ہوں یہ ہی نہیں بلکہ اس زمانہ کے بعض لوگ تو یہاں تک ذکر کرتے ہیں کہ وہ شروع ہی سے فرانس کے شاہی دربار میں بحیثیت ایک ملکہ کے پہنچنا چاہتی تھی۔ اس کے مطالعہ میں ہمیشہ وہ کتابیں پائی گئیں جو بڑے اہم واقعات اور بہت شاندار زندگیوں کے اذکار سے بھری ہوئی ہوتی تھیں ملکی حالات اور واقعاتِ عالم پر نگاہ ڈالنے میں بھی اُس کی یہ ہی خصوصیت نمایاں تھی چنانچہ وہ نوجوانی کے عالم سے ہی نپولین بونا پارٹ کی جنبشوں کا بہت غور سے مطالعہ کر رہی تھی۔ وہ نپولین جس کے اقبال کا ستارہ جزیرہ کارسکا سے چمکا تھا۔ اور سینٹ ہلینا میں غروب ہونے والا تھا۔ اور کس کو معلوم تھا کہ امریکہ کی ایک معمولی لڑکی اپنی قوت کے ایک لطیف اشارے سے نپولین کی بہت سی تدابیر کو درہم برہم کرنے والی تھی اور اس کے بدلے میں نپولین اُس سے نہایت ظالمانہ انتقام لینے والا تھا۔

ایلزبتھ کے باپ نے اپنی لڑکی کے خیالات کا ہمیشہ غور سے مطالعہ کیا اور اسے ہمیشہ اعتدال تحمل اور استقلال کی مرکز پر قائم رکھنے کی کوشش کی۔ مگر قدرت کی مصلحتوں کو پورا ہونے سے

کون روک سکتا ہے۔ پیٹرسن نے جتنی کوشش ایلزبتھ کو اعتدال پسند بنانے کی کی ایلزبتھ اتنی ہی انتہا پسند ہوتی گئی

اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ بلا لحاظ اس کے کہ کوئی بادشاہ اپنے آبا و اجداد کا کتنے ہی بڑے سلسلے کا دعویدار کیوں نہ ہو۔ لیکن جب اُس کے نسبی سلسلے کو ذرا دور تک دیکھا جائے گا تو یقیناً یہ معلوم ہوگا کہ وہ کسی ایسے شخص کی نسل سے ہے جو کبھی ایک کسان یا سپاہی یا شکاری یا تاجر تھا۔ اور جس نے کسی انقلاب کے زمانے میں لوگوں کی صحیح رہ نمائی کرکے اپنے آپ کو اپنی قوت اور حکمت سے سلطنت کا مالک بنالیا اٹھارویں صدی کے آخر میں نپولین نے بھی ایک ایسی ہی مثال پیش کی تھی وہ کارسکا کے ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ مگر اُس کے عزائم بلند اور خیالات نہایت ارفع و اعلیٰ تھے۔ یہاں تک کہ وہ فرانس والوں کے عادات اور طریقوں کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا جو لوگ انقلاب پسند ہوتے ہیں وہ ملکی رسم و رواج میں بھی ہمیشہ انقلاب کے متمنی رہتے ہیں نپولین کی قابلیت اور اہلیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ ستائیس سال کی عمر میں فرانس کا قونصل اول تھا اور اس کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ لوگ عام طور پر اُسے یورپ کا ریگولیٹر کہتے تھے۔ اور واقعی وہ ناظم تھا۔ اُس نے ملک کیا اپنے خاندان اور اس کے تمام معاملات تک کو منظم کردیا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے بھائی اور بہنوں کے تمام معاملات بھی وہ خود ہی طے کرتا تھا۔ اس سلسلے میں اُسے بعض لوگوں سے جھگڑنا بھی پڑا۔ کیونکہ اُن میں سے بعض نے بجائے اس کے مفاد کے ماتحت کام کرنے کے اپنے مفاد کے مطابق کام کئے۔

اسی نپولین کا ایک بھائی "جیروم" تھا۔ جو فوجِ شاہی میں داخل ہونا چاہتا تھا تاکہ نپولین کی فتوحات میں اُس کا بھی نام آجائے۔ لیکن نپولین نے ہمیشہ مصلحتاً اُس کی اس قسم کی درخواست کو نامنظور کردیا۔ اور اس کی بجائے اُسے جہاز کے بیڑے میں داخل کردیا (نپولین نے بعد میں اپنی اس غلطی کا خود بھی اعتراف کیا ہے) اس زمانہ میں جیروم کی عمر زیادہ نہ تھی۔ وہ ایک طالبعلم معلوم ہوتا تھا۔ بحرِ قلزم میں تھوڑے عرصے کام کرنے کے بعد وہ ویسٹ انڈیز بھیجدیا گیا مگر اس کا وہاں دل نہ لگا۔ اور بلا کسی خاص وجہ کے، اور اپنے بھائی نپولین سے دریافت کئے بغیر اس نے ممالک متحدہ امریکہ کا قصد کرلیا

امریکہ کے صدر جیفرسن کو جیروم کے اچانک امریکہ پہونچنے سے بڑی فکر ہوگئی۔ اسے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جیروم کی وجہ سے امریکہ اور انگلستان کے تازہ مصالحانہ تعلقات میں فرق آجائے۔ اور نپولین کے بھائی کے واسطے کوئی کام کرنے سے انگلستان برانگیختہ ہوجائے۔ تاہم اس سے یہ بھی امید نہ ہوسکتی تھی کہ وہ نپولین کے بھائی سے کسی قسم کا غیر مہذب برتاؤ کریگا

جیروم کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے مگر امریکہ کے لوگوں کو حقیقت میں اُس کا حال اُس وقت معلوم ہوا جب اسنے کموڈر بارنی کے مکان واقعہ بالٹیمور پر جانے کا دعوت نامہ قبول کرلیا۔ کموڈر بارنی نے فرانسیسی بیڑے پر بھی کچھ عرصہ ملازمت کی تھی۔ جیروم کی یہ عادت نہ تھی کہ وہ نتائج پر زیادہ غور کرے اس لئے اُس نے اسوقت تک جبتک کہ وہ فرانس سے بلایا نہ جائے خوب تفریح میں وقت کاٹنے کا ارادہ کیا اور عیش و عشرت کے ہر ممکن موقعہ سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ اِسی لئے جب بارنی نے جو اعلان آزادیِ ریاست ہائے متحدہ کے دستخط کرنے والوں میں سے ایک کا داماد تھا نہایت

فخر کے ساتھ اپنے جدید مہمان کا نام اور اُس کے عہدہ کا اعلان کیا تو چار دن کے بعد ہی جیروم کے پاس بالٹیمور کے بڑے بڑے لیڈروں کے دعوت نامے آئے۔ اور اور حقیقت میں یہ وقت جیروم نے نہایت لطف کے ساتھ کاٹا

یہ کس طرح ممکن تھا کہ جیروم —— دنیا کی ایک عظیم الشان ہستی کا بھائی —— بالٹیمور میں دعوتیں کھائے۔ اور ایلزبتھ جس کی سرشت میں جنونِ حکمرانی اور آرزوئے جاہ و عظمت تھی اس موقعہ سے فائدہ نہ اٹھائے۔ چنانچہ حسن و جمال کا وہ پیکرِ لطیف اور عورت کی فطرتِ پنہاں کو نمایاں ترین حیثیت میں دنیا کے سامنے پیش کرنے والی حور بصورت ایلزبتھ جیروم سے ملی اور اس انداز سے ملی کہ جیروم اپنے دل و دماغ پر قادر نہ رہ سکا۔ کسی کو کیا معلوم تھا کہ جب ایلزبتھ جیروم کو اسطرح مسحور کررہی تھی تو اس کے ارادوں اور ان کا مقصود کیا تھا

ایلزبتھ کی عمر اس وقت سولہ سال کی تھی اس وقت اُس کے فردوسی جمال کا کوئی کیا اندازہ لگا سکتا تھا۔ اِدھر جیروم کی عمر بھی اٹھارہ سال کی تھی۔ اس کی آرزوئیں بھی طوفان در آغوش تھیں۔ چنانچہ دونوں کے تعلقات بڑھتے گئے۔ مسٹر پیٹرسن (ایلزبتھ کا باپ) نے اپنی لڑکی کی جنبشوں کو غور سے دیکھا اور سمجھا۔ اُس کی نگاہ میں یہ بات بھی تھی کہ جیروم فرانس کے قانون سے ابھی سات سال تک سنِ بلوغ کو نہیں پہنچا تھا۔ اس لئے اس عمر میں اگر وہ شادی کرے تو اس کے لئے قانوناً اس کی بیوہ ماں کی منظوری ضروری تھی۔ ان اندیشوں کی وجہ سے مسٹر پیٹرسن نے دونوں نوجوانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کی بے حد کوشش کی۔ حتیٰ کہ اپنی لڑکی کو باہر دیہات میں پہنچا دیا۔ لیکن وہاں تو کوئی اور ہی جذبہ کام کررہا تھا جس کا روکنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ چنانچہ ایلزبتھ دیہات سے بھاگ کر بالٹیمور آگئی اور اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ جیروم کی شریکِ زندگی بن کر رہے گی۔ اس نے اس کے متعلق پیرس کے امریکن منسٹر کو بھی خط لکھا اور اُس میں صاف لکھ دیا کہ سوائے جبر و تشدد کے کوئی چیز انکی شادی کو روک نہیں سکتی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ معاملہ کو بہتر صورت میں ہی طے کردیا جائے

ایلزبتھ کی تقدیر۔ مسٹر پیٹرسن اور دیگر متعلقین کی تدابیر پر غالب آئی۔ ایلزبتھ نے اپنی تمام قوتیں جیروم کو مدہوشِ محبت بنانے میں صرف کردیں

۱۱۴

اپنے جنونِ حکمرانی کو پورا کرنے کے لئے! — اور وہ جیروم سے شادی کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ شادی ۱۸۰۳ء میں ہوئی تھی۔ امریکہ کے لوگوں میں اس شادی کو بہت دلچسپ نگاہوں سے دیکھا گیا۔ کیونکہ یہ شادی واقعات کے لحاظ سے بہت عجیب و غریب تھی۔ اس شادی میں شریک ہونے والوں اور تماشائیوں کی تعداد بھی بہت کثیر تھی

مسٹر پیٹرسن نے اپنی خودرائے لڑکی اور یورپ کے سب سے بڑے آدمی کے بھائی کے درمیان شادی کو محفوظ اور قانونی بنانے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کیا ہر قسم کے قانونی کاغذات مرتب ہوئے۔ اور شہر کے سب سے بڑے کیتھولک بشپ نے اس رسم کو ادا کیا۔ وہ وقت بھی کس قدر عجب تھا۔ شہر کے تمام آدمی اس شادی.... ..کے مستقبل کے متعلق چہ میگوئیاں کررہے تھے۔ جگہ جگہ یہی ذکر تھا —— یہ سب کچھ تھا مگر —— نوجوان اور خوبصورت ایلزبتھ مسرت کے گہوارہ میں محوِ جھول

رہی تھی۔ وہ عیش و نشاط سے بیخود ہو رہی تھی۔ اسے دُور کی چیزیں قریب نظر آ رہی تھیں۔ اس کو جسبی نسبی اعزاز کا فطرتاً اپنے خاندان میں احساس ہونا چاہیئے تھا مگر وہ سب بوناپارٹ کے خاندان میں پا رہی تھی۔ وہ اس بات کو بالکل بھول گئی کہ اُس کے ایرسٹانی بزرگ جن میں سے ایک "اولڈ مارٹلیٹی" بھی تھا۔ خاندانی حیثیت سے اتنے ہی بلند تھے۔ جتنا کہ کارسیکا کے افسر کا بیٹا۔ اس نے یہ بھی فراموش کر دیا کہ خود اس کا باپ امریکہ کے انقلاب کا اقتصادی بار اُٹھانے میں رابرٹ مورس کے دوش بدوش رہا تھا۔ اور کارنوالس کو مطیع ہونے پر مجبور کرنے میں اُس نے بڑا حصہ لیا تھا۔

نوجوان جیروم یقیناً حکمراں نہیں تھا۔ اور یہ بھی واقعہ تھا کہ جب وہ بالٹیمور آیا تھا تو اس کا بھائی نپولین، فرانس کا صرف قونصل اوّل ہی تھا۔ مگر پھر بھی اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ نپولین اس حالت میں بھی فرانس کا حکمراں ہی تھا۔ اس لئے ایلزبتھ جیروم کے لئے مستقبل میں ایک علیحدہ سلطنت کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اور اس میں بھی کیا شک ہو سکتا تھا کہ جیروم نے بھی "مجنونِ حکمرانی" ایلزبتھ کو علیحدہ سلطنت کے کافی سبز باغ دکھائے ہونگے۔ اس کے علاوہ کچھ آثار تھے بھی۔ کیونکہ نپولین نے ہمیشہ اپنے خاندان والوں کا زیادہ خیال رکھا۔ یہ ہی وجہ تو تھی کہ آج جیروم کو کارسیکا کی غریب زندگی میں سے صرف نپولین کا مذاق اور جوزیفائن کی شوخیاں یاد تھیں اور باقی وہ عسرت و مصیبت جو وہاں ان لوگوں کی زندگی کا بدترین پہلو تھی کبھی یاد بھی نہ آتی تھی۔ جیروم خود بھی معمولی اہلیت کا انسان نہیں تھا۔ اس کی زندگی بھی بہادری کے کارناموں میں گذری اور اس کے عزایم میں ہمیشہ بلندی رہی —— لوگ اس کو بہت عرصہ تک "بحری بہادر" کے نام سے یاد کرتے رہے

دوشیزہ ایلزبتھ جب بیوی ہو گئی تو جنونِ حکمرانی کے ساتھ ساتھ اس کی اور خصوصیات بھی نمایاں ہوئیں۔ مثلاً اس کی خودنمائی اور خودپرستی۔ اور گو اس کی زندگی واقعات کا ایک عجیب سلسلہ رہی ہے۔ مگر پھر بھی اس نے اپنی عمر کا کافی حصہ اپنی نمائش اور آرایش میں صرف کیا —— آہ ہم یہ بھولے جا رہے ہیں کہ وہ عورت تھی —— دنیا کو اپنے قدموں پر گرانے کی خواہشمند عورت! —— وہ اکثر گھنٹوں آئینہ دیکھتی رہتی تھی اکثر اپنی تصویروں کے دیکھنے میں اتنی محو ہو جاتی تھی کہ کچھ خبر ہی نہ رہتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات کسقدر تعجب خیز ہے کہ وہ یقین رکھتی تھی کہ لباس کی سادگی حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ اور کارچوبی یا اور کسی قسم کا کڑھا ہوا لباس حسن کو زیب نہیں دیتا۔ اسی وجہ سے وہ چاہے گھنٹوں لباس کو زیب تن کرنے میں لگا دیتی مگر پہنتی تھی بالکل سادہ لباس، شادی کے بعد کافی عرصہ تک بوسٹن سے لے کر واشنگٹن تک دعوتوں کا سلسلہ رہا جیروم اور ایلزبتھ دونوں مست و بیخود تھے —— دنیا و مافیہا سے بے خبر —— امریکہ ہی میں نہیں بلکہ فرانس میں بھی اس شادی پر کافی اظہارِ مسرت کیا گیا —— مگر —— نپولین کی طبیعت عوام سے بالکل مختلف تھی۔ وہ کسی تقریب یا حادثہ پر فوری مسرت یا رنج کا خوگر نہ تھا۔ وہ بہت دور اندیش تھا اور ہمیشہ واقعات کو ذاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کا عادی تھا۔ اُس نے جیروم کی اس شادی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ فرانس کے لوگوں نے جیروم کو یہ لکھا بھی کہ نپولین کی ہستی بہت بڑی ہستی ہے اور خود وہ ایسی زیادہ اچھی حالت میں نہیں ہیں۔ اس لئے نپولین کی رائے اِن تمام لوگوں کی رائے سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ مگر جیروم جس عالم میں تھا وہ اس کا متقاضی ہی نہ تھا کہ اس قسم کی تحریروں کو قابلِ توجہ سمجھا جائے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ جیروم کو یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ نپولین اُس کی شادی کو اپنی ذاتی مصلحتوں کے ماتحت نہایت قابلِ اعتراض سمجھتا ہے یہ ہی خواہش رہی کہ وہ کسیطرح پیرس پہونچ جائے۔ ادہر ایلزبتھ بھی برعم خود یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ اگر نپولین نے اسے ایک نظر دیکھ لیا تو وہ یقیناً اسی کا ہو جائے گا —— مگر —— اس نے انقلابی انسانوں کی فطرت کا غلط اندازہ لگایا۔ اِن لوگوں کے عزایم اور ارادے عورت کے عزایم اور ارادوں سے کہیں زیادہ بلند اور مضبوط ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہی ہوا۔ یعنی ایلزبتھ کے ارادے ایکطرف رہے اور نپولین کے ارادے دوسری طرف! —— نپولین نے جیروم کی شادی کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اور انھیں سلطنت تو کیا زمین کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا بھی نہیں دیا حالانکہ بعد میں اُسنے اپنے بہت سے عزیزوں کو مختلف سلطنتوں کا بادشاہ بنایا۔ بغیر اس کا خیال کئے ہوئے کہ ان سلطنتوں میں بادشاہی کی تبدیلی کی ضرورت ہے بھی یا نہیں یہ اسکی فطرت سے بھی بعید تھا وہ اپنے مقاصد کی خاطر ہر نظام اور اصول کو نظرانداز کر کے خود اپنا اصول اور نظام قایم کرنے کا عادی تھا۔ چنانچہ جب اُسے اپنے کسی عزیز کے بادشاہ بنانے کا خیال آتا تھا تو وہ اسے چاہے جس سلطنت کا بادشاہ بنا دیتا تھا۔ اس سے اُسے کوئی مطلب نہ ہوتا تھا کہ وہاں کے بادشاہ کا اصولِ حکمرانی بہتر ہے یا بدتر۔

جیروم کی شادی سے انکار اور اسے کوئی مملکت نہ دینا ایک ایسا واقعہ تھا جو اپنے ساتھ بہت سے اندیشے لے کر ظہور میں آیا تھا۔ چنانچہ ایک مدت تک لوگوں کو یہ خیال رہا کہ امریکہ اور فرانس کے درمیان کوئی جنگ چھڑنے والی ہے۔ ایلزبتھ کے باپ نے اس معاملہ کو وزیر متعینہ پیرس کے ذریعے طے کرانا چاہا۔ مگر یہ معاملہ نپولین سے متعلق تھا کسی معمولی انسان سے متعلق نہ تھا جو آسانی سے طے ہو جاتا۔ نپولین اپنے خیال میں پہاڑ کی طرح مضبوط تھا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ نپولین کو اپنے تمام معاملات میں زندگی بھر کامیابی ہی ہوئی ہو۔ وہ بعض جگہ ناکام بھی رہا۔ مثلاً اس نے ہمیشہ چاہا کہ وہ خاندان شاہی سے متعلق ہو جائے مگر اسکی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی اور نہ جسطرح کہ وہ چاہتا تھا خاندانِ شاہی اُس کی قوت کی ترقی اور قیام میں ممد ہوا۔ مگر پھر بھی وہ جس ارادے پر مضبوطی کے ساتھ قایم ہو جاتا تھا اس کو ترک نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اُس نے جیروم اور ایلزبتھ کے متعلق جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اُس پر اسے کبھی افسوس نہیں ہوا۔ یہ ہی نہیں بلکہ وہ ایلزبتھ کا تمام عمر دشمن رہا۔ البتہ سینٹ ہلینا میں پہونچ کر اسے اپنے اس خیال پر تھوڑا سا افسوس ہوا تھا۔ وہاں جب اس سے ایلزبتھ کا تذکرہ کیا گیا تو اس نے کہا۔

"جن لوگوں پر میں نے ظلم کیا انھوں نے مجھے معاف کر دیا اور جن لوگوں پر میں نے بے شمار مہربانیاں کیں وہ مجھے بھول گئے۔"

گو جیروم اور ایلزبتھ دونوں کو صاف طور پر یہ معلوم ہو چکا تھا کہ نپولین ان کی شادی سے بہت ناخوش ہے۔ پھر بھی یہ دونوں مایوس نہیں تھے۔ اور اسی طرح امیدیں قایم کئے ہوئے تھے۔ مگر امیدوں کا یہ طلسم بھی زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رہا۔ نوٹری ڈیم گرجا میں جب نپولین اور جوزیفائن کی شاندار تاجپوشی ہوئی تو جیروم اور اُس کی بیوی کو قطعی نظرانداز کر دیا گیا جیروم اس خبر کو سن کر اول تو دعوت نامہ کا انتظار کرتا رہا۔ مگر جب نپولین کی طرف سے خاموشی نے طول کھینچا تو اسے سخت تشویش ہو گئی۔ ایلزبتھ جیروم سے زیادہ بے چین تھی! کیونکہ اس کی دلی تمنا تھی کہ کسی دن وہ فرانس کے شاہی دربار میں اپنے حسن و جمال کی نمایش کرے۔ بعد میں جیروم کو یہ معلوم ہوا کہ اس کا نام شہزادوں کی فہرست سے علیحدہ

کردیا گیا ہے۔ اور سرکاری طور پر فرانس کے اخبارات میں یہ اعلان بھی ہوچکا ہے کہ جیروم کی اس شادی کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ اس خبر سے جیروم کو اور بھی صدمہ ہوا۔ اور ایلزبتھ پر تو گویا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ آخری تدبیر یہ سوچی گئی کہ کسی طرح جیروم اور اس کی بیوی فرانس پہونچ جائیں۔ تو ممکن ہے کہ معاملہ کوئی بہتر صورت اختیار کرے۔ چنانچہ پیٹرسن نے اپنی بیٹی اور داماد کو جہاز "ایرن" میں سوار کرا دیا۔ یہ جہاز بہت سے جنگی جہازوں سے بچتا ہوا (کیونکہ نپولین نے بہت سے جہاز جیروم کی نگرانی اور تلاش کے لئے چھوڑ رکھے تھے) پرتگال کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ نپولین اس وقت اٹلی میں تھا۔ اس کو جب خبر ملی تو اس نے ایک قاصد کے ہاتھ جیروم کو یہ پیغام پہنچایا کہ وہ اس کی شادی کو ہرگز تسلیم نہیں کرے گا۔ اور یہ بھی کہ ایلزبتھ کو فرانس میں داخل ہونے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ اس خبر کو سن کر ایلزبتھ کا غرور نسوانی جوش میں آگیا۔ وہ اس قسم کے جملے سننے کی کب عادی تھی۔ اس کی فطرت میں خود ایک شہنشاہیت تھی۔ چنانچہ اس نے کہلا بھیجا کہ ....

.... اپنے مالک سے کہو کہ میڈم بوناپارٹی (خود) ترقی کی ....

... . متمنی ہے اور خاندانِ شاہی کے ایک ممبر ہونے کی ....

.... حیثیت سے اپنے حقوق طلب کرتی ہے ....

مگر نپولین اس قسم کی باتوں کو کب خاطر میں لانے والا تھا۔ وہ اس معاملہ میں ایک قطعی فیصلہ کرچکا تھا۔ بہت کچھ غور کرنے کے بعد جیروم کی سمجھ میں یہ تدبیر آئی کہ وہ ایلزبتھ کی تصویر ساتھ لے کر معہ اپنے پرائیویٹ سکریٹری کے نپولین کے پاس چلا جائے۔ اس سے ملے اور ایلزبتھ کی تصویر دکھائے اور ساتھ ہی اس سے استدعا کرے کہ وہ اپنے خیالات کو بدل دے۔ اس دوران میں ایلزبتھ کے متعلق یہ طے ہوا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ (جو اس کے ہمراہ تھا) جیروم کی واپسی تک کے لئے ہالینڈ چلی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا

جیروم جب نپولین سے ملا تو نپولین نے اسے بہت سخت و سست کہا۔ اسی سلسلے میں اس نے ایلزبتھ کے متعلق بھی یہ کہا کہ "اس سے کہہ دو کہ تم چیزوں کی فطرت کو تبدیل نہیں کرسکتی ہو۔ اسے امریکہ چلا جانا چاہیئے۔ میں اس کے واسطے ایک بڑی پنشن مقرر کرسکتا ہوں۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنے نام کو ہمارے ساتھ شامل نہ کرے یعنی اپنے آپ کو میڈم بوناپارٹی نہ کہے"

اس سے پہلے کہ جیروم کا پرائیویٹ سکریٹری یہ خبر لے کر ایلزبتھ کے پاس پہنچے ایلزبتھ کا جہاز ایرن امسٹرڈم سے انگلستان کو اس لئے روانہ ہوچکا تھا کہ ہالینڈ اب فرانس کے ممالکِ محروسہ میں شامل ہوچکا تھا۔ اور ایلزبتھ کے لئے وہاں کا داخلہ بھی بند تھا،، موضع کیمبرویل میں جو اس وقت لندن سے دو میل کے فاصلہ پر تھا اور اب اس کے اندر شامل ہوچکا ہے۔ ایلزبتھ کو یہ روح فرسا اور دلشکن خبر ملی۔ موضع کیمبرویل کے ذکر میں یہ بیان بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ یہیں ۱۸۰۵ء کے موسم گرما میں ایلزبتھ کے بطن سے وہ لڑکا پیدا ہوا جس کا نام "جیروم نپولین بوناپارٹ" رکھا گیا۔ موضع کیمبرویل وہ ہی مقام ہے جہاں اس بچہ کی پیدائش کے چند سال بعد "رابرٹ براؤننگ" پیدا ہوا تھا

نپولین کو جب یہ معلوم ہوا کہ ایلزبتھ انگلستان چلی گئی ہے تو اسے اور بھی ناگوار ہوا چونکہ انگریزوں سے اس کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ نپولین کی یہ فطرت تھی کہ وہ جب یہ محسوس کرلیتا تھا کہ اس کی رائے کو وقعت نہیں دی جارہی ہے۔ تو وہ اپنی مخالفت کرنے والے سے بدترین انتقام لینے میں بھی تامل نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے پوپ سے جیروم کی شادی کی تنسیخ چاہی۔ مگر پوپ نے اس کو بالکل خلافِ قاعدہ سمجھا اور اس پر راضی نہ ہوا۔ نپولین نے جب دیکھا کہ اسے وہاں کامیابی نہیں ہوئی تو اس نے اپنی تمام عدالتوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس شادی کو خلاف قاعدہ قرار دیکر اس کے غیر قانونی ہونے کا اعلان کردیں۔ چونکہ اس کی عدالتیں اسکی مخالفت کی جرأت نہیں رکھتی تھیں۔ اس لئے فرانس میں اس شادی کے غیر قانونی ہونے کا اعلان ہوگیا

مرد کی فطرت کس قدر متلون اور تغیر پسند واقع ہوئی ہے۔ وہ جسقدر جلد کسی کو یاد کر سکتا ہے۔ اسی قدر جلد بھول بھی سکتا ہے۔ جس قدر جلد کسی کے قدموں پر گر سکتا ہے اسی قدر جلد اپنے قدموں سے اسے مسل بھی سکتا ہے۔ اس تلونِ فطرت کے اظہار میں وہ کسی بات کا خیال نہیں کرتا۔ نہ اپنے وعدوں کا نہ اپنے کسی عہد کا۔ اور نہ اپنی کسی گذشتہ نیازمندی و وابستگی کا۔ جب وہ اپنی زندگی کا کوئی نیا پروگرام بناتا ہے تو گذشتہ زندگی کو بالکل فراموش کردیتا ہے۔ چنانچہ جیروم نے جب یہ دیکھا کہ نپولین اسکی شادی کا بدترین مخالف ہوگیا ہے تو اس نے اپنے وہ تمام عہد و پیمان اور رغبت کے نقوشِ گذشتہ دل سے محو کردئے جو اسے ایلزبتھ سے وابستہ کئے ہوئے تھے۔ اس کی طبیعت عیش پسند تھی۔ وہ کسی عورت کی محبت کی خاطر اپنے عیش کو برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ تعجب خیز یہ ہے کہ اس نے اپنے نوزائیدہ بچہ کو بھی اپنے دل سے بھلا دیا جو اس کی اولین محبت کی یادگار تھا

بات دراصل یہ تھی کہ جیروم عیش پسند ہونے کی وجہ سے بہت فضول خرچ بھی تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ ضد کرتا تو نہ اسے کوئی سلطنت مل سکتی تھی اور نہ اسے اتنا سرمایہ مل سکتا تھا جو وہ اپنی زندگی کو مسرت و نشاط میں گذار سکتا۔ چنانچہ ان تمام باتوں کا خیال کرتے ہوئے اس نے نپولین کے آگے سرِ تسلیم خم کردیا۔ اور اس سے استدعا کی کہ وہ اس کی آیندہ زندگی کے متعلق جو چاہے پروگرام بنا دے۔ نپولین اپنی اس فتح پر بہت مسرور ہوا۔ اور اس نے جیروم کی دوسری شادی "ورٹمبرگ" کی شہزادی "کیتھرائن" سے کردی۔ اور اسے ۱۸۰۷ء میں "ویسٹ فیلیا" کا بادشاہ بنا دیا

آہ ایلزبتھ۔ وہ حکمرانی کی خواہشمند خوبصورت ایلزبتھ۔ اس خبر کو سن کر اس کا کیا حال ہوا ہوگا

کہا جاتا ہے کہ اس کا وہ رنگ و روپ، اس کا وہ حسن و جمال، اس کی مخمور آنکھوں کی نشہ آفرینی، اور اس کے ہونٹوں کا وہ تبسم رنگیں سب رخصت ہوگیا یا تو وہ جوان بلکہ نوجوان معلوم ہوتی تھی یا اس پر یہ غم کا پہاڑ ٹوٹا کہ ضعیف ہوکر رہ گئی اس کا بچہ جیروم نپولین بوناپارٹی جب تین مہینہ کا ہوا تو وہ دل شکستہ بالٹیمور کو واپس چلی گئی۔

عورت جب محبت کرتی ہے تو اس کی محبت کا جوش سمندروں کے طوفان سے زیادہ ہوتا ہے۔ مگر جب واقعات کی بنا پر اس کی محبت نفرت سے بدل جاتی ہے تو پھر وہ اس طرح نگاہ پھیر لیتی ہے گویا اسے کبھی محبت تھی ہی نہیں!

ایلزبتھ کو جیروم سے جسقدر محبت تھی اب اسی قدر نفرت تھی۔ اس واقعہ کے بعد اس کا نظریۂ حیات ہی بدل گیا۔ وہ سیر و سیاحت میں مصروف ہوگئی۔ نپولین نے اس کی

پینشن مقرر کردی تھی۔ اور اُسے باپ کی جائداد سے بہت بڑا سرمایہ ملا تھا۔ اس لئے وہ بہت کافی دولتمند تھی۔ اُس نے آخری عمر بھر تمام یورپ کی سیر کی۔ اور جہاں تک ہوسکا وقت کو بہترین عشرتوں میں گذارنا چاہا۔ اس کا باپ پٹیرسن اس کے متعلق کہا کرتا تھا کہ......

"اس نے غیر ممالک میں عزت و شہرت حاصل کرنے کی کوشش میں سب کچھ کھو دیا"

اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ اگر اسے "جنونِ حکمرانی" نہ ہوتا تو وہ اس قدر مصیبتیں نہ اٹھاتی۔ اور اپنی زندگی نہایت راحت و آرام سے گذارتی۔ حقیقت میں اس کی زندگی آرزوؤں کی مسلسل شکست اور ناکامیوں کے پیہم حملوں کی ایک افسوسناک داستان ہے۔ آہ وہ جس نے ملکہ بننے کے لئے اپنی بے انتہا قوتیں استعمال کیں اور کس قدر بے پناہ مساعی کیں۔ کبھی ملکہ نہ بن سکی۔ یہ واقعہ خود اس کی زندگی کی داستان کو اندوہناک بنانے کے لئے کافی ہے

جیروم سے اس کی آخری ملاقات فلورنس کے ایک تصویر خانہ میں ہوی۔ جیروم اس وقت کیتراین (اپنی دوسری بیوی) کے ساتھ تھا۔ اس نے کیتراین سے چپکے سے اشارہ کیا کہ ایلزبتھ یہاں موجود ہے۔ انھیں یہاں سے ہٹ جانا چاہیئے۔ یہ وہی جیروم تھا۔ جو کبھی ایلزبتھ کی محبت میں غرق تھا۔ اب وہ اس کے سامنے بھی نہیں آنا چاہتا تھا اس طرح دو لمحوں کے لئے جیروم اور ایلزبتھ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے

ایلزبتھ بوناپارٹ کے تمام خاندان سے ملی۔ مگر خود نپولین سے کبھی نہ مل سکی۔ وہ اپنی خواہشات کے معاملہ میں بے حد منصف تھی۔ حالانکہ نپولین نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا جس نے ایلزبتھ کی زندگی کو بالکل تباہ و برباد کر دیا مگر پھر بھی اس نے نپولین کے متعلق ان الفاظ میں ذکر کیا

"حالانکہ شہنشاہ نے مجھے پھر بالٹیمور واپس ہونے پر مجبور کردیا۔ مگر پھر بھی یہ صدمہ میری اس کیفیت کو دل سے نہیں مٹا سکتا جو میں شہنشاہ کی ذکاوتِ طبع اور اس کی شان کے متعلق محسوس کرتی ہوں"

ایلزبتھ نے کافی طویل عمر پائی۔ آخر وقت تک وہ جاہ و ثروت اور شہرت و عظمت کی طالب رہی۔ مگر اسی طرح جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈھ رہا ہو

—— x ——

قدرت نے جیروم سے اسکی گذشتہ لغزشوں کا بدلہ لیا۔ نپولین کی قوت کو جب زوال ہونا شروع ہوا تو جیروم کی عیش پسندی اس کی رعایا کی بغاوت کا سبب بن گئی۔ اس کی فطری کمزوریاں اس کے راستے میں حائل ہوئیں اور اسے اپنی سلطنت چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ رعایا کا اس کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ ایک عیش پرست، فضول خرچ اور لاپروا بادشاہ ہے۔ اس لئے جب وہ سلطنت چھوڑ کر بھاگا تو اس کی رعایا کو اس کے جانے کا افسوس بھی نہیں ہوا

اس طرح تاریخ کا وہ باب ختم ہو گیا جو ایک عورت کی طلبِ حکمرانی کی ایک دلچسپ داستان تھا

متین الحق کیف مرادآبادی

آزادی

جبیں سے تاجِ ثقاہت گرادیا تو نے | جہاں پہ عدل کا سکّہ جما دیا تو نے
رگوں میں کشمکشِ شوق کا لہو بن کر | جو نیم جان تھے انہیں بھی جلا دیا تو نے
پیامِ روح کا پڑھ پڑھ کے سرمدی افسوں | حریمِ ناز کا پردہ اُٹھا دیا تو نے
عروسِ شوق کے رُخ سے نقاب سرکا کر | نظر کو جلوۂ فردا دکھا دیا تو نے
جو منکرانِ وفا تھے انہیں بھی دم بھر میں | شریکِ بزمِ محبت بنا دیا تو نے
زبان کو شعلہ نوائی کا راز سمجھا کر | قفس میں آگ لگانا سکھا دیا تو نے

نفس نفس میں وہ بیتاب بجلیاں بھر دیں
کہ مشتِ پر کو فلک پر اُڑا دیا تو نے

(خواجہ) مسعود علی ذوقی بی اے

مردِ مسلم سے خطاب

(علامہ ڈاکٹر اقبال مدظلہ کے چند اشعار پر تضمین)

منظر صدیقی اکبر آبادی ایڈیٹر "کنول" کے قلم سے

ملک کے مشہور ادیب اور ماہنامہ "کنول" کے فاضل مدیر حضرت منظر اکبر آبادی کے ادبی خزانے سے "ایشیا" کے لئے ایک لازوال موتی کا سوال کیا گیا تو آپ نے سر اقبال کے چند اشعار پر سوادی میں فوراً چند بند فرمائے جو "ایشیا" میں بغیر کسی شکریہ کے درج کئے جاتے ہیں تضمین کی کیا تعریف کی جائے ؎ "تو آپ ہے اپنی روشنائی" ساغر

ذوقِ گنہ ہو یا بے گناہی — ہو دورِ غربت یا کج کلاہی
آئیگی سب پر اک دن تباہی — "ہر شے مسافر ہر چیز راہی
کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

تیری خرد سے تدبیرِ لشکر — تیری بدولت توقیرِ لشکر
توقیرِ لشکر، تشہیرِ لشکر — "تو مردِ میداں، تو میرِ لشکر!
نوری حضوری تیرے سپاہی"

گنجِ مطالب، روحِ معانی — اے مردِ مسلم اے ربِ ثانی
سمجھا تو خود کو اک نقشِ فانی — "کچھ قدر تو نے اپنی نہ جانی
یہ بے سوادی، یہ کم نگاہی!!

اے جانِ رومی، اے روحِ جامی — اے مردِ حق بیں، فردِ گرامی
کب تک رہیگا پستی کا حامی — دنیائے دوں کی کب تک غلامی
یا راہبی کر یا پادشاہی

زاہد کو اکثر جانچا ہے میں نے — دعوی کو اسکے سمجھا ہے میں نے
مردِ خدا کو پرکھا ہے میں نے — پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سود، گفتار واہی

نیو آئرلینڈ کے بُت پرست صنّاع

آجکل دُنیا کے تمام قدیم اور ملکی (Native.) فنون میں سے بلا شبہ نیو آئرلینڈ[1] کے میلی گن نقاشوں کا آرٹ بے نظیر اور بے مثال ہے۔ اس دشوار گزار، پرسکون، خوبصورت اور زرخیز جزیرے میں ابھی تک پتھر کے زمانے کی شخصیت پرستی کے باقی ماندہ نقوش پائے جاتے ہیں۔ اس جزیرے کے کاریگر انتہائی خلوص کے ساتھ اُس فن کے علمبردار ہیں جو عجیب و غریب میلی گن (Maligan) رسم کی نمائندگی کرتا ہے۔ شاگردوں کا وجود اس فن کی بقا کا ذمہ دار ہے اور ایک جدید تحریک اس بات کی شاہد ہے کہ رفتہ رفتہ ختم ہو جانے کے بجائے حقیقت میں اس کو حیاتِ نو مل رہی ہے۔

میلی گن لکڑی کے وہ ... بُت ہیں جو کسی قبیلے کے معزز ارکان کی زندگیوں اور کارگزاریوں کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔ ان بتوں سے دُنیا پر یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس طریقہ سے مرحومین کے لواحقین نے مجلس کے بعض احسانات سے سبکدوشی حاصل کر لی ہے۔ یہ نقش گر اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ اصلی چیز کو آئیڈیل طور پر پیش کریں بلکہ اپنے مذاق کے مطابق بُت کے سر کو قومی معیارِ حُسن پر پورا اُترتا ہوا — لمبی اُبھری ہوئی ہموار ناک سوراخ دار لٹکے ہوئے کان، مضبوط دانتوں والا بڑا جباڑہ — بناتے ہیں جس سے مجموعی طور پر جدید دور کے لوگ دلچسپی لے سکیں۔

تمام جزیرے میں سب سے زیادہ مشہور ایک ضعیف صنّاع (Carver) میلاکے نامی ہے جو نی سوآ گاؤں سے متعلق ہے۔ میلاکے نے بہت ریاضت کی ہے اور انسانی گوشت بُت پرستوں کے دیوتاؤں کی بھینٹ کر چکا ہے۔ یہ بوڑھا کاریگر جو قدیم اسکول سے تعلق رکھتا ہے کم نگاہ ہونے کے باوجود اس قابل ہے کہ جنگلی لکڑی اور خاکی رنگوں کے ذریعہ یقینی طور پر عجیب و غریب اور لاجواب آرٹ کی تخلیق کرے جو بلحاظِ نقوش اور مجموعی حیثیت سے اس قدر بے عیب ہوتا ہے کہ اُس کو ہمارے بُت تراشوں کے سُفید سنگ کے میلی گنوں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے جب بوڑھے میلاکے کا بہترین نقش (Carving) پبلک کے سامنے آیا اور اُس کے پوتے ما آرس کو اُس کی اس اُمید کی نشانی کے طور پر نذر کیا گیا کہ جوان عہدِ تلمذ کے بعد میلی گن نقوش ساز بن کر اپنی دیرینہ روایت کے مطابق اس فن کو زندہ رکھے گا تو یہ ثابت ہو گیا تھا کہ قدیم اقوام میں بھی فن کا اظہار و ثبات نسلاً بعد نسلاً چلا آتا ہے۔

نی سوآ کے قریب ہی کے ایک مشن کے عیسائی فادر نے کامیابی کیساتھ ایک صنّاع سے بت پرست میلی گن کی جگہ عیسائی بُت ترشوائے ہیں اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک ایسا شخص جو کبھی اس جزیرہ سے باہر نہیں گیا کتنی خوش اسلوبی سے موجودہ روش میں مسیح کی صلیب پر چڑھائے جانے کے تصور کو نقوش کے ذریعہ نمایاں کر سکتا ہے۔

کاوینگ کے چھوٹے گرم بندرگاہ میں اس محکوم ملک کے نگرانِ ضلع نے ایک موٹر کار تلاش کرنے میں ہماری بہت مدد کی جس کے بغیر ان ماہرانِ فن کو اُن کے نگارخانوں (Studios.) میں ملنا ناممکن تھا۔ ہمارے مقصدِ سفر سے آگاہ ہونے کے بعد اُس کسان نے جس نے ازراہِ کرم ہمیں اپنا موٹر دیا تھا اپنے شوفر کنا کا کو آواز دی اور اپنی زبان میں یہ حکم دیا: "یہ نیک مرد اپنی بیوی کے ساتھ قدیم و جدید اسکول کے میلی گن صنّاعوں سے ملنا اور گفتگو کرنا چاہتا ہے اور اُن سب کا اسکیچ لینا بھی مقصود ہے۔ ان کو جنگل میں لے جاؤ اور جو یہ چاہتے ہیں وہ ان کو دکھاؤ۔ خیال رہے کہ تمہیں ان کو جہاز کے وقت پر واپس لانا ہے ورنہ مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ خیر اب جاؤ۔" یہ ہدایات پاکر ہمارا چمکدار بھورے اور گھنے بالوں والا ڈرائیور جس کے بدن پر ایک لنگوٹی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا اور جس کے بالوں میں پھول لگے ہوئے تھے ہم کو ایک ایسے ناہموار راستے سے لے گیا جو ناریل کے کھیت سے ہوتا ہوا ایک ایسے جنگل میں جاتا تھا جس کی لکڑی آج تک نہیں کاٹی گئی۔ اُس جنگل سے گزر کر ایک تنگ راستے سے ہم ایک ایسے گاؤں میں پہنچے جہاں بانس اور پتوں سے بنے ہوئے فقط دس گیارہ مکان تھے اور یہ کہتے ہوئے کہ "یہ ایک بہت پُرانا اُستاد ہے" اس نے ہمیں گیوان گاؤں کے "مالک" سے متعارف کرایا جو بڑے اطمینان سے پان چبا رہا تھا اور اپنا مطلوبہ کام ختم کر کے اپنے نگارخانے کے سایہ میں آرام کر رہا تھا۔

"مالک" کے بالوں میں سفید چونا لگا ہوا تھا جس کو یہاں کے معمّر لوگ نوجوان دکھائی دینے کے لئے استعمال کرتے ہیں اُس کے پاس ہمیں دکھانے کے واسطے کوئی تصویر نہیں تھی کیونکہ یہ نقش گر ہمیشہ طلب پر کام کرتے ہیں۔ ان کے جنازی بت صرف اُس روز دکھائے جاتے ہیں جب تابوت نکلتا ہے اور اُس کے بعد اُن کو توڑ یا جلا دیا جاتا ہے۔ اُس کے عوض میں بُت تراش کو سرِ عام تزک و احتشام کے ساتھ سیپی سکوں میں قیمت ادا کر دی جاتی ہے۔ یہ سکے معیارِ زر سے قطعی علیحدہ ہیں اور ایک سکہ امریکہ کے ایک ڈالر کے برابر ہوتا ہے۔ جب کام دیا جاتا ہے تو قیمت وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں آتا کیونکہ اُستادانِ فن کی قیمتیں روایتوں کے ماتحت ہیں اور اس چیز کو ہر کاریگر ترجیح دیتا ہے اگرچہ ہمارے معیار کے مطابق یہ قیمتیں بہت ہی کم ہوتی ہیں۔ تاہم میلی گن صنّاع امیر اور طاقتور بن جاتے ہیں کیونکہ جنگل کی زندگی نہایت سادہ ہے اور دستکاروں کی حسبِ منشا عزت کی جاتی ہے۔

انگریزی زبان کو نہ سمجھتے ہوئے اُس بوڑھے اُستاد نے ہمارے آنے کا مقصد بھانپ لیا اور بڑے اہتمام اور دلچسپی سے اسکیچ کے لئے ہمارے سامنے بیٹھ گیا۔ سگریٹ پینے کے بعد ہم نے اُس کے نگارخانے میں چاء نوش کی۔

تھوڑی دور اور چلنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں جنگل کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا ہمارا ننھا موٹر پھر ہمیں ایک اُسی قسم کے گاؤں میں لے گیا۔ شوفر کے آواز دینے پر ایک موٹا تازہ آدمی مسکراتا ہوا ہمارے نزدیک آیا جس کے آنکھوں کے گرد اگرد اُن انتخاص کی طرح گہری جُھرّیاں تھیں جو غیر فانی چیزوں کو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اطراف و بعد میں کم سے کم فرق بھی معلوم کر لیتے ہیں اور نقوش کی پاکیزگی کی تعریف کرتے ہیں۔ شوفر نے "جدید اسکول کا اُستاد" کہکر ہمیں متعارف کیا۔ یہ جوان کاریگر اپنے صاف ستھرے چھوٹے بانس کے نگارخانہ میں لے گیا اور چاء پیش کی۔ اُس نے اپنے نئے قسم کے اوزار — کھمار، لکڑی سے بندھا ہوا لوہے کا ایک تیز ٹکڑا، ایک پُرانا جیبی چاقو اور بیئر کی شکستہ بوتل کے چھوٹے چھوٹے تیز ٹکڑے — ہمیں دکھلائے۔ انگریزوں کے اوزار و نکے آنے سے پیشتر ان ٹکڑوں کی بجائے ایک تیز کنارے والا بانس

---

[1] بحر اوقیانوس

ایک باریک سیپ اور شیشے کے ٹکڑے استعمال کئے جاتے تھے۔

بانس کی چار دیواری کے اندر گھاس کی چھت کے نیچے اُس کا سیلون تھا جس میں دو بڑے میلی گن تیار تھے جو چند نمایاں بوڑھے قومی انسانوں کی موت کی توقع میں بنوائے گئے تھے۔ ایک نقش میں نہایت خوبصورتی سے بنائی ہوئی مچھلی تھی جس پر ایک پرند بازو تولے کھڑا تھا۔ ان دونوں سے مراد وہ دو خاندان تھے جن کے شجرۂ نسب سے یہ میلی گن متعلق تھا۔ میلی گن صناع اپنے خاص فن کے علاوہ اپنے لوگوں کی ملکی نصیحتوں کی نمائندگی بھی کرتے ہیں (Heraldic pattern) میں اغلاط ناقابلِ تلافی ہیں لیکن یہ بُت پرست مہذب اُستادان فن سے بھی زیادہ نالتدہ قوش سمجھتے ہیں نصیحت کے لئے خطوط بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ بہرکیف کسی نہ کسی طریقہ سے وہ اصلی چیز میں اضافہ کرکے اُس کی شان دو بالا کرتے ہیں اور یہی وہ آزادی ہے جو آرٹسٹ کا مطمع نظر ہے اور جو آرٹ کو ہمیشہ زندہ رکھتی ہے۔ دوسری تصویر ایک بہت اونچے ستون کی تھی جس پر حیرتناک پرندے، عجیب جانور اور انسان کا طنز یانہ مجسمہ ان سب چیزوں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا تھا اور یہ میلی گن موجودہ طریقے پر نہایت سادہ اور پُر معنی بنا ہوا تھا۔

یہ جوان میزبان اسکیچ کے لئے نہایت مسرت سے بیٹھ گیا اور بے حد دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے اپنی بیوی کو بھی بلا لیا کہ وہ بھی اُس نظارے کو دیکھ لے اور اُس سے "امریکہ" کا یوں ذکر کیا گویا اس نے بھی کہیں سے سُنا تھا کہ بہت دور کسی جگہ اس نام کا بھی کوئی جزیرہ ہے۔ اُس نے ہم پر یہ ظاہر کیا کہ اگر اُس کا اسکیچ کسی جگہ شائع ہو تو اس کو بہت پسند کیا جائیگا۔ کیونکہ وہ بھی پتھر کے زمانے کے نیوآئرلینڈ کا باشندہ ہوتے ہوئے بھی موجودہ ماہران فن کی طرح سے شہرت سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس نئے اسکول کے اُستاد کی عمر پچیس برس کے قریب تھی۔ اور وہ تمام آداب سے واقف تھا۔ اُس کے ساتھ سگریٹ پینے کے بعد ہم جلدی سے اپنے جہاز پر واپس لوٹے کیونکہ تمام نیوآئرلینڈ میں صرف ایک ہی ہوٹل ہے وہ بھی "چینیوں کے زیر اہتمام"۔

ان بُت پرست صناعوں کے نگارخانوں میں چائے نوشی اس لحاظ سے بالکل پیرس نیویارک اور جکارتہ کی طرح تھی کہ چائے تو پی نہیں جاتی تھی اور مہمان سگریٹ پیش کرتے تھے اور اپنی گفتگو سے میزبان کو دق کرتے تھے

ہیرالال سونی ضیا ایم۔ اے

بم اور دروازہ کا لطیفہ

ایک مملکت میں بادشاہ کی سالگرہ منائی گئی۔ مملکت کے ایک تاریخی شہر میں پولیس نے نمائشی لکڑی کا ایک دروازہ بنانے والے آتشبازوں کو بلایا اور ایک شاندار دروازہ بنوایا جس پر ساٹھ روپئے لاگت آئی۔ دروازہ بنانے والوں نے ایسا دروازہ بنایا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے اور جشن سالگرہ کے اہتمام کرنے والوں سے بادشاہ اور اس کے حکام بہت خوش ہوئے اور بات آئی گئی ہوئی۔

کئی ہفتے کے بعد مقامی عدالت میں ایک بم پھٹا لوگ گرفتار ہوئے۔ تحقیقات ہوئی۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ یہ واقعہ بھی وقت کے سمندر میں ایک حباب موج کی طرح سے اٹھا اور فنا ہوگیا۔

کافی وقت گزر جانے کے بعد دروازہ بنانے والے آتشباز افسر پولیس کے پاس گئے ان کے دل میں خیال تھا کہ ساٹھ روپئے لاگت اور چالیس روپئے انعام مل کر سو روپئے تو ضرور ملیں گے۔ مگر جیسے ہی انہوں نے افسر پولیس سے "انعام" کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے خاص ڈانٹ کے ساتھ کہا۔

پہلے یہ بتاؤ کہ عدالت میں جو بم پھٹا وہ تم میں سے کس نے بنایا ہے۔ یہ سنتے ہی کاریگروں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور سب پریشان و سراسیمہ ہوکر ہاتھ پاؤں جوڑنے لگے۔

افسر پولیس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ اس معاملہ کی تحقیقات کی جائے۔ اور کاریگروں سے کہا کہ کل آکر بتاؤ کہ بم کس نے بنایا تھا۔ ورنہ تم کو حوالات میں بند کر دیا جائیگا

کاریگر اپنے گھر کو واپس ہو رہے تھے کہ راستے میں شہر کا ایک "جید مولوی" مل گیا یہ مولوی شہر کے ہر طبقے میں اپنا رسوخ رکھتا تھا۔ اس نے ان کاریگروں کو پریشان دیکھا تو پوچھا کہ ارے تم کہاں سے آرہے ہو خیر تو ہے؟

کاریگر بولے :۔

اجی مولی صاحب (مولوی صاحب) نماز بخشوانے گئے تھے روزے گلے پڑ گئے۔

کیسے روزے؟ مولوی نے پوچھا۔

ایک کاریگر بولا :۔ اجی مولی صاحب (مولوی صاحب) دیکھو میرے اتنے اتنے بچے ہیں۔ اجی میں تو مر جاؤنگا۔

دوسرا بولا :۔ اجی میں نے تو اپنی جوان لونڈیا کی شادی بھی نہیں کی اور تم جانو میں ہی اپنے گھر میں ایک بڑا بوڑھا ہوں۔

مولوی نے حیرت زدہ ہوکر کہا۔ ارے بیوقوفو ہوا کیا بتاؤ تو! ۔ مولوی کے اصرار پر کاریگروں نے واقعہ سنا دیا۔ تمام واقعہ سنتے ہی مولوی بے ساختہ ہنس پڑا اور کاریگروں میں سے ایک بوڑھے کاریگر کے کان میں کچھ کہہ کر دست بر ریش روانہ ہوگیا۔

بوڑھا کاریگر سب کاریگروں کے ساتھ پولیس کے افسر اعلےٰ کے پاس پہنچا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ افسر نے ڈانٹ کر دریافت کیا۔ پتہ چلا کہ بم کس نے بنایا تھا؟

کاریگر بولا :۔ نہیں حضور۔

پھر کیوں آئے ہو افسر نے کہا۔

کاریگروں نے جواب دیا بہ مجبور (حضور) یہ عرض کرنے آئے ہیں کہ نہ ہم نے بم بنایا اور نہ دروازہ

تاریخ علم ہیئت و تنجیم پر ایک نظر

دوسری قسط

از فلکی اجمیری

کسوف وخسوف، شہاب ثاقب وذات الاذناب کے وقتاً فوقتاً ظہور میں آنے سے انسانی ذہن اس طرف مائل ہوا کہ قانون قدرت کا پتہ چلایا جائے کہ ان قدرتی مناظر کے رونما ہونیکے اسباب کیا ہیں۔

سیارگان کی باقاعدہ رفتار منازل قمر و بروج کے بالترتیب طلوع و غروب سے کاشتکاروں، ملاحوں، مسافروں، تجار و سیاست داں طبقے نے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا جب یونان کے فنون و تمدن کا آغاز تھا اس وقت اہل مصر و کلدانی علم ہیئت میں بہت ترقی کر چکے تھے، ان کی پیشینگوئیاں قابل تعریف تھیں، اہل ہند زمانہ قدیم سے علم ہیئت میں ترقی کرتے چلے آئے ہیں۔ فونیشین[1] نے بھی قابل قدر ترقی کر لی تھی، اہل چین زمانہ قدیم سے علم فلکیات کے متعلق نہایت جانفشانی و کاوش فکر سے کام لیتے رہے ہیں۔ چونکہ وہاں حکومت کا ہاتھ اس فن کی قدردانی و ہمت افزائی کے لئے بڑھ رہا تھا۔ فوہی (Fohi) جس کا عہد حکومت ۲۸۵۷ قبل مسیح تھا دلچسپی لیتا اور ترقی دیتا رہا۔ فونگ ٹی (Fong Te) نے چنانچہ ایک رصد خانہ ۲۶۰۸ سال قبل مسیح چین میں قائم کیا تاکہ جنتریاں صحیح طور پر تیار کی جائیں۔ اس نے تین شعبے ماہرین علم ہیئت کے قائم کئے پہلے شعبہ کا یہ کام تھا کہ وہ صرف قمر کی رفتار کے متعلق اپنی معلومات بہم پہنچائے، دوسرے شعبہ کا یہ کام تھا کہ وہ شمس کے راستہ کا بغور مشاہدہ کرے۔ تیسرا شعبہ منازل قمر و بروج کی رفتار کی تحقیق کے لئے تھا۔ یو (Yao) فرمانروائے چین جس کا عہد حکومت ۲۳۱۷ سال قبل مسیح تھا علم ہیئت میں اس علم دوست بادشاہ نے ایک نئی روح پھونک دی اور ماہرین ہیئت کو حکم دیا کہ وہ نہایت غور سے سیارگان کا مشاہدہ کرکے بہت صحیح حساب معلوم کریں۔ اس وقت ۲۸ منازل قمر کی تقسیم کا مسئلہ حل کیا گیا جس میں قمر اپنا ماہانہ دورہ پورا کیا کرتا ہے اور اہل چین کا سال ۳۶۵ ¼ دن کا قائم ہوا۔ انہوں نے دائرہ سماوی کو برابر درجوں میں تقسیم کیا اہل چین کا علم ہیئت ۲۵۰۰ سال سے زائد عرصہ تک ترقی کرتا رہا اور اس کے بعد زوال و انحطاط شروع ہو گیا۔ چونکہ حکومت نے ماہرین کی قدردانی سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اہل یونان نے بعد میں ترقی کی، فیثاغورث (Pythagoras) نے خود اس علم کے اکتساب کی غرض سے مصر کا سفر اختیار کیا۔ اور وہاں پہنچکر دائرۂ منطقۃ البروج، صبح و شام کے ستیارگان کا علم حاصل کیا۔

بطلیموس (Ptolemy) اور ارسطو (Aristotle) گو ہیئت داں نہ تھے لیکن انہوں نے بہت سے توہمات باطلہ کا جو علم ہیئت میں پیدا ہو گئے تھے ازالہ کر دیا۔ فیثاغورث کے شاگرد فیلولس (Philolaus) کا خیال تھا کہ آفتاب شیشہ کا ایک قرص ہے جس سے تمام عالم منور ہوتا ہے، ارشمیدس (Archimedes) کے نزدیک آسمان کا قطر زمین سے نو گنہ زائد تھا۔ اس خیال کا رواج چوتھی صدی قبل مسیح تھا۔ اپالونس (Apollonius) نے علم ہیئت کو اقلیدس کے اصول سے حل کیا جو غالباً ہند و عرب کے ماہرین فن سے حاصل کئے گئے ہونگے۔ موجودہ علم ہیئت اہل یورپ عرب و ہندوستان کا بہت کچھ رہین منت ہے۔

البوطانی فرمانروائے سیریا (Syria) نے جس کا عہد حکومت نویں صدی بعد مسیح ہے نہایت غور سے بطلیموسی نظریات کا مطالعہ کیا اور ستاروں کے متعلق جو بطلیموس سے غلطیاں ہو گئی تھیں اُن کا پتہ چلایا۔

زمانہ جدید میں کوپرنیکس (Copernicus) تیخو براہی، کیپلر (Kepler) اور گلیلو (Galileo) نے علم ہیئت میں جو مردہ ہو چلا تھا ترقی دیکر از سر نو زندگی کی روح پھونک دی اور بہت سے مفید اضافے کئے، جدید ہیئت نے سترویں صدی میں اچھی ترقی کر لی تھی۔ قانون قوت کشش کا انکشاف نیوٹن (Newton) نے کر لیا تھا جس سے ہیئت و طبعیات کی بنیاد پڑی۔ اور جدید آلات رصد کی ایجاد نے اس کی ترقی میں چار چاند لگا دیئے۔ ریاضیات فلکیات میں اہل ہند کے کارنامے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سیارگان کی رفتار۔ ان کا اجتماع، رجعت۔ احتراق مطالع و مغارب، اوقات کا تعین ریاضی کے اصول پر قائم کئے۔ شوریہ سدھانت[2] ان کی دماغی قابلیت و ذہانت کی دلیل ہے، ہیئت کے متعلق جو جدولیں جنوبی ہندوستان کے ہیئت دانوں نے تیار کی تھیں وہ پیرس کے میوزیم میں موجود ہیں جس کے اہل فرانس بے حد مداح ہیں۔ اور اب تک ان کا لائحہ عمل ہیں۔

قدیم یونانی تخیل اور کلدانی و بابلی ہکائیہ۔ فلکی کا منشا یہ تھا کہ افلاک سخت اور بلوریں قبے ہیں جن میں نہ کوئی وزن ہے اور نہ ان میں کوئی کمی و زیادتی کا امکان ہے، قدیم منجمین اجرام فلکی کو جو مدار ستارے یا شہاب ثاقب کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں نہ ثوابت میں شمار کرتے تھے اور نہ سیاروں میں۔

ارسطو اور بطلیموس کا نظریہ یہ ہے کہ بعض دخانی ابخرات زمین سے اُٹھکر جب بالائے فضا میں پہنچتے ہیں اور کرۂ نار سے ملتے ہیں تو مشتعل ہو جاتے ہیں جن کو شہاب کہتے ہیں، جب یہ شے کثیف ہو جاتی ہے تو مختلف شکلیں پیدا کر دیتی ہے اور کبھی جھاڑو کی شکل میں دکھائی دیتی ہے، یہ نظریہ آجکل بالکل لغو خیال کیا جاتا ہے۔ کوپرنیکس (Copernicus) پہلا شخص ہے جس نے نظام شمسی کا پتہ چلایا ہیئت جدیدہ اس قسم کے افلاک یا طبقات کی قائل نہیں نئے زمانہ کا علم ہیئت بتاتا ہے کہ ثوابت و سیارگان کے مدار یعنی فرضی تخیلی راستے ہیں جن سے ہو کر اجرام فلکی گزرتے ہیں۔ ہر جرم سماوی خلائے مطلق میں حرکت کر رہا ہے، یہ ایک مفروضہ خط ہے جس کو مدار کہا جاتا ہے، حکیم دیمو قریطس (Democritus) کی رائے یہ ہے کہ آسمان کوئی مادی چیز نہیں جیسا کہ ارسطو و بطلیموس کا خیال ہے، اور جو ثوابت و سیارے ہم کو نظر آتے ہیں وہ فضائے بسیط میں متحرک ہیں، بطلیموسی نظام کا نظریہ یہ تھا کہ سات طبقات آسمان کے ہیں، کوپرنیکس کا خیال یہ ہے آفتاب نظام شمسی کے تمام ثوابت و سیارگان کا مرکز ہے، تمام اجرام سماوی اس مرکز کے چاروں طرف گردش کرتے ہیں اور آفتاب اپنی جگہ پر قائم ہے، بعد کے محققین نے یہ معلوم کیا کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ آفتاب اپنی جگہ پر قائم ہے بلکہ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہے۔

جب رصد گاہی آلات سے دیکھا جاتا ہے تو وقتاً فوقتاً نئے ثوابت نظر آتے رہتے ہیں اور بہت سے

[1] فونیشین، یہ عرب تھے۔ [2] شوریہ سدھانت، ریاضیات فلکیات پر ایک مستند و مشہور کتاب ہے۔

اجرام غائب بھی ہوتے رہتے ہیں جو پہلے ہماری نظروں کے سامنے تھے۔ ڈاکٹر کیمپبل (Campbell) مشہور امریکن فلکی ہیں جن کا یہ نظریہ ہے کہ زمین آفتاب کے گرد گردش کر رہی ہے اور آفتاب خود بھی آہستہ آہستہ گردش کر رہا ہے۔ آفتاب کی دو حرکتیں ہیں ایک محوری اور دوسری انتقالی۔ علم ہیئت میں رفتہ رفتہ جو ترقیاں زمانہ کے لحاظ سے ہوتی رہی ہیں وہ انسانی تخیلات کے ارتقاء کی بہترین مثال ہے۔ زمانۂ قدیم میں معمولی آلات اور صرف نگاہوں سے کام لیا جاتا تھا۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا جدید آلات اور دوربینیں ایجاد ہوتی گئیں جن سے نئے اجرام سماوی کا پتہ چلتا گیا۔ جو پہلے معلوم ہونے سے رہ گئے تھے۔

یہ بات معلوم کرکے حیرت ہوتی ہے کہ قدماء کے حسابات فلکی جو صرف مشاہدات پر مبنی تھے کس قدر ٹھیک اور درست تھے کہ آج کل جدید آلات و دوربینوں کے ذریعہ سے جو حسابات کئے جاتے ہیں ان میں اور قدماء کے پچھلے حسابات میں بہت ہی کم فرق پڑتا ہے۔ گرینوچ (Greenwich) کی شاہی رصدگاہ ۱۶۷۵ء میں چارلس ثانی کے زمانہ میں قائم کی گئی اور فلیمسٹیڈ (Flamstead) مشہور فلکی نے علم ہیئت کو بہت ترقی دی۔ جدید رصدی آلات و دوربینوں کی ایجاد سے جو ترقیاں ہوئیں وہ محتاج بیان نہیں ہر شخص جانتا ہے، لیکن یہ بات زیادہ قابل قدر ہو جاتی ہے کہ حکمائے متقدمین نے محض دماغی قابلیت و عینی مشاہدات و نظریات سے کام لیا اور اُن کو آلات و دوربینوں کی سہولتیں بہم نہ پہنچنے پر وہ کام کیا جو آجکل آلات کی مدد سے کیا جاتا ہے، اور لطف یہ ہے کہ حسابات میں مقابلہ کرنے پر خفیف سا فرق نکلتا ہے۔ ٹیخو براہی پہلا فلکی ہے جو یہ کہتا ہے کہ ذو مدار ستارے بھی ایک قسم کے سیارے ہیں اس لئے وہ بھی اپنے مدارات میں گردش کیا کرتے ہیں۔ کیپلر ٹیخو براہی کا شاگرد ہے جو یہ کہتا ہے کہ ذو مدار سیارے اس وقت نظر آتے ہیں جبکہ وہ مدار ارض سے قریب ہونے لگتے ہیں یا اپنی قد و قامت کے اعتبار سے ایسے وقت میں بھی کہ وہ بہت بعید تر ہوتے ہیں دکھائی دیتے ہیں۔ اہل سائنس کا نظریہ یہ ہے کہ ذو مدار ستارے جب سیاروں کے مدارات کے پاس سے گزرتے ہیں تو سیارہ کی حرکت میں ایک گونہ انحراف پیدا کر دیتے ہیں، لیکن جب نسبتاً چھوٹی قامت و جسم کے واقع ہوتے ہیں تو خود سیاروں سے متاثر ہوتے ہیں بعض وقت اس درجہ تک کہ وہ بالکل ان کی گرفت میں آ جاتے ہیں اور ایک قمر یا اقمار کی حیثیت سے اُس کے ساتھ وابستہ تعلق رہتے ہیں۔ علم الہیئت

شکل ۱۱

نظامِ شمسی

شکل ۲

مدار ستارہ

عطارد

زہرہ

دائرہ منطقۃ البروج

زمین

مدار ستارہ
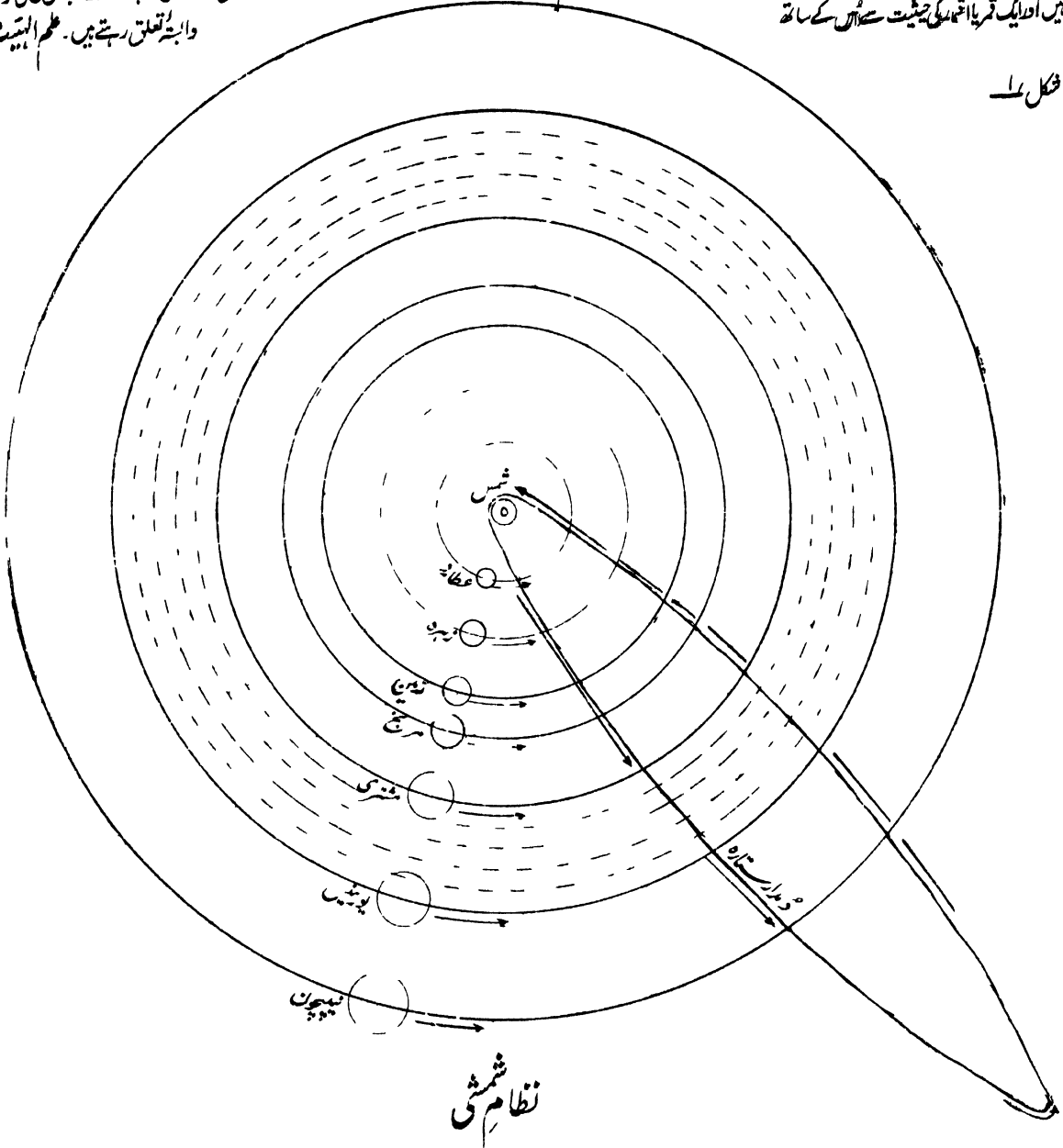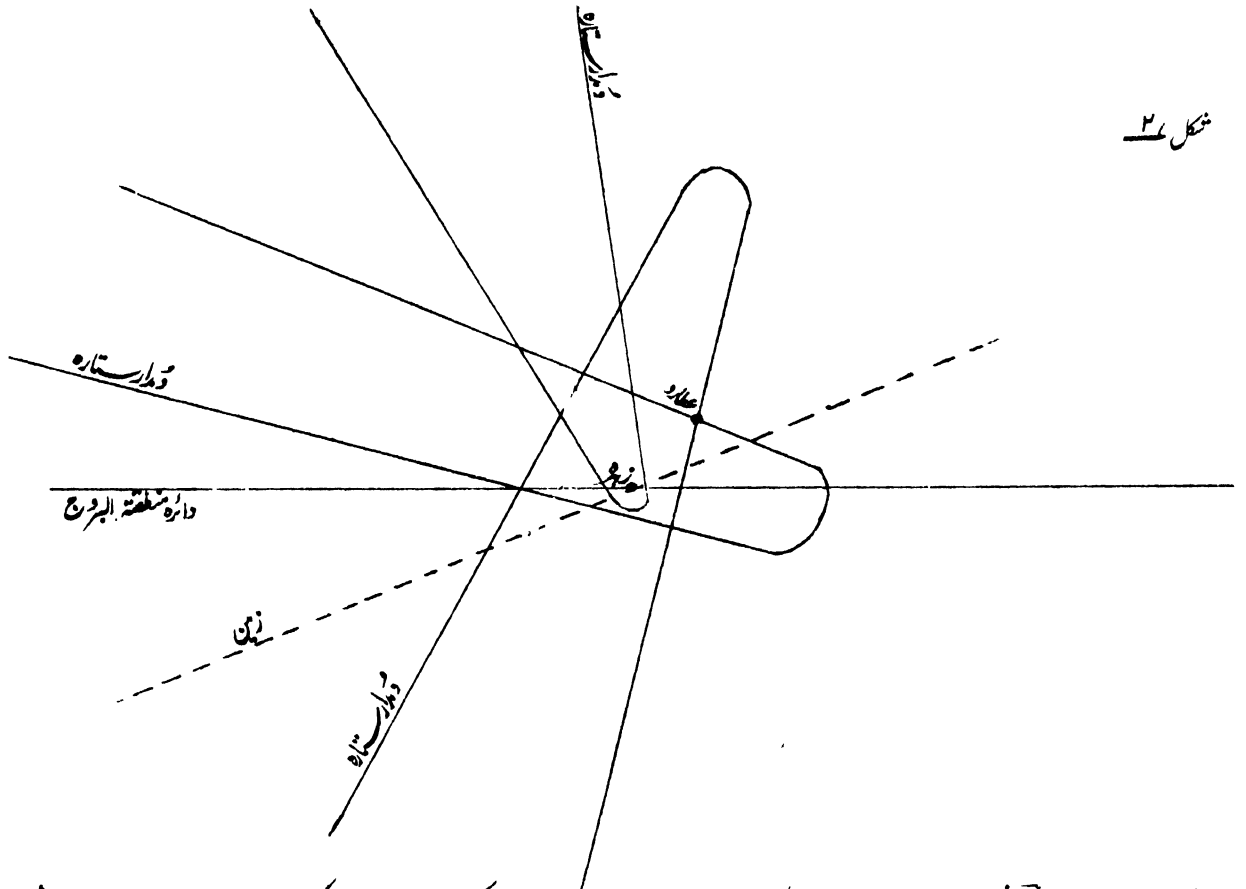
چونکہ سیارگان کے راستے اہلیلجی شکل کے واقع ہوئے ہیں اس لئے ان کا تفاوت آفتاب سے ہمیشہ بدلتا رہتا ہے کبھی آفتاب کے قریب اور کبھی آفتاب سے دور ہو جاتے ہیں۔ زمین سے شمس کا فاصلہ قریب ۹۳،۰۰۰،۰۰۰ میل ہے اور اس کا قطر ۸۶۶،۰۰۰ میل ہے اگر ایک ریل گاڑی ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے شمس کے گرد چلنا شروع کرے تو ۱۰ سال زائد عرصہ میں اس نکتہ پر پہنچے گی جہاں سے روانہ ہوئی تھی، زمین سے آفتاب کی مسافت کا قیاس یوں کیا جا سکتا ہے کہ ریل گاڑی یکم جنوری ۱۸۹۴ء کو ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلے تو شمس تک وسط جون ۲۲۴۷ء میں پہنچ سکے گی جو تخمیناً ۳۵۴ سال کا عرصہ ہوتا ہے،

آفتاب مثل زمین کے اپنے مدار پر حرکت کرتا ہے اور اس کا مدار ۷ درجہ خطِ سماوی سے جو آسمان کو نصف حصہ میں تقسیم کرتا ہے جھکا ہوا ہے اور اس کی گردش کا پتہ اس کے سیاہ دھبوں سے چلتا ہے یہ دھبے قرص آفتاب پر اپنی علیحدہ گردش رکھتے ہیں اور ان کی گردش خطِ استوا پر تیز ہو جاتی ہے اور اس کو ۲۵ دن میں طے کر جاتے ہیں۔ یہ دھبے جب خطِ استوا اور قطبین کے درمیان واقع ہوتے ہیں تو ۲۷ دن میں پورے قرص کو طے کرتے ہیں، اگر آفتاب کا مدار سیدھا ہوتا تو یہ دھبے ہمیشہ ایک ہی فاصلہ پر نظر آتے رہتے لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے۔

نقشہ ۳
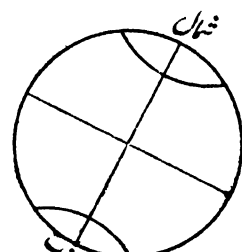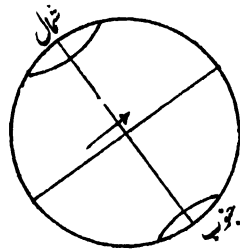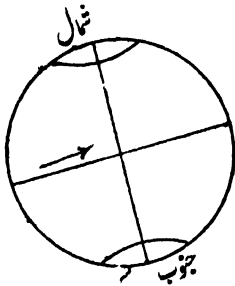
یہ دھبے تمام آفتاب پر نہیں پائے جاتے ہیں بلکہ آفتاب کے خطِ استوا سے کچھ اوپر اور کچھ دھبے نیچے کے جانب رہتے ہیں یہ دھبے آفتاب میں گڑھے ہیں اور ان کا مختلف رنگ مختلف لکڑیوں کا پتہ دیتا ہے زمین کی دو گردشیں ہیں۔ ایک اپنے مدار پر حرکت کرتی ہے جس سے دن۔ رات ظہور میں آتے ہیں۔ دوسری گردش آفتاب کے گرد ہے جس سے موسم میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔

زمین کا مدار فرضی خطِ ساوی سے ۲۳½ درجہ آفتاب کی طرف مائل ہے اور چوبیس گھنٹے میں اپنے مدار پر حرکت کر جاتی ہے جو ایک دن کہلاتا ہے۔ تمام روئے زمین پر دن۔ رات قریب ۲۲ مارچ و ۲۲ ستمبر کو برابر ہو جاتے ہیں۔ جب آفتاب برج حمل کے صفر درجہ پر ہوتا ہے جو قریب ۲۲ مارچ کے ہے تو گرمی کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے اور جب میزان کے صفر درجہ پر آفتاب پہنچتا ہے تو سردی کا موسم شروع ہوتا ہے

فلکی اجمیری

(باقی آیندہ)

(مرزا اسد اللہ خان غالبؔ دہلوی کے اختراعِ فائقہ قطعہ پر ایک تخمیس)

رُوح و دل و دماغ کو رقصاں کئے ہوئے — بدمستیٔ خیال کو عریاں کئے ہوئے
خلوت میں اہتمامِ گلستاں کئے ہوئے — مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

واپس بلا رہا ہوں اُسی عہدِ سخت کو — بیدار کر رہا ہوں دلِ خفتہ بخت کو
دوں گا پیامِ جذب خدنگ کرخت کو — کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر زورِ دستِ شوق سی جھکنے لگا ہے دم — پھر آتشِ قدیم سے پھکنے لگا ہے دم
پھر نوکِ خارِ خار پہ جھکنے لگا ہے دم — پھر وضعِ احتیاط سی رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر اک جہانِ نور کا معمار ہے نفس — تاریکیٔ فراق سے بیزار ہے نفس
پھر محوِ جلوہ باریٔ انوار ہے نفس — پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

شورشِ فروزِ خلوتِ دل کو چلا ہے عشق — افزائشِ قیامتِ دل کو چلا ہے عشق
پھر کوششِ ہلاکتِ دل کو چلا ہے عشق — پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

ہوتی ہے یوں مصوریٔ جلبہ بخونِ دل — نقاشیٔ محبتِ جاناں بہ خونِ دل
پھر لکھ رہا ہوں طرحِ گلستاں بخونِ دل — پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے

پھر مسلکِ یا پہ مجھے طیش آئے ہے — پھر عشق ننگ و نام کے ٹکڑے اڑائے ہے
جوشِ گناہ میرے قدم پھر اُٹھائے ہے — دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر فطرتِ طلب کو ہے آزار کی طلب — پھر بیخودی کو ہے رسن و دار کی طلب
پھر عشق کو ہے حسنِ طرحدار کی طلب — پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

اُف غنچۂ دوشیزہ و رنگیں کا وہ جلال — وہ میری چشمِ شوق وہ نظارۂ جمال
گلچینیٔ بہار کا اللہ رے یہ مآل — دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں میں درِ گلزار کھولنا — پھر چاہتا ہوں دُرجِ گہربار کھولنا
پھر چاہتا ہوں دفترِ اسرار کھولنا — پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیٔ عنواں کئے ہوئے

گھیرے ہوئے ہے شوق کو ہر گام پر ہوس — چاہے ہے پھر کسی کو سرِ شام پر ہوس
ڈھونڈے ہے پھر کسی کو سرِ عام پر ہوس — مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

یہ موسمِ بہار یہ طوفانِ رنگ و بو — دل کو ہے اپنے عیشِ گزشتہ کی جستجو
رہ جائے خوش خیالیٔ حسرت کی آبرو — چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

رنگینیٔ حریمِ حسن کو دیکھے ہے پھر نگاہ — اک جلوۂ لطیف کو لوٹے ہے پھر نگاہ
ہر روزنِ خیال سے جھانکے ہے پھر نگاہ — اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

ہر وقت سر جھکانے ادب سے کھڑے رہیں — مثلِ نگاہِ شرم زمیں میں گڑے رہیں
دھتکارنے پہ بھی اُسی در پہ اڑے رہیں — پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

پھر رُوح چاہتی ہے وہ بہجت کہ رات دن — جی چاہتا ہے پھر وہی عشرت کہ رات دن
دل مانگتا ہے پھر وہی دولت کہ رات دن — جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے!

ساغر نظامی

پھریرا باد

آسکر وائلڈ کی والدہ جین فرانسسکا ایلگی کے بے پناہ قلم کی وہ آتشیں تصنیف

جو آئرلینڈ کے انقلابی ادبیات میں آج تک بے نظیر تصور کیجاتی ہے

(مترجمہ میاں حسن لطیفی بی اے)

ہماری آئرش قوم انتظارِ مصالحت سے تھک کر ایک قاطع فیصلہ کر چکی ہے ہمیں انگلستان کی ایک سود مند خدمت کا ضرور اعتراف ہے، اس کے گزشتہ برتاؤ نے ہم سے صبر کے ساتھ لطمات قبول کر لینے کا آخری عذر لنگ چھین کر تمام دُنیا کے سامنے ہمیں حق بجانب ظاہر ہو جانے کا موقع مہیّا کر دیا ہے، اس نے حد سے تجاوز کرتے ہوئے ایک افتادہ اور ذلیل قوم کی بزدل اور انکسارانہ التجا کو سرفرازی کے رنگ میں رنگ کر حریّت کے پُرغرور مطالبہ میں تبدیل کر دیا ہے، یہ مطالبہ ایک ایسی قوم کی طرف سے ہے، جو عزم بالجزم کر چکی ہے، ہمہ تن آمادہ و مستعد ہے اور بیم دہراس کے نام سے یکسر ناآشنا۔

اب بیشک آئرلینڈ کے رہنے والے بزدل ہونگے، اگر وہ انتقام مبارزت اور کامرانی کا لمحہ ضائع ہو جانے دیں، یہ لمحہ انہیں غلام پاتا ہے لیکن بدنام چھوڑ جائے گا،

اے کاش! خورشید عالمتاب کی روشنی میں صدہزار آتشیں بندوقیں چمکتی ہوئی نظر آئیں اور غنیم کے راستے میں حائل ہونے والے یادگار رہتے ہماری اُن پاکیزہ گزرگاہوں میں پھیلے ہوئے ہوں جن کو انگلستان نے غیر آباد کر ڈالا ہے اور اس قلعہ کے گرد حلقہ زن ہوں جس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے جس کو انگلستان نے رسوا کر دیا ہے جہاں ظالم اجنبیوں نے ہماری قوم اور ہمارے وطن کے خلاف سات سو برس تک بدخواہی اور ناانصافی کی سازش کی ہے۔

بہادری کی صبح خطرے کے ساتھ طلوع ہوتی ہے اور جوانمردی کی صبح ارادے کے ساتھ انسانی

زندگی کے ان نادر و یادگار لمحوں میں جبکہ تشکک، تذبذب اور کمزوری کے بادل ہوا ہو چکے ہیں کیا ہم زیادہ آزادی کے سانس نہیں لے رہے؟ کیا ہر ایک دل کے دھڑکنے کی آواز تیز نہیں ہو گئی؟ ہماری روح تعصب، اندھی عقیدت، خود ستائی اور لاف زنی کی بھاری زنجیروں کو اُتار کر پھینکتے ہوئے پُرشکوہ انداز سے ہر چھوٹی سے چھوٹی رکاوٹ پر، ہر پست اور خود غرضانہ تامّل پر کامیابی حاصل کرتی ہوئی بلند ہو رہی ہے اور ایک فاتح کے حریفانہ اسلوب سے ایک شہید مرشتے کے طور سے ایک دیوتا کے اتمام قدرت کے انداز سے جوانمردی اور حُب الوطنی کی بلند ترا اور پاکیزہ تر زندگی کی سطح تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بڑھ رہی ہے۔

ہم ساری آئرش قوم سے اپیل کرتے ہیں، کیا ہم میں کوئی ایسا بدبخت ہے جو غلامی اور اسیری کے مکروہ راستہ پر ایک قدم بھی اور چلنے کی خواہش رکھتا ہو؟ کیا کوئی ایسا کمین ہے جو یہ خیال کرے کہ آئرلینڈ کی کافی ذلت نہیں ہو چکی یا آئرلینڈ اپنے حقوق اور اپنی آبرو کو اس قدر مجروح نہیں کرا چکا جو ستمگر حاکم کے خلاف درشت اور تند انداز سے نبرد آزما ہونیکو حق بجانب قرار دینے کے لئے کافی ہو؟

نہیں ایک ایسا ذلیل آدمی دُنیا کے اس ٹکڑے پر زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر ایسا ہو تو اس بزدل کی تنہا آواز اُس فلک شگاف اور جنون انگیز نعرے میں گھٹ کر جذب ہو کر فنا ہو جائے گی۔ جس کی صدائے بازگشت ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ تک گونج رہی ہے، جس کا قہقری شور ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک فضا میں تلاطم پیدا کر رہا ہے، جو ایک اُٹھتی ہوئی قوم کی پکار بن کر یوں بلند ہو رہا ہے "ہم آزاد ہو کر رہیں گے"!

تمہارے اس وطن کے نام پر جس کو رذیل اجنبیوں نے اپنے استبداد سے روند ڈالا ہے بے آبرو کر کے قعرِ مذلت میں گرا دیا ہے، تمہارے جوانمردانہ اوصاف کے نام پر، ہر اُس شے کے نام پر جو زندگی کو درخشاں اور ناموربناتی ہے یا قربانگاہِ حریت پر مٹنے والوں کی خاکستر سے دیوتا پیدا کرتی ہے، تمہارے اُن فرزندانِ وطن کے نام پر جو فاقے کاٹ کاٹ کر بھوک اور تشنگی کی شدت سے بیکسی کے عالم میں سسکتے رہے، وطن سے جلاوطن کئے گئے موت کے گھاٹ اُتارے گئے خدا اور انسان کے نام پر، قسم ہے اُن شہیدوں کی جن کو زنداں کے تاریک تہ خانوں میں مجرموں کی زنجیریں پہنا کر اسیر رکھا گیا، قسم ہے اس زمین کی جو یہ آواز سُن رہی ہے اور قسم ہے اس آسمان کی جو یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے میں تمہیں دعوت دیتی ہوں کہ اپنی روحوں کی آرزوئے رفعت کو حسنِ عمل کی صورت میں رونما کرو۔

اب بھی جبکہ تمہاری نگاہیں میرے دل کے ناتواں الفاظ سے دوچار ہو رہی ہیں جو ابھی

تک شجاعت کے ولولے سے یوں ہلکوریں لے رہا ہے، جیسے تمہارا اپنا دل، اب بھی جبکہ آئرلینڈ کے سینے کے زخموں کی یاد سے جو تمہاری روح پر بے اختیار چھائی جا رہی ہے، تمہاری آنکھوں کے کنارے آنسوؤں سے دھندلے ہوتے جا رہے ہیں اور قلب کی گہرائی سے آہیں نکل رہی ہیں، اب بھی وقت ہے اپنا دایاں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھاؤ، اور قسم کھاؤ، اپنی غیر فانی روح کی، ان امیدوں کی جو تمہارے دل کا آخری سہارا ہیں، کہ جب تک اس جاں بلب سرزمین کو از سرِ نو زندہ کر کے بچا نہیں لوگے، تم اپنے ہتھیار کبھی نہیں ڈالو گے، اور اس کارزار کو یونہی شعلہ زار بنائے رکھو گے!

اپنے سرداروں کے جھنڈے تلے، سر بکف ہو کر میدان میں اُتر آؤ! وہ کون ہے، جو یہ کہنے کی جسارت کر سکے، کہ وہ "ابرائن" کی رہنمائی قبول کر کے، اس کے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے تیار نہ ہوگا؟ تم میں اتنا بے غیرت کون ہے کہ وہ اپنے زر آشنا، لالچی اور خود غرض دشمنوں کے سپاہیوں پر، نوجوان بطل حریت "میگھر" کے زیرِ قیادت، شجاع، غیور اور آزاد سورماؤں کی طرح، پھر سے حملہ آور ہونے کی بجائے، اپنی جھونپڑی کی میلی اور گندی فضا میں، زمین پر ذلت و خواری سے رینگے، یا اس بات پر رضامندی ظاہر کرے کہ اس کو متعفن بدروؤں سے نکال کر محتاج خانے کے زندہ مقبرہ میں پھینک دیا جائے، ایک بیباک اور فیصلہ کن اقدام سے آگے بڑھنا چاہئے، سانس لینے کے لئے ایک لمحہ اس کے بعد ایک بغاوت، ایک پر ہجوم یورش، شمال، جنوب، مشرق اور مغرب سے محصورین پر بے محابا پل پڑو، اور پھر ملک ہمارا ہے۔

کیا تمہاری آنکھیں، ایک ملک کے ملنے کی آشکارا امید پر چمک نہیں پڑتیں؟ کیا تمہارے دل اُن یقینی در کنار آثارِ کامیابی سے غیر معمولی طور پر دھڑک نہیں رہے، یہ اس لئے کہ اس سے پیشتر تمہیں ملک گیری کا موقعہ نصیب ہی نہیں ہوا، تم نے کبھی آزادی کا افتخار، وقار اور شکوہ محسوس ہی نہیں کیا تم "آئرش مین" کے نام پر اپنا سر جلالی شان اور سماوی رفعت کے سمت اُٹھا ہی نہیں سکے، کیونکہ سارے یورپ نے تمہاری جبینِ داغدار پر کلنک کا ٹیکا یعنی غلامی کا نشان دیکھا ہے۔

اے کاش! میرے الفاظِ آتشیں تمہاری شرائین اور رگوں میں پگھلی ہوئی دھات کی طرح سرایت کر سکتے، اور قدیم زمانے کی اُس جوانمردانہ شجاعت کی افسردہ چنگاریوں کو جگا سکتے جو تم میں سے ہر شخص کو "لیونی ڈاس" ہر کارزار کو ایک "مراتھن" اور ہر دشوار گزار درّہ کو ایک "تھرمالپلی" بنا دے سکتی ہے، دلیری، کیا میں "آئرش" لوگوں کو دلیری کا درس دوں؟ کیا یہ مرنے سے بھی دشوار تر مرحلہ ہے؟ افسوس! کیا ہم آئے دن دل شکستگی سے، امیدوں کے ٹوٹ جانے سے دماغ اور جسم کی نت نئی ذہنی اور تلخیوں سے جو زندگی کو ایک بے کیف واماندگی میں تبدیل کئے ہوئے ہیں، اور ان صعوبتوں سے بھی، بدتر تکان سے نہیں مرتے؟ زندگی کیا ہے؟ ایک دراز اور سست رو فرصتِ جانکنی یا ایک صبر آزما آہستہ آہستہ گزرنے والا لمحہ سکرات!

نہیں جس سے تم ڈرتے ہو، وہ موت نہیں ہو سکتی کیونکہ بحر او قیانوس کے جلا وطن جا رہیں تم پلیگ جیسے مہلک غنیم کا بخوبی مقابلہ کر چکے ہو، اور اس سے پار اس مہلک مرض کا جو کہ جلا وطن ہونے والے کے نشیمن کی فضا پر طاری تھی، تم میں سے صد ہزار نفوس قحط سے تباہی سے غلامانہ زندگی اور کتے کی موت سے ہلاک ہو چکے ہیں، مردانگی! اب تم انسانیت کی اُن روایات پارینہ کو نہیں جھٹلاؤ گے، جو کہ ہم میں اس آسمانی خداداد عطیہ کا پتہ دیتی ہیں! میں نے کہیں ایک رومن شوہر کی بیوی کے مرنے کا حال پڑھا تھا، جس نے اپنے شوہر کو یہ سکھانے کے لئے کہ کیسے مرنا چاہئے، اپنے شکم میں خنجر بھونک کر خود کشی کر لی تھی، لیکن ہزاروں اموات ایسی ہی عبرت انگیز ہیں، آئرلینڈ کے لئے مر مٹنا ہاں کیا ہم نے اس تہیہ کے عہد و پیمان ہزاروں وجد آفریں الفاظ میں مجالس ملی و ائرہ ہائے یگانگت اور انجمنہائے اتحاد کی سنجیدہ قرار دادوں کی شکل میں اپنے شاعروں اور خطیبوں کی قسمیں کھا کھا کر نہیں باندھے؟ اب تمہاری آزمائش کا وقت آ پہنچا ہے، دیکھیں تم آزادی کی زیادہ قدر کرتے ہو یا زندگی کی یہ ساعت تاک کر نشانہ مارنے کی ساعت ہے اور نشانہ مار کر اپنی جان بچا لینے کی، فتح یابی کے بعد جو صبح آئے گی وہ تمہارے لئے مُردے شمار کرنے کے واسطے کافی و وافی مہلت لئے ہوئے ہوگی،

لیکن ہم اس جنگ کو برانگیختہ نہیں کرتے، مؤرخ آئرلینڈ کا ذکر کرتے ہوئے لکھیگا، کہ آئرلینڈ نے وہ صدمے برداشت کئے ہیں جس کی نظیر کسی خود مختارانہ حکومت کے جبر و تشدد میں نہیں ملتی، بیان کرنے والا بتائے گا کہ آئرلینڈ ان ایذاؤں میں مبتلا رہا ہے جو بلحاظ نوعیت جہان بھر سے نرالی تھیں مؤرخ تحریر کرے گا، کہ آئرلینڈ کا خونِ جگر اجنبی آقاؤں اور بیگانہ حاکموں کے شیطانی غول نے چوس چوس کر ختم کیا، مؤرخ لکھے گا، کہ اس ملک کی بے داغ آبرو کو جاسوسوں کی ایک لالچی اور کرایہ پر بلائی ہوئی جماعت سے داغدار کیا نیز عالم یاس اور بیچارگی کی حالت میں چیخیں مارنے والوں کا گلا ایسی بہیمیت کے مسلح ہاتھ سے گھونٹا گیا، جس کو اجنبی قانون کی منظوری ملی تھی، مؤرخ لکھے گا کہ آئرلینڈ کے مزارعین بھوکے پیاسے رہے، دراں حالیکہ انہوں نے فصل کاٹ کر اپنے اجنبی خداوندانِ نعمت کے لئے اکٹھا کیا، مؤرخ لکھے گا کہ آئرلینڈ کے زرد رُو کاریگر اور لاغر مزدور کاہش سے گھلتے رہے اور ناتوانی سے کمزور ہوتے رہے، کیونکہ ان کو کسی نے کام پر نہیں لگایا، مؤرخ لکھے گا، کہ آئرلینڈ کے جوہرِ کمال رکھنے والے باشندے شریف ترین اور سب سے زیادہ پاکدامن سپوت خطاکار مجرموں کے لئے مخصوص تہ خانوں میں گھسیٹ گھسیٹ کر لائے گئے، کہ مبادا عوام آوازِ حق سُن پائیں تمام جسمانی اور ذہنی قوتوں کے اس خوفناک ضعف و تعطل سے اور جملہ موجودات کی اس خرابی و فساد سے بیزار ہو کر جس کسی نے سر اُٹھانے کی جرأت کی اور یہ باغیانہ سوال کیا، کہ کیوں آئرلینڈ کی وہ زمین جس کو خدا نے ایسا خوبصورت بنایا ہے، ایسی رعنائی بخشی ہے، انسان کے ہاتھ سے کائنات بھر میں بدترین لعنت کا بھیانک مرکز بنائی گئی اس کو اذیت میں مبتلا کیا گیا؟ تاریخ اس بات کی شاہد ہوگی، کہ آئرلینڈ تکلیف اور مایوسی کی اس وحشتناک بے خودی سے اس وقت تک نہ چونکا، جب تک تیس ہزار تلوار دل نے اس کے دل کو زخمی نہ کر دیا، اور تب بھی وہ انتقام کے لئے سرکشانہ انداز سے ایستادہ نہیں ہوا محض نعمت مدافعت وطنی کے لئے آمادہ ہوا، نہیں نہیں ہم پہل کرنے والے نہیں ہیں، ہم اس خوفناک جنگ کو برانگیختہ نہیں کرتے اگرچہ ساٹھ لاکھ سپاہی ہماری امداد کے لئے آمادہ ہیں اور کامیابی کے تمام مواقع ہماری کامرانی کے لئے امید افزا رُخ لئے ہوئے ہیں، ہم پھر بھی انگلستان کے سامنے شرائط پیش کرتے ہیں اگر انگلستان ہماری شرطیں اس آخری لمحہ میں بھی مان لے اور آئرلینڈ کے جائز اور رُوبہ اعتدال مطالبات تسلیم کر لے ہمارے ہتھیار اس سنہری رشتہ کو جو کہ دو قوموں کو مربوط کرتا ہے۔ قطع کرنے کے لئے نہیں اُٹھینگے اگرچہ فتحمندی کی تمام فرصتیں اور مہلتیں ہمارے ہی لئے ہیں، ایک حق بجانب وجہ برانگیختگی میں ایک خدائی طاقت ہوتی ہے، ان افراد میں جو اپنے وطن کو اپنے قبضے میں لانے کے لئے اپنی ہی سرزمین پر برسر پیکار ہوں، ایک خشمگیں، دیوانگی آلود اور بیباک توانائی زور بازو بن جاتی ہے، ہیجان انگیز جوش و خروش ہوتا ہے، جو ہر خطرے کا مذاق اُڑاتا ہے، جبکہ وہ لوگ اپنے ملک کے لئے کامیابی کے اس پار بے نظیر جلال و مسرت کا ایک درخشاں مستقبل دیکھ رہے ہوں'!

ہمارے مقابل محض کرایہ پر منگوائے ہوئے سپاہیوں کا ایک لشکر ہے اور پولس کا وہ جتھا جس کو معاوضۂ خدمت دیا جاتا ہے، باوجود اس کے کہ وہ محض سدھائی ہوئی کلیں ہیں اور اپنی کوئی رائے نہیں رکھتے، چونکہ وہ انسان ہیں لہٰذا وہ بیم و دہشت سے تھرا اُٹھیں گے جب قتل و غارت کے اس خوفناک عمل پر نگاہ ڈالیں گے، جس نے فرض منصبی کے اس عنوان کو بھی ناپاک و نجس بنا دیا ہے، جس سے وہ موسوم کیا گیا ہے، اور جس کا پیغام انگلستان کی جانب سے انہیں دیا جاتا ہے، ان میں سے بہت سے ان لوگوں کے بھائی بند ہیں، جن کو قتل کرنے کی انہیں دعوت دی گئی ہے، یعنی ایک ہی سرزمین کے ان جوانمرد فرزندوں کے ہموطن جو اپنے مشترک ملک کو ممتاز کرنے کے لئے مجاہدانہ انداز سے جد و جہد کر رہے ہیں۔

یقیناً انسانیت کا وہ عنصر جو ہنوز اُن کے دلوں میں باقی ہے، تشدد اور خود مختارانہ ظلم کی افسوسناک کٹھ پتلیاں بنائے جانے سے گریز کرے گا، وہ انگلستان کی رشوت وصول کرنے

سے شرمائیں گے، جو برادر کشی کے عنتی ... نعل کے لئے ان کی قیمتی خدمت کے معاوضہ میں زرِ خرید پیش کر رہا ہے؟ کیا سسلی کا کوئی باشندہ نیپلز کی سپاہ میں پایا جا سکتا ہے؟ کیا میلان کے کسی مکین کا سُراغ آسٹریا کے وحشی حملہ آوروں میں مل سکتا ہے؟ نہیں، کیونکہ سسلی کے سادنت آبرو کے قدر شناس ہیں اور میلان کے غیور فرزند اُس بازو کو توڑ کر زمین پر پھینک دینگے جو اُن کے سامنے اپنے ہی اہل وطن کا خونبہا آسٹریا کے زرّین سکّوں کی صورت میں پیش کرنے کی جرأت کرے، خدا نہ کرے کہ آئرلینڈ میں مسلح، برادر کُش لوگوں کا گروہ پایا جائے، جو ایک اجنبی ظالم کے پرچم کے لئے اپنے ہی وطن کے خلاف ستیزہ کار ہو، لیکن اگر فی الحقیقت لالچ کی مصلحت یا دباؤ کی مجبوری ان کو ایک بدنما اور غیر فطری رویہ اختیار کرنے کی ترغیب دے، تو ہمیں ان کی حالت پر ہزار بار اظہارِ ہمدردی کرنا چاہیئے، ان حکام کی حکمت قابلِ رحم ہے جو اپنی آبرو کی ڈینگ مارتے ہیں، ہمیں ان دلیر سپاہیوں پر ترس آتا ہے، جن کی آئرش توانائی کی وجہ سے انگلستان کا نام روشن ہوا، کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو کاسہ لیسی کے لئے پیش کرتے ہوئے اپنی پاکیزہ آبرو معصوم شہرت، بیگناہ تلوار اور بے داغ پیشے کو بدنام امر سے داغدار کیا ہے۔

آہ! ہمیں ایک ایسی جماعت کے لئے ہراساں ہونا نہیں چاہیئے جو ایک والہانہ ہیجان اور پاکیزہ ولولے کی اُلوہی کیفیت اور وہبی قدوسیت سے سرشار رہے اور ہر اُس شے کے لئے انتھک پیہم تگ و دو میں مصروف رہے جس کو انسانی فطرت عزیز رکھتی ہے، مگر ان بکے ہوئے سپاہیوں کے سرغنوں کو اپنے فریق کے اثباتِ جواز کے لئے خوف سے لرزنا چاہیئے، کیونکہ ہمیشہ رہنے والی بدنامی کا شعوری احساس ہر اُس بازو کو شل کر دے گا جو اس ناجائز غایت کی معاونت کے لئے اُٹھا ہے۔

اب اگر ہمارے حریف ایمانداری سے آبرو کا پاس کرتے ہوئے رواداری کے ساتھ معاہدات ملحوظ رکھتے ہوئے (مصالحت کے لئے) آگے نہ بڑھیں، تو سرگرم اور پُر صبر طریقہ ہائے جنگ کا اعلان کر دینا چاہیئے انہیں اپنی افواج کے انتظام پر اعتماد ہے، ہمیں اپنے اقدام عسکری کے (جوانکی حقانیت پر لیکن ایک آتشیں جوش بھی، جس سے وہ محروم ہیں، ان کے انتظام کے ساتھ شامل ہو کر انہیں اس قابل نہیں بنا سکتا، کہ تیس ہزار محصور ہونے والے نفوس ساٹھ لاکھ قوم پرستوں کے خلاف معرکہ آرا ہو سکیں۔

ایک امر یقینی ہے، اگر جمہور محصورین سے جنگ کرنا پسند نہیں کریں گے، تو وہ اُن کو فاقہ کشی پر مجبور کر کے چھوڑینگے، میلان کا طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا، کوئی شخص ان کے پاس خورد و نوش کی کوئی شے فروخت کرنے نہیں پائیگا، متمل طریقۂ پیکار آئرلینڈ کے ہر قریہ اور ہر گاؤں میں جاری کیا جائے گا، اور اس اثنا میں بہت زیادہ سرگرم معرکے اور ہنگامے بڑے بڑے شہروں اور دیاروں میں بپا ہوتے رہیں گے، لیکن دار الخلافہ پر قبضہ حاصل کرنا تمام کوششوں کا عظیم الشان مقصد قرار دیا جانا چاہیئے ہر خط کو اس مرکزی نقطہ ...... کی جانب مائل ہونا پڑے گا، یہ قلعہ انگریزی طاقت کا مرکزی پتھر ہے اس پر قابض ہو جاؤ، اس کو تباہ کر دو اس کو آگ میں جھونک دو، اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالتے ہوئے اس کو زیر کر کے چھوڑو، اور اسی سرزمین پر جہاں سے تذلیل اور رسوائی کے ان تمام مکروہ افعال کی نمود کا آغاز ہوا ہے، جنہوں نے ایک قوم میں ایک جائز جذبۂ انتقام بیدار کیا ہے ایک ایسی حکومت قائم کرو، جس پر تمام جماعتوں کے لوگ اعتماد کر سکیں۔

شکست خوردہ استبداد اور ہزیمت زدہ تعذیب کے ستون کے اس پایہ پر شرافت کی ایک ایسی عمارت تعمیر کرو، جو ہماری انقلابی تحریک کے لئے بیک وقت قدیم اور معتبر اسمائے گرامی کی ضمانت اور گذشتہ کامیابی کا رسوخ مہیا کر سکے، کیونکہ ایک قوم جو مطلق العنان بادشاہی کو مغلوب کرنے کے لئے گرمِ عمل ہوتی ہے، وہ اس خود مختارانہ نظام کے عوض اس نظام کی کوئی ہم رنگ تشکیل تسلیم نہیں کرے گی، اگر وہ قوم جنگ آزما ہوگی تو مکمل آزادی کے لئے اور چونکہ ایک انقلابی ہنگامہ کے دوران میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ بدنظمی یا غدر کے امکان کا سدِ باب کیا جائے، وہ لوگ جو اس حکومت کی تعمیر پر مامور کئے گئے ہوں، ان کو انقلاب کی تمام پیش قدمی اور اس کی ترتیب و تنظیم اپنی حفاظت اور اپنے اختیار میں لے لینی چاہیئے، اس امر کی احتیاط ان کا فرض ہوگا، کہ آئرش حمیت کا پاکیزہ پرچم کسی ارتکاب جرم سے داغدار نہ ہونے پائے، ہمیں تمام دنیا پر ظاہر کر دینا چاہیئے، کہ ہم اپنے اوپر حکومت کرنے کے قابل ہیں، کہ ہم فی الحقیقت ایک آزاد قوم بننے کے مستحق و سزاوار ہیں؛ اور کہ اتحاد، آزادی، وطن کے الفاظ ہمارے دلوں میں اور عمل بن کر نمایاں ہونے والے لفظ میں ایسے ہی مقدس معانی لئے ہوئے ہیں، جیسے کہ ہمارے ہونٹوں پر، کہ حُبِ وطن کا مطلب محض ایک جنون انگیز ناقابل امتناع طاقت نہیں ہے، جس نے بربریت کا سر کچل دیا ہو، بلکہ از سر نو تعمیر، دیگر زندگی کی تجدید جوانمردی، قربانی، اور عظمت کا ایک تازہ دور ہے، ہمیں صرف آئرلینڈ کی زنجیریں ہی توڑنا نہیں، بلکہ اس کو ایک پُر جلال بلندی تک سرفراز کرنا، مدافعت کر کے اُس کو ظالم کے پنجے سے چھڑانا، شرافت کے رنگ میں رنگنا، پاکیزہ و مقدس بنانا ہے!

ہماری تجدید حیات کی تکمیل میں اب کسی بات کی کمی نہیں، اور ہماری کامیابی بلاشک و شبہ ایک یقینی امر ہے، اگر کمی ہے، تو اس بات کی کہ وہ نقائص و عیوب جنہوں نے ہماری نکو نامی کو دیگر اقوام میں رسوا کیا ہے، دور کر دئے جائیں، آئرلینڈ میں آزادی کے ---- لفظ کے ساتھ مہیب اور ہولناک روایات سایہ کی طرح وابستہ رہی ہیں، اس ملک کو نجات کی ایک مسرت بخش منزب گاہ بنانے، اوہام و مجازیات پر حقیقت کو مسلط کرنے، تعصب اور قدامت پسندی پر عقل و فہم کے راج کی بنیاد رکھنے اور ستم رانی اور ستم گری پر انسانیت کی سلطنت قائم کرنے کا کام ہم خود یعنی نسل حاضر کے مردان مجاہدین کے جانشین جنہوں نے جوانمردی کے جوہر دکھلائے، اور ان سورماؤں کی اولاد جنہوں نے حق کے لئے دُکھ اٹھائے، اور جو راہ صداقت میں شہید ہوئے، سرانجام دینگے۔

اے آئرستان کے باشندو! -------------

ایک نئی زندگی کی رستخیز کا انحصار تم پر ہے، کیونکہ اب تک ہم بے جان مُردے ہو کر پڑے رہے ہیں، نفرت، بے اعتمادی، ظلم، نا اتفاقی، خود غرضی، ہٹ دھرمی، یہ چیزیں "موت" ہیں ہمیں ان تمام برائیوں کا استیصال کرنا چاہیئے، تمام شر آمیز خواہشات کو مٹا دینا چاہیئے، ایک فتحیاب مسیح کی طرح ایسی حالت میں جبکہ اس کا پاؤں ایک ناگ کے سر کے اوپر ہو اُنہیں بے دریغ پائمال کر دینا چاہیئے، اور پھر اُس وقت معصوم نیک سیرت، تازہ حیات اور خدا کی جانب سے برکت حاصل کرنے والی قوم کے ہونٹوں سے حریت کے پُر افتخار ترانے فضائے آسمانی میں بلند ہونگے، اور ہماری یہ خوبصورت سرزمین جو اَب دُنیا کو اپنی زشت و زبوں حالت سے خوفزدہ کر رہی ہے، نیاز و بندگی کیلئے ایک عظیم الشان عبادت گاہ بن جائے گی، جس میں ہم تمام آئرستانی متحد بھائیوں کی طرح محو نیاز ہو ہو کر سجدے کرینگے، ایک مشترک ملک کے سپوت، ایک ہی خدا کے بچے، آپس میں شامل ہو کر آزادی، انصاف حریت، خوش نصیبی، اور نورانی جلال کی ان آسمانی برکتوں کے وارث ہوتے ہوئے جو ہمارے خون سے خرید کی جائیں گی، ایک مقدس پُر امن اور محبت سے سرشار نظام اخوت کے سایہ تلے زندگی بسر کریں گے!"

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

جس کے پٹے ناز سجود فقیر و شاہ تھے ۔۔۔ جسکے ساحل تیر اندازوں کی جولاں گاہ تھے
چاندنی میں جسکی ٹھنڈی ریت پر سوتے تھے ہم ۔۔۔ نیلگوں دھارے میں جسکے غوطہ زن ہوتے تھے ہم
جس نے پانڈو کے دلِ ویراں کو بخشی زندگی ۔۔۔ جسکی بکل موج بھی تسکین کا اک جام تھی
ساحلوں پر جسکے صحرائے لق و دق تھا کبھی ۔۔۔ جو درندوں اور حیوانوں کا تھا ملجا کبھی
ذوق نے الفت کے جس کو رشکِ گلشن کردیا ۔۔۔ گل بدامن کردیا جنت بدامن کردیا

جس کو پانڈو نے سنوارا کیا وہ دوشیزہ ہی تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہی تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہی تو ۔۔۔ جسکے آگے سرد تھا قلزم وہی دریا ہے تو
جسکے پاکیزہ کنارے مندروں کے شہر تھے ۔۔۔ جسکے قطرے دیکھنے والوں کو رشکِ بحر تھے
جسکی گودی میں ہزاروں قلعے تھے لاکھوں چمن ۔۔۔ جسکی موجوں میں نہا کرتی تھی دنیا اور دھن
جو کبھی صورت نمائے کوثر و تسنیم تھی ۔۔۔ جسکے ساحل پر گھنے کنجوں کی اک فردوس تھی
جسکے ساحل سے بہادر زندگی پاتے رہے ۔۔۔ ارجن و بھیم و یدھشٹر گرز چمکاتے رہے
آسماں جنت کے موتی جس پہ برساتا رہا ۔۔۔ آریہ عظمت کا جھنڈا جس پہ لہراتا رہا

جس کو جوہر نے تراشا تھا وہی ہیرا ہے تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہی تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو ۔۔۔ نو عروسِ گلستاں، دوشیزۂ صحرا ہے تو
جسکے سینے پر کنول کے پھول کھلتے تھے کبھی ۔۔۔ ساری دنیا کے خزانے جس میں ملتے تھے کبھی
جسکی چوٹی موتیوں کی کان تھی ہیروں کی جاں ۔۔۔ بھیک حسن جس سے مانگتے تھے نور کی ہفت آسماں
جسکی چھاتی گوشۂ آغوشِ مادر تھی کبھی ۔۔۔ جس کی گودی امن اور راحت کا مندر تھی کبھی
جو کبھی میٹھے سُروں میں گا کے بہلاتی بھی تھی ۔۔۔ اور کبھی پیڑوں کے سائے میں سلا جاتی بھی تھی

فرض کو اپنے اگر ہم بھول جاتے تھے کبھی ۔۔۔ بیخودی میں عیش کی محفل جماتے تھے کبھی
تند خو موجوں کے نغموں سے جگا دیتی تھی تو ۔۔۔ اُٹھکے اپنے پاؤں کے گھونگرو بجا دیتی تھی تو

محفلِ ہندوستاں کی مست رقاصہ ہی تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہی تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہی تو ۔۔۔ کرشن کی بنسی کا اک بہتا ہوا نغمہ ہے تو
دیوکی ہر صبح جس کے گھاٹ پر آتی رہی ۔۔۔ بطن میں گوکل کے پیغمبر کو نہلاتی رہی
نغمۂ گوتم کنارے پر ترے گونجا کیا ۔۔۔ بنسری کا مست تیری گود سے پیدا ہوا
تیرے ساحل پر کبھی آیا پریشاں واسدیو ۔۔۔ کنس کا مارا ہوا مقہور و حیران واسدیو
کنس کے ظلم و ستم کی سخت ہیبت دل پہ تھی ۔۔۔ گوردھن پر اک نظر تھی اور اک ساحل پہ تھی
یاد ہے اب تک ترا طوفاں اُٹھانا یاد ہے ۔۔۔ گوردھن کو دیکھکر موجوں پر آنا یاد ہے
کس قدر جادو بھرا تھا شوقِ پابوسی ترا ۔۔۔ تیری بیتابی پہ آخر کرشن کو رحم آگیا
کرشن نے اپنا قدم موجِ رواں پر رکھدیا ۔۔۔ تاجِ اُلفت کا وفا کے آستاں پر رکھ دیا
بوسے دیکر کرشن کے قدموں کو تو بہنے لگی ۔۔۔ مائلِ مقصود و محوِ جستجو بہنے لگی
نزہتِ آغوش تھی بازیچہ تھی گہوارہ تھی ۔۔۔ آسمانِ ہند کا بہتا ہوا سیارہ تھی
کیا تجھے وہ کرشن کا گیندیں اُڑانا یاد ہے ۔۔۔ ساحلوں کو اپنے بازیچہ بنانا یاد ہے
گیند کا موجوں پہ گرنا کودنا وہ کرشن کا ۔۔۔ اژدہے کا سانولے پیکر پہ کنڈل مارنا
کرشن کا اس وقت بھی بنسی بجانا یاد ہے ۔۔۔ ناچنا اور تیری موجوں کو نچانا یاد ہے
ناگ کے پھندے سے بچکر باہر آنا یاد ہے ۔۔۔ سب سے پہلا درسِ آزادی سُنانا یاد ہے
گوپیوں کا وہ سرِ ساحل نہانا یاد ہے ۔۔۔ کرشن کا رنگیں لباسوں کو چرانا یاد ہے
گوپیوں کا جسمِ عریاں کو چھپانا یاد ہے ۔۔۔ کرشن کا بنسی بجاکر مسکرانا یاد ہے

ہر سحر جس کی کنول تھی اور ہر شب چاندنی
ادھ کھلی کلیوں کی خوشبو سے مرکب چاندنی

جو دھر مرلی کی لے پر عمر بھر بہتی رہی
کرشن سے افسانۂ شام و سحر کہتی رہی

عمر بھر جو زندگی کی پند فرماتی رہی
موجِ گل جس کی روانی کی قسم کھاتی رہی

شام کے ہلکے دھندلکے میں بہ اندازِ حجاب
چھیڑتی تھی کنج میں رادھا محبت کا رباب

حسن کا گہوارہ تھی دارالامانِ عشق تھی
جسکی ہر موجِ رواں آرامِ جانِ عشق تھی

کرشن جس میں تیرتے تھے کیا وہی دریا ہے تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

رات کو انجم تری زلفوں سے اب ملتے نہیں
صبحدم موجوں پہ تیری اب کنول کھلتے نہیں

اب کہاں چہرے سے تیرے نورِ عشرت کا ظہور
اب کہاں آنکھوں میں تیری رنگ دنیائے سرور

تیرے پیکر پر لباسِ زندگی ہے تار تار
تیرے ساحل پر نہ گلشن ہیں نہ گلشن کی بہار

سنکھ کے نغمے ہیں مندر میں نہ مسجد میں اذاں
اور نہ ساحل پر ترے وہ دیویاں وہ گوپیاں

آہ وہ تیرے زمانے اک فسانا ہو گئے
ناچتے تھے مور جن کنجوں میں وہ کیا ہو گئے

یادگارِ حشمتِ تاریخِ دیرینہ ہے تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو
عظمتِ ماضی کا دھندلا سا اک آئینہ ہے تو

جس کا ساحل تھا شکست و فتح کی جولانگاہ
جس کا ساحل دیس بھگتوں کی تھی اک قربانگاہ

جسکی ریتی تھی شہیدوں کیلئے نوری کفن
خون کے قطروں سے جو بنتی رہی رشکِ چمن

تھی چتا ہر موج جسکی جلنے والوں کیلئے
اور اک قبرِ رواں تھی مرنے والوں کیلئے

انجمِ یونانیاں چمکا تری آغوش میں
باختر کا کارواں اترا تری آغوش میں

تیری گردن پر کبھی افغان کی شمشیر تھی
اور کبھی مغلوں کے نیزہ بوس نیزوں کی انی

خود تجھے اکثر ترے بیٹوں نے بھی زخمی کیا
آریوں نے اپنے خوں سے بھی تجھے بھر بھر دیا

جسکے ساحل عظمتِ تیمور کی ہیں یادگار
جسکے ساحل حشمتِ بابر کے ہیں آئینہ دار

دولتِ تیمور کی جاہ و جلالت دفن ہے
تیرے ساحل پر مسلمانوں کی عظمت دفن ہے

مرثیہ خوانِ جلال و حشمتِ رفتہ ہے تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو
جنگلوں میں ہند کے اک تشنہ لب بڑھیا ہے تو

غاصبوں کے سم زدہ تیروں سے جو زخمی ہوئی
جسکی چھاتی نیزۂ اغیار سے چھلنی ہوئی

جس کی ہر موجِ رواں ہے آج اک سازِ خموش
جس کی لہروں میں نہیں پہلا سا وہ جوش و خروش

جس کا ربط امتدادِ وقت نے ٹکڑے کیا
جس کی موجیں پڑھ رہی ہیں زندگی کا مرثیہ

جوش زن اور موج زن جسکے کنارے کٹ گئے
کاٹتے تھے جو سمندر کو وہ دھارے کٹ گئے

جسکی آنکھیں آنسوؤں سے پُر ہیں اور دل بیقرار
جسکا دامن ٹکڑے ٹکڑے اور گریباں تار تار

اور اس پر ظلم یہ بھی ہے کہ بے پروا ہے تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو
صحبتِ ماضی کا اک پُر درد افسانا ہے تو

شانہ تیری شہ جہاں کو تیرے گیسو کی ملی
مر کے بھی کی جذبۂ ممتاز نے مشاطگی

ایک کوہِ نور دامن پر ترے ٹانکا گیا
جو تری آبی ردائی کے لئے تارہ بنا

تاج سے راتوں کی خاموشی میں کیا کہتی ہے تو
آ کے اس کی گود میں آہستہ کیوں بہتی ہے تو

تیرے ساحل پر کہاں پہلی سی وہ آبادیاں
اب نہ وہ قلعے نہ وہ جھنڈے نہ پرچم اور نشاں

اب کہاں وہ عظمتیں وہ دبدبے اور وہ جلال
شام لاتی ہے کہاں تیرے لئے تاروں کی شال

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو
خوفِ مستقبل ہے تو اندیشۂ فردا ہے تو

کاش اک دن یہ ترے ٹوٹے کنارے پھٹ پڑیں
کاش اک دن یہ ترے خاموش دھارے پھٹ پڑیں

تیری موجیں ظالموں کے آستاں تک ہوں بلند
تیری لہریں غاصبوں کے اس مکاں تک ہوں بلند

جن مکاں میں تیری بربادی کے منصوبے ہوئے
جسکے کھمبے خونِ انسانی میں ہیں ڈوبے ہوئے

ظلم کے دھارے سے ٹکرائے تری موجِ رواں
بحر و بر میں گونج اٹھے اک صدائے الاماں

کاش اک دن اس طرح غیظ و غضب میں آئے تو
جانبِ مغرب غلامی کو بہا لیجائے تو

پھر وہی آزادیاں ہوں پھر وہی میخواریاں
پھر وہی دلشادیاں ہوں پھر وہی سرشاریاں

خود ہی ساقی خود ہی ساغر خود ہی میخانہ ہے تو
یا زوال و ارتقا کا ایک پیمانہ ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

ساغر نظامی

صوبۂ راجپوتانہ کا سب سے پہلا ایڈیٹر

عالم، سپاہی، فوجی، حکیم، شاعر، مورّخ اور مصنّف

مشرقی اور مغربی زبانوں کا ماہر

مولوی حکیم سید محمد مراد علی متخلص بہ ہوشیار

رائے سنگھ پورہ علاقہ بیکانیر کے رئیس و جاگیردار تھے اور صوبۂ راجپوتانہ کے سب سے پہلے اخبار کے واحد ایڈیٹر تھے۔ قصبہ بال سمد ضلع حصار (جنوبی پنجاب) میں ساڈھورے کے سادات ہیں جن کا سلسلۂ نسب پیرانِ پیر دستگیر حضرت غوث الاعظم رحمتہ اللہ علیہ سے ہے پیدا ہوئے۔

ان کے پردادا۔ سید احسان علی مرحوم ایک نہایت روشن ضمیر بزرگ تھے جن کی دعا سے مہاراجہ صورت سنگھ جی بہادر والیٔ ریاست بیکانیر کے ہاں فرزند نرینہ (مہاراجہ رتن سنگھ جی بہادر) پیدا ہوئے اور اسی صلہ میں مہاراجہ بہادر نے ان کو رائے سنگھ پورہ کی جاگیر عطا فرمائی۔

مولوی صاحب مرحوم ابتدائی تعلیم کے بعد نواب مولوی قمرالدین خاں بہادر مرحوم کے مدرسہ واقعہ کلاں مسجد دہلی میں سنہ ۱۸۵۴ء سے سنہ ۱۸۶۰ء تک تعلیم پا کر سند و دستارِ فضیلت حاصل کی۔

جولائی سنہ ۱۸۵۷ء میں جب مدرسہ بوجہ دہلی میں غدر ہو جانے کے بند ہو گیا تھا اور یہ پا پیادہ دہلی سے اپنے وطن کو تنہا آ رہے تھے تو راستہ میں بوڑاک کے جنگل میں گاؤں والوں کے حملوں سے انہوں نے دو انگریز افسروں اور ایک میم اور اس کے بچہ کی جانیں بچائیں اور ان کو نہر والی کوٹھی میں حفاظت سے سرکاری چپڑاسی کے سپرد کر کے اپنے گھر کی راہ لی۔

سنہ ۱۸۶۰ء میں اُس وقت کے جنگی لاٹ (کمانڈر اِن چیف آف انڈین آرمیز) سر نیول چیمبرلین (SIR NAVILLE CHAMBERLAIN) کے ۱۳۱ ایڈی کانگ (AID - DE CAMP) اے ڈی سی مقرر ہوئے۔ اور فوج میں صوبہ داری کا عہدہ ملا۔

امبیلہ کی جنگِ فاغنہ سنہ ۱۸۶۶ء میں شریک ہو کر تمغہ پایا

صوات اور بونیر کے ملّا عبدالغفور کے پاس حکومتِ ہند کی طرف سے گفت و شنید اور خط و کتابت کے لئے بھیجے گئے۔

ملکۂ معظمہ وکٹوریہ آنجہانیہ کی طرف سے جو تحائف امیر یعقوب خاں مرحوم والیٔ افغانستان کی خدمت میں بھیجے گئے تھے مولوی صاحب مرحوم ہی کے چارج میں تھے امیر مرحوم کے دربار میں کئی مہینہ رہنے کے بعد ہندوستان آنے پر حکومتِ ہند کی طرف سے مولوی صاحب مرحوم کو ایک تمغہ اور نقد مبلغ صما/۵۰۰ انعام ملا

حکومتِ ہند کے کاموں کے سلسلہ میں کاشغر۔ یارقند۔ لداخ۔ کابل۔ تخت پل ہیرات اور قندھار کی سیاحی کی۔

ابی سینا (ملک افریقہ) کی جنگ میں بھی شریک ہوئے اور تمغہ پایا۔ وہاں سے واپسی پر پنجاب پولیس میں ان کی خدمات منتقل کر دی گئیں۔ محکمہ پولیس میں نہایت کامیاب افسر اور سراغ رسانی میں بلا کے سی آئی ڈی تھے چنانچہ اسی سلسلہ میں میرٹھ کے ضلع میں جمنا کے کنارے مہینوں بنارس کے ایک زبردست پنڈت مہاتما کے پاس رجٹا دھاری ننگے سادھو بن کر رہے اور سنسکرت کی تکمیل کی۔

منصوری پہاڑ پر سنہ ۱۸۷۰ء میں تحصیلداری کی۔

جولائی سنہ ۱۸۷۳ء میں اجمیر کے کمشنر مسٹر ایل ایس ساؤنڈرس نے ان کو صوبۂ راجپوتانہ کے سب سے پہلے اور سرکاری ہفتہ وار اخبار موسومہ "راجپوتانہ آفیشل گزٹ" کا ایڈیٹر مقرر کیا یہ اخبار تین زبانوں (اردو۔ ہندی اور انگریزی) میں نکلتا تھا اور اس کی ایڈیٹری کے لئے حکومت نے مولوی صاحب مرحوم ایسے کارگزار اور آزمودہ کار افسر کو نہایت مناسب و موزوں سمجھا۔

سات سال سرکاری اخبار کو نہایت خوبی کے ساتھ چلانے کے بعد جب اس اخبار کا حکومت کے واحد آل انڈیا اخبار موسومہ "گورنمنٹ آف انڈیا گزٹ" میں الحاق ہو گیا تو مولوی صاحب مرحوم نے اجمیر میں مستقل سکونت کی ٹھان لی اور اپنا ذاتی ہفتہ وار "راجپوتانہ گزٹ" نامی جاری کیا اس اخبار کے لئے "مطبع چراغ راجستان" قائم کیا اور حکومت، ملک، قوم اور ریاستہائے راجپوتانہ کی اپنے اخبار کے ذریعہ تقریباً ۲۸ سال (سنہ ۱۸۷۳ء سے سنہ ۱۹۰۱ء تک) رہبری اور خدمات انجام دیں۔

سنہ ۱۸۷۶ء میں ہز امپیریل مجسٹی سلطان المعظم سلطان عبدالحمید خاں خلیفہ ثانی (سلطانِ روم) نے جنگنامۂ روم و روس سنہ ۱۸۷۷ء لکھنے پر مولوی صاحب مرحوم کو تمغائے مجیدی عطا فرمایا۔

مرحوم کی زندگی بھی عجیب اضداد حالتوں کا مجموعہ تھی۔ آپ دہلی کے مشہور عربی مدرسہ کے فاضل تھے پھر فوج کے عہدۂ جلیلہ کی وجہ سے سپاہیانہ زندگی گزاری انگریز فوجی افسروں کے ساتھ رہ کر انگریزی سیکھی اس کے بعد محکمۂ مال محکمۂ پولیس اور سی آئی ڈی کی افسری کی۔ پھر اخبار کی ادارت۔ حکمت اور شاعری کی اور متعدد تصانیف

تحریر کیں ان میں سے تاریخ راجگان راجپوتانہ اور جنگنامہ روم و روس ۱۸۷۷ء ان کی نہایت وسیع تصانیف ہیں اور یادگار مراد علی تو اجمیر کی عدالتوں میں اکثر مقدمات کے موقع پر ثبوت میں پیش ہوتی رہتی ہے۔

اپنے انتقال سے چھ ماہ پیشتر سے مولوی صاحب مرحوم نے ایک سلسلۂ مضامین بعنوان "توبہ" لکھنا شروع کیا جس میں دوست دشمن سب کو مخاطب کر کے معافی چاہی اور توبہ کے فلسفہ پر پوری پوری روشنی ڈالی اور خود کو ذات وحدت الوجود لاشریک لہٗ کی طرف صدق دل سے رجوع کیا۔ چنانچہ ۱۸ اگست ۱۹۱۰ء کو فجر کی اذان سنکر کلمۂ طیب پڑھتے ہوئے عالم جاودانی کی طرف رحلت کی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن اجمیر شریف کی مشرقی پہاڑی موسومہ "ٹیکری ملا صاحبؒ" کے دامن میں جہاں پہلے سے اپنے لئے پختہ قبر تیار کھی تھی دفن کئے گئے۔ مولوی فرحتی امروہوی مشہور مورخ مارواڑ نے مندرجہ ذیل تاریخ وفات کہی۔

چہ نالم از ستم و جور چرخ کجرفتار
ذوی الحیات ہمی ساخت آسیا کردار

چہ ذی حیات کہ مقبول اہل عالم بود
نظیر او نتوان یافتن بہ شصت ہزار

رفیق و ہمدم و ہمدرد من مراد علی
تخلصش بجہاں بود مشتہر رشید

چراغ بود وجودش براجپوتانہ
بمرگ او شدہ ایں ملک جملہ تیرہ و تار

دریں زمانہ بسے کارہائے نادر کرد
فضائلش نتوانم کہ آورم بشمار

ہزار و سیصد و شد گزشتہ ہجری
کہ کرد عزم حضوری سید ابرار

خموش گردم و راہ شکیب در گیرم
کہ ہیچ سود ندارد درازیٔ گفتار

برائے نخل وجود آمدہ خزان اجل
دریں زمانہ ندیدیم گلشن بیخار

بجاہ فرحتی خستہ کش بیامرزاد
بحق احمد مختار ایزد غفار

مولوی صاحب مرحوم مندرجہ ذیل دس زبانوں کے عالم اور ماہر تھے۔

عربی۔ فارسی۔ اردو۔ پنجابی۔ گورکھی۔ پشتو۔ انگریزی۔ ہندی بھاشا۔ سنسکرت اور بیکانیری تو ان کی مادری زبان ہی تھی۔

مولوی صاحب مرحوم کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔

تاریخ راجگان راجپوتانہ۔ یادگار مراد علی۔ جامع الفتاوی۔ تحفۂ مرادیہ۔ آئینۂ لکھنؤ جنگنامہ روم و روس (دو ضخیم جلدوں میں)۔ اجمیر گائیڈ (ہندی میں) گلدستۂ رشید (مجموعہ کلام اردو) جام سرور (مجموعہ کلام فارسی)

سید عنایت علی بی اے (علیگ)

برسات

کنور لطافت علی خان۔ طالب باغپتی

چمن بساطِ صحرا یہ ذرا ذرا سی جھیلیں !
یہ نو عروسِ فطرت یہ لباس جامدانی !
یہ بسی ہوئی فضائیں، یہ دُھلے ہوئے مناظر !
یہ شباب موہنی کا یہ گلاب کی جوانی !
کہیں جامنوں کے سایہ میں قمرو شوں کے جمگھٹ !
کہیں موسمی ترانوں میں حکایتِ جوانی !
کہیں دامنِ گلستاں پہ نقوشِ دست فطرت !
کوئی پھول آسمانی کوئی پھول زعفرانی !
نہ گھٹاؤں نے چھپائی نہ فضاؤں نے سنبھالی
لو بہار بن کے دنیا پہ برس پڑی جوانی !

تارے اور چاند کی گفتگو

اردو کی مشہور نظم "چاند کا تبصرہ" کے اتباع میں ایک انتقادی مکالمہ

از: سید عبدالقیوم مہجور

(۱)

ایک رات جبکہ بدرِ کامل اپنے تمام ظلمت سوز نور کے ساتھ کرۂ ارض پر تجلّیاں برسا رہا تھا، زمین سیلابِ نور میں ڈوبی ہوئی تھی، ایک چھوٹا سا ستارا بہت دور سے چیخ چیخ کر "چاند چاند" پکارتا ہوا چاند کا تعاقب کر رہا تھا۔ مگر وہ "پیمانۂ نور" متین اور خاموش اپنی گردش تمام کر رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت وہ "فطرت کا پیامی" شاعر اِک چٹیل میدان میں پیپل کے درخت کے قریب بیٹھا ہوا چاند کے خاموش سفر اور ستارہ کے تعاقبِ لطیف کو غور سے دیکھ رہا تھا، ...... چاند، چاند کی آواز برابر اس کے کانوں میں چلی آرہی تھی، اتنے میں ایک تارہ آسمان سے ٹوٹا، اس کے اجزا ہر سمت منتشر ہوگئے، معاً کچھ غم انگیز نغمات تمام فضائے نور میں گونجنے لگے شاعر سنبھل کر بیٹھ گیا، اور ٹکٹکی باندھ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت تمام تاروں کے پیکر لرزش میں معلوم ہوتے تھے اور خلائے بسیط میں گیتوں کی بارش ہو رہی تھی، ایک طرف دور زمین پر شاعر گوش بر آواز تھا ——— !!

(۲)

چاند کوششِ ضبط کے باوجود، تارے کی بار بار کی پکار سے متاثر ہو کر اپنی پوری استعدادِ نور کے ساتھ جواب پر مجبور ہوگیا، اور ...... برہمی کے ساتھ اس نے کہا! "خواہ مخواہ ہر رات تم دنیا کے ماضی و حال پر تبصرہ کرکے، بھولے ہوئے اور گزرنے والے حادثات کا ذکر چھیڑ کر مجھے کیوں ملول کرتے ہو؟ جانے دو! اگر انسان ہلاکت کی طرف تیز تیز قدم بڑھا رہا ہے تو تمہیں کیا؟ فطرت سرکشوں سے ہمیشہ انتقام لیا کرتی ہے، البتہ انتقام کی نزاکت دیکھتے رہو! ...... اگر سرمایہ دار غریب انسانوں کی گردنیں غلامی کا جوا ڈال کر، اس کا خون چوس کر، اپنا سرمایہ محفوظ کر رہا ہے، تو کیا ہوا؟ آخر تمہیں اس سے مطلب؟ موت ہمیشہ حیلہ ڈھونڈتی ہے مگر ہاں! جب ان فرزندانِ زر پر نزع کی تمام کیفیات طاری ہونگی، تو تسلیمِ روح کا منظر البتہ قابلِ دید ہوگا ——— ——— !

اگر حکومت، اِک فرضی، اور جابرانہ نظام کے ماتحت خدا کے قانون کو ذلیل کر رہی ہے، کرنے دو، تمہیں اس سے واسطہ؟ مگر اس دن کی جباریت دیکھنا، جب خدا کی تمام رحمت دفعتہً غضب میں تبدیل ہو جائیگی ——— ! چھوڑ دو، جب برہمی کائنات تدبیر کی حد سے گزر چکی ہے تو پھر ہم غم کیوں کریں؟ البتہ، نطرتاً تخریب و فنا کے آثار پر جہاں تک تم کا تعلق ہے ہم مجبور ہیں، لیکن خدا کے لئے مزید خراش تو تم پیدا نہ کرو!

اے! مضطرب فطرت تارے! یہ نہ سمجھو کہ تمہاری گفتگو سے صرف میرے قلب و جگر مجروح ہو رہے ہیں، بلکہ" چاند کرۂ ارض کے اس وسیع ٹکڑے کی طرف جہاں شاعر مجسم گوش بنا ہوا بیٹھا تھا، اپنی ایک چمکدار شعاع سے اشارہ کرتا ہوا بولا" وہ دیکھو، ٹھیک میری شعاع کی سیدھ میں، آبادی سے دور، اس غیر آباد سرزمین پر، ایک درخت کے قریب، دیکھو وہاں شاعر بیٹھا ہے، اس کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں، وہ روزانہ ہماری گفتگو سنتا ہے، اور اپنی بربادی کے افسانے غیروں کی زبان سے سن سن کر وہ ساری رات رو رو کر بسر کر دیتا ہے! آہ! کیا تم دیکھ رہے ہو؟ اب وہ آنسو جن کی ترکیب میں اس کے جگر کا تمام خون شامل تھا، اس کی آنکھوں سے ڈھلک چکے ہیں، اس کے سینہ میں آگ لگی ہوئی ہے، اور اس آگ میں اس کے تمام اعصاب جل رہے ہیں؟ ——— مگر دیکھو وہ جو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی سی معلوم ہو رہی ہیں، یہ دراصل آنسو کا کوئی آخری قطرہ نہیں ہے، بلکہ، یہ کہتے کہتے، چاند لرزش میں آگیا، اور کچھ وقفہ کے بعد اِک اضطراب کے عالم میں اس نے کہا" چھوٹے تارے! دیکھو دھوکہ نہ کھاؤ، یہ شاعر کی آنکھوں میں پانی نہیں ہے، آہ! شدتِ کرب کی وجہ سے بینائی کھنچ کر اس کی پلکوں پر کانپ رہی ہے جس کے زمین پر گرنے سے بہت پہلے شاعر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اندھا ہو جائیگا، اور یاد رکھو اس نقصانِ عظیم کی تمام ذمہ داری انسانیت کے دشمن حیوان نما انسان پر ہوگی۔

(۳)

تارہ چاند کی پُرمعنی مگر دل ہلا دینے والی تقریر سر جھکائے سنتا رہا ——— مگر چاند جب پہلے سے زیادہ روشن ہوگیا۔ اس کی بصیرت افروز تقریر ختم ہو چکی ——— تو تارے نے اپنے گریۂ خاموش کو چھپاتے ہوئے کہا ——— پیارے چاند ——— اگر میں ہر رات ماضی و حال پر تبصرہ کرکے تمہیں ملول کرتا ہوں، اور ہر شب میرے دل کی گہرائیوں

ٹالسٹائے

واجد علی شاہ

اودھ کے مقدر بادشاہ

مسز اینی بیسنٹ

شاہجہاں آعظم

سے نکلی ہوئی آواز تمہیں سر دُھننے پر مجبور کر دیتی ہے تو میری کیا خطا ہے ۔۔۔ فطرت سے پوچھو ـــــ جس نے ہمیں اور تمہیں صرف اسی لئے مامور کر رکھا ہے کہ ہر شب دُنیا اور دُنیا کی تمام بربادیوں پر روئیں ۔ ماتم کریں ۔ اور خواہ مخواہ دوسروں کا "تماشائے غم" اپنے خون سے سینچا کریں ۔ میرے دوست ! تمہیں بتاؤ کہ جب تمہارا خوبصورت جسم کائنات کے بے انتہا دکھوں سے گھٹ گھٹ کر فنا ہو جاتا ہے ـــــ تو پھر جابر فطرت تمہارے بے نور جسم کو "بارشِ انوار" سے جگمگا کر اور تمہارے سر پر "نئی زندگی" کا سنہری تاج سجا کر تمہیں کیوں "رسوائے عالم" کرتی ہے ؟ سر اُٹھاؤ ، جواب دو ، ستارے نے کہا ـــــ پیارے چاند ! اگر انسان ہلاکت کی طرف دوڑ رہا ہے تو دوڑے ، اگر سرمایہ دار غریبوں کے گلے میں طوقِ غلامی ڈال کر ، اُس کو محکومیت کے شکنجے میں کس کر سیم و زر کی لعنتیں فراہم کر رہا ہے تو کرے ۔ اگر حکومت ایک فرضی نظام کے ماتحت خدا کے قانون کو ذلیل کر رہی ہے " تو کئے جائے ہمیں اس سے کوئی واسطہ نہیں ، تارہ چاند سے اور قریب ہو گیا ۔ مگر اُس دن جبکہ جبر فطرت " ہر سرکش کو سر جھکانے پر مجبور کر دیگا ـــــ اُس دن جب غریبوں کے خون سے سینچے ہوئے پھولوں پر سونے والے ـــ انگاروں پر لوٹ رہے ہوں گے ۔۔۔ اُس دن جب انسانوں کا خون چوسنے والے انسان ایک گھونٹ پانی کے لئے ترس رہے ہونگے ـــ اُس وقت جبکہ جیب و دامن کے وہ تمام "نقوشِ غرق" جو محکوموں کی رگوں سے نکل کر لاکھوں برس پہلے "عبرتِ دوام" حاصل کر چکے تھے اس طرح اُبھر آئیں گے جس طرح وبائی جراثیم اُبھر پڑتے ہیں ـــــ اور اُس دن جب لمن الملک کا ڈنکا ، غرور تمکنت "عزت شاہی" اور نظام شاہنشاہیت کا پردہ چاک کر دیگا ـــــ آہ ! سنتے ہو ۔۔۔ اُس دن ہمیں اور تمہیں اور کائنات کے ہر ذرے کو اپنی خدمت گزاری کا حساب دینا ہوگا ـــــ اور جس طرح آج ننگِ انسانیت اشخاص مزدوروں محکوموں اور مفلسوں کے راحت کدوں پر ستم توڑ کر اُن کو جہنم زار بنا دیتے ہیں اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ عبرت انگیز طریقے سے کل ان کو اپنی گناہوں کے سامنے دوزخ کی ابدی لعنتوں میں دھکیل دینا ہوگا ۔۔۔ اور انسانوں کے ساتھ ہمارا یہی وہ واسطہ ہے جس کی وجہ سے ہر رات مجھے ماضی و حال کے نکاتِ حیات "خطوطِ نور" سے اپنی شعاعات یادداشت میں محفوظ کر لینا پڑتے ہیں ـــــ چھوٹے تارے کے خطرناک نغموں سے چاند تو چاند اُس کی سیدھ میں بیٹھا ہوا شاعر بھی کانپ گیا اور خود ستارہ بھی مدہوشانہ انداز سے خاموش ہو گیا ـــ اور پھر ایک "لطف لرزش" کے بعد سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اُس نے کہا ، میرے ہمنوا ! رات گزر رہی ہے اور باتیں بہت ہیں ۔ آج کی شب میں ماضی پر تبصرہ کر کے تمہیں تکلیف نہیں دوں گا لیکن خدمتِ انتقاد کی اہم ذمہ داریوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے زمانۂ حال کے ایک نہایت ہی خطرناک واقعہ پر روشنی ڈال کر میں اپنی گفتگو ختم کر دونگا ۔ اس کے بعد "بزم انجم" کی ایک لرزش خیز موسیقی فضائے آسمانی میں جگمگانے لگی اور فضا پہلے سے زیادہ روشن ہو گئی ـــــ تارے نے غم کے نرم سُروں میں کہنا شروع کیا ـــــ چاند ـــ چاند ـــــ دیکھ رہے ہو ؟ ـــ مشرقِ بعید میں وہ سیاہ دھوئیں اُٹھ رہے ہیں آسمان سیاہ نظر آ رہا ہے ـــــ اور ہمارے پاس کچھ ہنگامہ خیز صدائیں آ رہی ہیں ۔ جانتے ہو ؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے ؟ یہ کہتے کہتے تارے کی آنکھیں بھیگ گئیں اور اُس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا ـــــ دیکھو ! بھول نہ جانا وہ مشرق بعید سے دھوئیں نہیں اُٹھ رہے ہیں ـــــ بلکہ وہ خانماں برباد ضعیف باپوں اور تباہ حال ماؤں کی آہیں ہیں جن کے جوانمرد بیٹوں نے مادرِ وطن کے لئے سینوں پر سنگینیں روک کر اپنی جانیں قربان کی ہیں اور جن کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو گھوڑوں کی بے رحم ٹاپوں سے کچل ڈالا گیا ہے اور وہ جو آسمان سیاہ نظر آ رہا ہے ، وہ درحقیقت آسمان سیاہ نہیں ہے بلکہ فضائے آزادی پر "بندگانِ حرص" کی بیدرد آنکھیں منڈلا رہی ہیں جو اپنی فوجی طاقت اور شانِ جبروت کے غرور سے اپنے سوا ہر کمزور انسان کے سر پر غلامی و محکومی کی جہنمی لعنت مسلط کر دینا چاہتی ہیں ـــــ اور یہ جو صدائیں آ رہی ہیں وہ دراصل جنگِ طبل و بوق کی چیخیں ہیں جو ایشیا کی بنیادیں ہلا دینے کے لئے بیتاب نظر آ رہی ہیں ۔ میرے رفیق ! غور سے سنو کہ مستقبل قریب میں ایک ایسی خطرناک جنگ چھڑنے والی ہے ـــ جس کی طاغوتی ہلاکتیں عالم کے چپہ چپہ پر چھا جائیں گی ـــــ توپوں کی گرج ، رائفلوں کی باڑھ ، گیسوں کی ہلاکت آفرینی اور ہوائی جہازوں کی ٹکروں سے دُنیا جہنم بن جائے گی ـــــ ہوشیار ہو جاؤ اُس دن کیلئے جب امن سوز سلطنتیں آپس میں ٹکرائیں گی ، اور دُنیا دوزخ کے طبقوں میں تبدیل ہو کر عذابوں کا مجموعہ بن جائے گی ـــــ چاند ! سن رہے ہو ۔۔ ؟ اور اُس دن کے لئے بھی تیار ہو ـــــ جب ۔۔۔۔۔۔۔ تمام دلنوازیاں ، تم شباب بن کر تمہارے سامنے آئیں گی اور زمانہ ایک نیا پلٹا کھانے کے لئے بے چین ہوگا ـــــ اور اُس دن کا بھی انتظار کرو ۔ جب فطرت حیوانیت بردوش انسانوں کی تباہی کے لئے "اعلانِ مہیب" کرے گی اور جس کے بعد اُن کو کوئی طاقت فطرت کے عذاب سے نہیں بچا سکے گی ـــــ چاند کی سیدھ میں بیٹھا ہوا شاعر دُنیا کے اس دہشتناک انقلاب کا حال سُنکر قریب قریب بیہوش ہو گیا ـــــ مگر پھر اُس نے اپنے حواس یکجا کئے ، اور سنبھل کر بیٹھ گیا ـــــ تارے نے کہا ـــــ آہ ! وہ فطرت کا پیامی ۔ "وجہِ ذوق ، علوئے شوق نزاکتِ احساس لطافتِ روح ۔۔۔ ۔۔۔۔۔ کا پیکر مجسم " شاعر ۔ آہ وہ اندھا ہو جائیگا ، مگر دُنیا کو اس کا ذرا احساس نہ ہوگا ـــــ بیشک تم نے ٹھیک کہا ۔ میرے پیارے چاند ! کہ اس نقصانِ عظیم کی تمام ذمہ داریاں انسان نما درندوں پر عائد ہوں گی ۔ !

(۴)

چاند کے لطیف جذبات ستارے کے جگر خراش تبصرے سے کانپ اُٹھے اُس کی ضو ریز آنکھیں اشکبار ہو گئیں کوششِ ضبط کے باوجود وہ اپنے گریۂ خاموش کو نہ چھپا سکا ، آنسوؤں کے چند گرم و روشن قطرے اُس کی بھیگی ہوئی پلکوں سے گرے اور بساطِ آسمانی پر شہابِ ثاقب ۔۔ بنکر بکھر گئے ، کچھ وقفہ کے بعد اُس نے لب جواب مجتمع کئے ، اور کہا ـــــ معاف کرنا میرے ہمسفر ! غم و الم کی فراوانی نے مجھے بوکھلا دیا تھا ، اور میں اپنے فرائض سے غافل ہو گیا تھا ـــ تمہاری اس تنبیہ کا شکریہ ! لیکن تمہیں کیا معلوم کہ ایسی کتنی راتیں گزر جائیں گی ـــ تاہم واقعات و حوادثِ عالم کا ایک باب بھی ختم نہ ہو سکے گا ـــــ لو ادھر دیکھو ـــــ چاند نے ایک تیز شعاع زمین کے گرد ڈالتے ہوئے کہا ، اُس آبادی کی گنجان گودمیں یہاں سے بہت دور مغربِ بعید میں بڑی بڑی مرتفع اور سنگین عمارتیں نظر آ رہی ہیں جلتے

۱۳۴

کاش ساری دُنیا اس مخلوق کے عوض تمام مہیب امراض میں گرفتار ہو جاتی ہے اور صرف محفوظ رہتی، تو ماتم کی ضرورت نہ تھی ——————

چاند یہیں تک پہنچا تھا کہ شاعر کی آنکھوں میں جو قطرات اپنی داستانِ بربادی سُن سُن کر پلک پلک پر لبریز رہے تھے یکایک سُرخ ہو گئے، تارہ تبدیلیِ اشک کو دیکھتے ہی بول اُٹھا، چاند! چاند! ذرا ٹھہرو .. دیکھو! وہ فطرت کا رازدار اندھا ہوا جاتا ہے، اور قریب ہے کہ اُس کی بینائی کے قطرے زمین میں جذب ہو جائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا انتقاد پہنچانے سے پہلے پیامی خود فنا ہو جائے، اور شاعر سے قدرت کو جو کام لینا ہے وہ تشنہ رہ جائے، چاند باوجودیکہ پورے جوش پر تھا، اُس نے سوچ لیا تھا کہ آج میں اپنے انتقادات کو ختم کر دوں گا اور ہمیشہ کیلئے روز روز کی تکلیف سے خود نجات پا جاؤں گا، لیکن تارے کے اشارے پر شاعر کی زبوں حالت دیکھکر اُس کا دل رحم سے بھر آیا، اور اُس کے تمام ارادے اور نظامِ عمل دماغ سے نکلکر کہکشاں کی شکل میں فضائے نیلگوں پر بکھر گئے۔

(۶)

شاعر دفعتہً چاند کی خموشی سے چونک پڑا، اور اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے چاند کی طرف دیکھنے لگا، تارا مسرت کے ساتھ چاند سے قریب ہو گیا، اور چاند کو مخاطب کرتا ہوا بولا ——————
پیارے چاند دیکھتے ہو .. ؟ شاعر کی غمگین نگاہیں کس قدر عمیق تجسس، کتنا گہرا فکر ——————
معاً دریائے جذبات میں پھر ایک سیلابِ عظیم برپا ہو گیا اور چاند صبر و سکون سے قاصر رہا، قوتِ گویائی کوششِ تمام کے بعد بھی نہ رُکی، فضائے بسیط کو مرتعش کر دینے والی ایک مہیب آواز نے تارے کے وجودِ لطیف کو لرزش میں تبدیل کر دیا، اور وہ انتہائی خوف و ہراس کے عالم میں چاند کے پہلو میں آگیا، اُس وقت وہ سراپا التجا ہوکر رہ گیا تھا، اُس نے ڈرتے ڈرتے چاند سے کہا ..
...... پیارے چاند! تم وارداتِ ماضی و حال کے راز دار ہو، یقیناً گزشتہ اور موجودہ حالت پر روشنی ڈالو، میرے اچھے چاند بیانِ واقعات میں جذبات کا امتزاج بڑے غارتگر اثرات کا حامل ہوا کرتا ہے ...... للہ واقعات کو واقعات کی حد تک اپنے جذبات سے قطع نظر کہتے جاؤ! ورنہ وہ ہمارا تمہارا اور فطرت کا پیامی، تنظیم و تعمیر کی تمام اہم ذمہ داریوں کی تکمیل کئے بغیر اس "خاکدانِ خراب" سے رخصت ہو جائے گا .... آہ! ...... دُنیا کو ابھی اس کی ضرورت ہے، اگر شاعر، تعمیرِ انسانیت سے پہلے خود فنا ہو جائیگا! اس کی موت ایک "سیلابِ عظیم" اور اضطرابِ عمل کا سبب ہوگی، اور تمہارے ہیجان انگیز انتقادات کا نتیجہ تخریبِ انسانیت"!
چاند ایک عجیب عالم میں، سرنگوں، فکرِ مجسم، سراپا غور، استعجاب مکمل، اکیر مبہوت تھا، دفعتاً بہت زیادہ نورانی ہو گیا، تارے کی تجلی مختصر اس سیلابِ نور میں گم ہو گئی، چاند صبر و تحمل اور سعیِ استقلال کے باوجود خموش نہ رہ سکا، ایک زلزلہ انگیز اور دل ہلا دینے والی آواز سے تارے کی طرف ایک تازہ شعاع پھینکتا ہوا بولا .... یہ کیا مذاق ہے ؟ نہ مجھے خموش رہنے دیتے ہو، اور نہ اجازتِ تنقید سے سرفراز کرتے ہو، میں خود صبر و ضبط کا عادی ہوں مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہر راتِ ماضی و حال کے اطلاق خونیں تم میرے سامنے اُلٹا کرو، اور میں اپنے جذبات پر قابو پا سکوں! آخر اب برہمیِ کائنات سے خائف کیوں ہو .. ؟ اب کیا تعمیر و تنظیم ———— کے خواب دیکھ رہے ہو ؟
اور اب کیا برہمی و انتشار سے خائف ہو .. ؟ میں پوچھتا ہوں حیاتِ انسانی کا وہ کون سا شعبہ ہے جو ان فطرت شکن حیوانوں کی تخریب سے بچ رہا ہو ———— تمام برہمی ہی برہمی ہے، تمام خستگی ہی شکستگی ہے ———— اور تمام تخریب ہی تخریب ———— !! .... آہ! پیارے تارے، آدم و حوا کے اُس افسانۂ قدیم کو تو یاد کرو! اور ان کی تخلیق کے اُس مقصدِ جلیل کو بھی یاد کرو، جب ہم اور تم ہر رات اُن کے وسیع خلوت کدہ جمیل پر چمک کر، فطرت کی اُس اہم تجویز کو اپنی لطیف خنکیوں سے کامیاب بنایا کرتے تھے .... آہ! .... وہ زمانہ تھا جب آدمؑ صرف حوا کے لئے وقف تھا اور حواؑ کا وقارِ نسوانیت صرف آدمؑ کے تبسمِ لطیف کیلئے،

اور اب ...... اس دورِ تہذیب و تمدن میں جب علم کی شعاعیں ارتقائی منزلیں طے کر رہی ہیں، بڑی بڑی جماعتوں نے دُنیا کے اخلاقی ریفارم اور تبلیغ کا بار اپنے شانوں پر لے لیا ہے —— "تدبیرِ منزل" اور "سیاستِ مدن" کہا جاتا ہے کہ انتہائے عروج کو پہنچی ہوئی ہے، امنِ عامہ اور تسکینِ اضطراب کیلئے تمام قطعی ذرائع و سامان مہیا کر لئے گئے ہیں، بڑے بڑے عبادت خانے، مندر، گرجا، خانقاہیں اسی مقصد کے لئے تعمیر کئے گئے ہیں .... دیکھتے ہو، تہذیب و تمدن، علمی ارتقاء، ریفارم اور تبلیغ، تدبیرِ منزل، سیاست، امنِ عامہ، اور تسکینِ روحانی، کتنے بڑے بڑے، اور مرعوب کن الفاظ ان لوگوں نے گڑھے ہیں، کتنا خوبصورت جال ان صیادِ فطرت انسانوں نے آسمان کے نیچے بچھایا ہے، حالانکہ ان مہذب لٹیروں کے تمام دعووں کا خلاصہ یہ ہے کہ .... آج حوا کی ایک بیٹی، سیکڑوں ابنِ آدمؑ کے لئے وقف ہے، اس کا اگر عام مظاہرہ چاہتے ہو، جہاں برقی قمقموں کی دن کو شرما دینے والی روشنی میں، آدمؑ و حواؑ کی تذلیل کی جاتی ہے تو ان رقص گاہوں، سینماؤں اور تھیٹروں کی فضاؤں کو دیکھو، جن کے خوبصورت اور حسین حصار میں ......
...... "انسانیت" لٹتی ہے! ———— !! یہ ہے اُن ذمہ دارانِ تہذیب و تمدن کے اخلاقی ریفارم و تبلیغ کی حقیقت! .... اور سیاست کیا پوچھتے ہو؟ یہ تجارت، اور سرمایہ اندوزی کی ایک کامیاب چال ہے، اس سلسلے میں آگے کچھ نہ کہوں گا، تم خود ہی سب کچھ دیکھ رہے ہو! موجودہ اہتمامِ جنگ کی بنیاد کیا ہے .. ؟ اگر اپنے ذہن کی یادداشت پر بھروسہ کر سکتے ہو تو جواب مانگ لو! ———— ! اور ...... آہ، یہ بڑی بڑی عبادت گاہیں ان میں اکثر خدا کی یاد تو نہیں، ہاں! بڑے بڑے مہلک گناہوں کے دستورِ اساسی یہیں تیار ہوتے ہیں یہاں مذہبی عیاش بستے ہیں، دُنیا کا ہر گناہ اس حصارِ مقدس میں آکر جائز اور مقدس ہو جاتا ہے .....!
اس مشاہدے کے لئے تمہیں زیادہ زحمت نہ گوارا کرنی پڑے گی، اپنے ماحول پر نظر دوڑاؤ کوئی ایک نقطہ بھی بتا دو، جہاں مہذب عیاشی اس وقت نہ کی جا رہی ہو ...... بھولے تارے! اگر قدرت ہوتی تو اپنی لطافت اور خنکی سلب کر کے میں ایک دہکتا ہوا انگارہ بن جاتا، اور سب سے پہلی مرتبہ جب میں نے ان نظر سوز مناظر کا مطالعہ کیا تھا، اُسی وقت تبدیلِ ہیئت کر کے کرۂ ارض کو اپنی گرم آغوش میں لیکر اس زور سے دبا لیتا کہ منٹ کے سولھویں حصے میں میری آغوش میں صرف اک تودۂ خاکستر رہ جاتا، اور میں عمر بھر کے لئے اس مشاہدۂ معصیت سے بچ جاتا ———— !! تم ہی بتاؤ حیاتِ انسانی کا اب وہ کونسا شعبہ رہ گیا ہے جو ان فطرت شکن حیوانوں کی تخریب سے بچ رہا ہو ————
———— اب تو وقت ہے ایک زبردست انتقام کا، ایک مٹا دینے والی مہیب سزا کا، اب ضرورت ہے کہ فطرت کرۂ نار اور کرۂ ارض کو منضم کر دے، تاکہ زمین پر بسنے والی یہ تمام شیطانی روحیں اپنی کرتوت کے ساتھ اس آتشیں کرہ کا لقمہ بن جائیں، یا کم از کم تھوڑی دیر کے لئے کرۂ مائی کرۂ ارض کو نگل لے، تاکہ یہ تکلیف ہستی انسان اپنی تمام بربریت کے ساتھ اس سیلابِ عظیم کی نذر ہو جائے ...
...... یقیناً تنظیم و تعمیر کا موقعہ تھا، اگر جوہرِ حیا، اور انفعال کا کوئی خفیف عنصر بھی ان مادیت کے پتلوں میں باقی رہ جاتا، اگر ان کی تاریک روحوں میں کچھ بھی فطری آثار سے اثر گیری کی صلاحیت ہوتی، مگر جہاں مادیت ہی مادیت ہے، وہاں لطافت اور روحانی تاثر کا کیا تذکرہ ————
———— !! چاند کے اس آخری تبصرے نے اچانک ساری فضا کو سوگوار بنا دیا، دفعتہً سماں بالکل تبدیل ہو گیا، سارے اجرامِ فلکی نڈھال ہو گئے۔ تمام کائنات کسی خاص اثر سے متاثر ہو گئی ماحول کی سوگواری، غم آفرینی اور مایوسی میں، شاعر کا دل ڈوب گیا، دو موٹے موٹے چمکدار آنسوؤں کے قطرے اُس کے رخساروں پر ڈھلک آئے، کچھ بڑھے، اور کرۂ ارض میں جذب ہو گئے اور شاعر پیپل کے سایہ میں بے حس و حرکت گر پڑا ———— !! چاند نے سیاہ ابر کے ایک غلیظ ٹکڑے سے اپنا مُنہ چھپا لیا ————
تارا اپنی کمسن روشنی کے ساتھ سِسک کر خاموش سا ہو گیا۔

مہجور

سیاہ پوش راہب

(روسی افسانہ نگار چیخوف کا ایک شاہکار)

اینڈری کورن جس نے یونیورسٹی سے ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی اپنی طاقت کو صرف اور اپنے قوائے دماغی کو معطل کر چکا تھا۔ اس نے کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہ کیا لیکن اتفاقیہ طور پر ایک جلسۂ شراب نوشی میں ایک دوست سے جو ڈاکٹر بھی تھا۔ اس کا تذکرہ آگیا۔ موصوف نے اس کو بہار و گرمی کا موسم دیہات میں گزارنے کی صلاح دی۔ خوش قسمتی سے عین وقت پر تانیا پسوٹسکی نے ایک طویل مراسلہ میں اس سے آنے اور بورس سوڈکا میں قیام پذیر ہونے کی التجا کی۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ اب فی الحقیقت اُسے جانا چاہیئے۔

ابتدائے اپریل میں وہ اپنے مکان کورنکا کو گیا اور وہاں تین ہفتے تنہائی و عزلت میں رہ کر جیسے ہی کہ سڑکیں اور راستے اچھی حالت میں ہوئے وہ ایک گاڑی میں سوار ہو کر اپنے سابق مربی کے پاس جانے کی خاطر جس نے اسے پرورش کیا تھا اور جو تمام ملک روس میں پیشۂ باغبانی میں نام آوری حاصل کر چکا تھا روانہ ہو گیا۔ کورنکا سے بورس سوڈکا کا فاصلہ کچھ اوپر پچاس میل تھا۔ مئی کے مہینے میں عمدہ اور ہموار سڑک پر ایک آرام دہ گاڑی میں سوار ہونا حقیقی مسرت ہے۔

پسوٹسکی کا ایک عالی شان مکان تھا جس میں کھمبے اور ستون تھے مگر اُن کا پلاسٹر اکھڑا ہوا تھا۔ ڈیوڑھی پر ایک دربان وردی پہنے حاضر رہتا۔ پُرانا باغ انگریزی روش کا افسردہ تنہا پون میل کے قریب لمبا دریا تک چلا گیا تھا۔ جہاں پر زمین ڈھلوان تھی اور کنارہ گہرا و ریسدہ تھا ننگی تنگی جڑوں کے صنوبر کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ اور جڑیں ناہموار پنجوں کی مانند دکھائی پڑتیں۔ نیچے کی طرف پانی ایک عجیب طرز میں چمکتا۔ قرقروں کی آواز اُڑتے وقت نہایت رنج دہ و غمگین معلوم ہوتی۔ اس ماحول سے کچھ ایسا اثر مرتب ہوتا کہ ہر کوئی پُر کیف نغمہ و ترانہ لکھنے کی طرف راغب ہو جاتا۔ لیکن خود مکان کے پاس صحن میں اور باغیچے میں جو تمام پیر وغیرہ کو ملا کر نوے ایکڑ پر مشمول تھا۔ ہر جگہ پر ہر موسم میں حتیٰ کہ خزاں کے دنوں میں بھی زندگی لطافت موجود رہتی۔ ایسے حیرت انگیز گلاب۔ سوسن۔ کامنی۔ مختلف اقسام کے لالہ صاف و شفاف اور سیاہ فام پھول درحقیقت ایسا خزینۂ گُل کورن نے کبھی کہیں نہ دیکھا تھا۔ سوائے پسوٹسکی کے ہاں کے ابھی موسم بہار کا شروع تھا۔ اور پھولوں کے تختوں کی اصل شان و شوکت ہنوز گرم مکانوں میں محفوظ تھی لیکن پھر بھی روشوں کے کنارے اور جہاں تہاں کیاریوں میں پھول اس قدر کافی تھے کہ گمان ہوتا تھا ہم در اصل کسی چمن کی گلگشت میں مصروف ہیں۔ یا نازک رنگوں کی سلطنت میں جادہ پیما اور بالخصوص علی الصباح جبکہ اوس ہر ایک پتی پر تاباں ہوتی۔

باغ کا یہ آراستہ و پیراستہ حصہ جس کو پسوٹسکی حقارت سے بیکار محض خیال کرتا دیکھ کر بچپن کے زمانے میں کورن کے دل پر پریوں کے ملک کا نقشہ کھنچ جایا کرتا تھا۔ فطرت کے متعلق ہر قسم کے توہم اور تمسخر اور مزین غلطت کا ثبوت یہاں موجود تھا۔ یہاں پھلدار درختوں کے عجوبے موجود تھے۔ ناشپاتی کا درخت لانبا مخروطی شکل کا گول گول لیمو اور بلوط۔ ناشپاتی بشکل چھتری۔ بیریاں بصورت محراب و ہلال اور نیز بشکل ۱۸۶۲ جو اس سال کی یادتازہ کرتیں جب پسوٹسکی نے پہلی دفعہ باغبانی کو اپنا پیشہ قرار دیا۔ سیر کرتے وقت خوبصورت خوبرو۔ نازک درخت مضبوط سرو قد تنے والے درخت ملتے۔ مگر بغور دیکھنے پر ہی اُن کی اصلیت کھلتی اور معلوم ہوتا کہ وہ کس قسم کے درخت ہیں۔ صبح سے شام تک لگا تار آمد و رفت سے باغ بہت ہی زیادہ فرحت بخش اور پیارا معلوم ہوتا تھا۔ آدمی پہیہ والی گاڑی۔ ٹھیلوں اور پانی چھڑکنے والی ٹنکیوں سمیت درختوں اور جھاڑیوں کے گرد۔ سڑک اور کیاریوں میں شل چیونٹیوں کے جمع نظر آتے۔

کورن شام کے وقت دس بجے کے قریب پسوٹسکی کے مکان پر پہنچا اُس نے تانیا اور اُس کے باپ یگار سیمونچ کو بڑی تشویش میں دیکھا۔ صاف ستاروں بھرا آسمان تھا۔ لیکن مقیاس الحرارت سے پتہ لگتا تھا کہ صبح کو پالا پڑنے والا ہے۔ اس عرصہ میں ادان کار لیج مالی شہر چلا گیا تھا اور کوئی دوسرا معقول آدمی نہ تھا کہ اُس پر بھروسہ کرتے۔ کھانے کے وقت انہوں نے سوائے صبح کے پالے کے اور کسی چیز کا تذکرہ نہ کیا۔ یہ طے پایا کہ تانیا کو آج رات سونا نہ چاہیئے بلکہ بارہ اور ایک بجے کے درمیان باغ میں ٹہلنا چاہیے اور خبر گیری کرنا چاہیئے کہ ہر چیز ٹھیک ہے یگار خود تین بجے یا اُس سے بھی پیشتر اٹھے گا۔

کورن تمام وقت تانیا کے پاس بیٹھا رہا۔ اور آدھی رات بعد اس کے ہمراہ باغ کو گیا۔ اس وقت سردی تھی۔ تمام باغ میں جلنے کی بو آرہی تھی۔ بڑے باغ میں جو تجارتی باغ کے نام سے مشہور تھا اور جس سے یگار کو صاف ہزاروں کا پڑتا پڑتا۔ ایک گہرا سیاہ کڑوا دھواں تمام زمین پر پھیل رہا تھا۔ اور درختوں کو لپیٹ لپیٹ کر ہزاروں کو بگڑنے سے بچا رہا تھا۔ یہاں پر درخت شطرنجی شکل پر لگے ہوئے تھے۔ یعنی سیدھی اور باقاعدہ قطاروں میں سپاہیوں کی مانند کھڑے تھے۔ اس انتہائی عالمانہ باقاعدگی اور اس حقیقت نے کہ تمام درخت ایک ہی قامت کے تھے جن سب کے تنے اور چوٹیاں بالمشابہ تھیں اُن کو مزمل و مہمل بنا دیا کورن اور تانیا اُن درختوں کے پاس سے جہاں پر گوبر بھوس اور کوڑا کرکٹ جل رہا تھا۔ گزرے اور وقتاً فوقتاً مزدوروں سے ملے جو دھوئیں میں شل بھوت کے دکھائی دیتے۔ درخت جن پر پھول کھلے۔ صرف بیری، چیری اور خاص قسم کے "سیب" کے درخت تھے۔ لیکن تمام باغ دھوئیں میں اٹا ہوا تھا۔ اور صرف پنیر کے پاس ان کو صاف اور تازہ ہوا ملی۔

"اپنے عہد طفولیت میں بھی میں دھوئیں کے مارے چھینکتا"۔ کورن نے اپنے شانوں کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن آج تک یہ راز نہ کھلا کہ کس طرح دھواں پالے کو روک سکتا ہے"۔

"دھواں بادلوں کا کام کرتا ہے جب بادل نہیں ہوتے"۔ تانیا نے جواب دیا۔

"لیکن تمہیں بادلوں کی کیا ضرورت ہے"؟

۱۲۷

"ابر والے دن جب مطلع صاف نہیں ہوتا۔ پالا نہیں پڑتا۔"

"تم ایسا نہ کہو۔"

وہ ہنس پڑا اور اس کا بازو پکڑ لیا۔ اُس کا کشادہ معصوم چہرہ کُہرے سے سرد تھا۔ اس کی نازک سیاہ ابرو اور کوٹ کا الٹا ہوا کالر جس سے اس کو حرکت کرنے میں دقت ہوتی اور تمام نحیف و نازک جثہ اور شبنم آلود دامن نے کورن کو چھوا۔

"ماشاء اللہ! اب تو تم جوان ہو گئیں"، اُس نے کہا "جب میں پچھلی مرتبہ پانچ سال قبل یہاں سے گیا تم ابھی بچہ تھیں تم بہت نازک اور طویل القامت تھیں۔ تمہارے بال تمہارے کاندھوں پر لٹکے رہتے۔ چھوٹا سا کوٹ پہنتی اور میں تمہیں دق کرتا۔ اور تم کو بو تیمار کہا کرتا تھا۔ آہ وقت کیا کچھ گزرتا ہے۔"

"ہاں! پانچ سال"۔ تانیا نے سانس لی "اسوقت سے بہت تغیر ہو گیا ہے۔ اینڈریوشا مجھے صاف صاف تبلاؤ۔ لیکن میں ایسا کیوں پوچھتی ہوں! تم جوان آدمی ہو، عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے ہو تم دراصل کچھ ہو.......... انوکھا بن جانا قدرتی امر ہے۔ لیکن اینڈریوشا چاہے تم کچھ بھی ہو میری التجا ہے کہ تم ہمیں اپنے آدمیوں میں ہی سے سمجھتے رہو۔ ہمیں ایسا کہنے کا حق ہے۔"

"میں خیال کرتا ہوں تانیا۔ اپنی عزت کی قسم۔ ہاں اپنی عزت کی قسم۔"

"تم یہ دیکھ کر آج تعجب میں ہو گے کہ ہمارے یہاں تمہارے کسقدر فوٹو ہیں تمہیں معلوم ہو کہ میرے باپ تمہیں پسند کرتے ہیں۔ بعض اوقات مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمہیں مجھ سے بھی زیادہ چاہتے ہیں۔ وہ تم پر ..... نازاں ہیں۔ تم ہونہار اور نادر المثال آدمی ہو تمہارا مرحلہ زندگی نہایت شاندار و کامیاب ہے۔ میرے باپ کو خیال ہو چلا ہے کہ یہ سب اُن کی تربیت کا ثمرہ ہے۔ میں اُن کے ایسا خیال کرنے میں کبھی مانع نہیں ہوتی۔ اُن کو خیال کرنے دو۔"

صبح کی پو پھٹ چکی تھی۔ اور اُس کی آمد کا اظہار دھوئیں کے غٹ کے غٹ درختوں کے اوپر ہوا میں آویزاں دکھائی پڑنے سے ہو رہا تھا۔

"اب وقت ہے کہ ہم جا کر آرام کریں، کیونکہ سردی بھی کافی ہے۔" تانیا بولی اور کورن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ "اینڈریوشا میں تمہارے قدم رنجہ کرنے پر خوش آمدید کہتی ہوں۔ یہاں پر ہمارے جاننے والے بہت کم ہیں اور محض صورت آشنا۔ ہمارے پاس صرف باغ باغ اور باغ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ گویا جھنڈے اور جھنڈیاں" اور کہتے ہی ہنس پڑی: "پھل پھول۔ بیل بوٹے قلم وغیرہ۔ ہماری تمام زندگی باغ کی نذر ہو گئی۔ مجھے خواب میں بھی سوائے سیب و ناسپاتی کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بلاشبہ یہ اچھی اور عمدہ ہے مگر بعض وقت انسان کی طبیعت تبدیلی کو بھی چاہتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب تم گرمیوں کی بڑی تعطیل میں یا صرف ملاقات کی خاطر یہاں آتے تو تمام گھر بھولا بھولا اور پیارا دکھائی پڑتا تھا۔ گویا معلوم ہوتا تھا کہ تمام ساز و سامان میز کرسی وغیرہ سے غلاف اُتار لئے گئے ہیں اور چمک دمک آ گئی۔ میں تب ایک چھوٹی لڑکی تھی۔ لیکن پھر بھی اس تبدیلی کو محسوس کرتی۔"

وہ دیر تک گفتگو کرتی رہی اور متاثر معلوم ہوتی تھی۔ کچھ وجوہ کے باعث اینڈریوشا کے دماغ میں گذرا کہ وہ اِس تعطیل کے عرصہ میں اس چھوٹی۔ کمزور اور باتونی بلبل کا گرویدہ بن جائیگا۔ اور کیا عجب ہے کہ کشش قلبی سے اس پر وارفتہ و مفتوں ہو جائے۔ کیونکہ موجودہ حالت میں ایسا ہو جانا بعینہ مقتضائے قدرت تھا۔ اِس خیال نے اس کے دل پہ چوٹ کی اور وہ محظوظ ہوا وہ اپنی پیاری محسنہ کے چہرے کی طرف جھکا اور گنگنانے لگا

"میں تم سے اپنی محبت کو نہیں چھپاؤنگا۔ سُن لو میں تمہارا وارفتہ ہوں۔"

اسوقت وہ گھر پہنچ گئے۔ یگار خواب سے بیدار ہو گیا تھا۔ اسے نیند نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بڈھے سے باتیں کرتا ہوا باغ چلا گیا۔ یگار بلند قامت۔ چوڑے چکلے جسم کا قوی جُثہ آدمی تھا۔ اگرچہ اُسے ضیق النفس کی بیماری تھی۔ پھر بھی وہ اسقدر تیزی سے چلتا کہ اس کے پیچھے پیچھے چلنا بھی سخت محنت کا کام تھا۔ وہ بیحد مغنول الطبع انسان تھا وہ ہمیشہ تعجیل میں رہتا۔ اور ایسا ظاہر ہوتا کہ اگر ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوئی تو تمام کام خراب ہو جائے گا۔

"بھائی! یہاں کام کرنا ہے"۔ وہ کہنے لگا جب وہ سانس لینے کے لئے ٹھہرا۔

"زمین کی سطح پر جیسا کہ تم دیکھتے ہو۔ پالا ہی پالا ہے۔ لیکن اگر تم مقیاس الحرارت کو بانس کے ذریعہ ۱۴ فیٹ اونچا کرو تو معلوم ہوگا کہ اوپر فضا گرم ہے۔" "ایسا آخر کیوں ہے"

"میں نہیں جانتا"۔ کورن نے جواب دیا اور ہنس پڑا۔

"ہاں بیشک آدمی ہر ایک بات نہیں جان سکتا۔ عقل انسانی چاہے کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ ہر شے کے لئے اس میں جگہ ہونا محال ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم ابھی تک فلسفہ کی تحقیق و تدقیق میں مصروف ہو۔"

"جی ہاں میں علم معرفت النفس کی تعلیم دیتا ہوں۔ میں عام فلسفہ میں بھی تحقیق کر رہا ہوں"

"اور اس سے تم گھبراتے نہیں؟"

"برخلاف اس کے یہی وہ شے ہے جس کی خاطر میں زندہ ہوں۔"

"تو خدا اپنا رحم کرے"۔ یگار نے تخیل میں محو ہو کر اپنی سفید مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا۔ "خدا اپنا رحم کرے"۔ میں تم سے خوش ہوں........ بہت خوش میرے عزیز لیکن فوراً ہی وہ کچھ ہنسا اور ڈراونی شکل بنا کر دوڑا اور درختوں کے پیچھے جا کر دھوئیں میں چھپ گیا۔

"کس نے اس گھوڑے کو سیب کے درخت سے باندھا!؟" کورن نے اس کی امید شکن و لخراش آواز کو سنا۔ "وہ کون بیوقوف گدھا ہے جس نے اس گھوڑے کو سیب کے درخت سے باندھنے کی جرأت کی؟ الامان۔ الحفیظ۔ انہوں نے تمام چیزوں کو تباہ کر دیا۔ برباد کر دیا۔ انہوں نے تمام کا ستیاناس لگا دیا، تمام کو ملیا میٹ کر دیا۔ باغچہ ختم ہو گیا۔ اُجڑ گیا۔ یا اللہ!"

جب وہ کورن کے پاس آیا اُس کا چہرہ فسردہ و پژمردہ تھا۔

"ان بدبختوں کا کوئی کیا کر سکتا ہے"؟ اس نے رونے والی آواز میں ہاتھوں کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "اسٹیپو یکارات کو گوبر سمیٹ رہا تھا۔ اسی نے گھوڑے کو سیب کے درخت سے باندھا ہوگا اسی نمک حرام نے اسکو درخت کے گرد خوب مضبوطی سے باندھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ چھال کم و بیش تین جگہ سے چھل گئی۔ تمہارا اس کی بابت کیا خیال ہے۔ میں نے اس سے کہا اور وہ خاموش بُت کی طرح کھڑا رہا اور صرف اپنی آنکھوں کو ٹمٹماتا رہا ایسے کو پھانسی بہتر ہے۔"

پھر ذرا خاموش ہو کر وہ کورن سے چمٹ گیا اور اس کے رخساروں پر بوسہ دیا۔

"اچھا۔ خدا تم پر مہربانی کرے.......... خدا فضل کرے......" اس نے کہا۔

"میں بہت خوش ہوں کہ تم آ گئے۔ میری خوشی اندازہ بیان سے باہر ہے...... میں تمہارا متشکر ہوں۔"

تب پھر اُسی تیز رفتاری و مجنونانہ حالت سے اُس نے تمام باغ میں چکر لگایا۔ اور اپنے سابق کے لے پالک کو سبز باغ۔ گرم مکان۔ آراستہ باغ اور دوخانہ باغ جن کو وہ صدی کا مجوبہ خیال کرتا تھا دکھائے۔

جبکہ وہ ٹہل رہے تھے۔ آفتاب نمودار ہوا اور تمام باغ سُنہری تیز روشنی سے پُر ہو گیا۔ کچھ گرمی بھی ہو چلی تو ٹہل۔ روشن اور بہجت آمیز دن کو دیکھ کر کورن نے اندازہ کیا کہ مئی کا مہینہ شروع ہو گیا۔ اب اس کے سامنے تمام گرم موسم خوش خوش و طویل تھا۔ کہ یکایک اس کے سینہ میں طمانیت آمیز و جذبہ انگیز خیالات اُبھنے لگے۔ جن کو وہ کبھی پیشتر بھی بچپن میں تجربہ کر چکا تھا۔ جب وہ اس باغ میں کھیلا کرتا تھا۔ وہ بڈھے کو چمٹ گیا اور جوش کے ساتھ پیار کیا۔ وہ دونوں متاثر ہو کر مکان کے اندر چلے گئے۔ اور پُرانی طرز کے چینی کے پیالوں میں چائے نوش کی جس میں بالائی بھی تھی۔ اور دودھ وانڈوں کی ساختہ ٹکیوں کو کھایا۔ ان واقعات نے اس کے بچپن اور لڑکپن کی یاد کو تازہ کر دیا۔ موجودہ مرفہ حالی عہد ماضیہ کے خیالات سے جو اس کے دماغ میں اُٹھ رہے تھے گھل مل گئی۔ اس کے دل میں سختی سی معلوم ہوئی لیکن پھر بھی وہ خوش و خرم نظر آیا۔

وہ تانیا کے بیدار ہونے تک انتظار کرتا رہا۔ اس کے ساتھ قہوہ استعمال کیا۔ ٹہلنے کے لئے چلا گیا۔ اور پھر واپس آکر اپنے کمرہ میں کام میں مشغول ہو گیا۔ اُسے غور و خوض سے مطالعہ۔ اور کچھ اخذ بھی کیا۔ کبھی اپنی نگاہ کھلی ہوئی کھڑکی پر یا تازہ اور اُس سے لدے ہوئے گلدستہ کے پھولوں پر جو میز پر تھا ڈالی۔ اور پھر کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہو گیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس کے جسم کی رگ رگ خوشی سے تڑپ اور اُچھل رہی ہے۔

(۲)

گاؤں میں بھی اس کی زندگی ایسی ہی بےچینی و پریشانی میں تھی جیسی کہ شہر میں۔ وہ بکثرت پڑھتا اور لکھتا تھا۔ اس نے اطالوی زبان کو سیکھا۔ اور جب وہ سیر کے واسطے باہر جاتا۔ وہ خیال کر کے محظوظ ہوتا کہ پھر کام میں مصروف ہو جائے گا۔ وہ اسقدر کم سوتا تھا۔ کہ ہر ایک کو حیرت تھی۔ اور اگر اتفاقاً کبھی آدھ گھنٹے کے لئے بھی وہ دن میں سو جاتا۔ تو تمام رات جاگتا رہتا۔ اور بغیر کسی خواب کے وہ تازہ دم اور توانا اور تندرست معلوم ہوتا۔ گویا کوئی چیز واقع ہی نہ ہوئی تھی۔

وہ بہت باتونی تھا۔ شراب استعمال کرتا اور قیمتی سگار پیتا۔ اکثر اور قریب ہر روز نوجوان عورتیں پاس پڑوس کی رہنے والی۔ پسوتسکی کے مکان پر آتیں۔ اور تانیا کے ہمراہ گاتی اور پیانو بجاتی تھیں۔ بعض اوقات ایک نوجوان ہمسایہ بھی جو بہت اچھا سا زندہ تھا۔ آیا کرتا۔ کورن گانے اور باجے کو بہت شوق سے سنتا۔ کہ اُس سے تھک جاتا۔ جس کا اظہار اس کی آنکھوں کے بند ہو جانے اور سر کے ایک طرف کو جھک جانے سے ہوتا۔

ایک روز شام کے وقت چائے کے بعد وہ بالاخانہ پر بیٹھا ہوا پڑھ رہا تھا۔ اُسی وقت آرام گاہ میں تانیا اور ایک اور نوجوان عورت اور وہ اجنبی اپنے اپنے باجے لئے برگا کی مشہور عوام غزلیں گا رہے تھے۔ کورن نے لفظوں کو سنا۔ اور چونکہ وہ روسی نہ تھے اس کے معنی سمجھنے سے قاصر تھا۔ بالآخر اپنی کتاب کو چھوڑ کر اور غور سے سننے پر وہ اس کے مفہوم کو سمجھا۔ خیالات پریشان سے پُر ایک دوشیزہ نے ایک رات اپنے باغ میں عجیب عجیب آوازیں سنیں۔ ایسی انوکھی اور پیاری کہ اُس نے تصور کیا۔ وہ بہشتی راگنیاں ہیں جو ہم انسان فانی کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اور پھر واپس بہشت بریں کو چلی جاتی ہیں۔ کورن کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کمرہ طعام و آرام گاہ میں ادھر اُدھر پریشانی کے عالم میں گھومنے لگا۔ جب گانا ختم ہوا۔ اُس نے تانیا کا ہاتھ پکڑا اور اوپر بالاخانہ پر چلا گیا۔

"میں تمام دن ایک اسطورہ کی[1] دھیڑبن میں لگا رہا" اس نے کہا۔ "مجھے یاد نہیں کہ آیا میں نے اسکو کہیں پڑھا ہے یا سنا ہے۔ لیکن یہ ایک انوکھی اور عجیب کہانی ہے۔ کہنے کے لئے یہ کسی قدر غیر دلچسپ بھی ہے۔ ہزار برس ہوئے ایک راہب سیاہ پوش صحرا میں گھومتا پھرتا تھا عرب یا شام میں کہیں پر اس کے جائے قیام سے کچھ میل دور ایک مچھیارے نے کسی دوسرے سیاہ پوش راہب کو دیکھا۔ جو ایک جھیل کی سطح آب پر آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ یہ دوسرا راہب محض واہمہ تھا۔ اب تم علم العین کے تمام اصولوں کو خیرباد کہدو جن کی منانتوں کے سامنے کوئی اصلیت نہیں اور باقی کو سنو۔ اس انعکاس سے دوسرا پیکر پیدا ہوا تب دوسرے سے تیسرا۔ حتیٰ کہ کرۂ باد کے ایک پرتو سے دوسرے تک تمام میں لاتعداد پیکر نمودار ہوگئے اگر ایک وقت وہ افریقہ میں نظر آیا تو دوسرے لمحہ اسپین اٹلی اور پھر شمال بعید میں...... بعدہٗ وہ کرۂ باد سے چلا گیا۔ اور اب تمام عالم میں گھومتا پھرتا ہے۔ ہنوز وہ ایسی صورت میں کبھی دکھلائی نہیں پڑتا کہ جس میں معدوم ہو جائے۔ بہت ممکن ہے اب وہ مریخ میں یا جنوبی ستارہ میں نظر آئے۔ لیکن میری پیاری اصل نکتہ جس پر تمام قصہ کا انحصار ہے اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اُس وقت سے ٹھیک ہزار سال بعد جبکہ راہب صحرا میں گام زن تھا۔ اس کا واہمہ زمین کے کرۂ باد کی طرف بازگشت کرے گا۔ اور لوگوں پر ظاہر ہوگا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ مدت ختم ہونے پر آگئی۔ روایت کے مطابق ہم سیاہ پوش راہب کو آجکل میں دیکھیں گے۔"

"ایک عجیب پیکر" تانیا نے کہا جو اس خرافات کو پسند نہ کرتی تھی۔

"لیکن اس تمام حکایت کا سب سے زیادہ حیرت افزا حصہ یہ ہے۔ کہ میں قطعی خیال نہیں کر سکتا کہ مجھے یہ اسطورہ کیسے معلوم ہوا" کورن نے ہنسکر کہا۔ "کیا میں نے اس کو کہیں پڑھا ہے؟ کیا میں نے سُنا ہے؟ یا میں نے شاید سیاہ پوش کے متعلق خواب دیکھا۔ میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ مجھے یاد نہیں لیکن قصے میں دل بستگی ہے۔ میں تمام دن اسی کے متعلق غور کرتا رہا ہوں۔"

تانیا کو مہمانوں کی خاطر مدارات کے لئے جانے دیا مگر خود مکان کے باہر آیا اور فکر میں غلطاں پھولوں کے تختوں کے پاس گیا۔ آفتاب قریب غروب تھا۔ پھولوں کو ابھی پانی دیا گیا تھا۔ اُن سے ایک قسم کی مرطوب و پریشان کُن بو نکل رہی تھی۔ مکان کے اندر انہوں نے پھر گانا شروع کیا اور فاصلہ پر ساز کی آواز آدمی کی آواز کے مشابہ تھی۔ کورن نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا کہ کہاں اس نے اسطورہ کو سنا یا پڑھا تھا آہستہ آہستہ پارک کی طرف مڑا اور عالم بیخودی میں دریا کے کنارے تک پہنچ گیا۔ ایک تنگ راستہ سے جو ڈھلوان کنارے کے پاس پاس ننگی جڑوں میں سے گیا تھا وہ دریا کے پانی تک چلا گیا۔ قرقروں کو چھیڑا اور دو بطخوں کو ڈرا دیا۔ سورج کی آخری کرنیں اپنی روشنی ابھی تک خاموش و مغموم صنوبروں پر پھینک رہی تھیں۔ مگر سطح دریا پر بالکل اندھیرا تھا۔ کورن تنگ پل پر سے اُتر کر دوسری طرف چلا گیا۔ اب اس کے محاذ میں رائی کا ایک بڑا کھیت تھا جس پر ابھی پھول نہ آیا تھا۔ اسوقت وہاں کسی متنفس یا جاندار کا دور تک پتہ نہ تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ تنگ گلی اگر اُس میں سے کوئی جائے اُس کو ایک غیر معلوم دیر اسرار جگہ میں لے جائیگی جہاں پر ابھی سورج غروب ہوا تھا اور جہاں پر شفق بہت شان و شوکت سے درخشندہ تھی"

[1] Mythology.

پژمردہ اور آہ وزاری سے پریشان چہرہ کو دیکھا۔

"فی الحقیقت معاملہ ایسا اہم ہے۔ افسوس افسوس"

"لیکن اگر تمہیں معلوم ہو کہ وہ کس طرح مجھے ایذا دیتے ہیں" وہ بولی اور بڑے بڑے گرم آنسوؤں کی رو اوراس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بہ نکلی "وہ مجھے موت کی حد تک تکلیف دیتے ہیں۔" وہ ہاتھوں کو بے چینی سے ملتے ہوئے کہتی رہی "میں نے اُن سے کچھ بھی نہ کہا تھا .... کچھ نہیں .... میں نے صرف یہ کہا کہ ...... اسقدر مزدوروں کے رکھنے کی کچھ ضرورت نہیں .... جبکہ ہم بوقت ضرورت اُن کو یومیہ اُجرت پر ملازم رکھ سکتے ہیں۔ تمہیں معلوم .... تم جانتے ہو کہ ان مزدوروں نے تمام ہفتہ کچھ کام نہیں کیا .... میں ..... میں نے .... صرف یہ کہا اور وہ چلا پڑے اور مجھے طرح طرح کے نام رکھنے لگے .... آخر کس واسطے؟

"ہاں۔ ہاں" کورن نے اس کے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا "تم ہر ایک سے لڑ چکی ہو۔ رو چکی ہو۔ اور یہ کافی ہے۔ تم کو زیادہ عرصہ تک ناراض نہ رہنا چاہئے۔ یہ غلطی ہے .... کیونکہ وہ تمہیں سب سے زیادہ چاہتے ہیں" "انہوں .... اُنہوں نے میری تمام زندگی کو برباد کر دیا" تانیا نے سسکی لیتے ہوئے کہا "میرے نصیب میں سوائے گالی ..... اور گلوج کے اور کچھ نہیں، اُن کا خیال ہے کہ میں بیکار محض ہوں۔ ہاں وہ صحیح فرماتے ہیں۔ میں کل چلی جاؤں گی۔ اور تار گھر میں ملازم ہو جاؤں گی مجھے پروا نہیں ..... "

آؤ۔ آؤ۔ آؤ .... تانیا روؤ نہیں۔ پیاری روؤ مت .... تم مغلوب الغضب اور زود رنج۔ اس کا الزام تمہارے سر ہے۔ آؤ میں تمہاری صلح کرا دوں"

کورن محبت آمیز اور اطمینان بخش لہجہ میں گفتگو کرتا رہا جبکہ وہ روتی رہی اور اپنے ہاتھوں کو ملتی اور کندھوں کو مٹکاتی رہی گویا کوئی آفت ناگہانی نازل ہو گئی تھی۔ کورن کو زیادہ افسوس اس وجہ سے بھی تھا۔ کہ تانیا کا رنج زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ بہت تکلیف میں تھی کیسی معمولی باتیں اس چھوٹی سی مخلوق خدا کو تمام تمام دن بلکہ شاید تمام عمر رنجیدہ و غمگین بنا دینے کے لئے کافی تھیں! تانیا کو تسلی دے کر کورن نے خیال کیا۔ کہ یہ لڑکی اور اس کا باپ ایسے لوگ چاہے میں تمام عالم میں تلاش کروں مجھ کو نہ مل سکیں گے۔ جو مجھ سے مثل اپنے بچے کے محبت کریں۔ اور اپنا رشتہ دار جانیں۔ یہ صرف ان ہی دونوں کی بدولت ہے ورنہ اپنے ماں باپ کی عالم طفولیت میں وفات پر مجھ کو آخری دن تک پتہ نہ چلتا کہ اصلی محبت پاک و بے عیب محبت جو صرف خون میں ہی جوش مارتی ہے کیا ہے" اور اب اس کو معلوم ہوا کہ اس رونے والی۔ کپکپانے والی لڑکی کی نبضیں اس کی خود کی کسی قدر مضمحل و سخت نبضوں کا مقابلہ کر رہی تھیں، اور وہی کیفیت تھی جو لوہے کے ایک ٹکڑے کی مقناطیس کے سامنے ہوتی ہے۔ وہ کبھی بھی کسی فربہ توانا اور بشاش عورت سے محبت نہ کرتا۔ لیکن اس زرد رو کمزور اور ملول تانیا نے اُس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے اس کے کندھوں اور بالوں کو تھپکنا اپنے ہاتھوں کو دبانا۔ اور آنسوؤں کو پونچھنا شروع کیا ...... آخر کار اس نے بھی رونا بند کر دیا وہ بہت دیر تک اپنے باپ اور اپنی سخت و ناقابل برداشت زندگی کی شکایت کرتی رہی اور کورن سے التجا کی کہ وہ اس کی جگہ رکھ کر دیکھے۔ تب وہ آہستہ آہستہ ہنسی اور افسوس کرنے لگی۔ کہ خدا نے اسکو ایسا بد مزاج پیدا کیا ہے۔ آخر الامر زور سے قہقہہ لگا کر وہ اپنے آپ کو بیوقوف کہتی ہوئی کمرے کے باہر بھاگ گئی۔

جب کچھ دیر بعد کورن باغ میں گیا۔ یگار اور تانیا ساتھ ساتھ ایک روش کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ دونوں رائی کی روٹی نمک سے کھا رہے تھے اور بہت بھوکے تھے۔

(۵)

اپنے صلحکارانہ مقصد کی کامیابی پر خوش خوش کورن پارک میں گیا۔ وہ باغ میں ایک چوکی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا اس نے ایک گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ اور کسی عورت کے ہنسنے کی آواز سُنی۔ ملنے والے آرہے تھے۔ جب باغ میں شام کی تاریکی نمودار ہونے لگی۔ رباب اور گانے کی آواز اس کو صاف صاف آنے لگی جس نے راہب سیاہ پوش کی یاد تازہ کر دی۔ کس خطۂ زمین یا کس سیارہ میں وہ فریب نظر گھوم رہا ہوگا بمشکل ابھی یہ بات اس کے دماغ میں گزری اور اس نے سیاہ بھوت کا جس کو رائی کے کھیت میں دیکھا تھا خیال کیا کہ سامنے میں صنوبر کے درخت کے پیچھے سے ایک شخص میانہ قد کا سفید ڈاڑھی رکھے ہوئے بغیر کسی حرکت و شور کے خاموشی سے ہمہ تن سیاہ پوش اور شکل فقیر کے برہنہ پا اس کے سامنے آموجود ہوا، اس کی سیاہ بھویں اس کے زرد اور مردہ چہرے پر نمایاں تھیں۔ تلطفانہ انداز سے سر کو ہلاتے ہوئے وہ فقیر یا مجاہد چپکے چپکے اُس جگہ آیا اور بیٹھ گیا۔ کورن نے اس کو سیاہ پوش راہب سمجھ لیا۔

ایک منٹ تک وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کورن تعجب سے اور راہب محبت و قدرے انداز تجاہل عارفانہ سے گویا وہ خود کسی چیز پر غور کر رہا تھا۔

"لیکن تم واہمہ ہو" کورن نے کہا۔ "تم یہاں کیوں ہو اور کس لئے خاموش بیٹھے ہو۔ یہ اسطورہ کی حقیقت کے بالکل خلاف ہے"

"کچھ پروا نہیں" راہب نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ مگر اپنا رخ اُس کی طرف نہ کیا۔ "حکایت۔ واہمہ اور میں سب کچھ تمہارے ہی جوشیلے دماغ کا نتیجہ ہوں میں تو ایک ہیولیٰ ہوں"

"اچھا تو کیا تمہاری کچھ اصلیت نہیں؟" کورن نے پوچھا۔

"جیسا چاہو تم خیال کر سکتے ہو" راہب نے کسیقدر ہنستے ہوئے جواب دیا۔ میں تمہارے ذہن میں قایم ہوں اور تمہارا ذہن بھی قدرت کا ایک جزو ہے۔ اس لئے میرا قیام احاطۂ قدرت سے باہر نہیں"

"تمہارا چہرہ ضعیف مگر حسین اور نہایت اثر انداز ہے اور ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ گویا تم ہزارہا برس سے زندہ ہو" کورن نے کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ میرا ذہن ایسا پیکر پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن تم مجھے اسقدر غور سے کیوں دیکھتے ہو؟ کیا تم مجھے پسند کرتے ہو؟"

"ہاں تم اُن چند میں سے ایک ہو جن کو صحیح طور پر خدا کا پسندیدہ کہا جاتا ہے۔ تم ابدی صداقت کا اظہار کر رہے ہو۔ تمہارے خیال، تمہارے منصوبے، تمہارا غیر معمولی مطالعہ جس میں تم مصروف ہو اور تمام تمہاری زندگی پر خدائی اور الہٰی مہر ہے۔ کیونکہ وہ نور الہیت سے منور و ممتاز ہیں"

"تم کہتے ہو ابدی صداقت؟ ...... لیکن کیا ابدی صداقت انسان کے قبضۂ قدرت میں ہے یا یہ اس کے لئے مفید ہو سکتی ہے جبکہ لطف یہ ہے کہ کوئی ابدی زندگی ہی نہیں؟"

"ابدی زندگی ضرور ہے" راہب نے جواب دیا۔

"کیا تم انسان کے بقائے دوام پر یقین رکھتے ہو؟"

"ہاں، بیشک۔ تم انسانوں کے لئے ایک عظیم شاندار مستقبل ذخیرۂ قدرت میں ہے اور تم ایسے آدمیوں کی جسقدر زیادہ تعداد زمین پر ہوگی اتنی ہی جلد یہ مستقبل حاصل

ہو سکتا ہے۔ بغیر تمہارے جو کہ اعلیٰ اصول زندگی پر پابند اور پوری طرح آزاد و فہیم و عاقل ہو۔ انسان کی کوئی شخصیت نہیں۔ اس دنیاوی تاریخ کے ختم ہونے میں ابھی زمانہ ہے۔ تم ہزارہا برس ابدی صداقت کی سلطنت میں رہکر بسر کروگے۔ اور وہاں تمہاری سچی قیمت معلوم ہوگی۔ تم خدا کی مہربانیوں کا جو انسان پر نازل ہوتی ہیں ایک اوتار ہو۔"

"اور ابدی زندگی کا مقصد کیا ہے؟" کورن نے دریافت کیا۔

"جیسا کہ اس تمام زندگی کا یعنی ...... خوشی و شادمانی ...... اصلی مسرت علم میں حاصل ہوتی ہے اور ابدی زندگی مہیا کرتی ہے بیشمار لاتعداد ذرائع علم کے۔ اور اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ "میرے خداوند کے محل میں بہت سے مکان ہیں۔"

"کاش تمہیں اندازہ ہو کہ تمہاری باتوں کو سننا کیسا اچھا ہے۔" کورن نے اطمینان سے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے کہا

"میں بہت خوش ہوں۔"

"لیکن میں جانتا ہوں کہ جب تم چلے جاؤ گے میں تمہاری حقیقت کے سوالات سے پریشان ہو جاؤں گا۔ تم ایک واہمہ ہو ایک خیالی پیکر گویا میری دماغی کمزوری ہے جو اعتدال پر نہیں۔"

"کیا ہوا اگر تم ایسے ہو! کیوں اپنے کو پریشانی میں ڈالتے ہو؟ تم علیل ہو کیونکہ تم نے بکثرت کام کیا ہے تم نے اپنے کو وقف کر دیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے اپنی تندرستی و صحت کو خیالات کے لئے قربان کر دیا ہے۔ اور وہ زمانہ قریب ہے جب تم اپنی زندگی ان کی نذر کر دوگے۔ اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے؟ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے تمام صالح و سعید طبائع کوشش کرتی ہیں۔"

"اگر مجھے پتہ چلے کہ میرے دماغ پر اثر ہوا تو کیا میں اپنے پر اعتبار کر سکتا ہوں۔"

"اور کیا تمہیں یقین ہے کہ اعلیٰ دماغ رکھنے والے لوگ جن پر سب بھروسہ کرتے ہیں خیالی پیکر کبھی نہیں دیکھتے؟ عالموں کا قول ہے کہ عبقریت (اعلیٰ دماغی) دیوانگی سے متصل ہے۔ میرے دوست معتدل آدمی معمولی انسان ہے زیادتی عمر کے باعث کمزوری۔ بدنی زوال وانحطاط وغیرہ صرف انہی لوگوں کو زیادہ پریشان کرتے ہیں جن کی نگاہ میں زندگی کا مقصد اولین معمولی آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرنا ہے۔"

"مگر اہل روم کا مقولہ ہے: "عمدہ دماغ عمدہ جسم میں۔"

"ہاں مگر یہ ضرور نہیں کہ ہر وہ چیز جو یونانیوں یا رومیوں نے سکھلائی ہو صحیح ہو بلندی و عظمت۔ جوش اور فکر۔ تمام وہ خیال جو پیغمبروں شاعروں اور شہیدوں کو دوسرے معمولی لوگوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ انسان کی قوت حیوانی اور جسمانی فربہی کے مقابلہ میں پس پشت ڈالدئے جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر تم تندرست و مضبوط ہونا چاہتے ہو تو معمولی آدمیوں کی زندگی میں شرکت کرو۔"

"تعجب ہے تم بھی وہی کہتے ہو جو اکثر میرے دماغ میں آیا ہے۔" کورن نے کہا "اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تم نے میرے رازہائے سربستہ کو سنا یا دیکھا ہے لیکن ہمیں ان جزئی چیزوں کے متعلق گفتگو ختم کرنی چاہیئے۔ تمہارا ابدی صداقت سے کیا مطلب ہے؟"

راہب نے کچھ جواب نہ دیا۔ کورن نے اس کی طرف دیکھا مگر اس کے چہرے کو نہ دیکھ سکا اس کی شکل و شباہت مٹتی گئی۔ تب اس کے ہاتھ اور پیر غائب ہوئے۔ اس کا جسم شفق میں پوشیدہ ہوتا گیا۔ اور وہ بالکل معدوم ہو گیا۔ "شکل خیالی کافور ہو گئی"، کورن نے سوچا اور ہنسا "بڑی حیرت ہے"، وہ مکان کو واپس گیا۔ اب اس کی طبیعت میں ہلکا پن تھا اور وہ مسرور تھا۔ تھوڑا سا جو راہب نے اس کے متعلق اظہار رائے کیا اس نے نہ صرف اس کے جسم کو بلکہ اس کی تمام روح کو اور اس کی کل ہستی کو توصیف سے بھر دیا۔ منتخب لوگوں میں سے ہونا حقیقی صداقت کا اظہار کرنا ان لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونا جو مخلوق کو ہزاروں برس پیشتر خدا کی سلطنت کے قابل و اہل بنا دیں۔ اور انسان کو ایک غیر ضروری ہزاروں برس کی محنت گناہ و معصیت سے آزاد کرنا۔ خیال کے پیچھے ہر ایک چیز جوانی۔ طاقت و تندرستی کو قربان کر دینا۔ اور مفاد عامہ کے لئے مرنے کے واسطے تیار رہنا۔ اصل کے ساتھ خوش آئند و روح پرور خیال ہے! اس نے اپنے خالص پاک عفیف و محنت کے گذشتہ عہد کو یاد کیا اس کو یاد آیا کہ اس نے خود کیا سیکھا تھا اور دوسروں کو کیا بتایا تھا۔ اور نتیجہ پر پہنچا کہ راہب کے لفظوں میں ذرا بھی مبالغہ نہ تھا۔

اس وقت تانیا اس سے ملنے کے لئے پارک میں آئی۔ اب وہ ایک دوسرا لباس زیب تن کئے ہوئے تھی: "کیا تم یہاں ہو؟" اس نے پوچھا: "اور ہم تمہارا انتظار .... انتظار کر رہے ہیں۔ تمہارا مزاج کیسا ہے؟"

اس نے کورن کے روشن کیفیات سے پر بشرہ اور آنسوؤں سے ڈبڈباتی آنکھوں کو دیکھ کر پوچھا۔ "اینڈریوشا تم کسی قدر تبدیل معلوم ہوتے ہو؟"

"میں محظوظ ہوں تانیا" کورن نے اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ کر کہا: "میں محظوظ سے بھی زیادہ خوش ہوں میں مسرور ہوں تانیا۔ پیاری تانیا۔ تم غیر معمولی اچھی مخلوق ہو پیاری تانیا میں بہت خوش ہوں در اصل میں بہت خوش ہوں۔"

اس نے اشتیاق سے تانیا کے دونوں ہاتھوں کو چوما اور کہا: "میں ابھی ایک وجد انگیز حیرت افزا اور غیر دنیوی حالت میں تھا۔ لیکن میں تم کو زیادہ نہیں بتا سکتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم مجھے پاگل و خبطی خیال کرو گی اور میری بات کا یقین نہ کرو گی۔ مجھے تمہارے متعلق بات چیت کر لی چاہیئے۔ پیاری خوش نصیب تانیا! میں تمہیں پیار کرتا ہوں اور تم پر فدا ہوں۔ تم کو اپنے پاس دیکھنا۔ دن بھر میں دس بارہ مرتبہ ملاقات کرنا میری زندگی کی ضروریات میں داخل ہو گیا ہے۔ میں خیال نہیں کر سکتا کہ کس طرح تمہارے بغیر گذارہ ہوگا جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"آہ!" تانیا ہنسی "تم ہمیں دو ہی دن میں بھول جاؤ گے۔ ہم غریب ہیں اور تم بڑے آدمی ہو۔"

"نہیں۔ نہیں ہمیں سنجیدگی سے بات کرنی چاہیئے۔" اس نے کہا: "تانیا میں تمہیں اپنے ہمراہ لے جاؤں گا۔ ہاں! کیا تم چلو گی! کیا تم میری ہوگی؟"

"آؤ" تانیا بولی۔ اور پھر ہنسنے کی کوشش کی مگر ہنسی نہ آسکی۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ وہ جلد جلد سانس لینے لگی۔ اور بہت تیزی سے گھر کو نہیں بلکہ دور پارک کی طرف چلی گئی۔

"مجھے اس کا خیال نہ تھا .... مجھے اس کا گمان نہ تھا۔" اس نے ناامیدی سے ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہا۔ اور کورن نے اس کا پیچھا کیا اور اسی سرخ و جوشیلے چہرے کی حالت میں بولتا گیا۔

"میں صرف محبت چاہتا ہوں جو مجھے تسخیر کرلے اور وہ محبت تانیا تمہاری طرف سے ہوسکتی ہے۔ میں مسرور ہوں میں محظوظ ہوں"

وہ پریشان ہوگئی سکڑنے لگی اور یکایک دس سال زیادہ عمر میں بڑی معلوم ہونے لگی مگر کورن نے اس کو حسین و دلکش خیال کیا اور پرجوش طریقہ پر اپنی مہر و محبت کا اظہار کیا "تم کسقدر حسین ہو"

(۶)

کورن سے یہ معلوم ہوکر کہ نہ صرف سلسلۂ محبت ہی قایم ہوا ہے بلکہ عنقریب شادی بھی ہوگی نگار کمرے میں ادہر سے اُدہر بہت دیر تک گھومتا رہا اور اپنے ہیجان کو چھپانے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے اس کی گردن سوجی اور زرد پڑگئی۔ اُس نے فوراً اپنی دوڑ کی گھوڑی منگائی اور سوار ہوکر کسی طرف کو چل دیا۔ تانیا یہ دیکھ کر کہ کس طرح اُس نے گھوڑی کے کوڑے جمائے اور کس طرح ٹوپی سر پر منڈھی۔ تاڑ گئی کہ اُس کے خیالات کیا ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں بند ہوگئی اور دن بھر روتی رہی۔

گرم گھر میں شفتالو اور بیر پک چکے تھے۔ ان نازک اور رسیلے پھلوں کے ماس کو بھیجنے کے لیے باندھنے اور رکھنے میں بہت ہوشیاری سے کام کرنا اور مصیبت اُٹھانی پڑتی تھی۔ کیونکہ گرمی کا موسم بہت گرم اور خشک تھا۔ یہ ضروری تھا کہ ہر درخت کو پانی دیا جائے اور اس طرح بہت وقت صرف ہوتا اور کافی محنت درکار تھی۔ اب بہت سی تتلیاں پیدا ہوگئیں جن کو کورن کی پریشانی کے باوجود بھی مزدوروں نے اور خود نگار تانیا نے مسل مسل دیا۔ علاوہ بریں اُن کو موسم خزاں کے پھلوں اور قلموں کے بہت سے آرڈر درج رجسٹر کرنے ہوتے اور خط و کتابت کرنی پڑتی تھی۔ مشغولیت کے اس عالم میں جبکہ کسی کے پاس ایک لمحہ فرصت کا نہ تھا کھیت کے کام پر باغ کے آدھے سے زیادہ مزدور چلے گئے۔ نگار دھوپ سے جھلسا ہوا خستہ و چڑچڑا کھیت سے باغ اور باغ سے کھیت گھوڑے پر سوار دوڑتا پھرتا چلاتا کہ اس کا بدن بکھرا جاتا ہے اور خیال کرتا کہ گولی اپنے سر میں مار لے۔

اب دان جہیز کے بارے میں جس کو پسونکی بہت اہمیت دیتا تھا پریشانی و جنجال پھیل گیا قینچی کی آواز مشین کی حرکت گرم لوہے کی بو اور درزن کے توہمات سے جو ایک بد دماغ اور چڑچڑی عورت تھی ہر شخص پریشان تھا اس پر طرہ یہ کہ ملاقاتی ہر روز آتے جن کی خاطر و مدارات کی جاتی۔ بعض وقت رات کو ٹھہرایا بھی جاتا لیکن یہ تمام مصروفیت چپکے چپکے ختم ہوگئی۔ گویا کبھی پیش ہی نہ آئی تھی۔

تانیا نے محسوس کیا کہ محبت و مسرت نے عالم بیخبری میں اس کو لبریز کردیا اگرچہ بقدر ضرور قرائن سے جب اس کی عمر ۱۴ برس کی ہوئی۔ اس کو یقین ہو چلا تھا کہ کورن اس سے ہی شادی کرے گا اور کسی دوسری لڑکی سے نہیں وہ حیران تھی۔ سمجھنے سے قاصر اور اپنے غیر متیقن۔ کسی وقت ان خوشیوں سے پریشان ہوکر وہ متمنی ہوئی کہ بادلوں میں اُڑ جائے اور وہاں کے خدا کی عبادت کرے۔ کبھی اُسے خیال آتا کہ اگست کے مہینہ وہ اپنے پیارے باپ کے گھر کو خیرباد کہے گی یا خدا جانے اسکو کیا خیال گذرتا کہ وہ ناکارہ بے حقیقت اور ناچیز ہے اور کورن ایسے لائق آدمی کے ناقابل۔ وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی دروازہ مقفل کرلیتی اور گھنٹوں زار و قطار روتی۔ اور جب ملاقاتی جمع ہوتے وہ یکایک سوچنے لگتی کہ کورن غیر معمولی طور پر حسین ہے۔ اور تمام عورتیں اُس سے محبت کرتی ہیں۔ اور اس سے رشک اس کی روح فخر و طمانیت سے بھر جاتی گویا اس نے دنیا کو فتح کرلیا لیکن جب وہ ذرا بھی کسی نوجوان بیگم سے مودبانہ انداز میں ہنستا۔ تانیا رشک سے کانپنے لگتی اور اپنے کمرے میں جا گھستی اور رونے لگتی۔ ان نئے خیالات نے اُس پر پوری طرح قبضہ جمالیا۔ وہ اپنے باپ کو بلا ارادہ مدد دیتی۔ اور شفتالو تتلی اور مزدوروں کی قطعی پرواہ نہ کرتی اُسے معلوم نہ تھا کہ وقت کس تیزی سے گزر رہا ہے۔

نگار کے لئے یہ بالکل معمولی بات تھی۔ وہ صبح سے رات تک کام کرتا۔ ہر وقت جلدی میں ہوتا۔ کھسیانہ تھا۔ بہت جلد غصہ ہوجاتا۔ لیکن یہ تمام از قسم خواب تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُس میں دو متضاد قوتیں کام کررہی ہیں۔ ایک اصل نگار جو لال پیلا ہوجاتا۔ اور ناامیدی میں اپنی مٹھی بند کرلیتا۔ جب اُسے آدان مالی سے کسی بد احتیاطی یا بے عنوانی کا پتہ لگتا۔ اور دوسرا نقلی و مصنوعی نگار جو مخمور تھا اور وسط معاملہ میں بات کو کاٹ دیتا۔ مالی کے کندھے کو ہلاتا اور بڑبڑانے لگتا۔

"تم جو چاہو کہو۔ مگر خون میں جوش ہوتا ہے۔ اس کی ماں عجیب عورت تھی وہ بہت عالی دماغ اور لائق تھی۔ اس کے نیک اور بھولے بھالے چہرے کو دیکھ کر خوشی حاصل ہوتی تھی۔ اس کی شباہت فرشتہ جیسی تھی۔ وہ نظم بھی لکھتی اور پانچ غیر ملکی زبانوں میں ماہر تھی۔ گانے میں مشاق....... مگر غریب و خاکسار وہ سل میں مری خدا کرے اُسے بہشت نصیب ہو"

نقلی نگار نے سانس لی اور تامل کے بعد کہنے لگا۔

"جب وہ لڑکا تھا۔ اور میرے گھر میں پرورش پاتا تھا۔ اس کا چہرہ بھی فرشتہ صفت نیک اور بھولا تھا۔ جب وہ لکھتا۔ بات کرتا یا چلتا پھرتا تھا۔ اپنی ماں کی طرح دلکش اور نازک و نفیس معلوم ہوتا تھا۔ اس کی فہم اس کی ذکاوت و فطنت سے مجھے ہمیشہ تعجب رہا۔ واقعہ ہے کہ وہ یوں ہی ایم۔ اے پاس نہیں ہوگیا! یونہی نہیں! اور ذرا ٹھہرو آدان۔ وہ اب سے دس سال بعد کیا ہوگا؟ وہ ہم سے کہیں بڑا ہوگا؟"

لیکن اس نکتہ پر اصلی نگار اپنی حالت پر عود کر آتا۔ خوفناک چہرہ بنالیتا اپنے سر کو پکڑ لیتا۔ اور چیخ پڑتا: "تو شیطان کے بچے انہوں نے سب کا ستیاناس لگا دیا۔ سب کو برباد کردیا۔ باغ اُجڑ گیا۔ ویران ہوگیا"

کورن اس عرصہ میں اُسی جذبہ و اشتیاق سے کام کرتا رہا۔ اس عام ہیجان و اضطراب کو مطالعہ نہ کیا۔ محبت نے آگ پر اور ایندھن کا کام کیا۔ تانیا سے ہر گفتگو کے بعد وہ اپنے کمرے میں بہت خوش و کامیاب جاتا۔ اپنی کتاب یا کتبوں کو اُسی اشتیاق سے اٹھاتا جس سے اس نے تانیا کو پیار کیا اور اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔

راہب سیاہ پوش کے اظہار رائے نے کہ وہ خدا کا انتخاب۔ ابدی صداقت و مخلوق خدا کے مستقبل کا خیرخواہ تھا۔ اس کے کام میں ایک عجیب و غیر معمولی خصوصیت پیدا کردی۔ اس کی روح کو تفخر و مباہات اور بلند نتائج کی خبر سے پُر کردیا۔ ہر ہفتہ ایک دو مرتبہ پارک میں یا مکان پر سیاہ پوش راہب سے ملاقات ہوجاتی اور دیر تک سلسلۂ گفتگو جاری رہتا لیکن اس سے وہ قطعی خائف نہ ہوا بلکہ برخلاف اس کے اس کو مسرت ہوئی۔ کیونکہ اب اس کو یقین کلی ہوگیا کہ ایسی صورتیں صرف اُن چیدہ ہستیوں کے پاس آتی ہیں، جو اپنے بھائیوں سے بلند درجے پر ہوتے ہیں، اور یکسوئی کی تلاش میں، مستغرق ہوجاتے ہیں۔

ایک دن راہب عین کھانے کے وقت ظاہر ہوا اور کھانے کے کمرے کی کھڑکی میں

بیٹھ گیا۔ کورن بہت فرحاں تھا اور بہت ہوشیاری و باریک نظری سے یگار اور تانیا سے اس بحث کے متعلق جو راہب کی دلچسپی کا بھی موجب ہو گفتگو کرنے لگا۔ سیاہ پوش نے سنا اور تلطف سے سر ہلایا۔ یگار اور تانیا بھی ہنسے مگر ذرا نہ سمجھے کہ کورن ان سے گفتگو کر رہا ہے بلکہ واہمہ سے۔

بی بی مریم کے روزہ کا دن چپکے چپکے آگیا اور اس کے بعد ہی شادی کی تقریب جو یگار کی انتہائی خواہش کے بموجب دو رات دن کی متواتر دھوم دھام دعوتوں کے ساتھ منائی گئی۔ پانچ چھ ہزار روپیہ کی قیمت کا کھانا اور شراب صرف ہوئی۔ لیکن کمبخت کرائے کے باجے۔ غل غپاڑے کی دعوت نوکروں کی آمد و رفت شور و غل اور بھیڑ بھاڑ کے باعث مہمان بیش قیمت شراب اور نفیس نفیس مٹھائیوں کا جو ماسکو سے آئی تھیں پورا پورا حظ نہ اٹھا سکے۔

(۷)

جاڑوں کی ایک لمبی رات کو کورن بستر پر لیٹا فرانسیسی ناول کا مطالعہ کر رہا تھا۔ بچاری غریب تانیا شہر میں رہنے کی وجہ سے جس کی وہ عادی نہ تھی اکثر شام کو درد سر سے بے چین ہو جاتی۔ اب وہ بہت دیر کی سو چکی تھی اور کبھی کبھی خواب میں اس کے منہ سے غیر واضح اور مہمل جملے نکلتے۔

تین بجے کورن نے روشنی خاموش کر دی اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ بہت دیر تک آنکھیں بند کئے لیٹا رہا لیکن سو نہ سکا۔ کیونکہ کمرہ زیادہ گرم تھا۔ اور تانیا سوتے میں بڑبڑا رہی تھی۔ ساڑھے چار بجے اس نے شمع پھر روشن کی۔ مگر اس دفعہ اس نے سیاہ پوش راہب کو پلنگ کے پاس آرام کرسی پر بیٹھے پایا۔

"سلام" راہب بولا۔ اور ذرا تامل کے بعد پوچھا "تم کیا سوچ رہے ہو؟" "شہرت و نام و نمود کی بابت" کورن نے جواب دیا "فرانسیسی ناول میں جس کو میں ابھی پڑھ رہا تھا۔ ایک نوجوان آدمی کا تذکرہ ہے جو احمقانہ حرکتیں کرتا ہے اور فضول شہرت کے لئے گھلتا ہے۔ میں ایسی خواہشات کے فلسفہ کو نہیں سمجھ سکتا۔"

"کیونکہ تم عقلمند ہو۔ شہرت کی طرف تمہارا رویہ متسابلانہ ہے۔ شہرت مثل اس کھلونے کے ہے جس کو تم اب پسند نہیں کرتے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

"شہرت اب تمہیں اپنا گرویدہ نہیں بنا سکتی۔ پتھروں کے اوپر اب تمہارا نام کندہ ہونے تم کو خوش کرنے یا خوشامد کرنے میں کیا رکھا ہے۔ جبکہ زمانہ کتبہ کو مع زیب و آرائش مکتوب کے نیست و نابود کر دیگا۔ علاوہ ازیں تم ایسے ہزاروں آدمی ہیں جن کے نام انسانی کمزور دماغ کبھی بھی یاد نہیں رکھ سکتے۔"

"بیشک بیشک" کورن نے تائید کی۔ "اس کے علاوہ اُن کو کیوں یاد رکھا جائے؟ ہمیں کسی اور چیز کا تذکرہ کرنا چاہیئے۔ مثلاً مسرت کا۔ مسرت کیا ہے؟"

جب گھڑی نے پانچ بجائے وہ میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ اپنے پیروں کو دری سے رگڑ رہا تھا اور راہب سے مشغول گفتگو تھا۔

پرانے زمانے میں ایک مسرور آدمی اپنی مسرت سے بالآخر ڈر گیا وہ اسقدر زیادہ تھی اور دیوتاؤں سے التجا کرنے کے لئے وہ اپنی پیاری انگوٹھی نذر کی خاطر لایا۔ کیا تم جانتے ہو کہ میں بھی اس کی طرح اپنی مسرت سے پریشان ہونے لگتا ہوں۔ مجھے یہ تعجب معلوم ہونے لگتا ہے کہ صبح سے شام تک میں سوائے مسرت کے اور کچھ محسوس نہیں کرتا۔ وہ میرے تمام جسم کو بھر دیتی ہے اور تمام دوسرے خیال کافور ہو جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ رنج۔ کلفت یا ملال کیا شئے ہے جو کچھ میں سویا نہیں۔ مجھے بہت کم نیند آتی ہے۔ پھر بھی میں سست نہیں ہوتا۔ میں ٹھیک ٹھیک کہتا ہوں میں مسرت سے پریشان ہونے لگتا ہوں۔"

"لیکن کیوں؟" راہب نے تعجب سے پوچھا "کیا مسرت مافوق القدرت حسیات کا نام ہے۔ کیا یہ آدمی کی معتدل حالت نہیں ہو سکتی۔ جسقدر زیادہ آدمی عقلی و اخلاقی نقطۂ نظر سے تکمیل کرتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ آزاد ہے اور اتنی ہی زیادہ مسرت اسے زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔ سقراط مارکس، وڈیاجینیز مسرت سے پر تھے۔ رنجیدہ نہ تھے۔ انجیل مقدس کی تعلیم ہے۔ خوشی مناؤ ہمیشہ خوشی مناؤ اور سدا خوش رہو۔"

"لیکن کیا دیوتا یکایک غضبناک ہو جائیں گے؟" کورن نے مذاقاً کہا اور ہنس پڑا "کہ وہ مجھ سے آرام چھین لیں گے اور مجھے بھوکا ننگا جانے میں ٹھٹھرتا پھرنے دیں گے۔ یہ میرے مذاق و ذائقہ کے موافق نہ ہو گا۔"

اسی اثنا میں تانیا بیدار ہو گئی اور اپنے شوہر کی طرف تعجب اور خوف سے دیکھا وہ آرام کرسی سے مخاطب تھا اور اس سے مشغول گفتگو ہنس رہا تھا اور ٹھٹول بازی میں مصروف۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں اور اس کے تبسم میں کچھ عجیب سی چیز معلوم ہوتی تھی۔

"اینڈریوشا تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟" اس نے راہب کی طرف دراز ہاتھ کو جھٹک کر پوچھا

"اینڈریوشا کس سے؟"

"اسے کس سے؟" کورن نے اضطراب میں کہا "کیوں اس سے وہ یہاں بیٹھا ہوا ہے" اس نے سیاہ پوش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ...... یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ اینڈریو تم بیمار ہو۔"

تانیا نے اپنا بازو اپنے شوہر کے گلے میں ڈالا اور مضبوط پکڑا گویا وہ اسے بھوت سے بچانا چاہتی تھی۔ اور اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیا۔"

"تم علیل ہو" اس کے بدن میں رعشہ آگیا اور سسکی لی۔ "میرے قابل قدر میرے پیارے مجھے معاف کرو۔ میں عرصہ سے دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے دماغ میں وہم ہے تمہیں دماغی بیماری ہے۔ اینڈریوشا"

اس کی کپکپاہٹ اس میں بھی اثر کر گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر آرام کرسی کی طرف دیکھا وہ اب خالی تھی۔ اس کو اپنے ہاتھ پاؤں میں یکایک کمزوری محسوس ہوئی وہ ڈر گیا اور کپڑے پہننے لگا۔

"کچھ نہیں تانیا" کچھ نہیں۔ کورن کانپتے ہوئے بولا "فی الحقیقت میں بالکل تندرست نہیں ... اب میں اس کا اقرار کرتا ہوں۔"

"میں عرصہ سے اس پر غور کر رہی ہوں ..... اور والد صاحب نے بھی دیکھا ہے" اس نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا "تم خود بخود باتیں کرتے ہو۔ اور ہنستے بھی عجیب طرح ہو ..... اور سو نہیں سکتے۔ میرے خدا میرے خدا۔ تیری امان تیری حفاظت" اس نے خوف سے کہا "لیکن اینڈریوشا ڈرو نہیں خدا کے لئے ڈرو نہیں۔"

اس نے بھی کپڑے پہننے شروع کئے۔ صرف اب اس طرف دیکھ کر کورن نے اپنی خطرناک حالت کا احساس کیا ..... اسے سیاہ پوش راہب اور اس سے گفتگو کے معنی اب معلوم ہوئے۔ اب اس کو واضح ہو گیا کہ وہ در اصل پاگل ہے۔

دونوں میں سے ایک بھی نہ سمجھ سکا کہ کیوں وہ کپڑے پہن رہے ہیں۔ وہ کھانے کے کمرہ میں گئے۔ تانیا آگے آگے اور اینڈری پیچھے پیچھے۔ وہاں انہوں نے یگار کو جلباب پہنے کھڑا پایا۔ وہ ایک شمع ہاتھ میں لئے تھا۔ وہ ان کا مہمان تھا اور تانیا کے رونے کی آواز سن کر جاگ پڑا تھا۔

"ڈرو نہیں اینڈریوشا۔ تانیا کانپتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ گویا اسے بخار چڑھا ہوا تھا" ڈرو نہیں باپ یہ سب ختم ہو جائیگا ...... یہ سب جلد رفع ہو جائیگا"

کورن اسقدر زیادہ مختل الحواس تھا کہ بول بھی نہ سکا۔ وہ اپنی زبان سے کہنا چاہتا تھا: "مجھے مبارکباد دو۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں پاگل ہوگیا"۔ لیکن وہ صرف اپنے ہونٹ ہلا سکا اور بری طرح ہنسا۔

صبح نو بجے انہوں نے اس کو ویسکوٹ اور سمور کا کوٹ پہنایا اور ایک اونی شال اڑھا گاڑی میں بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

(۸)

گرمی کا موسم پھر آگیا اور ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ وہ کسی گاؤں میں چلے جائیں۔ کورن صحتیاب ہوچکا تھا۔ اس نے سیاہ پوش کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اب صرف کمزوری باقی تھی۔ طاقت آنے کی دیر تھی۔ اپنے خسر کے مکان پر اس نے دودھ کا استعمال خوب کیا اور چوبیں گھنٹوں میں صرف دو گھنٹے کام کرتا اور نہ سگریٹ پیتا اور نہ شراب۔ یوم الیاس سے پہلی شام کو اس کے مکان پر عام تگی جب پادری پرستار کو عود آ رہا تھا۔ تو تمام مکان میں قبرستان کی سی بو آنے لگی اور کورن کو خستگی معلوم ہوئی۔ وہ باغ میں چلا گیا خوشنما پھولوں کی طرف کچھ ملتفت نہ ہوا۔ بلکہ تنہا باغ میں ٹہلتا رہا۔ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ پھر پارک میں گھومنے لگا۔ دریا کے کنارے پہنچ کر وہ نیچے اترا اور خیالات میں منہمک ہوگیا۔ پانی کی طرف دیکھنے لگا۔

نئے قد اور صنوبر کے تنگی جڑوں والے جنہوں نے اس کو ایک سال پیشتر اس قدر جوان، خوش اور مطمئن دیکھا تھا۔ اب خاموش تھے۔ گونگے اور بے حس و حرکت کھڑے ہوئے گویا وہ اس کو پہچان نہ سکے دراصل اس کا سر بالکل منڈا ہوا تھا۔ اب اس کے خوبصورت لمبے بال نہ تھے۔ اس کے قدم تھرتھرا رہے تھے اس کے گال اندر کو پچکے ہوئے تھے۔ وہ پچھلی گرمی کے مقابلہ میں زیادہ زرد تھا۔

وہ پگڈنڈی سے دوسری طرف گیا۔ جہاں پچھلے سال رائی اور جوار کھڑی تھی۔ جو اب اکھاڑ کے زمین پر ڈال دی گئی تھی۔ آفتاب غروب ہوچکا تھا اور افق مغرب میں شفق کی لالی ابھی تک نمودار تھی جو موسم کے طوفانی ہونے کی علامت تھی۔ سماں بالکل خاموش تھا۔ اس سمت کی طرف جہاں سے سال گذشتہ سیاہ پوش نمودار ہوا تھا۔ کورن بیس منٹ تک دیکھتا رہا۔ حتےٰ کہ شام کی سرخی مفقود ہوگئی۔

جب وہ پریشان و غیر مطمئن گھر لوٹا تو کھانا ختم ہوچکی تھی۔ نگار اور تانیا دونوں برآمدے میں بیٹھے چائے نوشی کر رہے تھے۔ وہ کسی چیز کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ لیکن کورن کو دیکھ کر بالکل خاموش ہوگئے اور جس سے اس نے استنباط کیا کہ وہ اسی کی بابت بات چیت کر رہے تھے۔

"میں یقین کرتی ہوں کہ اب آپ کے دودھ پینے کا وقت آگیا" تانیا نے اپنے شوہر سے کہا۔

"نہیں ابھی نہیں" ایک طرف بیٹھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ "تم خود پی لو مجھے ضرورت نہیں"۔ تانیا نے مضطربانہ انداز سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور لرزتی آواز سے کہا۔ "آپ نے خود دیکھا کہ دودھ سے کتنا فائدہ ہوا۔"

"جی ہاں بہت زیادہ" "میں تمہیں خوشخبری سناتا ہوں کہ جمعہ سے ابتک میرا وزن آدھ سیر بڑھ گیا ہے" اس نے اپنے سر کو زور سے دبایا اور پریشان معلوم ہوا "کیوں۔ کیوں۔ تم نے میرا علاج کیا۔ دوا کی تیاری کی۔ گرم گرم غسل۔ احتیاط۔ ہر لقمہ پر نگاہ۔ یہ سب باتیں مجھے بالآخر گدھا بنا کر چھوڑیں گی۔ میں پاگل ہوگیا۔ عاجز آگیا۔ مجھے خیال تھا میں بڑا آدمی ہوں لیکن پھر بھی مطمئن اور خوش و خرم تھا۔ وہ وقت دلچسپی و اہمیت سے پر گذرتا۔ اب جبکہ میں زیادہ ہوش دار اور فہیم ہوں میں بالکل معمولی آدمی ہوں۔ میں معمولی ہوں اور زندگی سے بیزار۔ آہ تم نے کیسی بیدردی سے میرے ساتھ برتاؤ کیا ۔۔۔۔۔۔ میں خیالی پیکر دیکھتا ہوں لیکن اس سے کسی کا کیا نقصان تھا۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے کسی کا کیا حرج تھا؟"

"خدا جانے تم کیا کہہ رہے ہو" نگار نے افسوس سے کہا۔ "ایسے کلمات سننا تو تکلیف دہ ہیں بہتر ہے مت سنو۔"

دوسرے آدمیوں اور بالخصوص نگار کی موجودگی نے کورن کو غصہ کر دیا۔ اس نے نگار کو لاپرواہی عدم توجہی حتیٰ کہ بدتمیزی سے جواب دینے شروع کئے کبھی اس طرف نہ دیکھا۔ مگر نفرت و استہزا سے۔ برخلاف اس کے نگار پریشان ہوگیا۔ اس نے غلطے کو صاف کیا۔ حالانکہ وہ اپنا کوئی قصور نہ پاتا تھا۔ وہ قطعی نہ سمجھ سکا کہ کیوں۔ ان کا پیارا اور محبوب بچہ یکایک اس درجہ تبدیل ہوگیا۔ تانیا اپنے باپ کی طرف سہمی اور مشتاق نگاہوں سے اس کے چہرہ کو اطراف دیکھنے لگی۔ وہ حقیقت حال کو جاننا چاہتی تھی مگر خاک سمجھ میں نہ آیا۔ جو کچھ سمجھ کی وہ اس حقیقت کا انکشاف تھا کہ ان کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے جارہے تھے۔ چند دن سے اس کا باپ زیادہ بوڑھا معلوم ہوتا تھا۔ اور اس کا شوہر چڑچڑا وہمی، جھگڑالو اور متاہل۔ وہ نہ تو ہنس سکتی اور نہ گا سکتی تھی۔ کھانے کے وقت کچھ نہ کھاتی۔ کئی کئی رات متواتر نہ سوتی۔ اور ہر وقت کسی خوفناک حادثہ کے وقوع سے ڈرتی۔ وہ اس قدر خستہ ہوگئی کہ ایک دن صبح سے شام تک مردہ کی حالت میں پڑی رہی۔ دعا کے وقت وہ خیال کرتی کہ اس کا باپ چلا رہا ہے اور اب جبکہ تینوں باہم بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کوشش کی کہ اس معاملہ کی ادھیڑ بن سے کچھ مطلب نہ رکھے۔

"بدھ حضرت محمد اور شکسپیئر کیسے خوش قسمت تھے کہ ان کے عزیز و رشتہ دار اور طبیبوں نے ان کے محویت الہام و جدو انکشافات کا علاج نہ کیا" کورن نے کہا۔ "اگر حضرت محمد صلعم نے اپنی تندرستی کو برقرار رکھنے کے لئے مقوی معجون کا استعمال کیا ہوتا اور چوبیں گھنٹوں میں صرف دو گھنٹے کام اور محض دودھ پیا ہوتا تو وہ رنگ انسانیت ہستی اپنے پیچھے ایک بھی نشان نہ چھوڑ جاتی۔ ڈاکٹر اور رشتہ دار مخلوق کو بیوقوف بنانے عبقریت کو معمولی انسان کرنے اور تہذیب و تمدن کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کاش تمہیں معلوم ہو کہ میں تمہارا کس قدر احسانمند ہوں"۔ اس نے جھلا کر کہا۔

وہ بہت زیادہ پریشان نظر آیا۔ اور زیادہ کہنے سے بچنے کے لئے جلدی اٹھ کھڑا ہوا اور اندر گھر میں چلا گیا۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔ پیترو کے عجوبہ تنباکو کی باس کھلی ہوئی کھڑکی سے آرہی تھی۔ چاندنی کا انعکاس فرش پر اور کھانے کے بڑے کمرہ میں پیانو پر ہو رہا تھا۔ سال گذشتہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ کیونکہ بعینہ ایسی ہی خوشبو تنباکو کی جب بھی آرہی تھی اور چاند کھڑکی میں سے چمک رہا تھا اس حالت کو واپس لانے کے لئے وہ مطالعہ کے کمرہ میں گیا۔ ایک تیز سگار جلایا۔ اور ملازم سے شراب کے لئے کہا۔ لیکن سگار سے اس کے منہ کا ذائقہ کڑوا اور سیٹھا ہوگیا۔ شراب کا ذائقہ بھی ویسا لذیذ نہ تھا۔ ترک عادت کا اثر اس قدر ہوا کہ ایک سگار اور دو جام شراب ہی نے اس کو لٹو کر دیا۔ اسکا دل دھڑکنے لگا وہ مجبور ہوگیا معجون استعمال کرنے کے لئے۔

سونے سے پیشتر تانیا نے اس سے کہا "باپ تم سے انتہائی محبت کرتے ہیں لیکن تم کسی بات پر ان سے ناراض ہو۔ اور یہ گویا ان کو مار ڈالنا ہے۔ ان کو دیکھو وہ نہ صرف روز بروز بلکہ ساعت بساعت کمزور و نحیف ہوتے جارہے ہیں۔ اینڈریو شا میں تم سے التجا کرتی ہوں خدا کے لئے اپنے مردہ باپ کی روح کے صدقے اور اپنے ذہنی اطمینان کی خاطر ان سے محبت کا اظہار کرو۔"

"میں نہیں جانتا۔ میں نہیں کہہ سکتا"۔

"لیکن وجہ" تانیا نے دریافت کیا۔ اس کے بدن میں رعشہ تھا۔ "وجہ بتلاؤ"۔ "کیوں مجھ سے وہ بیدردی سے پیش آتے ہیں اور بس۔" کورن نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ اور اپنے شانوں کو ہلایا۔ "لیکن میں ان کے متعلق کچھ نہ کہوں گا۔ وہ تمہارے باپ ہیں"۔

"میں تمہیں سمجھ سکتی۔ میں نہیں"۔ تانیا نے کسی خاص چیز کی طرف تکتی بلند سے اور اپنے ہاتھوں کو زور سے دباتے ہوئے کہا۔

"کوئی خوفناک وہ ازہ ناک امر گھر میں وقوع پذیر ہونے والا ہے۔ تم تبدیل ہو گئے ہو اور اپنی فطرت کے بالکل متضاد ... تم ہوشیار و غیر معمولی آدمی ہوتے ہوئے بھی ذرا ذرا سی باتوں پر ناراض چھوٹی چھوٹی حرکتوں پر غصہ ہو جاتے ہو ... اور اس وقت آدمی خیال کرکے کہ یہ تم ہو تعجب میں ہو جاتا ہے۔ آؤ۔ آؤ غصہ نہ ہو۔ بگڑو نہیں"۔ وہ اس کے ہاتھوں کو چومتی ہوئی کہہ رہی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے لفظوں اور فقروں سے بھی خائف تھی۔ "تم ہونہار، مہربان اور شریف ہو۔ تم باپ کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ۔ وہ بڑے نیک دل ہیں"۔

"وہ نیک ہیں۔ وہ بہت نیک خصلت ہیں۔ تمہارے باپ ایسے بوڑھے مسخرے چیاموٹے تانے۔ رحم دل۔ بغایت چالاک، مہمان نواز۔ کسی وقت مجھے ناولوں اور افسانوں میں محظوظ کیا کرتے اور مجھ پر اثر ڈالتے تھے۔ لیکن اب میں انہیں ناپسند کرتا ہوں۔ وہ ہمہ تن نفسانیت سے پُر ہیں۔ جو امر مجھ کو نہایت ناگوار ہے۔ وہ ان کا ہٹا کٹا حیوان صفت۔ خنزیر مثال اور تعادل پرست ہونا ہے"۔

"یہ ظلم ہے" اس نے کہا۔ اس کی آواز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بالکل خستہ ہو چکی تھی۔ اور اس کو بولنا دشوار تھا۔ جاڑوں سے ایک لحہ بھی تو آرام سے نہیں گزرا۔ بیشک یہ ماحول خوفناک ہے۔ میرے خدا میں بدبخت ہوں"۔

"ہاں میں ظالم شداد ہوں۔ تم اور تمہارے والد معصوم و بیگناہ ہیں۔ بیشک۔ بیشک"۔

اس کا چہرہ تانیا کو بدصورت اور غیر دلکش معلوم ہوا۔ نفرت اور اشارہ و کنایہ اس کو لازم نہ تھے۔ در اصل وہ اس سے کہیں پہلے دیکھ چکی تھی کہ اس کے چہرے میں کسی چیز کی کمی تھی۔ جب سے اس کے بال تراشے گئے اس کا چہرہ بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ کوئی مضرت رساں جملہ کہنا چاہتی تھی مگر فوراً اپنے کو عالم ہیجان میں روکا وہ مخوف تھی اور خوابگاہ سے باہر چلی گئی

(۹)

کورن کا یونیورسٹی میں پروفیسر کی جگہ پہ تقرر ہوا۔ سپاسنامۂ افتتاحیہ کی تاریخ ۲ر دسمبر مقرر کی گئی اور اسی لحاظ سے یونیورسٹی کے بورڈ پر اعلان چسپاں کر دیا گیا۔ لیکن اس تاریخ موعودہ پر اس نے طالب علموں کے انسپکٹر کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ وہ بسبب علالت لیکچر نہ دے سکے گا۔

اس نے منہ سے خون ڈالا۔ اسے اکثر خون آتا۔ اور مہینہ میں دو تین مرتبہ کافی مقدار میں خون نکل جاتا اس سے وہ کمزور ہو جاتا اور اس پر سستی عود کر آتی۔ اس تساہلانہ زندگی سے اس کو کوئی خاص اندیشہ نہ تھا۔ کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ اس کی ماں بھی دس سال یا زیادہ عرصہ تک اسی بیماری میں مبتلا زندہ رہی۔ ڈاکٹروں نے یقین دلایا کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ مگر نصیحت کی کہ حتی الامکان جوش و غصہ سے بچے۔ باقاعدہ طور پر زندگی بسر کرے اور کم بولے۔

جنوری میں پھر اس کے لیکچر اسی باعث شروع نہ ہوئے اور فروری میں زیادہ وقت گزر چکا تھا کہ نیا نصاب شروع کیا جاتا۔ لہٰذا لیکچروں کا سلسلہ آئندہ سال کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

اب وہ تانیا کے ساتھ نہیں بلکہ ایک دوسری عورت کے ساتھ رہتا تھا جو عمر میں اس سے دو سال بڑی تھی اور بجائے طفل بچہ کے جانتی تھی۔ اس کی دماغی حالت خاموش تھی اور سکون پذیر۔ وہ بخوشی اس عورت سے راضی ہو گیا۔ اور جب ورورا نکولیوتا نے جو اس عورت کا نام تھا اس کو کریمیا جانے کی تجویز پیش کی وہ راضی ہو گیا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس سفر سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

شام کے وقت وہ سیواسٹوپل شہر میں جا پہنچے اور شب باشی کے لیے ایک ہوٹل میں قیام کیا وہ دونوں سفر سے تھک گئے تھے۔ ورورا نے کچھ چائے پی۔ بستر پر گئی اور جلدی سے سو گئی۔ لیکن کورن نہ سویا۔ اسٹیشن پر روانہ ہونے سے ایک گھنٹہ قبل اسے تانیا کا خط ملا تھا۔ اس نے خط کو نہ کھولا بلکہ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے خیال سے اس کا خون بے مدہوش مارنے لگا۔ تہ دل

سے اب اس کو یقین ہو گیا کہ تانیا کے ساتھ شادی کرنا ہی سرے سے حماقت تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ اب ابدی جدائی ہو گئی۔ اور اس عورت کا خیال جو آخر میں محض زندہ تاثر ہو کر رہ گئی ابھی تک اس کے ذہن میں موجود تھا۔ اگرچہ اب سوائے اس کی بڑی بڑی تیز چمکدار آنکھوں کے سب کچھ مردہ تھا۔ اس خیال سے اس کے دل میں کچھ بھی حرکت نہ ہوئی۔ لفافہ پر سواد خط اس کو بتا رہا تھا کہ دو برس قبل وہ کیسا بے رحم و ناانصاف تھا اور کس طرح اپنی روحانی کمزوری، تھکن، ماندگی اور تنہائی کی زندگی سے وہ غیر منصفانہ طور پر ان پر غصہ ہوتا۔ ان لوگوں سے بدلہ لیتا جو کسی طرح بھی مورد الزام نہ تھے۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ کس طرح اس نے اپنے زمانۂ علالت کے لکھے ہوئے تمام مضامین تدقیقی و تحقیقاتی مبحث کو چاک کر دیا تھا اور کس طرح ان کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور کاغذ کے پرزے ہوا میں اڑ اڑ کر درختوں اور پھولوں سے چمٹ گئے۔ ان کی ہر ایک سطر میں اسے عجیب بالکل بے بنیاد دعوی، خالی خولی دلائل۔ جہالت و ضد اور تکبر دکھائی پڑا۔ ان کو دیکھ کر اس کو احساس ہوتا تھا کہ گویا وہ اپنی کمزوریوں اور عیبوں کا تذکرہ پڑھ رہا تھا لیکن جب آخری مکتوب پھاڑ لیا اور کھڑکی کے باہر ہوا میں پھینکا گیا تو بغیر کسی ظاہری سبب کے وہ یکایک غصہ میں بھر گیا۔ وہ اپنی بیگم کے پاس گیا اور بہت سے نام اس کو رکھے۔ الحفیظ کس طرح اس نے تانیا پر ظلم کئے ایک دن محض اس کو تکلیف پہنچانے کی نیت سے اس نے کہا کہ اس کے باپ نے ایک نہایت غیر مناسب حصہ ان کے رابطۂ محبت کے قائم کرنے میں لیا اور اس نے ہی شادی کے لیے کہا تھا۔ یگار نے اتفاقاً اس کو سن لیا۔ کمرہ میں بھاگا اور عالم یاس میں ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکا۔ صرف زمین پیٹنے اور عجیب ہولناک آوازیں گلے سے نکالنے لگا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہے تانیا نے اپنے باپ کی حالت دیکھ کر ایک دل خراش چیخ ماری اور بے ہوش زمین پر گر پڑی۔ یہ امر مکروہ و نازیبا تھا۔

یہ تمام باتیں اس کے ذہن میں آتی رہیں۔ جو اس پیاری تحریر کے دیکھنے سے پیدا ہوئی تھیں۔ کورن بالاخانہ پر گیا۔ ابھی تک ہوا میں خشکی تھی۔ گو بحری ہوا کی خوشبو بھی شامل تھی سامنے والی خلیج پر چاندنی کی روشنی کا انعکاس ہو رہا تھا اور ایسا رنگ تھا جس کا کوئی مخصوص نام نہیں بتایا جا سکتا صاف اور ہلکا نیلے اور سبز رنگ سے مرکب تھا۔ بعض جگہوں میں پانی بالکل نیلے تھوتھے کی طرح تھا اور بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاندنی پانی کی شکل میں تبدیل ہو کر خلیج کو پر رونق بنا رہی ہے۔ رنگوں کا کیسا تناسب خاموشی، سکون اور عافیت کا کیسا توازن وہاں تھا۔

بالاخانہ کی نیچی منزل میں شاید کچھ کھڑکیاں کھلی تھیں۔ کیونکہ عورتوں کی ہنسی ٹھٹھول کی آواز صاف آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ڈنر میں شرکت ہو رہی ہے

کورن نے کوشش کی لفافہ کو پھاڑا اور اپنے کمرہ میں جا کر پڑھنا شروع کیا۔

"میرے باپ ختم ہو چکے۔ اس کا سبب تم ہو۔ تم نے ہی ان کو مارا ہے، ہمارا باغ برباد ہو رہا ہے۔ غیر آدمی اس کا انتظار کر رہے ہیں اور وہی واقع ہوا جس سے میرے باپ ڈرتے تھے۔ اس کا بھی تم ہی سبب ہو۔ میں تم سے دل سے نفرت کرتی ہوں۔ میری دعا ہے کہ تم جلد تباہ و برباد ہو جاؤ۔ آہ! میں کیسی بدبخت ہوں! ناقابل برداشت صدمہ! ایک غیر معمولی چبک میرے جگر میں ہے۔ میری بددعائیں تم پر۔ میں نے تمہیں عبقریۃ اور نابغۂ خیال کیا۔ تم سے محبت کی اور تم پاگل نکلے ... ..."

کورن آگے نہ پڑھ سکا۔ اس نے خط کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور باہر پھینک دیا۔ پریشانی اور کلفت نے جو خوف سے متحد تھی اس پر غلبہ کیا۔ ورورا پردے کے پیچھے سو رہی تھی۔ وہ اس کے سانس کی آواز کو سن رہی تھی۔ نیچے مکان سے ہنسی اور مذاق کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لیکن اس کو ایسا محسوس

ہوا کہ تمام ہوٹل میں سوائے اس کے کوئی زندہ ہستی نہ تھی۔ کیونکہ تانیا رنجور، غم سے مجبور نے اس کو بدو عادی تھی۔ اور اس کی تباہی کی متمنی تھی۔ اس کو ڈر معلوم ہوا اور جلد جلد دروازہ کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا وہ مخوف تھا کہ کہیں وہ پراسرار طاقت جو دو سال قبل اس کی زندگی اور نیز اس کے عزیزوں کی زندگی میں تہلکہ ڈال چکی تھی۔ پھر کمرہ میں نہ آجائے اور اس پر غلبہ حاصل کرے۔

اسے تجربہ سے معلوم ہوگیا تھا کہ جب اس کی نبضیں چھوٹنے لگتیں۔ سب سے مناسب بات اس کے لئے یہ تھی کہ وہ کام کرنے لگتا۔ پس اس نے سوچا کہ میز کے پاس بیٹھ کر اپنے دماغ کو چاہے کچھ ہی حشر کیوں نہ ہو کسی ایک خیال کی طرف منعطف کردے۔ اس نے اپنی سرخ کتاب لے کر ایک کاغذ نکالا جس میں ایک چھوٹا سا مضمون تھا اور اس نے اس نیت سے مرتب کیا تھا کہ شاید کرنیتیہ میں بغیر کام کے کوفت ہوگی۔ وہ میز کے پاس بیٹھ گیا اور اس منصوبے پر کام کرنے لگا۔ اس کو معلوم ہوا کہ اس کا خاموش صلح کارانہ اور بے تعلق انداز پھر آرہا ہے۔ اس تالیف و تصنیف سے اس کا خیال دنیا کی جاہ و حشمت کی طرف منتقل ہوگیا اور اسی پر وہ غور کرنے لگا۔ اسے انکشاف ہوا کہ زندگی ان بے کار و معمولی سہولتوں کے بدلے کس قدر وصول کرلیتی ہے۔ مثال کے طور پر چالیس سال سے پیشتر یونیورسٹی میں کرسی ملنے یا معمولی پروفیسر مقرر کئے جانے، معمولی اور مستعملہ خیالات کو بھدی، خراب اور غیر ذی روح زبان میں ادا کرنے اور فی الحقیقت ایک ادنےٰ اور عام آدمی ایسے ترقی کرنے کے لئے وہ پندرہ سال تک صبح سے شام تک محنت کرتا۔ مطالعہ کرتا۔ خوفناک ودماغی بار کو برداشت کرتا رہا۔ ایک رنج دہ شادی کا تلخ تجربہ اٹھایا اور بہت سے ایسے بے وقوفی و بے ایمانی کے کام کئے جن کا ذکر کرنا ہی سرے سے بے سود ہے۔

کورن کو اب واضح طور پر ظاہر ہوگیا کہ وہ محض ایک معمولی آدمی تھا۔ اس نے خوشی سے بلاحیل وحجت اس نظریہ کو تسلیم کرلیا جب اس نے سوچا کہ ہر ایک آدمی کو اپنی موجودہ حالت میں خوش و مطمئن رہنا چاہئے

کتاب کے منصوبے نے اس کو پورے طور پر تسلی دی ہوتی۔ لیکن پھٹے ہوئے خط کے پرزے فرش پر پڑے چمک رہے تھے۔ وہ اٹھا۔ پرزوں کو جمع کیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ سمندر کی ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ جس نے کاغذ کے ٹکڑے کھڑکی کے پتھر پر منتشر کردیئے پھر اس پر خوف و بے ہوشی کے آثار ظاہر ہوئے۔ اس کو محسوس ہوا کہ گویا تمام ہوٹل میں سوائے اس کے کوئی زندہ نفر نہیں ہے۔ وہ بالاخانہ پر گیا۔ خلیج مثل کسی زندہ شے کے اپنی ہزارہا ہلکی نیلی گہری نیلی زرد اور روشن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور زبان حال سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اسوقت گرمی تھی اور کسی قدر تکلیف دہ تھی۔ غسل کرنا کوئی قباحت کی بات نہیں تھی

یکایک نیچے منزل میں بربط بجنا شروع ہوا اور لطیف و دلکش نسوانی آوازیں راگ کی صورت میں سنائی دیں۔ راگنی مشہور تھی۔ گیت ایک لڑکی کے متعلق تھا جس کا دماغ خیالاً واہمہ سے پر تھا۔ جس نے ایک دن اپنے باغ میں عجیب و پراسرار آوازیں سنیں۔ ایسی دلکش اور سریلی کہ اس نے لامحالہ خیال کیا کہ وہ سرود الہیٰ تھیں جو ہم فانی انسانوں کی سمجھ سے دور ہیں اور پھر بہشت بریں کو واپس ہوجاتی ہیں۔ ۔ ۔

کورن کا سانس قدرے رکا۔ اس کے دل میں رنج کا کانٹا کھٹکا۔ اور پیاری نازک خوشی کی لہریں جسے مدت سے فراموش کرچکا تھا۔ اس کے دل میں موجیں مارنے لگیں۔ ایک لمبا سیاہ ستون مثل بگولہ یا پانی کے جھوے کے خلیج کی دوسری طرف ظاہر ہوا اور خوفناک سرعت سے خلیج پر گزرتا ہوا ہوٹل کی طرف آیا اور چھوٹا اور زیادہ سیاہ ہوتا گیا۔ کورن بمشکل تمام اس کی گزر کے لئے سامنے سے ہٹ سکا

راہب سفید ننگی ڈاڑھی، سیاہ ابرو، ننگے پیر سینہ پر ہاتھ رکھے اس کے پاس آموجود ہوا۔ اور کمرہ کے وسط میں خاموش کھڑا ہوگیا۔

تم نے میرا یقین کیوں نہ کیا۔ اس نے طعن سے کہا۔ مگر محبت سے کورن کی طرف دیکھا اگر اسوقت تم نے میرا اعتبار کیا ہوتا کہ تم نابغہ تم ہرگز یہ دو سال اس بے لطفی و بدمزگی سے نہ گزارتے۔

کورن کو پہلے ہی سے یقین تھا کہ وہ خدا کی ایک پسندیدہ ہستی اور عبقرینہ ہے۔ اس نے راہب کے ساتھ گزشتہ گفتگو کو یاد کیا اور بولنے کی سعی کی لیکن اس کے منہ سے خون سینہ پر بہہ گیا۔ بغیر علم کے اس نے اپنا ہاتھ سینہ پر پھیرا۔ اس کی آستین خون سے تر ہوگئی۔ اس نے ورزورا کو جو پردے کے پیچھے سو رہی تھی آواز دینی چاہی۔ اس نے کوشش کی۔ مگر زبان سے نہ نکلا۔

"تانیا!"

وہ فرش پر گر پڑا اور اپنے کو بازو کے سہارے سنبھالتے ہوئے پھر بولا "تانیا"

اس نے تانیا کو پکارا۔ عمدہ و عالی شان اس سے ترپھولوں والے باغ کو، پارک کو، سمور کو، رائی کے کھیت، اپنی حیرت انگیز تعلیمات، اپنی جوانی، ہمت اور ہمت کو، زندگی کو جو اس قدر پیاری تھی۔ غرض سب کو پکارا۔ اس نے زمین پر اپنے منہ کے پاس خون کا ایک دریا دیکھا۔ اور اس قدر کمزور ہوگیا کہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ لیکن ایک دوراز بیان لامتناہی مسرت نے اس کی تمام ہستی کو مسرور کردیا۔ نیچے بالاخانہ کے عورتیں ابھی تک گانے میں مصروف تھیں۔ راہب سیاہ پوش نے اس کے کان میں کہا کہ وہ نابغہ ہے اور صرف اس لئے جان توڑ رہا تھا کہ اس کا کمزور جسم اپنا توازن کھو چکا تھا۔ اور اس لئے عبقریتہ فانی لباس میں نہ رہ سکتی تھی

جب ورورا بیدار ہوئی اور پردے سے باہر آئی۔ اس نے کورن کو مردہ پایا لیکن اس کا چہرہ الہیٰ خوشی سے منور تھا

(ذکریا فیاضی بی۔اے)

الہامات
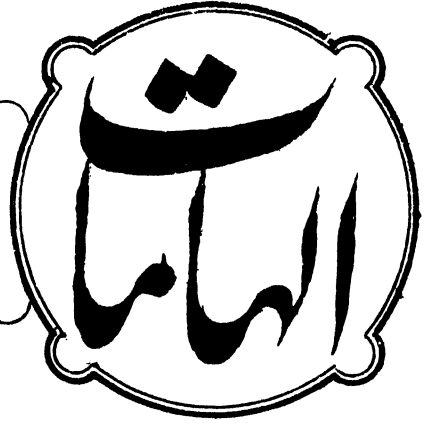
مشاہیر شعراء کے تازہ افکار

سیّد ابن الحسن فکر ایم اے

مرا جنوں کبھی وہ بخیہ گر نہ دیکھ سکے
جو چاک جیب پہ چاک جگر نہ دیکھ سکے

خود اپنی آنکھ کو جیسے نظر نہ دیکھ سکے
ہم اپنے گھر میں رہے اور گھر نہ دیکھ سکے

ہمیشہ دیکھتے رہنے کی تاب تھی کس کو
جمالِ یار کو بارِ دگر نہ دیکھ سکے

عجیب پردۂ بے پردگی ہے جلوۂ حُسن
وہ آنکھ ہی میں رہیں اور نظر نہ دیکھ سکے

سُنا کے حالِ زبوں کہہ دیا کہانی تھی
ہم اُس حسین کی آنکھوں کو تر نہ دیکھ سکے

خراب ہو کہیں یہ بُتکدہ تعیّن کا
ہماری آنکھ خدا کا بھی گھر نہ دیکھ سکے

پتہ کچھ اول و آخر ورق کا مل نہ سکا
کتابِ زیست کو ہم سر بسر نہ دیکھ سکے

سحر سے پہلے ہی یوں چل بسے تھے پروانے
کہ بے فروغیٔ شمعِ سحر نہ دیکھ سکے

نہاں تھا ذوقِ طلب میں نشان منزل کا
ہمیں نے دیکھ لیا راہبر نہ دیکھ سکے

کہو کلیم مرے بتکدے میں آ جائیں
جمالِ یار اگر طور پر نہ دیکھ سکے

زمانہ غرق ہوا پھر بھی یہ جہاں والے!
مآلِ گریۂ اہلِ نظر نہ دیکھ سکے

حضرتِ بیخود دہلوی

نزع میں سامنے اِک صورتِ زیبا آئی
موت آنکھوں سے اُٹھاتی ہوئی پردہ آئی

کوئی انسان بھی دیکھا کوئی عاشق بھی ملا؟
یوں تو آنے کو تری بزم میں دُنیا آئی

بات کرنے کی قسم کس لئے کھالی بیخود
تو نے کیا سوچا ہے یہ جی میں ترے کیا آئی

قاضی بدرالحسن بدر جلالی بی اے (علیگ)

نازاں نے کبھی پوچھ مرے دیدۂ تر سے
آئینے نے دیکھا ہے تجھے تیری نظر سے

طولِ شبِ ہجراں میں تلوّن تو نہیں تھا
تنگ آیا ہوں آشوبِ گہِ شام و سحر سے

سو میکدے قربان ہیں اُس جامِ تہی پر
اک بار گزر جائے جو ساقی کی نظر سے

اب تک ہیں جبیں سے مری شرمندہ ستارے
مدت ہوئی گزرا تھا تری راہگذر سے

لگ جائے نظر اس کو نہ گلزارِ ارم کی
اس طرح نہ دیکھو مرا دل حُسنِ نظر سے

جن آنکھوں میں تم رہتے ہو اُن آنکھوں سے پردہ!
منظر نہیں ہوتا کبھی روپوش نظر سے

وہ جادۂ تاریک کہ تو جس کی نہایت
مرنا جسے کہتے ہیں گزرنا ہے اُدھر سے

پھر بھولے سے جا پہنچا ہیں قاتل کی گلی میں
چھٹتی ہی نہیں عادتِ دیرینہ بشر سے

اے شوخ حیا بدرِ زخود رفتہ سے کیسی!؟
دیوانہ کہیں دیکھتا ہے اپنی نظر سے!

آنکھوں کی اُف وہ مستی رنگیں شباب میں
رقصاں کنول کے پھول ہیں جوئے شراب میں

ساقی پلا دیا تھا مجھے کیا شراب میں
دیکھا ہے میں نے آج جوانی کو خواب میں

اب ترکِ مدعا پہ بھی قدرت نہیں رہی
حسنِ خیال ڈال گیا کس عذاب میں

میں جانتا ہوں مستیٔ رنگینیٔ بہار
میری نگاہیں ڈوب چکی ہیں شراب میں

اک بحرِ بے کنار کا سینہ سمیٹ کر
باندھا طلسمِ عبرتِ ہستی حباب میں

اللہ رے اضطرابِ محبت کا احترام
جان نذر دے رہا ہوں اُمیدِ جواب میں

دُنیا سے اور بدلہ اُمیدِ کرم عجب!
گوہر تلاش کرتے ہو موجِ سراب میں

حضرتِ لبیب دہلوی

لڑھکتا ٹھوکروں میں کاسۂ سر لیکے آتے ہیں
ترے در پر ہم اک سنسان محشر لیکے آتے ہیں

جہاں سب دیدۂ دل ہے کہ یہ دونوں تماشائی
نظر کے ساتھ اپنا اپنا منظر لیکے آتے ہیں

اِدھر بھی دیکھنا او تسکینِ خاطر بخشنے والے
بہت سے بینوا مینا و ساغر لیکے آتے ہیں

لئے پھرتے ہیں حکمِ قتل اور قاتل نہیں ملتا
ترے دربار میں اب اپنا محضر لیکے آتے ہیں

لبیب ان دیر میں سب دل کے آگے سر بسجدہ ہیں
یہ بندے اپنا اپنا بندہ پرور لیکے آتے ہیں

حضرتِ کیف مرادآبادی

نہ عشقِ حقیقی نہ حسنِ مجازی
ترا عکس اور تری آئینہ سازی

ترے غم میں جینا کمالِ طلب ہے
مقامِ شہادت سے آگے ہے غازی

محبت میں مقصود کی آرزو کیا
محبت کی فطرت ہے مقصد طرازی

مرا عشق ہے اضطرابِ مسلسل
کہاں تک سکوں دے تری بے نیازی

زمانہ رہے ایک حالت پہ کیونکر
ہے ان کی نظر خوگرِ فتنہ سازی

میں عالم کی تاریکیاں تو مٹا دوں
مگر یہ ترے گیسوؤں کی درازی

حقیقت کے اسرار پوچھو اسی سے
کہ اس وقت ہے کیف فخر رازی

حضرت احسن مارہروی

نہ کیوں ہو محویتِ جلوہ میں رقابت گم
وہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی

جو اُن سے دور ہیں اُنکے لئے ہیں چشم براہ
ہم اُنکے پاس ہیں ہم پر نظر نہیں ہوتی

اجل کو روکئے کیا کہہ کے اُنکے آنے تک
کہ اب تو بات بھی لے چارہ گر نہیں ہوتی

کمالِ بے ہنری سے غنی ہوں میں احسن
مجھے ضرورتِ عرضِ ہنر نہیں ہوتی

جنابِ صفی لکھنوی

اُسے یونہی مرے پروردگار رہنے دے
جو بے قرار ہے دل بے قرار رہنے دے

کچھ ان کے دل پہ اثر ہو چلا ہے اے غمِ عشق
ابھی مژہ کو مری اشکبار رہنے دے

کسی کا وعدۂ فردا غلط نہیں لیکن
جو زندہ طولِ شبِ انتظار رہنے دے

چمن کو بادِ خزاں اس طرح نہ کر پامال
کوئی تو پھول سرِ شاخسار رہنے دے

بنا رہا ہوں نشیمن چمن میں رہنے کو
مگر جو گردشِ لیل و نہار رہنے دے

... مطبوعہ ساغر پریس پٹ اسٹریٹ میرٹھ باہتمام ... اسد یار خان اعظم

ایشیا
مُدیر۔ ساغر نظامیؔ
SAMI.34

صوبہ متحدہ میں خوبصورت صحیح باشوکت اور بہترین کتابت وطباعت کا واحد مرکز
ساغر پریس
شعبۂ طباعت ادبی مرکز
ہندوستان کے شعراء ادیب اور انشا پردازوں کو نوید
یقیناً یہ خوشخبری تمام ادبی دنیا کیلئے نہایت مسرت و اطمینان کا باعث ہوگی کہ ملک کے
مشہور انشا پرداز و شاعر حضرت ساغر نظامی
کے زیر اہتمام و سرپرستی صوبہ متحدہ کے ادبی شہر میرٹھ میں ایک صحیح مرکز قائم ہو گیا ہے جس کے قیام کے بعد ادبی مطبوعات کی شکایت ختم ہو گی
اور اردو کی بہترین تصنیفات صحت و جمال کے ساتھ شائع ہو کر ملک کے ادبی مطبوعات خزانہ تحسین حاصل کر سکیں گی
ساغر پریس کی اعلیٰ و حسن طباعت کا بہترین شاہکار بادۂ مشرق ہے جو حضرت ساغر نظامی کی نظموں کا شاندار مجموعہ ہے جس کی مجموعی صورت کے متعلق بلند بانگی
سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے کہنہ مشق و ترقی یافتہ مطابع بھی بہ آسانی ایسی طباعت پیش نہیں کر سکتے
مسودہ وصول ہونے کے بعد کتاب حسب دلخواہ خوبصورت اور باصحت تیار کر کے مرکز پہنچا دی جائے گی
یعنی آپ پروف اور کاپیاں دیکھنے کی زحمت سے بری آزاد ہو جائینگے
خط و کتابت کیلئے پتہ
احمد یار خان منیجر "ساغر پریس" سیپٹ اسٹریٹ میرٹھ

قرطاسِ خریداری

باتصویر ماہنامہ "ایشیا" ادبی مرکز میرٹھ

مورخہ ---------- سنہ ۱۹۳ ء

براہِ کرم بہ حیثیت خریدار "ایشیا" میرا نام ایک سال / ششماہی کے لئے آیندہ ماہ سے رجسٹرڈ کر لیجیے اور رسالہ بذریعہ وی پی ارسال کیجیے / زرِ سالانہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کیا جاتا ہے

رسالہ مندرجۂ ذیل پتہ پر جاری کیجیے:۔

اسم گرامی --

(براہِ کرم صاف الفاظ میں پتہ لکھیے)

پتہ --

زرِ سالانہ یہ ہے

سال بھر کے لئے مبلغ عہ (معہ محصول)

ششماہی کے لئے مبلغ ے (معہ محصول)

خاکسار

منیجر "ایشیا" میرٹھ

([illegible])

اُردو زبان میں سب سے پہلا بین الاقوامی رسالہ مشرق اور ہندوستان کی آزادی اور عظمت کا واحد علم بردار

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

بہ سرپرستی زعیم ہند عالی جناب ڈاکٹر سیّد محمود ایم، اے پی ایچ ڈی بار ایٹ لا مدظلہ العالی

اغراض و مقاصد

(۱) عالمگیر اخوّت و محبّت۔

(۲) اقوامِ مشرق میں ایک کلچرل اتحاد کا تصوّر پیدا کرنا۔

(۳) ایشیا کی ہر جدوجہد اور ہیجان سے اُردو داں طبقوں کو علمی طور پر آگاہ کرنا

(۴) بین الاقوامی سیاست پر بحث و انتقاد

(۵) مشرقیت کا احیاء مشرقی فنونِ لطیفہ اور اُس کے متعلقات سے بحث

(۶) ہندوستانی فرقوں میں حب الوطنی اور اتحادِ قومی کے جذبات کو وسیع کرنا۔

(۷) معاشری اور اخلاقی انقلاب۔

(۸) ہندوستان کی قومی زبان اُردو کی ہر ممکن خدمت۔

(۹) روحانی اور دماغی تربیت و ترقی کے لئے بہترین لٹریچر پیش کرنا۔

ادبی رفیق

پنڈت گوپی ناتھ سنہا ایڈووکیٹ میرٹھ۔

اقبال احمد بی، اے (علیگ) ایڈووکیٹ میرٹھ

سیّد محمد یحییٰ امیر میرٹھی

سیّد حسن برنی بی، اے ایڈووکیٹ

سیّد عنایت علی بی، اے (علیگ)

محمود حسن صدیقی بی، اے (علیگ)

سیّد فرید جعفری مجیلی شہری "مدیر لیلیٰ"

مہر لال ضیا فتح آبادی ایم، اے۔

حفیظ بی، اے بریلوی

سیّد عبدالقیوم مہجور (فاضلِ عربی)

اختر حسین رائے پوری بی، اے (علیگ)

عبدالباری آسی و شوکت تھانوی۔

امین سلونوی و حکیم یوسف حسن ایڈیٹر "نیرنگِ خیال"

شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی

سیّد علی سکندر جگر مرادآبادی

عبدالاحد شرف الدین پوری (فاضل عربی)

سیّد محمد یحییٰ تنہا بی، اے (علیگ)

میاں حسن لطیفی بی، اے۔

مدیرِ مسئول:- **ساغر نظامی**

ہندوستان میں قیمت سالانہ ۵ ششماہی ۳ فی پرچہ آٹھ آنہ (۸)

بیرونِ ہند قیمت سالانہ آٹھ روپئے ریلوے بک اسٹال سے ۱۰

ارشاداتِ عالیہ

نتیجۂ فکر ہز ایکسلنسی راجہ راجگان مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ صدرِ اعظم باب حکومت سرکارِ عالی

درشبِ ہجر چہ اندیشۂ محشر دارم	شورِ فریاد ہماں است کہ در سر دارم
سوزِ پنہاں کہ بسودائے تو در سر دارم	سینۂ آتشکدہ و دل چو سمندر دارم
محتسب بردر میخانہ نشستست چہ باک	بشکنم توبہ و مُہر از سرِ خم بردارم
آنکہ منصورِ سرافرازی و خوش بختی بود	بر سرِ خویش ز الطافِ پیمبر دارم
بچہ کارست ندانم نہ خط آورد نہ خبر	چندے امید ز پروازِ کبوتر دارم
جلوۂ روئے دل افروز ترا می بینم	روز و شب در برِ خود ماہِ منور دارم
طالعم بیں کہ نشستم بدرِ خلوتِ دوست	تختِ جم دارم و ہم بختِ سکندر دارم
پاسباں را نہ شناسم نہ کسے دیگر را	بر درِ دیر و حرم بالش و بستر دارم

مشکلے نیست رسیدن بحقیقت اے شادؔ
گر سرِ صحبتِ سلمان و ابوذر دارم

۲

فہرست مضامین

ایشیا بابت ماہ جولائی ۱۹۳۵ء

جلد ۱ — نمبر ۱

تصاویر

(۱) خیام کی رباعی کا ایک تصویری تخیل (۲ و ۳ و ۴) انگریزی گرجاؤں میں دستک دینے کی گھنٹیاں (۵) نواب میر یوسف علیخاں بہادر سالار جنگ ثالث (۶) سر تیج بہادر سپرو۔ (۷) مسز سروجنی نائیڈو (۸) سیٹھ محمد علی فیاد

۳

نشاطِ آغاز

دوشینہ شکستیم بیک توبہ دو صد جام
امروز بیک جام دو صد توبہ شکستیم

کامل ۵ سال کے بعد وقت، ذوق اور احساسِ فرض نے میرے شانوں پر پھر وہ مقدس بار رکھ دیا جس کو آغاز بے شعوری سے شعور و ادراک کے انجام تک اٹھائے رہنا میری قسمت ہے۔

میری ادارتی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۱ء تک بہر حال جاری رہی اس کے بعد میں نے کسی جریدہ کو مرتب نہیں کیا ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ ایک وقفۂ فکر و استغراق تھا۔ اس وقفہ میں میں نے صرف اُن ماؤف مقامات کو معلوم کیا جن پر نشتر زنی فرض تھی خواہ وہ میرے ہاتھ سے ہو یا نشترِ قدرت کے ذریعہ، مگر لمز وہ انسان کی کیا مجال ہے کہ وہ پیکرِ جہل کی جراحی کر سکے یہ تو کچھ قدرت ہی کے دستِ اقتدار میں ہے کہ انسانی ذہن و دماغ سے وہ پردے اٹھائے جنکی دبازت کو انسانی فکر کا نشتر چاک نہیں کر سکتا۔

لیکن بہر حال یہ قدرت کا کام تھا، میرا کام تو ان صفات کا پیدا کرنا تھا جو مستقبل کے لئے لازمی و ضروری تھی اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ایک ایسے نئے نقشے کی ترتیب لازمی تھی جسکے حدود و اربعہ قطعی جدید اور جس کا ہر خط بالکل نئی بنیادوں پر مبنی ہو۔ چنانچہ وہ نقشہ بنایا گیا اور اس کے مطابق وہ تعمیر مکمل کی گئی جو آج آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہ تعمیر نہ تو بہت شاندار ہے نہ اتنی مستحکم کہ ادنیٰ سا ادنیٰ دعویٰ کرنے کی جرأت بھی ہو سکے۔ مگر جو کچھ بھی ہے خود اعتمادی، محنت، محبت اور سچائی کی بنیادوں پر قائم ہے اور شاید اس کے ذرہ ذرہ میں انسانی خدمت گزاری کا جذبہ جوش زن ہے۔

دراصل یہ بھی کوئی بلند بات نہیں کہ جذبۂ خدمت گزاری کا ڈھول پیٹا جائے، خدمت ہمیشہ بہت خدمت کیلئے ہونی چاہئے اور خادم کا فرض ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد سب کچھ بھول جائے، بھول جائے اور بھول کر مر جائے، کہ خود فراموشی کے ساتھ اس طرح موت حیاتِ جاوید کا دیباچہ ہوتی ہے۔ مگر مرنے کے بعد حیاتِ جاوید کا تخیل بھی میرے نزدیک کوئی اعلیٰ تصور نہیں۔ یہ تو گویا اپنے اعمال کی تجارت ہے کھلے بندوں مجاہدۂ حیات کا سودا ہے پھر کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے اگر زندگی کے مخصوص اور شدید راستوں پر سفر نہ کیا جائے زمانہ سازی یا رسمی زندگی کو اصولِ زندگی قرار دیا جائے تو راحت ہی راحت ہے مگر مجاہد کی طرح زندہ رہنا اور شہید کی طرح جان توڑنے سے پہلے اپنی جانبازیوں کے اپنی زبان سے گیت گانا اوّل درجہ کی بے دماغی اور بدترین مغالطہ ہے۔

اسی لئے میں اپنا یہ سفر اُن راہوں پر شروع نہیں کرتا جو دوسروں کے خیال میں راست ہیں بلکہ میں ان خطوط پر سرگرمِ جہد ہونا چاہتا ہوں جو خود میرے ہی تفکر کا نتیجہ ہیں اور جن کی صحت پر میں اعتقادِ کلی رکھتا ہوں گو میں جانتا ہوں کہ میری ہستی ایک مزدور خادم سے زیادہ نہیں۔

ادبی مرکز کی تشکیل، ساغر پریس کے قیام، مکتبۂ ساغر کی ترتیب اور "ایشیا" کے اجرا کے بعد مجھے بلند آہنگی سے کام لینے کا حق حاصل ہو گیا ہے لیکن میں اس بلند آہنگی کو بازاری دکانفروشوں کی مصنوعی اور پُر فریب صداؤں کے مماثل خیال کرتا ہوں اور "ایشیا" کے صفحات کو بے انتہا وعدوں کی پوٹ نہیں بنانا چاہتا بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "ایشیا" اپنے ناظرین کیلئے مطالعہ کا بہترین سامان اور انسانی روح و دماغ کی نشوونما و تفریح کے لئے لطیف ترین ادب پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا اور اپنے مقاصد کے مطابق اور ماورائے مقاصد اپنی ادبی جد و جہد کو جاری رکھے گا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے ملک اچھی طرح واقف ہے کہ میں اپنی تمام زندگی ادب کی طالب علمی کے لئے وقف کر چکا ہوں اور زندگی کا ہر جزیہ اسی رنگ میں رنگا جا چکا ہے۔ شوق اور ذوق نے میرے شانوں میں جو شہپر پیوست کر دئے ہیں۔ اگر میں ان کو نوچ کر نذرِ آتش بھی کر دینا چاہوں تو نہیں کر سکتا اور اگر ان شہپروں کے ساتھ بے ادبی و بے عملی کی دُنیا میں ٹھوکریں کھانا چاہوں تو خود میری سوائی انگشت نمائی کے عجیب عجیب موقع پیدا کر دے گی۔ اس لئے اُڑتے رہنے ہی میں عافیت محسوس کرتا ہوں ——

—— سو اُڑ رہا ہوں جس طرح اُڑا جا رہا ہے۔

لیکن محض ایک مرغِ صحرا کی پرواز کبھی فضا کے حسنِ تمام کا باعث نہیں ہو سکتی۔ ذرا اُس منظر کا تصور کیجئے جب بگلوں کے قافلے قطار اندر قطار درختوں نہروں اور کھیتوں سے بہت اونچے نیلگوں آسمان کے سایہ میں پرواز کرتے ہیں اور تمام ماحول ایک کیفیتِ پرواز سے لبریز نظر آتا ہے۔ جہاں تک مجھ شکستہ پر کا تعلق ہے باوجود بے بال و پری کے ہر ممکن جد و جہد کئے جاؤں گا۔ لیکن ہم صفیروں کے اتحاد کی بھی سخت ضرورت ہے میں اُڑتا ہوں مگر ہم مذاقانِ چمن کو یوں پر توڑے بیٹھے رہنا زیب نہیں دیتا۔

خدا کا شکر ہے کہ میں ان "بخود غلط" لوگوں میں سے نہیں جو سولئے اپنے ہر ایک کو حرفِ فضول خیال کرتے ہیں میرا تو اعتقاد ہے کہ اجتماعی کام ہمیشہ اجتماعی طور پر ہی سرانجام ہو سکتے ہیں اور اس اعتقاد کی بنا پر میں تمام نوجوانانِ ادب کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ "ایشیا" کو نوجوانوں کا نمائندہ یقین کریں اور اس کے ذریعہ انسانی فلاح و بہبود خصوصیت کے ساتھ مشرق کے لئے بہتری کی فضا پیدا کریں۔ کہ وہ اس کا حقدار ہے۔

آج ہم جس منزلِ حیات تک آ پہنچے ہیں وہاں پہنچکر ہمارا فرض "باعزت زندگی" حاصل کرنا ہے۔ یہ باعزت زندگی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے؟ بے خوفی اور خودداری کو ایمان بنا لینے سے، قدامت کی ہر زنجیر توڑ کر پھینک دینے سے یعنی ہر قسم کی غلامی کی بیڑیاں کاٹنے کی بنیادی سامان کر لینے کے بعد ہی ہم یہ ذی عزت زندگی یقینی طور پر حاصل کر سکتے ہیں جو دنیا میں ہر انسان کا قدرتی حق اور فطری مقصودِ حیات ہے۔

آخر میں میں اپنے ان تمام ہم نواؤں کا شکر گزار ہوں جن کی مشورت اور امداد نے میرے عزم کو ہمت بخشی اور میں اتنے عظیم کام کیلئے قدم اُٹھا سکا۔ "ایشیا" کے موجودہ نمبر کو دیکھکر اس کے تمام کام کا اندازہ کرنا تعجیل شوق ہو گی میں "ایشیا" کو جس قدر جامع جسقدر حسین اور جسقدر . . . . . . شاندار بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا لیکن شاید تکمیل کے بعد تنزل کی طرف رجوع کرنا بلند بات نہیں لیکن عدمِ تکمیل کی منزل [illegible] تدریج ارتقا کی طرف بڑھتے رہنا بیک وقت تکمیل کی طرف ٹھوکر نہیں سے انسب و بہتر ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ میں ہر ماہ "ایشیا" کو رنگا رنگ حسن اور گونا گوں ترقی سے ہمکنار کرنے میں کامیاب ہوتا رہوں گا۔ اگر خدا کی توفیق اور مخلصین کی امداد شاملِ حال رہی۔

خاکسار
ساغر نظامی

"ادبی مرکز"
میرٹھ

"ایشیا میرٹھ"

جولائی ۱۹۳۵ء

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
شاد عظیم آبادی

ماہنامہ ایشیا

جلد ۱	ایشیا بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۵ء	نمبر ۱

اذکار و مباحث

ایشیا میں بیداری کی بے پناہ موج

اب یہ حقیقت مکمل طور پر واضح ہوگئی ہے کہ سویا ہوا ایشیا غفلت اور بے کیفی کی نیند سے بیدار ہو چکا ہے۔ نسل انسانی کے دو تہائی حصہ میں بیداری کی وہ حرکت سریع محسوس کیجا رہی ہے۔ جو قدرتی ضرور ہے لیکن مغرب کے نزدیک اس قدر جلد متوقع خیال نہیں کیجاتی تھی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بیداری مقدس اور شاندار بیداری اپنے پہلوؤں میں کس انجام کو پوشیدہ رکھتی ہے اور اس کی موجیں اپنی تموّج کا کیا مقصد رکھتی ہیں لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ مغرب اس سے شدید طور پر متاثر ہے۔ اور اپنے لئے ایک خطرۂ عظیم محسوس کر رہا ہے۔ ایشیا کی اس بیداری کی تحریک اور اس کی باگ ڈور جاپان کے ہاتھ میں ہے۔ جو دنیا کی دو عظیم قوتوں کے ساتھ بحری مساوات کا مطالبہ کر چکا ہے۔ مدبّرین کو خدشہ ہے کہ بحرالکاہل . . . . دنیا دامن دنیا کے لئے ایک سخت خطرہ کی صورت میں بدل جانے والا ہے جس کا مقابلہ دنیا کی ہر طاقت کے لئے غالباً ناگزیر ہو جائے گا۔

مشرق کی اس موج بیداری کے شباب سے اندازہ ہوتا ہے کہ بوڑھی دنیا کے مجوزہ اور مستعملہ نقشہ میں بالکل نئے خط پڑتے نظر آتے ہیں اور ایک قطعی نئی صورت حال پیدا ہو رہی ہے یورپ کے عاقبت اندیش مدبّرین اپنی تہذیب کے تحفظ کی اپیل کر رہے ہیں اور "شاندار امن" پیدا کرنے کی عظیم الشان آرزو کو آزادانہ بیان کرتے ہیں یہی نہیں بلکہ "اتحاد بین المغرب" کے لئے چیخ رہے ہیں۔ حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ ایشیا کے مقابلہ میں حقیقی طور پر کبھی یورپ کو متفرق و مختلف نہیں دیکھا گیا۔

وہ کہتے ہیں کہ مشرق کی یہ بیداری دنیا کے امن کے لئے مضر ہے اور اس کی "روک تھام" کرنی چاہئے۔ تاکہ امن عالم بحال رہے۔

اس عاقبت اندیشی کے طلسم کو پارہ پارہ ہوتے دیکھ کر ندیم ایشیا نے کہا ہے کہ ؎

اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ

یوروپ کو مستقبل قریب میں جاپان سے سخت خدشے معلوم ہوتے ہیں اور بلا شک چین میں جاپان کی حکمت عملی ان خدشات کی بڑی حد تک چغلی کھاتی ہے۔ لیکن جہاں تک چین کا تعلق ہے اسپر عرصہ دراز سے مختلف طاقتوں کی نگاہ شوق پڑتی رہی ہے۔ اور وہ جاپان ہی کیا روس اور امریکہ کی بھی جولانگاہ شوق ہے۔ وہ تو ایک قمار خانہ سیاست ہے جہاں دن رات ہر طاقت اپنی اپنی قسمت کی بازی لگاتی ہے۔ اور فتح و شکست کا تماشہ ہوتے ہوتے رہتا ہے۔

لیکن بہر حال جو کوئی بھی ایشیا کی بیداری سے آتش زیر پا ہے وہ گویا نظام قدرت کے مسلمات کو جھٹلانا چاہتا ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ مشرق اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ غلام اور بے بس ہے تو قانون قدرت کے مطابق اس کی غلامی اور بے بسی ختم ہونے کے بعد اعادۂ شعور کا عمل لازمی طور پر ہونا چاہئے کہ بے ہوشی کے بعد ہوش اور تخریب کے بعد تعمیر لازمی ہے۔ آج اگر وہ مشرق جو سینکڑوں تمدنوں سینکڑوں تہذیبوں اور بے حد علوم و فنون کا گہوارہ رہا ہے جو دنیا کے مذاہب کا مرکز ہے۔ روحانیت وارتقائے انسانیت کا تو کیا ذکر اس کی نوجوانی کی انگڑائی سے دنیا میں تباہی آجائیگی ہم جانتے ہیں کہ دنیا کی تباہی کا مغرب کو اس قدر خیال نہیں ہے جس قدر کہ وہ مشرق کی تعمیر سے لرزہ براندام ہو رہا ہے۔

لیکن بہرحال مغرب ہو یا مشرق۔ یہ قدرت کا نظام ہے کہ جاگنے والوں کو نیند آئے اور سوتے ہوئے بیدار ہو جائیں اس لئے اس بیداری کو جو ایران، ہندوستان افغانستان اور تمام تر اعظم ایشیا میں پیدا ہوئی ہے جس کو غیر قدرتی اور غلط نہیں کہا جا سکتا۔

یہ بیداری مشرق کے باشندوں میں بتدریج بڑھتی جا رہی ہے اور ایشیائی ہونے پر افتخار و سرفرازی کا جذبہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے ؎

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

ہندوستان باوجود اپنی انتہائی قید و بند کے جو اس کی مجلسی زندگی کو بھی متاثر کئے ہوئے ہے آزادی کا بے پناہ جذبہ اپنے اندر رکھتا ہے اور اپنی داخلی سیاست کی بے پناہ گتھیوں کے سلجھانے کے لئے کام کر رہا ہے وہ غلامی کی زنجیروں کو پاش پاش کر دینا چاہتا ہے اور مجموعی طور پر ہر شخص دل سے آزادی کا خواہاں ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ اس کی اس خواہش کو قانون اور خود اس کا افلاس کچل دینے کے لئے آمادہ رہتا ہے لیکن یہ خواہش اس کے دل میں اس درجہ جاگزیں ہو گئی ہے۔ کہ مٹائے نہیں مٹتی اور نہیں مٹنی چاہیئے۔

اس جاوید آرزو کے شعلے کی روشنی میں ایشیا کی نئی قسمت کے مقدس سراج منیر کی عالم افروز روشنی نظر آتی ہے۔ یقیناً ہندوستان کی آزادی تمام ایشیا کی آزادی ہے۔ اور ہم رفتہ رفتہ اس آزادی کے مقدس مندر کے قریب ہو رہے ہیں۔

ابی سینا اور اطالیہ

کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ اور موجودہ حکومتیں قدیم حکومتوں کی طرح ملک گیری کی ہوس کو ایک غیر انسانی اور مجرمانہ فعل خیال کرتی ہیں۔ لیکن آئے دن کی باہمی آویزشیں یہ بتاتی ہیں کہ "جمہوریت" محض ایک بہانہ ہے ورنہ حقیقی طور پر یورپ جو اس تصوّر کی تخلیق کا دعویدار ہے سخت متکبر اور شخصیت پرست واقع ہوا ہے۔ جہاں تک نظام ہائے سلطنت کا تعلق ہے جمہوری بنیادوں پر قائم ہے لیکن اعمال اور نتائج اسکے خلاف بالکل شخصیت پرستی پر منتج ہوتے ہیں

یہ خیال ایک بڑی حد تک درست ہے کہ یورپ میں آزادی کے جذبات کا زوال ہو رہا ہے اور مغربی حکومتیں نئے تجربات میں مشغول ہیں۔ جرمنی نے اس کی نمایاں مثال پیش کی ہے اور جو کچھ وہاں ہوا ہے یا ہو رہا ہے وہ اس دعوی کی دلیل ہے کہ ہٹلر تنہا طور پر جرمنی کی قسمت کا مالک ہے۔

اسی طرح موسیولینی جس کا پیام ہی دنیا کے لئے جنگ ہے ایک آہنی قسم کا انسان ہے اور اٹلی اس کے پنجہ آہنی میں ایک شاہین کی طرح اسیر ہے۔

اس کے پیکر میں قدیم روم کی جبیل روح ہے اور اس کے دماغ میں وہ استبداد ہے جو رومن دماغ کی خصوصیت تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کے جدید نقشۂ عمل کو دیکھا جائے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اٹلی کی جغرافیائی توسیع کا خواہشمند ہے اور اٹلی ابی سینا کی صلح کے امکانات کو ٹھکرا دینے سے ہی یہ واضح ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ارادے کی پختگی میں کوئی نرمی پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کی تازہ تقریر جس میں اس نے کہا ہے کہ اٹلی نے کبھی کسی سے منہ کی نہیں کھائی، اس کے ارادوں پر روشنی ڈالتی ہے۔

آئیے ہم سمجھیں کہ اٹلی اور ابی سینا کی یہ کشمکش کا آخر راز کیا ہے۔ ابی سینا سے اٹلی کی جنگ کی اولین وجہ سرحد کے قضیہ کے متعلق بتائی جاتی ہے۔ فروری کے باہمی تصادم کے بعد اٹلی اور ابی سینا نے مجلس اقوام سے اپیل کی۔ موسیولینی نے لیگ آف نیشنیز سے مطالبہ کیا کہ ابی سینا کو مجلس اقوام سے نکال دیا جائے۔ اس کے بعد کہا کہ ۴۹۹۰۰ ڈالر تاوان وصول کیا جائے اٹلی سے معافی چاہے یہی نہیں کہ بلکہ اس کے جھنڈے کو سلامی دے۔

یہ دفعۂ گفتگو دراصل ایک سیاسی فرصت حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ کیونکہ اس دوران میں وہ ہر ایک صورت حال کے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ اور فرانس و برطانیہ سے اس نے افریقہ میں اپنے ملک گیری کے ارادوں کو مکمل کرنے کے لئے رضامندی حاصل کر لی۔ نیز معاہدہ لوکارنو اور فرانس و برطانیہ سے دائمی معاہدہ کا حامی ہو جانے پر وعدوں کی مہر لگا دی۔

ابی سینا عیسائی شہنشائیت کے تابع ہے اور اس کی آبادی میں علاوہ عیسائی رعایا کے مسلمان بھی کافی ہیں۔ موسیولینی کا مقصد ابی سینا سے جنگ کو ناگزیر بنا دینے سے صرف یہ ہے کہ وہ افریقہ میں اپنی حکومت کی توسیع کرے اور ابی سینا پر قدرت حاصل کرنے سے اس کا بہت بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ ابی سینا کے علاقہ میں لوہا۔ تانبا۔ پیتل۔ ابرق۔ سونا۔ چاندی۔ پلاٹیم۔ ہاتھی دانت۔ قہوہ تمام خام مسالے موجود ہیں۔ اور جس طرح فرانس کو اس کا شام کا علاقہ جنگ کے اوقات میں عسکری امداد دے سکتا ہے اسی طرح ابی سینا بھی فوج دے سکتا ہے۔

لیکن بہرحال اطالیہ کی یہ خواہشات یورپ کے امن سے ٹکراتی ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان طاقتوں کی جنگی آرزوؤں کا انجام کیا ہوگا۔ بہت اچھا ہوتا اگر "انسانیت" کے اس تصوّر کو دنیا سے مٹا دیا جاتا جس کی جمہوری اور فارغ روح ہے کے دعوے یورپ کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس وقت یورپ کے جو سیاسی حالات ہیں وہ ہرگز اعتماد اور اطمینان کے قابل نہیں ہیں۔

مسلمانوں میں زندگی کی روح افزا تڑپ

سچ ہے کہ مکر و فریب کی عمر زیادہ نہیں ہوتی اور وقت خود ان حقیقتوں کو ہمارے سامنے لے آتا ہے جن کے خلاف منافق اور گمراہ کن طبقے عوام کو باطل اور فریب کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ چند سال پہلے مسلمان سیاسی اور مجلسی معاملات میں فرقہ پرست اور قدیم الخیال تھے۔ اور ان کو حالات کے ساتھ ساتھ فرقہ پرست اور خود غرض رہنماؤں نے غلط عقائد پر راسخ کر دیا تھا۔ لیکن تین راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں ان کے نتائج خصوصاً کمیونل اوارڈ مسلم کانفرنس اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے اندرونی مساعی کے انکشافات نے مسلم رائے عامّہ میں تبدیلی اور نرمی پیدا کرنے کا قدرتی موقع پیدا کر دیا ہے۔ اور ہر ملک کی نئی سیاسی صورت حال اور اسمبلی و کونسل میں کانگریس کی

نمایاں کامیابی سے ان تمام حقائق کا اندازہ ہوگیا جن پر غور کرنے کا موقع وقت نے نہیں دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ نوجوان نسل کی نمائندگی کرتے ہوئے میں پُرزور الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کو اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے کہ مذہبی و مجلسی اور سیاسی طور پر وہ زندہ نہیں رہ سکتے اگر انہوں نے اپنی زندگی میں انقلاب پیدا نہیں کیا۔

چنانچہ زندگی کے لمحہ بہ لمحہ مطالعہ اور ہمسایہ قوم کی روزافزوں بیداری و ترقی سے قدرتی طور پر متاثر ہوکر مسلمان قوم کے مفلوج پیکر میں زندگی کی وہ روح کارفرما معلوم ہوتی ہے جو ایک عظیم بیداری کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روح تمام مصمحل جسم میں زندگی کی موج نہیں دوڑا دیگی۔ گذشتہ برس کے دوران میں مسلمانوں کے لیڈروں نے اپنی قوم سے جو وعدے کئے تھے اور عوام کو آزادی کی تحریکات میں شریک ہونے سے دامن پکڑ پکڑ کر بٹھایا تھا اس کی تمام حقیقت طشت از بام ہوچکی ہے۔ اس کے علاوہ سمندر پار سے آنے والے "تحفۂ آزادی" کا جو شدید انتظار تھا وہ مایوسی کے ساتھ ختم ہوچکا ہے اور مسلمان سمجھ چکے ہیں کہ ان کے وہ رہنما جوان کی ترقی اور نئی زندگی کے دعویدار تھے جھوٹے اور خود غرض تھے ان کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ وہ اپنی ذاتی جاہ و عظمت میں اضافہ کریں اور نئے ہندوستان میں اپنے لئے اقبال و ترقی کی نئی راہ کھولیں مجلسی طور پر وہ سمجھ گئے ہیں کہ اگر وہ اس لکیر کے فقیر رہے جس کو وہ برسوں سے پیٹ رہے ہیں تو وہ نوجوان ہندو سے اس قدر پیچھے رہجائیں گے کہ ایک دن اس کا سرِ دامن چھونا بھی ان کے لئے ناممکن ہوجائیگا۔

چنانچہ عام طور پر سوشل زندگی میں آزادی اور استواری کے جذبات کی تیز روپائی جاتی ہے اور انکی نگاہوں سے برستا ہے کہ حالات اگر موقع دیں تو وہ قدامت کی اس جھول کو جو صدیوں سے ان کے وجود کے دوش نازک پر بارِ عظیم ثابت ہورہی ہے۔ دُہم سے پٹک دیں اور اپنی ہستی کی نئی جلوہ آرائیوں سے دنیا جہان کو خیرہ کردیں۔

وہ اخبار و رسائل جن کے لب اظہارِ حق کو جرم و کفر کا درجہ دیتے تھے اب آزادانہ ان حقائق کو بیان کرتے ہیں جو مسلمان کی سیاسی و مجلسی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو اعتراف ہے کہ وہ غلط راہ پر تھے۔ وہ اب اس راز کو سمجھ گئے ہیں کہ مسلمان قوم اسوقت تک زندہ نہیں رہ سکتی جب تک کہ وہ مجاہدانہ طور پر میدان میں نہ کود پڑے کہ آج سوال قدیم روایات زندگی کے بتوں کی پرستش کا نہیں ہے بلکہ اس نئے مندر کی تعمیر سب سے زیادہ اہم ہے جس میں بیٹھکر اپنی نئی زندگی کے عقیدہ حیات کی پوجا کیجا سکے

اور بلا شک وہ لوگ فلسفۂ جدید سے ناواقف ہیں جو اک عمر کے چھانے ہوئے راستوں میں زندگی کی راہ تلاش کررہے ہیں وہ راستے زندگی پر ہمیشہ کے لئے بند ہوچکے اب نیا دور ہے اس لئے نئی راہوں پر سفر ناگزیر ہے ہم کو اسوقت زندہ ہونا اور زندہ رہنا ہے لیکن زندہ رہنے کے لئے خوش یقینی کی ضرورت ہے۔ خودی کی ضرورت ہے۔ خودداری کی ضرورت ہے۔ محنت کی ضرورت ہے خود اعتمادی کی ضرورت ہے اور آزادی کی ضرورت ہے۔ یقین کرو کبھی مذبذب قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجاہدۂ حیات کے دوران میں بے پردگی اور پردہ داری، جہل و علم، آزادی و قید، ریش و بے ریشی۔ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے بے ضرورت خیالات میں قید رہنا خود کو زندہ دفن کردینے کے مترادف ہے۔ ؎

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی   خودی کی موت ہیں اندیشہ ہائے گوناگوں۔

سنو مسلم کانفرنس کا صدر اقبال آج کیا کہتا ہے۔ ؎

تو ابھی رہگذر میں ہے قیدِ مقام سے گذر   مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر

وہ اقبال جو سیاسی اور اخلاقی طور پر قطعی قدیم الخیال ہے بے تابانہ چلاتا ہے ؎

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور   ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر

جس کا اعتقاد سیاسی طور پر صرف غلامیٔ افرنگ تھا وہ مسلمانوں سے خطاب کرتا ہے ؎

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار   طائرک بلند بال دانہ دام سے گذر

وہ مغربی تہذیب و مغربی کلچر کو "دانہ دام" سے تعبیر کرتا ہے اور دنیا کی فضاؤں سے بلند ہوکر فرشتہ وار لاہوتی نغمہ گاتا ہے۔

جس کا عمل ہے بے غرض اسکی جزا کچھ اور ہے   حور و خیام سے گذر بادہ و جام سے گذر

عمل کی روحانیت اور افضلیت کا اس سے بہتر بیان اور کیا ہوسکتا ہے۔ وہ جزا کیا ہے! جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے وہ جزا "حیات" ہے اور محض حیات نہیں حیات جاوید جو اسی وقت نصیب ہوسکتی ہے جب کسی قوم کی زندگی شانداری اور عزت کے ساتھ بسر ہو۔ تاریخ کے صفحات روزانہ ان قوموں کے لئے لعنت کے سامان مہیا کرتے ہیں جنہوں نے زندگی کو نہیں سمجھا اور ہر صبح برکت و رحمت کا قصیدہ گاتی ہے ان اقوام کی شان میں جنہوں نے زندگی کی قدر کی۔ خدا کا شکر ہے کہ بالآخر مسلمانوں میں ایک حرارت خفی کے آثار پائے جاتے ہیں جو ان کے رگ و پے میں تازہ اور جوان خون پیدا کرکے رہے گی۔ آخر ؎

کب تک رہے محکومی انجم میں میری خاک   یا میں نہیں یا گردش افلاک نہیں ہے

فراموش کار دوستوں سے

اگر محض دوستی اور اس کے نتائج سے لطف اندوز ہونے اور زندہ رہنے کا سوال ہوتا تو اس سے زیادہ دلچسپ اور شاعرانہ کیفیت اور کیا ہوسکتی تھی کہ میں اپنے دوستوں کی فراموش کاریوں کے تصور میں ڈوبا ہی رہتا۔ نہ خو چھوڑنے کا شکوہ ہوتا نہ "وضع" پر خوددارانہ اصرار" نہ سبک سری" کی نوعیت اور نہ "سرگران" ہونے کے متعلق استفہام مگر آج سوال ہے کام کرنے کا اس لئے عملی توازن کے لحاظ سے "وجدان" کو نظر انداز کرنے کے بعد کام کرنا چاہئے۔ یہ حقیقت غالباً نا ذکر کرنے کے قابل ہے کہ میں ہندوستان میں اپنے دوست ہی کی دوست رکھتا ہوں اور میں نے اپنے خیال میں کبھی کسی کو دشمن نہیں سمجھا۔ پھر اس کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی تقسیم کیجائے۔ یعنی ؎

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

میں اپنے تمام واقف کاروں اور دوستوں کو "وہ فراموش کار ہوں یا یاد رکھنے والے" زندگی اور عمل کی طرف آواز دیتا ہوں۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی رہبری اور مخلصانہ امداد و مشورہ سے میری مدد فرمائیں اور متحد ہوکر قومی خدمت میں میرا ہاتھ بٹائیں ؎

"گرم فغاں ہے جرس اٹھ کہ گیا قافلہ"

معذرت

عین اسوقت جبکہ ایشیا کے موجودہ نمبر کی طباعت کا کام شروع ہونے والا تھا کہ مجھے مجبور کردیا گیا کہ فردوس کشمیر کی سیر کے لئے روانہ ہوجاؤں۔ ایک وقت تو وہ تھا کہ سیر کشمیر کی آرزو بیتاب کئے ہوئے تھی لیکن جب قدرت نے اس کے سامان بہم پہنچائے تو میں بہت رد و کد کے بعد کشمیر کے لئے روانہ ہو سکا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ کشمیر کی سیر کرنے کے لئے بہت بڑی قربانی کرنی ہوگی۔ اودھر بادہ مشرق کا کام آخری منزلوں میں تھا ادھر ایشیا کی تیاری۔ کوئی شک نہیں کہ اگر میں کشمیر نہ جاتا اور وہاں تقریباً ۲۰ روز صرف نہ ہوجاتے تو اسوقت تک دونوں

چیزیں کبھی کی شائع ہو چکی ہوتیں - یہ معذرت فرض شناسی کی مادیت کی ادنیٰ مثال ہے - ورنہ جہاں تک کشمیر اور اس کے تمام جمالیاتی تعلقات کا تعلق ہے وہ حقدار ہیں کہ یہ وقت اور زندگی دونوں انہیں خوشی سے نذر دیدیئے جائیں - اگر میرا شمار موجودہ زمانہ جد وجہد وعمل کی مخلوق میں نہ کیا جاتا تو مجھے کاموں کی تاخیر اور حسب آرزو تکمیل نہ ہونے کا ہرگز افسوس نہ ہوتا - لیکن ایشیا کی اور بارہ کی اشاعت میں تاخیر ہو جانے کی اور اس تحریر میں کتابت کی بعض غلطیاں رہجانے سے مجھے تکلیف ہوئی - کاپیاں اور پروف میری نظر سے نہیں گذرے - ناظرین اپنے خیال میں ان اغلاط کی تصحیح فرمالیں

آخر میں میں مسٹر اقبال احمد بی اے ایڈوکیٹ - اعظم صاحب اور راحد صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ایشیا کے اہتمامات میں مجھے بیحد مدد دی - گو میں جانتا ہوں کہ ان سب کے خلوص کو میرے شکریہ کی ضرورت نہیں ہے -

یاد رفتگاں

آغا محمد شاہ حشر کاشمیری

ہندوستان کے ادیب شہیر حضرت آغا محمد حشر کاشمیری جنکا انتقال لاہور میں ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو ہوگیا، ملک کی ان عظیم ہستیوں میں سے تھے - جو انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے قومی لٹریچر علی الخصوص اردو و ہندی ادب کو آغا حشر کی موت سے ایک نا قابل تلافی نقصان پہونچا ہے - وہ ایک جامع کمالات وصفات انسان تھے اور سچے قوم پرور تھے ان کی ادبی طاقتیں تمام حیات اردو و ہندی ادب کی ترقی و توسیع میں صرف ہوتی رہیں اور انہوں نے اپنے ڈرامہ کے ذریعہ وہ اصلاحی قومی اور مجلسی آزادی کی روح ہندوستانیوں میں دوڑائی جو اس سے قبل کسی نے نہیں دوڑائی تھی - وہ ہر قوم سے گہرے تعلقات رکھتے تھے اور ہر قوم کی مذہبی وتمدنی تاریخ سے اچھی طرح واقف تھے - یہی وجہ تھی کہ ان میں قومی عصبیت کا شائبہ بھی نہ تھا -

اس وقوف اور خداداد عقل سلیم نے انہیں ہمیشہ فرقہ پرستی اور قوم فروشی سے دور رکھا انہوں نے جو کچھ کیا وہ ہندوستانی قوم کے لیئے کیا - اور انسانی ذہن ودماغ کے لئے وہ اپنی زندگی میں اسقدر لٹریچر پیدا کر گئے - کہ وہ قیامت تک ان کی عزت وعظمت کو انسانوں کے دلوں میں قائم رکھیگا - وہ حقیقی طور پر نیشنل ڈرامانگار خوش فکر قومی شاعر اور جادو بیان مقرر تھے - انہوں نے اپنی جادو بیانی او معجز نما آرٹ سے تمام ہندوستان کے قلوب کو مسخر کرلیا تھا -

ہندی زبان کے "نورتن" کے بعد آغا حشر پہلا شخص تھا جسنے ہندو قوم میں ہندی زبان کے احیا کی تحریک کو راسخ کیا اردو وہندی زبان کا ایسا نکھرا ہوا معیار پیش کیا - جو اس سے پہلے کسی ہندی شاعر اور ادیب نے پیش نہیں کیا تھا - آغا حشر کی عظمت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے - کہ انہوں نے ہندوستان کی مختلف تہذیبوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اپنے وطن پرور قلم سے تمام قوموں کو ایک مرکز پر متحد کرنے کے لئے کام کیا - مجھے انکی موت کا صرف ایک ہم عصر اور ہم مذاق ہونیکی حیثیت سے ہی رنج نہیں ہے بلکہ گہرے دوست ہونیکی حیثیت سے بھی میری آنکھیں ان کے لئے غمناک ہیں - میں اس غم میں جوان کی المناک موت سے ان کے بھانجوں اور خصوصاً ان کے چھوٹے بھائی جناب محمود کو ہوا ہے دل سے شریک ہوں اور ایشیا کی کسی اشاعت میں "آغا حشر کے ساتھ چند دن" کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کرونگا جو ناظرین کی بہت سی دلچسپیوں کا موجب ہوگا - خدا ان کو جوار رحمت میں جگہ دے -

میر سید ممتاز علی

آغا حشر کے بعد ہی تہذیب نسواں اور دارالاشاعت پنجاب کے بانی میر سید ممتاز علی رحمۃ اللہ علیہ کی موت اردو دنیا کی انتہائی بدقسمتی ہے - ابھی ایک داغ مٹا نہیں تھا کہ دل پر دوسرا داغ لگا - میر سید ممتاز علی ان بزرگوں میں سے تھے جن کی ذات اردو زبان کے لئے نہایت مغتنم تھی اور جنہوں نے اپنے رسائل و اخبارات کے ذریعہ طبقۂ نسواں اور ہندوستانی ذہن و دماغ کے لئے بہترین سامان فراہم کیا -

مجھے اس سلسلہ میں میر صاحب مرحوم کے صاحبزادے سید امتیاز علی تاج بی اے سے دلی ہمدردی ہے - خدا ان کو صبر عطا فرمائے -

مظہر حسین اختر میرٹھی

زندگی کا سب سے المناک فرض شاید اپنے کسی عزیز دوست کے لئے آنسو بہانا ہے - پھر رونا یہ ہے کہ یہ آنسو بہانا بھی اسکو زندگی پھر واپس نہیں لاتا - مظہر صاحب میرٹھ کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے، اردو ادب سے ان کو گہرا شغف اور اردو شاعری سے پختہ ذوق تھا - متقدمین ومتاخرین کا کلام انہیں ازبر تھا - حالیہ شعراء کے کلام کے متعلق روشن رائے رکھتے تھے - نہایت خلیق و شریف بیحد متواضع اور نیک - نہایت صابر و قانع اور بہت ہی بہتر انسان تھے - دن رات ان کے ساتھ صحبتیں رہتی تھیں اور میرے ان دوستوں میں سے ایک تھے جنکو میرے ہر کام سے گہری دلچسپی اور خصوصاً ادبی جد وجہد سے شغف تھا افسوس ہے کہ کئی ماہ کینسر کی تکلیف میں مبتلا رہ کر بالآخر مجلس کو سونا کر گئے - ان کی موت نے مجھے ایک مخلص ادبی رفیق اور ایک آزاد نقاد امور سے محروم کردیا مجھے ان کے اعزا خصوصاً بیگم مظہر اور ان کے بھائی سید وصال حسین صاحب بی اے بی ایس سی سے دلی طور پر ہمدردی ہے - خدا مظہر مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے -

فروغ شمع جواب ہے رہیگا صبح محشر تک — مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

ساغر نظامی

عمر خیام کی رباعی کا ایک تصویری تخیل

رُوح کا شُعلہ

پٹ مندر کے کھول پُجاری پٹ مندر کے کھول

پریم نگر سے آئی میں داسی پٹ مندر کے کھول   ہیرے موتی لائی میں داسی پٹ مندر کے کھول
وہ موتی ہیں تیج سے جن کی چندرماں چُھپ جائے   وہ ہیرے ہیں جوت جنھوں کی سورج کو شرمائے
نین کا کانٹا ہے ان کو اس کانٹے میں تول
پٹ مندر کے کھول

صبح سویرے پپیہا کس نے بنسی کا یہ راگ   آنکھ کُھلی ایسے میں میری' یہ بھی میرے بھاگ
کوئل' مور' پپیہا' شاما سب سوویں نر ناری   گہرے سپنے میں ڈوبی ہے' سپنے کی متواری
سارا جگ مردہ ہے پُجاری' ہیرے موتی رول
پٹ مندر کے کھول

دور کہیں اک جھرنا گاوے سپنے کے سے راگ   لُٹنے کو ہے دن کے ہاتھوں' تاروں کا سُہاگ
سکھیاں اپنے ہٹ میں لیٹی کریں دلوں کی کھود   جمنا دُھندلا درپن ہے اور پنگھٹ سونی گود
پنگھٹ پر ہر کوئی چُپ ہے گری' گگری' ڈول
پٹ مندر کے کھول

دو نینن میں سو آنسو ہیں دیوانی کی بھینٹ   نین مرے ماٹی ہیں کیول' بھینٹ ہے یہ اَن میٹ
اُس مندر کے کھول ذرا پٹ جس میں ہیں گردھاری   وہ گردھاری جن پہ ساری دنیا ہے بلہاری
کب سے میں چیخوں بیچاری سُن تو میرے بول
پٹ مندر کے کھول

جیون میرا روپ بدل کر بن جائے ایک ہار   اُن کے گلے کا ہار پجاری' میرا من سنگھار
مجھ کو گلے یوں پڑتے دیکھیں دیوی وہ من ہار   گُندھ جاویں اک ہار میں دونوں سنسار اور ساکار
تجھ کو کیوں ہے عار پجاری کچھ تو مُنہ سے بول
پٹ مندر کے کھول

جیون کیا ہے ایک رسیلا اور اَمر سنگیت   پریم نگر میں نہیں پُجاری مر جانے کی ریت
جھانجھ کی لَے پر دھرتی ناچے اور جھومے آکاس   تال پہ میرے گھونگھرو کی ترلوک ہیں ہووے راس
میرے مَد کے آگے پُجاری دُنیا کا کیا مول
پٹ مندر کے کھول

میں پگلی' اب جاؤں کدھر کو چھوٹے مُنہ سے بول   پٹ مندر کے کھول پُجاری' پٹ مندر کے کھول
جوبن اور جوبن کی مستی سب کچھ بھینٹ چڑھاؤں   جگ ڈھونڈے ہر یُگ میں مجھ کو میں اُس میں کھو جاؤں
پاگل' کامی' چنچل' پاپی' مت ہو ڈانواں ڈول
پٹ مندر کے کھول

ساغر نظامی

۹

مسئلہ مشرق اور ترک

ترکی قوم اور دنیا میں اسلام کا مستقبل

پیغمبرِ اسلام کا ارشاد ہے کہ "جو شخص بصیرت سے کام لیگا خود بھی فائدہ میں رہے گا اور جو اندھا بن جائیگا خود ہی نقصان اٹھائے گا۔" مشرق نہایت بے صبری کے ساتھ مغرب کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اور اقوام عالم کے زمرے میں شریک ہونا چاہتا ہے خصوصاً مشرقی دنیائے اسلام اپنی مشہور قدیم تہذیب کا واسطہ دیکر اتحاد بین الملل میں حصہ لینے کی خواہشمند ہے۔

ان تحریکات کو جو حقیقتاً نہایت ہی پُر خلوص صاحب رائے کی تدبیر کا نتیجہ ہیں گندم نما جو فروش سیاست دانوں نے اپنے ہم خیالوں کے مفاد کے لئے بالکل بگاڑ دیا ہے اور جذبات انسانی کی دائمی کشاکش کی تنظیم کا سوال درپیش ہوتا ہے تو بہت الجھی ہوئی مبہم اور ناقابل عمل نظر آتی ہیں لیکن تاریخی انداز کے پردوں پر مشرق و مغرب کے تصادم کا جو منظر صدیوں سے ظاہر ہو رہا تھا اب نئی شکل اختیار کر بیٹھا ہے اور روز بروز ناگوار تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ دورِ حاضر کی جمہوریت اس مسئلہ کو طے کرنے میں جس قدر ناکام ثابت ہوئی ہے انسانیت کا افق اتنا ہی زیادہ دھندلا ہوتا جاتا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے خیالات میں کم از کم وہ صفائی اور سنجیدگی ضرور پیدا کر لیں جس کے بغیر ہم کو کوئی حق نہیں کہ صاحب غور کہلائیں نیٹشے نے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ تہذیب مغرب کی قسمت ایشیا کے معاملات سے کس قدر وابستہ ہے۔ اپنی تصنیف "ماورائے خیر و شر" میں وہ یورپ کا نام انتہائی غصہ اور حقارت کے ساتھ لیتا ہے یعنی وہ ملک جو براعظم ایشیا کا محض ایک منحوس جزیرہ نما ہے اور روحانی فوقیت کا دعویدار ہے صرف اس لئے کہ وہ موجودہ ایجادات کا بانی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ایشیا کی اس روح رواں کو اب تک قطعی نہیں سمجھ سکا جو تمام بڑے مذاہب اور فلسفیانہ نظریوں کی (جو ہمیں ورثہ میں ملے ہیں) خالق ہے نیٹشے کے ان الہامات کی تصدیق واقعاتِ حالیہ نے پوری پوری کر دی ہے۔

علم معاشرت نے بیشک یہ کوشش کی ہے کہ تمام مظاہرات تمدن کو محض واقعات اعداد یا صیغۂ ضوابط کی شکل میں لے آئے لیکن مسائل انسانی کے اخلاقی اور روحانی پہلو نے مادہ پرستوں پر ایک زبردست انتقامی حملہ کر دیا ہے بلکہ ہر فرقہ کے وہ ماہرین معاشرت اس سے اثر پذیر ہیں جنھوں نے اب تک صرف اس لئے ایشیا سے بے اعتنائی برتی کہ وہاں صنعت و حرفت کی کمی تھی کیونکہ ان کے نزدیک یہ کمی غیر مہذب ہونے کے مرادف ہے اور اب تجارت بین الاقوام کے متعلق اپنے یقین باطل سے چونک کر مغرب کو اسی مشرقی مسئلہ کا ایک نئی اور شدید اضطراب انگیز شکل میں سامنا کرنا پڑا ہے۔

یورپ کی مادی ہوس نے جو سوال اول اول اٹھایا تھا اور جس پر عالمان دین کی دھواں دھار تقریروں نے مذہبی رنگ چڑھا دیا تھا۔ اب جنگ عظیم کے زمانہ سے وہ سوال اخلاقی اور روحانی عظمت کا حامل ہے یا بذات خود ایک معیار ہے جس پر اُن تاریخی قوتوں کا توازن کیا جا سکتا ہے جو انسان کو جدھر چاہتی ہیں ڈھکیل دیتی ہیں۔ ان تاریخی قوتوں میں اسلام ایک زبردست روحانی و اخلاقی جزو ہے جس سے چشم پوشی ممکن نہیں بشرطیکہ ہم کو مشرق اور مغرب کے آئندہ تعلقات کا مسئلہ طے کرنا ناگزیر ہو اسی وجہ سے عراق عرب کی مردم شماری کی نسبت ترکی کا انقلاب کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ انقلاب اپنے گہرے معنی میں سیاست یورپ کے حدود سے باہر ہے جو اتنے عرصے سے انہیں متروک نظریوں کا پابند چلا آتا ہے اور اپنی پرانی روایات پر قائم ہے حالانکہ وہ ترکی کی صرف مالی حالت پر روشنی ڈال سکتا ہے اور اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کر ہی نہیں سکتا جو آج تک یورپ کے کسی مدبر نے نہیں سمجھی۔ ذرا غور تو کیجئے لاسین کانفرنس میں ترکوں کے خلاف بحیثیت ایک مسلمان قوم کے کتنی تجارتی مالی اور انتظامی شکایات پیدا ہوئیں قسطنطنیہ میں فرنچ چیمبر آف کامرس کی درخواست پڑھئے جو معاشی فوائد کے موافق ہے اُن مذہبی بحثوں کو بغور سنیئے جو مشرق میں عیسائیوں کی بہبودی کو خطرے میں ڈالنے کے لئے کی گئیں اور اس درخواست کا مطالعہ کیجئے جس پر عیسائیوں اور یورپ کے تمام بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں اور امریکہ کی دینی جمعیت کے دستخط ہوئے۔ ان تمام پُر اثر درخواستوں کی تہ میں آپ کو روح ایشیا اور اسلام کے متعلق ہمیشہ خیالات باطل نظر آئیں گے۔ اسی لئے مجھے یہ ضرورت ہوئی کہ آپ کی توجہ مشرق کی اور خصوصاً اسلام و ترکی کی روحانیت کی طرف مبذول کراؤں۔ اس کی اہمیت کم سے کم ان خطروں سے کسی حالت میں کم نہیں جو آجکل مشرق کے کاروبار پر چھائی ہوئی ہیں۔ آج دنیا کے اتحاد روحانی کی امید کا انحصار سب سے زیادہ اس انقلاب پر ہے جو جلد یا بہ دیر ایشیا اور خصوصاً اسلام کی روح میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اسلام جس کی گزشتہ مسلمہ قوت و خوشحالی نے بےشمار حاسد پیدا کر لئے تھے۔ صرف اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اس کی آواز پر ہمدردی کے ساتھ کان لگائے جائیں یا مساوات کی درخواست پر توجہ کی جائے۔ ممالک اسلامی میں جو خزانے پوشیدہ ہیں ان کو نکالنے کے لئے اسلام سے دوستی کی ضرورت ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ دوستی معمولی سیاسی فریب کاریوں سے خریدنے کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ روح مشرق کی طرف ایک ہمدردانہ محبت بھری نظر کی متمنی ہے۔

جس تحریک نے عراق عرب میں اتنا زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کی حقیقت

مغرب نے اچھی طرح نہیں سمجھی ہے یہ واقعہ صرف تاریخ ترکی ہی میں ایک خاص اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اس سے باہر بھی کافی اثر جمائے ہوئے ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس کی ابتدا اور کیفیت کو اختصار کے ساتھ بیان کر دوں اور وہ سیاسی نکتہ بتا دوں جو اس کی تہ میں موجود ہے۔

۲

دنیائے اسلام اور ایشیا سے مغربی یورپ کے آیندہ تعلقات کا مسئلہ سیاست عالم کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور ایک نہایت گہرا اور فیصلہ کن سوال سمجھا جاتا ہے باسفورس سے گنگا تک، باکو سے ہرات تک، انگورہ سے کابل، دہلی، شملہ، کلکتہ، اور بمبئی تک ہر جگہ یہی سوال اٹھایا جاتا ہے کہ آیا یورپ اور ایشیا مشرق اور مغرب ایک قابل رہائش دنیا کی از سر نو تعمیر کے متعلق کبھی دوستانہ وار ہمخیال ہو سکیں گے یا نہیں۔ یا پھر صاحب ہمت ہادیوں اور اعلیٰ دماغوں کے قحط کی وجہ سے یورپ ایک خالص مادی تہذیب کا دیوانہ ہو کر آخرکار اپنی ظالمانہ کشمکش میں ایشیا سے مغلوب ہو کر بیٹھ جائیگا۔

تمام اہل معاشرتی تجاویز جو اصلاح یورپ کے سلسلہ میں زیر بحث ہیں صرف اسی وقت قابل عمل ہو سکتی ہیں جب مسئلہ مشرق کسی ایسی نئی بنا پر پوری پوری طرح طے ہو جائے جو ہدایات عقل و فہم کے مطابق ہو یعنی حاکم بہترین طریقوں سے محکوم کی ایسی رائے حاصل کرے جو اس کی ضروریات پر حاوی ہو جس میں وحشیانہ استبداد یا تجارتی خود غرضیاں شامل ہوں اور جو رعایا کی فلاح و بہبودی کی پوری پوری موید ہو۔ ایک قوم پر دوسری قوم کے بے سوچے سمجھے معاشرتی حملے اب قطعی ناممکن ہیں ۱۷۷۶ء میں امریکہ کی جنگ آزادی جن معاشرتی انقلابی تبدیلات کا نتیجہ تھی وہی اب ایشیا میں ہیجان پیدا کر رہے ہیں۔ اور جس معاشرتی عاقبت بینی اور اندیشی عقل و دانش نے کنیڈا، آسٹریلیا، اور جنوبی افریقہ کو ایک بڑی حکومت کے رشتہ میں منسلک کیا۔ کیا اب بھی شاید وہی اس شدید تنفر کو دور کر سکے جو مشرق بر سر دل پر چھایا ہوا ہے۔ دنیا کی جدید تعمیر کی تمام پر فریب بڑی بڑی تجاویز ناکام ہو کر رہیں گی جب تک کہ مغرب اقوام مشرق کے لئے کوئی مناسب مقام تلاش نہ کرے۔

حکمران اقوام میں قوم ترک بذات خود اس قدر سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس پر وہ بلا شرکت غیرے راسین سے اب تک حکمران چلی آئی ہے۔ یورپ سے ایشیا کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کی کنجی ترکوں کے ہاتھ میں ہے "اور صرف اجازت چاہتا ہے" ان راستوں پر سے گزر سکے جو شخص اسلام پر حکومت کرے خواہ تلوار کے زور سے یا قوت روحانی سے ترک ہو یا انگریز فرانسیسی ہو یا روسی وہی ایشیا کی کنجی اپنے قبضہ میں رکھتا ہے اور جو شخص ان کنجیوں کو اپنے ہاتھ سے نکل جانے دے خواہ وہ ایشیا ہی میں بڑے بڑے وسیع رقبوں کا مالک کیوں نہ ہو کبھی بے خوف نہیں بیٹھ سکتا ترکی کی اہمیت حقیقتاً اس امر میں پوشیدہ ہے جو تاریخ سیاست کی گزشتہ پانچ صدیوں نے ظاہر کر دیا ہے یعنی ایشیا سے متعلق بڑی بڑی قوتوں کے باہمی تعلقات کا دارو مدار اسی قوم پر ہے۔ جنگ ترکی کے موقع پر جن احساسات اور جذبات نے قسطنطنیہ کو دہلی سے متحد کر دیا تھا۔ وہ اس دعوے کی بین دلیل ہیں لائڈ جارج نے بھی مجبوراً ہندوستان کے مسلمان نمایندوں کو اس بحث مباحثہ میں شرکت کے لئے مدعو کیا جو سلطنت برطانیہ اور ٹرکی کے درمیان ہو رہا تھا۔ یہ واقعہ چھوٹا سہی لیکن اہم ضرور ہے اور خود جس واضح طور سے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ انگلستان کے دل میں ترکی کتنی اہمیت رکھتا ہے تاریخ کے سو صفحے بھی مشکل سے پیش کر سکیں گے۔ فی الحقیقت اس بات کا اقرار بے خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ صدی میں جس میں ممکنات کی کوئی حد و شمار نہیں سلطنت برطانیہ کی قسمت اسلام کی قسمت سے بہت مستحکم بندھی ہوئی ہے۔

یہی باعث ہے کہ اسلام سے ترکی کا طرز عمل مغربی اور وسطی ایشیا کے متعلق تمام معموں کی کنجی ہے۔ ایک زبردست جنگجو قوم یعنی ترکی جو اپنی شاندار روایات کی مالک ہے تمام اہل اسلام کی آیندہ ترقی کی راہیں قائم کر سکتی ہے بشرطیکہ تہذیب مغرب کی جانب جو اس کا رجحان ہے اس کی ماہیت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے۔ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۳ء کے درمیان عراق عرب میں قومی جنگ و جدال کے موقع پر سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ترکی کو یورپ کے مقابلہ میں انقلاب اسلامی کا ہراول بنایا جائے یا ایشیا اور یورپ کے حدود پر مغرب کا عقب لشکر قرار دیکر اسے اپنی خواہشات کے مطابق اپنی عجیب و غریب تاریخی زندگی کے خوشگوار ترین لمحات سے لطف اندوز ہونے دیا جائے ترک یورپ کے موافق ہوں گے یا مخالف؟ موجودہ بے چینی کے دوران میں یہ سوال چشم پوشی کے قابل نہ تھا۔ درآں حالیکہ چھوٹی چھوٹی قومیں بھی جو نہ اتنی طاقتور ہیں اور نہ اپنی گزشتہ عظمت کا اس قدر احساس رکھتی ہیں اس قابل ہو گئی ہیں کہ موقع کے لحاظ سے تہذیب مغرب کے لئے مفید یا خطرناک ثابت ہو سکیں حقیقتاً سلطنت ترکی ایشیا کی سیاسی دنیا میں ایک نہایت ــــ کارکن قوت ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ترکی دوستی کئے بغیر تعلقات کا قائم رکھنا اور ساتھ ہی اس کی خصوصیات کو سمجھنے کے لئے مستعد رہنا کوئی ممکن کام نہیں خصوصاً ایسے موقع پر جب اس نے یہ طے کر لیا ہے کہ عراق عرب کی اندرونی تعمیر میں ہمہ تن مصروف ہو جائے۔ اور جب وہ صرف ایک چیز طلب کرتی ہے یعنی اقوام عالم میں سے ایک قوم بنکر رہنے کا حق۔

جب سے ترک پہلی مرتبہ تاریخ میں رونما ہوئے ہیں یورپ ہمیشہ اس کوشش میں رہا کہ اس کے صفحات سے ان کی ہستی مٹا دینے کی کوئی صورت نکل آئے۔ اور گزشتہ چھ صدیوں سے جو نمایاں حصہ وہ تاریخ میں لے رہے ہیں اس کا خاتمہ ہو جائے۔ دو سو سال کی متواتر کاوش کا نتیجہ یہ ہے کہ "تین براعظم اور تین سمندر" جن پر حکومت کرنے کا فخریہ اظہار سلطان استنبول کے خطابات میں پایا جاتا تھا آج صرف ایک تاریخی یادگار رہ گئے ہیں۔

قسمت کی ایک کاری ضرب کھا کر ترکی نے اپنے اصولی مسئلہ میں سادگی پیدا کر لی ہے اور سیاسی نکتہ نظر کو چھوڑ کر پھر اسی حالت پر آ گیا ہے جو اسے تیرھویں صدی کے وسط میں حاصل تھی جب اسے سلطنت سلجوقی کے دروازہ پر جو زندگی کے سامان تلاش کر رہی تھی دستک دینی پڑی اپنی قومی سرزمین پر جسے شاید فطرت نے انہی کے استعمال کے لئے منتخب کیا ہے جب ان کو ایسے شمول کا خطرہ ہوا جو صدیوں سے للچائی ہوئی نظریں جمائے ہوئے تھے تو ترکوں نے ہمیشہ ایک نئی قوت از سر نو حاصل کر لی۔ انقلاب روس نے جب ان تمام ریشہ دوانیوں پر پانی پھیر دیا جو پیٹر اعظم کے بعد پھیلائی جا رہی تھیں تو ترک منصہ سیاست پر ایسی خوبصورتی کے ساتھ آ گئے گویا کہ جوانی پھر عود کر آئی۔

آخر اس کی کیا وجہ کہ وہ غیر معمولی تغیر جو انقلاب روس نے مسئلہ مشرق کے تمام اجزا میں پیدا کر دیا مغربی قوموں کے لئے مفید ثابت نہ ہو سکا جو ۱۹۱۸ء میں کوشش کر رہی تھیں کہ مشرقی تحریک اصلاح کے سیاسی پہلو پھر حاصل کر لیں۔ یہ کیا کہ اسلام جو انیسویں صدی میں لندن اور پیرس پر تمام تر توجہ جمائے رہا ماسکو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جہاں ایک اصول جو قطعی منافی اسلام ہے ایک پر غلبہ کئے ہوئے ہے جس کو ۱۹۱۷ء تک مشرق اپنا قدیمی دشمن سمجھتا رہا ــ مناظر کا یہ غیر متوقع تغیر اور مشرقی ڈراما کا نرالا انداز صرف یورپ کی عام رائے کی نا سمجھی کا نتیجہ ہے جو مشرق

کی نہایت ہے) تعصب اور سب سے زیادہ غیر متعلق مصنوعی اثرات کا محکوم ہونے کی وجہ سے کبھی نہ سمجھ سکا کہ تہذیب مغرب کی قسمت کا تمامتر انحصار صرف اس بازی پر ہے جو اس کا اور ایشیا میں لگی ہوئی ہے۔ خود انگریزی پبلک رائے اس اہمیت کو سمجھنے سے ابھی بہت دور ہے کہ وہ اہم ترین شاہراہیں جو یورپ کو ایشیا کے دور دراز گوشوں سے ملاتی ہیں اسلام کے ہاتھ میں ہیں وہ عین ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک میں ہو کر گزرتی ہیں اور دنیا کی معاشرتی زندگی میں شریانوں کا کام دے سکتی ہیں بشرطیکہ وہ جن انجام میں پھیلی ہوئی ہیں وہ کم سے کم ضروری طاقت حاصل کرتے رہیں۔ جغرافیہ کے دائمی قوانین نے عہد ہائے قدیم سے ان تمام بین الاقوام شاہراہوں کو تمام بڑی تاریخی لڑائیوں کی علت نمائی قرار دے دیا ہے۔ جب تک ترکی قوم کے پاس ان اہم شاہراہوں کی کنجی موجود ہے مغربی قوتوں کو ترکی کے خلاف جد و جہد سے بچکر اس سے تعلقات رکھنے پڑیں گے۔

بدقسمتی سے چند الفاظ کے استعمال نے جو علمائے دین کو بہت عزیز ہیں یہ سوال ذرا مبہم سا کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے بنی نوع انسان پر اتنی مصیبت نازل نہ ہوتی اگر ایک مصنوعی محبت انسانی اس پر غلبہ نہ کر لیتی۔ یہ بدستور اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا تو سیاست اس کے مدعا سے بخوبی واقف تھی (یعنی عالمگیر طاقت کے توازن کا مسئلہ) حق تو یہ ہے کہ یورپ کی سیاست تعصب مذہبی سے کبھی پاک نہیں رہ سکی خصوصاً اسلام کے مقابل میں۔ اور موجودہ عیسائیت نے گزشتہ صدیوں کی مذہبی پالیسی پر ہمیشہ لعنت ملامت کی ہے اور یہ وہی پالیسی ہے جس میں تعصب کے وہ جراثیم شامل ہیں جو بائی زنٹائن کے مورخوں نے مغربی خیالات کے پاس ترکہ میں چھوڑی ہے۔ یہ مورخ خلافت اسلام تحریک کے زبردست بانی مبانی تھے۔ اور مشرقی معاملات کے بارے میں یورپ کے خیالات کو اپنی یاوہ گوئی سے اسی طرح برگشتہ کر دیتے تھے جس طرح شکست خوردہ قومیں فاتح سے انتقام لینے اور اُن کی تذلیل سے خوش ہونے کے لئے عموماً کیا کرتی ہیں۔ جبر و اختیار کا مافذ مدت دراز تک یورپ کا تعصب رہا ہے جو مشرق کے ساتھ تھا۔ اور جب تک عیسائیت کو خطرۂ ترکی رہا عیسائی قوتوں کے ماہران سیاست ان کو فوراً سپرد قلم کرتے رہے۔ ایک پوپ صاحب یعنی پایس ثانی نے جو بڑا آدم دوست تھا اور اینیز سلویس کے نام سے معروف تھا۔ ترکوں کے خلاف تیاری کرنے سے پہلے ہی مسئلہ عثمانی کو حل کرنے کے لئے ایک عجیب سیدھی سادی ترکیب نکالی۔ ایک ذاتی خط میں اس نے فاتح عصر محمد اور اُس کے رفقاء کو عیسائیت کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ تمہیں اس مذہب کا پیشوائے اعظم اور یورپ کا دین پناہ بنا دوں گا۔ یورپ جو الزام ترکی پر عاید کرتا ہے یہ خط اس کا اصلی نمونہ ہے یورپ اس کی تمام فتوحات کو جو دیگر فاتحوں سے کسی حالت میں زیادہ ناگوار نہ تھے، معاف کر دیتا بشرطیکہ وہ عیسائیت قبول کر لیتا۔ جیسا کہ ان تمام نئی قوموں نے کیا جو مذہب عیسائیت کے غلبہ کے بعد یورپ میں آئیں۔

آجکل بھی یورپ کی سیاست اسلام کے خلاف اسی مذہبی تعصب سے پُر ہے۔ یہی وہ امر ہے جس نے مسئلہ مشرق کے تمام فریقوں کو موقع دیدیا ہے کہ وہ بہتر سے بہتر قابل قدر انسانی نظریوں کا مذاق اُڑا سکیں۔ اور صرف اس نقطۂ نظر اور احساسات کو مرکز خیال بنائے رہیں جو یورپ کو مشرقی عیسائیوں سے متحد کئے ہوئے ہے اسلام اور جدید یورپ کے باہمی تعلقات کو نقصان پہنچانے کا اتنا کارگر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایشیائی مسئلہ کو مبہم بنانے کی اس سے زیادہ مؤثر کوئی صورت نہ تھی۔ اور تمام عالم کے امن عام کو خطرے میں ڈالنے کا یقین کامل اور کسی طرح ممکن نہیں تھا جس طرح یورپ کے اندرونی معاملات کے متعلق مذہبی نقطۂ نظر ان تمام مصائب کا مخرج تھا جس نے اس بر اعظم کو مذہبی جنگوں کے دوران میں درہم و برہم کر دیا اور جس طرح یورپ پھر آزادی کی سانس صرف اس وقت لے سکا جب دیوانے مذہبی سیاست دانوں سے اس نے چھٹکارا پایا اسی طرح ایک با اصول محب بنی آدم کا جس پر روسی تعصب اور انگریزی مذہبی سیاست کا رنگ چڑھا ہوا ہو مشرق میں بہت ہی دردناک انجام ہو کر رہیگا جہاں اُس نے تمام خطرناک جذبات کو اُبھار کر انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

انگریزی سیاسی ادب میں ترکی اور اسلام کے متعلق دو قسم کے اہل الرائے موجود تھے ۱۸۵۶ء میں اڈنبرگ میں رچرڈ کابڈن کا مشہور رسالہ "ایشیا" چھپا جس میں انچسٹر سکول کے افسر اعلیٰ نے پبلک کے اُن خیالات پر حملہ کیا جو اُس کے خلاف پیدا ہو رہے تھے۔ اور کھلم کھلا اُن لوگوں کی تائید کی جو عیسائیت کا واسطہ دیکر روس کی طرفداری میں ترکی سلطنت کا قلع قمع چاہتے تھے۔ اور اعلان کر دیا کہ انگلستان خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکتا ہے اگر وہ قریبی مشرق کا نقشہ اس طرح تبدیل کر دے۔ انگریزی آزادی پسند طبقے کے خیالات پر اس رسالہ کا اثر ہونا لازمی تھا چنانچہ ان سب کی مشرقی پالیسی نے اُنیسویں صدی میں پامرسٹن سے گلیڈاسٹون تک گرے اور اس کو تھ تک ایک ہی روش اختیار کر لی یعنی روس کی طرفداری میں قسطنطینیہ زار کو دینے کی تجویز کی گئی۔ اور اب بھی بے دھڑک یہی کہتے ہیں کہ اس شہر کا سوال ابھی زیر تجویز رکھا جائے تاکہ روس جب اس انقلابی بخار کی غفلت سے چونکے تو ممکن ہے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کی خواہش کرے۔ ایک مورخ نے کیا خوب کہا ہے کہ پیران زار نے انگلستان کے آزادی پسندوں کو ہمیشہ اسی آسانی کے ساتھ زیر اثر کر لیا جس طرح خود اپنے یہاں کے لوگوں کو۔ ترکی اور اسلام کے بہترین سیاسی مورخ ڈیوڈ ار کھارٹ نے جو یورپ میں گزرا ہے اس وقت کوشش کی کہ ایشیا اور انگریزی سیاست کے اُن غلط اعتقادات کی اصلاح کرے جن کا اثر اصلاح ترکی پر پڑ رہا تھا اور جو سینٹ پیٹر برگ چانسلریز میں تجویز ہوئی تھی اُس نے ان بناوٹی اصولوں کی جو بے سوچے سمجھے مشرق پر چسپاں کئے جاتے تھے بہت زور کے ساتھ مذمت کی اور نہایت مؤثر پیرایہ میں درخواست کی مسلمانوں کی ان اچھی روایات کو قائم رکھنا چاہیئے جن کی قوتوں کا وہ معترف تھا۔ اُس نے مشورہ دیا کہ ترکی کو یورپ میں شامل سمجھا جائے۔ اس کو یقین تھا کہ اگر ترکی کے معاملات میں بیرونی مداخلت کی متواتر روک تھام کی گئی تو وہ طاقتوں کے توازن کے لئے ایک نہایت کارآمد اور کامیاب عنصر ثابت ہوگا۔ اور ایشیا میں علوم مغرب کا ہراول بنکر اپنی تاریخی حیثیت میں قابل قدر اضافہ کریگا ۱۸۳۰ء اور ۱۸۷۸ء کے درمیان اُس نے یورپ کی تمام طاقتوں کو تلقین کی کہ ترکی معاملات میں ذرا بھی دخل نہ دیں تاکہ اُن روشن ضمیر تہذیب یافتہ حضرات کی مدد سے جو مسائل شرقی کے ماہر اور تمام سیاسی چالوں سے بری ہیں مسلمانوں کو جدید قوموں کے سانچے میں ڈھالنے کا اہم کام فطری اصول پر بتدریج مکمل ہو جائے۔ کل ابتدائی مراحل اور تمام اصلاحوں کا عمل درآمد قابل سائنس دانوں کو سپرد کرنے اور سیاسی فرقوں کے ہاتھ میں مہلک ہتیار بنا کر نہ چھوڑ دینے کی رائے اس کی ایک بہترین نصیحت ہے جو اب تک قابل قبول اور صائب کہی جا سکتی ہے سب سے پہلے یہ ار کھارٹ ہی کو محسوس ہوا کہ قریبی مشرق کا سوال جس شکل میں کہ مخالفین اسلام اس یورپ کی رائے عامہ کے سامنے پیش کرتے ہیں حقیقتاً ایک راز مکنون ہے جو انجام کار خونریزیوں کا باعث ہوگا۔ سیاست مغرب کبھی نہ سمجھ سکی کہ اس مسئلہ کی جان ہے تو یہ ہے کہ یورپ اور ایشیا کے تعلقات میں کامل تغیر پیدا کر دیا جائے اور ایک عظیم الشان مذہب اور جری فرقے کو موقع دیا جائے کہ بیرونی فریب کاریوں سے محفوظ رہکر اپنی زلکیت کے اس اہم سوال کو خود حل کرے۔

یورپ کے لوگوں نے جن کو لارڈ بائرن "خرید و فروخت کرنے والا فرقہ" کہتا ہے،

زاریت اور اسلام کے درمیان تعجب انگیز کشمکش پر ذرا بھی غور نہیں کیا یہ مسئلہ کبھی اپنے ہمہ گیر مفہوم میں کھول کر بیان نہیں کیا گیا اور بین الاقوامی چالیں ایک عالمگیر جنگ عظیم کے افسوسناک اسباب فراہم کرتی رہیں۔ بہرحال ممکن ہے کہ قریبی مشرق کے عیسائی آخراً فائدہ میں رہتے اگر اپنے ذاتی حقوق پر قائم رہتے اور بیرونی سازشوں کو جو انہوں نے اکثر خود پیدا کیں خیر مقدم کہنے کے بجائے انہوں نے اس تحریک اصلاح سے اتفاق کر لیا ہوتا جو اسلام کی بنیادیں ہلا دینے پر تلی ہوئی تھیں۔

۳

۱۸۵۶ء کی پیرس کانگریس کے بعد روس نے ایک نظام قائم کیا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ترکی اپنا ایک ایک عضو جدا کر کے خودکشی کر لے۔ عیسائیت اور اسلام میں عداوت بڑھانے اور پوشیدہ ذریعوں سے اصول صلح پر عمل نہ ہونے دینے کی ترکیب جس کی تائید کھلم کھلا یورپ کی پبلک نے کی ایک نہایت بیکار گر اور امید افزا پالیسی تھی کیونکہ ترکی میں حکومتِ مذہبی کا عنصر عرصہ سے منافیٔ ترقی ثابت ہو رہا تھا۔ اصلاح ترکی یعنی تنظیم کی پہلی زبردست کوشش اگر قطعی ناکام رہی تو زیادہ تر غیر ملکی بیجا مداخلت کی وجہ سے مغربی مشرق کے عیسائیوں کو مسلسل مدافلت اور متواتر رخنہ اندازی یعنی اسلام پر باضابطہ نگہبانی کرنیکا عادی کر دیا گویا ان کو ترکوں کے خلاف پورے پورے اختیارات دیدیا ہے بیکنس فیلڈ کے خیال کے مطابق سلمان کافی اہلیت رکھتے ہیں کہ موجودہ تہذیب کے ہر شعبے میں حصہ لے سکیں۔ جیسا کہ انہوں نے اپنی بیشتر زبردست تہذیبوں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر ہمیشہ ظاہر کر دیا۔ اُن کی خواہش تھی کہ ان کا ملک برادرانہ حیثیت سے مسلمانوں کی معاشرتی تعلیم کا محافظ اور کارکن رہے اور ان تمام تحریکوں کو اپنے قبضے میں رکھے جو ایک صدی سے سلمانوں کے دماغوں میں ہیجان پیدا کر رہی ہیں۔ بدقسمتی سے انگلستان لارڈ بیکنس فیلڈ کا مدعا نہ سمجھ سکا اور اُن خانگی مصیبتوں میں پھنس گیا جن میں گلیڈاسٹون نے سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا گلیڈاسٹون پر چونکہ عیسائی مذہب کا بہت گہرا اور یکطرفہ رنگ غالب تھا اس لئے سب جانتے ہیں کہ اُس کا اصلی اور سب سے بڑا مقصد ہی یہ تھا کہ اسلام کے خلاف حقارت کی اشاعت کرے۔ اس کے زہریلے اثرات کی وجہ سے برطانیہ عظمیٰ کی مشرقی پالیسی قطعی بدل گئی اور وہ بے جانے بوجھے اسلام کی ضد یں فی الواقع زاریت کی معین و حامی بن گئی۔ بجائے اس کے کہ عیسائیت اور اسلام کے مابین وہ ایک غیر جانبدار اور شفیق واسطہ ہو روز بروز زار کی طرف مائل ہوتی رہی جس کا مدعا ہی یہ تھا کہ دُنیا کے نظام سیاسی میں سے ان مستحکم اور پائیدار قوتوں کو جواب تک اسلام کی محکوم ہیں نیست و نابود کر دے۔ جنگ کے بعد جب توسیع جرمنی کا خطرہ پیش نظر ہوا تو وحدت پانا کی ماتحتی میں پہلی تحریک ساسی نے جس کی تھوڑی بہت تائید کی وہ یہی مہلک راستہ تھا جس پر انگلستان سر کے بل بیل کھڑا ہوا اور جب ایک طرف ترکی ردِ عمل کی افواج عبدالحمید کے تحت میں تیار ہو گئیں اور اس طرح تمام یورپ کی متحدہ دشمنی کی آگ اسلام کے خلاف بھڑکا دی اور دوسری جانب جرمنی کا خوف انگلستان میں ہر دماغ پر آسیب کی طرح مسلط ہو گیا تو اس ملک کی پبلک زاریت کے مانوس خیالات کی عادی ہونے لگی اور ایڈورڈ ہفتم نے بہت سا خراج تحسین وصول کیا جب وہ نکلسن ثانی سے ملنے کے لئے ریوِل گیا۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب ترکی نے سیاست یورپ کے تمام منصوبے پھر خاک میں ملا دئے انگلستان میں اس کی مقبولیت نے دفتر خارجی کو مجبور کیا کہ اپنے آپ کو بدل ڈالے اور ترکوں کی طرف سے ایک نیا حساب کھولدے ترک اب نہایت گرمجوشی کے ساتھ اپنے انگریز دوستوں کی جانب جھک پڑے کیونکہ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اُن کی نجات اب انگریزوں ہی کے ہاتھ میں ہے نہ کہ جرمنی کے جس نے تیس سال تک عبدالحمید کی حمایت کی اور اس کے صلے میں بہت سی بیجا رعایات زبردستی حاصل کر لیں۔ قسطنطنیہ میں نظام سلطنت قائم ہو جانے کے بعد برطانوی سفیر کا جس طرح خیر مقدم کیا گیا اس سے کافی روشن ہو جائیگا کہ ۱۹۰۸ء میں ترکوں کو کیا کیا اُمیدیں تھیں۔ یہ ہے وہ عجیب موقع جہاں ڈیوڈار کھارٹ کے خیالات کی خود بخود تصدیق ہو جاتی ہے۔ اتفاقات زمانہ نے انگلستان کے سامنے پھر ایک ہونہار مسلمان قوم کی دوستی پیش کر دی۔ اب موقع تھا کہ دُنیا کو اس ہمہ گیر آتش سوزاں سے بچا لیا جاتا جو قریبی مشرق کے مسئلہ میں اندر ہی اندر شعلہ زن ہو رہی تھی یعنی سلمانوں کو علم معیشت اور سیاست سے پورا پورا واقف کر دیا جاتا اور اُن تمام فرقوں میں مصالحت ہو جاتی جو ایشیا اور یورپ کی حدود پر ایک دوسرے کو پھاڑے ڈالتے تھے۔ یورپ کی بدقسمتی سے گلیڈاسٹون کی پھونکی ہوئی تعصب روح اور تنگ نظری نے بیکنس فیلڈ کی وسعت و رفعت خیال کو برطانوی سیاست میں منتقل کیا اور فرقہ بندیوں کے تغیر و تبدل نے گلیڈاسٹون کے پیرووں پر یہ فرض عاید کر دیا کہ ترکی کی قومی تحریک سے اس نازک اور اہم موقع پر ہرگز بے تعلق نہ ہوں۔

ان اسباب کے زیر اثر متعدد اور مختلف النوع بلکہ برعکس اغراض کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں ۱۹۰۸ء کے انقلاب ترکی کی ناکامی لازمی تھی۔ سیاست یورپ نے ان سخت لغزشوں سے فائدہ اُٹھایا۔ جو کسی کار اصلاح یا انقلاب کے ساتھ ساتھ قریبی مشرق میں لازماً سرزد ہو جاتی ہیں۔ تاکہ وہ مستعدی کے ساتھ اپنی تخریبی حکمت عملی پھر حاصل کرے جو اس طول طویل اور شاندار تحمل سے بہت نمایاں طور پر ممتاز تھی جو وہ نظام خود مختاری کے متعلق ظاہر کرتا رہا۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء کا انقلاب ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ترکوں کو جب سیاست مغربی میں کوئی قابل اعتماد سہارا نہ ملا تو ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء میں عراق عرب کی اصلاح کے متعلق برطانیہ کی اعانت حاصل کرنے کی لاحاصل کوشش کی اور مایوسی پر آنکھیں بند کر کے آغوش جرمنی میں جا گرے۔ بہرحال ہمیں ابتدائی کارروائیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ انگلستان کے بعض حلقوں میں جہاں اُن کے کچھ ایسے بہی خواہ موجود تھے جو عراق عرب کو از سر نو زندہ کرنے میں حصہ لینا چاہتے تھے ان کو یہ اعانت پیش کی گئی چنانچہ امور سلطنت کے متعلق بہتر سے بہتر انتظامی ملکہ رکھنے والوں اور صاحبان تنظیم نے جن کی قابلیت کا اظہار جنوبی افریقہ اور کنیڈا میں ہو چکا تھا اعلان کر دیا کہ ہم ترکی کے لئے عراق عرب کا از سر نو انضباط و تنظیم کرنے کے واسطے اسی عزم و استقلال کے ساتھ تیار ہیں جو ہماری قوم کی قوت کا جوہر ہے اور جس نے ہر برِ اعظم میں ہماری قوم کو ممتاز کر رکھا ہے۔ یہ انگریز جن کو ڈیوڈار کھارٹ کی شریف روح غیر محسوس طریقے سے ابھار رہی تھی اور جنہوں نے اسلام کی قدیمی سرزمین کو خود غرضانہ حکومت خسروی کے محکوم کرنے کے بجائے تہذیب جدیدت مالامال کرنے کے خیال پر نہایت گرمجوشی سے لبیک کہا تھا جنگ عظیم سے چند ماہ پیشتر دفتر خارجی میں ان کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے جا پہنچے۔ وہاں اُن کی کوئی ہمت افزائی نہ ہوئی۔ چنانچہ دنیائے اسلام اور سلطنت برطانیہ میں سمجھوتا ہو جانے کا یہ موقع بھی نکل گیا جس پر نہ صرف قریبی مشرق کے بلکہ ممکن ہے کہ تمام دُنیا کے امن و امان کا انحصار تھا۔

۴

جب سے قریبی اور وسطی مشرق کی حکومت خلفائے بغداد و قاہرہ سے ترکوں کو ورثہ میں ملی ہے وہ ہمیشہ اسلام کے ہراول رہے ہیں اور شروع ہی سے برابر بے تعصبی کی اُس روح کے معتقد رہے ہیں جو اُن کو اپنے پیشرووں سے ملی تھی۔ اُن کی سلطنت میں

نسلاً اس قدر غیر ملکی جماعتوں اور مرکزوں کا وجود ہی اس امر کی کافی دلیل ہے تنگ نظر قومیت اُن کی ایجاد نہیں۔ چنانچہ یورپ کو اور بھی زیادہ حیرت ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ ترکی نے خود اپنی پسماندہ حکومت ہی میں سے ایک قومی سلطنت قائم کر لی ہے۔ لیکن قومیت کا خیال تعلیم یورپ کا ایک منطقی نتیجہ ہے اگر ترک اس خیال سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں جس کے لئے پوری انیسویں صدی میں اُن پر برابر حملے ہوتے رہے تو یقیناً اسلام کی چند مصنوعی روایات کی بنا پر ان کو اب لعنت ملامت کرنا بہت بیجا ہوگا۔ اور وہ عین اس وقت جب وہ اپنے مذہب اور اپنی قوم کے خالص اور لطیف نصب العین پر فائز ہونے کے لئے اس قسم کی پابندیوں سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ترکی قومیت اس تعلیم کے عملی نتیجہ پر پہنچنے کی راہ پر ہے جو اُس نے یورپ سے حاصل کی ہے اور پھر بھی جارج آف کلہین (١٩٠٨ء) کے زمانے سے جو زور اس پر ڈالا جا رہا تھا بجنسہ اس پر عمل درآمد کرنے کے صلے میں اس کو طعن تشنیع کرنے کا یہی موقع منتخب کیا گیا ہے۔ کیونکہ تنظیمہ کے زمانے سے مسلمانوں کی جماعتوں اور مرکزوں نے جو اساسی اصلاح حاصل کی اس کو جزو درست سیاسی شہ دی گئی وہ ان تمام کارروائیوں میں شامل ہے جو انگورہ میں ١٩٢٢ء سے اب تک ہوئیں۔ اصلاح اسلام کے متعلق بہت ہی مختلف حلقوں میں کوشش کی جا چکی۔ فلسفۂ مذہب قانون، اخلاقیات میں ان کوششوں کا آغاز معتزلیوں سے ہوتا ہے جو گیارھویں صدی میں مسلمانوں کا آزاد خیال عقل دوست فرقہ تھا۔ اسلام قلب ہیئت کے عمل سے کبھی خالی نہیں رہا۔ لیکن مسلمانوں کے مختلف فرقوں نے جن اصلاحوں کی کوششیں کیں خواہ کتنی ہی پُرخلوص سہی وہ ایک دیرپا عملی نتیجہ پیدا کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ مذہب و عقائد کا تزکیہ قوم کی اصلاح اور مشرق کے بعض غیر مہذب گروہوں کے اخلاقی لب و لہجہ کا ارتفاع تمام صاحبان رائے یا اخوت اسلامی کے سربرآوردہ سیدھے سادے معتقدین کا واحد نصب العین تھا لیکن اسلام کا قدم ترقی کسی او چیز کا بھی حاجتمند تھا۔ اسلامی مرکزوں کی اساسی اصلاح کو عالمگیر ہونے کا معمولی سا موقع بھی دینے کے لئے دو اہم شرطوں کی ضرورت تھی۔ اول یہ کہ اس پر عیسائیت کا دباؤ نہ پڑے۔ دویم یہ کہ مسلمانوں کی مضبوط، دہن کی پکی، اور آزاد قوم خود اس کو انجام دے۔

آج ترکوں نے انہیں دو شرطوں کو پورا کر دیا ہے۔ اسلامی مرکزوں کی اصلاح صرف ایسی مسلمان قوم ہی سے ممکن ہے جس کا وقار پیروانِ رسولؐ کی نگاہوں میں قائم ہو اور جس کی آزادی کی ذمہ دار خود اسی کا زور بازو اور عزم بالجزم ہو سکے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام صرف اعتقادی اصول پر مبنی ہے اور اس لئے ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناموزوں سانچے میں ڈھلی ہوئی مقررہ روایات سے اسے آزاد کرنے کی ہر کوشش قابل ملامت ہے لیکن ایسے لوگ یہ امر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اسلام کو غیر متحرک بنانے والے تمام نظریے ہمیشہ بے بنیاد اور کمزور ثابت ہوئے ہیں اور خیالات کے تاریخی ہنگاموں نے دنیائے اسلام میں ہمیشہ ہلچل مچا دی ہے۔ قوانین اسلام جن کی اصلاح آج کل ترک جدید علم سیاست کے مطابق کر رہے ہیں۔ خود ان کے اعتقادی اصول کا نشان امتیازی خیالات یونان کی ایک جھلک ہے اور اس کے فلسفے میں جدید افلاطونی اور ہندوستانی تصورات شامل ہیں۔ ہمارے زمانے کے سب سے بڑے پروفیسر گولڈ زیہر نے اپنی مشہور تصنیف "درس ہر اسلام" میں نہایت مدلل اور صاف طور پر اسلام کے مادۂ قبولیت کو ثابت کر دکھایا۔ گولڈ زیہر نے بتا دیا کہ اسلام نے اپنی صلاحیت اخذ و اکتساب اور عناصر خارجی سے بہرہ اندوز ہونے کی قابلیت اپنی تمام تاریخ میں واضح کر دی ہے۔ اس کا اعتقاد ہے کہ اسلام کو اُن اخلاقی کمزوریوں اور انجماد ذہنی کا ذمہ دار بنانا سراسر

زیادتی ہے جو یقیناً آب و ہوا اور رجحانات کے نتائج ہیں۔ اخلاقی نکتۂ نظر سے اسلام اب بھی ایک عالمگیر قوت ہے۔ جو صاحبان رائے کے تدبر و تفکر کا موضوع بننے کی پوری استعداد رکھتا ہے۔

لیکن اصول اسلام اور تاریخ اسلام کے مابین غیر محدود امکانات کے رنگ موجود ہیں اور اس کی آیندہ ترقی کا دار و مدار قطعاً اس رویہ پر ہے جو ترکی اس کی جانب اختیار کرے۔

مسلمانوں میں ترک از روئے فوقیت ایک سیاسی قوم ہے جب سے انہوں نے عربوں کو حکومت اسلامی سے برطرف کیا ہے وہ عرصۂ دراز تک نہایت کامیابی کے ساتھ مشرق اور مغرب کے درمیان واسطہ بنے رہے۔ جاپان سے کہیں پہلے ترکی نے تہذیب مغرب کے لئے ایشیا کے دروازے کھولدئے تھے۔ دونوں نصف کروں کو ان نسلوں کے ذریعے سے ملا کر جنہوں نے سلطنت عثمانیہ کو اس کے یوم تاسیس سے لیکر برابر اپنی فرودگاہ بنا رکھا تھا۔ انسانی جد و جہد کے ہر شعبے میں وہ دونوں ممالک میں ایک عقد اتحاد بنا رہا۔

گولڈ زیہر جو سائنس میں مسلم الثبوت مانا جاتا ہے کہتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ کا علوئے مرتبت اور عروج کمال دُنیائے اسلام کے محکوم حلقوں میں سے حنبلی تعصب کو روز بروز کامیابی کے ساتھ اکھاڑتا رہا اور حنفی اثر (جس کے پیرو ترک ہیں) اسی رفتار سے بڑھتا گیا۔

فتوحات عثمانی کے وقت عیسائی فرقوں کے لئے جو عضوی قوانین منظور کئے گئے وہ یقیناً اس امر کے ثبوت میں بہت کافی ہیں کہ مذہبی معاملات میں اُن کی بے تعصبی ضرب المثل ہونی چاہئے اور اس زمانے کے یورپین فرقوں سے کہیں زیادہ فوقیت رکھتی ہے۔

خود رسول خدا فرماتے ہیں کہ میری اُمت میں اختلاف رائے رحمت خدا کا ایک ظہور ہے اس ارشاد کے بعد فرقہ بندی کا سوال بہت زور پکڑ گیا۔ ہجری کی ابتدائی صدیوں کے غور و خوض کا امتیاز خصوصی یہی آزاد خیالی تھی جو اصول مذہب کی تشریح میں روا رکھی جاتی تھی۔ سر ٹامس آرنلڈ کہتے ہیں کہ بادشاہوں اور عوام نے اکثر عالمان دین کے تعصب کو بُرا بھلا کہا ہے۔ قرآن پاک میں غیر مذہب کے لوگوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا انحصار خدائے واحد کے پہچاننے پر رکھا ہے۔ نبی برحقؐ فرماتے ہیں۔ "اہل کتاب سے تم لوگ مباحثہ کرو۔ تو انتہائی محبت کے ساتھ"۔ پھر ارشاد ہوتا ہے۔ "مذہب میں جبر و تشدد کو راہ نہ دو۔"

بے تعصبی کا یہ واضح ترین حکم ہے جو کلام ربانی کے لفظ بلفظ مطابق ہے۔ حضرتؐ نے نجران کے پادریوں، پیشوایان دین اور راہبوں کو ایک خط تحریر فرمایا جس میں وعدہ کیا کہ اُن کے معابد کی حفاظت کی جائے گی اور ان کے حقوق میں کسی قسم کی بیجا مداخلت یا خلل اندازی نہ ہونے پائے گی۔ بشرطیکہ وہ اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔ آنحضرتؐ نے مدینہ کے یہودیوں کو بھی اپنی اپنی عبادت کی اجازت دی یہاں تک کہ اُن کے دلی عناد نے اُن کو شہر بدر کر دیا اور ١٠ھ میں ایک سفیر کو تبلیغ کے لئے یمن بھیجا تو ہدایت فرمائی کہ کسی یہودی پر اس کا مذہب چھڑانے کے لئے ہرگز جبر و تشدد نہ کرنا۔

جب حکومت عرب ایران تک پھیل گئی تو بیان کیا گیا کہ نبیؐ کا حکم یہ ہے کہ زردشت لوگوں سے بعینہ اہل کتاب سمجھکر برتاؤ کیا جائے ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ معتصم کے عہد حکومت ٨٣٣ء تا ٨٤٢ء میں ایک مسلمان سپہ سالار نے ایک امام اور ایک موذن کو دُرّے لگائے جانے کا حکم دیا کیونکہ انہوں نے سُغد میں ایک آتشکدہ مسمار کر کے اس کی جگہ ایک مسجد بنا دی تھی دسویں صدی میں فتح ایران کے تین صدیوں بعد قریب قریب ہر صوبے میں آتشکدے پائے جاتے ہیں حتیٰ کہ مسلمانوں کی بے تعصبی کی وجہ سے مینکی[1] بھی ایک جداگانہ

۱۴

(۱) مینکی یا مینکیین ایران کے ایک بہت قدیم فرقے کا نام ہے جو اپنی بانی مینکیس کے نام سے موسوم تھا اور جو دو اعلیٰ اصول یعنی خیر و شر کا قائل تھا۔ (مترجم)

فرقے کی حیثیت میں دسویں صدی کے اختتام تک قائم رہے اور مامون کے عہد میں نیرو نجت نے جو اس فرقے کا پیشوا تھا بغداد میں علمائے اسلام کے ساتھ علی الاعلان مناظرہ کیا

فتوحات اسلام کے بعد ہندوستان میں بھی حالانکہ ابتدائی زمانہ میں ہندوؤں کے بہت کافی مندر منہدم ہوگئے تھے۔ لیکن جن مسلمان حکمرانوں نے یہاں قیام کیا انہوں نے علی العموم عطیات مذہبی کو احترام کے ساتھ جاری رکھا جو ان سے پہلے ہندو بادشاہ نے مذہبی تعمیروں کے لئے مقرر کئے تھے۔ ہندوستان کی موجودہ اسلامی ریاستیں مثلاً حیدرآباد اور بہاولپور اب تک اسی روش پر قائم ہیں۔ وہاں اب بھی برابر ہندوؤں کے مندروں کی بہت کافی مالی امداد کی جاتی ہے۔

۵

مشرق میں خام اشیاء کے مسئلے کے متعلق زبردست معاشرتی غرض ترکوں کو مجبور کر رہی ہے کہ اپنے مجلسی، قانونی، مالی، اور تمدنی مرکزوں اور اپنی زراعتی اور دیگر عام پیداوار کے ذرائع کی از سر نو تعمیر و تنظیم کریں یہی وہ اصلاح ہے جس کی بنا ر خود مصلحانِ انگورہ نے ڈالی ہے اُن کے افعال کا منشا پوری پوری طرح سمجھے بغیر تین ہزار میل کے فاصلہ سے اُن کے متعلق کوئی فیصلہ کر دینا صریحاً ہٹ دھرمی ہے کیونکہ جو لوگ اُن کو مورد الزام بناتے ہیں وہ باوجود ایک مستحکم جمی جمائی تہذیب کے اُن سے کہیں کم پیچیدہ اسباب کے زیر اثر فاش سے فاش غلطیوں کے مرتکب ہو چکے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔

اناطولیہ کے کاشتکار نکات دینیات قطعی نہ سمجھ سکے۔ ان کی حالت ذہنی کو ادراک کرنے اور مادۂ انسانی کا اندازہ لگانے کے لئے جو گویا مصطفےٰ کمال کے پردہ میں پوشیدہ ہے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس سے ملتی جلتی تاریخی حالتوں کی جانب توجہ کی جائے مثلاً اس حالت کی جانب جو کاسنرسی اسنر کو اور کوستھ نے پیدا کی اول الذکر کی تائید پولینڈ کے کاشتکاروں نے کی اور کوستھ کی ہنگری کے زراعت پیشہ لوگوں نے جو بین الاقوامی سیاسی میل سے قطعی بے بہرہ تھے اور دونوں آدمی اس میل کا شکار بن گئے۔ اس لئے یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ مصطفےٰ کمال جو تاریخ سے واقف ہے اور جس کے ملک نے ۱۹۰۸ء کے انقلاب مکہ کے اصول کا اعلان اسلام کے لئے کر دیا ہے ان جیسا انجام اپنے لئے پسند نہیں کرتا۔ بلکہ واشنگٹن کے قدم بہ قدم چلنے کو ترجیح دیتا ہے انگورہ کی مجلس اعظم کے ممبروں نے اس کو خلافت پیش کی تو اُس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اعلان کر دیا کہ خلافت جمہوری سلطنت کے اصول میں شامل ہے

اسلام ترکی جس بات کا حاجتمند ہے وہ جدید تعلیم اور سائنس ہے اب اسے قدیم بے فیض کلبیت اور اُس کی ذہنی زندگی کے متروک آئین سے رہائی حاصل کر لینی چاہئے۔ جن لوگوں کی رائے ہے کہ تمام مسلمان اقوام میں ترک ذہنی اصلاح کی سب سے کم صلاحیت رکھتے ہیں وہ ایک ایسے مغالطہ میں پھنسے ہوئے ہیں جس کی اشاعت ہر جگہ اُن بے شمار امیدواروں نے کی ہے جو وہ صدیوں سے زیادہ ورثۂ ترکی کے متمنی رہ چکے ہیں برخلاف اس کے اسلام میں صرف وہی ذہنیت آسانی سے قدیمی دینیات کے اصول ترک کر سکتی ہے اور اصلاح کا بیڑا اٹھا سکتی ہے جو الہیات کے دقیق تصورات کی متحمل نہیں ہو سکتی جیسی کہ ترکوں کی نمایاں عملی ذہنیت بشرطیکہ ابتدائی کارروائیوں کے لئے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے ترکوں کا مفروضہ جوش مذہبی یورپ و بائزنٹائن کی ایجاد ہے کیونکہ بے تعصبی کی تعلیم سے کوئی اور قوم کبھی اتنی مایوس نہیں ہوئی جتنی قوم ترک جب اس کو موقع دیا گیا کہ ان ملاؤں کی پیروی چھوڑ دیں جو ترکی میں الہیات کے دقایق کی تلقین کرنے کو پہنچے تھے۔

ترکی کا جوش مذہبی ایک ناگہانی شے تھی جس کی ذمہ دار قوم ترک نہیں ہو سکتی حالانکہ اس کی تاریخ کے بہت سے خونین صفحے جو حقیقتاً سیاسی اور معاشرتی اسباب کا نتیجہ ہیں اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ ذرا اس قول کو یاد کیجئے جو تعصب یہود کے قومی اسباب کے متعلق رینان جیسا شخص لکھ گیا۔

(ترجمہ)

ظہیر ایم اے (علیگ)

قدیم پجاریوں سے خطاب

(رِدانِ خلد آشیاں کے قلم سے)

برہمن۔ او سراپائے بتاں کے پوجنے والے ‌ ‌ ‌ مسلماں۔ او خدائے دو جہاں کے پوجنے والے

عبادت گاہِ بند رسمِ دنیا اے معاذ اللہ ‌ ‌ ‌ سنبھل او پردہ ہائے درمیاں کے پوجنے والے

خدا کے واسطے بیدار ہو۔ ہشیار ہو غافل ‌ ‌ ‌ فریبِ کاوشِ سود و زیاں کے پوجنے والے

مبارک تیرے دل کو ہیبت حدّاد و آہنگر ‌ ‌ ‌ طلسم بندشِ بندِ گراں کے پوجنے والے

جو ممکن ہو قفس کی تیلیوں سے درسِ عبرت لے ‌ ‌ ‌ گلستاں کے فدائی آشیاں کے پوجنے والے

یہ صحن باغ یہ بادِ سموم و تند و زہر آلود ‌ ‌ ‌ پرستارانِ گل بھی ہیں خزاں کے پوجنے والے

کہاں ہیں اپنی دنیا اپنے ہاتھوں جو بساتے ہیں ‌ ‌ ‌ کہاں ہیں لذتِ دردِ نہاں کے پوجنے والے

کہاں ہیں جن کو راس آتی نہیں راحت زمانے کی ‌ ‌ ‌ چمن بیزار برقِ آشیاں کے پوجنے والے

دیانت کیش راہ و رسمِ دنیا ساز کے دشمن ‌ ‌ ‌ شہادت کوش تیغِ خونفشاں کے پوجنے والے

یہی ہے دین تو قہرِ الٰہی کس کو کہتے ہیں ‌ ‌ ‌ ارے او مذہبِ آتش فشاں کے پوجنے والے

ذرا سر در گریباں ہو کے دیکھ اپنی عبادت کو ‌ ‌ ‌ بقائے اتحادِ جسم و جاں کے پوجنے والے

طریقت پر شریعت کی نہیں زیبا ہے قربانی ‌ ‌ ‌ رہِ گم کردہ منزل کارواں کے پوجنے والے

یہ دنیائے خدا دشمن ہے یا دینِ خدا پرور ‌ ‌ ‌ نظر لازم ہے نیرنگ جہاں کے پوجنے والے

یہ شامِ آرزو کل صبح خوابِ مضطرب ہو گی ‌ ‌ ‌ فریبِ کامیاب و کامراں کے پوجنے والے

ذرا ہشیار اے دلدادۂ ذوقِ تن آسانی ‌ ‌ ‌ شہیدِ آرزو خوابِ گراں کے پوجنے والے

کسی دن دامن گلچیں کا بھی تو جائزہ لیتے ‌ ‌ ‌ بہی خواہانِ گلشن باغباں کے پوجنے والے

چٹانیں ہیں چٹانیں جس کو موجِ آب سمجھا ہے ‌ ‌ ‌ ارے کشتی کے غافل بادباں کے پوجنے والے

تو ہی بتخانہ بھی کعبہ بھی ہے اپنی پرستش کر ‌ ‌ ‌ خدائی ہے نشاں او بے نشاں کے پوجنے والے

فنا کے راز کا جویا بقا کے راز سے غافل ‌ ‌ ‌ تمنائے حیاتِ جاوداں کے پوجنے والے

وطن کا ذرّہ ذرّہ مایۂ نورِ حقیقت ہے ‌ ‌ ‌ مکاں پر غور کر لے لامکاں کے پوجنے والے

مسیحی۔ جین۔ مسلم۔ بودھ۔ ہرجن۔ پارسی۔ ہندو ‌ ‌ ‌ زمیں پر رہنے والے آسماں کے پوجنے والے

میں اس دن کا تمنائی ہوں جب سب کی زباں پر ہو
کہ ہم ہندی ہیں اور ہندوستاں کے پوجنے والے

ہندوستان میں پریس یا اخبارات کی ترقی

(ڈاکٹر علامہ سید نجم الدین جعفری بارایٹ لا)

"میرے محترم کرم فرما ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری بارایٹ لا ڈائرکٹر پبلک انفارمیشن بیورو (گورنمنٹ آف انڈیا) نے باوجود اپنی انتہائی ذمہ دارانہ مصروفیت کے "ایشیا" کے لئے بطور خاص یہ مقالہ اہم عنایت فرمایا ہے، ہرچند کہ یہ کرم ستائش و تشکر کی منازل سے بلند ہے لیکن . . . "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر" ادارہ ایشیا آپ کی اس عنایت کا مل احترام محبت کے ساتھ شکر گزار ہے اور متوقع ہے کہ مستقبل میں اس سے زیادہ بارش لطف و کرم ہوگی۔

ساغر (نظامی)"

ہندوستان میں پریس کی تاریخ کا آغاز مغلوں کے دور سے ہوتا ہے۔ دارالسلطنت اور تہذیب و تمدن کے دیگر مرکزوں میں محدود اشاعتوں کے قلمی اخبار ہوا کرتے تھے۔ وقائع نگار اور وقائع نویس بھی ہوتے تھے جو دربار اور عامۃ الخلائق دونوں میں تھوڑا بہت رسوخ رکھتے تھے۔ ان کا کام دوگونہ ہوتا تھا ایک طرف وہ مرکزی حکومت کو لوگوں کے رجحانات سے باخبر رکھتے تھے اور دوسری طرف پبلک کے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔ قلمی اخبار مغلوں کے زوال اور برطانوی راج کے استحکام کے بعد بھی جاری رہے۔ اس وقت کی اخباری دنیا میں خطیم الامراء اور مرزا علی بیگ مشہور شخصیتوں کے مالک تھے۔

پریس کی یہ صورت کہ وہ رائے عامہ کا آئینہ دار بھی ہو اور عوام کا مشیر اور رہنما بھی، برطانوی حکومت کے ساتھ وجود میں آئی۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ پریس ہم تک اہل یورپ کے ذریعے پہنچا ہے پہلے آدمی جنہوں نے ۱۷۶۸ء میں پریس قائم کرنے کی کوشش کی۔ مسٹر ولیم بولٹس تھے مگر وہ اپنی اسکیم میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد مسٹر جیمس آگسٹس ہکی نے ۱۷۸۰ء میں پہلا ہندوستانی اخبار بنگال گزٹ نکالا مگر چونکہ اس اخبار کے صفحات ذاتی تو تو میں میں اور پست مذاق کی چیزوں سے آلودہ ہونے لگے۔ اس لئے سپریم کورٹ نے اُسے بند کردیا۔ اس کے بعد بھی اخبار نکلے ان میں اہم ترین انڈین گزٹ ہے۔

۱۷۹۹ء سے پہلے اخبارات کے ایڈیٹروں کے طرز عمل کی رہبری کرنے اور ان کو جائز حدود سے تجاوز نہ کرنے دینے کے لئے پریسیڈنسیوں میں کوئی ہموار اور مستحکم ضابطہ نہیں تھا۔ یہ کام گورنر کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد کلکتہ پریس کی بعض نامناسب حرکتوں کی بنا پر لارڈ ولزلی نے پریس پر سنسر بٹھایا اور پہلی مرتبہ لارڈ موصوف کو یہ خیال ہوا کہ سرکاری نقطۂ نگاہ عوام کے ذہن نشین کرنے کے لئے کوئی سرکاری آرگن ہونا چاہیے لیکن انگلینڈ کے کورٹ آف ڈائرکٹرز کی مخالفت کی وجہ سے وہ اپنی تجویز کو عملی صورت نہ دے سکے۔ ان کے جانشین لارڈ منٹو نے بھی کڑی نظر رکھی اور انہوں نے خصوصیت کے ساتھ اُن لوگوں کو تہدید کی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعتقادات کے سلسلے میں ایک دوسرے کو الزام دیتے رہتے تھے۔ خوش قسمتی سے لارڈ ہیسٹنگز کے زمانے میں ہندوستانی پریس کو ڈاکٹر جیمس برکنگ جیسا مشہور عالم نصیب ہوا جس کی شہرت تمام یورپ میں تھی۔ ڈاکٹر جیمس نے جو "ایشیاٹک مرر" کے ایڈیٹر اور منیجنگ پروپرائٹر تھے پریس کا لہجہ بلند کردیا اور اس خدمت کے صلے میں اچھی شہرت حاصل کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنر جنرل تک نے ہندوستانی پریس کی حمایت کی۔ اس کڑے طرز عمل کی بنا پر جو مسٹر برائس نے اختیار کیا ان میں اور پریس کے سنسر مسٹر ایڈمز میں کچھ قیل و قال بھی ہوگئی مگر مسٹر برائس کا پانسہ زبر رہا۔ لارڈ ہیسٹنگز نے ۱۸۱۸ء میں سنسر شپ اڑادی اور اسی سال کلکتہ کے اخبارات کے ایڈیٹروں کی رہنمائی کے لئے چند ملتے جلتے قوانین بنا دئے یہ قوانین ۱۸۲۳ء تک قائم رہے۔ اس کے بعد ان کی جگہ اور قوانین نے لے لی ۱۸۱۸ء ہندوستانی پریس کی تاریخ میں بہت اہم سال ہے۔ اسی سال ہندوستان میں دیسی جرنلزم نے جنم لیا۔ سیرام پور کی بیپٹسٹ مشنری نے ایک دیسی ہفتہ وار اخبار "دگ درشن" جاری کیا مشنری کے اس تجربے کو دیکھ کر کلکتہ کے اور لوگوں نے بھی دیسی زبان کے اخبار نکالے ان میں مشہور اور بارسوخ اخبارات سماچار درپن "سنگباد کومودی" "سماچار چندر کا" "گنیشان" "سنگباد راس راج" اور سنگباد بھاسکر تھے ان میں سے بیشتر مذہبی اور لٹریری تھے صرف چند ایک سیاسیات کو چھیڑتے تھے۔ بعض کٹر ہندوؤں کے آرگن تھے اور صرف عیسائیت کے اثرات کا رد کرنے کے لئے جاری کئے گئے تھے بعض ترقی پسند جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور ہندوازم کو مغربیت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ کلکتہ کے دیسی پریس نے ہندوؤں کو مغربیت کے عمدہ اثرات کے جذب کرنے کے ساتھ ہی ہندو سوسائٹی کو مستحکم رکھنے میں بڑی مدد دی ان میں سے تاتو بھاودنی جو برہمو سماج نے مشنری کے اثرات کو گھٹانے کے لئے نکالا تھا عیسائیت کے خلاف جذبات پیدا کرنے میں بحیثیت مجموعی کامیاب ہوا اور اس نے مشنری کا اثر بہت کچھ کم کردیا۔ اسی سال کلکتہ جرنل جاری ہوا۔ اس کی بنیاد مسٹر بکنگھم نے رکھی، یہ آزاد اخبار تھا دوسرے اخبار حکومت کے زیر اثر تھے۔ اس اخبار کو یورپین تجار کی سرپرستی حاصل تھی۔

۱۸۲۳ء میں مسٹر آدم قائم مقام گورنر جنرل نے اخباروں کی اشاعت کے سلسلے میں چند قاعدے بنانے کی ضرورت محسوس کی اور یہ قاعدے سپریم کورٹ نے منظور بھی کرلئے۔ مسٹر ایڈمز کے قواعد کی کچھ مخالفت ہوئی مگر وہ حتی الفائم رہے اور لارڈ ایمہرسٹ کے وقت میں بھی نہیں بدلے بلکہ ۱۸۲۶ء میں لارڈ ایمہرسٹ نے تو افسروں کو پریس سے کوئی تعلق رکھنے ہی سے منع کردیا۔

لارڈ ولیم بنٹینک کے گورنر جنرل بن کر آنے تک پریس اپنی نرم رفتار سے چلتا رہا لارڈ بنٹینک نے پریس کو آزادی دیدی اور ان کے نظام حکومت کے ماتحت جرنلزم نے بڑی سُرعت سے ترقی کی ۱۸۲۸ء اور ۱۸۳۰ء میں آدھے بھتہ (half Batta) کے سوال پر بڑا ایجی ٹیشن ہوا اور سپاہیوں کے دکھ درد بیان کرنے کے سلسلے میں اخبار کے کالم شر انگیز تحریروں سے پُر ہونے لگے۔ مگر لارڈ بنٹینک نے سوائے ایک دفعہ کے کبھی تعزیری کارروائی نہیں کی۔ گو کورٹ آف ڈائرکٹرز کی طرف سے انتظامی کارروائی پر اصرار ہوتا رہا۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ پریس کو اقتصادی حالات کی ابتری کے مضر اثرات سے دوچار ہونا پڑا گورنر جنرل نے کسی اخبار کو ایذا نہیں پہنچائی۔ اس ہمدردانہ طرز عمل سے کلکتہ کے باشندوں کی ہمت بڑھی اور انہوں نے

۱۸۳۵ء میں جون ایڈمز کے پریس ریگولیشن کو منسوخ کر دئے جانے کی درخواست کی درخواست منظور ہوگئی اور سر چارلز مٹکاف نے اپنی کونسل کی متفقہ رائے کے ساتھ ہوم کے حکام کی مخالفت کے باوجود ریگولیشن کو منسوخ کر دیا۔

مٹکاف صاحب کے جانشین لارڈ آکلینڈ نے بھی اپنے پیشرو کی پالیسی پر عمل درآمد جاری رکھا۔ انہوں نے سرد سول کو پریس سے آزاد تعلق قائم کرنے کی اجازت دی گو فوجی افسران پر قدرے گرفت رکھی۔ لارڈ آکلینڈ کے زمانے میں ایک سرکاری آرگن نکالنے کا سوال پھر سامنے آیا مگر لارڈ موصوف نے اس کی ہمت افزائی نہیں کی کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اخبار صرف اخلاقی اثر کے بل پر چلنا چاہیے۔ لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ ڈلہوزی کے دوران حکومت کے تعلقات پریس کے ساتھ بہت خوشگوار رہے اور یہ خوشگواری جوں کی توں قائم رہتی اگر ۱۸۵۷ء کے غدر سے سوسائٹی اور حکومت کا توازن نہ بگڑ جاتا۔ غدر سے پہلے بمبئی اور کلکتہ کے دیسی اور انگریزی اخبارات میں ایک قسم کی توہین حکومت اور واقعات کو توڑ مروڑ کر بیان کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی بنا پر حکومت کو ۱۸۵۷ء کا گیگنگ ایکٹ جو کچھ عرصے کے لئے تھا پاس کرنا پڑا اور اس کے تحت میں بہت سے اخبارات بالخصوص دوربین سلطان الاخبار اور فرینڈ آف انڈیا کو تحدید کی گئی۔ اس ایکٹ کا ایک روشن پہلو یہ تھا انگریزی اور دیسی اخبارات میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔ اس قانون کی رو سے سرکاری لائسنس کے بغیر چھاپہ خانہ چلانے کی ممانعت ہوگئی اور حکومت کو اختیار تھا کہ لائسنس دے یا منسوخ کردے

لارڈ الگن کے زمانے میں جو لارڈ کیننگ کے جانشین تھے۔ پریس کی آزادی میں کوئی خلل نہیں آیا۔ ۱۸۶۷ء میں ۱۸۳۵ء کا قانون اٹھ گیا اور اس کی جگہ پریس اور رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ہوگیا۔ یہ حالت ۱۸۷۸ء تک قائم رہی۔ ۱۸۷۸ء میں یہ معلوم ہوا کہ دیسی پریس زیادہ مخالفانہ اور باغیانہ رویہ اختیار کرتا جاتا ہے لارڈ لٹن نے تمام صوبجاتی حکومتوں سے مشورہ طلب کیا اور انہوں نے یہ سفارش کی کہ دیسی اخبارات پر جن کے قارئین زیادہ تر جذباتی لوگ ہوتے ہیں مناسب قابو رکھنے کے لئے قانونی چارہ جوئی ناگزیر ہے۔ پس دیسی زبانوں کی مطبوعات پر گرفت رکھنے کیلئے ۱۸۷۸ء میں ایک قانون پاس کیا گیا۔ اس قانون نے پہلی مرتبہ انگریزی و دیسی اخبارات میں امتیاز قائم کیا۔ مسٹر گلیڈسٹون نے انگلستان کے ایوان عام میں اس قانون پر بڑی لے دے کی اور ۱۸۸۰ء میں جب مارکوئس آف رپن گورنر جنرل ہوئے یہ قانون منسوخ ہوگیا۔ لارڈ رپن نے پوسٹ آفس کو یہ اختیار دیدیا کہ وہ باغیانہ دیسی مطبوعات پر گرفت لینے کا مجاز ہے۔ اسی زمانے میں ڈپارٹمنٹ آف پریس کمشنر پر بھی نظر ثانی ہوئی کیونکہ اس کے اخراجات کو فضول سمجھا جاتا تھا جب لارڈ ڈفرن لارڈ رپن کے جانشین ہوئے تو انہوں نے اپنی مدبرانہ پالیسی سے ہندوستانی پریس کو جیت لیا۔ کیونکہ انہیں ایڈیٹروں کی اخلاقی قوت اور ان کے رسوخ پر بڑا بھروسہ تھا۔ انہوں نے تو یہاں تک کیا کہ معاملات حکومت کے متعلق نمایاں ایڈیٹروں کو رازدارانہ گفتگو کرنے کی بھی اجازت دی۔

۱۸۸۹ء میں حکومت آفیشل سیکرٹ ایکٹ پاس کرنے پر مجبور ہوئی۔

انیسویں صدی کے اختتام پر بمبئی پریسیڈنسی میں پلیگ پھیلا۔ حکومت نے ۱۸۹۷ء اور ۱۸۹۸ء کے پلیگ ریگولیشن پاس کئے اور ان سے فسادات اور سیاسی جرائم جیسی سنجیدہ پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ چونکہ ورنیکلر پریس فرقہ وارانہ نفرت، تشدد پسندی کا ذمہ دار قرار پایا۔ اس کے خلاف کارروائی کی گئی۔ اس فوری صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ۱۸۹۸ء میں پینل کوڈ میں ایک نیا سیکشن ۱۵۳ الف داخل کیا گیا۔ انیسویں صدی کا باقی حصہ ہندوستانی پریس پر کوئی مزید پابندی دیکھے بغیر گزر گیا۔ جب کبھی کوئی فوری صورت حال پیدا ہوئی۔ اس کی روک تھام کے لئے کوئی قانون بنا دیا گیا اور جب سکون ہوا۔ وہ ترک کر دیا گیا۔

بیسویں صدی کا آغاز ایک زبردست سیاسی بے چینی سے ہوا جس کی تہ میں مختلف عناصر کام کر رہے تھے۔ بالخصوص جنگ روس و جاپان۔ اس عرصہ میں کلکتہ کے پریس نے پونا کے پریس کی نقل کرتے ہوئے حکومت کے خلاف سخت لہجہ اختیار کر لیا اور اس کے صفحات تشدد کی تعلیم دینے لگے۔ کیسری، وہاری اور یوگانتر کے کالم اس بات کا ثبوت ہیں کہ مذہب تک کو سیاسیات میں ملا دیا گیا تاکہ مذہبی اور رعایات پرست جماعتوں کو تشدد آمیز حرکات پر اکسایا جا سکے۔ حکومت نے مجبور ہو کر نیوز پیپر ایکٹ بابت ۱۹۰۸ء پاس کیا۔ اس قانون کی رو سے حکومت کو یہ اختیار دیا گیا کہ ان چھاپہ خانوں کو ضبط کرے جن میں بعض جرائم پر اکسانے والے اخبارات چھپیں۔ اس ایکٹ کی فوری وجہ مسٹر اور مسز کینیڈی کا قتل تھا۔ چونکہ تشدد روز بروز سخت ہوتا جاتا تھا اور ۱۹۰۸ء کا قانون حالات کے تدارک کو کافی نہیں تھا۔ اس لئے ۱۹۱۰ء کا پریس ایکٹ پاس ہوا۔ اس قانون کا مسودہ پیش کرتے وقت جو کچھ سرکاری ممبر نے کہا وہ قابل توجہ ہے۔ انہوں نے کہا۔

"یہ باتیں بعض اخبارات کی تعلیمات کا فطری اور معمولی نتیجہ ہیں۔ ان اخبارات نے وہ زمین تیار کی ہے جس پر آئی پھل پھول رہی ہے۔ انہوں نے بیج بو دیا ہے اور اب فصل کے ذمہ دار ہیں وجوہات کا سلسلہ بالکل صاف ہے۔ نہ صرف یہ کہ تشدد کا آغاز اس وقت سے ہوا جب پریس نے اپنا لہجہ بدلا، بلکہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ادھر بھڑکایا گیا اور ادھر کوئی نہ کوئی واردات ہوئی۔"

جب اس ایکٹ کی ضرورت ختم ہوگئی۔ پریس لا کمیٹی کی سفارش پر لارڈ ریڈنگ کے زمانے میں اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اس کی منسوخی پر چیمبر آف پرنسس نے یہ درخواست کی کہ پریس ایکٹ کی ضروری دفعات کے استرداد سے ہندوستانی ریاستوں کے ہیں جو کمی ہوگئی اسے خاص تحفظ سے پورا کیا جائے چنانچہ ۱۹۲۲ء میں ہندوستانی ریاستوں کو سازشوں سے بچانے کے لئے انڈین اسٹیٹس پروٹیکشن ایکٹ پاس ہوا۔ کیونکہ یہ خطرہ ہر روز بڑھتا جاتا تھا اور برطانوی ہند کی سرزمین پر سازشیں تیار کی جاتی تھیں۔

ہندوستانی پریس کے اس مختصر سے تاریخی جائزے سے ایک حد تک یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کس طرح پریس اس قدر وسعت پذیر ہوا اور کس طرح یہ ملک کے سیاسی ارتقاء میں ایک زندہ قوت بن گیا۔ اب پریس ملک کی ترقی پر بڑا زبردست اثر ڈال رہا ہے اور ہم دیگر ملکوں کے پریس سے مقابلہ کر کے اسے کچھ بہتر پاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم روس یا جرمنی جیسے ملکوں کے پریس سے اپنے ملک کے پریس کا مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی پریس کو کس بلند درجہ کی آزادی نصیب ہے۔ روس اور جرمنی میں اس وقت صرف وہی پریس باقی رہنے دیا جاتا ہے جو حکومت وقت کا ہم آواز ہو۔ بالخصوص روس میں جہاں کے متعلق ہم بہت کچھ سنتے رہتے ہیں پریس کو مطلق آزادی حاصل نہیں ہے کیونکہ وہاں سرکاری ادارہ "گلاولت" ہی سب سے بڑا سنسر بورڈ ہے اور کوئی ذاتی پریس گلاولت کی مرضی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہندوستانی پریس کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات یہ ایسی روشوں پر جا پڑتا ہے جن سے تعصبات تمام ملک میں پھیل جاتے ہیں ملکی فضا میں جذب ہو کر ہندوستان کی جمہوریت پسندانہ اور قوم پرستانہ صلاحیتوں کو ضرر پہنچاتے ہیں۔ یہ عنصر ہماری ملکی زندگی پر بری طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ جمہوری اداروں کے رواج پانے کے لئے ایک روشن خیال رائے عامہ کا وجود ضروری ہے۔ کیونکہ رائے عامہ ہی کے بل پر جمہوریت چل سکتی ہے اور چونکہ رائے عامہ کا رہبر پریس ہے اس لئے ان لوگوں کا جو رائے عامہ پر اثر و نفوذ رکھتے ہیں یہ فرض ہے کہ وہ پریس کو جہاں تک ہو سکے ایماندار اور صحیح الخیال بنائے رکھیں۔ لارڈ ڈیرانس نے نے صحیح کہا ہے کہ بڑے ملکوں میں پریس ہی نے جمہوریت کو ممکن بنایا۔ فرقہ وار اخباروں کو بھی لارڈ برائس کی اس نصیحت کو گوش گیر کرنا چاہیے جو انہوں نے اپنی کتاب ماڈرن ڈیموکریسی

میں کی۔ وہ لکھتے ہیں:۔
" ایک ایسا اخبار جو قوم کے ایک مخصوص فرقے کو خواہ وہ نسلی ہو، مذہبی ہو، یا صنعتی ہو، خطاب کرتا ہے خطرناک ہوتا ہے اگر وہ اس فرقے کے سامنے صرف جماعتی زاویۂ نگاہ اور واقعات لائے اور اس مخصوص فرقے کی تکالیف کو مبالغے کے ساتھ پیش کرے اور اس فرقے کے باقی قوم سے علیحدگی اور مخالفت کے جذبات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرے ایک مخصوص علاقے میں یا کسی ایک جماعت کے افراد میں کسی ایک اخبار یا متعدد اخبارات کا جو ایک ہی شخص یا جماعت کے آگن میں ضرورت سے زیادہ اقتدار روشن خیال رائے عامہ

————— :(کی تخلیق کے لئے خطرہ ہے)؛ —————

ترک و اختیار

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

قومی عصبیت کو ترک کردو

کہ یہی وہ زہریلا تخیل ہے جو دنیا کے امن کو پارہ پارہ کئے ہوئے ہے یہی ایک فرد کو دوسرے فرد کے حقوق کے غصب کی خطرناک رائے دیتی ہے اور یہی اس پُرکیف محبت کی فردوس سے دور رکھتی ہے جس میں حیاتِ جاوید کے نغمہ ریز آبشار ہیں۔ یہی وہ سانپن ہے جو دنیا میں سیاسی بے چینیوں کے اژدہے پیدا کرتی ہے اور یہی وہ ڈائن ہے جس نے اپنے پنجوں سے انسانی قلوب کو جکڑ رکھا ہے اٹھو اور تریاقِ محبت سے اس سانپن اور اس ڈائن کی زہریلی گرفت سے آزاد ہو جاؤ۔

اکتفا اور توکل کو چھوڑ دو

کہ توکل تکاہل اور سستی، قدرت کے اکرام سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے تصور میں مست رہنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ توکل اس روحِ یقین کو کہتے ہیں جو عبد کو معبود کے علاوہ ہر ایک کی طرف سے بے نیاز کر دے، توکل حجرہ نشینی اور گوشہ گیری کا نام نہیں، توکل نام ہے ایک مقدس بے نیازی کا' اور بے نیازی ایک مجاہد ہی کا سلوک ہو سکتی ہے جو زندگی اور قوتِ بازو سے گہرا رابطہ رکھتا ہو۔

اکتفا۔ قدرت کی توہین ہے اور تسلیم غلامی کے لئے ایک پاکیزہ بہانہ ہے۔ خون کو سرد کرنے کے لئے ایک بجھا ہوا ابال ہے۔ ایک مٹا ہوا تصور ہے اور روح کو منفعل کرنے کے لئے ایک سیلاب۔ کبھی اکتفا اس کو نہیں کہتے کہ اگر کوئی ملک غلام ہے اور اس کے باشندے امن کی زندگی بسر کرتے ہیں تو اس کے باشندوں کو آزادی کی سعی نہیں کرنی چاہئے بلکہ اکتفا نام ہے فاسد مزاج کے مطالبات ناجائز سے دماغ، دل کو محفوظ رکھنے کا، حرص و آز کے تقاضات کو رد کر دینے کا، خود آزاد اور دوسروں کو بھی ذی عزت اور آزاد رہنے دینے کا، اپنی پونجی کی حفاظت اور دوسرے کی جنس نقد کی طرف سے آنکھ بچا کر گزر جانے کا۔

ذی حیات موسم ہے اس لئے سنو کہ اکتفا جمود کا نام نہیں حرکت کا نام ہے۔ حرکت اور حرارت ہی زندگی ہے، اکتفا کاہلی ہے اور کاہلی موت ہے اور موت دنیا میں عزت و آزادی کی ضامن نہیں ہو سکتی، اس لئے جھوٹے توکل اور باطل اکتفا کو چھوڑ دو جو تم کو بازاری صوفیوں نے سکھایا ہے۔

انسانی اخوت کو اختیار کرو

دنیا کو ایک گھر انسانی نسل کو ایک خاندان اور تمام قوموں کے افراد کو اپنا بھائی یقین کرو کہ قومیت ہو یا وطنیت، نسل ہو یا رنگ اس کی تعین قدرت نے نہیں کی ہے اور اگر تعین کرتی تو یورپ میں دو آنکھوں والے انسانوں کے بجائے چار آنکھوں والے آدمی پیدا کرتی، امریکہ میں ایک ٹانگ کا آدم ہوتا اور ہندوستان میں چار دست انسان، اسلئے سوچو اور اپنے نفس کی کدورتوں، خباثتوں اور گندگیوں کا محاسبہ کرو، یہ تمام طلسم یہ ساری جادوگری اور یہ رنگ برنگ کے جال خود تمہارے ہی وضع کئے ہوئے ہیں۔

دنیا کا امن سیاسی خود غرضی میں پوشیدہ نہیں بلکہ اخلاقی قدروں میں پنہاں ہے، عیسائیت ہو یا اسلام ہندوازم ہو یا کوئی اور مذہب جس قدر اخلاقی مذاہب ہیں ان کی روح اور ان کا مقصد صرف انسانی کی بحالی و ترقی ہے۔ قومی عصبیت اخلاق کی بنیادی روح پر ایک ضرب کاری ہے اگر یہ ترک ہوگی تو انسانی روحانیت کا قلع قمع ہو جائیگا۔ انسان جس منزلِ ارتقا تک اس وقت تک پہنچا ہے اور خود اس کی سعی جس مدرس و تہذیب کے عظیم الشان درجہ پر لائی ہے اور جس دماغی و روحانی بلندی پر اس وقت وہ پرواز کر رہا ہے کیا وہ دنیا و انسان کے لئے محض فریب و سراب ہے؟ اور اگر سراب نہیں ہے تو پھر اپنے منصب کی روایات کو باقی رکھو

حجروں اور گوشوں کی دیواریں توڑ کر باہر نکل آؤ' خدا تم کو حجروں کے اندر اور گوشوں کے اندر توکل کا صلہ نہیں دیگا حق دینگے اور آج دنیا و انسان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ حق سے فائدہ اٹھانے والوں کو نیست و نابود کر دو انسان کی خدائی میں توکل فنا کا دوسرا نام ہے اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو مجاہد بنو' زندگی نام ہے اضطراب و اشتعال کا' اگر گھر کے کونوں میں اس چنگاری کی طرح جیسے بیٹھے رہے جو اولاد میں ان کو دبا دی جاتی ہے تو یاد رکھو صبح ہوتے ہی تم پر اوس پڑ جائیگی لیکن اگر تم نے اپنے ہاتھوں کو فعلہ عمل سے سلگا کر مشعل بنا دیا تو تم خود اپنے رہبر بن جاؤ گے اور قسمت کی روشنی تمہاری رکاب بردار ہوگی' توکل کی تعلیم اس وقت کی تعلیم ہے جب ادیب اور شعراء حکومتوں کے وظیفہ خوار ہوتے تھے اور اپنے ادب کے ذریعہ عوام کی روحِ احتجاج کو مفلوج کرنے والی اخلاقیات کا درس دیتے تھے۔ آج وہ زمانہ آگیا ہے کہ ہر شخص اپنا خود وظیفہ خوار ہے یہ وظیفہ تمہارے ہاتھوں کی جنبش ہی ادا کر سکتی ہے خلا پر بھروسہ رکھو مگر اس یقین کے ساتھ کہ بغیر حرکت کے خدا تم کو ایک قطرہ نہیں دیگا۔ **اکتفا**، قدرت کے لطف و کرم کی توہین ہے اور اس کے دروازۂ فیض سے ہٹ جانے کے مترادف۔ اکتفا ترقی کے راستے مسدود کرتا ہے۔ بے چینی ارتقاء کی ضامن ہے۔ ہر وقت فضاؤں میں شاہین صفت اڑتے رہو اور عقاب نظر شکاری کی طرح طائرِ وقت کا شکار کرو۔ اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو ترکش جلا دو اور کمان ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔

ساغر نظامی

"ایشیا" میرٹھ

انگریزی گرجوں میں دستک دینے کی خاص گھنٹیاں

(از سید عنایت علی بی اے (علیگ))

کلیسائی گھنٹی

سینٹ گری گوری کے گرجہ واقع نارویچ میں

انگلستان کے پرانے گرجوں میں اب بھی ایسی گھنٹیاں موجود ہیں جو محض مجرموں کیلئے مخصوص تھیں کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کی غرض سے گرجوں میں جب آتے تھے تو ان گھنٹیوں کے ذریعہ کلیسا کے راہب کو اطلاع دیتے تھے جو اپنے مراقبہ سے بیدار ہو کر گرجہ کے دروازہ کو کھولتا اور گناہگاروں کو کلیسا (choir) کے پاس لیجا کر امن کی چوکی (Frith or peace stool) پر بٹھاتا۔ اگر ان کے پاس ہتیار ہوتے تو یہ گنہگار وہاں پہنچکر ان کو راہب کے سپرد کر دیتے۔ پھر اپنے جرموں کا اقبال و اعتراف کرتے۔ توبہ کرتے۔ مختلف قسمیں کھاتے داخلہ کی فیس ادا کرتے اور ایک سیاہ چغا پہنکر جس کی بائیں آستین پر سینٹ کیتھبرٹ (St cuth bert) کا صلیبی نشان ہوتا۔ ہمیشہ کے لئے کلیسا کی پناہ میں نہایت پر امن زندگی گزارتے۔

عیسائیوں کا گمان ہے کہ گرجہ میں وہ حصہ جسے کلیسا (choir) کہتے ہیں نہایت متبرک و مقدس ہے اور جو شخص اس کی پناہ میں ہو وہ تمام آفات اور پاداشِ جرائم اور سزاؤں سے محفوظ ہوتا ہے چنانچہ اسی عقیدہ کو قائم رکھتے ہوئے انگلستان میں سنہ ۳۹۹ء میں گرجاؤں کی تقدیس کو حکومت نے تسلیم کر لیا۔ پھر بذریعہ قانون سنہ ۴۱۹ء گرجہ کے دروازہ سے پچاس قدم تک اس تقدیس کو وسعت دی گئی۔ بالآخر سنہ ۴۳۱ء میں گرجہ کے احاطہ تک یہ وسعت بڑھ گئی۔ اس احاطہ کے اندر اندر حکومت کے قوانین کا نفاذ اور ان کی عملدرآمد ناممکن ہو گئی تھی اور مجرم۔ ڈاکو۔ قاتل وہاں پہنچکر مامون و محفوظ ہو جاتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب انگلستان میں راہبوں کے دور دورے تھے اور راہبوں کی خانقاہوں پر بڑے بڑے شاہانِ انگلستان خمیدہ اور سرنگوں نظر آتے تھے۔

حقوق کلیسا پر سب سے پرانا قانون جو ہاتھ لگا ہے وہ سنہ ۶۰۰ء کا ہے۔ اس میں بالتفصیل گناہگاروں کے توبہ کرنے کے طریقے درج ہیں کہ کس طرح وہ کلیسا میں داخل ہوں۔ کس طرح اپنے گناہوں کا اقبال اور صحیح بیان راہب کے سامنے دیں اور پھر اپنے گناہوں سے توبہ کر کے کس طرح کلیسا کی پناہ میں آجائیں۔ کیا داخلہ کی فیس دیں اور بعد میں سیاہ لباس پہنکر کس طرح گرجہ میں پر امن طریقہ سے ایک آزاد خادم کی زندگی بسر کریں۔

آل سینٹس کے گرجہ واقع یارک میں کلیسا کی گھنٹی

چونکہ اس طریقہ میں یہ خرابی تھی کہ جس نے جب چاہا اور جیسا کچھ چاہا سنگین سے سنگین جرم کر ڈالا اور گرجہ میں جا کر توبہ کر ڈالی۔ مگر اس سے لیبے سنگین جرائم کی تعداد میں جو اضافہ ہوا وہ شاہ جیمس اول کے سنہ ۱۶۲۳ء کے قانون سے واضح ہوتا ہے۔ اس لئے اس کلیسائی تقدیس کا سنہ ۱۷۹۹ء کے قانون سے سدباب ہوا اور پھر سنہ ۱۷۲۳ء کے قانون نے اسے بالکل فنا کر ڈالا۔

ہیکس ہیم (Hex ham) اور بیورلی (Beuerley) کے گرجاؤں میں مندرجہ بالا

امن کی چوکیاں (Frith stools) اب بھی موجود ہیں

یہ کلیسائی دستک کی گھنٹیاں پارک کے آل سنٹس چرچ۔ نارفوچ کے سینٹ گری گری چرچ اور اپڈل علاقہ بیڈز میں اس وقت بھی موجود ہیں۔ یہ تقریباً ایک سی وضع کی ہیں۔ ایک سور کا منہ اور اُس کی گھنٹی پر راہب کی تصویر معہ اُس کے راہبی ٹوپے کے۔ اور زنجیر ہلانے والا کڑا ان دونوں۔ اُبھرے ہوئے منہوں کے پیچھے۔ یہ گھنٹیاں ڈھلے ہوئے لوہے کی ہیں مگر ان کی ساخت اور کاریگری سے انگلستان کے قدیم فنِ آہنگری کا پتہ چلتا ہے۔

ایسی گھنٹیاں نہ صرف معبدوں اور گرجاؤں ہی میں استعمال ہوتی تھیں بلکہ ان کا رواج شہروں میں بڑی بڑی نجی اور سرکاری عمارتوں میں بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ انگلستان کے بڑے عجائب خانہ (British Museum) میں ایسی گھنٹیاں موجود ہیں۔ اور وکٹوریہ میوزیم لندن میں چودھویں صدی کی ایک گھنٹی موجود ہے۔ آکسفورڈ کی بریزنوز کالج میں جو ایک مشہور گھنٹی ہے اُس کو کالج نے ۱۸۸۶ء میں خریدا تھا اُس کے متعلق ایک طول طویل داستان ہے۔ یہ گھنٹی ابتدا میں ایک معمولی عمارت میں تھی۔

رائل ہسٹوریکل سوسائٹی کے ممبر مسٹر ارنسٹ مورس نے ان گھنٹیوں کے حالات اور تصاویر سوسائٹی ہذا کے لئے فراہم کئے ہیں۔

(ترجمہ)

بریزنوز کالج۔ آکسفورڈ میں یہ گھنٹی موجود ہے

محبت کی کرم فرمائیاں

بن نہ جائیں عشق کی رسوائیاں ۔۔۔ شوقِ نافرماں تری خود رائیاں

برخلافِ عشق، ہر تدبیرِ عشق ۔۔۔ مل گئیں سب خاک میں دانائیاں

کس سے ہوتیں، گر نہ ہوتیں آپ سے ۔۔۔ اس قدر! اور اتنی! بے پروائیاں

مرحبا! اے شاہدِ حسنِ خیال ۔۔۔ کس نے دیکھی ہیں تری رعنائیاں

شبنم و گل، ماہ و انجم، ارض و سما ۔۔۔ ایک ذات، اور سیکڑوں پرچھائیاں

اب وہ آئے! اب وہ آئے! اب وہ آئے ۔۔۔ سب ہیں یہ دل کی خیال آرائیاں

خون رلوائیں گی نشتر! ایک دن

یہ محبت کی کرم فرمائیاں

"نشتر" سندیلوی

۲۱

جرعاتِ خیال

(روحِ فرید سیّدہ زینب جنّت مکانی کے نام)

ساغر! تم نے افسانہ مانگا ہے گویا میرے پاس —— کہانی کی مشین ہے کہ جب چاہا ڈھال لی، برادرانہ اصرار اور پُر خلوص محبت سے مجبور ہو کر چند بھولی بسری کہانیوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں، گل پوش شملہ میں "اُن کے" سوا کچھ یاد نہیں آتا۔

فقط تمہارا ۔ نگار فرید

(۱)

موہنی! آج جب میں قدم قدم پر پھسل رہا ہوں، مجھ پر ہر طرف سے کمندیں پڑ رہی ہیں اور میں بچتے بچتے بھی گرفتار ہوا جاتا ہوں سنبھلتے سنبھلتے بھی پھسلا جاتا ہوں مجھے وہ تھرتھراتی ہوئی راتیں یاد آتی ہیں جب گرجتے ہوئے راستوں کے کنارے کنارے ہم پریت نگر کو بانہوں میں بانہیں ڈالے جایا کرتے تھے جب تم ڈر ڈر کر اپنی پریت بھری انکھوں کو میرے اوورکوٹ میں چھپا لیا کرتی تھیں جب تمہارے کسی قدر چھلکتے ہوئے ہونٹ میری انگلیوں کے سہارے سنبھلتے تھے اور میں ڈگمگا جایا کرتا تھا۔ جب بادل کی لہراتی ہوئی روشنی زمین کو "انجنستان" بنائے ہوتی تھی جب دور گھاٹیوں میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ ہم کو غور و فکر میں ڈبو دیتے تھے۔ جب میں تمہارا ہاتھ کسی قدر دباتا تھا اور تم ڈری ہوئی ہنسی ہنس دیتی تھیں۔

آج جب ہر لمحہ ناگنوں کا نرغہ بن جاتا ہے۔ میں وہ پراگندہ راتیں یاد کرتا ہوں جب چندرما کی دودھ بھری فضا میں ہمارے دل ایک دوسرے کے پاس رہا کرتے تھے، جب دونوں ہونٹوں سے پریم اور پریت کی چنگاریاں اٹھتی تھیں، اور ہم دونوں انہیں اور بھڑکا کر شعلہ کر دیتے تھے اور پھر چوموں کی روشنی میں جُھلسے جُھلسائے رخصت ہو جایا کرتے تھے ——

آج جب تم کوشر کی پھوار میں نہا رہی ہو اور پریم کے گنگا جل میں مجھے ڈھونڈھتی پھرتی ہو، میں تم سے بہت دور ہوں، تم زمردیں محل میں حوروں کے نرغے میں "بالم مورے پردیس" کی پرسوز راگنی چھیڑ رہی ہو میں بے وفائی اور بے حیائی کے سیلاب میں بہا جا رہا ہوں۔ ایک ریتا تنکا بھی ہاتھ نہیں آتا کہ کہیں تو ساحل سے جا لگوں ——

آج تمہارے پریتم کا خون برف ہو رہا ہے صرف پُرانی یاد کی چنگاریوں کی حرارت میں وہ جی رہا ہے مگر یہ کب تک —— کیا ہمارے جذبات کی گہرائیوں پر بھی خزاں کے جھونکے بہہ گئے ہیں؟

وعدوں کی یاد پر کھرا سا چھا رہا ہے، وفا کے معاہدوں پر دُنیا کا حسن اور رُومان غالب آ رہا ہے تصورات کے سہارے ہیں مگر ان میں ناگنیں لپٹی ہوئی ہیں ——

میں سنسناتی ہوئی راتوں میں تمہارے لئے بڑبڑایا کرتا ہوں بھول بھول کر تمہیں یاد کرتا ہوں کبھی دل کو بہلانے کے لئے تمہارے پریت نگر کی یاترا کیلئے اُٹھنا چاہتا ہوں مگر دزدیدہ نگاہوں کے گرداب میں گھر کر اُٹھتے ہی رہ جاتا ہوں۔ دوست مُنہ چھپا چھپا کر ہنستے ہیں مگر وہی مجھے گناہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں جس سے صرف گاہے گاہے تمہاری یاد کی ایک ہلکی سی جُھرجُھری بچا دیتی ہے۔

وقت خوابوں کی تعمیر کی ہوئی فلک پیما عمارت کو توڑ ڈالتا ہے مسمار کر دیتا ہے، اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے —— وقت دیوی دیوتا دونوں کے بتوں کو مٹی میں ملا دیتا ہے، خواہشیں ویران ہو جاتی ہیں اور آرزوئیں سنسان۔ صرف پریم اور پریت جاوید ہی باقی رہتے ہیں۔ اپنی طلسماتی شمع کی روشنی میں برابر آگے ہی بڑھتے رہتے ہیں گلاب مسل جاتا ہے لیکن اس کی خوشبو دماغ میں بسی رہتی ہے۔

(۲)

سندری! میں ہمالیہ کی چوٹیوں سے تمہیں دیکھ رہا تھا جب تم موت کے رتھ پر پریت نگر کی طرف اُڑی جا رہی تھیں مگر میں بے بس تھا! یہ نہ سمجھنا کہ ہلاکت آفرین فضا نے مجھے تمہارے پاس پہنچنے سے روک دیا یا آسمانی غصہ کے خوفناک بپکے سے میں ڈر گیا۔ میں اس آتی ہوئی گھڑی کے خوفناک رازوں سے بے خبر بھی نہیں تھا —— میں دیکھتا تھا کہ آسمان پر کس کے وداعی خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سارا آسمان آباد! سینے ڈینے پھڑپھڑا رہا ہے۔ آخری سانس لیتا ہوا مغرب دم توڑ رہا ہے، مشرق تباہی کے امواج سوتی کے ساتھ چلا آ رہا ہے —— میں نے موت کے رتھ کا سفید لہراتا ہوا پرچم بھی دیکھ لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رتھ فضا کے کھمبے میں اٹک چکا ہے اور طوفانی سفر کے لئے بادلوں کے گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی ہو چکی ہیں، لہروں نے ہمارے اپنے چندرما کی تڑپ اور فطری تکلیف کو مچل مچل کر ظاہر کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور سدا بہار تارے پیلے پڑ گئے ہیں —— میں خواب سے بیدار ہو چکا تھا اور تم کو اپنی آغوش کی پناہ میں لے لینے کے لئے ایک عجیب و غریب کالا چاند میری آرزو کے گہوارے کے قریب دھیرے دھیرے تیرتا ہوا آ رہا تھا اور وہ میرے ساحل تک پہنچنے کے لئے اس قدر بضد تھا کہ میری ذرا سی لغزش میں اس کی کشتیٔ حیات پتھریلے ساحل سے ٹکرا جاتی اور انجام اس سے زیادہ خوفناک ہوتا —— اب تم شکمی سے وقت کے نامعلوم جزیرے میں رہو میں غیر فانی ساحل کے لئے روانہ ہو چکا ہوں تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا لیکن اس کے لئے مجھے بھی اپنے جسم کے امرت کو اچھی طرح نچوڑنا ہے زندگی کے مصنوعی روغن کو اچھی طرح دھونا ہے، جب میں دُنیاوی قانون کے ماتحت اچھی طرح

پاک صاف ہو جاؤں گا پربت نگر کے مندر میں ہمارا تمہارا ملاپ ہو جائیگا اُس وقت ہماری روحیں ملکر ایک ہو جائیں گی ——————

(۳)

کامنی! پریم کی وہ ایک مدھ بھری رات تمہیں یاد ہے جب ہم چونک کر ایک دوسرے سے ملے آکاش سے دھرتی پر پریم کے پھولوں کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ تم کیسی سُندر معلوم ہو رہی تھیں۔ میں باہر سے آیا تھا۔ میری ماتا جی بھی ساتھ تھیں۔ تم نے کیا سب کی نظریں بچاکر مجھ پر اپنے پریم کا امرت چھڑکا، اُف کیسی نشیلی خوشبو تھی، میں بیہوش ہو گیا تھا تم نے مجھے پریت کی جونہی چھڑی ماری مجھے ہوش آگیا —————— پھر ہانپتے ہوئے آسمان کے نیچے ہمارے پریم کی وہ لمبی لمبی پینگیں، میں نے تمہارے لہراتے بالوں کی اندھیری مست خوشبو لی تھی اور تمہاری چھلکتی ہوئی آنکھوں میں کرم کا نہان کر لیا تھا۔ تم نے مجھے پریم اور پیار کی دھیمی تھپکیوں میں کتنی نیندیں سلائی تھیں اور اُن ابلتے ہوئے گھنٹوں میں دنیا کیسی مدہوش ہو جاتی تھی جبکہ ہم دونوں رخساروں کے سہارے سماج کی جیرہ دستیوں کے افکار میں کھوئے سے رہتے تھے —————— جھڑی ہوئی پتیوں ٹوٹے ہوئے چھلوں اور بکی ہوئی خوشبو کے سایے تلے ہم ہچکیاں لیتے ہوئے چاند کو بیٹھے ہو ہو کر دیکھا کرتے تھے اور آخر کبھی کبھی اکتا کر پیوست لبوں کی مٹھاس سے درد کی چیخوں کو بہلایا کرتے تھے —————— یہاں تک کہ ہماری پرسکون ریاضتیں اور دقت وقت کی ستیہ گرہ کام آئی اور سماج اور دنیا کی نظروں میں بھی ہم ایک دوسرے کے ہو گئے —————— مگر پھر ایک دن بدبختی کا پتھر آسمان کی چھرائی ہوئی چھت میں سے کھسکا اور تم پر گرا اس وقت میں تم سے بہت دور ہمالیہ کی چوٹیوں پر مستقبل کا قلعہ تعمیر کر رہا تھا —————— جب میں تلاش کرنے پہنچا تو تم "اللہ آباد" سے بھی اوجھل ہو چکی تھیں اور اب میں تم کو وہاں دیکھتا ہوں جہاں میری جگہ نہیں —————— مگر اب میں نے بغاوت کر دی ہے، ہر چیز سے بغاوت کر دی ہے

انتقام کی پیاس بجھتے ہی مجھے یقین ہے کہ دروازے کھل جائیں گے اور میں ایک بار پھر تمہارا ہو جاؤں گا۔ تم روحانیت کے زرتار لباس میں ملبوس کر دی گئی ہو، مجھے ابھی مجھے ابھی جسمانی کیچلی ہی اتارنی ہے ——————

(۴)

پیاری! میں وقت کا منتظر ہوں، میری روح تمہارے لئے انتظار کر رہی ہے مگر جس طرح تمہارا جسم فنا ہو چکا اور روح ہی روح رہ گئی اسی طرح جب تک کہ میرا جسم بھی فنا نہیں ہو جاتا اور صرف روح نہیں باقی رہ جاتی میں تم سے بہت دور ہوں، بہت دور!

میری روح وقت کا انتظار کر رہی ہے، طوفان، برف، آندھی اور بارش کی بھی اُسے پرواہ نہیں اُسے وقت کا انتظار ہے اور اسی کی دُھن ہے

یہ امتحان کا وقت ہے، میری روح نے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری روح سے جُدا نہیں ہوگی، میری روح بے وفا نہیں ہے، وہ وعدہ پر قائم ہے، وہ صرف تمہارے خیال میں سرگرداں رہتی ہے وہ تم سے جُدا نہیں ہوگی، تمہارے جسم نے بے وفائی کی، میرا جسم بہت دن رویا کیا، اب میں بہت روکتا ہوں، کبھی کبھی مان جاتا ہے، گھبراؤ نہیں وقت قریب ہے بہت قریب!! تم پربت نگر کی گل ریز فضا میں اپنے پریم کی بانسری بجاتی رہو، میں آپہنچوں گا —————— میں آپہنچوں گا۔

موسم سرما سیٹی بجا رہا ہے! اور راتیں غصیلی ہوتی جا رہی ہیں۔ تم جب سے گئی ہو جھلک دکھانے کبھی نہیں آئیں، مجھے یقین ہے کہ تم نہ آؤ گی —————— مگر میں اپنی روانگی کا وقت آنے تک بلبلاتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ تمہارا انتظار کرتا رہوں گا!!

فرید مچھلی شہری،

میرا پیام

(جُرعاتِ خیال کے فرید کے لئے چند گھونٹ)

ہے جو بیوزِ یک نفس، سازِ تمام ہے یہی
نغمۂ صبح ہے یہی نالۂ شام ہے یہی

موت جہانِ عشق میں اک شدید کفر ہے
اے دلِ نا اُمیدِ مُن جذبۂ خام ہے یہی

میرے لبِ خموش پر حُسن کو حیرتیں ہیں کیوں
کہدے کوئی کہ عشق کا طرزِ کلام ہے یہی

منکرِ حشر ایک دن حشر کو مان جائیں گے
حُسنِ ملیح کا اگر طرزِ خرام ہے یہی

ذکرِ رہائی پر مرے اہلِ قفس پکار اُٹھے
اس کو رہا نہ کیجئے حاصلِ دام ہے یہی

خونِ حیات نذر دے لعبتِ نوبہار کو
بُلبُلِ نغمہ ریز کو گُل کا پیام ہے یہی

حبِ چمن سے مست ہو کیفِ وطن پرست ہو
موسمِ نوبہار میں میرا پیام ہے یہی

جام بدست رقص میں بیخود و مست رقص میں
ساغرِ مست زندہ باد، گردشِ جام ہے یہی

گرم و ستیزہ کار ہے مولوئ فساد خو
پہلے اسے تمام کر شترِ تمام ہے یہی

ساغر نظامی

جیونی

میرا گھر میں پاؤں رکھنا تھا کہ کاکا نے ایک لا انتہائی گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ میری کامیابی، میری تندرستی، چھوٹی بہن کی شادی کی فکر، میسور کی حالت وغیرہ وغیرہ غرضیکہ وہ کونسا ذکر تھا کہ نہ کیا گیا ہو اور میری یہ حالت تھی کہ ہمہ تن گوش تھا مگر حقیقتاً یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ وہ کہہ کیا رہی ہیں البتہ کبھی کبھی ہاں ہوں ضرور کر دیتا تھا میں تو اس وقت گرما گرم چائے کی چسکیاں لے رہا تھا جو دس میل کے طویل سفر کے بعد بالکل اُمرت معلوم ہوتی تھی سفر کی طوالت کا اس طرح اندازہ کیجئے کہ مجھکو بالکل کی شکستہ اور گرد آلود سڑک پر دس میل بائیسکل پر چلنا پڑا تھا۔ اُس بائیسکل پر جس میں سے چرخ چوں و چڑ پڑ کی مختلف الصوت آوازیں نکل کر انقباضِ طبع اور دل کی پراگندگی کا سامان مہیا کرنے میں مصروف کار تھیں گھر سے ۹ ماہ کی طویل جدائی کے بعد گھر کے اندر ایسا سکون محسوس ہوا کہ بس سو جانے کو جی چاہتا تھا چنانچہ نیم غنودگی کی سی حالت میں میں کاکا کی باتیں سنتا رہا مگر جی یہی چاہتا تھا کہ کاکا چلی جائیں اور میں نیند میں دنیا و مافیہا سے کھو جاؤں۔ پیالی ختم کرنے کے بعد میں نے ان سے دوسری پیالی کی درخواست کی کیونکہ اوّل تو تنہائی کا بہانہ اس سے بہتر نہیں مل سکتا تھا دوسرے واقعہ یہ بھی تھا کہ چائے کی خواہش باقی تھی ان کے چلے جانے کے بعد میں اپنے ہاتھ کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور سکون کی ایک پُر مسرت موج تمام جسم میں دوڑ گئی کچھ غنودگی بھی طاری ہوگئی۔ یکایک نیم بیداری کی حالت میں میں نے اپنے عقب میں آہستہ سے دروازہ کھلتا ہوا محسوس کیا جو مکمل طور پر نہیں کھولا گیا تھا۔ میں چپ چاپ لیٹا رہا میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص دروازہ میں کھڑا ہے اور اندر آتے ہوئے ڈرتا ہے میں نے اپنا ہاتھ سر کے نیچے سے سرکایا اور پاؤں بھی فرش پر آہستہ سے پھیلایا اور کچھ بڑبڑایا بھی کروٹ بھی لی دروازہ پھر کچھ بند ہوا اور وہی شخص واپس ہوتا ہوا معلوم ہوا ———— گیا ————

میں نے دل میں خیال کیا اور اس خیال سے کہ میں نے کسی ہمسایہ کو جو غالباً میری آمد کی خبر سنکر مجھ سے ملنے آیا تھا واپس بھیجدیا کچھ تکلیف سی محسوس کی لیکن کوئی اندر سے کہہ رہا تھا کہ نہیں ابھی یہ گوشت پوست کا مجسمہ موجود ہے باہر پتھریلی زمین پر گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ اور کوّوں کی کائیں کائیں نے ایک بلا خیز طوفان اُٹھا رکھا تھا۔ دروازہ سے سورج کی چند کرنیں اندر آکر مجھ کو آرام پہنچانے میں مشغول تھیں کہ کاکا چائے لیکر اور میرے قریب کھڑے ہوکر آہستہ سے بولیں رتّمو بھیا سو گئے!؟ میں نے اپنے سر کو دروازہ کے جانب حرکت دیتے ہوئے کہا جاگ رہا ہوں دروازہ اب مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔

"کاکا" میں نے کہا "دروازہ میں کوئی آدمی کھڑا تھا!"

کب۔ انہوں نے بلند آواز میں دریافت کیا۔

ابھی کوئی ایک سیکنڈ ہوا۔

انہوں نے دروازہ میں سے جھانک کر دیکھا کچھ مسکرائیں اور پکارنے لگیں جیونی! بندریا! اندر کیوں نہیں آتی۔ بھیا تم کیا سمجھ رہے تھے؟ رام جانے کون ہے؟ اور یہ کہکر ایک قہقہہ لگایا یہاں تک کہ اُن کے آنسو نکل آئے ایک نحیف آواز میں یہ الفاظ ادا کئے گئے۔

جی ماتا جی۔ جی ہاں میں اندر آنا چاہتی تھی مگر بابو جی کو سوتا دیکھکر میں یہاں رُک گئی۔ یہ الفاظ دیہقانی لہجہ میں ادا کئے گئے تھے۔

کاکا نے حکم دیا اندر آجاؤ۔

جیونی آہستہ سے دروازہ تک آ کر رُک گئی اور مجھ کو اس طرح سے دیکھنے لگی کہ میں کوئی دلی یا مہاتما ہوں۔

کاکا نے پھر کہا ڈرو مت اندر آجاؤ

جیونی اندر داخل ہوئی اس انداز میں گویا کہ مندر میں داخل ہو رہی ہے اور دور ہی ایک چاول کی بوری کے پاس کھڑی ہوگئی۔

کاکا میرے قریب فخر اور محبت کے انداز میں بیٹھی تھیں۔ ان کی تمام تر محبت میری ذات سے وابستہ تھی انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا رتّمو۔ جیونی ہماری نئی نوکرانی ہے اب میں نے جیونی کو دیکھا جس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اس کی عمر ۴۰ سے تجاوز کر چکی تھی چہرہ پر کہیں کہیں جھریاں پڑ گئی تھیں مگر آنکھوں میں عجیب چمک باقی تھی۔ اس کے بال سفید ہو چلے تھے اور لٹکی ہوئی چھاتیاں قمیص سے نا آشنا تھیں۔ کشادہ پیشانی سے بیوگی اور غم کے آثار نمایاں تھے۔

جیونی قریب آؤ میں نے کہا۔

نہیں بابو جی۔

نہیں آگے آؤ میں نے پھر اصرار کیا۔

کاکا چلائیں۔ جیونی یہاں قریب سے آکر دیکھ میرا بھیا کیسا سُندر ہے۔ کیا قیامت کا افتخار تھا جس نے میری بھدّی ناک اور موٹے لبوں کا تصور دماغ میں پھر تازہ کر دیا۔

ہجو ملیح کا نہایت حسین انداز تھا۔

جیونی چند قدم اور رینگی۔

بندریا آگے کیوں نہیں آتی کاکا نے تُرشی سے کہا۔

جیونی چند قدم اور آگے بڑھی اور گردن جھکا کر ایک نئی دلہن کی طرح کھڑی ہوگئی۔

کاکا کہنے لگیں دیکھ جیونی میرا بھیا بالکل شہزادہ معلوم ہوتا ہے

"دیوتا" جیونی بولی

مجھ کو ہنسی آگئی اور چائے پینے میں مشغول ہوگیا۔

جیونی نے آہستہ سے کہا تمام گاؤں بابو جی کے راگ الاپ رہا ہے

تجھے کیسے معلوم کاکا نے پوچھا!

کیسے میں تیسرے پہر کو بازار گئی تھی مجھے بابو جی کے آنے کا حال معلوم تھا آپ نے کہا تھا کہ وہ بالکل شہزادے معلوم ہوتے ہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ بائیسکل پر سوار ہوں گے۔ جب بابو جی

اس پیپل کے نیچے پہنچے جس میں رسّی کا پھندا ڈالکر اس موئے مچھیرے کودوں نے پھانسی لگالی تھی تو میں نے دیکھا کہ سب آدمی بابوجی کو دیکھ رہے ہیں اور وہ مجھ سے پوچھنے لگے یہ کون ہیں میں نے جواب دیا نائب صاحب کے سالے ہیں اور کون ہوتے۔ موٹے لالہ ننکو بولے کیسے سندر ہیں۔ بیوی کہنے لگی شہزادے ہیں شہزادے۔ میرے پاس ہی ڈنکا نائی کی بیوی کہنے لگی نہیں دیوتا ہیں "دیوتا"

رمو دیکھا تمام قصبہ میں تمہاری خوبصورتی کی شہرت ہو چکی ہے اب تم ذرا احتیاط سے کام لینا اس قصبہ میں جادوگر بہت رہتے ہیں جو خوبصورت بچوں کو جانور بنا کر مار ڈالتے ہیں مجھکو ہنسی آگئی۔

بابوجی ہنسو نہیں میں نے اپنی ان آنکھوں سے خود سینکڑوں جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے بھوت دیکھے ہیں جو سب کے سب جادو کے زور سے مارے گئے تھے جادو کے زور سے بابوجی جیونی نے اول مرتبہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا بابوجی دن چھپنے کے بعد تم جنگل میں کبھی نہ جانا کیونکہ اس وقت بھوت پریت نکلتے ہیں اور خاصکر گیا آنے کے بعد تال پر تو بھولکر بھی نہ جانا وہاں بھوت بہت رہتے ہیں

میں نے تعجب سے پوچھا تم کو کیسے معلوم ہوا

کیسے ؟ میں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا ہے رنگی کمہار کی بیوی نے صدموں سے تنگ آکر ایک رات اسی تال میں ڈوب کر خودکشی کر لی تھی۔ ابھی کچھ دن ہوئے میں رات کو اندھیرے میں اسی تال کے پاس سے گزر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ رنگی کی بیوی لمبے بال بکھیرے اور سفید ساری باندھے میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی اور رونے لگی وہ بھاگ کر درخت کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ اور عجیب بھیانک آواز میں چلانے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ پل پر کھڑی تھی اور یہ کہتی ہوئی پانی میں کود پڑی۔ میری بچی مر گئی۔ میرا بچہ مر گیا اب میں بھی مرنے جا رہی ہوں۔

کاکا کانپ گئیں وہ بھوتوں سے نہایت خوفزدہ ہو جاتی تھیں اور غصہ سے بولیں

گدھی چپ کیوں نہیں رہتی میں نے ہزار دفعہ منع کیا ہے کہ یہ قصے نہ بیان کیا کر۔

ماتاجی معاف کرو (گلطی) غلطی ہو گئی۔

میں سیکڑوں دفعہ معاف کر چکی ہوں مگر تو ان قصوں کے کہنے سے باز نہیں آتی گویا اُن پڑھ رہی ہے۔ تو خود جا کر تال میں ڈوب کر بھوت کیوں نہیں بن جاتی۔ کاکا غصہ سے بیتاب تھیں۔ جیونی نے خوف اور لحاظ سے سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر کے بعد بولی آپ کے بھیّا کیسے سندر ہیں؟

میں نے نہیں کہا تھا کہ میرا بھائی شہزادہ معلوم ہوتا ہے اور کسے معلوم ہے ممکن ہے اس کے جسم میں کسی دیوتا نے جنم لیا ہو۔ کاکا نے نہایت فخریہ انداز میں کہا۔

کاکا خدا کے لئے رحم کرو۔

میں نے جوش محبت سے ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

کاکا تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں اس خوفناک قصبہ میں میں بغیر جیونی کے کیونکر زندگی گزارتی

اور ماتاجی بنا آپکے میں تو زندہ بھی کیسے رہتی جیونی نے کہا اسکی آواز میں گیت کا ترنم تھا۔

یہ کمبخت قصبہ کیا ہے گاؤں سے بدتر چیزیں ملنا دشوار ہیں۔ اور "وہ" (بحیثیت ایک ہندوستانی بیوی کے کاکا اپنے شوہر کا نام نہیں لے سکتیں تھیں) اکثر تقاوی کی وصولیابی کے سلسلہ میں گھر سے باہر رہتے ہیں گاؤں میں تو کم مگر ایک دوسرے سے بہت فاصلہ پر واقع ہیں اکثر ہفتوں گھر کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوتی اور اگر جیونی میرے پاس نہ ہوتی تو میرا خوف و دہشت سے دم ہی نکل جاتا۔ کاکا کی آواز کچھ بھرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی رمو تم مرد ہمارے کامنا اور وشواس سمجھنے سے بالکل قاصر ہو اب جیونی باوجود نوکرانی ہونے کے بھی مجھکو یقین ہے میرے احساسات سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

کیوں میں نے دریافت کیا !؟

کیوں کیا تو میں نہیں بتا سکتی البتہ اس قدر جانتی ہوں کہ تم کشاکش زندگی میں گرفتار ہو کر ہم سے تو کیا "مذہب" جیسی حقیقت سے بھی بیگانہ ہو چکے ہو۔ ہمارے دیوتا اب تمہارے دیوتا نہیں رہے اور تم کو حسن جن چیزوں میں جلوہ نظر آتا ہے وہ ہماری نظروں میں بھیانک معلوم ہوتی ہیں یہ بالکل معمولی بات ہے اب کاکا کی آواز میں حزن و ملال کا عنصر نمایاں تھا۔

مگر کاکا میں نے تو ہمیشہ آپ کے کامنا کو سمجھنے کی کوشش کی ہے میں نے آہستہ سے کہا

نہایت پُر مسرت آواز سے بولیں یقینی یقینی

بابوجی تمہاری آپا تم سے بہت محبت کرتی ہیں وہ تم کو اپنے بچوں کی طرح چاہتی ہیں۔ میں بعض اوقات اس خیال سے کہ میں نے ان کے بچے نہیں دیکھے بے تاب ہو جاتی ہوں بچے کیا ہوں گے فرشتے ہونگے اور اب تو یقینی وہ آسمان میں فرشتوں میں شامل ہونگے کیونکہ جب بچے مر جاتے ہیں تو وہ فرشتے بن جاتے ہیں جیونی نے کہا اب اُس کی آنکھیں پُرنم تھیں مگر بابوجی میں کہنا چاہتی تھی کہ تمہاری آپا کو تو تم سے اس قدر پریم ہے کہ وہ اکثر تمہارا ذکر کر کے کہتی ہیں کہ اگر رمو نہ ہوتا تو میں بھی کبھی کی مر گئی ہوتی"!

تم آپا جی کے پاس کتنے عرصے سے ہو میں نے گفتگو کا پہلو بدلنے کے لئے پوچھا۔

عرصہ درصہ تو میں جانتی نہیں لیکن دیکھئے میں آپ کو بتلاتی ہوں جب خریف کی فصل تیار ہو گئی تھی اور ہم اناج کاٹ رہے تھے تب آپ کی آپا نے مجھکو اپنے یہاں نوکری کرنے کو بلایا تھا۔

کاکا تم کو جیونی کا حال کیونکر معلوم ہوا۔

بابوجی آپ کو نہیں معلوم سارے قصبہ میں کوئی عورت نائب صاحب کی نوکری کے لائق مجھ سے اچھی نہیں ہے اگر آپ چاہیں تو قصبہ کے تمام لوگوں سے پوچھ لیجئے اور وہ سب آپ کو بتائینگے کہ جیونی گاؤں سے زیادہ نیک اور ہیں سے زیادہ خدمت گزار ہے جیونی سے بڑھکر نائب صاحب جیسے بڑے لوگوں کی خدمت کوئی عورت نہیں کر سکتی اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیوں منہ سے نکلا اچھا تو تم تمام گاؤں کی نوکرانیوں میں سب سے زیادہ وفادار ہو۔

"اور کیا؟" اُس نے فخریہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔

تم نے کتنے نائب تحصیلداروں کی ملازمت کی ہے میں نے دریافت کیا۔

اچھا ابھی بتلاتی ہوں اب اُس نے انگلیوں پر گننا شروع کیا ہر ایک کا نام ان کے بچوں کی تعداد ان کی بیویوں کا مزاج اور ان کا رحم و کرم

میں نے شرارتاً دریافت کیا جیونی فرض کرو کہ میں دس یا پندرہ برس بعد پھر اس قصبہ میں آؤں اور نائب تحصیلدار نہ ہوں تو تم میری ملازمت کرو گی یا نہیں۔

یہ سُنکر وہ کچھ پریشان سی ہوئی اور جواب کے لئے کاکا کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی مگر پھر یکایک سوچکے بولی بابو جی آپ بھی بابو جی جیسے بڑے ہی آدمی ہوکر آؤ گے آپ کی تعلیم آپ کی سند تو سب باتیں کہتی ہیں کہ آپ نائب تحصیلدار ضرور ہونگے اور پھر میں خوشی سے آپ کی نوکری کرونگی فرض کرو کہ میں نائب تحصیلدار نہ ہو سکا۔

آپ ضرور ہونگے ضرور ہونگے اس نے ایسے انداز سے کہا گویا کہ میں اس سے مذاق اور اپنی توہین کررہا تھا۔

اچھا تو تمہیں ملازم رکھنے کے لئے مجھے نائب تحصیلدار ہی ہونا پڑے گا۔ میں نے مذاقاً کہا۔

عقب کے دروازے سے میری بہنوئی کی آواز آئی مگر میری طرح سے خون پسینہ ایک کرنا پڑیگا۔ نائب تحصیلداری بالکل اس کی مصداق ہے کہ عشق آسان نمود اول دلے افتاد مشکلہا،،

جیونی مارے خوف کے لرز اٹھی (کیونکہ یہ آواز اُسکے آقا کی تھی) اور باہر نکل گئی

آپ کی نوکرنی بہت اچھی ہے میں نے کاکا سے کہا۔

مجھکو وہ ماتا جی کہتی ہے مگر محبت اپنے بچوں جیسی کرتی ہے۔ کاکا نے جواب دیا۔

بھائی جی کو ہفتہ میں دو تین وقت باہر دورہ میں جانا پڑتا تھا اور چونکہ کاکا تنہائی سے گھبراتی تھیں اس لئے جیونی ہمارے مکان ہی پر سوتی تھی اور یہ بات اب اس کی عادتِ ثانیہ ہوگئی تھی چنانچہ میرے گھر پر آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

ایک شام کا ذکر ہے نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ ہم دونوں بہن بھائی سرِ شام ہی کھانا کھاکر لیٹ بستروں پر دراز ہوگئے تھے کہ جیونی نے باہر ہی سے کھڑکی سے جھانک کر آہستہ سے کہا ماتا جی کیا سوگئیں؟

بندریا اندر کیوں نہیں آتی کاکا نے کہا۔

جیونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور ایک چادر جو وہ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھی پلنگ پر ڈالکر باہر اصطبل میں چلی گئی جہاں وہ ہمیشہ اپنا کھانا کھایا کرتی تھی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میں سیکڑوں مرتبہ کاکا سے اس بات پر جھگڑ چکا تھا مگر ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح ایک نیچ ذات کی عورت کو اُسی کمرہ میں جہاں ہم کھانا کھاتے ہیں بیٹھکر کھانا کھانے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

آج میں نے پھر وہی ذکر چھیڑا آخر یہ جیونی اصطبل میں بیٹھکر کیوں کھانا کھاتی ہے۔

کہہ تو دیا نیچ ذلت کی عورت ہے یہاں کیسے کھانا کھاسکتی ہے

افسوس کاکا آپکے پہلو میں دل نہیں پتھر کا ٹکڑا ہے وہ دل بھی کیا جو دوسروں کے دکھ سے متاثر نہ ہوسکے۔ کیا نیچ ذات کو کوئی دوسرا برہما پیدا کرتا ہے۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں کیا آپ کی معاشرت انسانیت کا خون بہانے کے لئے ان سے بہتر قوانین وضع کرسکتی تھی؟ کیا ہندو دھرم کے ماتھے پر اس سے زیادہ کلنک کا ٹیکہ لگایا جاسکتا ہے؟ کیا نیچ گھرانے میں پیدا ہونے کا گناہ اس قدر عظیم ہے کہ وہ کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی اور نسائی جذبات میں وہ کس طرح آپ سے کمتر ہے ابھی کل کا ذکر ہے کہ آپ کہہ رہیں تھی کہ وہ آپسے بڑی بہن یا ماں جیسی محبت کرتی ہے مگر اس کے محبت کرنے سے یہ تو لازم نہیں آجاتا کہ ہم بے دھرم ہوجائیں۔

اور انسان بے دھرم کس طریقہ سے ہوجاتا ہے"؟

نیچ ذات کی عورت کے ساتھ کھانا کھانے سے انسان بے دھرم ہوجاتا ہے۔

رتنو کافی غصہ کہہ چکے ہو یا ابھی کوئی اور بات سُنانی باقی ہے پرمیشور کے لئے چُپ ہوجاؤ یہ کہکر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

آپ ظالم ناخدا ترس اور انسانیت کا خون بہانے والی ہیں میں نے ان کے آنسوؤں سے بغیر متاثر ہوئے کہا۔"

"جاؤ جاؤ اپنا انسانیت کا جذبہ باہر جاکر دکھاؤ انہوں نے غصہ سے کہا اور کمبل سے مُنہ ڈھک کر زیادہ زور سے رونے لگیں۔

میرا دل بھی اُنکی ظالمانہ حرکت سے خون ہوچکا تھا یہ میری عمر میں پہلا واقعہ تھا کہ ان کے رونے سے میں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا اور غصہ سے بیتاب ہوکر باہر نکل آیا میں سیدھا اصطبل میں پہنچا تو دیکھا کہ جیونی اندھیرے میں بیٹھی ہوئی اس طرح چاول کھارہی ہے جیسے گائے جگالی کرتی ہو۔ اُس نے خیال کیا کہ شاید میں اصطبل میں ہوکر باہر باغیچہ میں جانا چاہتا ہوں مگر میں اس کے برابر دیوار کے سہارے سے کھڑا رہا۔ اُس نے کھانا بند کردیا اور نہایت خوفزدہ سی ہوگئی۔

جیونی میں نے نہایت خلوص کے لہجہ میں کہا۔

بابو جی اُس نے گھبراکر جواب دیا۔

جیونی کھانا کھاتے وقت تم چراغ کیوں نہیں روشن کرلیتیں،،

کیا فائدہ۔ اُس نے جواب دیا اور پھر چاول کھانے میں مشغول ہوگئی

"مگر تم اندھیرے میں کیسے دیکھ سکتی ہو کہ تم کیا کھارہی ہو"

"بابو جی کھانے کی چیز کو دیکھنے سے فائدہ اُس نے ہنسکر جواب دیا"

"دیکھو جیونی تم کو بغیر روشنی کے ہرگز کھانا نہیں کھانا چاہئے"

"بابو جی مجھکو معلوم ہے کہ میرے چاول اور بھات کہاں رکھا ہے اور یہ کافی ہے"

ٹھیک اسی وقت گائے نے کثرت سے گوبر کیا جس کی چھینٹوں نے اگر کھانے کو نہیں تو کم از کم اس کے کپڑوں کو ضرور آلودہ کیا ہوگا۔ میں نے غم و غصہ سے متاثر ہوکر کہا تم کمرہ میں چلکر کیوں نہیں کھانا کھاتیں (گو کہ میں سمجھتا تھا کہ وہ کبھی اس کو منظور نہیں کرے گی)

"نہیں بابو جی میں یہاں بہت اچھی ہوں میں دری کو گندہ نہیں کرنا چاہتی۔

اگر دری گندی ہو جائے گی تو میں خود اس کو اپنے ہاتھ سے صاف کردوں گا۔ میں نے اپنے دلی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش ہوگئی تاروں کی روشنی میں مجھکو اس کا موہوم سایہ اصطبل کی دیوار پر نظر آرہا تھا۔ گائے جگالی کرنے میں اور بچھڑا گھاس کھانے میں مشغول تھا اور میرے دل میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ رہا تھا۔ مجھکو سماج کے ظلم نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور میں اس کے بوجھ کے نیچے دبا جارہا تھا۔ مگر آہ معصوم و مظلوم جیونی اس جذبہ سے بے نیاز اطمینان کے سانس لے رہی تھی اور خوش تھی۔

میں نے غم غلط کرنے کے لئے دریافت کیا جیونی کیا تم مکان پر بھی اندھیرے میں کھانا کھاتی ہو

جی بابو جی!

کیوں؟

بابو جی تیل بہت مہنگا ہے ۲ میں تیل کی ایک بوتل آتی ہے اور وہ ۸ یوم چلتی ہے۔

مگر دو آنے ہوتے ہی کیا ہیں۔

"ہوتے ہی کیا ہیں میری دو دن کی کمائی کچھ ہوتی ہی نہیں!!؟

دو دن کی کمائی ہے میں نے کمال تعجب سے پوچھا؟
جی ہاں مجھے دو روپئے ماہوار گزارے کو ملتے ہیں!
دو روپئے ماہوار!!
جی ہاں دو روپئے ماہوار ———— تو بہت ہیں (اُس نے لفظ "بہت" پر زور دیکر کہا) کہیں قریب ہی سے تو کی آواز آرہی تھی اور کہیں دور اس قدر دور کہ دُنیا والوں کی نظریں وہاں تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتی بھارت ماتا اپنے مظلوم بچوں کی بیکسی پر آنسو بہا رہی تھی کیا پاکیزہ تعلیم ہے اسلام کی میں نے دل میں خیال کیا میں نے دل ہی خیال کیا جس نے شاہ گدا و محتاج و غنی کو ایک صف میں کھڑا کر دیا جہاں بزرگی و برتری منحصر ہے علم و اعمال پر نہ کہ ذات پر بیشک کرشن اور رام کی بھی تعلیم ہوگی بے شک رشیوں نے بھی یہی درس دیا ہوگا مگر دُنیا والوں نے اس تعلیم کو نیست و نابود کرکے ہندو دھرم کی پیشانی پر ایک بدنما داغ لگا دیا۔ اے پرمیشور دھرماتما گاندھی جی کو وہ قوت دے کہ وہ اس ظلم کی بیخ کنی کرنے میں کامیاب ہوں۔

اب میں تاثرات سے اس قدر مغلوب ہوگیا تھا کہ بات کرنے کو الفاظ نہیں ملتے تھے ہے ایشور کیا وہ تمام عمر یہی چاول کھا کر اپنی زندگی گزار دیگی کیا چاول کھانا ہی اس کی زندگی کا ماحصل ہے۔
میں نے اپنا غم غلط کرنے کے لئے اس سے دریافت کیا۔ جیونی تم دو روپئے کا کیا کرتی ہو۔
میں اپنی تنخواہ نہیں لیتی ہوں"
کیوں نہیں لیتی ہو۔ میں نے پوچھا۔
ماتا جی میری تنخواہ جمع کرتی رہتی ہیں اور جب وہ میرے کام سے خوش ہوتی ہیں۔ تو ایک دو آنہ انعام کے طور پر اس میں اور اضافہ کر دیتی ہیں۔ اور جب کافی رقم جمع ہو جاتی ہے تو میں ساری خرید لیتی ہوں۔
اور بقیہ کا کیا ہوتا ہے میں نے دریافت کیا۔
بقیہ سے میں اپنے بھتیجے کے لئے کھلونے خریدتی ہوں
کیا تمہارا بھائی غریب ہے۔
نہیں بابو جی مگر مجھے بچے سے محبت ہے
اگر میں تم سے بچے کو طلب کروں تو کیا تم مجھکو دیدو گی۔ میں نے مسکرا کر دریافت کیا کیونکہ غم و غصہ نے آنسو خشک کر دئے تھے۔
آپ مجھ سے کبھی نہیں طلب کرینگے اور اگر آپ طلب کریں گے تو مجھ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ بھی ہنس پڑی "کیا تم سچ کہتی ہو"
آپ کے چرنوں کی قسم اب وہ کھانا ختم کر چکی تھی اور اُٹھکر ہاتھ دھونے چلی گئی تھی۔
میں بھی باہر نکل آیا۔
ستارے آسمان پر جگمگا رہے تھے ان میں چھوٹے اور بڑے چمکیلے اور ماند میں کسی کو ایک دوسرے پر فوقیت نہ تھی سب کو نیلا آسمان اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا۔ پرمیشور کیا ان میں بھی ذات پات کا فرق ہے۔
باہر سڑک پر ایک گاڑی بان یہ شعر الاپ رہا تھا۔
"چلی آئیں تنہا اُنہیں بھی تو لائیں"
اور فضا ساکت تھی۔

جب کبھی رات کو جیونی ہمارے یہاں سونے آتی تو قصبہ کی خبروں کا کافی ذخیرہ اس کے پاس ہوتا تھا۔ جو ایک ایک کرکے ہم کو سنائی جاتی تھیں۔ اگر کبھی آم والے بڑھے چھٹی رساں کی بیوی کو اغوا کرنے کا قصہ بیان کیا جاتا تھا تو کبھی دنکا کی بیوی کے مندر کے درشن سے شفا پانے کا کاکا کو ان خبروں کے سننے میں خاص لطف آتا تھا اور غالباً اسی لئے جیونی بھی قصبہ کی ایک ایک خبر نہایت احتیاط سے ہم پہنچا کر کاکا کے گوش گزار کرتی تھی۔ ہم لوگ اپنے نرم و گرم بچھونوں پر سوتے اور جیونی چٹائی پر ایک بوسیدہ رضائی اوڑھ کر سوتی اس نے کبھی جاڑے کی بھی شکایت نہیں کی۔

ایک شب کا ذکر ہے کہ میں نے جیونی سے درخواست کی کہ وہ اپنا کچھ حال سنائے پہلے تو اُس نے انکار کیا مگر کاکا کے کہنے سے طوعاً و کرہاً راضی ہوگئی۔ میں ہمہ تن گوش تھا اور کاکا نیند سے مغلوب ہوکر دنیا سے بے خبر۔

———— ∴ ————

جیونی کی پیدائش قریب کے گاؤں کوٹھالی میں ہوئی تھی اس کا باپ ایک متوسط الحال کاشتکار تھا جو موسم سرما میں کھیتی اور موسم گرما میں کپڑے دھونے کا پیشہ کرتا تھا اس کی ماں چونکہ کوٹھالی میں تنہا دائی کا پیشہ کرتی تھی اور ہر روز کسی نہ کسی کے یہاں بچہ جنانے کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے بہت عدیم الفرصت رہتی تھی۔ جیونی کے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں مگر موت نے صرف ایک بھائی بھیما نامی زندہ چھوڑا تھا باقی سب نذر اجل ہو چکے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارہ اور دل کی ٹھنڈک بنکر رہی یہانتک کہ جب اُس نے اٹھارہویں سال میں قدم رکھا۔ اس کے ماں باپ کو شادی کی فکر ہوئی بڑی جستجو کے بعد ایک دھوبی کا لڑکا تجویز کیا گیا شادی کی رسم ادا کی گئی اور جیونی ماں باپ کورد تا چھوڑ کر اپنے شوہر کے گھر پہنچ گئی قسمت نے یہاں بھی یاوری کی وہ شوہر کے دل کا سرور بنکر رہی شادی کے کچھ عرصہ بعد تک اس کا محبوب شوہر زندہ رہا اور جیونی اس کے دل کی رانی بن کر رہی مگر ایک روز یکایک کپڑے دھوتے وقت کسی زہریلے سانپ نے اس کو ڈس لیا تمام جادو ٹونے کئے گئے مگر کوئی بات کارگر نہ ہوئی اور وہ سب کو روتا چھوڑ کر کسی دوسری دنیا کو آباد کرنے کے لئے چلدیا میرا خیال تھا کہ یہاں آکر وہ تاثرات سے بے تاب ہوکر آنسوؤں کے دریا بہانے گی مگر نہیں میں نے محسوس کیا کہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بیوگی گویا تمام مصائب والائم کی ابتدا تھی جن سے یکے بعد دیگرے اس کو ہمکنار ہونا پڑا۔ اس کے شوہر کے دو بھائی اور ایک بہن تھی بڑا بھائی شرابی اور جواری تھا۔ اور چھوٹے بھائی نے باوجود شادی کے ایک بازاری عورت سے ناجائز تعلق کر لیا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو نہایت بے دردی سے مارتا تھا یہانتک کہ ایک روز تو اس نے بیوی کو مارتے مارتے بے ہوش کر دیا۔ اس کے جیٹھ اور دیور و نیز نند کے کافی بچے تھے جن سے گھر میں چہل پہل اور کافی رونق رہتی تھی۔ اس لئے جیونی صبر و شکر سے اپنی سسرال میں رہتی اور گھر کا کام کاج کرتی اس نے ان مصیبتوں میں کوئی تکلیف نہیں محسوس کی کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ وہ سب عطیہ ہیں دیوی ماتا کا جو اس کو آیندہ جنم میں ان سب کا نعم البدل عطا کرے گی۔

ایک روز نہ معلوم کس جرم میں پولس والے اس کے جیٹھ کو گرفتار کرکے لیگئے اور اب کوئی کھیتی کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں رہ گیا۔ گاؤں والوں نے اپنے مویشیوں سے تمام کاشت اجڑوا دی اور منع کرنے پر گالیوں سے پیش آئے۔ نتیجہ ظاہر ہے افلاس نے بڑھکر ان کا دامن تھاما اور فاقوں کی نوبت پہنچ گئی۔ اب چونکہ جیٹھ نے جیل خانے اور دیور نے اپنی داشتہ

کا گھر آباد کر لیا تھا گھر کی عورتوں نے طعن و تشنیع سے جیونتی کا کلیجہ چھلنی
کر دیا۔ منحوس بیوہ کہنا اور منہ پر تھوک دینا تو گویا ایک ان کا روزانہ کا
مشغلہ تھا۔

جیونتی کہنے لگی مجھ کو اکثر خیال آتا تھا کہ میں نہر میں کود کر جان دیدوں اور
دنیا کی مصیبتوں سے نجات پاؤں مگر دیوی ماتا کا ڈر اس قصد سے باز رکھتا تھا
مگر ایک روز بھابی نے اس قدر بُرا بھلا کہا کہ میں گھر سے نکل کر بھاگ گئی۔ گھر سے
نکلنے کو تو نکل آئی مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں میرا بھائی ہمیشہ سے مجھ سے
نفرت کرتا تھا مگر بابو جی بہن تو آخر بہن ہی ہے اور آپ اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے
کہ جس ماں کا میں نے دودھ پیا تھا اسی کا بھیا نے بھی پیا تھا

ہرگز نہیں میں نے کہا۔

مگر بابو جی میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس نے وہ برتاؤ مجھ سے کبھی نہیں کیا جو آپ اپنی
کاکا سے کرتے ہیں خیر میں نے کہا تم اپنا قصہ بیان کرو۔

میں سیدھی اپنے بھائی کے مکان پہنچی مجھ کو دیکھتے ہی بھابی کے آگ لگ گئی۔ انہوں نے
مجھ کو منحوس ڈاین اور نہ معلوم کیا کیا کہا زمین پر تھوک دیا اور اپنے بچے کو جو کھیل رہا
تھا گود میں اٹھا کر اندر لے گئیں اسی اثنا میں بھائی بھی نکل آیا۔

کیسے آئی اُس نے کہا۔

میں نے کہا کہ مجھ کو سر چھپانے کے لئے کہیں جھونپڑا بھی میسر نہیں ہے۔

منحوس بیوہ تجھے جھونپڑا کیسے میسر آسکتا ہے جبکہ تو جہاں جائے گی نحوست تیرے ساتھ
ہوگی۔

میں رونے لگی۔

رو۔ رو کر تو کاویری کو بھر دے اُس نے غصے سے کہا مگر میں تجھ کو ایک لقمہ بھی کھانے
کو نہیں دونگا۔

مجھ کو تمہارا کھانا نہیں چاہئے مجھ کو تو سر چھپانے کے لئے ایک جھونپڑی کی ضرورت ہے۔
میں نے کہا۔

یہ سُن کر اُس کا غصہ ذرا دھیما پڑا اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور بولے اچھا
یہ وعدہ کر کہ لڑے گی تو نہیں۔

"نہیں" میں نے کہا۔

اچھا پتا جی کے خیال سے میں تجھ کو رہنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ یہاں تو چاہے
رہ چاہے کہاں چاہے مر۔ میں سر سے پیر تک کانپ گئی اتنے ہی میں بھابی بھی نکل
آئیں۔ اُس نے مجھ کو منحوس گدھی اُلو کی بچی۔ جادوگرنی کہہ ڈالا اور زمین پر زور زور
سے ٹھوکریں ماریں۔ بابو جی میں نے ایسی عورت نہیں دیکھی وہ میری زندگی مسلسل
آنسوؤں میں تبدیل کر دیتی ہے۔

کیونکر میں نے دریافت کیا۔

کیونکر تو میں نہیں بتلا سکتی مگر ہر روز جب صبح کو میری آنکھ کھلتی ہے تو کان گدھے کی
بچی اور رنڈیا کے الفاظ ضرور سن لیتے ہیں۔

مگر تمہارا اپنی بھاوج سے تو کوئی واسطہ نہیں ہے۔

واسطہ تو نہیں ہے مگر اکثر ان کا بچہ میرے پاس آجاتا ہے اور چونکہ مجھے بچے سے محبت ہے
میں اس کو گود میں لیتی ہوں یہ دیکھ کر بھابی کے آگ لگ جاتی ہے اور شیرنی
کی طرح بپھرتی ہوئی میری جھونپڑی میں آکر بچہ کو مجھ سے چھین لے جاتی ہے اور کہتی
ہیں کہ اگر بچہ کو آئندہ ہاتھ لگایا تو تیری کھال کھنچوا لوں گی۔

تو تم بچہ کو مت لیا کرو میں نے کہا۔

ہاں اگر میرا اپنا بچہ ہوتا تو میں کیوں ان کے بچہ کو ہاتھ لگاتی اور پھر بچے کو بھی مجھ سے محبت ہے
اور ہاں میں نے کہا وہ تم کو بچہ کو کیوں نہیں لینے دیتی ہیں۔

وہ کہتی ہیں کہ میں بیوہ ہوں اور میری نحوست کا اثر بچہ پر بھی پڑے گا۔ اگر میں اس کو گود
میں لوں گی۔

کون کہتا ہے تمہاری بھابی۔

نہیں بھائی اور بھابی دونوں۔

کیا اُن کے ایک ہی بچہ ہے

نہیں اُن کے چار اور بچے ہیں سب بڑے ہوگئے ہیں ایک تو آپ کے برابر ہے۔

کیا سب بچے تم سے محبت کرتے ہیں۔

نہیں صرف یہ چھوٹا بچہ محبت کرتا ہے باقی تو سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں نفرت

تم کسی بچہ کو گود کیوں نہیں لے لیتیں۔

گود لیکر کیا کروں گی میں نے ایک بکری کا بچہ پال رکھا ہے وہی میرے دل کے بہلنے کے لئے
کافی ہے۔

اچھا تم نے بکری کا بچہ بھی پال رکھا ہے میں نے تعجب سے کہا۔

جی ہاں بکری کا بچہ پال رکھا ہے منو میرا بھتیجا اس سے کھیلتا ہے اور آئندہ درگا کے موقع
پر میرا ارادہ اس کو "تالا کما" دیوی کے بھینٹ چڑھانے کا ہے۔

دیوی کو بھینٹ چڑھانے کا   اسے زندہ کیوں نہیں رہنے دیتیں۔

باپ کی باتیں نہ کرو بابو جی میں نے دیوی کو ہر تیسرے سال ایک بکرے کی بھینٹ دینے کی
نیت کر رکھی ہے۔

اور دیوی تم کو بکرے کے بدلے میں کیا دیتی ہے

کیا۔ سب کچھ۔ ہر چیز۔ میری زندگی۔ میری تندرستی۔ ماتا جی کی مہربانی بابو جی سب کچھ دیوی ہی
کا دیا ہوا ہے۔ یہ کہکر اس نے اپنے ہاتھ باندھے اور نہایت التجا سے دعا مانگنی شروع کی۔ دیوی ماتا
مجھ پر رحم کر ماتا جی مجھ پر رحم کر اور ساری دنیا کو دولت۔ عزت اور تندرستی عطا کر۔

میں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا تم کو مجھ سے زیادہ محبت ہے یا اپنے بھتیجہ سے۔

میں کس طرح جواب دوں اس نے کہا میں بھتیجہ کے لئے تو ہر تیسرے سال ایک بکرا دیوی کی نذر کرتی
ہوں آپ کے لئے تو میں نے کوئی بکرہ ابھی تک بھینٹ نہیں چڑھایا۔

تو صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تم کو بھتیجہ سے زیادہ محبت ہے۔

یہ بات بھی نہیں ہے کیونکہ جب سے ماتا جی نے کہا ہے کہ ان کے ایک بھائی ہے میں برابر آپ کی
سلامتی اور تندرستی کی دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔

اچھا میں نے کہا تم مجھ کو گود لیلو۔

یہ سنکر وہ اس زور سے ہنسی کہ کاکا کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے غصہ سے بگڑ کر کہا چپ بدتمیز
میں نے کہا کاکا جیونتی مجھ کو گود لینا چاہتی ہے۔

کاکا نے کہا تم کو گود لینا چاہتی ہے جا کے کاویری میں کیوں نہیں ڈوب مرتی۔ یہ کہکر وہ پھر

خراٹے لینے لگیں۔
میں نے کہا جیونی اگر تم مجھ کو گود دلیلو تو میں تمہارے لئے کام کرونگا اور تمہیں روٹی کپڑے کی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔
نہیں بابوجی برہمن کام کرنے کے لئے نہیں پیدا ہوئے ہیں وہ تو پرمیشور کے برگزیدہ بندے ہیں
ہرگز نہیں میں نے کہا ہم میں کوئی بزرگی نہیں ہے۔
نہیں آپ ضرور بزرگ ہیں ضرور ہیں۔ تمام مقدس کتابیں آپ کی ہیں، متبرک وید آپ کے ہیں آپ سب کچھ ہیں سب کچھ آپ اونچی ذات کے ہیں اور ہم تو آپ کے خادم اور غلام ہیں۔
میں برہمن ہی نہیں میں نے کہا۔
نہیں آپ ہیں۔ آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔
جو کچھ بھی ہو اچھا جیونی تم مجھ کو گود ضرور لے لو۔
وہ پھر ہنسنے لگی۔
اچھا میں نے کہا اگر تم نہیں مانتیں تو میں مرجاتا ہوں اور پھر بکری کا جنم لوں گا اور تم اُس کو خریدوگی بتاؤ اُس وقت کیا کروگی۔
اس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان سی ہوگئی ہے مجھ کو بھی اُس وقت نیند کا غلبہ تھا میں نے کہا کہ اچھا اب تم سو جاؤ اور کل پھر اس پر غور کرنا کہ تم مجھ کو گود لوگی یا نہیں میں بھی سوگیا مگر سونے سے قبل میں نے سُنا کہ جیونی دیوی ماتا سے دعا مانگنے میں مشغول ہے "دیوی ماتا میرے گناہوں کو معاف کر میری مدد کر ماتا جی ان کے بھائی اور میاں کی حفاظت کر رحم کر ماتا رحم کر" ماتا دیوی کی پجارن مصروف دعا تھی اور دیوی کا دیری کے کنارے اپنے خوبصورت مندر میں خاموش،

اس واقعہ کے دو سال بعد آخر وہ دن بھی آگیا جبکہ بھائی صاحب کے تبادلے کے سلسلے میں ہم ایک گاڑی میں سوار ہوکر باکلہ کو خیر باد کہہ رہے تھے کاکا اور میں بیلی میں اندر کی طرف سوار تھے اور بھائی صاحب بیلوان کے برابر بیٹھے تھے۔ ایک ہفتہ پہلے سے جیونی برابر سرد آہیں بھرہی تھی اور جدائی کے لمحوں کا خیال کرکے اس کی آنکھیں غم آلود ہو جاتی تھیں آج بھی وہ گاڑی کے ہمراہ تھی اور جب کبھی کاکا اور اُس کی آنکھیں چار ہو جاتی تھیں وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھی کاکا بھی افسردہ تھیں اور سمجھتی تھیں کہ وہ آج ایک سچی خیر خواہ سے، جدا ہو رہی ہیں ہاں اس قصبہ میں جیونی ان کی تنہا رفیق اور مخلص خیر خواہ تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ پہلی پر رکھتے ہوئے کہا "ماتا جی مجھ کو بھول مت جانا"
یقین رکھ میں تجھ کو ہرگز نہیں بھولوں گی اور کاکا کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔
میرا دل بھی بے اختیار رونے کو چاہتا تھا مگر تہذیب مانع تھی اس لئے خاموش تھا دریا کے پاس پہنچکر گاڑی بان نے بیل کھول دیئے کیونکہ دریا پایاب تھا اور گاڑی کو دریا میں ہوکر دوسرے کنارہ پر پہنچنا تھا۔ میں گاڑی سے اُتر پڑا کچھ تو اس خیال سے کہ کھلی ہوئی ہوا میں سانس لے سکوں مگر زیادہ تر جیونی سے گفتگو کرنے کے خیال سے۔
میں نے اُس کو تسلی دیتے ہوئے کہا جیونی روؤ نہیں۔
آہ بابوجی کس طرح نہ روؤں مجھ کو تمہارا جیسا دیوتاؤں کا خاندان کہاں نصیب ہوگا۔ ماتا جی مجھ پر دیوی کی طرح مہربان تھیں۔ آپ بھی مہربان تھے اور بڑے بابو یہ کہکر وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
نہیں جیونی میں نے اس سے کہا تمہارے جیسے دل کی مالک سے مل کر کون شخص دیوتا نہیں ہو جائے گا لیکن وہ رونے میں مشغول تھی اور نیز میرے الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر
تھوڑی دیر بعد گاڑی بان نے مجھ سے گاڑی میں سوار ہونے کو کہا اور میں ایک غمزدہ دل اور مجروح آتما لئے ہوئے گاڑی میں سوار ہوگیا۔ آج میں ایک عجیب اور قیمتی ہستی سے جُدا ہو رہا تھا۔
گاڑی بان نے ہیئے ہیئے کہکر گاڑی دریا میں ڈال دی میں خاموش گوش دل سے جیونی کی سسکیوں کی آواز سُن رہا تھا۔ وہ ایک پیپل کے درخت سے کمر لگائے ہماری گاڑی کو ٹکٹکی باندھے ہوئے تک رہی تھی۔ وہ نیلے آسمان کے نیچے اس وسیع دنیا کا ایک نہایت ہلکا اور خفیف سا نقش معلوم ہوتی تھی وہ اس دُنیا کی ایک نہایت قیمتی ہستی تھی مگر اوہام پرستی اور سماج کے مظالم کا شکار

از (راجہ راؤ)

مترجمہ

اقبال احمد بی اے

رازونیاز

از

ابوالفاضل

ساز

چاند پوری

ایشیا

آئینۂ علم و شعر و حکمت یہ ہے
بُستان تمدن و سیاست یہ ہے
کیا چیز ہے ایشیائے ساغر اے راز
میخانۂ بادۂ حقیقت یہ ہے

کیف نظارہ

اس رنگ و سمن کا کیا کہنا ہے
اس حسن چمن چمن کا کیا کہنا ہے
چشم بد بیں میں خاک پائے نرگس
مخموری انجمن کا کیا کہنا ہے

میخانۂ اقوام

مُسلمِ ہندی

شعاعِ مہر سے ہے مطلعِ سحر خالی — ہوا نہ ہو نہیں تاریکیوں میں گھر خالی
نہ فکر بیخودیِ شوق کی نہ کسل کا غم — ہر اک ہاتھ میں اک جام ہے مگر خالی
سوالِ کیف کی آواز ہر طرف ہے بلند — مگر سرورِ عمل سے ہیں بے خبر خالی
بُرا ہو لعنتِ تشنہ لبی بُرا ہو ترا — ہے ایک اشک سے بھی آج چشمِ تر خالی
ہر ایک گام پہ ہے ذکرِ میکشانِ قدیم — مگر ہے جوشِ عمل سے ہر ایک سر خالی
کبھی ہزار گلستاں تھے اور ایک نگاہ — اب ایک پھول سے ہے دامنِ نظر خالی
ہے اتفاق سے بت خانہ صد صنم بکنار — اور اختلاف سے کعبے کے بام و در خالی

مئے غلامیِ مغرب سے مست ہے مُسلم
خود اپنے ظرفِ خودی کی شکست ہے مُسلم

۳۰

"ہندو"

نشاطِ تازہ سے ہے چشمِ برہمن روشن
جدید نور سے ہے محفلِ کہن روشن

عجب نکھار پہ ہے صندل و عبیر کا رنگ
ہوئی ہے قشقۂ خونیں سے انجمن روشن

بہار اب کے برس آگ بن کے آئی ہے
ہے ایک "لالۂ رنگیں" سے کُل چمن روشن

جگر کے داغ چھپائے سے چھپ نہیں سکتے
وطن کی آگ سے ہیں سب کے پیرہن روشن

ستارے کیا کہ نہ بھولیں گے راہ ذرّے بھی
ہیں ایک چاند کے پرتو سے بن کے بن روشن

ضیائے بزم نہیں اب رہینِ منتِ شمع
بجھے گی شمع تو ہو جائے گی لگن روشن

تلاشِ شمع میں اہلِ حرم رہے مصروف
چراغِ دیر نے کی محفلِ وطن روشن

مہِ جدید بر اوجِ وطن ہویدا شد
"کلیدِ میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد"

"افغان"

اٹھی ہیں جہل و بغاوت کی آندھیاں تاریک
سیاہ تر ہے زمین اور آسماں تاریک

یہ کس کا خون در و بامِ میکدہ میں ہے جذب
ہے جوشِ رنگ سے صہبائے ارغواں تاریک

سوادِ بحرِ الم سے یہ کس غضب کا دھواں
اُٹھا، کہ ہو گئے کشتی کے بادباں تاریک

ہوئی حجابِ ثریّا سے بے حجابیِ حُسن
چلا نہ کام کہ تھی "بزمِ کہکشاں" تاریک

سیاہ بختیِ افغاں کا یہ تصرّف دیکھ
کہ بعدِ صبح بھی ہے راہِ کارواں تاریک

نوائے بلبل رنگیں چمن میں جب سے نہیں
ہر ایک پھول ہے بے نور گلستاں تاریک
مآلِ قسمتِ گلشن کی خیر ہو یارب!
ہے آشیاں کی طرح ذہنِ باغباں تاریک

یہ رندِ بادیہ سرخوش بھی تشنہ کام بھی ہے
تضاد دیکھ کہ آزاد بھی غلام بھی ہے

"ایرانی"

کمالِ سعی پہ ہے کائنات کی بنیاد
اسی سے رونقِ صحرا اسی سے گھر آباد
دیارِ عشق میں لازم ہے شرطِ سعی و عمل
کہ ایک بازوئے رنگیں ہے اصل میں فرہاد
نہ اب وہ نغمۂ تاریاں نہ بربطِ عیش
نہ اب وہ سیرِ مصلیٰ و آبِ رکناباد
ہزار قطرۂ خونِ جمیل صرف ہوئے
تو ہو سکا وطنِ حافظ و سعدی آزاد
کمالِ تیغِ رضا کی ہے دھوم عالم میں
کہ دی ہے روحِ منوچہر نے مبارکباد
بساطِ گلشنِ ایراں پہ کھیل مشکل ہے
یہ وہ جگہ ہے جہاں مات کھا گیا صیاد
اسیرِ حبِ وطن کے خطاب ہیں کیا کیا
غیور و زندہ و آزاد و اشرف و دلشاد

یہ قوم میکدہ در بر ہے خود خمستاں ہے
چراغِ محفلِ فارس اسی سے تاباں ہے

"روسی"

چمن میں آج جو ہے پا بہ گلِ بہ مجبوری
وہ کل بہار کو دیگا پیامِ منصوری

ایشیا
مدیر۔ ساغر نظامی

صوبہ متحدہ میں خوبصورت صحیح باشوکت اور بہترین کتابت وطباعت کا واحد مرکز
ساغر پریس
شعبہ طباعت ادبی مرکز
میرٹھ
ہندوستان کے شعراء ادیب اور انشا پردازوں کو نوید
یقیناً یہ خوشخبری تمام ادبی دنیا کیلئے نہایت مسرت اور اطمینان کا باعث ہوگی کہ ملک کے
مشہور انشا پرداز اور شاعر حضرت ساغر نظامی
کے زیر اہتمام و سرپرستی صوبہ متحدہ کے تاریخی شہر میرٹھ میں ایک ایسا طباعتی مرکز قائم ہوگیا ہے جس کے قیام کے بعد اردو کی اعلیٰ طباعت کی مشکلات کم ہوجائینگی
اور اردو کی بہترین تصنیفات صحت و جمال کے ساتھ شائع ہوکر ملک کے جمال پسند طبقوں سے خراج تحسین حاصل کرسکیں گی
ساغر پریس کی اعلیٰ و حسین طباعت کا بہترین شاہکار "بادۂ مشرق" ہے جو حضرت ساغر نظامی کی نظموں کا شاندار مجموعہ ہے جس کی مجموعی صورت سے متعلق بلند آہنگی
سے دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ملک کے کہنہ مشق اور ترقی یافتہ مطابع بھی بہ آسانی ایسی طباعت پیش نہیں کرسکتے
مسودہ وصول ہونے کے بعد کتاب حسب دلخواہ عمدہ خوبصورت اور باصحت تیار کرکے مرکز پر پہنچا دی جائے گی
یعنی آپ پروف اور کاپیاں دیکھنے کی زحمت سے بھی آزاد ہوجائینگے
خط و کتابت کیلئے پتہ
احمد یار خان منیجر "ساغر پریس" سیپٹ اسٹریٹ میرٹھ

قرطاسِ خریداری

باتصویر ماہنامہ "ایشیا" ادبی مرکز میرٹھ

سنہ ۱۹۳ء

براہِ کرم بحیثیت خریدار "ایشیا" میرا نام یک سال / ششماہی کے لئے آیندہ ماہ سے رجسٹر کر لیجئے اور رسالہ بذریعہ وی پی ارسال کیجئے / رسالہ بدرجہ منی آرڈر ارسال ہو رہا ہے

رسالہ مندرجہ ذیل پتہ پر جاری کیجئے۔

اسم گرامی

(براہ کرم صاف صاف لکھئے)

پتہ

زرِ سالانہ ۸ ہے

سال بھر کے لئے مبلغ ۸ (معہ محصول)

ششماہی کے لئے مبلغ ۵ (معہ محصول)

خاکسار

منیجر "ایشیا" میرٹھ

(ایجنٹوں کے لئے ۲۵ فیصدی کمیشن)

ارشاداتِ عالیہ

نتیجۂ فکر ہز ایکسلنسی راجہ راجگان مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد مدظلہ یمین السلطنت و صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

در شبِ ہجر چہ اندیشۂ محشر دارم ‌ ‌ ‌ شور فریاد ہماں است کہ در سر دارم

سوزِ پنہاں کہ بسودائے تو در سر دارم ‌ ‌ ‌ سینہ آتشکدہ و دل چو سمندر دارم

محتسب بر در میخانہ نشستست چہ باک ‌ ‌ ‌ بشکنم توبہ و مُہر از خم بردارم

آنکہ منصور سرافرازی و خوش بختی بود ‌ ‌ ‌ بر سر خویش ز الطاف پیمبر دارم

ہیچ کارست ندانم نہ خط آورد نبرد ‌ ‌ ‌ چندے امید ز پروازِ کبوتر دارم

جلوۂ روئے دل افروز ترا می بینیم ‌ ‌ ‌ روز و شب در بر خود ماہِ منور دارم

طالعم بیں کہ نشستم بدرِ خلوتِ دوست ‌ ‌ ‌ تخت جم دارم و ہم بختِ سکندر دارم

پاسباں را نہ شناسم نہ کسے دیگر را ‌ ‌ ‌ بر در دیر و حرم بالش و بستر دارم

مشکلے نیست رسیدن بحقیقت اے شاد

گر سر صحبت سلمان و ابوذر دارم

فہرست مضامین

ایشیا بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۵ء

جلد ۱   نمبر ۱

تصاویر

(۱) خیام کی رباعی کا ایک تصویری تخیل (۲ و ۳ و ۴) انگریزی گرجاؤں میں دستک دینے کی گھنٹیاں (۵) نواب میر یوسف علیخاں بہادر سالار جنگ ثالث (۶) سر تیج بہادر سپرو۔ (۷) مسز سروجنی نائیڈو (۸) سیٹھ محمد علی میلاد

نشاطِ آغاز

دو شیشہ شکستیم بیک توبہ دو صد جام
امروز بیک جام دو صد توبہ شکستیم

کامل ۵ سال کے بعد وقت، ذوق اور احساسِ فرض نے میرے شانوں پر پھر وہ مقدس بار رکھ دیا جس کو آغازِ بے شعوری سے شعورِ ادراک کے انجام تک اٹھائے رہنا میری قسمت ہے۔

میری ادارتی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۱ء تک بہرحال جاری رہی اس کے بعد میں نے کسی جریدہ کو مرتب نہیں کیا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ ایک وقفۂ فکر و استغراق تھا۔ اس وقفہ میں میں نے صرف اُن ماؤف مقامات کو معلوم کیا جن پر نشتر زنی فرض تھی خواہ وہ میرے ہاتھ سے ہو یا نشترِ قدرت کے ذریعہ، مگر کمزور انسان کی کیا مجال ہے کہ وہ پیکرِ جہل کی جراحی کر سکے، یہ تو کچھ قدرت ہی کے دستِ اقتدار میں ہے کہ انسانی ذہن و دماغ سے وہ پردے اٹھا دے جنکی دبازت کو انسانی فکر کا نشتر چاک نہیں کر سکتا۔

لیکن بہرحال یہ قدرت کا کام تھا اور قدرت ہی نے وہ فضا پیدا کی جو مستقبل کے لئے لازمی و ضروری تھی اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ایک ایسے نئے نقشے کی ترتیب لازمی تھی جسکے حدود وار بعہ قطعی جدید اور جس کا ہر خط بالکل نئی بنیادوں پر مبنی ہو۔ چنانچہ وہ نقشہ بنایا گیا اور اس کے مطابق وہ تعمیر مکمل کی گئی جو آج آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہ تعمیر نہ بظاہر شاندار ہے نہ اتنی مستحکم کہ ادنیٰ سا ادنیٰ دعویٰ کرنے کی جرأت بھی ہو سکے۔ مگر جو کچھ بھی ہے خود اعتمادی، محنت، محبت اور سچائی کی بنیادوں پر قائم ہے اور شاید اس کے ذرہ ذرہ میں انسانی خدمت گزاری کا جذبہ جوش زن ہے۔

دراصل یہ بھی کوئی بلند بات نہیں کہ جذبۂ خدمت گزاری کا ڈھول پیٹا جائے، خدمت ہمیشہ خدمت کیلئے ہونی چاہئے اور خادم کا فرض ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد سب کچھ بھول جائے، بھول جائے اور بھول کر مر جائے، کہ خود فراموشی کے ساتھ اس طرح موت حیاتِ جاوید کا دیباچہ ہوتی ہے۔ مگر مرنے کے بعد حیاتِ جاوید کا تخیل بھی میرے نزدیک کوئی اعلیٰ تصور نہیں۔ یہ تو گویا اپنے اعمال کی تجارت ہے کھلے بندوں مجاہدۂ حیات کا سودا ہے پھر کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے اگر زندگی کے مخصوص اور شدید راستوں پر سفر نہ کیا جائے زمانہ سازی یا رسمی زندگی کو اصولِ زندگی قرار دیا جائے تو راحت ہی راحت ہے مگر مجاہد کی طرح زندہ رہنا اور شہید کی طرح جان توڑنے سے پہلے اپنی جانبازیوں کے اپنی زبان سے گیت گانا اول درجہ کی بے دماغی اور بدترین مغالطہ ہے۔

اسی لئے میں اپنا یہ سفر اُن راہوں پر شروع نہیں کرتا جو دوسروں کے خیال میں راست ہیں بلکہ میں ان خطوط پر سرگرمِ جہد ہونا چاہتا ہوں جو خود میرے ہی تفکر کا نتیجہ ہیں اور جن کی صحت پر میں اعتقادِ کلی رکھتا ہوں گو میں جانتا ہوں کہ میری ہستی ایک مزدور خادم سے زیادہ نہیں۔

ادبی مرکز کی تشکیل، ساغر پریس کے قیام، مکتبۂ ساغر کی ترتیب و "ایشیا" کے اجراء کے بعد مجھے بلند آہنگی سے کام لینے کا حق حاصل ہو گیا ہے لیکن میں اس بلند آہنگی کو بازاری دوا فروشوں کی مصنوعی اور پُر فریب صداؤں کے مماثل خیال کرتا ہوں۔ اور "ایشیا" کے صفحات کو بے انتہا دعووں کی پوٹ نہیں بنانا چاہتا بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "ایشیا" اپنے ناظرین کیلئے مطالعہ کا بہترین سامان اور انسانی روح و دماغ کی نشو و نما و تفریح کے لئے لطیف ترین ادب پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا اور اپنے مقاصد کے مطابق اور ماورائے مقاصد اپنی ادبی جد و جہد کو جاری رکھے گا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے ملک اچھی طرح واقف ہے کہ میں اپنی تمام زندگی ادب کی طالب علمی کے لئے وقف کر چکا ہوں اور زندگی کا ہر جزو یہ اسی رنگ میں رنگا جا چکا ہے۔ شوق اور ذوق نے میرے شانوں میں جو شہپر پیوست کر دئے ہیں۔ اگر میں ان کو نوچ کر نذرِ آتش بھی کر دینا چاہوں تو نہیں کر سکتا۔ اور اگر ان شہپروں کے ساتھ بے ادبی و بے عملی کی دُنیا میں ٹھوکریں کھانا چاہوں تو خود میری سوائے انگشت نمائی کے عجیب عجیب موقع پیدا کر دے گی۔ اس لئے اُڑتے رہنے ہی میں عافیت محسوس کرتا ہوں — — سو اُڑ رہا ہوں جس طرح اُڑا جا رہا ہے۔

لیکن محض ایک مرغِ صحرا کی پرواز کبھی فضا کے حسنِ تمام کا باعث نہیں ہو سکتی۔ ذرا اُس منظر کا تصور کیجئے جب بگلوں کے قافلے قطار اندر قطار درختوں نہروں اور کھیتوں سے بہت اونچے نیلگوں آسمان کے سایہ میں پرواز کرتے ہیں اور تمام ماحول ایک کیفیتِ پرواز سے لبریز نظر آتا ہے۔ جہاں تک مجھ شکستہ پر کا تعلق ہے باوجود بے بال و پری کے ہر ممکن جہد کئے جاؤں گا۔ لیکن ہم صفیروں کے اتحاد کی بھی ضرورت ہے میں اُڑتا ہوں مگر ہم مذاقانِ چمن کو یوں پر تولے بیٹھے رہنا زیب نہیں دیتا۔

خدا کا شکر ہے کہ میں اُن "برخود غلط" لوگوں میں سے نہیں جو سوائے اپنے ہر ایک کو حرفِ فضول خیال کرتے ہیں میرا تو اعتقاد ہے کہ اجتماعی کام ہمیشہ اجتماعی طور پر ہی سرانجام ہو سکتے ہیں اور اس اعتقاد کی بنا پر میں تمام نوجوانانِ ادب کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ "ایشیا" کو نوجوانوں کا نمائندہ یقین کریں اور اس کے اوراق کے ذریعہ انسانی فلاح و بہبود خصوصیت کے ساتھ مشرق کے لئے بہتری کی فضا پیدا کریں۔ کہ وہ اس کا حقدار ہے۔

آج ہم جس منزلِ حیات تک آ پہنچے ہیں وہاں پہنچکر ہمارا فرض "باعزت زندگی" حاصل کرنا ہے۔ یہ باعزت زندگی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے؟ بے خوفی اور خودداری کو ایمان بنا لینے سے، قدامت کی ہر زنجیر توڑ کر پھینک دینے سے یعنی ہر قسم کی غلامی کی بیڑیاں کاٹنے کی بنیادی سامان کر لینے کے بعد ہی ہم یہ ذی عزت زندگی یقینی طور پر حاصل کر سکتے ہیں جو دُنیا میں ہر انسان کا قدرتی حق اور فطری مقصودِ حیات ہے۔

آخر میں میں اپنے ان تمام ہم نواؤں کا شکر گزار ہوں جن کی مشورت اور امداد نے میرے عزم کو ہمت بخشی اور میں اتنے عظیم کام کیلئے قدم اُٹھا سکا۔ "ایشیا" کے موجودہ نمبر کو دیکھکر اس کے تمام کام کا اندازہ کرنا تعجیل شوق ہوگی میں "ایشیا" کو جس قدر جامع جسقدر حسین اور جسقدر . . . . . . شاندار بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا لیکن شاید تکمیل کے بعد تنزل کی طرف رجوع کرنا بلند بات نہیں لیکن عدمِ تکمیل کی منزل سے بتدریج ارتقا کی طرف بڑھتے رہنا بیک وقت تکمیل کی طرف ٹھوکر نہیں نسبۃً بہتر ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں ماہ "ایشیا" کو رنگا رنگ حُسن اور گونا گوں ترقی سے ہمکنار کرنے میں کامیاب ہوتا رہوں گا۔ اگر خدا کی توفیق اور مخلصین کی امداد شاملِ حال رہی۔

"ادبی مرکز"
میرٹھ

خاکسار
ساغر نظامی

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
شاد عظیم آبادی

ماہنامہ ایشیا

جلد ۱ — ایشیا بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۵ء — نمبر ۱

اذکار و مباحث

ایشیا میں بیداری کی بے پناہ موج

اب یہ حقیقت مکمل طور پر واضح ہو گئی ہے کہ سویا ہوا ایشیا غفلت اور بے کیفی کی نیند سے بیدار ہو چکا ہے۔ نسل انسانی کے دو تہائی حصہ میں بیداری کی وہ حرکت سریع محسوس کی جا رہی ہے۔ جو قدرتی ضرور ہے لیکن مغرب کے نزدیک اس قدر جلد متوقع خیال نہیں کی جاتی تھی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بیداری مقدس اور شاندار بیداری اپنے پہلوؤں میں کس انجام کو پوشیدہ رکھتی ہے اور اس کی موجیں اپنی سیمابی کا کیا مقصد رکھتی ہیں لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ مغرب اس سے شدید طور پر متاثر ہے۔ اور اپنے لئے ایک خطرۂ عظیم محسوس کر رہا ہے۔ ایشیا کی اس بیداری کی تحریک اور اس کی باگ ڈور جاپان کے ہاتھ میں ہے۔ جو دنیا کی دو عظیم قوتوں کے ساتھ بحری مساوات کا مطالبہ کر چکا ہے۔ مدبرین کو خدشہ ہے کہ بحر الکاہل . . . . دنیا و امن دنیا کے لئے ایک سخت خطرہ کی صورت میں بدل جانے والا ہے جس کا مقابلہ دنیا کی ہر طاقت کے لئے غالباً ناگزیر ہو جائے گا۔

مشرق کی اس موج بیداری کے شباب سے اندازہ ہوتا ہے کہ بوڑھی دنیا کے مجوزہ اور مستعمل نقشہ میں بالکل نئے خط پڑتے نظر آتے ہیں اور ایک قطعی نئی صورت حال پیدا ہو رہی ہے۔ یورپ کے عاقبت اندیش مدبرین اپنی تہذیب کے تحفظ کی اپیل کر رہے ہیں اور شاندار امن پیدا کرنے کی عظیم الشان آرزو کو آزادانہ بیان کرتے ہیں یہی نہیں بلکہ اتحاد بین المغرب کے لئے چیخ رہے ہیں۔ حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ ایشیا کے مقابلہ میں حقیقی طور پر کبھی یورپ کو متفرق و مختلف نہیں دیکھا گیا۔

وہ کہتے ہیں کہ مشرق کی یہ بیداری دنیا کے امن کے لئے مضر ہے اور اس کی روک تھام کرنی چاہئے۔ تاکہ امن عالم بحال رہے۔

اس عاقبت اندیشی کے طلسم کو پارہ پارہ ہوتے دیکھ کر ندیم ایشیا نے کہا ہے کہ ؎

اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ

یورپ کو مستقبل قریب میں جاپان سے سخت خدشے معلوم ہوتے ہیں اور بلا شک چین میں جاپان کی حکمت عملی ان خدشات کی بڑی حد تک چغلی کھاتی ہے۔ لیکن جہاں تک چین کا تعلق ہے اس پر عرصہ دراز سے مختلف طاقتوں کی نگاہ شوق پڑتی رہی ہے۔ اور وہ جاپان ہی کیا روس اور امریکہ کی بھی جولانگاہ شوق ہے۔ وہ تو ایک قمار خانۂ سیاست ہے جہاں دن رات ہر طاقت اپنی اپنی قسمت کی بازی لگاتی ہے۔ اور فتح و شکست کا تماشہ ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔

لیکن بہر حال جو کوئی بھی ایشیا کی بیداری سے آتش زیر پا ہے وہ گویا نظام قدرت کے مسلمات کو جھٹلانا چاہتا ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ مشرق اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ غلام اور بے بس ہے تو قانون قدرت کے مطابق اس کی غلامی اور بے بسی ختم ہونے کے بعد اعادۂ شعور کا عمل لازمی طور پر ہونا چاہئے کہ بے ہوشی کے بعد ہوش اور تخریب کے بعد تعمیر لازمی ہے۔ آج اگر وہ مشرق جو سینکڑوں تمدنوں سینکڑوں تہذیبوں اور بیسیوں علوم و فنون کا گہوارہ رہا ہے۔ جو دنیا کے مذاہب کی درمرکز ہے۔ روحانیت و ارتقائے انسانیت کا تو کیا ذکر اس کی نوجوانی کی انگڑائی سے دنیا میں تباہی آ جائیگی ہم جانتے ہیں کہ دنیا کی تباہی کا مغرب کو اس قدر خیال نہیں ہے بس قدر کہ وہ مشرق کی تعمیر سے لرزہ براندام ہو رہا ہے۔

لیکن بہر حال مغرب ہو یا مشرق۔ یہ قدرت کا نظام ہے کہ جاگنے والوں کو نیند آئے اور سوتے ہوئے بیدار ہو جائیں اس لئے اس بیداری کو جو ایران، ہندوستان افغانستان اور تمام تر اعظم ایشیا میں پیدا ہوئی ہے جس کو غیر قدرتی اور غلط نہیں کہا جا سکتا۔

یہ بیداری مشرق کے باشندوں میں بتدریج بڑھتی جا رہی ہے اور ایشیائی ہونے پر افتخار و سرفرازی کا جذبہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے ؎

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

ہندوستان باوجود اپنی انتہائی قید و بند کے جو اس کی مجلسی زندگی کو بھی متاثر کئے ہوئے ہے آزادی کا بے پناہ جذبہ اپنے اندر رکھتا ہے اور اپنی داخلی سیاست کی بے پناہ گتھیوں کے سلجھانے کے لئے کام کر رہا ہے وہ غلامی کی زنجیروں کو پاش پاش کر دینا چاہتا ہے اور مجموعی طور پر ہر شخص دل سے آزادی کا خواہاں ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ اس کی اس خواہش کو قانون اور خود اس کا افلاس کچل دینے کے لئے آمادہ رہتا ہے لیکن یہ خواہش اس کے دل میں اس درجہ جاگزیں ہو گئی ہے۔ کہ مٹائے نہیں مٹتی اور نہیں مٹنی چاہئے۔

اس جاوید آرزو کے شعلے کی روشنی میں ایشیا کی نئی قسمت کے مقدس سراج منیر کی عالم افروز روشنی نظر آتی ہے۔ یقیناً ہندوستان کی آزادی تمام ایشیا کی آزادی ہے۔ اور ہم رفتہ رفتہ اس آزادی کے مقدس مندر کے قریب ہو رہے ہیں۔

ابی سینا اور اطالیہ

کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ اور موجودہ حکومتیں قدیم حکومتوں کی طرح ملک گیری کی ہوس کو ایک غیر انسانی اور مجرمانہ فعل خیال کرتی ہیں۔ لیکن آئے دن کی باہمی آویزشیں یہ بتاتی ہیں کہ "جمہوریت" محض ایک بہانہ ہے ورنہ حقیقی طور پر یورپ جو اس تصور کی تخلیق کا دعویدار ہے سخت متکبر اور شخصیت پرست واقع ہوا ہے۔ جہاں تک نظام ہائے سلطنت کا تعلق ہے جمہوری بنیادوں پر قائم ہے لیکن اعمال اور نتائج سکے خلاف بالکل شخصیت پرستی پر منتج ہوتے ہیں

یہ خیال ایک بڑی حد تک درست ہے کہ یورپ میں آزادی کے جذبات کا زوال ہو رہا ہے اور مغربی حکومتیں نئے تجربات میں مشغول ہیں۔ جرمنی نے اس کی نمایاں مثال پیش کی ہے اور جو کچھ وہاں ہوا ہے یا ہو رہا ہے وہ اس دعوی کی دلیل ہے کہ ہٹلر تنہا طور پر جرمنی کی قسمت کا مالک ہے۔

اسی طرح موسیولینی جس کا پیام ہی دنیا کے لئے جنگ ہے ایک آہنی قسم کا انسان ہے اور اٹلی اس کے پنجۂ آہنی میں ایک شاہین کی طرح اسیر ہے۔

اس کے پیکر میں قدیم روم کی جبیل روح ہے اور اس کے دماغ میں وہ استبداد ہے جو رومن دماغ کی خصوصیت تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کے جدید نقشۂ عمل کو دیکھا جائے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اٹلی کی جغرافیائی توسیع کا خواہشمند ہے اور اٹلی ابی سینا کی صلح کے امکانات کو ٹھکرا دینے سے بھی یہ واضح ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ارادے کی پختگی میں کوئی نرمی پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کی تازہ تقریر جس میں اس نے کہا ہے کہ "اٹلی نے کبھی کسی سے منہ کی نہیں کھائی" اس کے ارادوں پر روشنی ڈالتی ہے۔

آئیے ہم سمجھیں کہ اٹلی اور ابی سینا کی یہ کشمکش کا آغاز کیا ہے۔ ابی سینا سے اٹلی کی جنگ کی اولین وجہ سرحد کے قضیہ کے متعلق بتائی جاتی ہے۔ فروری کے باہمی تصادم کے بعد اٹلی اور ابی سینا نے مجلس اقوام سے اپیل کی۔ موسیولینی نے لیگ آف نیشنیز سے مطالبہ کیا کہ ابی سینا کو مجلس اقوام سے نکال دیا جائے۔ اس کے بعد کہا کہ ۴۹۹۰۰ ڈالر تاوان وصول کیا جائے اٹلی سے معافی چاہے یہی نہیں کہ بلکہ اس کے جھنڈے کو سلامی دے۔

یہ دفعۃً گفتگو دراصل ایک سیاسی فرصت حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ کیونکہ اس دوران میں وہ ہر ایک صورت حال کے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ اور فرانس و برطانیہ سے اس نے افریقہ میں اپنے ملک گیری کے ارادوں کو مکمل کرنے کے لئے رضامندی حاصل کر لی۔ نیز معاہدہ لوکارنو اور فرانس و برطانیہ سے ذاتی معاہدہ کا حامی ہو جانے پر وعدوں کی حد لگا دی۔

ابی سینا عیسائی شہنشائیت کے تابع ہے اور اس کی آبادی میں علاوہ عیسائی رعایا کے مسلمان بھی کافی ہیں۔ موسیولینی کا مقصد ابی سینا سے جنگ کرنا کہ زیر بنا دینے سے صرف یہ ہے کہ وہ افریقہ میں اپنی حکومت کی توسیع کرے اور ابی سینا پر قدرت حاصل کرنے سے اس کا بہت بڑا مقصد یہی ہے کہ ابی سینا کے علاقہ میں لوہا۔ تانبا۔ پیتل۔ ابرق۔ سونا۔ چاندی۔ پلاٹینم۔ ہاتھی دانت۔ قہوہ تمام خام مسالے موجود ہیں اور جس طرح فرانس کو اس کا شام کا علاقہ جنگ کے اوقات میں عسکری امداد دے سکتا ہے اسی طرح ابی سینا بھی فوج دے سکتا ہے۔

لیکن بہر حال اطالیہ کی یہ خواہشات یورپ کے امن سے ٹکراتی ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان طاقتوں کی جنگی آرزوؤں کا انجام کیا ہوگا۔ بہت اچھا ہوتا اگر "انسانیت" کے اس تصور کو دنیا سے مٹا دیا جاتا جس کی جمہوری اور فارغ روح کے دعوے یورپ کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس وقت یورپ کے جو سیاسی حالات ہیں وہ ہرگز اعتماد اور اطمینان کے قابل نہیں ہیں۔

مسلمانوں میں زندگی کی روح افزا تڑپ

سچ ہے مکر و فریب کی عمر زیادہ نہیں ہوتی اور وقت خود ان حقیقتوں کو ہمارے سامنے لے آتا ہے جن کے خلاف منافق اور گمراہ کن طبقے عوام کو باطل اور فریب کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ چند سال پہلے مسلمان سیاسی اور مجلسی معاملات میں فرقہ پرست اور قدیم الخیال تھے۔ اور ان کو حالات کے ساتھ ساتھ فرقہ پرست اور خود غرض رہنماؤں نے غلط عقائد پر راسخ کر دیا تھا۔ لیکن تین راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں ان کے نتائج خصوصاً کمیونل ایوارڈ مسلم کانفرنس اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے اندرونی مساعی کے انکشاف نے مسلم رائے عامہ میں تبدیلی اور نرمی پیدا کرنے کا قدرتی موقع پیدا کر دیا [illegible] ملک کی نئی سیاسی صورت حال اور اسمبلی و کونسل میں کانگریس کی

نمایاں کامیابی سے ان تمام حقائق کا اندازہ ہوگیا جن پر غور کرنے کا موقع وقت نے نہیں دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ نوجوان نسل کی نمائندگی کرتے ہوئے میں پُر زور الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کو اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے کہ مذہبی و مجلسی اور سیاسی طور پر وہ زندہ نہیں رہ سکتے اگر انہوں نے اپنی زندگی میں انقلاب پیدا نہیں کیا۔

چنانچہ زندگی کے لمحہ بہ لمحہ مطالعہ اور ہمسایہ قوم کی روز افزوں بیداری و ترقی سے قدرتی طور پر متاثر ہو کر مسلمان قوم کے مفلوج پیکر میں زندگی کی وہ روح کار فرما معلوم ہوتی ہے جو ایک عظیم بیداری کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روح تمام حصص جسم میں زندگی کی موج نہیں دوڑا دیگی۔ گذشتہ ۵ برس کے دوران میں مسلمانوں کے لیڈروں نے اپنی قوم سے جو وعدے کئے تھے اور عوام کو آزادی کی تحریکات میں شریک ہونے سے دامن پکڑ پکڑ کر بٹھایا تھا۔ اس کی تمام حقیقت طشت از بام ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ سمندر پار سے آنے والے "تحفہ آزادی" کا جو شدید انتظار تھا وہ مایوسی کے ساتھ ختم ہو چکا ہے اور مسلمان سمجھ چکے ہیں کہ ان کے وہ رہنما جوان کی ترقی اور نئی زندگی کے دعویدار تھے جھوٹے اور خود غرض تھے ان کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ وہ اپنی ذاتی جاہ و عظمت میں اضافہ کریں اور نئے ہندوستان میں اپنے لئے اقبال و ترقی کی نئی راہ کھولیں مجلسی طور پر وہ سمجھ گئے ہیں کہ اگر وہ اس لکیر کے فقیر رہے جس کو وہ برسوں سے پیٹ رہے ہیں تو وہ نوجوان ہندوستان سے اس قدر پیچھے رہ جائیں گے کہ ایک دن اس کا سر دامن چھونا بھی ان کے لئے ناممکن ہو جائیگا۔

چنانچہ عام طور پر سوشل زندگی میں آزادی اور استواری کے جذبات کی تیز روپائی جاتی ہے اور انکی نگاہوں سے برستا ہے کہ حالات اگر موقع دیں تو وہ قدامت کی اس جھول کو جو صدیوں سے ان کے وجود کے دوش نازک پر بار عظیم ثابت ہو رہی ہے۔ دہم سے پٹک دیں اور اپنی ہستی کی نئی جلوہ آرائیوں سے دنیا جہان کو خیرہ کردیں۔

وہ اخبار و رسائل جن کے لب اظہار حق کو جرم وکفر کا درجہ دیتے تھے اب آزادانہ ان حقائق کو بیان کرتے ہیں جو مسلمان کی سیاسی و مجلسی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو اعتراف ہے کہ وہ غلط راہ پر تھے۔ وہ اب اس راز کو سمجھ گئے ہیں کہ مسلمان قوم اسوقت تک زندہ نہیں رہ سکتی جب تک کہ وہ مجاہدانہ طور پر میدان میں نہ کود پڑے کہ آج سوال قدیم روایات زندگی کے بتوں کی پرستش کا نہیں ہے بلکہ اس نئے مندر کی تعمیر سب سے زیادہ اہم ہے جس میں بیٹھکر اپنی نئی زندگی کے عقیدہ حیات کی پوجا کیجا سکے اور بلا شک وہ لوگ فلسفہ جدید سے ناواقف ہیں جو اک عمر کے چھانے ہوئے راستوں میں زندگی کی راہ تلاش کررہے ہیں وہ راستے زندگی پر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے اب نیا دور ہے اس لئے نئی راہوں پر سفر ناگزیر ہے ہم کو اسوقت زندہ ہونا اور زندہ رہنا ہے لیکن زندہ رہنے کے لئے خوش یقینی کی ضرورت ہے۔ خودی کی ضرورت ہے۔ خودداری کی ضرورت ہے۔ محنت کی ضرورت ہے خود اعتمادی کی ضرورت ہے اور آزادی کی ضرورت ہے۔ یقین کرو کبھی مذبذب قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجاہدۂ حیات کے دوران میں بے پردگی اور پردہ داری، جہل و علم۔ آزادی و قید۔ ریش و بے ریشی۔ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے بے ضرورت خیالات میں قید رہنا خود کو زندہ دفن کردینے کے مترادف ہے۔ ؎

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی　　　خودی کی موت ہیں اندیشہ ہائے گوناگوں۔

سنو مسلم کانفرنس کا صدر اقبال آج کیا کہتا ہے۔ ؎

تو ابھی رہگذر میں ہے قید مقام سے گذر　　　مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر

وہ اقبال جو سیاسی و اخلاقی طور پر قطعی قدیم الخیال ہے بے تابانہ چلّاتا ہے ؎

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور　　　ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر

جس کا اعتقاد سیاسی طور پر صرف غلامیٔ افرنگ تھا وہ مسلمانوں سے خطاب کرتا ہے ؎

گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار　　　طائرک بلند بال دانہ دام سے گذر

وہ مغربی تہذیب و مغربی کلچر کو "دانہ دام" سے تعبیر کرتا ہے اور دنیا کی فضاؤں سے بلند ہو کر فرشتہ وار لاہوتی نغمہ گاتا ہے

جس کا عمل ہے بے غرض اسکی جزا کچھ اور ہے　　　حور و خیام سے گذر بادہ و جام سے گذر

عمل کی روحانیت اور افضلیت کا اس سے بہتر بیان اور کیا ہو سکتا ہے۔ وہ جزا کیا ہے! جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے وہ جزا "حیات" ہے اور محض حیات نہیں حیات جاوید جو اسی وقت نصیب ہو سکتی ہے جب کسی قوم کی زندگی شانداری اور عزت کے ساتھ بسر ہو۔ تاریخ کے صفحات روزانہ ان قوموں کے لئے لعنت کے سامان مہیا کرتے ہیں جنہوں نے زندگی کو نہیں سمجھا اور ہر صبح برکت و رحمت کا قصیدہ گاتی ہے ان اقوام کی شان میں جنہوں نے زندگی کی قدر کی۔ خدا کا شکر ہے کہ بالآخر مسلمانوں میں ایک حرارت خفی کے آثار پائے جاتے ہیں جو ان کے رگ و پے میں تازہ اور جوان خون پیدا کرکے رہے گی۔ آخر ؎

کب تک رہے محکومی انجم میں میری خاک　　　یا میں نہیں یا گردش افلاک نہیں ہے

فراموش کار دوستوں سے

اگر محض دوستی اور اس کے نتائج سے لطف اندوز ہونے اور زندہ رہنے کا سوال ہوتا تو اس سے زیادہ دلچسپ اور شاعرانہ کیفیت اور کیا ہو سکتی تھی کہ میں اپنے دوستوں کی فراموش کاریوں کے تصور میں ڈوبا ہی رہتا۔ نہ خو چھوڑنے کا شکوہ ہوتا نہ "وضع" پر خوددارانہ اصرار، نہ "سبک سری" کی نوعیت اور نہ "سرگران" ہونے کے متعلق استفہام مگر آج سوال ہے کام کرنے کا اس لئے عملی توازن کے لحاظ سے "وجدان" کو نظر انداز کرنے کے بعد کام کرنا چاہئے۔ یہ حقیقت غالباً ناز کرنے کے قابل ہے کہ میں ہندوستان میں اپنے دوست ہی کی دوست رکھتا ہوں اور میں نے اپنے خیال میں کبھی کسی کو دشمن نہیں سمجھا۔ پھر اس کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی تقسیم کیجائے۔ یعنی ؎

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

میں اپنے تمام واقف کاروں اور دوستوں کو "وہ فراموش کار ہوں یا یاد رکھنے والے" زندگی اور عمل کی طرف آواز دیتا ہوں۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی رہبری اور مخلصانہ امداد و مشورہ سے میری مدد فرمائیں اور متحد ہو کر قومی خدمت میں میرا ہاتھ بٹائیں ؎

"گرم فغاں ہے جرس اٹھ کہ گیا قافلہ"

معذرت

عین اسوقت جبکہ ایشیا کے موجودہ نمبر کی طباعت کا کام شروع ہونے والا تھا کہ مجھے مجبور کر دیا گیا کہ فردوس کشمیر کی سیر کے لئے روانہ ہو جاؤں۔ ایک وقت تو وہ تھا کہ سیر کشمیر کی آرزو بیتاب کئے ہوئے تھی لیکن جسوقت قدرت نے اس کے سامان بہم پہنچائے تو میں بہت رد و کد کے بعد کشمیر کے لئے روانہ ہو سکا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ کشمیر کی سیر کرنے کے لئے بہت بڑی قربانی کرنی ہوگی۔ ادھر بادہ مشرق کا کام آخری منزلوں میں تھا ادھر ایشیا کی تیاری۔ کوئی شک نہیں کہ اگر میں کشمیر نہ جاتا اور وہاں تقریباً ۲۰ روز صرف نہ ہو جاتے تو اسوقت تک دونوں

چیزیں کبھی کی شائع ہو چکی ہوتیں۔ یہ معذرت فرض شناسی کی مادیت کی ادنیٰ مثال ہے۔ ورنہ جہاں تک کشمیر اور اس کے تمام جمالیاتی تعلقات کا تعلق ہے وہ حقدار ہیں کہ یہ وقت اور زندگی دونوں انہیں خوشی سے نذر دیدیے جائیں۔ اگر میرا شمار موجودہ زمانہ جدوجہد و عمل کی مخلوق میں نہ کیا جاتا تو مجھے کاموں کی تاخیر اور حسب آرزو تکمیل نہ ہونے کا ہرگز افسوس نہ ہوتا۔ لیکن ایشیا کی اور بارہ کی اشاعت میں تاخیر ہو جانے کی اور اس خبر میں کتابت کی بعض غلطیاں رہجانے سے مجھے تکلیف ہوئی۔ کاپیاں اور پروف میری نظر سے نہیں گذرے۔ ناظرین اپنے خیال میں ان اغلاط کی تصحیح فرمالیں

آخر میں میں مسٹر اقبال احمد بی اے ایڈوکیٹ۔ اعظم صاحب اور راحد صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ایشیا کے اہتمامات میں مجھے بیحد مدد دی۔ گو میں جانتا ہوں کہ ان سب کے خلوص کو میرے شکریہ کی ضرورت نہیں ہے۔

یادِ رفتگاں

آغا محمد شاہ حشر کاشمیری

ہندوستان کے ادیب شہیر حضرت آغا محمد حشر کاشمیری جنکا انتقال لاہور میں ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو ہوگیا۔ ملک کی ان عظیم ہستیوں میں سے تھے۔ جو انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے قومی لٹریچر علی الخصوص اردو و ہندی ادب کو آغا حشر کی موت سے ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے۔ وہ ایک جامع کمالات وصفات انسان تھے اور سچے قوم پرور تھے ان کی ادبی طاقتیں تمام حیات اردو و ہندی ادب کی ترقی و توسیع میں صرف ہوتی رہیں اور انہوں نے اپنے ڈرامہ کے ذریعہ وہ اصلاحی قومی اور مجلسی آزادی کی رُوح ہندوستانیوں میں دوڑائی جو اس سے قبل کسی نے نہیں دوڑائی تھی۔ وہ ہر قوم سے گہرے تعلقات رکھتے تھے اور ہر قوم کی مذہبی و تمدنی تاریخ سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں قومی عصبیت کا شائبہ بھی نہ تھا۔

اس وقوف اور خداداد عقل سلیم نے انہیں ہمیشہ فرقہ پرستی اور قوم فروشی سے دور رکھا انہوں نے جو کچھ کیا وہ ہندوستانی قوم کے لیئے کیا۔ اور انسانی ذہن و دماغ کے لئے وہ اپنی زندگی میں اسقدر لٹریچر پیدا کر گئے۔ کہ وہ قیامت تک ان کی عزت و عظمت کو انسانوں کے دلوں میں قائم رکھیگا۔ وہ حقیقی طور پر پنیتل ڈرامانگار خوش فکر قومی شاعر اور جادو بیان مقرر تھے۔ انہوں نے اپنی جادو بیانی او معجز نما آرٹ سے تمام ہندوستان کے قلوب کو مسخر کر لیا تھا۔

ہندی زبان کے "نورتن" کے بعد آغا حشر پہلا شخص تھا جسنے ہندو قوم میں ہندی زبان کے احیا کی تحریک کو راسخ کیا اور اردو و ہندی زبان کا ایسا نکھرا ہوا معیار پیش کیا۔ جو اس سے پہلے کسی ہندی شاعر اور ادیب نے پیش نہیں کیا تھا۔ آغا حشر کی عظمت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کہ انہوں نے ہندوستان کی مختلف تہذیبوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اپنے وطن پرور رقم سے تمام قوموں کو ایک مرکز پر متحد کرنے کے لئے کام کیا۔ مجھے انکی موت کا صرف ایک ہم عصر اور ہم مذاق ہونیکی حیثیت سے ہی رنج نہیں ہے بلکہ گہرے دوست ہونیکی حیثیت سے بھی میری آنکھیں ان کے لئے غمناک ہیں۔ میں اس غم میں جو ان کی المناک موت سے ان کے بھانجوں اور خصوصاً ان کے چھوٹے بھائی جناب محمود کو ہوا ہے دل سے شریک ہوں اور ایشیا کی کسی اشاعت میں "آغا حشر کے ساتھ چند دن" کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کرونگا جو ناظرین کی بہت سی دلچسپیوں کا موجب ہوگا۔ خدا ان کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

میر سید ممتاز علی

آغا حشر کے بعد ہی تہذیب نسواں اور دارالاشاعت پنجاب کے بانی میر سید ممتاز علی رحمۃ اللہ علیہ کی موت اردو دنیا کی انتہائی بدقسمتی ہے۔ ابھی ایک داغ مٹا نہیں تھا کہ دل پر دوسرا داغ لگا۔ میر سید ممتاز علی ان بزرگوں میں سے تھے جن کی ذات اردو زبان کے لئے نہایت مغتنم تھی اور جنہوں نے اپنے رسائل و اخبارات کے ذریعہ طبقۂ نسواں اور ہندوستانی ذہن و دماغ کے لئے بہترین سامان فراہم کیا۔

مجھے اس سلسلہ میں میر صاحب مرحوم کے صاحبزادے سید امتیاز علی تاج بی اے سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا ان کو صبر عطا فرمائے۔

منظر حسین اختر میرٹھی

زندگی کا سب سے المناک فرض شاید اپنے کسی عزیز دوست کے لئے آنسو بہانا ہے۔ پھر رونا یہ ہے کہ یہ آنسو بہانا بھی اسکو زندگی پھر واپس نہیں لاتا۔ منظر صاحب میرٹھ کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے، اردو ادب سے ان کو گہرا شغف اور اردو شاعری سے پختہ ذوق تہا۔ متقدمین و متاخرین کا کلام انہیں ازبر تھا۔ حالیہ شعراء کے کلام کے متعلق روشن رائے رکھتے تھے۔ نہایت خلیق و شریف بیحد متواضع اور نیک۔ نہایت صابر و قانع اور بہت ہی بہتر انسان تھے۔ دن رات ان کے ساتھ صحبتیں رہتی تہیں اور میرے ان دوستوں میں سے ایک تھے جنکو میرے ہر کام سے گہری دلچسپی اور خصوصاً ادبی جدوجہد سے شغف تھا افسوس ہے کہ کئی ماہ کینسر کی تکلیف میں مبتلا رہ کر بالآخر مجلس کو سونا کر گئے۔ ان کی موت نے مجھے ایک مخلص ادبی رفیق اور ایک آزاد نقادِ امور سے محروم کر دیا۔ مجھے ان کے اعزا خصوصاً بیگم منظر اور ان کے بھائی سید وصال حسین صاحب بی اے بی۔ ایس۔ سی سے دلی طور پر ہمدردی ہے۔ خدا مظہر مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

فروغِ شمع جواب ہے رہیگا صبح محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

ساغر نظامی

عمر خیام کی رباعی کا ایک تصویری تخیل

روح کا شعلہ

پٹ مندر کے کھول پجاری پٹ مندر کے کھول

پریم نگر سے آئی ہیں داسی پٹ مندر کے کھول
ہیرے موتی لائی ہیں داسی پٹ مندر کے کھول
وہ موتی ہیں سیج سے جن کی چندرماں چھپ جائے
وہ ہیرے ہیں جوت جنہوں کی سورج کو شرمائے
نینن کا کانٹا ہے ان کو اس کانٹے میں تول
پٹ مندر کے کھول

صبح سویرے چھیڑا کس نے بنسی کا یہ راگ
آنکھ کھلی ایسے میں میری یہ بھی میرے بھاگ
کوئل، مور، پپیہا، شاما سب سوویں نر ناری
گہرے سپنے میں ڈوبی ہے سپنے کی متواری
سارا جگ مردہ ہے پجاری، ہیرے موتی رول
پٹ مندر کے کھول

دور کہیں اک جھرنا گاوے سپنے کے سے راگ
لٹنے کو ہے دن کے ہاتھوں، تاروں کا سہاگ
سکھیاں اپنے ہٹ میں لیٹی کریں دلوں کی کھود
جمنا دھندلا درپن ہے اور پنگھٹ سونی گود
پنگھٹ پر ہر کوئی چپ ہے گری، گگری، ڈول
پٹ مندر کے کھول

دو نینن میں سو آنسو ہیں دیوانی کی بھینٹ
نین مرے ماٹی ہیں کیول، بھینٹ ہے یاں میت
اس مندر کے کھول ذرا پٹ جس میں ہیں گردھاری
وہ گردھاری جن پہ ساری دنیا ہے بلہاری
کب سے ہیں بے چین پجاری سن تو میرے بول
پٹ مندر کے کھول

جیون میرا روپ بدل کر بن جائے ایک ہار
ان کے گلے کا ہار پجاری، میرا من سنگھار
مجھ کو گلے یوں پڑتے دیکھیں دیویں وہ من ہار
گندھ جاویں اک ہار میں دونوں سنسار اور ساکار
تجھ کو کیوں ہے عار پجاری کچھ تو منہ سے بول
پٹ مندر کے کھول

جیون کیا ہے ایک رسیلا اور امر سنگیت
پریم نگر میں نہیں پجاری مرجانے کی ریت
جھانجھ کی لے پر دھرتی ناچے اور جھومے آکاس
تال پہ میرے گھونگھرو کی ترلوک میں ہووے راس
میرے مد کے آگے پجاری دنیا کا کیا مول
پٹ مندر کے کھول

میں پگلی اب جاؤں کدھر کو پھوٹے منہ سے بول
پٹ مندر کے کھول پجاری، پٹ مندر کے کھول
جوبن اور جوبن کی مستی سب کچھ بھینٹ چڑھاؤں
جگ ڈھونڈے ہر رنگ میں مجھ کو میں اس میں کھو جاؤں
پاگل، کامی، چنچل، پاپی، مت ہو ڈانواں ڈول
پٹ مندر کے کھول

ساغر نظامی

مسئلہ مشرق اور ترک

ترکی قوم اور دنیا میں اسلام کا مستقبل

پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے کہ "جو شخص ضرر سے کام لیگا تو وہی فائدہ میں رہے گا اور جو انہ عاجز رہا ہے تو خود ہی نقصان اٹھائے گا۔" مشرق نہایت بے صبری کے ساتھ مغرب کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اور اقوام عالم کے زمرے میں شریک ہونا چاہتا ہے خصوصاً مشرقی دنیائے اسلام اپنی شہور قدیم تہذیب کا واسطہ دیکر اتحاد بین الملل میں حصہ لینے کی خواہشمند ہے۔ ان تجربات کو جو حقیقتاً نہایت ہی پُرخلوص اصحاب الرائے کی تدبیر کا نتیجہ ہیں گندم نما جو فروش سیاست دانوں نے اپنے تم خیالوں کے مفاد کے مطابق گڑھ لیا ہے اور جذبات انسانی کی دائمی کشاکش کی تنظیم کا سوال درپیش ہوتا ہے تو بہت الجھی ہوئی مبہم اور ناقابل عمل نظر آتی ہیں لیکن تاریخی ڈراما کے پردوں پر مشرق و مغرب کے تصادم کا جو منظر صدیوں سے ظاہر ہو رہا تھا اب نئی شکل اختیار کر بیٹھا ہے اور روز بروز ناگوار تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ دور حاضر کی جمہوریت اس مسئلہ کو طے کرنے میں جس قدر نااہل ثابت ہوئی ہے انسانیت کا افق اتنا ہی زیادہ دھندلا ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے خیالات میں کم از کم وہ صفائی و سنجیدگی ضرور پیدا کرلیں جس کے بغیر ہمیں کوئی حق نہیں کہ صاحب غور کہلائیں۔ نیٹشے نے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ تہذیب مغرب کی قسمت ایشیا کے معاملات سے کس قدر وابستہ ہے۔ اپنی تصنیف "ماورائے خیر و شر" میں وہ یورپ کا نام انتہائی غصہ اور حقارت کے ساتھ لیتا ہے یعنی وہ ملک جو برّاعظم ایشیا کا محض ایک منحوس جزیرہ نما ہے اور روحانی فوقیت کا دعویدار ہے صرف اس لئے کہ وہ موجودہ ایجادات کا بانی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ایشیا کی اس روح رواں کو اب تک قطعی نہیں سمجھ سکا جو تمام بڑے مذاہب اور فلسفیانہ نظریوں کی (جو ہمیں ورثہ میں ملے ہیں) خالق ہے نیٹشے کے ان الہامات کی تصدیق واقعاتِ حالیہ نے پوری پوری کردی ہے

علم معاشرت نے بیشک یہ کوشش کی ہے کہ تمام مظاہرات تمدن کو محض واقعات اعداد یا صیغۂ ضوابط کی شکل میں لے آئے۔ لیکن مسائل انسانی کے اخلاقی اور روحانی پہلو نے مادہ پرستوں پر ایک زبردست انتقامی حملہ کردیا ہے بلکہ ہر فرقہ کے وہ ماہران معاشرت اس سے اثر پذیر ہیں جنہوں نے اب تک صرف اس لئے ایشیا سے بے اعتنائی برتی کہ وہاں صنعت و حرفت کی کمی تھی کیونکہ ان کے نزدیک یہ کمی غیر مہذب ہونے کے مرادف ہے اور اب تجارت بین الاقوام کے متعلق اپنے یقین باطل سے چونک کر مغرب کو اسی مشرقی مسئلہ کا ایک نئی اور شدید اضطراب کی شکل میں سامنا کرنا پڑا ہے۔

یورپ کی مادی ہوس نے جو سوال اول اول اٹھایا تھا اور جس پر عالمان دین کی دھواں دھار تقریروں نے مذہبی رنگ چڑھا دیا تھا۔ اب جنگ عظیم کے زمانہ سے وہ سوال اخلاقی اور روحانی عظمت کا حامل ہے یا بذات خود ایک معیار ہے جس پر ان تاریخی قوتوں کا توازن کیا جا سکتا ہے جو انسان کو جدھر چاہتی ہیں ڈھکیل دیتی ہیں۔ ان تاریخی قوتوں میں اسلام ایک زبردست روحانی و اخلاقی قوت ہے جس سے چشم پوشی ممکن نہیں بشرطیکہ ہم کو مشرق اور مغرب کے آیندہ تعلقات کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہو اسی وجہ سے عراق عرب کی مردم شماری کی بہ نسبت ترکی کا انقلاب کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے جبھی تو یہ انقلاب اپنے گہرے معنی میں سیاست یورپ کے حدود سے باہر ہے جو اتنے عرصے سے اپنے انھیں مترو‌ک نظریوں کا پابند چلا آتا ہے اور اپنی پرانی روایات پر قائم ہے حالانکہ وہ ترکی کی صرف مالی حالت پر روشنی ڈال سکتا ہے اور اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرہی نہیں سکتا جو آج تک یورپ کے کسی مدبر نے نہیں سمجھی۔ ذرا غور تو کیجئے راسین کانفرنس میں ترکوں کے خلاف بحیثیت ایک مسلمان قوم کے کتنی تجارتی مالی اور انتظامی شکایات پیدا ہوئیں قسطنطنیہ میں فرنچ چیمبر آف کامرس کی درخواست پڑھئے جو معاشی فوائد کے موافق ہے ان مذہبی بحثوں کو بغور سنئے جو مشرق میں عیسائیوں کی بہبودی کو خطرے میں ڈالنے کے لئے کی گئیں اور اس درخواست کا مطالعہ کیجئے جس پر عیسائیوں اور یورپ کے تمام بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں اور امریکہ کی دینی جمعیت کے دستخط ہوئے۔ ان تمام پُراثر درخواستوں کی تہ میں آپ کو روح ایشیا اور اسلام کے متعلق ہمیشہ خیالات باطل نظر آئیں گے۔ اسی لئے مجھے یہ ضرورت ہوئی کہ آپ کی توجہ مشرق کی اور خصوصاً اسلام و ترکی کی روحانیت کی طرف مبذول کراؤں۔ اس کی اہمیت کم سے کم ان خطروں سے کسی حالت میں کم نہیں جو آجکل مشرق کے کاروبار پر چھائی ہوئی ہیں۔ آج دنیا کے اتحاد روحانی کی امید کا انحصار سب سے زیادہ اس انقلاب پر ہے جو جلد یا بہ دیر ایشیا اور خصوصاً اسلام کی روح میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اسلام جس کی گزشتہ مسلّمہ قوت و خوشحالی نے بےشمار حاسد پیدا کرلئے تھے۔ صرف اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اس کی آواز پر ہمدردی کے ساتھ کان لگائے جائیں یا امدادات کی درخواست پر توجہ کی جائے۔ ممالک اسلامی میں جو خزانے پوشیدہ ہیں ان کو نکالنے کے لئے اسلام سے دوستی کی ضرورت ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ دوستی معمولی سیاسی فریب کاریوں سے خریدنے کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ روح مشرق کی طرف ایک ہمدردانہ محبت بھری نظر کی متمنی ہے۔

جس تحریک نے عراق عرب میں اتنا زبردست انقلاب پیدا کردیا۔ اس کی حقیقت

اچھی طرح نہیں سمجھی۔ یہ واقعہ صرف تاریخ ترکی ہی میں ایک خاص اہمیت نہیں رکھتا سے باہر بھی کافی اثر جائے ہوئے ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس کی ابتدا ت کو اختصار کے ساتھ بیان کر دوں اور وہ سیاسی نکتہ بتا دوں جو اس کی تہ میں ہے۔

۲

"دنیائے اسلام اور ایشیا سے مغربی یورپ کے آیندہ تعلقات کا مسئلہ سیاست عالم بنا ہوا ہے۔ اور ایک نہایت گہرا اور فیصلہ کن سوال سمجھا جاتا ہے۔ باسفورس سے گنگا سے ہرات تک، انگورہ سے کابل، دہلی، شملہ، کلکتہ اور بمبئی تک ہر جگہ یہی سوال ہے کہ آیا یورپ اور ایشیا، مشرق اور مغرب ایک قابل رہائش دنیا کی ازسر نو تعمیر کبھی دوستانہ وار ہمخیال ہو سکیں گے یا نہیں۔ یا پھر صاحب ہمت بادیوں اور اعلیٰ ... کے تحفظ کی وجہ سے یورپ ایک خالص مادی تہذیب کا دیوانہ ہو کر آخر کار اپنی ظالمانہ ... ایشیا سے مغلوب ہو کر بیٹھ جائیگا۔

تمام اہل معاشرتی تجاویز جو اصلاح یورپ کے سلسلہ میں زیر بحث ہیں صرف اسی وقت عمل ہو سکتی ہیں جب مسئلہ مشرق کسی ایسی نئی بنا پر پوری پوری طرح طے ہو جائے جو عقل و فہم کے مطابق ہو یعنی حاکم بہترین طریقوں سے محکوم کی ایسی رائے حاصل کرے کی ضروریات پر حاوی ہو جس میں وحشیانہ استبداد یا تجارتی خود غرضیاں تنگ ہو۔ رعایا کی فلاح و بہبودی کی پوری پوری موید ہو۔ ایک قوم پر دوسری قوم کے بے سوسیہ معاشرتی حملے اب قطعی ناممکن ہیں ۱۷۷۶ء میں امریکہ کی جنگ آزادی جن معاشرتی اور تقسیمات کا نتیجہ تھی وہی اب ایشیا میں ہیجان پیدا کر رہے ہیں اور جن معاشرتی عاقبت ... اہل عقل و دانش نے کنیڈا، آسٹریلیا، اور جنوبی افریقہ کو ایک بڑی حکومت کے رشتہ میں منسلک رکھا اب بھی شاید وہی اس شدید تنفر کو دور کر سکے جو مشرق میں سر دل پر چھایا ہے۔ دنیا کی جدید تعمیر کی تمام پُر فریب بڑی بڑی تجاویز ناکام ہو کر رہیں گی جب تک کہ مغرب اقوام مشرق کے لئے کوئی مناسب مقام تلاش نہ کرے۔

حکمران اقوام میں قوم ترک بذات خود اس رتبہ سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس پر وہ بلا شرکت غیرے راسین سے اب تک حکمراں چلی آئی ہے۔ یورپ سے ایشیا کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کی کنجی ترک کے ہاتھ میں ہے، اور صرف اجازت چاہتا ہے، ان راستوں پر سے گزر سکے جو شخص اسلام پر بیعت کرے خواہ تلوار کے زور سے یا قوت روحانی سے ترک ہو یا انگریز فرانسیسی ہو یا روسی وہی ایشیا کی کنجی اپنے قبضہ میں رکھتا ہے اور جو شخص ان کنجیوں کو اپنے ہاتھ سے نکل جانے دے وہ ایشیا ہی میں بڑے بڑے وسیع رقبوں کا مالک کیوں نہ ہو کبھی بے خوف نہیں بیٹھ سکتا۔ کی کی اہمیت حقیقتاً اس امر میں پوشیدہ ہے جو تاریخ سیاست کی گزشتہ پانچ صدیوں نے ظاہر کیا ہے یعنی ایشیا سے متعلق بڑی بڑی قوتوں کے باہمی تعلقات کا دار و مدار اسی قوم پر ہے۔ جنگ ترکی کے موقع پر جن احساسات و جذبات نے قسطنطنیہ کو دہلی سے متحد کر دیا تھا۔ وہ اس دعوے کی بین دلیل ہیں لائڈ جارج نے بھی مجبوراً ہندوستان کے مسلمان نمایندوں کو اس بحث مباحثہ میں شرکت کے لئے مدعو کیا جو سلطنت برطانیہ اور ٹرکی کے درمیان ہو رہا تھا۔ یہ واقعہ چھوٹا سہی لیکن اہم ضرور ہے اور خود جس واضح طور سے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ انگلستان کے دل میں ترکی کتنی اہمیت رکھتا ہے تاریخ کے سو صفحے بھی مشکل سے پیش کر سکیں گے۔ فی الحقیقت اس بات کا اقرار بے خوف تردید کیا

جا سکتا ہے کہ موجودہ صدی میں جس میں ممکنات کی کوئی حد و شمار نہیں سلطنت برطانیہ کی قسمت اسلام کی قسمت سے بہت مستحکم بندھی ہوئی ہے۔

یہی باعث ہے کہ اسلام سے ترکی کا طرز عمل مغربی اور وسطی ایشیا کے متعلق تمام معموں کی کنجی ہے۔ ایک زبردست جنگجو قوم یعنی ترکی جو اپنی شاندار روایات کی مالک ہے تمام اہل اسلام کی آیندہ ترقی کی راہیں قائم کر سکتی ہے بشرطیکہ تہذیب مغرب کی جانب جو اس کا رجحان ہے اس کی ماہیت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے۔ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۳ء کے درمیان عراق عرب میں قومی جنگ و جدال کے موقع پر سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ترکی کو یورپ کے مقابلہ میں انقلاب اسلامی کا ہراول بنایا جائے یا ایشیا و یورپ کے حدود پر مغرب کا عقب لشکر قرار دیکر اسے اپنی خواہشات کے مطابق اپنی عجیب و غریب تاریخی زندگی کے خوشگوار ترین لمحات سے لطف اندوز ہونے دیا جائے ترک یورپ کے موافق ہوں گے یا مخالف؟ موجودہ بے چینی کے دوران میں یہ سوال چشم پوشی کے قابل نہ تھا۔ درآں حالیکہ چھوٹی چھوٹی قومیں بھی جو نہ اتنی خود دار دغیور ہیں اور نہ اپنی گزشتہ عظمت کا اس قدر احساس رکھتی ہیں اس قابل ہوگئی ہیں کہ موقع کے لحاظ سے تہذیب مغرب کے لئے مفید یا خطرناک ثابت ہوں لیکن حقیقتاً سلطنت ترکی ایشیا کی سیاسی دنیا میں ایک نہایت — کارکن قوت ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ترکی پر دوستی کئے بغیر تعلقات کا قائم رکھنا اور ساتھ ہی اس کی خصوصیات کو سمجھنے کے لئے مستعد رہنا کوئی ممکن کام نہیں خصوصاً ایسے موقع پر جب اس نے یہ طے کر لیا ہے کہ عراق عرب کی اندرونی ... میں ہمہ تن مصروف ہو جائے اور جب وہ صرف ایک چیز طلب کرتی ہے یعنی اقوام عالم میں ایک قوم بنکر رہنے کا حق۔

جب سے ترک پہلی مرتبہ تاریخ میں رونما ہوئے ہیں یورپ ہمیشہ اس کوشش میں رہا کہ اس کے صفحات سے ان کی ہستی مٹا دینے کی کوئی صورت نکل آئے۔ اور گزشتہ چھ صدیوں سے جو نمایاں حصہ وہ تاریخ میں لے رہے ہیں اس کا خاتمہ ہو جائے۔ دو سو سال کی متواتر کاوش کا نتیجہ یہ ہے کہ "تین براعظم اور تین سمندر" جن پر حکومت کرنے کا فخریہ اظہار سلطان استنبول کے خطابات میں پایا جاتا تھا آج صرف ایک تاریخی یادگار رہ گئے ہیں۔

قسمت کی ایک کاری ضرب کھا کر ترکی نے اپنے اصولی مسئلہ میں سادگی پیدا کر لی ہے اور سیاسی نکتہ نظر کو چھوڑ کر پھر اسی حالت پر آگیا ہے جو اسے تیرھویں صدی کے وسط میں حاصل تھی جب اسے سلطنت سلجوقی کے دروازہ پر جو زندگی کے سامان ترتیب کر رہی تھی دسنگ دینی پڑی اپنی قومی سرزمین پر جسے شاید فطرت نے انہی کے استعمال کے لئے منتخب کیا ہے جب ان کو ایسے دشمنوں کا خطرہ ہوا جو صدیوں سے للچائی ہوئی نظریں جمائے ہوئے تھے تو ترکوں نے ہمیشہ ایک نئی قوت ازسر نو حاصل کر لی انقلاب روس نے جب ان تمام ریشہ دوانیوں پر پانی پھیر دیا جو پیٹر اعظم کے بعد پھیلائی جا رہی تھیں تو ترک منصۂ سیاست پر ایسی خوبصورتی کے ساتھ آگئے گویا کہ جوانی پھر عود کر آئی۔

آخر اس کی کیا وجہ کہ وہ غیر معمولی تغیر جو انقلاب روس نے مسئلہ مشرق کے تمام اجزا میں پیدا کر دیا مغربی قوموں کے لئے مفید ثابت نہ ہو سکا جو ۱۹۱۸ء میں کوشش کر رہی تھیں کہ مشرقی تحریک اصلاح کے سیاسی پہلو پھر حاصل کر لیں۔ یہ کیا کہ اسلام جو انیسویں صدی میں لندن اور پیرس پر تمام تر توجہ جمائے رہا ماسکو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جہاں ایک اصول جو قطعی منافی اسلام ہے ایک پر غلبہ کئے ہوئے ہے جس کو ۱۹۱۷ء تک مشرق اپنا قدیمی دشمن سمجھتا رہا — مناظر کا یہ غیر متوقع تغیر اور مشرقی ڈراما کا نرالا انداز صرف یورپ کی عام رائے کی ناسمجھی کا نتیجہ ہے جو مشرق

کی نہایت ہے) تعصب اور سب سے زیادہ غیر متعلق مصنوعی اثرات کا محکوم ہونے کی وجہ سے کبھی نہ سمجھ سکا کہ تہذیب مغرب کی قسمت کا تمام تر انحصار صرف اس بازی پر ہے جو ایشیا اور ایشیا میں لگی ہوئی ہے۔ خود انگریزی پبلک رائے اس اہمیت کو سمجھنے سے ابھی بہت دور ہے کہ وہ اہم ترین شاہراہیں جو یورپ کو ایشیا کے دور دراز گوشوں سے ملا رہی ہیں اسلام کے ہاتھ میں ہیں وہ یعنی ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک میں ہو کر گزرتی ہیں اور دنیا کی معاشرتی زندگی میں شہ رگوں کا کام دے سکتی ہیں بشرطیکہ وہ جن انجام میں پھیلی ہوئی ہیں وہ کم سے کم ضروری طاقت حاصل کرتے رہیں۔ جغرافیہ کے دوامی قوانین نے عہدہائے قدیم سے ان تمام بین الاقوام شاہراہوں کو تمام بڑی تاریخی لڑائیوں کی علت نمائی قرار دے دیا ہے۔ جب تک ترکی قوم کے پاس ان اہم شاہراہوں کی کنجی موجود ہے مغربی قوتوں کو ترکی کے خلاف جد و جہد سے بچکر اُس سے تعلقات رکھنے پڑیں گے۔

بدقسمتی سے چند الفاظ کے استعمال نے جو علمائے دین کو بہت عزیز ہیں یہ سوال ذرا مبہم سا کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے بنی نوع انسان پر اتنی مصیبت نازل نہ ہوتی اگر ایک مصنوعی محبت انسانی اس پر غلبہ نہ کر لیتی۔ یہ بدستور اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا تو سیاست اس کے مدعا سے بخوبی واقف تھی (یعنی عالمگیر طاقت کے توازن کا مسئلہ) حق تو یہ ہے کہ یورپ کی سیاست تعصب مذہبی سے کبھی پاک نہیں رہ سکی خصوصاً اسلام کے مقابل میں۔ اور موجودہ عیسائیت نے گزشتہ صدیوں کی مذہبی پالیسی پر ہمیشہ لعنت ملامت کی ہے اور یہ وہی پالیسی ہے جس میں تعصب کے وہ جراثیم شامل ہیں جو بائی زنٹائن کے مورخوں نے مغربی خیالات کے پاس ترکہ میں چھوڑے ہیں۔ یہ مورخ خلاف اسلام تحریک کے زبردست بانی مبانی تھے۔ اور مشرقی معاملات کے بارے میں یورپ کے خیالات کو اپنی یاوہ گوئی سے اسی طرح برگشتہ کر دیتے تھے جس طرح شکست خوردہ قومیں فاتح سے انتقام لینے اور اُن کی تذلیل سے خوش ہونے کے لئے عموماً کیا کرتی ہیں۔ جبر و اختیار کا ماخذ مدت دراز تک یورپ کا تعصب رہا ہے جو مشرق کے ساتھ تھا۔ اور جب تک عیسائیت کو خطرۂ ترکی رہا عیسائی قوتوں کے ماہرانِ سیاست ان کو فوراً سپرد قلم کرتے رہے۔ ایک پوپ صاحب یعنی پائیس ثانی نے جو بڑا آدم دوست تھا اور اینیز سلویس کے نام سے معروف تھا۔ ترکوں کے خلاف تیاری کرنے سے پہلے ہی مسئلہ عثمانی کو حل کرنے کے لئے ایک عجیب سیدھی سادی ترکیب نکالی۔ ایک ذاتی خط میں اُس نے فاتح عصر محمد اور اُس کے رفقاء کو عیسائیت کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ تمہیں اس مذہب کا پیشوائے اعظم اور یورپ کا دین پناہ بنا دوں گا۔ یورپ جو الزام ترکی پر عاید کرتا ہے یہ خط اس کا اصلی نمونہ ہے یورپ اس کی تمام فتوحات کو جو دیگر فاتحوں سے کسی حالت میں زیادہ ناگوار نہ تھے معاف کر دیتا بشرطیکہ وہ عیسائیت قبول کر لیتا۔ جیسا کہ ان تمام نئی قوموں نے کیا جو مذہب عیسائیت کے غلبہ کے بعد یورپ میں آئیں۔

آجکل بھی یورپ کی سیاست اسلام کے خلاف اسی مذہبی تعصب سے پُر ہے۔ یہی وہ امر ہے جس نے مسئلہ مشرق کے تمام فریقوں کو موقع دیدیا ہے کہ وہ بہتر سے بہتر قابل قدر انسانی نظریوں کا مذاق اڑا سکیں۔ اور صرف اس نقطۂ نظر اور احساسات کو مرکز خیال بنائے رہیں جو یورپ کو مشرقی عیسائیوں سے متحد کئے ہوئے ہے اسلام اور جدید یورپ کے باہمی تعلقات کو نقصان پہنچانے کا اتنا کارگر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایشیائی مسئلہ کو مبہم بنانے کی اس سے زیادہ مؤثر کوئی صورت نہ تھی۔ اور تمام عالم کے امن عام کو خطرے میں ڈالنے کا یقین کامل اور کسی طرح ممکن نہیں تھا جس طرح یورپ کے اندرونی معاملات کے متعلق مذہبی نقطۂ نظر ان تمام مصائب کا مخرج تھا جس نے اس براعظم کو مذہبی جنگوں کے دوران میں درہم و برہم کر دیا اور جس طرح یورپ میں آزادی کی سانس صرف اس وقت لے سکا جب دیوانے مذہبی سیاست دانوں سے اس نے چھٹکارا پایا اسی طرح ایک بااصول محب بنی آدم کا جس پر روسی تعصب اور انگریزی مذہبی تعصب کا رنگ چڑھا ہوا ہو مشرق میں بہت ہی دردناک انجام ہو کر رہیگا جہاں اُس نے تمام خطرناک جذبات کو اُبھار کر انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

انگریزی سیاسی ادب میں ترکی اور اسلام کے متعلق دو قسم کے اہل الرائے موجود ہیں ۱۸۵۶ء میں اڈنبرگ میں رچرڈ کابڈن کا مشہور رسالہ "ایشیا" چھپا جس میں انجہانی نے افسر اعلیٰ نے پبلک کے اُن خیالات پر حملہ کیا جو اُس کے خلاف پیدا ہو رہے تھے۔ اور کھلا اُن لوگوں کی تائید کی جو عیسائیت کا واسطہ دیکر روس کی طرفداری میں ترکی سلطنت کو قمع کرنا چاہتے تھے۔ اور اعلان کر دیا کہ انگلستان خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکتا ہے اگر وہ یورپ کا نقشہ اس طرح تبدیل کر دے۔ انگریزی آزادی پسند طبقے کے خیالات پر اس رسالہ کا اثر ہوا تھا چنانچہ ان سب کی مشرقی پالیسی نے اُنیسویں صدی میں پامرسٹن سے گلیڈ اسٹون تک گویا اور اس کے بعد تک ایک ہی روش اختیار کر لی یعنی روس کی طرفداری میں قسطنطنیہ زار کو دیدی گئی۔ اور اب بھی بے دھڑک یہی کہتے ہیں کہ اس شہر کا سوال ابھی زیر تجویز رکھا جائے روس جب اس انقلابی بخار کی غفلت سے چونکے تو ممکن ہے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ ایک مورخ نے کیا خوب کہا ہے کہ پیران زار نے انگلستان کے آزادی پسندوں کو اسی آسانی کے ساتھ زیر اثر کر لیا جس طرح خود اپنے یہاں کے لوگوں کو۔ ترکی اور اسلام کے بہترین سیاسی مورخ ڈیوڈ ارکھارٹ نے جو یورپ میں گزرا ہے اس وقت کوشش کی کہ یورپ اور انگریزی سیاست کے اُن غلط اعتقادات کی اصلاح کرے جن کا اثر اصلاح کے مدعا پر تھا اور جو سینٹ پیٹرز برگ چانسلریز میں تجویز ہوئی تھی اُس نے ان بناوٹی اصولوں کی جو سمجھے بوجھے مشرق پر چسپاں کئے جاتے تھے بہت زور کے ساتھ مذمت کی اور نہایت مؤثر پیرایہ میں سیاست کی مسلمانوں کی ان اچھی روایات کو قائم رکھنا چاہئے جن کی قوتوں کا وہ معترف تھا۔ نیز مشورہ دیا کہ ترکی کو یورپ میں شامل سمجھا جائے۔ اس کو یقین تھا کہ اگر ترکی کے معاملات میں بیرونی مداخلت کی متواتر روک تھام کی گئی تو وہ طاقتوں کے توازن کے لئے ایک نہایت کارآمد اسباب عنصر ثابت ہو گا۔ اور ایشیا میں علوم مغرب کا ہراول بنکر اپنی تاریخی حیثیت میں تا بقدر اضافہ کریگا ۱۸۳۰ء اور ۱۸۷۸ء کے درمیان اُس نے یورپ کی تمام طاقتوں کو تلقین کی کہ ترکی معاملات میں ذرا بھی دخل نہ دیں تاکہ اُن روشن ضمیر تہذیب یافتہ حضرات کی مدد سے مسائل مشرقی کے ماہرانہ اور تمام سیاسی چالوں سے بری ہیں مسلمانوں کو جدید قوموں کے سانچے میں ڈھالنے کا اہم کام فطری اصول پر بتدریج مکمل ہو جائے۔ کل ابتدائی مراحل اور تمام اصلاحوں کا عمل درآمد قابل سائنس دانوں کو سپرد کرنے اور سیاسی فرقوں کے ہاتھ میں مہلک ہتیار بنا کر نہ چھوڑ دینے کی رائے اس کی ایک بہترین نصیحت ہے جو اب تک قابل قبول اور صائب سمجھی جا سکتی ہے سب سے پہلے یہ ارکھارٹ ہی کو محسوس ہوا کہ قریبی مشرق کا سوال جس شکل میں یہ مخالفین اسلام اس یورپ کی رائے عامہ کے سامنے پیش کرتے ہیں حقیقتاً ایک راز ہوں ہے جو انجام کار خونریزیوں کا باعث ہو گا۔ سیاست مغرب کبھی نہ سمجھ سکی کہ اس مسئلہ کی جڑ ہے تو یہ ہے کہ یورپ اور ایشیا کے تعلقات میں کامل تغیر پیدا کر دیا جائے اور ایک عظیم الشان مذہب اور جری فرقے کو موقع دیا جائے کہ بیرونی فریب کاریوں سے محفوظ رہکر اپنی ملکیت کے اس اہم سوال کو خود حل کر لے۔

یورپ کے لوگوں نے جن کو لارڈ بائرن "خرید و فروخت کرنے والا فرقہ" کہتا ہے،

زاریت اور اسلام کے درمیان تعجب انگیز کشمکش پر ذرا بھی غور نہیں کیا یہ مسئلہ کبھی اپنے ہمہ گیر مفہوم میں کھول کر بیان نہیں کیا گیا اور بین الاقوامی چالیں ایک عالمگیر جنگ عظیم کے افسوسناک اسباب فراہم کرتی رہیں۔ بہرحال ممکن ہے کہ قریبی مشرق کے عیسائی آخراً فائدہ میں رہتے اگر اپنے ذاتی حقوق پر قائم رہتے اور بیرونی سازشوں کو جو انہوں نے اکثر خود پھیلائیں خیر مقدم کہنے کے بجائے انہوں نے اس تحریک اصلاح سے اتفاق کر لیا ہوتا جو اسلام کی بنیادیں ہلا دینے پر تلی ہوئی تھیں۔

۳

۱۸۵۶ء کی پیرس کانگریس کے بعد روس نے ایک نظام قائم کیا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ترکی اپنا ایک ایک عضو جدا کر کے خودکشی کر لے۔ عیسائیت اور اسلام میں عداوت بڑھانے اور پوشیدہ ذریعوں سے اصول صحیح پر عمل نہ ہونے دینے کی ترکیب جس کی تائید کھلم کھلا یورپ کی پبلک نے کی ایک نہایت گمراہ اور امید افزا پالیسی تھی کیونکہ ترکی میں حکومتِ مذہبی کا عنصر عرصہ سے منافی ترقی ثابت ہو رہا تھا۔ اصلاح ترکی یعنی تنظیم کی پہلی زبردست کوشش اگر قطعی ناکام نہیں تو زیادہ تر غیر ملکی بیجا مداخلت کی وجہ سے قریبی مشرق کے عیسائیوں کو مسلسل مداخلت اور متواتر رخنہ اندازی یعنی اسلام پر باضابطہ نگہبانی کرنیکا عادی کر دیا گویا ان کو ترکوں کے خلاف پورے پورے اختیارات دیدیتا ہے بکنس فیلڈ کے خیال کے مطابق مسلمان کافی اہلیت رکھتے ہیں کہ موجودہ تہذیب کے ہر شعبے میں حصہ لے سکیں۔ جیسا کہ انہوں نے اپنی پیشرو زبردست تہذیبوں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر ہمیشہ ظاہر کر دیا۔ اُن کی خواہش تھی کہ ان کا ملک برادرانہ حیثیت سے مسلمانوں کی معاشرتی تعلیم کا محافظ اور کارکن رہے اور ان تمام تحریکوں کو اپنے قبضے میں رکھے جو ایک صدی سے مسلمانوں کے دماغوں میں ہیجان پیدا کر رہی ہیں۔ بدقسمتی سے انگلستان لارڈ بکنس فیلڈ کا مدعا نہ سمجھ سکا اور اُن خانگی مصیبتوں میں پھنس گیا جن میں گلیڈ اسٹون نے سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا گلیڈ اسٹون پر چونکہ عیسائی مذہب کا بہت گہرا اور یکطرفہ رنگ غالب تھا اس لئے سب جانتے ہیں کہ اُس کا اصلی اور سب سے بڑا مقصد ہی یہ تھا کہ اسلام کے خلاف حقارت کی اشاعت کرے۔ اس کے زہریلے اثرات کی وجہ سے برطانیہ عظمیٰ کی مشرقی پالیسی قطعی بدل گئی اور وہ بے جانے بوجھے اسلام کی ضد یعنی فی الواقع زاریت کی معین و حامی بن گئی۔ بجائے اس کے کہ عیسائیت اور اسلام کے مابین وہ ایک غیر جانبدار اور شفیق واسطہ ہو روز بروز زار کی طرف مائل ہوتی رہی جس کا مدعا ہی یہ تھا کہ دنیا کے نظام سیاسی میں سے ان مستحکم اور پائیدار قوتوں کو جواب تک اسلام کی محکوم ہیں نیست و نابود کر دے۔ جنگ کے بعد جب توسیع جرمنی کا خطرہ پیش نظر ہوا تو وحدت پان کی ماتحتی میں پہلی تحریک سیاسی نے جس کی تھوڑی بہت تائید کی وہی مہلک راستہ تھا جس پر انگلستان سر کے بل چل کھڑا ہوا اور جب ایک طرف ترکی ردِ عمل کی افواج عبدالحمید کے تحت میں تیار ہو گئیں اور اس طرح تمام یورپ کی متحدہ دشمنی کی آگ اسلام کے خلاف بھڑکا دی اور دوسری جانب جرمنی کا خوف انگلستان میں ہر دماغ پر آسیب کی طرح مسلط ہو گیا تو اس ملک کی پبلک زاریت کے مانوس خیالات کی عادی ہونے لگی اور ایڈورڈ ہفتم نے بہت سا خراجِ تحسین وصول کیا جب وہ نکلس ثانی سے ملنے کے لئے ریوَل گیا۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب ترکی نے سیاست یورپ کے تمام منصوبے پھر خاک میں ملا دئے انگلستان میں اس کی مقبولیت نے دفتر خارجی کو مجبور کیا کہ اپنے آپ کو بدل ڈالے اور ترکوں کی طرف سے ایک نیا حساب کھول دے ترک اب نہایت گرمجوشی کے ساتھ اپنے انگریز دوستوں کی جانب جھک پڑے کیونکہ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اُن کی نجات اب انگریزوں ہی کے ہاتھ میں ہے نہ کہ جرمنی کے جس نے تیس سال تک عبدالحمید کی حمایت کی اور اس کے صلے میں بہت سی بیجا رعایات زبردستی حاصل کر لیں۔ قسطنطنیہ میں نظام سلطنت قائم ہو جانے کے بعد برطانوی سفیر کا جس طرح خیر مقدم کیا گیا اس سے کافی روشن ہو جائیگا کہ ۱۹۰۸ء میں ترکوں کو کیا کیا امیدیں تھیں۔ یہ ہے وہ عجیب موقع جہاں ڈیوڈار کھارٹ کے خیالات کی خود بخود تصدیق ہو جاتی ہے۔ اتفاقات زمانہ نے انگلستان کے سامنے پھر ایک ہونہار مسلمان قوم کی دوستی پیش کر دی۔ اب موقع تھا کہ دنیا کو اس ہمہ گیر آتش سوزاں سے بچا لیا جاتا جو قریبی مشرق کے مسئلہ میں اندر ہی اندر شعلہ زن ہو رہی تھی یعنی مسلمانوں کو علم معیشت اور سیاست سے پورا پورا واقف کر دیا جاتا اور اُن تمام فرقوں میں مصالحت ہو جاتی جو ایشیا اور یورپ کی حدود پر ایک دوسرے کو پھاڑے ڈالتے تھے۔ یورپ کی بدقسمتی سے گلیڈ اسٹون کی پھونکی ہوئی پر تعصب روح اور تنگ نظری نے بکنس فیلڈ کی وسعت و رفعت خیال کو برطانوی سیاست میں منتقل کر دیا اور فرقہ بندیوں کے تغیر و تبدل نے گلیڈ اسٹون کے پیرووں پر یہ فرض عاید کر دیا کہ ترکی کی قومی تحریک سے اس نازک اور اہم موقع پر ہرگز بے تعلق نہ ہوں۔

ان اسباب کے زیر اثر متعدد اور مختلف النوع بلکہ اغراض کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں ۱۹۰۸ء کے انقلاب ترکی کی ناکامی لازمی تھی۔ سیاست یورپ نے ان سخت لغزشوں سے فائدہ اُٹھایا۔ جو کسی کار اصلاح یا انقلاب کے ساتھ ساتھ قریبی مشرق میں لازماً سرزد ہو جاتی ہیں۔ تاکہ وہ مستعدی کے ساتھ اپنی تخریبی حکمت عملی پھر حاصل کرے جو اس طول طویل اور شاندار تحمل سے بہت نمایاں طور پر ممتاز تھی جو وہ نظام خود مختاری کے متعلق ظاہر کرتا رہا۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء کا انقلاب ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان کی چٹانوں سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ترکوں کو جب سیاست مغربی میں کوئی قابل اعتماد سہارا نہ ملا تو ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء میں عراق عرب کی اصلاح کے متعلق برطانیہ کی اعانت حاصل کرنے کی لاحاصل کوشش کی اور مایوسی پر آنکھیں بند کر کے آغوش جرمنی میں جا گرے۔ بہرحال ہمیں ابتدائی کارروائیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ انگلستان کے بعض حلقوں میں جہاں اُن کے کچھ ایسے بہی خواہ موجود تھے جو عراق عرب کو از سر نو زندہ کرنے میں حصہ لینا چاہتے تھے ان کو یہ اعانت پیش کی گئی چنانچہ امور سلطنت کے متعلق بہتر سے بہتر انتظامی ملکہ رکھنے والوں اور صاحبان تنظیم نے جن کی قابلیت کا اظہار جنوبی افریقہ اور کنیڈا میں ہو چکا تھا اعلان کر دیا کہ ہم ترکی کے لئے عراق عرب کا از سر نو انضباط و تنظیم کرنے کے واسطے اسی عزم و استقلال کے ساتھ تیار ہیں جو ہماری قوم کی قوت کا جوہر ہے اور جس نے ہر بر اعظم میں ہماری قوم کو ممتاز کر رکھا ہے۔ یہ انگریز جن کو ڈیوڈار کھارٹ کی شریف روح غیر محسوس طریقے سے ابھار رہی تھی اور جنہوں نے اسلام کی قدیمی سرزمین کو خود غرضانہ حکومت خسروی کے محکوم کرنے کے بجائے تہذیب جدیدہ سے مالامال کرنے کے خیال پر نہایت گرمجوشی سے لبیک کہا تھا جنگ عظیم سے چند ماہ پیشتر دفتر خارجی میں ان کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے جا پہنچے۔ وہاں اُن کی کوئی ہمت افزائی نہ ہوئی۔ چنانچہ دنیائے اسلام اور سلطنت برطانیہ میں سمجھوتا ہو جانے کا یہ موقع بھی نکل گیا جس پر نہ صرف قریبی مشرق کے بلکہ ممکن ہے کہ تمام دنیا کے امن و امان کا انحصار تھا۔

۴

جب سے قریبی اور وسطی مشرق کی حکومت خلفائے بغداد و قاہرہ سے ترکوں کو ورثہ میں ملی ہے وہ ہمیشہ اسلام کے ہراول رہے ہیں مادر شروع ہی سے برابر بے تعصبی کی اس روح کے معتقد رہے ہیں جو اُن کو اپنے پیشروؤں سے ملی تھی۔ اُن کی سلطنت میں

نسلاً اس قدر غیر ملکی عناصر اور مرکزوں کا وجود ہی اس امر کی کافی دلیل ہے تنگ نظر قومیت اُن کی ایجاد نہیں۔ چنانچہ یورپ کو اور بھی زیادہ حیرت ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ ترکی نے خود اپنی پسماندہ حکومت ہی میں سے ایک قومی سلطنت قائم کرلی ہے۔ لیکن قومیت کا خیال تعلیم یورپ کا ایک منطقی نتیجہ ہے اگر ترک اس خیال سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں جس کے لئے پوری انیسویں صدی میں اُن پر برابر حملے ہوتے رہے تو یقیناً اسلام کی چند مصنوعی روایات کی بنا پر ان کو اب لعنت ملامت کرنا بہت بیجا ہوگا۔ اور وہ عین اس وقت جب وہ اپنے مذہب اور اپنی قوم کے خالص اور لطیف نصب العین پر فائز ہونے کے لئے اس قسم کی پابندیوں سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ترکی قومیت اس تعلیم کے عملی نتیجہ پر پہنچنے کی راہ پر ہے جو اُس نے یورپ سے حاصل کی ہے اور پھر بھی چاپلسٹا آف کلمین ۱۹۳۰ء کے زمانے سے جو زور اس پر ڈالا جا رہا تھا بجنسہ اس پر عمل درآمد کرنے کے صلے میں اس کو طعن تشنیع کرنے کا یہی موقع منتخب کیا گیا ہے۔ کیونکہ تنظیم کے زمانے سے مسلمانوں کی جماعتوں اور مرکزوں نے جو اساسی اصلاح حاصل کی اس کو جو فہرست سیاستی دی گئی وہ ان تمام کارروائیوں میں شامل ہے جو انگورہ میں ۱۹۲۲ء سے اب تک ہوئیں۔ اصلاح اسلام کے متعلق بہت ہی مختلف حلقوں میں کوشش کی جا چکی۔ فلسفۂ مذہب قانون، اخلاقیات میں ان کوششوں کا آغاز معتزلیوں سے ہوتا ہے جو گیارھویں صدی میں مسلمانوں کا آزاد خیال حقِ درست فرقہ تھا۔ اسلام قلب ہیئت کے عمل سے کبھی خالی نہیں رہا۔ لیکن مسلمانوں کے مختلف فرقوں نے جن اصلاحوں کی کوششیں کیں خواہ کتنی ہی پُرخلوص سہی وہ ایک دیرپا عملی نتیجہ پیدا کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ مذہبی عقائد کا تزکیہ قوم کی اصلاح اور مشرق کے بعض غیر مذہب گروہوں کے اخلاقی لب و لہجہ کا ارتفاع تمام حامیان رائے یا اخوت اسلامی کے ... اور وہ ... معتقدین کا واحد نصب العین تھا لیکن اسلام کا قدم ترقی کسی اور چیز کا بھی حاجتمند تھا۔ اسلامی مرکزوں کی اساسی اصلاح کو عالمگیر ہونے کا معمولی سا موقع بھی دینے کے لئے دو اہم شرطوں کی ضرورت تھی۔ اوّل یہ کہ اس پر عیسائیت کا دباؤ نہ پڑے۔ دوم یہ کہ مسلمانوں کی مضبوط، دین کی پکی، اور آزاد قوم خود اس کو انجام دے۔

آج ترکوں نے انہیں دو شرطوں کو پورا کر دیا ہے۔ اسلامی مرکزوں کی اصلاح صرف ایسی مسلمان قوم ہی سے ممکن ہے جس کا وقار پیروانِ رسولؐ کی نگاہوں میں قائم ہو اور جس کی آزادی کی ذمہ دار خود اسی کا زور بازو اور عزم بالجزم ہو سکے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام صرف اعتقادی اصول پر مبنی ہے اور اس لئے ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناموزوں سانچے میں ڈھلی ہوئی مقررہ روایات سے اسے آزاد کرنے کی ہر کوشش قابل ملامت ہے لیکن ایسے لوگ یہ امر نظرانداز کر دیتے ہیں کہ اسلام کو غیر متحرک بنانے والے تمام نظریے ہمیشہ بے بنیاد اور کمزور ثابت ہوئے ہیں اور خیالات کے تاریخی ہنگاموں نے دنیائے اسلام میں ہمیشہ ہلچل مچا دی ہے۔ قوانین اسلام جن کی اصلاح آج کل ترک جدید علم سیاست کے مطابق کر رہے ہیں۔ خود ان کے اعتقادی اصول کا نشان امتیازی خیالات یونان کی ایک جھلک ہے اور اس کے فلسفے میں جدید افلاطونی اور ہندوستانی تصورات شامل ہیں۔ ہمارے زمانے کے سب سے بڑے پروفیسر گولڈ زیہر نے اپنی مشہور تصنیف "درس ہائے اسلام" میں نہایت مدلل اور صاف طور پر اسلام کے مادۂ قبولیت کو ثابت کر دکھایا۔ گولڈ زیہر نے بتا دیا کہ اسلام نے اپنی صلاحیت اخذ و اکتساب اور عناصر خارجی سے بہرہ اندوز ہونے کی قابلیت اپنی تمام تاریخ میں واضح کر دی ... کا اعتقاد ہے کہ اسلام کو اُن اخلاقی کمزوریوں اور انجماد ذہنی کا ذمہ دار بنانا سراسر

زیادتی ہے جو یقیناً آب و ہوا اور رجحانات کے نتائج ہیں۔ اخلاقی نکتۂ نظر سے اسلام اب بھی ایک عالمگیر قوت ہے۔ جو صاحبان رائے کے تدبر و تفکر کا موضوع بننے کی پوری استعداد رکھتا ہے۔

لیکن اصول اسلام اور تاریخ اسلام کے مابین غیر محدود امکانات کے رنگ موجود ہیں اور اس کی آئندہ ترقی کا دار و مدار قطعاً اس رویہ پر ہے جو ترکی اس کی جانب اختیار کرے۔

مسلمانوں میں ترک از روئے فوقیت ایک سیاسی قوم ہے جب سے انھوں نے عربوں کو حکومت اسلامی سے برطرف کیا ہے وہ عرصۂ دراز تک نہایت کامیابی کے ساتھ مشرق اور مغرب کے درمیان واسطہ بنے رہے۔ جاپان سے کہیں پہلے ترکی نے تہذیب مغرب کے لئے ایشیا کے دروازے کھول دئے تھے۔ دونوں نصف کروں کو ان نسلوں کے ذریعے سے ملا کر جنہوں نے سلطنت عثمانیہ کو اس کے یوم تاسیس سے لیکر ... اپنی قرارگاہ بنا رکھا تھا۔ انسانی جدوجہد کے ہر شعبے میں وہ دونوں ممالک میں ایک عقد اتحاد بنا رہا۔

گولڈ زیہر جو سائنس میں مسلم الثبوت مانا جاتا ہے کہتا ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کا عظیم ترین ... اور عروج کمال دُنیائے اسلام کے محکوم حلقوں میں سے حنبلی تعصب کو روز بروز کامیابی کے ساتھ اکھاڑتا رہا اور حنفی اثر (جس کے پیرو ترک ہیں) اسی رفتار سے بڑھتا گیا۔

فتوحات عثمانی کے وقت عیسائی فرقوں کے لئے جو عضوی قوانین منظور کئے گئے وہ یقیناً اس امر کے ثبوت میں بہت کافی ہیں کہ مذہبی معاملات میں اُن کی بے تعصبی ضرب المثل ہونی چاہئے اور اس زمانے کے یورپین فرقوں سے کہیں زیادہ فوقیت رکھتی ہے۔

خود رسول خدا فرماتے ہیں کہ میری اُمت میں اختلاف رائے رحمت خدا کا ایک ظہور ہے۔ اس ارشاد کے بعد فرقہ بندی کا سوال بہت زور پکڑ گیا۔ ہجری کی ابتدائی صدیوں کے غور و خوض کا امتیاز خصوصی یہی آزاد خیالی تھی جو اصول مذہب کی تشریح میں روا رکھی جاتی تھی۔ سر ٹامس آرنلڈ کہتے ہیں کہ بادشاہوں اور عوام نے اکثر عالمان دین کے تعصب کو بُرا بھلا کہا ہے۔ قرآن پاک میں غیر مذہب کے لوگوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا انحصار خدائے واحد کے پہچاننے پر رکھا ہے۔ نبی برحقؐ فرماتے ہیں "اہل کتاب سے تم لوگ مباحثہ کرو تو انتہائی تہذیب کے ساتھ۔" پھر ارشاد ہوتا ہے "مذہب میں جبر و تشدد کو راہ نہ دو۔"

بے تعصبی کا یہ واضح ترین حکم ہے جو کلام ربانی کے لفظ بلفظ مطابق ہے۔ حضرتؐ نے نجران کے پادریوں، پیشوایانِ دین اور راہبوں کو ایک خط تحریر فرمایا جس میں وعدہ کیا کہ اُن کے معابد کی حفاظت کی جائے گی اور ان کے حقوق میں کسی قسم کی بیجا مداخلت یا خلل اندازی نہ ہونے پائے گی۔ بشرطیکہ وہ اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔ آنحضرتؐ نے مدینہ کے یہودیوں کو بھی اپنی عبادت کی اجازت دی یہاں تک کہ اُن کے دلی عناد نے اُن کو شہر بدر کر دیا اور ۱۰ھ میں ایک سفیر کو تبلیغ کے لئے یمن بھیجا تو ہدایت فرمائی کہ کسی یہودی پر اس کا مذہب چھڑانے کے لئے ہرگز جبر و تشدد نہ کرنا۔

جب حکومتِ عرب ایران تک پھیل گئی تو بیان کیا گیا کہ نبیؐ کا حکم یہ ہے کہ زردشت لوگوں سے بعینہ اہل کتاب سمجھ کر برتاؤ کیا جائے۔ ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ معتصم کے عہد حکومت ۸۳۳ء تا ۸۴۲ء میں ایک مسلمان سپہ سالار نے ایک امام اور ایک مؤذن کو دُرّے لگائے جانے کا حکم دیا کیونکہ انھوں نے سُغد میں ایک آتشکدہ مسمار کرکے اس کی جگہ ایک مسجد بنا دی تھی۔ دسویں صدی میں فتح ایران کے تین صدیوں بعد قریب قریب ہر صوبے میں آتشکدے پائے جاتے ہیں حتیٰ کہ مسلمانوں کی بے تعصبی کی وجہ سے مینکی[1] بھی ایک ...

[1] مینکی یا مینکیین ایران کے ایک بہت قدیم فرقے کا نام ہے جو اپنے بانی مینکیس کے نام سے موسوم، اور وجود دو اعلیٰ اصول یعنی خیر و شر کا قائل تھا۔ (مترجم)

فرقے کی حیثیت میں دسویں صدی کے اختتام تک قائم رہے اور مامون کے عہد میں نیرد نبجت نے جو اس فرقے کا پیشوا تھا بغداد میں علماء اسلام کے ساتھ علی الاعلان مناظرہ کیا

فتوحات اسلام کے بعد ہندوستان میں بھی حالانکہ اخیر زمانہ میں ہندوؤں کے بہت کافی مندر منہدم ہوگئے تھے۔ لیکن جن مسلمان حکمرانوں نے یہاں قیام کیا انہوں نے علی العموم عطیات فیاضی کو احترام کے ساتھ جاری رکھا جو اُن سے پہلے ہندو بادشاہ نے مذہبی تعمیروں کے لئے مقرر کئے تھے۔ ہندوستان کی موجودہ اسلامی ریاستیں مثلاً حیدرآباد اور بھاولپور اب تک اسی روش پر قائم ہیں۔ وہاں اب بھی برابر ہندوؤں کے مندروں کی بہت کافی مالی امداد کی جاتی ہے۔

۵

مشرق میں خام اشیاء کے مسئلے کے متعلق زبردست معاشرتی غرض ترکوں کو مجبور کر رہی ہے کہ اپنے مجلسی، قانونی، مالی، اور تمدنی مرکزوں اور اپنی زراعتی اور دیگر عام پیداوار کے ذرائع کی از سر نو تعمیر و تنظیم کریں یہی وہ اصلاح ہے جس کی بنا خود مصلحانِ انگورہ نے ڈالی ہے اُن کے افعال کا منشا پوری پوری طرح سمجھے بغیر تین ہزار میل کے فاصلہ سے اُن کے متعلق کوئی فیصلہ کر دینا صریحاً ہٹ دھرمی ہے کیونکہ جو لوگ اُن کو مورد الزام بناتے ہیں وہ باوجود ایک مستحکم جمی جمائی تہذیب کے اُن سے کہیں کم پیچیدہ اسباب کے زیر اثر فاش سے فاش غلطیوں کے مرتکب ہو چکے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔

اناطولیہ کے کاشتکار نکات دینیات قطعی نہ سمجھ سکے۔ ان کی حالت ذہنی کو ادراک کرنے اور مادۂ انسانی کا اندازہ لگانے کے لئے جو گویا مصطفےٰ کمال کے پردہ میں پوشیدہ ہے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس سے ملتی جلتی تاریخی حالتوں کی جانب توجہ کی جائے مثلاً اس حالت کی جانب جو کاسنرسی اسنر کو اور کوستھ نے پیدا کی اول الذکر کی تائید پولینڈ کے کاشتکاروں نے کی اور کوستھ کی ہنگری کے زراعت پیشہ لوگوں نے جو بین الاقوامی سیاسی میل سے قطعی بے بہرہ تھے اور دونوں آدمی اس میل کا شکار بن گئے۔ اس لئے یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ مصطفےٰ کمال جو تاریخ سے واقف ہے اور جس کے ملک نے ۱۸۷۶ء کے انقلابیہ مکہ کے اصول کا اعلان اسلام کے لئے کر دیا ہے ان جیسا انجام اپنے لئے پسند نہیں کرتا بلکہ واشنگٹن کے قدم بہ قدم چلنے کو ترجیح دیتا ہے انگورہ کی مجلس اعظم کے ممبروں نے اس کو خلافت پیش کی تو اُس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اعلان کر دیا کہ خلافت جمہوری سلطنت کے اصول میں شامل ہے

اسلام ترکی جس بات کا حاجتمند ہے وہ جدید تعلیم اور سائنس ہے اب اسے قدیم بے فیض کتبیت اور اس کی ذہنی زندگی کے متروک آئین سے رہائی حاصل کر لینی چاہیئے۔ جن لوگوں کی رائے ہے کہ تمام مسلمان اقوام میں ترک ذہنی اصلاح کی سب سے کم صلاحیت رکھتے ہیں وہ ایک ایسے مغالطہ میں پھنسے ہوئے ہیں جس کی اشاعت ہر جگہ اُن بے شمار مبلغین نے کی ہے جو وہ صدیوں سے زیادہ ورثۂ ترکی کے متمنی رہ چکے ہیں برخلاف اس کے اسلام میں صرف وہی ذہنیت آسانی سے قدیمی دینیات کے اصول ترک کر سکتی ہے اور اصلاح کا بیڑا اُٹھا سکتی ہے جو الہیات کے دقیق تصورات کی متحمل نہیں ہو سکتی جیسی کہ ترکوں کی نمایاں عملی ذہنیت بشرطیکہ ابتدائی کارروائیوں کے لئے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے ترکوں کا مفروضہ جوش مذہبی یورپ و رہائز نشاٹن کی ایجاد ہے کیونکہ بے تعصبی کی تعلیم سے کوئی اور قوم کبھی اتنی مایوس نہیں ہوئی جتنی قوم ترک جب اس کو موقع دیا گیا کہ ان ملاؤں کی پیروی چھوڑ دیں جو ترکی میں الہیات کے دقایق کی تلقین کرنے کو پہنچے تھے۔

ترکی کا جوش مذہبی ایک ناگہانی شے تھی جس کی ذمہ دار قوم ترک نہیں ہو سکتی حالانکہ اس کی تاریخ کے بہت سے خونین صفحے جو حقیقتاً سیاسی اور معاشرتی اسباب کا نتیجہ ہیں اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ ذرا اس قول کو یاد کیجئے جو تعصب یہود سے قومی اسباب کے متعلق ریناں جیسا شخص لکھ گیا۔

(ترجمہ)

ظہیر ایم اے (علیگ)

کشمکشِ حیات

۱۵

SAMI.K

یقیں کا جنون دشمن، سلاسل مانع جنبش، نہ رہ سکتا ہوں زنداں میں نہ جا سکتا ہوں زنداں سے

(عیاں بی اے میرٹھی مرحوم)

قدیم پجاریوں سے خطاب

(روانِ خلد آشیاں کے قلم سے)

برہمن۔ او سراپائے بتاں کے پوجنے والے
مسلماں۔ او خدائے دوجہاں کے پوجنے والے

عبادت گاہِ بند رسمِ دنیا اے معاذ اللہ
سنبھل او پردہ ہائے درمیاں کے پوجنے والے

خدا کے واسطے بیدار ہو۔ ہشیار ہو غافل
فریبِ کاوشِ سود و زیاں کے پوجنے والے

مبارک تیرے دل کو ہیبت حداد و آہنگر
طلسمِ بندشِ بندِ گراں کے پوجنے والے

جو ممکن ہو قفس کی تیلیوں سے درسِ عبرت لے
گلستاں کے فدائی آشیاں کے پوجنے والے

یہ صحنِ باغ یہ بادِ سموم و تند و زہر آلود
پرستارانِ گل بھی ہیں خزاں کے پوجنے والے

کہاں ہیں اپنی دنیا اپنے ہاتھوں جو بساتے ہیں
کہاں ہیں لذتِ دردِ نہاں کے پوجنے والے

کہاں ہیں جن کو راس آتی نہیں راحت زمانے کی
چمن بیزار برقِ آشیاں کے پوجنے والے

دیانت کیش راہ و رسمِ دنیا ساز کے دشمن
شہادت کوش تیغ خونفشاں کے پوجنے والے

یہی ہے دین تو قہرِ الٰہی کس کو کہتے ہیں
ارے او مذہبِ آتش فشاں کے پوجنے والے

ذرا سر در گریباں ہو کے دیکھ اپنی عبادت کو
بقائے اتحادِ جسم و جاں کے پوجنے والے

طریقت پر شریعت کی نہیں زیبا ہے قربانی
رہِ گم کردہ منزل کارواں کے پوجنے والے

یہ دنیائے خدا دشمن ہے یا دینِ خدا پرور
نظر لازم ہے نیرنگِ جہاں کے پوجنے والے

یہ شامِ آرزو کل صبحِ خوابِ مضطرب ہوگی
فریبِ کامیاب و کامراں کے پوجنے والے

ذرا ہشیار اے دلدادۂ ذوقِ تن آسانی
شہیدِ آرزو خوابِ گراں کے پوجنے والے

کسی دن دامنِ گلچیں کا بھی تو جائزہ لیتے
بہی خواہانِ گلشن باغباں کے پوجنے والے

چٹانیں ہیں چٹانیں جس کو موجِ آب سمجھا ہے
ارے کشتی کے غافل بادباں کے پوجنے والے

تو ہی بتخانہ بھی کعبہ بھی ہے اپنی پرستش کر
خدائی ہے نشاں او بے نشاں کے پوجنے والے

فنا کے راز کا جویا بقا کے راز سے غافل
تمنائے حیاتِ جاوداں کے پوجنے والے

وطن کا ذرہ ذرہ مایۂ نورِ حقیقت ہے
مکاں پر غور کر لے لامکاں کے پوجنے والے

مسیحی جین مسلم بودھ ہرجن۔ پارسی ہندو
زمیں پر رہنے والے آسماں کے پوجنے والے

میں اس دن کا تمنائی ہوں جب سب کی زباں پر ہو
کہ ہم ہندی ہیں اور ہندوستاں کے پوجنے والے

ہندوستان میں پریس یا اخبارات کی ترقی

(ڈاکٹر علامہ سید نجم الدین جعفری بار ایٹ لا)

"میرے محترم کرم فرما ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری بار ایٹ لا ڈائرکٹر پبلک انفارمیشن بیورو (گورنمنٹ آف انڈیا) نے باوجود اپنی انتہائی ذمہ دارانہ مصروفیت کے "ایشیا" کے لئے بطور خاص یہ مقالہ اہم عنایت فرمایا ہے، ہر چندکہ یہ کرم ستائش و تشکر کی منازل سے بلند ہے لیکن . . . "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر" ادارہ ایشیا آپ کی اس عنایت کا مل احترام محبت کے ساتھ شکر گزار ہے اور متوقع ہے کہ مستقبل میں اس سے زیادہ بارش لطف و کرم ہوگی۔

"ساغر (نظامی)"

ہندوستان میں پریس کی تاریخ کا آغاز مغلوں کے دور سے ہوتا ہے۔ دارالسلطنت اور تہذیب و تمدن کے دیگر مرکزوں میں محدود اشاعتوں کے قلمی اخبار ہوا کرتے تھے۔ وقائع نگار اور وقائع نویس بھی ہوتے تھے جو دربار اور عامتہ الخلائق دونوں میں تھوڑا بہت رسوخ رکھتے تھے۔ ان کا کام دوگونہ ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ مرکزی حکومت کو لوگوں کے رجحانات سے باخبر رکھتے تھے اور دوسری طرف پبلک کے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔ قلمی اخبار مغلوں کے زوال اور برطانوی راج کے استحکام کے بعد بھی جاری رہے۔ اس وقت کی اخباری دنیا میں عظیم الامراء اور مرزا علی بیگ مشہور شخصیتوں کے مالک تھے۔

پریس کی یہ صورت کہ وہ رائے عامّہ کا آئینہ دار بھی ہو اور عوام کا مشیر اور رہنما بھی، برطانوی حکومت کے ساتھ وجود میں آئی۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ پریس ہم تک اہل یورپ کے ذریعے پہنچا ہے پہلے آدمی جنہوں نے ۱۷۶۸ء میں یہاں پریس قائم کرنے کی کوشش کی مسٹر ولیم بولٹس تھے مگر وہ اپنی اسکیم میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد مسٹر جیمس آگسٹس ہکی نے ۱۷۸۰ء میں پہلا ہندوستانی اخبار بنگال گزٹ نکالا مگر چونکہ اس اخبار کے صفحات ذاتی تو تو میں میں اور پست مذاق کی چیزوں سے آلودہ ہونے لگے۔ اس لئے سپریم کورٹ نے اُسے بند کر دیا۔ اس کے بعد بھی اخبار نکلے ان میں اہم ترین انڈین گزٹ ہے۔

۱۷۹۹ء سے پہلے اخبارات کے ایڈیٹروں کے طرزِ عمل کی رہبری کرنے اور ان کو جائز حدود سے تجاوز نہ کرنے دینے کے لئے پریسیڈنسیوں میں کوئی ہموار اور مستحکم ضابطہ نہیں تھا۔ یہ کام گورنر کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد کلکتہ پریس کی بعض نامناسب حرکتوں کی بنا پر لارڈ ولزلی نے پریس پر سنسر بٹھایا اور پہلی مرتبہ لارڈ موصوف کو یہ خیال ہوا کہ سرکاری نقطۂ نگاہ عوام کے ذہن نشین کرنے کے لئے کوئی سرکاری آرگن ہونا چاہیے لیکن انگلینڈ کے کورٹ آف ڈائرکٹرز کی مخالفت کی وجہ سے وہ اپنی تجویز کو عملی صورت نہ دے سکے۔ ان کے جانشین لارڈ منٹو نے بھی کڑی نظر رکھی اور انہوں نے خصوصیت کے ساتھ اُن لوگوں کو تہدید کی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعتقادات کے سلسلے میں ایک دوسرے کو الزام دیتے رہتے تھے۔ خوش قسمتی سے لارڈ ہیسٹنگز کے زمانے میں ہندوستانی پریس کو ڈاکٹر جیمس برنس جیسا مشہور عالم نصیب ہوا جس کی شہرت تمام یورپ میں تھی۔ ڈاکٹر جیمس نے جو "ایشیاٹک مرر" کے ایڈیٹر اور منیجنگ پروپرائٹر تھے پریس کا لہجہ بلند کر دیا اور اس خدمت کے صلے میں اچھی شہرت حاصل کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنر جنرل تک نے ہندوستانی پریس کی حمایت کی۔ اس کڑے طرزِ عمل کی بنا پر جو مسٹر برائس نے اختیار کیا ان میں اور پریس کے سنسر مسٹر ایڈمز میں کچھ قیل و قال بھی ہوگئی مگر مسٹر برائس کا پانسہ زبر رہا۔ لارڈ ہیسٹنگز نے ۱۸۱۸ء میں سنسر شپ اٹھا دی اور اسی سال کلکتہ کے اخبارات کے ایڈیٹروں کی رہنمائی کے لئے چند ملتے جلتے قوانین بنا دئے یہ قوانین ۱۸۲۳ء تک قائم رہے۔ اس کے بعد ان کی جگہ اور قوانین نے لے لی ۱۸۱۸ء ہندوستانی پریس کی تاریخ میں بہت اہم سال ہے۔ اسی سال ہندوستان میں دیسی جرنلزم نے جنم لیا۔ سیرام پور کی بپٹسٹ مشنری نے ایک دیسی ہفتہ وار اخبار "دِگ درشن" جاری کیا۔ مشنری کے اس تجربے کو دیکھ کر کلکتہ کے اور لوگوں نے بھی دیسی زبان کے اخبار نکالے ان میں مشہور اور بارسوخ اخبارات کا جاری ہونا "سنگھاد کومودی" "سماچار چندر کا" "گنیان" "سنگھان راس پالم" اور "سنگھاد بھاسکر" تھے ان میں سے بیشتر مذہبی اور لٹریری تھے صرف چند ایک سیاسیات کو چھیڑتے تھے۔ بعض کٹر ہندوؤں کے آرگن تھے اور صرف عیسائیت کے اثرات کا رد کرنے کے لئے جاری کئے گئے تھے۔ بعض ترقی پسند جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور ہندو ازم کو مغربیت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ کلکتہ کے دیسی پریس نے ہندوؤں کو مغربیت کے عمدہ اثرات کے جذب کرنے کے ساتھ ہی ہندو سوسائٹی کو مستحکم رکھنے میں بڑی مدد دی۔ ان میں سے تاترا بھاد نبی جریرا ہمو سماج نے مشنری کے اثرات کو گھٹانے کے لئے نکالا تھا۔ عیسائیت کے خلاف جذبات پیدا کرنے میں بحیثیت مجموعی کامیاب ہوا اور اُس نے مشنری کا اثر بہت کچھ کم کر دیا۔ اسی سال کلکتہ جرنل جاری ہوا۔ اس کی بنیاد مسٹر بکنگھم نے رکھی، یہ آزاد اخبار تھا، دوسرے اخبار حکومت کے زیر اثر تھے۔ اس اخبار کو یورپین تجار کی سرپرستی حاصل تھی۔

۱۸۲۳ء میں مسٹر آدم قائم مقام گورنر جنرل نے اخباروں کی اشاعت کے سلسلے میں چند قاعدے بنانے کی ضرورت محسوس کی اور یہ قاعدے سپریم کورٹ نے منظور بھی کر لئے۔ مسٹر ایڈمز کے قواعد کی کچھ مخالفت ہوئی مگر وہ حتی الامکان قائم رہے اور لارڈ ایمہرسٹ کے وقت میں بھی نہیں بدلے بلکہ ۱۸۲۶ء میں لارڈ ایمہرسٹ نے تو افسروں کو پریس سے کوئی تعلق رکھنے ہی سے منع کر دیا۔

۱۷

لارڈ ولیم بنٹنک کے گورنر جنرل بن کر آنے تک پریس اپنی نرم رفتار سے چلتا رہا لارڈ بنٹنک نے پریس کو آزادی دیدی اور ان کے نظام حکومت کے ماتحت جرنلزم نے بڑی سُرعت سے ترقی کی ۱۸۲۸ء اور ۱۸۳۰ء میں آدھے بھتہ (half Batta) کے سوال پر بڑا ایجی ٹیشن ہوا اور سپاہیوں کے دُکھ درد بیان کرنے کے سلسلے میں اخبار کے کالم شر انگیز تحریروں سے پُر ہونے لگے۔ مگر لارڈ بنٹنک نے سوائے ایک دفعہ کے کبھی تعذیری کارروائی نہیں کی۔ گو کورٹ آف ڈائرکٹرز کی طرف سے انتظامی کارروائی پر اصرار ہوتا رہا۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ پریس کو اقتصادی حالات کی ابتری کے مضر اثرات سے دوچار ہونا پڑا گو گورنر جنرل نے کسی اخبار کو ایذا نہیں پہنچائی۔ اس ہمدردانہ طرزِ عمل سے کلکتہ کے باشندوں کی ہمت بڑھی اور انہوں نے

۱۸۳۵ء میں جون ایڈمز کے پریس ریگولیشن کو منسوخ کر دئے جانے کی درخواست کی منظوری ہو گئی اور سر چارلز مٹکاف نے اپنی کونسل کی متفقہ رائے کے ساتھ ہوم کے حکام کی مخالفت کے باوجود ریگولیشن کو منسوخ کر دیا۔

مٹکاف صاحب کے جانشین لارڈ آکلینڈ نے بھی اپنے پیشرو کی پالیسی پر عمل درآمد جاری رکھا۔ انہوں نے سرد موں کو پریس سے آزاد تعلق قائم کرنے کی اجازت دی گو فوجی افسران پر قدرے گرفت رکھی۔ لارڈ آکلینڈ کے زمانے میں ایک سرکاری آرگن نکالنے کا سوال پھر سامنے آیا مگر لارڈ موصوف نے اس کی ہمت افزائی نہیں کی کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اخبار صرف اخلاقی اثر کے بل پر چلنا چاہیے۔ لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ ڈلہوزی کے دوران حکومت کے تعلقات پریس کے ساتھ بہت خوشگوار رہے اور یہ خوشگواری جوں کی توں قائم رہتی اگر ۱۸۵۷ء کے غدر سے سوسائٹی اور حکومت کا توازن نہ بگڑ جاتا۔ غدر سے پہلے بمبئی اور کلکتہ کے دیسی اور انگریزی اخبارات میں ایک قسم کی توہین حکومت اور واقعات کو توڑ مروڑ کر بیان کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی بنا پر حکومت کو ۱۸۵۷ء کا گیگنگ ایکٹ جو کچھ عرصے کے لئے تھا پاس کرنا پڑا اور اس کے تحت میں ابتدا سے اخبارات بالخصوص دوربین سلطان الاخبار اور فرینڈ آف انڈیا کو تحدید کی گئی۔ اس ایکٹ کا ایک روشن پہلو یہ تھا یورپین اور دیسی اخبارات میں کوئی امتیاز نہیں کیا گیا۔ اس قانون کی رو سے سرکاری لائسنس کے بغیر چھاپہ خانہ چلانے کی ممانعت ہو گئی اور حکومت کو اختیار تھا کہ لائسنس دے یا منسوخ کر دے

لارڈ الگن کے زمانے میں جو لارڈ کیننگ کے جانشین تھے۔ پریس کی آزادی میں کوئی خلل نہیں آیا۔ ۱۸۶۷ء میں ۱۸۳۵ء کا قانون اٹھ گیا اور اس کی جگہ پریس اور رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ہو گیا۔ یہ حالت ۱۸۷۰ء تک قائم رہی۔ ۱۸۷۸ء میں یہ معلوم ہوا کہ دیسی پریس زیادہ مخالفانہ اور باغیانہ رویہ اختیار کرتا جاتا ہے لارڈ لٹن نے تمام صوبجاتی حکومتوں سے مشورہ طلب کیا اور انہوں نے یہ سفارش کی کہ دیسی اخبارات پر جنکے قارئین زیادہ تر جذباتی لوگ ہوتے ہیں مناسب قابو رکھنے کے لئے قانونی چارہ جوئی ناگزیر ہے۔ اس دیسی زبانوں کی مطبوعات پر گرفت رکھنے کیلئے ۱۸۷۸ء میں ایک قانون پاس کیا گیا۔ اس قانون نے پہلی مرتبہ انگریزی اور دیسی اخبارات میں امتیاز قائم کیا۔ مسٹر گلیڈ اسٹون نے انگلستان کے ایوان عام میں اس قانون پر بڑی لے دے کی اور ۱۸۸۰ء میں جب مارکوئس آف رپن گورنر جنرل ہوئے یہ قانون مسترد ہو گیا۔ لارڈ رپن نے پوسٹ آفس کو یہ اختیار دیدیا کہ وہ باغیانہ دیسی مطبوعات پر گرفت لینے کا مجاز ہے۔ اسی زمانے میں ڈپارٹمنٹ آف پریس کمشنر پر بھی نظر ثانی ہوئی کیونکہ اس کے اخراجات کو فضول سمجھا جاتا تھا جب لارڈ ڈفرن لارڈ رپن کے جانشین ہوئے تو انہوں نے اپنی مدبرانہ پالیسی سے ہندوستانی پریس کو جیت لیا۔ کیونکہ انہیں ایڈیٹروں کی اخلاقی قوت اور ان کے صدق پر بڑا بھروسہ تھا۔ انہوں نے تو یہاں تک کیا کہ معاملاتِ حکومت کے متعلق نمایاں ایڈیٹروں کو راز دارانہ گفتگو کرنے کی بھی اجازت دی۔

۱۸۸۹ء میں حکومت آفیشل سیکرٹ ایکٹ پاس کرنے پر مجبور ہوئی۔

انیسویں صدی کے اختتام پر بمبئی پریسیڈنسی میں پلیگ پھیلا۔ حکومت نے ۱۸۹۷ء اور ۱۸۹۸ء کے پلیگ ریگولیشن پاس کئے اور ان سے فسادات اور سیاسی جرائم جیسی سنجیدہ پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ چونکہ ورنیکلر پریس فرقہ دارانہ نفرت، تشدد پسندی کا ذمہ دار قرار پایا۔ اس کے خلاف کارروائی کی گئی۔ اس فوری صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ۱۸۹۸ء میں پینل کوڈ میں ایک نیا سیکشن ۱۵۳ الف داخل کیا گیا۔ انیسویں صدی کا باقی حصہ ہندوستانی پریس پر کوئی مزید پابندی دیکھے بغیر گزر گیا۔ جب کبھی کوئی فوری صورت حال پیدا ہوئی۔ اس کی روک تھام کے لئے کوئی قانون بنا دیا گیا اور جب سکون ہوا۔ وہ ترک کر دیا گیا۔

بیسویں صدی کا آغاز ایک زبردست سیاسی بے چینی سے ہوا جس کی تہ میں مختلف عناصر کام کر رہے تھے۔ بالخصوص جنگ روس و جاپان۔ اس عرصہ میں کلکتہ کے پریس نے یونا کے پریس کی نقل کرتے ہوئے حکومت کے خلاف سخت لہجہ اختیار کر لیا اور اس کے صفحات تشدد کی تعلیم دینے لگے۔ کیسری، وہاری اور یوگانتر کے کالم اس بات کا ثبوت ہیں کہ مذہب تک کو سیاسیات میں ملا دیا گیا تاکہ مذہبی اور جذبات پرست جماعتوں کو تشدد آمیز حرکات پر اکسایا جا سکے۔ حکومت نے مجبور ہو کر نیوز پیپر ایکٹ بابت ۱۹۰۸ء پاس کیا۔ اس قانون کی رو سے حکومت کو یہ اختیار دیا گیا کہ ان چھاپہ خانوں کو ضبط کرے جن میں بعض جرائم پر اکسانے والے اخبارات چھپیں۔ اس ایکٹ کی فوری وجہ مسٹر اور مسز کینیڈی کا قتل تھا۔ چونکہ تشدد روز بروز سخت ہوتا جاتا تھا اور ۱۹۰۸ء کا قانون حالات کے تدارک کو کافی نہیں تھا۔ اس لئے ۱۹۱۰ء کا پریس ایکٹ پاس ہوا۔ اس قانون کا مسودہ پیش کرتے وقت جو کچھ سرکاری ممبر نے کہا وہ قابل توجہ ہے۔ انہوں نے کہا۔

"یہ باتیں بعض اخبارات کی تعلیمات کا فطری اور معمولی نتیجہ ہیں۔ ان اخبارات نے وہ زمین تیار کی ہے جس پر آنی بیل پھول رہی ہے۔ انہوں نے بیج بودیا ہے اور اب یہ فصل کے ذمہ دار ہیں وجوہات کا سلسلہ بالکل صاف ہے۔ نہ صرف یہ کہ تشدد کا آغاز اس وقت سے ہوا جب پریس نے اپنا لہجہ بدلا، بلکہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ادھر بھڑکایا گیا اور ادھر کوئی نہ کوئی واردات ہوئی۔"

جب اس ایکٹ کی ضرورت ختم ہو گئی، پریس لا کمیٹی کی سفارش پر لارڈ ریڈنگ کے زمانے میں اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اس کی منسوخی پر چیمبر آف پرنسس نے یہ درخواست کی کہ پریس ایکٹ کی ضروری دفعات کے استرداد سے ہندوستانی ریاستوں کے لئے جو کمی ہو گئی اسے خاص تحفظ سے پورا کیا جائے چنانچہ ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی ریاستوں کو سازشوں سے بچانے کے لئے انڈین اسٹیٹس پروٹیکشن ایکٹ پاس ہوا۔ کیونکہ یہ خطرہ ہر روز بڑھتا جاتا تھا اور برطانوی ہند کی سرزمین پر سازشیں تیار کی جاتی تھیں۔

ہندوستانی پریس کے اس مختصر سے تاریخی جائزے سے ایک حد تک یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کس طرح پریس اس قدر وسعت پذیر ہوا اور کس طرح یہ ملک کے سیاسی ارتقاء میں ایک زندہ قوت بن گیا۔ اب پریس ملک کی ترقی پر بڑا زبردست اثر ڈال رہا ہے اور ہم دیگر ملکوں کے پریس سے مقابلہ کر کے اسے کچھ بہتر پاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم روس یا جرمنی جیسے ملکوں کے پریس سے اپنے ملک کے پریس کا مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی پریس کو کس بلند درجہ کی آزادی ملنے نصیب ہے۔ روس اور جرمنی میں اس وقت صرف وہی پریس باقی رہنے دیا جاتا ہے جو حکومت وقت کا ہم آواز ہو۔ بالخصوص روس میں جہاں کے متعلق ہم بہت کچھ سنتے رہتے ہیں پریس کو مطلق آزادی حاصل نہیں ہے کیونکہ وہاں سرکاری ادارہ "گلاولٹ" ہی سب سے بڑا سنسر اور ڈھاوا اور کوئی ذاتی پریس گلاولٹ کی مرضی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہندوستانی پریس کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات یہ ایسی روش پر جا پڑتا ہے جن سے تعصبات تمام ملک میں پھیل جاتے ہیں ملکی فضا میں جذب ہو کر ہندوستان کی جمہور پسندانہ اور قوم پرستانہ صلاحیتوں کو ضرر پہنچاتے ہیں۔ یہ عنصر ہماری ملکی زندگی پر بری طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ جمہوری اداروں کے رواج پانے کے لئے ایک روشن خیال رائے عامہ کا وجود ضروری ہے۔ کیونکہ رائے عامہ ہی کے بل پر جمہوریت چل سکتی ہے اور چونکہ رائے عامہ کا رہبر پریس ہے اس لئے ان لوگوں کا جو رائے عامہ پر اثر و نفوذ رکھتے ہیں یہ فرض ہے کہ وہ پریس کو جہاں تک ہو سکے ایماندار اور صحیح الخیال بنائے رکھیں۔ لارڈ برائس نے نے صحیح کہا ہے کہ بڑے ملکوں میں پریس ہی نے جمہوریت کو ممکن بنایا۔ فرقہ وار اخباروں کو بھی لارڈ برائس کی اس نصیحت کو گوش گزار کرنا چاہیے جو انہوں نے اپنی کتاب ماڈرن ڈیموکریسی

میں کی - وہ لکھتے ہیں :-

"ایک ایسا اخبار جو قوم کے ایک مخصوص فرقے کو خواہ وہ نسلی ہو، مذہبی ہو، یا صنعتی ہو خطاب کرتا ہے خطرناک ہوتا ہے اگر وہ اس فرقے کے سامنے صرف جماعتی زاویۂ نگاہ اور واقعات لائے اور اس مخصوص فرقے کی تکالیف کو مبالغے کے ساتھ پیش کرے اور اس فرقے کے باقی قوم سے علیحدگی اور مخالفت کے جذبات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرے ایک مخصوص علاقے میں یا کسی ایک جماعت کے افراد میں کسی ایک اخبار یا متعدد اخبارات کا جو ایک ہی شخص یا جماعت کے اثر میں ہوں ضرورت سے زیادہ اقتدار روشن خیال رائے عامہ

———— :(کی تخلیق کے لئے خطرہ ہے) ————

ترک و اختیار

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

قومی عصبیت کو ترک کردو

کہ یہی وہ زہریلا تخیل ہے جو دنیا کے امن کو پارہ پارہ کئے ہوئے ہے یہی ایک فرد کو دوسرے فرد کے حقوق کے غصب کی خطرناک رائے دیتی ہے اور یہی اس پُرکیف محبت کی فردوس سے دور رکھتی ہے جس میں حیاتِ جاوید کے نغمہ ریز آبشار ہیں۔ یہی وہ سانپن ہے جو دنیا میں سیاسی بے چینیوں کے اژدہے پیدا کرتی ہے اور یہی وہ ڈائین ہے جس نے اپنے پنجوں سے انسانی قلوب کو جکڑ رکھا ہے۔ اُٹھو اور تریاقِ محبت سے اس سانپن اور اس ڈائین کی زہریلی گرفت سے آزاد ہو جاؤ۔

اکتفا اور توکّل کو چھوڑ دو

کہ توکّل تکاہل اور سستی، قدرت کے اکرام سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کے تصور میں مست رہنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ توکّل اُس روحِ یقین کو کہتے ہیں جو عبد کو معبود کے علاوہ ہر ایک کی طرف سے بے نیاز کردے، توکل حجرہ نشینی اور گوشہ گیری کا نام نہیں، توکل نام ہے ایک مقدس بے نیازی کا، اور بے نیازی ایک مجاہد ہی کا اصول ہو سکتی ہے جو زندگی اور قوتِ بازو سے گہرا رابطہ رکھتا ہو۔

اکتفا - قدرت کی توہین ہے اور تسلیم غلامی کے لئے ایک پاکیزہ بہانہ ہے۔ خون کو سرد کرنے کے لئے ایک بجھا ہوا ابال ہے۔ ایک مٹا ہوا تصور ہے اور روح کو منفعل کرنے کے لئے ایک سیلاب کہی اکتفا اس کو نہیں کہتے کہ اگر کوئی ملک غلام ہے اور اس کے باشندے امن کی زندگی بسر کرتے ہیں تو اس کے باشندوں کو آزادی کی سعی نہیں کرنی چاہئے بلکہ اکتفا نام ہے فاسد مزاج کے مطالباتِ ناجائز سے دماغ و دل کو محفوظ رکھنے کا، حرص و آز کے تقاضات کو رد کردینے کا، خود آزاد اور دوسروں کو بھی ذی عزت اور آزاد رہنے دینے کا، اپنی پونجی کی حفاظت اور دوسرے کی جنس نقد کی طرف سے آنکھ بچا کر گزر جانے کا۔

ذی حیات موسم ہے اس لئے سنو کہ اکتفا جمود کا نام نہیں حرکت کا نام ہے۔ حرکت اور حرارت ہی زندگی ہے، اکتفا کاہلی ہے اور کاہلی ذلت ہے اور موت دنیا میں عزت و آزادی کی ضامن نہیں ہو سکتی، اس لئے جھوٹے توکل اور باطل اکتفا کو چھوڑ دو جو تم کو بازاری صوفیوں نے سکھایا ہے۔

انسانی اخوّت کو اختیار کرو

دُنیا کو ایک گھر، انسانی نسل کو ایک خاندان اور تمام قوموں کے افراد کو اپنا بھائی یقین کرو کہ قومیت ہو یا وطنیت، نسل ہو یا رنگ اس کی تعین قدرت نے نہیں کی ہے اور اگر تعین کرتی تو یورپ میں دو آنکھوں والے انسانوں کے بجائے چار آنکھوں والے آدمی پیدا کرتی۔ امریکہ میں ایک ٹانگ کا آدم ہوتا اور ہندوستان میں چار دست انسان، اسلئے سوچو اور اپنے نفس کی کدورتوں، خباثتوں اور تنگیوں کا محاسبہ کرو، یہ تمام طلسم، یہ ساری جادوگری اور یہ رنگ برنگ کے جال خود تمہارے ہی وضع کئے ہوئے ہیں۔

دُنیا کا امن سیاسی خود غرضی میں پوشیدہ نہیں بلکہ اخلاقی فراخدلی میں پنہاں ہے، عیسائیت ہو یا اسلام ہندوازم ہو یا کوئی اور مذہب جسقدر اخلاقی مذاہب ہیں ان کی اصلاح اور ان کا مقصد صرف امنِ انسانی کی بحالی و ترقی ہے۔ قومی عصبیت اخلاق کی بنیادی روح پر ایک ضرب کاری ہے اگر یہ ترک ہوگی تو انسانی روحانیت کا قلع قمع ہوجائیگا۔ انسان جس منزلِ ارتقا تک اس وقت تک پہنچا ہے اور خود اس کی سعی جس تمدن و تہذیب کے عظیم الشان درجہ پر لائی ہے اور جس دماغی و روحانی بلندی پر اس وقت وہ پرواز کر رہا ہے کیا وہ دُنیا و انسان کے لئے محض فریب و سراب ہے؟ اور اگر سراب نہیں ہے، تو پھر اپنے منصب کی روایات کو باقی رکھو

حجروں اور گوشوں کی دیواریں توڑ کر باہر نکل آؤ خدا تم کو حجروں کے اندر اور گوشوں کے اندر توکل کا صلہ نہیں دیگا حمق دینگے، اور آج دُنیا و انسان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ حمق سے فائدہ اُٹھانے والوں کو نیست و نابود کردو انسان کی خدائی میں توکل فنا کا دوسرا نام ہے اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو مجاہد بنو، زندگی نام ہے اضطراب و اشتعال کا، اگر گھر دل کے کونوں میں اس چنگاری کی طرح چھپے بیٹھے رہے جو الاؤ میں راکھ کو دبا دی جاتی ہے تو یاد رکھو صبح ہوتے ہی تم پر اوس پڑجائیگی لیکن اگر تم نے اپنے ہاتھوں کو شعلۂ عمل سے سلگا کر مشعل بنادیا تو تم خود اپنے رہبر بن جاؤ گے اور قسمت کی روشنی تمہاری رکاب بردار ہوگی، توکّل کی تعلیم اس وقت کی تعلیم ہے جب ادیب اور شعراء حکومتوں کے وظیفہ خوار ہوتے تھے اور اپنے ادب کے ذریعہ عوام کی روحِ احتجاج کو مفلوج کرنے والی اخلاقیات کا درس دیتے تھے۔ آج وہ زمانہ آگیا ہے کہ ہر شخص اپنا خود وظیفہ خوار ہے یہ وظیفہ تمہارے ہاتھوں کی جنبش ہی ادا کرسکتی ہے، خدا پر بھروسہ رکھو مگر اس یقین کے ساتھ کہ بغیر حرکت کے خدا تم کو ایک ذرہ نہیں دیگا۔ **اکتفا** - قدرت کے لطف و کرم کی توہین ہے اور اس کے دروازۂ فیض سے ہٹ جانے کے مترادف۔ اکتفا ترقی کے راستے مسدود کرتا ہے بے چینی ارتقاء کی ضامن ہے۔ ہر وقت فضاؤں میں شاہین صفت اُڑتے رہو اور عقاب نظر شکاری کی طرح طائرِ وقت کا شکار کرو۔ اور اگر تم ایسا نہیں کرسکتے تو ترکش جلا دو اور کمان ٹکڑے ٹکڑے کردو۔

ساغر نظامی

19

انگریزی گرجوں میں دستک دینے کی خاص گھنٹیاں

(از سید عنایت علی بی۔اے (علیگ))

انگلستان کے پرانے گرجوں میں اب بھی ایسی گھنٹیاں موجود ہیں جو محض مجرموں کیلئے مخصوص تھیں کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کی غرض سے گرجوں میں جب آتے تھے تو ان گھنٹیوں کے ذریعہ کلیسا کے راہب کو اطلاع دیتے تھے جو اپنے مراقبہ سے بیدار ہو کر گرجہ کے دروازہ کو کھولتا اور گناہگاروں کو کلیسا (choir) کے پاس لیجا کر اس کی چوکی (frith or peace stool) پر بٹھاتا۔ اگر ان کے پاس ہتیار ہوتے تو یہ گنہگار وہاں پہنچکر ان کو راہب کے سپرد کر دیتے۔ پھر اپنے جرموں کا اقبال و اعتراف کرتے۔ توبہ کرتے۔ مختلف قسمیں کھاتے داخلہ کی فیس ادا کرتے اور ایک سیاہ چغا پہنکر جس کی بائیں آستین پر سینٹ کیتھبرٹ (St cuth bert) کا صلیبی نشان ہوتا۔ ہمیشہ کے لئے کلیسا کی پناہ میں نہایت پُر امن زندگی گزارتے۔

کلیسائی گھنٹی
سینٹ گری گوری کے گرجہ واقع ناروچ میں

عیسائیوں کا بیان ہے کہ گرجہ میں وہ حصہ جسے کلیسا (choir) کہتے ہیں نہایت متبرک اور مقدس ہے اور جو شخص اس کی پناہ میں ہو وہ تمام آفات اور پاداشِ جرائم اور سزاؤں سے محفوظ ہوتا ہے چنانچہ اسی عقیدہ کو قائم رکھتے ہوئے انگلستان میں ۳۹۹ء میں گرجاؤں کی تقدیس کو حکومت نے تسلیم کر لیا۔ پھر بذریعہ قانون ۱۴۱۹ء گرجہ کے دروازہ سے پچاس قدم تک اس تقدیس کو وسعت دی گئی۔ بالآخر ۱۴۳۱ء میں گرجہ کے احاطہ تک یہ وسعت بڑھ گئی۔ اس احاطہ کے اندر اندر حکومت کے قوانین کا نفاذ اور ان کی عملدرآمد ناممکن ہو گئی تھی اور مجرم۔ ڈاکو۔ قاتل وہاں پہنچکر مامون و محفوظ ہو جاتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب انگلستان میں راہبوں کے دور دورے تھے اور راہبوں کی خانقاہوں پر بڑے بڑے شاہانِ انگلستان خمیدہ اور سرنگوں نظر آتے تھے۔

آل سینٹس کے گرجہ واقع یارک میں کلیسا کی گھنٹی

حقوق کلیسا پر سب سے پرانا قانون جو ہاتھ لگا ہے وہ سنہ ۶۰۰ء کا ہے۔ اس میں بالتفصیل گناہگاروں کے توبہ کرنے کے طریقے درج ہیں کہ کس طرح وہ کلیسا میں داخل ہوں۔ کس طرح اپنے گناہوں کا اقبال اور صحیح بیان راہب کے سامنے دیں اور پھر اپنے گناہوں سے توبہ کر کے کس طرح کلیسا کی پناہ میں آجائیں۔ کیا داخلہ کی فیس دیں اور بعد میں سیاہ لباس پہنکر کس طرح گرجہ میں پُر امن طریقہ سے ایک آزاد خادم کی زندگی بسر کریں۔

چونکہ اس طریقہ میں یہ خرابی تھی کہ جس نے جب چاہا اور جیسا کچھ چاہا سنگین سے سنگین جرم کر ڈالا اور گرجہ میں جا کر توبہ کر ڈالی۔ مگر اس سے لیے سنگین جرائم کی تعداد میں جو اضافہ ہوا وہ شاہ جیمس اول کے ۱۶۲۳ء کے قانون سے واضح ہوتا ہے۔ اس لئے اس کلیسائی تقدیس کا ۱۶۹۹ء کے قانون سے سدباب ہوا اور پھر ۱۷۲۳ء کے قانون نے اسے بالکل فنا کر ڈالا۔

ہیکس ہیم (Hexham) اور بیورلی (Beverley) کے گرجاؤں میں مندرجہ بالا

امن کی چوکیاں (Frith stools) اب بھی موجود ہیں

یہ کلیسائی دستک کی گھنٹیاں پارک کے آل سنٹس چرچ۔ ناروچ کے سینٹ گری گری چرچ اور ایڈل علاقہ لیڈز میں اس وقت بھی موجود ہیں۔ یہ تقریباً ایک سی وضع کی ہیں۔ ایک سُور کا مُنہ اور اُس کی گھنٹی پر راہب کی تصویر معہ اُس کے راہبی ٹوپے کے۔ اور زنجیر ہلانے والا کڑا ان دونوں اُبھرے ہوئے منہوں کے پیچھے۔ یہ گھنٹیاں ڈھلے ہوئے لوہے کی ہیں مگر ان کی ساخت اور کاریگری سے انگلستان کے قدیم فنِ آہنگری کا پتہ چلتا ہے۔

ایسی گھنٹیاں نہ صرف معبدوں اور گرجاؤں ہی میں استعمال ہوتی تھیں بلکہ ان کا رواج شہروں میں بڑی بڑی نجی اور سرکاری عمارتوں میں بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ انگلستان کے بڑے عجائب خانہ (British Museum) میں ایسی گھنٹیاں موجود ہیں۔ اور وکٹوریہ میوزیم لندن میں چودھویں صدی کی ایک گھنٹی موجود ہے۔ آکسفورڈ کی برینز نوز کالج میں جو ایک مشہور گھنٹی ہے اُس کو کالج نے ۱۸۸۸ء میں خریدا تھا اس کے متعلق ایک طول طویل داستاں ہے۔ یہ گھنٹی ابتدا میں ایک معمولی عمارت میں تھی۔

رائل ہسٹوریکل سوسائٹی کے ممبر مسٹر ارنسٹ مورس نے ان گھنٹیوں کے حالات اور تصاویر سوسائٹی ہذا کے لئے فراہم کئے ہیں۔

(ترجمہ)

برینز نوز کالج۔ آکسفورڈ میں یہ گھنٹی موجود ہے

محبت کی کرم فرمائیاں

بن نہ جائیں عشق کی رسوائیاں — شوقِ نافرماں تری خود رائیاں

بر خلافِ عشق، ہر تدبیرِ عشق — مل گئیں سب خاک میں دانائیاں

کس سے ہوتیں، گر نہ ہوتیں آپ سے — اِس قدر! اور اتنی! بے پروائیاں

مرحبا! اے شاہدِ حسنِ خیال — کِس نے دیکھی ہیں تری رعنائیاں

شبنم و گل، ماہ و نجم، ارض و سما — ایک ذات، اور سیکڑوں پرچھائیاں

اب وہ آئے اب وہ آئے اب وہ آئے — سب ہیں یہ دل کی خیال آرائیاں

خون رلوائیں گی نشتر! ایک دن
"یہ محبت کی کرم فرمائیاں"

"نشتر" سندیلوی

۲۱

جُرعاتِ خیال

(روحِ فریدہ سیّدہ زینب جنّت مکانی کے نام)

ساغر! تم نے افسانہ مانگا ہے گویا میرے پاس ——— کہانی کی مشین ہے کہ جب چاہا ڈھال لی، برادرانہ اصرار اور پُرخلوص محبت سے مجبور ہو کر چند بھولی بسری کہانیوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں، گل پوش شملہ میں "اُن کے" سوا کچھ یاد نہیں آتا۔ فقط تمہارا۔ فگار فرید

(۱)

موہنی! آج جب میں قدم قدم پر پھسل رہا ہوں، مجھ پر ہر طرف سے کمندیں پڑ رہی ہیں اور میں بچتے بچتے بھی گرفتار ہوا جاتا ہوں سنبھلتے سنبھلتے بھی پھسلا جاتا ہوں مجھے وہ تھرتھراتی ہوئی راتیں یاد آتی ہیں جب گہرتے ہوئے راستوں کے کنارے ہم پریت نگر کو بانہوں میں بانہیں ڈالے جایا کرتے تھے۔ جب تم ڈر ڈر کر اپنی پریت بھری آنکھوں کو میرے اوورکوٹ میں چھپا لیا کرتی تھیں۔ جب تمہارے کسی قدر چھلکتے ہوئے ہونٹ میری اُنگلیوں کے سہارے سنبھلتے تھے اور میں ڈگمگا جایا کرتا تھا۔ جب بازار کی لہراتی ہوئی روشنی زمین کو "انجمنستان" بنائے ہوتی تھی۔ جب دور گھاٹیوں میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ ہم کو غور و فکر میں ڈبو دیتے تھے۔ جب میں تمہارا ہاتھ کسی قدر دباتا تھا اور تم ڈری ہوئی ہنسی ہنس دیتی تھیں۔

آج جب ہر لمحہ ناگنوں کا نرغہ بن جاتا ہے۔ میں وہ پراگندہ راتیں یاد کرتا ہوں جب چندرما کی مدھ بھری فضا میں ہمارے دل ایک دوسرے کے پاس رہجایا کرتے تھے، دہکتی ہونٹوں سے پریم اور پریت کی جھنکاریاں اُٹھتی تھیں اور ہم دونوں اُنہیں اور بڑھا کر شعلہ کر دیتے تھے اور پھر چوموں کی روشنی میں جھلسے جھلسائے رخصت ہو جایا کرتے تھے ———

آج جب تم کوثر کی پھواریں نہا رہی ہو اور پریم کے گنگا جل میں مجھے ڈھونڈھتی پھرتی ہو، میں تم سے بہت دور ہوں، تم زمردیں محل میں حوروں کے نرغے میں "بالم مورے پردیس" کی براہ راگنی چھیڑ رہی ہو میں بے وفائی اور بے حیائی کے سیلاب میں بہا جا رہا ہوں۔ ایک رہنما تنکا بھی ہاتھ نہیں آتا کہ کہیں تو ساحل سے جا لگوں ———

آج تمہارے پریتم کا خون برف ہو رہا ہے صرف پرانی یاد کی چنگاریوں کی حرارت میں وہ جی رہا ہے مگر یہ کب تک ——— کیا ہمارے جذبات کی گہرائیوں پر بھی خزاں کے جھونکے بہہ گئے ہیں؟

وعدوں کی یاد پر کہر سا چھا رہا ہے، وفا کے معاہدوں پر دُنیا کا حسن اور رومان غالب آ رہا ہے تصورات کے سہارے ہیں مگر ان میں ناگین لپٹی ہوئی ہیں ———

میں سنسناتی ہوئی راتوں میں تمہارے لئے بڑبڑایا کرتا ہوں بھول بھول کر تمہیں یاد کرتا ہوں۔ کبھی دل کو بہلانے کے لئے تمہارے پریت نگر کی یاترا کیلئے اُٹھنا چاہتا ہوں مگر دزدیدہ نگاہوں کے گرداب میں گھِر کر اُٹھتے ہی رہجاتا ہوں۔ دوست منہ چھپا چھپا کر ہنستے ہیں مگر وہی مجھے گناہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں جس سے صرف گاہے گاہے تمہاری یاد کی ایک ہلکی سی جھرجھری بچا دیتی ہے۔

وقت خوابوں کی تعمیر کی ہوئی فلک پیما عمارت کو توڑ ڈالتا ہے، مسمار کر دیتا ہے، اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے ——— وقت دیوی دیوتا دونوں کے بتوں کو مٹی میں ملا دیتا ہے، خواہشیں ویران ہو جاتی ہیں اور آرزوئیں سنسان۔ صرف پریم اور پریت جاودی ہیں باقی رہتے ہیں۔ اپنی طلسماتی شمع کی روشنی میں برابر آگے ہی بڑھتے رہتے ہیں گلاب مسل جاتا ہے لیکن اُس کی خوشبو دماغ میں بسی رہتی ہے۔

(۲)

سندری! میں ہمالیہ کی چوٹیوں سے تمہیں دیکھ رہا تھا جب تم موت کے رتھ پر پریت نگر کی طرف اُڑی جا رہی تھیں مگر میں بے بس تھا! یہ نہ سمجھنا کہ ہلاکت آفرین فضا نے مجھے تمہارے پاس پہنچنے سے روک دیا یا آسمانی غصہ کے خوفناک لپکے سے میں ڈر گیا۔ میں اس آتی ہوئی گھڑی کے خوفناک ارادوں سے بے خبر بھی نہیں تھا ——— میں دیکھتا تھا کہ آسمان پر عروس کے وداعی خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سارا آسمان آباد اپنے ڈینے پھڑپھڑا رہا ہے۔ آخری سانس لیتا ہوا مغرب دم توڑ رہا ہے، مشرق تباہی کے امواج صوتی کے ساتھ چلا آ رہا ہے ——— میں نے موت کے رتھ کا سفید لہراتا ہوا پرچم بھی دیکھ لیا تھا مجھے معلوم تھا کہ رتھ فضا کے کھمبے میں اٹک چکا ہے اور طوفانی سفر کے لئے بادلوں کے گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی ہو چکی ہیں، لہروں نے ہمارے اپنے چندرما کی تڑپ اور فطری تکلیف کو مچل مچل کر ظاہر کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور سدا بہار تارے پیلے پڑ گئے ہیں ——— میں خواب سے بیدار ہو چکا تھا اور تم کو اپنی آغوش کی پناہ میں لے لینے کے لئے ایک عجیب و غریب کالا چاند میری آرزو کے گہوارے کے قریب دھیرے دھیرے تیرتا ہوا آ رہا تھا اور وہ میرے ساحل تک پہنچنے کے لئے اس قدر بضد تھا کہ میری ذرا سی لغزش میں اُس کی کشتیٔ حیات پتھریلے ساحل سے ٹکرا جاتی اور انجام اس سے زیادہ خوفناک ہوتا ——— اب تم ٹکٹکی سے وقت کے نامعلوم جزیرے میں رہو میں غیر فانی ساحل کے لئے روانہ ہو چکا ہوں تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا لیکن اس کے لئے مجھے بھی اپنے جسم کے امرت کو اچھی طرح نچوڑنا ہے زندگی کے مصنوعی روغن کو اچھی طرح دھونا ہے، جب میں دُنیاوی قانون کے ماتحت اچھی طرح

پاک صاف ہو جاؤں گا۔ پریت نگر کے مندر میں ہمارا تمہارا ملاپ ہو جائیگا اُس وقت ہماری روحیں ملکر ایک ہو جائیں گی ———

(۳)

کامنی! پریم کی وہ ایک مدھ بھری رات تمہیں یاد ہے جب ہم چونک کر ایک دوسرے سے ملے آکاش سے دھرتی پر پریم کے پھولوں کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ تم کیسی سُندر معلوم ہو رہی تھیں۔ میں باہر سے آیا تھا۔ میری ماتا جی بھی ساتھ تھیں۔ تم نے کیا سب کی نظریں بچا کر مجھ پر اپنے پریم کا امرت چھڑکا، اُف کیسی نشیلی خوشبو تھی، میں بیخود ہو گیا تھا تم نے مجھے پریت کی جونہی چھڑی ماری مجھے ہوش آگیا ——— پھر ہانپتے ہوئے آسمان کے نیچے ہمارے پریم کی وہ لمبی لمبی پینگیں، میں نے تمہارے لہراتے بالوں کی اندھیری مست خوشبو لی تھی اور تمہاری جھلکتی ہوئی آنکھوں میں کرم کا نہان کر لیا تھا۔ تم نے مجھے پریم اور پیار کی دھیمی تھپکیوں میں کتنی نیندیں سلائی تھیں اور اُن ابلتے ہوئے گھنٹوں میں دنیا کیسی مدہوش ہو جاتی تھی جبکہ ہم دونوں رخساروں کے سہارے سماج کی چیرہ دستیوں کے انکار میں کھوئے سے رہتے تھے ——— جھڑی ہوئی پتیوں ٹوٹے ہوئے پھولوں اور بکی ہوئی خوشبو کے سایے تلے ہم ہچکیاں لیتے ہوئے چاند کو پیلے ہو ہو کر دیکھا کرتے تھے اور آخر کبھی کبھی اکتا کر پیوست لبوں کی مٹھاس سے درد کی چیخوں کو بھلا لیا کرتے تھے ——— یہاں تک کہ ہماری پرسکون ریاضتیں اور وقت وقت کی ستیہ گرہ کام آئی اور سماج اور دنیا کی نظروں میں بھی ہم ایک دوسرے کے ہو گئے ——— مگر پھر ایک دن بدبختی کا پتھر آسمان کی چھائی ہوئی چھت میں سے کھسکا اور تم پر گرا، اُس وقت میں تم سے بہت دور ہمالیہ کی چوٹیوں پر مستقبل کا قلعہ تعمیر کر رہا تھا ——— جب تمہیں تلاش کرنے پہنچا تو تم "اللہ آباد" سے بھی اوجھل ہو چکی تھیں اور اب میں تم کو وہاں دیکھتا ہوں جہاں میری جگہ نہیں ——— مگر اب میں نے بغاوت کر دی ہے، ہر چیز سے بغاوت کر دی ہے

انتقام کی پیاس بجھتے ہی مجھے یقین ہے کہ دروازے کھل جائیں گے اور میں ایک بار پھر تمہارا ہو جاؤں گا۔ تم روحانیت کے زرتار لباس میں ملبوس کر دی گئی ہو، مجھے ابھی جسمانی کیچلی ہی آتارنی ہے ———

(۴)

پیاری! میں وقت کا منتظر ہوں، میری روح تمہارے لئے انتظار کر رہی ہے مگر جس طرح تمہارا جسم فنا ہو چکا اور روح ہی روح رہ گئی اسی طرح جب تک کہ میرا جسم بھی فنا نہیں ہو جاتا اور صرف روح نہیں باقی رہ جاتی میں تم سے بہت دور ہوں، بہت دور!

میری روح وقت کا انتظار کر رہی ہے، طوفان، برف آندھی اور بارش کی بھی اسے پرواہ نہیں اُسے وقت کا انتظار ہے اور اسی کی دُھن ہے

یہ امتحان کا وقت ہے، میری روح نے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری روح سے جدا نہیں ہوگی، میری روح بے وفا نہیں ہے، وہ وعدہ پر قائم ہے وہ صرف تمہارے خیال میں سرگرداں رہتی ہے وہ تم سے جدا نہیں ہوگی۔ تمہارے جسم نے بے وفائی کی، میرا جسم بہت دن رویا کیا، اب میں بہت روکتا ہوں، کبھی کبھی مان جاتا ہے، گھبراؤ نہیں وقت قریب ہے بہت قریب!! تم پریت نگر کی نغمہ ریز فضا میں اپنے پریم کی بانسری بجاتی رہو، میں آپہنچونگا ——— میں آپہنچوں گا۔

موسم سرما سیٹی بجا رہا ہے، اور راتیں غصیلی ہوتی جا رہی ہیں۔ تم جب سے گئی ہو جھلک دکھانے کبھی نہیں آئیں، مجھے یقین ہے کہ تم نہ آؤ گی ——— مگر میں اپنی روانگی کا وقت آنے تک بلبلاتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ تمہارا انتظار کرتا ہی رہوں گا!!

فرید مچھلی شہری،

میرا پیام

(جرعاتِ خیال کے فرید کے لئے چند گھونٹ)

ہے جو سوزِ یک نفس، سازِ تمام ہے یہی — نغمۂ صبح ہے یہی نالۂ شام ہے یہی
موت جہانِ عشق میں اک شدید کفر ہے — اے دلِ نا اُمید حسن جذبۂ خام ہے یہی
میرے لبِ خموش پر حسن کو حیرتیں ہیں کیوں؟ — کہدے کوئی کہ عشق کا طرزِ کلام ہے یہی
منکرِ حشر ایک دن حشر کو مان جائیں گے — حسنِ ملیح کا اگر طرزِ خرام ہے یہی
ذکرِ رہائی پر مرے اہلِ قفس پکار اُٹھے — اس کو رہا نہ کیجئے حاصلِ دام ہے یہی
خونِ حیات نذر دے لعبتِ نوبہار کو — بلبلِ نغمہ ریز کو گُل کا پیام ہے یہی
حبِ چمن سے مست ہو کیفِ وطن سے مست ہو — موسمِ نوبہار میں میرا پیام ہے یہی

جام بدست رقص میں بیخود و مست رقص میں
ساغرِ مست زندہ باد، گردشِ جام ہے یہی

گرم و ستیزہ کار ہے مولوی فساد خو — پہلے اسے تمام کر شترِ تمام ہے یہی

ساغر نظامی

جیونی

سیدا گھر میں پاؤں رکھنا تھا کہ کاکا نے ایک لاانتہائی گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ میری کامیابی، میری تندرستی، چھوٹی بہن کی شادی کی فکر، میسور کی حالت وغیرہ وغیرہ غرضیکہ وہ کونسا ذکر تھا کہ نہ کیا گیا ہو اور میری یہ حالت تھی کہ ہمہ تن گوش تھا مگر حقیقتاً یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ وہ کہہ کیا رہی، میں البتہ کبھی کبھی ہاں ہوں ضرور کر دیتا تھا۔ میں تو اس وقت گرما گرم چائے کی چسکیاں لے رہا تھا جو دس میل کے طویل سفر کے بعد بالکل امرت معلوم ہوتی تھی۔ سفر کی طوالت کا اس طرح اندازہ کیجئے کہ مجھکو بائیسکل کی شکستہ، درگرد آلود سڑک پر دس میل بائیسکل پر چلنا پڑا تھا۔ اس بائیسکل پر جس میں سے چرخ چوں چرچر کی مختلف الصوت آوازیں نکل کر انقباض طبع اور دل کی پراگندگی کا سامان مہیا کرنے میں مصروف کار تھیں۔ کرتے داد کی طویل جدائی کے بعد گھر کے اندر ایسا سکون محسوس ہوا کہ بس سو جانے کو جی چاہتا تھا چنانچہ نیم غنودگی کی سی حالت میں میں کاکا کی باتیں سنتا رہا۔ دل جی ہی چاہتا تھا کہ کاکا چلی جائیں اور میں نیند میں دنیا و مافیہا سے کھو جاؤں۔ پیالی ختم کرنے کے بعد میں نے ان سے دوسری پیالی کی درخواست کی کیونکہ اول تو تنہائی کا بہانہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا دوسرے واقعہ یہ بھی تھا کہ چائے کی خواہش باقی تھی ان کے چلے جانے کے بعد میں اپنے ہاتھ کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور سکون کی ایک پر مسرت موج تمام جسم میں دوڑ گئی کچھ غنودگی بھی طاری ہو گئی۔ یکایک نیم بیداری کی حالت میں میں نے اپنے عقب میں آہستہ سے دروازہ کھلتا ہوا محسوس کیا جو مکمل طور پر نہیں کھولا گیا تھا۔ میں چپ چاپ لیٹا رہا میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص دروازہ میں کھڑا ہے اور اندر آتے ہوئے ڈرتا ہے میں نے اپنا ہاتھ سر کے نیچے سے سرکایا اور پاؤں بھی فرش پر آہستہ سے پھیلایا اور کچھ بڑبڑایا بھی کروٹ بھی لی دروازہ پھر کچھ بند ہوا اور وہی شخص واپس ہوتا ہوا معلوم ہوا ——— گیا

میں نے دل میں خیال کیا اور اس خیال سے کہ میں نے کسی ہمسایہ کو جو غالباً میری آمد کی خبر سنکر مجھ سے ملنے آیا تھا واپس بھیجدیا کچھ تکلیف سی محسوس کی لیکن کوئی اندر سے کہہ رہا تھا کہ نہیں ابھی یہ گوشت پوست کا مجسمہ موجود ہے باہر پتھریلی زمین پر گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ اور کوؤں کی کائیں کائیں نے ایک بلاخیز طوفان اٹھا رکھا تھا۔ دروازہ سے سورج کی چند کرنیں اندر آکر مجھ کو آرام پہنچانے میں مشغول تھیں کہ کاکا چائے لیکر اور میرے قریب کھڑے ہوکر آہستہ سے بولیں رمّو بھیا سو گئے!؟ میں نے اپنے سر کو دروازہ کے جانب حرکت دیتے ہوئے کہا جاگ رہا ہوں دروازہ اب مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔

"کاکا" میں نے کہا "دروازہ میں کوئی آدمی کھڑا تھا!"

کب۔ انہوں نے بلند آواز میں دریافت کیا۔

ابھی کوئی ایک سیکنڈ ہوا۔

انہوں نے دروازہ میں سے جھانککر دیکھا کچھ مسکرائیں اور پکارنے لگیں جیونی! بندریا! اندر کیوں نہیں آتی۔ بھیا تم کیا سمجھ رہے تھے؟ رام جانے کون ہے؟ اور یہ کہکر ایک قہقہہ لگایا یہاں تک کہ اُن کے آنسو نکل آئے ایک نحیف آواز میں یہ الفاظ ادا کیے گئے۔

جی ماتا جی۔ جی ہاں میں اندر آنا چاہتی تھی مگر بابو جی کو سوتا دیکھکر میں یہاں رُک گئی۔ یہ الفاظ دیہاتی لہجہ میں ادا کئے گئے تھے۔

کاکا نے حکم دیا اندر آجاؤ

جیونی آہستہ سے دروازہ تک آکر رُک گئی اور مجھ کو اس طرح سے دیکھنے لگی کہ میں کوئی دلی یا مہاتما ہوں۔

کاکا نے پھر کہا ڈرو مت اندر آجاؤ

جیونی اندر داخل ہوئی اس انداز میں گویا کہ مندر میں داخل ہو رہی ہے اور دور ہی ایک چاول کی بوری کے پاس کھڑی ہوگئی۔

کاکا میرے قریب فخر اور بہجت کے انداز میں بیٹھی تھیں۔ ان کی تمام تر محبت میری ذات سے وابستہ تھی انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا رمّو۔ جیونی ہماری نئی نوکرنی ہے اب میں نے جیونی کو دیکھا جس نے شرماکر سر جھکا لیا۔ اس کی عمر ۴۰ سے تجاوز کر چکی تھی چہرہ پر کہیں کہیں جھریاں پڑ گئی تھیں مگر آنکھوں میں عجیب چمک باقی تھی۔ اس کے بال سفید ہو چلے تھے اور لٹکی ہوئی چھاتیاں قمیص سے ناآشنا تھیں۔ کشادہ پیشانی سے بیوگی اور غم کے آثار نمایاں تھے۔

جیونی قریب آؤ میں نے کہا۔

نہیں بابو جی۔

نہیں آگے آؤ میں نے پھر اصرار کیا۔

کاکا چلائیں۔ جیونی یہاں قریب سے آکر دیکھ میرا بھیا کیسا سندر ہے۔ کیا قیامت کا افتخار تھا جس نے میری بھدی ناک اور موٹے لبوں کا تصور دماغ میں پھر تازہ کر دیا۔ ہجو ملیح کا نہایت حسین انداز تھا۔

جیونی چند قدم اور رینگی۔

بندریا آگے کیوں نہیں آتی کاکا نے ترشی سے کہا۔

جیونی چند قدم اور آگے بڑھی اور گردن جھکا کر ایک نئی دلہن کی طرح کھڑی ہو گئی۔

کاکا کہنے لگیں دیکھ جیونی میرا بھیا بالکل شہزادہ معلوم ہوتا ہے

"دیوتا" جیونی بولی

مجھ کو ہنسی آگئی اور چائے پینے میں مشغول ہو گیا۔

جیونی نے آہستہ سے کہا تمام گاؤں بابو جی کے راگ الاپ رہا ہے

تجھے کیسے معلوم کاکا نے پوچھا!

کیسے میں تیسرے پہر کو آ گئی تھی مجھے بابو جی کے آنے کا حال معلوم تھا آپ نے کہا تھا کہ وہ بالکل شہزادے معلوم ہوتے ہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ بائیسکل پر سوار ہوں گے۔ جب بابو جی

اس پیپل کے نیچے پہنچے جس میں رسّی کا پھندا ڈالکر اس موئے مچھیرے کودوں نے پھانسی لگالی تھی تو میں نے دیکھا کہ سب آدمی بابوجی کو دیکھ رہے ہیں اور وہ مجھ سے پوچھنے لگے یہ کون ہیں میں نے جواب دیا نائب صاحب کے سالے ہیں اور کون ہوتے۔ موٹے لالہ ننکو بولے کیسے سندر ہیں۔ بیوی کہنے لگی شہزادے ہیں شہزادے۔ میرے پاس ہی ڈنکا نائی کی بیوی کہنے لگی نہیں دیوتا ہیں "دیوتا"

رمّو دیکھا تمام قصبہ میں تمہاری خوبصورتی کی شہرت ہو چکی ہے اب تم ذرا احتیاط سے کام لینا اس قصبہ میں جادوگر بہت رہتے ہیں جو خوبصورت بچوں کو جانور بنا کر مار ڈالتے ہیں مجھکو ہنسی آگئی۔

بابوجی ہنسو نہیں میں نے اپنی ان آنکھوں سے خود سینکڑوں جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے بھوت دیکھے ہیں جو سب کے سب جادو کے زور سے مارے گئے تھے جادو کے زور سے بابوجی جیونی نے اول مرتبہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا بابوجی دن چھپنے کے بعد تم جنگل میں کبھی نہ جانا کیونکہ اس وقت بھوت پریت نکلتے ہیں اور خاصکر گیا آنے کے بعد تال پر تو بھولکر بھی نہ جانا وہاں بھوت بہت رہتے ہیں

میں نے تعجب سے پوچھا تم کو کیسے معلوم ہوا

کیسے؟ میں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا ہے رنگی کمہار کی بیوی نے صدموں سے تنگ آکر ایک رات اسی تال میں ڈوب کر خودکشی کر لی تھی۔ ابھی کچھ دن ہوئے میں رات کو اندھیرے میں اسی تال کے پاس سے گزر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ رنگی کی بیوی اپنے بال بکھیرے اور سفید ساری باندھے میرے سامنے کھڑی ہے میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی اور رونے لگی وہ بھاگ کر درخت کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ اور عجیب بھیانک آواز میں چلّانے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ پل پر کھڑی تھی اور یہ کہتی ہوئی پانی میں کود پڑی۔ میری بچی مر گئی۔ میرا بچہ مر گیا اب میں بھی مرنے جا رہی ہوں۔

کاکا کانپ گئیں وہ بھوتوں سے نہایت خوفزدہ ہو جاتی تھیں اور غصہ سے بولیں گدھی چپ کیوں نہیں رہتی میں نے ہزار دفعہ منع کیا ہے کہ یہ قصے نہ بیان کیا کر۔

ماتاجی معاف کرو (گلطی) غلطی ہوگئی۔

میں سیکڑوں دفعہ معاف کر چکی ہوں مگر تو ان قصوں کے کہنے سے باز نہیں آتی گویا اُن پڑھ رہی ہے۔ تو خود جا کر تال میں ڈوب کر بھوت کیوں نہیں بن جاتی۔ کاکا غصہ سے بیتاب تھیں۔ جیونی نے خوف اور لحاظ سے سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر کے بعد بولی آپ کے بھیا کیسے سندر ہیں؟

میں نے نہیں کہا تھا کہ میرا بھائی شہزادہ معلوم ہوتا ہے اور کسے معلوم ہے ممکن ہے اس کے جسم میں کسی دیوتا نے جنم لیا ہو۔ کاکا نے نہایت فخریہ انداز میں کہا۔

کاکا خدا کے لئے رحم کرو۔

میں نے جوش محبت سے ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

کاکا تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں اس خوفناک قصبہ میں میں بغیر جیونی کے کیونکر زندگی گزارتی

اور ماتاجی بنا آپکے میں تو زندہ بھی کیسے رہتی جیونی نے کہا اسکی آواز میں گیت کا ترنم تھا۔

یہ کمبخت قصبہ کیا ہے گاؤں سے بدتر چیزیں ملنا دشوار ہیں۔ اور "وہ" (بحیثیت ایک ہندوستانی بیوی کے کاکا اپنے شوہر کا نام نہیں لے سکتیں تھیں) اکثر تقاوی کی تحصیلابی

کے سلسلہ میں گھر سے باہر رہتے ہیں گاؤں میں تو کم مگر ایک دوسرے سے بہت فاصلہ پر واقع ہیں اکثر ہفتوں گھر کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوتی اور اگر جیونی میرے پاس نہ ہوتی تو میرا خوف و دہشت سے دم ہی نکل جاتا۔ کاکا کی آواز کچھ بھرآئی ہوئی معلوم ہوتی تھی رمّو تم مرد ہمارے کامنا اور وشواس سمجھنے سے بالکل قاصر ہو اب جیونی باوجود نوکرانی ہونے کے بھی مجھکو یقین ہے میرے احساسات سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

کیوں میں نے دریافت کیا!؟

کیوں کیا تو میں نہیں بتا سکتی البتہ اس قدر جانتی ہوں کہ تم کشاکش زندگی میں گرفتہ ہو کو ہم سے تو کیا "مذہب" جیسی حقیقت سے بھی بیگانہ ہو چکے ہو۔ ہمارے دیوتا اب تمہارے دیوتا نہیں رہے اور تم کو جن چیزوں میں جلوہ نظر آتا ہے وہ ہماری نظروں میں بھیانک معلوم ہوتی ہیں یہ بالکل معمولی بات ہے اب کاکا کی آواز میں حزن و ملال کا عنصر نمایاں تھا۔

مگر کاکا میں نے تو ہمیشہ آپ کے کامنا کو سمجھنے کی کوشش کی ہے میں نے آہستہ سے کہا

نہایت پُر مسرت آواز سے بولیں یقینی یقینی

بابوجی تمہاری آپا تم سے بہت محبت کرتی ہیں وہ تم کو اپنے بچوں کی طرح چاہتی ہیں۔ میں بعض اوقات اس خیال سے کہ میں نے ان کے بچے نہیں دیکھے بے تاب ہو جاتی ہوں بچے کیا ہوں گے فرشتے ہونگے اور اب تو یقینی وہ آسمان میں فرشتوں میں شامل ہونگے کیونکہ جب بچے مر جاتے ہیں تو وہ فرشتے بن جاتے ہیں۔ جیونی نے کہا اب اس کی آنکھیں پُرنم تھیں مگر بابوجی میں کہنا چاہتی تھی کہ تمہاری آپا کو تو تم سے اس قدر پریم ہے کہ وہ اکثر تمہارا ذکر کر کے کہتی ہیں کہ اگر رمّو نہ ہوتا تو میں بھی کبھی کی مر گئی ہوتی!!

تم آپاجی کے پاس کتنے عرصے سے ہو میں نے گفتگو کا پہلو بدلنے کے لئے پوچھا۔

عرصہ درصہ تو میں جانتی نہیں لیکن دیکھئے میں آپ کو بتلاتی ہوں جب خریف کی فصل تیار ہو گئی تھی اور ہم اناج کاٹ رہے تھے تب آپ کی آپا نے مجھکو اپنے یہاں نوکری کرنے کو بلایا تھا۔

کاکا تم کو جیونی کا حال کیونکر معلوم ہوا۔

بابوجی آپ کو نہیں معلوم سارے قصبہ میں کوئی عورت نائب صاحب کی نوکری کے لائق مجھ سے اچھی نہیں ہے اگر آپ چاہیں تو قصبہ کے تمام لوگوں سے پوچھ لیجئے اور وہ سب آپ کو بتائینگے کہ جیونی گاؤں سے زیادہ نیک اور بیل سے زیادہ خدمت گزار ہے جیونی سے بڑھکر نائب صاحب جیسے بڑے لوگوں کی خدمت کوئی عورت نہیں کر سکتی اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیوں منہ سے نکلا اچھا تو تم تمام گاؤں کی نوکرانیوں میں سب سے زیادہ وفادار ہو۔

"اور کیا؟" اس نے فخریہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔

تم نے کتنے نائب تحصیلداروں کی ملازمت کی ہے میں نے دریافت کیا۔

اچھا ابھی بتلاتی ہوں اب اس نے انگلیوں پر گننا شروع کیا ہر ایک کا نام ان کے بچوں کی تعداد ان کی بیویوں کا مزاج اور ان کا رحم و کرم

میں نے شرارتاً دریافت کیا جیونی فرض کرو کہ میں دس یا پندرہ برس بعد پھر اس قصبہ میں آؤں اور نائب تحصیلدار نہ ہوں تو تم میری ملازمت کروگی یا نہیں۔

میرا گھر میں پاؤں رکھنا تھا کہ کاکا نے ایک لاانتہائی گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا میری کامیابی، میری تندرستی، چھوٹی بہن کی شادی کی فکر میسور کی حالت وغیرہ وغیرہ غرضیکہ وہ کونسا ذکر تھا کہ نہ کیا گیا ہو اور میری یہ حالت تھی کہ ہمہ تن گوش تھا مگر حقیقتاً یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ وہ کہہ کیا رہی ہیں البتہ کبھی کبھی ہاں ہوں ضرور کر دیتا تھا میں تو اس وقت گرما گرم چائے کی چسکیاں لے رہا تھا جو دس میل کے طویل سفر کے بعد بالکل امرت معلوم ہوتی تھی سفر کی طوالت کا اس طرح اندازہ کیجئے کہ مجھکو باکلہ کی شکستہ اور گرد آلود سڑک پر دس میل بائیسکل پر چلنا پڑا تھا۔ اس بائیسکل پر جس میں سے چرخ چوں و چڑ پڑ کی مختلف الصوت آوازیں نکل کر انقباضِ طبع اور دل کی پراگندگی کا سامان مہیا کرے۔ میں مصروف کار نمبیں گھر سے ۶ ماہ کی طویل جدائی کے بعد گھر کے اندر ایسا سکون محسوس ہوا کہ بس سو جانے کو جی چاہتا تھا چنانچہ نیم غنودگی کی سی حالت میں میں کاکا کی باتیں سنتا رہا مگر جی یہی چاہتا تھا کہ کاکا چلی جائیں اور میں نیند میں دنیا و مافیہا سے کھو جاؤں۔ پیالی ختم کرنے کے بعد میں نے ان سے دوسری پیالی کی درخواست کی کیونکہ اول تو تنہائی کا بہانہ ان سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا دوسرے واقعہ یہ بھی تھا کہ چائے کی خواہش باقی تھی ان کے چلے جانے کے بعد میں اپنے ہاتھ کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور سکون کی ایک پُر مسرت موج تمام جسم میں دوڑ گئی کچھ غنودگی بھی طاری ہو گئی۔ یکایک نیم بیداری کی حالت میں میں نے اپنے عقب میں آہستہ سے دروازہ کھلتا ہوا محسوس کیا جو مکمل طور پر نہیں کھولا گیا تھا۔ میں چپ چاپ لیٹا رہا میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص دروازہ میں کھڑا ہے اور اندر آتے ہوئے ڈرتا ہے میں نے اپنا ہاتھ سر کے نیچے سے سرکایا اور پاؤں بھی فرش پر آہستہ سے پھیلایا اور کچھ بڑبڑایا بھی کروٹ بھی لی دروازہ پھر کچھ بند ہوا اور وہی شخص واپس ہوتا ہوا معلوم ہوا ——— گیا ———

میں نے دل میں خیال کیا اور اس خیال سے کہ میں نے کسی ہمسایہ کو جو غالباً میری آمد کی خبر سنکر مجھ سے ملنے آیا تھا واپس بھیجدیا کچھ تکلیف سی محسوس کی لیکن کوئی اندر سے کہہ رہا تھا کہ نہیں ابھی یہ گوشت پوست کا مجسمہ موجود ہے باہر پتھریلی زمین پر گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ اور کوؤں کی کائیں کائیں نے ایک بلا خیز طوفان اٹھا رکھا تھا۔ دروازہ سے سورج کی چند کرنیں اندر آکر مجھ کو آرام پہنچانے میں مشغول تھیں کہ کاکا چائے لیکر اور میرے قریب کھڑے ہوکر آہستہ سے بولیں رمّو بھیا سو گئے!؟ میں نے اپنے سر کو دروازہ کے جانب حرکت دیتے ہوئے کہا جاگ رہا ہوں دروازہ اب مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔

"کاکا" میں نے کہا "دروازہ میں کوئی آدمی کھڑا تھا!"

کب۔ انہوں نے بلند آواز میں دریافت کیا۔

ابھی کوئی ایک سیکنڈ ہوا۔

انہوں نے دروازہ میں سے جھانک کر دیکھا کچھ مسکرائیں اور پکارنے لگیں جیونی! بندریا! اندر کیوں نہیں آتی۔ بھیا تم کیا سمجھ رہے تھے؟ رام جانے کون ہے؟ اور یہ کہکر ایک قہقہہ لگایا یہاں تک کہ اُن کے آنسو نکل آئے ایک نحیف آواز میں یہ الفاظ ادا کئے گئے۔

جی ماتا جی۔ جی ہاں میں اندر آنا چاہتی تھی مگر بابو جی کو سوتا دیکھکر میں یہاں رک گئی۔ یہ الفاظ دہقانی لہجہ میں ادا کئے گئے تھے۔

کاکا نے حکم دیا اندر آجاؤ۔

جیونی آہستہ سے دروازہ تک آکر رک گئی اور مجھ کو اس طرح سے دیکھنے لگی کہ میں کوئی دلی یا مہاتما ہوں۔

کاکا نے پھر کہا ڈرو مت اندر آجاؤ

جیونی اندر داخل ہوئی اس انداز میں گویا کہ مندر میں داخل ہو رہی ہے اور دور ہی ایک چاول کی بوری کے پاس کھڑی ہو گئی۔

کاکا میرے قریب فخر اور محبت کے انداز میں بیٹھی تھیں۔ ان کی تمام تر محبت میری ذات سے وابستہ تھی انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا رمّو۔ جیونی ہماری نئی نوکرانی ہے اب میں نے جیونی کو دیکھا جس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اس کی عمر ۴۰ سے تجاوز کر چکی تھی چہرہ پر کہیں کہیں جھریاں پڑ گئی تھیں مگر آنکھوں میں عجیب چمک باقی تھی۔ اس کے بال سفید ہو چلے تھے اور لٹکی ہوئی چھاتیاں قمیص سے ناآشنا تھیں۔ کشادہ پیشانی سے بیوگی اور غم کے آثار نمایاں تھے۔

جیونی قریب آؤ میں نے کہا۔

نہیں بابو جی۔

نہیں آگے آؤ میں نے پھر اصرار کیا۔

کاکا چلائیں۔ جیونی یہاں قریب سے آکر دیکھ میرا بھیا کیسا سُندر ہے۔ کیا قیامت کا افتخار تھا جس نے میری بھدی ناک اور موٹے لبوں کا تصور دماغ میں پھر تازہ کر دیا۔ ہجو ملیح کا نہایت حسین انداز تھا۔

جیونی چند قدم اور رینگی۔

بندریا آگے کیوں نہیں آتی کاکا نے ترشی سے کہا۔

جیونی چند قدم اور آگے بڑھی اور گردن جھکا کر ایک نئی دلہن کی طرح کھڑی ہو گئی۔

کاکا کہنے لگیں دیکھ جیونی میرا بھیا بالکل شہزادہ معلوم ہوتا ہے

"دیوتا" جیونی بولی

مجھ کو ہنسی آگئی اور چائے پینے میں مشغول ہو گیا۔

جیونی نے آہستہ سے کہا تمام گاؤں بابو جی کے راگ الاپ رہا ہے

تجھے کیسے معلوم کاکا نے پوچھا!

کیسے میں تیسرے پہر کو آگئی تھی مجھے بابو جی کے آنے کا حال معلوم تھا آپ نے کہا تھا کہ وہ بالکل شہزادے معلوم ہوتے ہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ بائیسکل پر سوار ہوں گے۔ جب بابو جی

اس پیپل کے نیچے پہنچے جس میں رسّی کا پھندا ڈالکر اس موئے مچھیرے کودوں نے پھانسی لگالی تھی تو میں نے دیکھا کہ سب آدمی بابوجی کو دیکھ رہے ہیں اور وہ مجھ سے پوچھنے لگے یہ کون ہیں میں نے جواب دیا نائب صاحب کے سالے ہیں اور کون ہوتے۔ موٹے لالہ ننکو بولے کیسے سندر ہیں۔ بیوی کہنے لگی شہزادے ہیں شہزادے۔ میرے پاس ہی ڈنکا نائی کی بیوی کہنے لگی نہیں دیوتا ہیں "دیوتا"

رمّو دیکھا تمام قصبہ میں تمہاری خوبصورتی کی شہرت ہوچکی ہے اب تم ذرا احتیاط سے کام لینا اس قصبہ میں جادوگر بہت رہتے ہیں جو خوبصورت بچّوں کو جانور بناکر مار ڈالتے ہیں مجھکو ہنسی آگئی۔

بابوجی ہنسو نہیں میں نے اپنی ان آنکھوں سے خود سینکڑوں جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے بھوت دیکھے ہیں جو سب کے سب جادو کے زور سے مارے گئے تھے جادو کے زور سے بابوجی جیونی نے اول مرتبہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا بابوجی دن چھپنے کے بعد تم جنگل میں کبھی نہ جانا کیونکہ اس وقت بھوت پریت نکلتے ہیں اور خاصکر گیا آنے کے بعد تال پر تو بھولکر بھی نہ جانا وہاں بھوت بہت رہتے ہیں

میں نے تعجب سے پوچھا تم کو کیسے معلوم ہوا

کیسے؟ میں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا ہے رنگی کمہار کی بیوی نے صدموں سے تنگ آکر ایک رات اسی تال میں ڈوب کر خودکشی کرلی تھی۔ ابھی کچھ دن ہوئے میں رات کو اندھیرے میں اسی تال کے پاس سے گزر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ رنگی کی بیوی لینے بال بکھیرے اور سفید ساری باندھے میرے سامنے کھڑی ہے میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی اور رونے لگی وہ بھاگ کر درخت کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ اور عجیب بھیانک آواز میں چلّانے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ پل پر کھڑی تھی اور یہ کہتی ہوئی پانی میں کود پڑی۔ میری بچّی مرگئی۔ میرا بچہ مرگیا اب میں بھی مرنے جارہی ہوں۔

کاکا کانپ گئیں وہ بھوتوں سے نہایت خوفزدہ ہوجاتی تھیں اور غصہ سے بولیں

گدھی چپ کیوں نہیں رہتی میں نے ہزار دفعہ منع کیا ہے کہ یہ قصّے نہ بیان کیا کر۔

ماتاجی معاف کرو (گلطی) غلطی ہوگئی۔

میں سیکڑوں دفعہ معاف کرچکی ہوں مگر تو ان قصوں کے کہنے سے باز نہیں آتی گویا اُن پڑھ رہی ہے۔ تو خود جاکر تال میں ڈوب کر بھوت کیوں نہیں بن جاتی۔ کاکا غصہ سے بیتاب تھیں۔ جیونی نے خوف اور لحاظ سے سر جھکالیا اور تھوڑی دیر کے بعد بولی آپ کے بھیا کیسے سندر ہیں؟

میں نے نہیں کہا تھا کہ میرا بھائی شہزادہ معلوم ہوتا ہے اور کسے معلوم ہے ممکن ہے اس کے جسم میں کسی دیوتا نے جنم لیا ہو۔ کاکا نے نہایت فخریہ انداز میں کہا۔

کاکا خدا کے لئے رحم کرو۔

میں نے جوش محبت سے ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

کاکا تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں اس خوفناک قصبہ میں میں بغیر جیونی کے کیونکر زندگی گزارتی

اور ماتاجی بنا آپکے میں تو زندہ بھی کیسے رہتی جیونی نے کہا اسکی آواز میں گیت کا ترنم تھا۔

یہ کمبخت قصبہ کیا ہے گاؤں سے بدتر چیزیں ملنا دشوار ہیں۔ اور "وہ" (بحیثیت ایک ہندوستانی بیوی کے کاکا اپنے شوہر کا نام نہیں لے سکتیں تھیں) اکثر تعلقداری کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں گھر سے باہر رہتے ہیں گاؤں ہیں تو کم مگر ایک دوسرے سے بہت فاصلہ پر واقع ہیں اکثر ہفتوں گھر کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوتی اور اگر جیونی میرے پاس نہ ہوتی تو میرا خوف و دہشت سے دم ہی نکل جاتا۔ کاکا کی آواز کچھ بھرّائی ہوئی معلوم ہوتی تھی رمّو تم مرد ہمارے کامنا اور وشواس سمجھنے سے بالکل قاصر ہو اب جیونی باوجود نوکر ہونے کے بھی مجھکو یقین ہے میرے احساسات سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

کیوں میں نے دریافت کیا!؟

کیوں کیا تو میں نہیں بتا سکتی البتہ اس قدر جانتی ہوں کہ تم کشاکش زندگی میں گرفتار ہوکر ہم سے تو کیا "مذہب" جیسی حقیقت سے بھی بیگانہ ہوچکے ہو۔ ہمارے دیوتا اب تمہارے دیوتا نہیں رہے اور تم کو جن چیزوں میں جلوہ نظر آتا ہے وہ ہماری نظروں میں بھیانک معلوم ہوتی ہیں یہ بالکل معمولی بات ہے اب کاکا کی آواز میں حزن و ملال کا عنصر نمایاں تھا۔

مگر کاکا میں نے تو ہمیشہ آپ کے کامنا کو سمجھنے کی کوشش کی ہے میں نے آہستہ سے کہا

نہایت پُرمسرت آواز سے بولیں یقینی یقینی

بابوجی تمہاری آپا تم سے بہت محبت کرتی ہیں وہ تم کو اپنے بچّوں کی طرح چاہتی ہیں۔ میں بعض اوقات اس خیال سے کہ میں نے ان کے بچے نہیں دیکھے بے تاب ہوجاتی ہوں بچّے کیا ہوں گے فرشتے ہونگے اور اب تو یقینی وہ آسمان میں فرشتوں میں شامل ہونگے کیونکہ جب بچّے مرجاتے ہیں تو وہ فرشتے بن جاتے ہیں۔ جیونی نے کہا اب اس کی آنکھیں پُرنم تھیں مگر بابوجی میں کہنا چاہتی تھی کہ تمہاری آپا کو تو تم سے اس قدر پریم ہے کہ وہ اکثر تمہارا ذکر کرکے کہتی ہیں کہ اگر رمّو نہ ہوتا تو میں بھی کبھی کی مرگئی ہوتی!!

تم آپاجی کے پاس کتنے عرصے سے ہو میں نے گفتگو کا پہلو بدلنے کے لئے پوچھا۔

عرصہ ورصہ تو میں جانتی نہیں لیکن دیکھئے میں آپ کو بتلاتی ہوں جب خریف کی فصل تیار ہوگئی تھی اور ہم اناج کاٹ رہے تھے تب آپ کی آپا نے مجھکو اپنے یہاں نوکری کرنے کو بلایا تھا۔

کاکا تم کو جیونی کا حال کیونکر معلوم ہوا۔

بابوجی آپ کو نہیں معلوم سارے قصبہ میں کوئی عورت نائب صاحب کی نوکری کے لائق مجھ سے اچھی نہیں ہے اگر آپ چاہیں تو قصبہ کے تمام لوگوں سے پوچھ لیجئے اور وہ سب آپ کو بتائینگے کہ جیونی گاؤں سے زیادہ نیک اور میں سے زیادہ خدمت گزار ہے جیونی سے بڑھکر نائب صاحب جیسے بڑے لوگوں کی خدمت کوئی عورت نہیں کرسکتی اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیوں منہ سے نکلا اچھا تو تم تمام گاؤں کی نوکرانیوں میں سب سے زیادہ وفادار ہو۔

"اور کیا!" اُس نے فخریہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔

تم نے کتنے نائب تحصیلداروں کی ملازمت کی ہے میں نے دریافت کیا۔

اچھا ابھی بتلاتی ہوں اب اس نے انگلیوں پر گننا شروع کیا ہر ایک کا نام ان کے بچّوں کی تعداد ان کی بیویوں کا مزاج اور ان کا رحم و کرم

میں نے شرارتاً دریافت کیا جیونی فرض کرو کہ میں دس یا پندرہ برس بعد پھر اس قصبہ میں آؤں اور نائب تحصیلدار نہ ہوں تو تم میری ملازمت کروگی یا نہیں۔

یہ سُنکر وہ کچھ پریشان سی ہوئی اور جواب کے لئے کاکا کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی مگر پھر کچھ سوچکے بولی بابو جی آپ بھی بابو جی جیسے بڑے ہی آدمی ہو کر آؤ گے آپ کی تعلیم آپ کی سند تا سب باتیں کہتی ہیں کہ آپ نائب تحصیلدار ضرور ہونگے اور پھر میں خوشی سے آپ کی نوکری کرونگی فرض کرو کہ میں نائب تحصیلدار نہ ہو سکا۔

آپ ضرور ہونگے ضرور ہونگے اس نے ایسے انداز سے کہا گویا کہ میں اس سے مذاق اور اپنی توہین کر رہا تھا۔

اچھا تو تمہیں ملازم رکھنے کے لئے مجھے نائب تحصیلدار ہی ہونا پڑے گا۔ میں نے مذاقاً کہا۔

عقب کے دروازے سے میری بہنوئی کی آواز آئی مگر میری طرح سے خون پسینہ ایک کرنا پڑیگا۔ نائب تحصیلداری بالکل اس کی مصداق ہے کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا"

جیونی مارے خوف کے لرز اُٹھی (کیونکہ یہ آواز اُسکے آقا کی تھی) اور باہر نکل گئی

آپ کی نوکرنی بہت اچھی ہے میں نے کاکا سے کہا۔

مجھ کو وہ ماتا جی کہتی ہے مگر محبت اپنے بچوں جیسی کرتی ہے۔ کاکا نے جواب دیا۔

بھائی جی کو ہفتہ میں دو تین دفعہ باہر دورہ میں جانا پڑتا تھا اور چونکہ کاکا تنہائی سے گھبراتی تھیں اس لئے جیونی ہمارے مکان ہی پر سوتی تھی اور یہ بات اب اس کی عادتِ ثانیہ ہو گئی تھی چنانچہ میرے گھر پر آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

ایک شام کا ذکر ہے نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ ہم دونوں بہن بھائی سرِ شام ہی کھانا کھا کر اپنے بستروں پر دراز ہو گئے تھے کہ جیونی نے باہر ہی سے کھڑکی سے جھانک کر آہستہ سے کہا

ماتا جی کیا سو گئیں؟

بندریا اندر کیوں نہیں آتی کاکا نے کہا۔

جیونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور ایک چادر جو وہ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھی پلنگ پر ڈالکر باہر اصطبل میں چلی گئی جہاں وہ ہمیشہ اپنا کھانا کھایا کرتی تھی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میں سیکڑوں مرتبہ کاکا سے اس بات پر جھگڑ چکا تھا مگر ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح ایک نیچ ذات کی عورت کو اُسی کمرہ میں جہاں ہم کھانا کھاتے ہیں بیٹھکر کھانا کھانے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

آج میں نے پھر وہی ذکر چھیڑا آخر یہ جیونی اصطبل میں بیٹھکر کیوں کھانا کھاتی ہے۔

کہہ تو دیا نیچ ذات کی عورت ہے یہاں کیسے کھانا کھا سکتی ہے

افسوس کاکا آپ کے پہلو میں دل نہیں پتھر کا ٹکڑا ہے وہ دل بھی کیا جو دوسروں کے دکھ سے متاثر نہ ہو سکے۔ کیا نیچ ذات کو کوئی دوسرا پیدا کرتا ہے۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں کیا آپ کی معاشرت انسانیت کا خون بہانے کے لئے اُن سے بہتر قوانین وضع کر سکتی تھی؟ کیا ہندو دھرم کے ماتھے پر اس سے زیادہ کلنگ کا ٹیکہ لگایا جا سکتا ہے؟ کیا نیچ گھرانے میں پیدا ہونے کا گناہ اس قدر عظیم ہے کہ وہ کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی اور نسائی جذبات میں وہ کس طرح آپ سے کمتر ہے ابھی کل کا ذکر ہے کہ آپ کہہ رہی تھیں کہ وہ آپ سے بڑی بہن یا ماں جیسی محبت کرتی ہے مگر اس کے محبت کرنے سے یہ تو لازم نہیں آجاتا کہ ہم بے دھرم ہو جائیں۔

اور انسان بے دھرم کس طریقہ سے ہو جاتا ہے"؟

نیچ ذات کی عورت کے ساتھ کھانا کھانے سے انسان بے دھرم ہو جاتا ہے۔

رتنو کافی غصہ کرچکے ہو یا ابھی کوئی اور بات سُنانی باقی ہے پرمیشور کے لئے چُپ ہو جاؤ یہ کہکر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

آپ ظالم ناخدا ترس اور انسانیت کا خون بہانے والی ہیں میں نے ان کے آنسوؤں سے بغیر متاثر ہوئے کہا"

"جاؤ جاؤ اپنا انسانیت کا جذبہ باہر جاکر دکھاؤ انہوں نے غصہ سے کہا اور کمبل سے مُنہ ڈھک کر زیادہ زور سے رونے لگیں۔

میرا دل بھی اُنکی کی ظالمانہ حرکت سے خون ہو چکا تھا یہ میری عمر میں پہلا واقعہ تھا کہ ان کے رونے سے میں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا اور غصہ سے بیتاب ہو کر باہر نکل آیا میں سیدھا اصطبل میں پہنچا تو دیکھا کہ جیونی اندھیرے میں بیٹھی ہوئی اس طرح چاول کھا رہی ہے جیسے گائے جگالی کر رہی ہو۔ اُس نے خیال کیا کہ شاید میں اصطبل میں ہو کر باہر باغیچہ میں جانا چاہتا ہوں مگر میں اس کے برابر دیوار کے سہارے سے کھڑا رہا۔ اُس نے کھانا بند کر دیا اور نہایت خوفزدہ سی ہو گئی۔

جیونی میں نے نہایت خلوص کے لہجہ میں کہا۔

بابو جی اُس نے گھبرا کر جواب دیا۔

جیونی کھانا کھاتے وقت تم چراغ کیوں نہیں روشن کر لیتیں"

کیا فائدہ۔ اُس نے جواب دیا اور پھر چاول کھانے میں مشغول ہو گئی

"مگر تم اندھیرے میں کیسے دیکھ سکتی ہو کہ تم کیا کھا رہی ہو"

"بابو جی کھانے کی چیز کو دیکھنے سے فائدہ اُس نے ہنسکر جواب دیا"

"دیکھو جیونی تم کو بغیر روشنی کے ہرگز کھانا نہیں کھانا چاہئے"

"بابو جی مجھکو معلوم ہے کہ میرے چاول اور بھات کہاں رکھا ہے اور یہ کافی ہے"

ٹھیک اسی وقت گائے نے کثرت سے گوبر کیا جس کی چھینٹوں نے اگر کھانے کو نہیں تو کم از کم اس کے کپڑوں کو ضرور آلودہ کیا ہو گا۔ میں نے غم و غصہ سے متاثر ہو کر کہا تم کمرہ میں چلکر کیوں نہیں کھانا کھاتیں (گو کہ میں سمجھتا تھا کہ وہ کبھی اس کو منظور نہیں کرے گی)

"نہیں بابو جی میں یہاں بہت اچھی ہوں میں دری کو گندہ نہیں کرنا چاہتی۔

اگر دری گندی ہو جائے گی تو میں خود اس کو اپنے ہاتھ سے صاف کر دوں گا۔ میں نے اپنے دلی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش ہو گئی ستاروں کی روشنی میں مجھکو اس کا موہوم سایہ اصطبل کی دیوار پر نظر آ رہا تھا۔ گائے جگالی کرنے میں اور بچھڑا گھاس کھانے میں مشغول تھا اور میرے دل میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ رہا تھا مجھکو سماج کے ظلم نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور میں اس کے بوجھ کے نیچے دبا جا رہا تھا۔ مگر آہ معصوم و مظلوم جیونی اس جذبہ سے بے نیاز اطمینان کے سانس لے رہی تھی اور خوش تھی۔

میں نے غم غلط کرنے کے لئے دریافت کیا جیونی کیا تم مکان پر بھی اندھیرے میں کھانا کھاتی ہو

جی بابو جی!

کیوں؟

بابو جی تیل بہت مہنگا ہے ۲ میں تیل کی ایک بوتل آتی ہے اور وہ ۸ یوم چلتی ہے۔

مگر دو آنے ہوتے ہی کیا ہیں۔

"ہوتے ہی کیا ہیں میری دو دن کی کمائی کچھ ہوتی ہی نہیں!!؟

دو دن کی کمائی ہو میں نے کمال تعجب سے پوچھا؟
جی ہاں مجھے دو روپئے ماہوار گزارے کو ملتے ہیں!
دو روپئے ماہوار!!
جی ہاں دو روپئے ماہوار ——— تو بہت ہیں (اُس نے لفظ "بہت" پر زور دیکر کہا) کہیں قریب ہی ملٹے تو کی آواز آرہی تھی اور کہیں دور اس قدر دور کہ دُنیا والوں کی نظریں وہاں تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتی بھارت ماتا اپنے مظلوم بچوں کی بیکسی پر آنسو بہا رہی تھی کیا پاکیزہ تعلیم ہے اسلام کی میں نے دل میں خیال کیا میں نے دل میں خیال کیا جس نے شاہ گدا و محتاج و غنی کو ایک صف میں کھڑا کر دیا جہاں بزرگی و برتری منحصر ہے علم و اعمال پر نہ کہ ذات پر بیشک کرشن اور رام کی بھی تعلیم ہوگی بے شک رشیوں نے بھی یہی درس دیا ہوگا مگر دُنیا والوں نے اس تعلیم کو نیست و نابود کرکے ہندو دھرم کی پیشانی پر ایک بدنما داغ لگا دیا۔ اے پرمیشور دھرم مہاتما گاندھی جی کو وہ قوت دے کہ وہ اس ظلم کی بیخ کنی کرنے میں کامیاب ہوں۔
اب میں تاثرات سے اس قدر مغلوب ہوگیا تھا کہ بات کرنے کو الفاظ نہیں ملتے تھے ہے ایشور کیا وہ تمام عمر یہی چاول کھا کر اپنی زندگی گزار دیگی کیا چاول کھانا ہی اس کی زندگی کا ماحصل ہے۔
میں نے اپنا غم غلط کرنے کے لئے اس سے دریافت کیا۔ جیونی تم دو روپئے کا کیا کرتی ہو۔
میں اپنی تنخواہ نہیں لیتی ہوں"
کیوں نہیں لیتی ہو۔ میں نے پوچھا۔
ماتا جی میری تنخواہ جمع کرتی رہتی ہیں اور جب وہ میرے کام سے خوش ہوتی ہیں۔ تو ایک دو آنہ انعام کے طور پر اس میں اور اضافہ کر دیتی ہیں۔ اور جب کافی رقم جمع ہو جاتی ہے تو میں ساری خرید لیتی ہوں۔
اور بقیہ کا کیا ہوتا ہے میں نے دریافت کیا۔
بقیہ سے میں اپنے بھتیجے کے لئے کھلونے خریدتی ہوں
کیا تمہارا بھائی غریب ہے۔
نہیں بابو جی مگر مجھے بچے سے محبت ہے
اگر میں تم سے بچے کو طلب کروں تو کیا تم مجھکو دیدو گی۔ میں نے مسکرا کر دریافت کیا کیونکہ غم و غصہ نے آنسو خشک کر دئے تھے۔
آپ مجھ سے کبھی نہیں طلب کرینگے اور اگر آپ طلب کریں گے تو مجھ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ بھی ہنس پڑی "کیا تم سچ کہتی ہو"
آپ کے چرنوں کی قسم اب وہ کھانا ختم کر چکی تھی اور اُٹھکر ہاتھ دھونے چلی گئی تھی۔
میں بھی باہر نکل آیا۔
ستارے آسمان پر جگمگا رہے تھے ان میں چھوٹے اور بڑے چمکیلے اور ماند میں کسی کو ایک دوسرے پر فوقیت نہ تھی سب کو نیلا آسمان اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا۔ پرمیشور کیا ان میں بھی ذات پات کا فرق ہے۔
باہر سڑک پر ایک گاڑی بان یہ شعر الاپ رہا تھا۔
"چلی آئیں تنہا اُنہیں بھی تو لائیں"
اور فضا ساکت تھی۔

جب کبھی رات کو جیونی ہمارے یہاں سونے آتی تو قصبہ کی خبروں کا کافی ذخیرہ اس کے پاس ہوتا تھا۔ جو ایک ایک کر کے ہم کو سنائی جاتی تھیں۔ اگر کبھی آم والے کا چھٹی رساں کی بیوی کو اغوا کرنے کا قصہ بیان کیا جاتا تھا تو کبھی دنکا کی بیوی کے مندر کے درشن سے شفا پانے کا کاکا کو ان خبروں کے سننے میں خاص لطف آتا تھا اور غالباً اسی لئے جیونی بھی قصبہ کی ایک ایک خبر نہایت احتیاط سے ہم پہنچا کر کاکا کے گوش گزار کرتی تھی۔ ہم لوگ اپنے نرم و گرم بچھونوں پر سوتے اور جیونی چٹائی پر ایک بوسیدہ رضائی اوڑھ کر سوتی اس نے کبھی جاڑے کی بھی شکایت نہیں کی۔
ایک شب کا ذکر ہے کہ میں نے جیونی سے درخواست کی کہ وہ اپنا کچھ حال سنائے پہلے تو اُس نے انکار کیا مگر کاکا کے کہنے سے طوعاً و کرہاً راضی ہوگئی۔ میں ہمہ تن گوش تھا اور کاکا نیند سے مغلوب ہو کر دنیا سے بے خبر۔

جیونی کی پیدائش قریب کے گاؤں کوٹھالی میں ہوئی تھی اس کا باپ ایک متوسط الحال کاشتکار تھا جو موسم سرما میں کھیتی اور موسم گرما میں کپڑے دھونے کا پیشہ کرتا تھا اس کی ماں چونکہ کوٹھالی میں تنہا دائی کا پیشہ کرتی تھی اور ہر روز کسی نہ کسی کے یہاں بچہ جنانے کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے بہت عدیم الفرصت رہتی تھی۔ جیونی کے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں مگر موت نے صرف ایک بھائی بھیما نامی زندہ چھوڑا تھا باقی سب نذر اجل ہو چکے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارہ اور دل کی ٹھنڈک بنکر رہی یہانتک کہ جب اُس نے اٹھارہویں سال میں قدم رکھا۔ اس کے ماں باپ کو شادی کی فکر ہوئی بڑی جستجو کے بعد ایک دھوبی کا لڑکا تجویز کیا گیا۔ شادی کی رسم ادا کی گئی اور جیونی ماں باپ کو روتا چھوڑ کر اپنے شوہر کے گھر پہنچ گئی قسمت نے یہاں بھی یاوری کی وہ شوہر کے دل کا سرور بنکر رہی شادی کے کچھ عرصہ بعد تک اس کا محبوب شوہر زندہ رہا اور جیونی اس کے دل کی رانی بن کر رہی مگر ایک روز یکایک کپڑے دھوتے وقت کسی زہریلے سانپ نے اس کو ڈس لیا تمام جادو ٹونے کئے گئے مگر کوئی بات کارگر نہ ہوئی اور وہ سب کو روتا چھوڑ کر کسی دوسری دنیا کو آباد کرنے کے لئے چلدیا میرا خیال تھا کہ یہاں آکر وہ تاثرات سے بے تاب ہو کر آنسوؤں کے دریا بہائے گی مگر نہیں میں نے محسوس کیا کہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بیوگی گویا تمام مصائب والائم کی ابتدا تھی جن سے یکے بعد دیگرے اس کو ہمکنار ہونا پڑا۔ اس کے شوہر کے دو بھائی اور ایک بہن تھی بڑا بھائی شرابی اور جواری تھا۔ اور چھوٹے بھائی نے باوجود شادی کے ایک بازاری عورت سے ناجائز تعلق کر لیا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو نہایت بے دردی سے مارتا تھا یہانتک کہ ایک روز تو اُس نے بیوی کو مارتے مارتے بے ہوش کر دیا۔ اس کے جیٹھ اور دیور و نیز نند کے کافی بچے تھے جن سے گھر میں چہل پہل اور کافی رونق رہتی تھی۔ اس لئے جیونی صبر و شکر سے اپنی سسرال میں رہتی اور گھر کا کام کاج کرتی اس نے ان مصیبتوں میں کوئی تکلیف نہیں محسوس کی کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ وہ سب عطیہ ہیں دیوی ماتا کا جو اس کو آئندہ جنم میں ان سب کا نعم البدل عطا کرے گی۔
ایک روز نہ معلوم کس جرم میں پولس والے اس کے جیٹھ کو گرفتار کر کے لیگئے اور اب کوئی کھیتی کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں رہ گیا۔ گاؤں والوں نے اپنے مویشیوں سے تمام کاشت اجڑوا دی اور منع کرنے پر گالیوں سے پیش آئے۔ نتیجہ ظاہر ہے افلاس نے بڑھ کر ان کا دامن تھاما اور فاقوں کی نوبت پہنچ گئی۔ اب چونکہ جیٹھ نے جیل خانے اور دیور نے اپنی داشتہ

کا گھر آباد کر لیا تھا گھر کی عورتوں نے طعن و تشنیع سے جیونی کا کلیجہ چھلنی کر دیا۔ منحوس بیوہ کہنا اور منہ پر تھوک دینا تو گویا ایک ان کا روزانہ کا مشغلہ تھا۔

جیونی کہنے لگی مجھ کو اکثر خیال آتا تھا کہ میں نہر میں کود کر جان دیدوں اور دنیا کی مصیبتوں سے نجات پاؤں مگر دیوی ماتا کا ڈر اس قصد سے باز رکھتا تھا مگر ایک روز بھابی نے اس قدر برا بھلا کہا کہ میں گھر سے نکل کر بھاگ گئی۔ گھر سے نکلنے کو تو نکل آئی مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں میرا بھائی ہمیشہ سے مجھ سے نفرت کرتا تھا مگر بابو جی بہن تو آخر بہن ہی ہے اور آپ اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ جس ماں کا میں نے دودھ پیا تھا اسی کا بھیا نے بھی پیا تھا

ہر گز نہیں میں نے کہا۔

مگر بابو جی میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس نے وہ برتاؤ مجھ سے کبھی نہیں کیا جو آپ اپنی کاکا سے کرتے ہیں خیر میں نے کہا تم اپنا قصہ بیان کرو۔

میں سیدھی اپنے بھائی کے مکان پر گئی مجھ کو دیکھتے ہی بھابی کے آگ لگ گئی۔ انہوں نے مجھ کو منحوس ڈاین اور نہ معلوم کیا کیا کہا زمین پر تھوک دیا اور اپنے بچے کو جو کھیل رہا تھا گود میں اٹھا کر اندر لے گئیں اسی اثنا میں بھائی بھی نکل آیا۔

کیسے آئی اُس نے کہا۔

میں نے کہا کہ مجھ کو سر چھپانے کے لئے کہیں جھونپڑا بھی میسر نہیں ہے۔

منحوس بیوہ تجھے جھونپڑا کیسے میسر آسکتا ہے جبکہ تو جہاں جائے گی نحوست تیرے ساتھ ہوگی۔

میں رونے لگی۔

رو۔ رو کر تو کاویری کو بہر دے اُس نے غصے سے کہا مگر میں تجھ کو ایک لقمہ بھی کھانے کو نہیں دونگا۔

مجھکو تمہارا کھانا نہیں چاہیئے مجھ کو تو سر چھپانے کے لئے ایک جھونپڑی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا۔

یہ سن کر اُس کا غصہ ذرا دھیما پڑا اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور بولے اچھا یہ وعدہ کر کہ لڑے گی تو نہیں۔

"نہیں" میں نے کہا۔

اچھا پتا جی کے خیال سے میں تجھ کو رہنے کی اجازت دے سکتا ہو۔ یہاں تو چاہے رہ چاہے کہا چاہے مر۔ میں سر سے پیر تک کانپ گئی اتنے ہی میں بھابی بھی نکل آئیں۔ اس نے مجھکو منحوس گدھی الو کی بچی۔ جادوگرنی کہہ ڈالا اور زمین پر زور زور سے ٹھوکریں ماریں۔ بابو جی میں نے ایسی عورت نہیں دیکھی وہ میری زندگی مسلسل آنسوؤں میں تبدیل کر دیتی ہے۔

کیونکر میں نے دریافت کیا۔

کیونکر تو میں نہیں بتلا سکتی مگر ہر روز جب صبح کو میری آنکھ کھلتی ہے تو کان گدھے کی بچی اور رنڈیا کے الفاظ ضرور سن لیتے ہیں۔

مگر تمہارا اپنی بھاوج سے تو کوئی واسطہ نہیں ہے۔

واسطہ تو نہیں ہے مگر اکثر ان کا بچہ میرے پاس آجاتا ہے اور چونکہ مجھے بچہ سے محبت ہے میں اس کو گود میں لیتی ہوں یہ دیکھکر بھابی کے آگ لگ جاتی ہے اور شیرنی کی طرح بپھرتی ہوئی میری جھونپڑی میں آکر بچہ کو مجھ سے چھین لے جاتی ہے اور کہتی ہیں کہ اگر بچہ کو آیندہ ہاتھ لگایا تو تیری کھال کھنچوا لوں گی۔

تو تم بچہ کو مت لیا کرو میں نے کہا۔

ہاں اگر میرا اپنا بچہ ہوتا تو میں کیوں ان کے بچہ کو ہاتھ لگاتی اور پھر بچہ کو بھی مجھ سے محبت ہے

اور ہاں میں نے کہا وہ تم کو بچہ کو کیوں نہیں لینے دیتی ہیں۔

وہ کہتی ہیں کہ میں بیوہ ہوں اور میری نحوست کا اثر بچہ پر بھی پڑے گا۔ اگر میں اس کو گود میں لوں گی۔

کون کہتا ہے تمہاری بھابی۔

نہیں بھائی اور بھابی دونوں۔

کیا اُن کے ایک ہی بچہ ہے

نہیں اُن کے چار اور بچے ہیں سب بڑے ہو گئے ہیں ایک تو آپ کے برابر ہے۔

کیا سب بچے تم سے محبت کرتے ہیں۔

نہیں صرف یہ چھوٹا بچہ محبت کرتا ہے باقی تو سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں نفرت

تم کسی بچہ کو گود کیوں نہیں لے لیتیں۔

گود لیکر کیا کروں گی میں نے ایک بکری کا بچہ پال رکھا ہے وہی میرے دل کے بہلنے کے لئے کافی ہے۔

اچھا تم نے بکری کا بچہ بھی پال رکھا ہے میں نے تعجب سے کہا۔

جی ہاں بکری کا بچہ پال رکھا ہے منو میرا بھتیجہ اس سے کھیلتا ہے اور آیندہ درگا کے موقع پر میرا ارادہ اس کو تالا کما دیوی کے بھینٹ چڑھانے کا ہے۔

دیوی کو بھینٹ چڑھانے کا اسے زندہ کیوں نہیں رہنے دیتیں۔

پاپ کی باتیں نہ کرو بابو جی میں نے دیوی کو ہر تیسرے سال ایک بکرے کی بھینٹ دینے کی نیت کر رکھی ہے۔

اور دیوی تم کو بکرے کے بدلے میں کیا دیتی ہے

کیا۔ سب کچھ۔ ہر چیز۔ میری زندگی۔ میری تندرستی۔ ماتا جی کی مہربانی بابو جی سب کچھ دیوی ہی کا دیا ہوا ہے۔ یہ کہکر اس نے اپنے ہاتھ باندھے اور نہایت التجا سے دعا مانگنی شروع کی۔ دیوی ماتا مجھ پر رحم کر ماتا جی مجھ پر رحم کر اور ساری دنیا کو دولت۔ عزت اور تندرستی عطا کر۔

میں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا تم کو مجھ سے زیادہ محبت ہے یا اپنے بھتیجہ سے۔

میں کس طرح جواب دوں اس نے کہا میں بھتیجہ کے لئے تو ہر تیسرے سال ایک بکرا دیوی کی نذر کرتی ہوں آپ کے لئے تو میں نے کوئی بکرہ ابھی تک بھینٹ نہیں چڑھایا۔

تو صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تم کو بھتیجہ سے زیادہ محبت ہے۔

یہ بات بھی نہیں ہے کیونکہ جب سے ماتا جی نے کہا ہے کہ ان کے ایک بھائی ہے میں برابر آپ کی سلامتی اور تندرستی کی دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔

اچھا میں نے کہا کہ تم مجھ کو گود لیلو۔

یہ سنکر وہ اس زور سے ہنسی کہ کاکا کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے غصہ سے بگڑ کر کہا چپ بدتمیز میں نے کہا کاکا جیونی مجھ کو گود لینا چاہتی ہے۔

کاکا نے کہا تم کو گود لینا چاہتی ہے جا کے کاویری میں کیوں نہیں ڈوب مرتی۔ یہ کہکر وہ پھر

خراٹے لینے لگیں۔
میں نے کہا جیوتی اگر تم مجھ کو گود لیلو تو میں تمہارے لئے کام کرونگا اور تمہیں روٹی کپڑے کی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔
نہیں بابوجی برہمن کام کرنے کے لئے نہیں پیدا ہوئے ہیں وہ تو پرمیشور کے برگزیدہ بندے ہیں
ہرگز نہیں میں نے کہا ہم میں کوئی بزرگی نہیں ہے۔
نہیں آپ ضرور بزرگ ہیں ضرور ہیں۔ تمام مقدس کتابیں آپ کی ہیں، متبرک وید آپ کے ہیں آپ سب کچھ ہیں سب کچھ آپ اونچی ذات کے ہیں اور ہم تو آپ کے خادم اور غلام ہیں۔
میں برہمن ہی نہیں میں نے کہا۔
نہیں آپ ہیں۔ آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔
جو کچھ بھی ہو اچھا جیوتی تم مجھ کو گود ضرور لے لو۔
وہ پھر ہنسنے لگی۔
اچھا میں نے کہا اگر تم نہیں مانتیں تو میں مرجاتا ہوں اور پھر بکری کا جنم لوں گا اور تم اس کو خریدوگی بتاؤ اُس وقت کیا کروگی۔
اس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان سی ہوگئی ہے مجھ کو بھی اُس وقت نیند کا غلبہ تھا میں نے کہا کہ اچھا اب تم سو جاؤ اور کل پھر اس پر غور کرنا کہ تم مجھکو گود لوگی یا نہیں
میں بھی سو گیا مگر سونے سے قبل میں نے سُنا کہ جیوتی دیوی ماتا سے دعا مانگنے میں مشغول ہے
"دیوی ماتا میرے گناہوں کو معاف کر میری مدد کر ماتا جی ان کے بھائی اور میاں کی حفاظت کر رحم کر ماتا رحم کر" ماتا دیوی کی پجارن مصروف دعا تھی اور دیوی کا ڈیری کے کنارے اپنے خوبصورت مندر میں خاموش،

— · —

اس واقعہ کے دو سال بعد آخر وہ دن بھی آگیا جبکہ بھائی صاحب کے تبادلے کے سلسلے میں ہم ایک گاڑی میں سوار ہوکر باکلہ کو خیرباد کہہ رہے تھے کاکا اور میں بہلی میں اندر کی طرف سوار تھے اور بھائی صاحب بیلوان کے برابر بیٹھے تھے۔ ایک ہفتہ پہلے سے جیوتی برابر سرد آہیں بھرتی تھی اور جدائی کے لموں کا خیال کرکے اس کی آنکھیں غم آلود ہو جاتی تھیں آج بھی وہ گاڑی کے ہمراہ تھی اور جب کبھی کاکا اور اُس کی آنکھیں چار ہو جاتی تھیں وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھی کاکا بھی افسردہ تھیں اور سمجھتی تھیں کہ وہ آج ایک سچی خیر خواہ سے، جدا ہو رہی ہیں ہاں اس قصبہ میں جیوتی ان کی تنہا رفیق اور مخلص خیر خواہ تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ بہلی پر رکھتے ہوئے کہا "ماتا جی مجھ کو بھول مت جانا"
یقین رکھ میں تجھ کو ہرگز نہیں بھولوں گی اور کاکا کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔
میرا دل بھی بے اختیار رونے کو چاہتا تھا مگر تہذیب مانع تھی اس لئے خاموش تھا
دریا کے پاس پہنچکر گاڑی بان نے بیل کھول دیئے کیونکہ دریا پایاب تھا اور گاڑی کو دریا میں ہوکر دوسرے کنارہ پر پہنچنا تھا۔ میں گاڑی سے اتر پڑا کچھ تو اس خیال سے کہ کھلی ہوئی ہوا میں سانس لے سکوں مگر زیادہ تر جیوتی سے گفتگو کرنے کے خیال سے۔
میں نے اُس کو تسلی دیتے ہوئے کہا جیوتی روؤ نہیں۔
آہ بابوجی کس طرح نہ روؤں مجھ کو تمہارا جیسا دیوتاؤں کا خاندان کہاں نصیب ہوگا۔ ماتا جی مجھ پر دیوی کی طرح مہربان تھیں۔ آپ بھی مہربان تھے اور بڑے بابو یہ کہکر وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
نہیں جیوتی میں نے اس سے کہا تمہارے جیسے دل کی مالک سے مل کر کون شخص دیوتا نہیں ہو جائے گا لیکن وہ رونے میں مشغول تھی اور نیز میرے الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر
تھوڑی دیر بعد گاڑی بان نے مجھ سے گاڑی میں سوار ہونے کو کہا اور میں ایک غمزدہ دل اور مجروح آتما لئے ہوئے گاڑی میں سوار ہوگیا۔ آج میں ایک عجیب اور قیمتی ہستی سے جدا ہو رہا تھا۔
گاڑی بان نے ہیئے ہیئے کہکر گاڑی دریا میں ڈال دی میں خاموش گوش دل سے جیوتی کی سسکیوں کی آواز سُن رہا تھا۔ وہ ایک پیپل کے درخت سے کمر لگائے ہماری گاڑی کو ٹکٹکی باندھے ہوئے تک رہی تھی۔ وہ نیلے آسمان کے نیچے اس وسیع دنیا کا ایک نہایت ہلکا اور خفیف سا نقش معلوم ہوتی تھی وہ اس دُنیا کی ایک نہایت قیمتی ہستی تھی مگر اوہام پرستی اور سماج کے مظالم کا شکار

از (ابراہم راؤ)

مترجمہ

اقبال احمد بی اے

رازونیاز

ایشیا

آئینۂ علم و شعر و حکمت یہ ہے
بستان تمدن و سیاست یہ ہے
کیا چیز ہے ایشیائے ساغر اے رازؔ
میخانۂ بادۂ حقیقت یہ ہے

از
ابوالفاضل
سرؔاز
چاند پوری

کیف نظارہ

اس رنگ و سمن کا کیا کہنا ہے
اس حسنِ چمن چمن کا کیا کہنا ہے
چشم بد ہیں میں خاک پائے نرگس
مخموری انجمن کا کیا کہنا ہے

میخانۂ اقوام

مسلمِ ہندی

شعاعِ مہر سے ہے مطلعِ سحر خالی ہوا نہ ہو نہیں تاریکیوں میں گھر خالی

نہ فکرِ بیخودیِ شوق کی نہ کسل کا غم ہر اک ہاتھ میں اک جام ہے مگر خالی

سوالِ کیف کی آواز ہر طرف سے ہے بلند مگر سرورِ عمل سے ہیں بے خبر خالی

بُرا ہو لعنتِ تشنہ لبی بُرا ہو ترا ہے ایک اشک سے بھی آج چشمِ تر خالی

ہر ایک گام پہ ہے ذکرِ میکشانِ قدیم مگر ہے جوشِ عمل سے ہر ایک سر خالی

کبھی ہزار گلستاں تھے اور ایک نگاہ اب ایک پھول سے ہے دامنِ نظر خالی

ہے اتفاق سے بت خانہ صد صنم بکنار اور اختلاف سے کعبے کے بام و در خالی

مےُ غلامیِ مغرب سے مست ہے مُسلم
خود اپنے ظرفِ خودی کی شکست ہے مُسلم

"ہندو"

نشاطِ تازہ سے ہے چشمِ برہمن روشن
جدید نور سے ہے محفلِ کہن روشن

عجب نکھار پہ ہے صندل و عبیر کا رنگ
ہوئی ہے قشقۂ خونیں سے انجمن روشن

بہار اب کے برس آگ بن کے آئی ہے
ہے ایک "لالۂ رنگیں" سے کل چمن روشن

جگر کے داغ چھپائے سے چھپ نہیں سکتے
وطن کی آگ سے ہیں سب کے پیرہن روشن

ستارے کیا کہ نہ بھولیں گے راہ ذرے بھی
ہیں ایک چاند کے پرتو سے بن کے بن روشن

ضیائے بزم نہیں اب رہینِ منتِ شمع
بجھے گی شمع تو ہو جائے گی لگن روشن

تلاشِ شمع میں اہلِ حرم ہے مصروف
چراغ دیر نے کی محفلِ وطن روشن

مہ جدید بر اوجِ وطن ہویدا شد
"کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد"

"افغان"

اٹھی ہیں جہل و بغاوت کی آندھیاں تاریک
سیاہ تر ہے زمین اور آسماں تاریک

یہ کس کا خون در و بامِ میکدہ میں ہے جذب
ہے جوشِ رنگ سے صہبائے ارغواں تاریک

سوادِ بحرِ الم سے یہ کس غضب کا دھواں
اٹھا کہ ہو گئے کشتی کے بادباں تاریک

ہوئی حجابِ ثریا سے بے حجابیِ حسن
چلا نہ کام کہ تھی "بزمِ کہکشاں" تاریک

سیاہ بختیِ افغاں کا یہ تصرف دیکھ
کہ بعد صبح بھی ہے راہِ کارواں تاریک

نوائے بلبلِ رنگیں چمن میں جب سے نہیں — ہر ایک پھول ہے بے نور گلستاں تاریک

مآلِ قسمتِ گلشن کی خیر ہو یارب! — ہے آشیاں کی طرح ذہنِ باغباں تاریک

یہ رندِ بادیہ سرخوش بھی تشنہ کام بھی ہے

تضاد دیکھ کہ آزاد بھی غلام بھی ہے

"ایرانی"

کمالِ سعی پہ ہے کائنات کی بنیاد — اسی سے رونقِ صحرا اسی سے گھر آباد

دیارِ عشق میں لازم ہے شرطِ سعی و عمل — کہ ایک بازوئے سنگیں ہے اصل میں فرہاد

نہ اب وہ نغمۂ قاچاریاں نہ بربطِ عیش — نہ اب وہ سیرِ مصلّےٰ و آبِ رکنا باد

ہزار قطرۂ خونِ جمیل صرف ہوئے — تو ہو سکا وطنِ حافظ و یمیں آزاد

کمالِ تیغِ رضا کی ہے دھوم عالم میں — کہ دی ہے روحِ منوچہر نے مبارکباد

بساطِ گلشنِ ایراں پہ کھیل مشکل ہے — یہ وہ جگہ ہے جہاں مات کھا گیا صیاد

اسیرِ حبِّ وطن کے خطاب ہیں کیا کیا — غیور و زندہ و آزاد و اشرف و دلشاد

یہ قوم میکدہ در بر ہے خود خمستاں ہے

چراغِ محفلِ فارس اسی سے تاباں ہے

"روسی"

چمن میں آج جو ہے پابہ گلِ بہ مجبوری — وہ کل بہار کو دیگا پیامِ منصوری

صوبۂ متحدہ میں خوبصورت صحیح باشوکت اور بہترین کتابت وطباعت کا واحد مرکز

ساغر پریس

شعبۂ طباعت ادبی مرکز

میرٹھ

ہندوستان کے شعراء ادیب اور انشا پردازوں کو نوید

یقیناً یہ خوشخبری تمام ادبی دنیا کیلئے نہایت مسرت اور اطمینان کا باعث ہوگی کہ ملک کے

مشہور انشا پرداز اور شاعر حضرت ساغر نظامی

کے زیر اہتمام و سرپرستی صوبۂ متحدہ کے تاریخی شہر میرٹھ میں ایک ایسا طباعتی مرکز قائم ہوگیا ہے جس کے قیام کے بعد اردو کی علمی طباعت کی مشکلات کم ہوجائینگی

اور اردو کی بہترین تصنیفات صحت و جمال کے ساتھ شائع ہو کر ملک کے باکمال پسند طبقوں سے خراج تحسین حاصل کرسکیں گی

ساغر پریس کی اعلیٰ و حسین طباعت کا بہترین شاہکار "بادۂ مشرق" ہے جو حضرت ساغر نظامی کی نظموں کا شاندار مجموعہ ہے جسکی مجموعی صورت کے متعلق بلند آہنگی

سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے کہنہ مشق اور ترقی یافتہ مطابع بھی بہ آسانی ایسی طباعت پیش نہیں کرسکتے

مسودہ وصول ہونے کے بعد کتاب حسب عمدہ خوبصورت اور باصحت تیار کرکے مرکز پر پہنچا دیجائے گی

یعنی آپ پروف اور کاپیاں دیکھنے کی زحمت سے بھی آزاد ہوجائینگے

خط و کتابت کیلئے پتہ

احمد یار خان منیجر "ساغر پریس" سیٹھ اسٹریٹ میرٹھ

قرطاس خریداری

باتصویر ماہنامہ "ایشیا" ادبی مرکز میرٹھ

مورخہ .... سنہ ۱۹۳ء

براہِ کرم بہ حیثیت خریدارِ "ایشیا" میرا نام ایک سال / ششماہی کے لئے آیندہ ماہ سے رجسٹرڈ کر لیجئے۔ اور رسالہ بذریعۂ وی پی ارسال کیجئے / زرِ سالانہ بذریعۂ منی آرڈر ارسال کیا جاتا ہے

رسالہ مندرجۂ ذیل پتہ پر جاری کیجئے:-

اسمِ گرامی ....

(براہِ کرم صاف الفاظ میں پتہ لکھئے)

پتہ ....

سال بھر کے لئے مبلغ صہ ۸؍ (معہ محصول)
ششماہی کے لئے مبلغ سے؍ (معہ محصول)

خاکسار
منیجر "ایشیا" میرٹھ

اُردو زبان میں سب سے پہلا بین الاقوامی رسالہ مشرق اور ہندوستان کی آزادی اور عظمت کا واحد علم بردار

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

بہ سرپرستی زعیم ہند عالی جناب ڈاکٹر سید محمود ایم اے پی ایچ ڈی بار ایٹ لا مدظلہ العالی

اغراض و مقاصد

(۱) عالمگیر اخوت و محبت۔

(۲) اقوامِ مشرق میں ایک کلچرل اتحاد کا تصور پیدا کرنا۔

(۳) ایشیا کی ہر جدوجہد اور ہیجان سے اُردو داں طبقوں کو علمی طور پر آگاہ کرنا

(۴) بین الاقوامی سیاست پر بحث و انتقاد

(۵) مشرقیت کا احیاء مشرقی فنونِ لطیفہ اور اُس کے متعلقات سے بحث

(۶) ہندوستانی فرقوں میں حب الوطنی اور اتحادِ قومی کے جذبات کو وسیع کرنا۔

(۷) معاشری اور اخلاقی انقلاب۔

(۸) ہندوستان کی قومی زبان اُردو کی ہر ممکن خدمت۔

(۹) روحانی اور دماغی تربیت و ترقی کے لئے بہترین لٹریچر پیش کرنا۔

ہندوستان میں قیمت سالانہ ۵ششماہی ۳ ہے فی پرچہ آٹھ آنہ (۸)

بیرونِ ہند قیمت سالانہ آٹھ روپیے ریلوے بک سٹال سے ۱۰

ادبی رفیق

پنڈت گوپی ناتھ سنہا ایڈوکیٹ میرٹھ۔
اقبال احمد بی اے (علیگ) ایڈوکیٹ میرٹھ
سید محمد یحییٰ امیر مٹی
سید حسن برنی بی اے ایڈوکیٹ
سید عنایت علی بی اے (علیگ)
محمود الحسن صدیقی بی اے (علیگ)
سید فرید جعفری مجلی شہری "مدیر لیلے"
مہر لال ضیا فتح آبادی ایم اے۔
حفیظ بی اے بریلوی
سید عبد القیوم مہجور (فاضلِ عربی)
اختر حسین رائے پوری بی اے (علیگ)
عبد الباری آسی شوکت تھانوی۔
امین سلونوی و حکیم یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگِ خیال"
شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی
سید علی سکندر جگر مرادآبادی
عبد الاحد شرف الدین پوری (فاضل عربی)
سید محمد یحییٰ تنہا بی اے (علیگ)
میاں حسن لطیفی بی اے۔

مدیر مسئول: ساغر نظامی

ارشاداتِ عالیہ

نتیجۂ فکر ہز ایکسلنسی راجہ راجگان مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت و صدرِ اعظم بابِ حکومتِ سرکارِ عالی

در شبِ ہجر چہ اندیشۂ محشر دارم
شور فریاد ہماں است کہ در سر دارم

سوزِ پنہاں کہ بسودائے تو در سر دارم
سینہ آتشکدہ و دل چو سمندر دارم

محتسب بر درِ میخانہ نشست چہ باک
بشکنم توبہ و مُہر از سرِ خم بردارم

آنکہ منصورِ سر افرازی و خوش بختی بود
بر سرِ خویش ز الطاف پیمبر دارم

بچہ کار است ندانم نہ خط آورد نہ برد
چندے امید ز پروازِ کبوتر دارم

جلوۂ روئے دل افروز ترا می بینیم
روز و شب در برِ خود ماہِ منور دارم

طالعم بیں کہ نشستم بدرِ خلوت دوست
تخت جم دارم و ہم بختِ سکندر دارم

پاسباں را نہ شناسم نہ کسے دیگر را
بر درِ دیر و حرم بالش و بستر دارم

مشکلے نیست رسیدن بحقیقت اے شاد
گر سرِ صحبتِ سلمان و ابوذر دارم

فہرست مضامین

ایشیا بابت ماہ جولائی ۱۹۳۵ء

جلد ۱ نمبر ۱

تصاویر

(۱) خیّام کی رباعی کا ایک تصویری تخیل (۲ و ۳ و ۴) انگریزی گرجاؤں میں دستک دینے کی گھنٹیاں (۵) نواب میر یوسف علیخاں بہادر سالار جنگ ثالث (۶) سر تیج بہادر سپرو۔

(۷) مسز سروجنی نائیڈو (۸) سیٹھ محمد علی خیلار

نشاطِ آغاز

دوشینہ شکستیم بیک توبہ دو صد جام
امروز بیک جام دو صد توبہ شکستیم

کامل ۵ سال کے بعد وقت، ذوق اور احساسِ فرض نے میرے شانوں پر پھر وہ مقدس بار رکھ دیا جس کو آغازِ بے شعوری سے شعورِ ادراک کے انجام تک اٹھائے رہنا میری قسمت ہے۔

میری ادارتی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۱ء تک بہر حال جاری رہی اس کے بعد میں نے کسی جریدہ کو مرتب نہیں کیا ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ ایک وقفہ فکر و استغراق تھا۔ اس وقفہ میں میں نے صرف اُن ماؤف مقامات کو معلوم کیا جن پر نشتر زنی فرض تھی خواہ وہ میرے ہاتھ سے ہو یا نشترِ قدرت کے ذریعہ، مگر کمزور انسان کی کیا مجال ہے کہ وہ پیکرِ جہل کی جراحی کر سکے، یہ تو کچھ قدرت ہی کے دستِ اقتدار میں ہے کہ انسانی ذہن و دماغ سے وہ پردے اٹھائے جنکی دبازت کو انسانی فکر کا نشتر چاک نہیں کر سکتا۔

لیکن بہر حال یہ قدرت کا کام تھا اور قدرت ہی نے وہ فضا پیدا کی جو مستقبل کے لئے لازمی و ضروری تھی اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ایک ایسے نئے نقشے کی ترتیب لازمی تھی جسکے حدود واربعہ قطعی جدید اور جس کا ہر خط بالکل نئی بنیادوں پر مبنی ہو۔ چنانچہ وہ نقشہ بنایا گیا اور اس کے مطابق وہ تعمیر مکمل کی گئی جو آج آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہ تعمیر بظاہر شاندار ہے نہ اتنی مستحکم کہ ادنیٰ سا ادنیٰ دعویٰ کرنے کی جرأت بھی ہو سکے۔ مگر جو کچھ بھی ہے خود اعتمادی، محنت، محبت اور سچائی کی بنیادوں پر قائم ہے اور شاید اس کے ذرہ ذرہ میں انسانی خدمت گزاری کا جذبہ جوش زن ہے۔

دراصل یہ بھی کوئی بلند بات نہیں کہ جذبۂ خدمت گزاری کا ڈھول پیٹا جائے، خدمت ہمیشہ خدمت کیلئے ہونی چاہئے اور خادم کا فرض ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد سب کچھ بھول جائے، بھول جائے اور بھول کر مر جائے، کہ خود فراموشی کے ساتھ اس طرح موت حیاتِ جاوید کا دیباچہ ہوتی ہے۔ مگر مرنے کے بعد حیاتِ جاوید کا تخیل بھی میرے نزدیک کوئی اعلیٰ تصور نہیں۔ یہ تو گویا اپنے اعمال کی تجارت ہے کھلے بندوں مجاہدۂ حیات کا سودا ہے پھر کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے اگر زندگی کے مخصوص اور شدید راستوں پر سفر نہ کیا جائے تو نابیاری یا رسمی زندگی کو اصولِ زندگی قرار دیا جائے تو راحت ہی راحت ہے مگر مجاہد کی طرح زندہ رہنا اور شہید کی طرح جان توڑنے سے پہلے اپنی جانبازیوں کے اپنی زبان سے گیت گانا اول درجہ کی بے دماغی اور بدترین مغالطہ ہے۔

اسی لئے میں اپنا یہ سفر اُن راہوں پر شروع نہیں کرتا جو دوسروں کے خیال میں راست ہیں بلکہ میں ان خطوط پر سرگرمِ جد ہونا چاہتا ہوں جو خود میرے ہی تفکر کا نتیجہ ہیں اور جن کی صحت پر میں اعتقادِ کلی رکھتا ہوں گو میں جانتا ہوں کہ میری ہستی ایک مزدور خادم سے زیادہ نہیں۔

ادبی مرکز کی تشکیل، ساغر پریس کے قیام، مکتبۂ ساغر کی ترتیب اور "ایشیا" کے اجراء کے بعد مجھے بلند آہنگی سے کام لینے کا حق حاصل ہو گیا ہے لیکن میں اس بلند آہنگی کو بازاری دعا فروشوں کی مصنوعی اور پُر فریب صداؤں کے مماثل خیال کرتا ہوں۔ اور "ایشیا" کے صفحات کو بے انتہا دعووں کی پوٹ نہیں بنانا چاہتا بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "ایشیا" اپنے ناظرین کیلئے مطالعہ کا بہترین سامان اور انسانی روح و دماغ کی نشو و نما و تفریح کے لئے لطیف ترین ادب پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا اور اپنے مقاصد کے مطابق اور ماورائے مقاصد اپنی ادبی جد و جہد کو جاری رکھے گا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے ملک اچھی طرح واقف ہے کہ میں اپنی تمام زندگی ادب کی طالب علمی کے لئے وقف کر چکا ہوں اور زندگی کا ہر حربہ اسی رنگ میں رنگا جا چکا ہے۔ شوق اور ذوق نے میرے شانوں میں جو شہپر پیوست کر دئے ہیں۔ اگر میں ان کو نوچ کر نذرِ آتش بھی کر دینا چاہوں تو نہیں کر سکتا، اور اگر ان شہپروں کے ساتھ بے ادبی و بے عملی کی دُنیا میں ٹھوکریں کھانا چاہوں تو خود میری سوائی انگشت نمائی کے عجیب عجیب موقع پیدا کر دے گی۔ اس لئے اُڑتے رہنے ہی میں عافیت محسوس کرتا ہوں ——

—— سو اُڑ رہا ہوں جس طرح اُڑا جا رہا ہے۔

لیکن محض ایک مرغِ صحرا کی پرواز کبھی فضا کے حسنِ تمام کا باعث نہیں ہو سکتی۔ ذرا اُس منظر کا تصور کیجئے جب بگلوں کے قافلے قطار اندر قطار درختوں نہروں اور کھیتوں سے بہت اونچے نیلگوں آسمان کے سایہ میں پرواز کرتے ہیں اور تمام ماحول ایک کیفیتِ پرواز سے لبریز نظر آتا ہے۔ جہاں تک مجھ شکستہ پر کا تعلق ہے باوجود بے بال و پری کے ہر ممکن جہد کئے جاؤں گا۔ لیکن ہم صفیروں کے اتحاد کی بھی ضرورت ہے میں اُڑتا ہوں مگر ہم مذاقانِ چمن کو یوں پر تولے بیٹھے رہنا زیب نہیں دیتا۔

خدا کا شکر ہے کہ میں اُن "بر خود غلط" لوگوں میں سے نہیں جو سوائے اپنے ہر ایک کو "حرفِ فضول" خیال کرتے ہیں میرا تو اعتقاد ہے کہ اجتماعی کام ہمیشہ اجتماعی طور پر ہی سرانجام ہو سکتے ہیں اور اس اعتقاد کی بنا پر میں تمام نوجوانانِ ادب کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ "ایشیا" کو نوجوانوں کا نمائندہ یقین کر کے اور اس کے اوراق کے ذریعہ انسانی فلاح و بہبود خصوصیت کے ساتھ مشرق کے لئے بہتری کی فضا پیدا کریں۔ کہ وہ اس کا حقدار ہے۔

آج ہم جس منزلِ حیات تک آ پہنچے ہیں وہاں پہنچکر ہمارا فرض "با عزت زندگی" حاصل کرنا ہے۔ یہ با عزت زندگی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے؟ بے خوفی اور خودداری کو ایمان بنا لینے سے، قدامت کی ہر زنجیر توڑ کر پھینک دینے سے یعنی ہر قسم کی غلامی کی بیڑیاں کاٹنے کی بنیادی سامان کر لینے کے بعد ہی ہم یہ ذی عزت زندگی یقینی طور پر حاصل کر سکتے ہیں جو دُنیا میں ہر انسان کا قدرتی حق اور فطری مقصودِ حیات ہے۔

آخر میں میں اپنے ان تمام ہم نواؤں کا شکر گزار ہوں جن کی مشورت اور امداد نے میرے عزم کو ہمت بخشی اور میں اتنے عظیم کام کیلئے قدم اُٹھا سکا۔ "ایشیا" کے موجودہ نمبر کو دیکھکر اس کے تمام کام کا اندازہ کرنا تعجیل شوق ہوگی میں "ایشیا" کو جس قدر جامع جسقدر حسین اور جسقدر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاندار بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا لیکن شاید تکمیل کے بعد تنزل کی طرف رجوع کرنا بلند بات نہیں لیکن عدمِ تکمیل کی منزل سے بتدریج ارتقا کی طرف بڑھتے رہنا بیک وقت تکمیل کی طرف دوڑ کر گر پڑنے سے بہتر ہے مجھے اُمید ہے کہ ہر ماہ "ایشیا" کو زرنگار حُسن اور گوناگوں ترقی سے ہمکنار کرنے میں کامیاب ہوتا رہوں گا اگر خدا کی توفیق اور مخلصین کی اعانت شاملِ حال رہی۔

خاکسار
ساغر نظامی

"ادبی مرکز"
میرٹھ

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
شاد عظیم آبادی

ماہنامہ ایشیا

جلد ۱	ایشیا بابت ماہ جولائی ۱۹۳۵ء	نمبر ۱

اذکار و مباحث

ایشیا میں بیداری کی بے پناہ موج

اب یہ حقیقت مکمل طور پر واضح ہوگئی ہے کہ سویا ہوا ایشیا غفلت اور بے کیفی کی نیند سے بیدار ہوچکا ہے۔ نسل انسانی کے دو تہائی حصہ میں بیداری کی وہ حرکت سریع محسوس کیجا رہی ہے۔ جو قدرتی ضرور ہے لیکن مغرب کے نزدیک اس قدر جلد متوقع خیال نہیں کیجاتی تھی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بیداری مقدس اور شاندار بیداری اپنے پہلوؤں میں کس انجام کو پوشیدہ رکھتی ہے اور اس کی موجیں اپنی ہواجی کا کیا مقصد رکھتی ہیں لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ مغرب اس سے شدید طور پر متاثر ہے۔ اور اپنے لئے ایک خطرہ عظیم محسوس کر رہا ہے۔ ایشیا کی اس بیداری کی تحریک اور اس کی باگ ڈور جاپان کے ہاتھ میں ہے۔ جو دنیا کی دو عظیم قوتوں کے ساتھ بحری مساوات کا مطالبہ کر چکا ہے۔ مدبرین کو خدشہ ہے کہ بحرالکاہل . . . . دنیا و امن دنیا کے لئے ایک سخت خطرہ کی صورت میں بدل جانے والا ہے جس کا مقابلہ دنیا کی ہر طاقت کے لئے غالباً ناگزیر ہو جائے گا۔

مشرق کی اس موج بیداری کے شباب سے اندازہ ہوتا ہے کہ بوڑھی دنیا کے مجوزہ اور مستعملہ نقشہ میں بالکل نئے خط پڑتے نظر آتے ہیں اور ایک قطعی نئی صورت حال پیدا ہو رہی ہے یورپ کے عاقبت اندیش مدبرین اپنی تہذیب کے تحفظ کی اپیل کر رہے ہیں اور "شاندار امن" پیدا کرنے کی عظیم الشان آرزو کو آزادانہ بیان کرتے ہیں یہی نہیں بلکہ اتحاد بین المغرب" کے لئے چیخ رہے ہیں۔ حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ ایشیا کے مقابلہ میں حقیقی طور پر کبھی یورپ کو متفرق و مختلف نہیں دیکھا گیا۔

وہ کہتے ہیں کہ مشرق کی یہ بیداری دنیا کے امن کے لئے مضر ہے اور اس کی "روک تھام" کرنی چاہئے۔ تاکہ امن عالم بحال رہے۔

اس عاقبت اندیشی کے طلسم کو پارہ پارہ ہوتے دیکھ کر ندیم ایشیا نے کہا ہے کہ ؎

اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ

یورپ کو مستقبل قریب میں جاپان سے سخت خدشے معلوم ہوتے ہیں اور بلاشک چین میں جاپان کی حکمت عملی ان خدشات کی بڑی حد تک چغلی کھاتی ہے۔ لیکن جہاں تک چین کا تعلق ہے اسپر عرصہ دراز سے مختلف طاقتوں کی نگاہ شوق پڑتی رہی ہے۔ اور وہ جاپان ہی کیا روس اور امریکہ کی بھی جولانگاہ شوق ہے۔ وہ تو ایک قمار خانہ سیاست ہے جہاں دن رات ہر طاقت اپنی اپنی قسمت کی بازی لگاتی ہے۔ اور فتح و شکست کا تماشہ ہوتے ہوتے رہجاتا ہے۔

لیکن بہر حال جو کوئی بھی ایشیا کی بیداری سے آتش زیر پا ہے وہ گویا نظام قدرت کے مسلمات کو جھٹلانا چاہتا ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ مشرق اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ غلام اور بے بس ہے تو قانون قدرت کے مطابق اس کی غلامی اور بے بسی ختم ہونے کے بعد اعادۂ شعور کا عمل لازمی طور پر ہونا چاہئے کہ بے ہوشی کے بعد ہوش اور تخریب کے بعد تعمیر لازمی ہے۔ آج اگر وہ مشرق جو سینکڑوں تمدنوں سینکڑوں تہذیبوں اور بیحد علوم و فنون کا گہوارہ رہا ہے جو دنیا ہے مذاہب کا اور مرکز ہے۔ روحانیت وارتقائے انسانیت کا تو کیا ذکر اس کی نوجوانی کی انگڑائی سے دنیا میں تباہی آجائیگی ہم جانتے ہیں کہ دنیا کی تباہی کا مغرب کو اس قدر خیال نہیں ہے جس قدر کہ وہ مشرق کی تعمیر سے لرزہ براندام ہو رہا ہے۔

لیکن بہر حال مغرب ہو یا مشرق۔ یہ قدرت کا نظام ہے کہ جاگنے والوں کو نیند آئے اور سوتے ہوئے بیدار ہو جائیں اس لئے اس بیداری کو جو ایران، ہندوستان افغانستان اور تمام تر اعظم ایشیا میں پیدا ہوئی ہے جس کو غیر قدرتی اور غلط نہیں کہا جا سکتا۔

یہ بیداری مشرق کے باشندوں میں بتدریج بڑھتی جا رہی ہے اور ایشیائی ہونے پر افتخار و سرفرازی کا جذبہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے ؎

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

ہندوستان باوجود اپنی انتہائی قید و بند کے جو اس کی مجلسی زندگی کو بھی متاثر کئے ہوئے ہے آزادی کا بے پناہ جذبہ اپنے اندر رکھتا ہے اور اپنی داخلی سیاست کی بے پناہ گتھیوں کے سلجھانے کے لئے کام کر رہا ہے وہ غلامی کی زنجیروں کو پاش پاش کر دینا چاہتا ہے اور مجموعی طور پر ہر شخص دل سے آزادی کا خواہاں ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ اس کی اس خواہش کو قانون اور خود اس کا افلاس کچل دینے کے لئے آمادہ رہتا ہے لیکن یہ خواہش اس کے دل میں اس درجہ جاگزیں ہو گئی ہے۔ کہ مٹائے نہیں مٹتی اور نہیں مٹنی چاہیئے۔

اس جاوید آرزو کے شعلے کی روشنی میں ایشیا کی نئی قسمت کے مقدس سراج منیر کی عالم افروز روشنی نظر آتی ہے۔ یقیناً ہندوستان کی آزادی تمام ایشیا کی آزادی ہے۔ اور ہم رفتہ رفتہ اس آزادی کے مقدس مندر کے قریب ہو رہے ہیں۔

ابی سینا اور اطالیہ

کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ اور موجودہ حکومتیں قدیم حکومتوں کی طرح ملک گیری کی ہوس کو ایک غیر انسانی اور مجرمانہ فعل خیال کرتی ہیں۔ لیکن آئے دن کی باہمی آویزشیں یہ بتاتی ہیں کہ "جمہوریت" محض ایک بہانہ ہے ورنہ حقیقی طور پر یورپ جو اس تصوّر کی تخلیق کا دعویدار ہے سخت متکبر اور شخصیت پرست واقع ہوا ہے۔ جہاں تک نظام ہائے سلطنت کا تعلق ہے جمہوری بنیادوں پر قائم ہے لیکن اعمال اور نتائج اسکے خلاف بالکل شخصیت پرستی پر منتج ہوتے ہیں

یہ خیال ایک بڑی حد تک درست ہے کہ یورپ میں آزادی کے جذبات کا زوال ہو رہا ہے اور مغربی حکومتیں نئے تجربات میں مشغول ہیں۔ جرمنی نے اس کی نمایاں مثال پیش کی ہے اور جو کچھ وہاں ہوا ہے یا ہو رہا ہے وہ اس دعوی کی دلیل ہے کہ ہٹلر تنہا طور پر جرمنی کی قسمت کا مالک ہے۔

اسی طرح موسیولینی جس کا پیام ہی دنیا کے لئے جنگ ہے ایک آہنی قسم کا انسان ہے اور اٹلی اس کے پنجہ آہنی میں ایک شاہین کی طرح اسیر ہے۔

اس کے پیکر میں قدیم روم کی جبیل روح ہے اور اس کے دماغ میں وہ استبداد ہے جو رومن دماغ کی خصوصیت تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کے جدید نقشۂ عمل کو دیکھا جائے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اٹلی کی جغرافیائی توسیع کا خواہشمند ہے اور اٹلی ابی سینا کی صلح کے امکانات کو ٹھکرا دینے سے بھی یہ واضح ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ارادے کی پختگی میں کوئی نرمی پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کی تازہ تقریر جس میں اس نے کہا ہے کہ اٹلی نے کبھی کسی سے منہ کی نہیں کھائی" اس کے ارادوں پر روشنی ڈالتی ہے۔

آئیے ہم سمجھیں کہ اٹلی اور ابی سینا کی یہ کشمکش کا آخر راز کیا ہے۔ ابی سینا سے اٹلی کی جنگ کی اولین وجہ سرحد کے قضیہ کے متعلق بتائی جاتی ہے۔ فروری کے باہمی تصادم کے بعد اٹلی اور ابی سینا نے مجلس اقوام سے اپیل کی۔ موسیولینی نے لیگ آف نیشنیز سے مطالبہ کیا کہ ابی سینا کو مجلس اقوام سے نکال دیا جائے۔ اس کے بعد کہا کہ ۴۹۹۰۰ ڈالر تاوان وصول کیا جائے اٹلی سے معافی چاہے یہی نہیں کہ بلکہ اس کے جھنڈے کو سلامی دے۔

یہ وقفہ گفتگو دراصل ایک سیاسی فرصت حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ کیونکہ اس دوران میں وہ ہر ایک صورت حال کے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ اور فرانس و برطانیہ سے اس نے افریقہ میں اپنے ملک گیری کے ارادوں کو مکمل کرنے کے لئے رضامندی حاصل کر لی۔ نیز معاہدہ لوکارنو اور فرانس و برطانیہ سے ہوائی معاہدہ کا حامی ہو جانے پر وعدوں کی مہر لگا دی۔

ابی سینا عیسائی شہنشائیت کے تابع ہے اور اس کی آبادی میں علاوہ عیسائی رعایا کے مسلمان بھی کافی ہیں۔ موسیولینی کا مقصد ابی سینا سے جنگ کو ناگزیر بنا دینے سے صرف یہ ہے کہ وہ افریقہ میں اپنی حکومت کی توسیع کرے اور ابی سینا پر قدرت حاصل کرنے سے اس کا بہت بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ ابی سینا کے علاقہ میں لوہا۔ تانبا۔ پیتل۔ ابرق۔ سونا۔ چاندی۔ پلاٹیم۔ ہاتھی دانت۔ قہوہ تمام خام مسالے موجود ہیں۔ اور جس طرح فرانس کو اس کا شام کا علاقہ جنگ کے اوقات میں عسکری امداد دے سکتا ہے اسی طرح ابی سینا بھی فوج دے سکتا ہے۔

لیکن بہر حال اطالیہ کی یہ خواہشات یورپ کے امن سے ٹکراتی ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان طاقتوں کی جنگی آرزوؤں کا انجام کیا ہوگا۔ بہت اچھا ہوتا اگر "انسانیت" کے اس تصوّر کو دنیا سے مٹا دیا جاتا جس کی جمہوری اور فارغ روح کے دعوے یورپ کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ اسوقت یورپ کے جو سیاسی حالات ہیں وہ ہرگز عمتماد اور اطمینان کے قابل نہیں ہیں۔

مسلمانوں میں زندگی کی روح افزا تڑپ

سچ ہے مکر وفریب کی عمر زیادہ نہیں ہوتی اور وقت خود ان حقیقتوں کو ہمارے سامنے لے آتا ہے جن کے خلاف منافق اور گمراہ کن طبقے عوام کو باطل اور فریب کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ چند سال پہلے مسلمان سیاسی اور مجلسی معاملات میں فرقہ پرست اور قدیم الخیال تھے۔ اور ان کو حالات کے ساتھ ساتھ فرقہ پرست اور خود غرض رہنماؤں نے غلط عقائد پر راسخ کر دیا تھا۔ لیکن تین راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں ان کے نتائج خصوصاً کمیونل ایوارڈ مسلم کانفرنس اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے اندرونی مساعی کے انکشافات نے مسلم رائے عامہ میں تبدیلی اور نرمی پیدا کرنے کا قدرتی موقع پیدا کر دیا ہے۔ اور ہر ملک کی نئی سیاسی صورت حال اور اسمبلی و کونسل میں کانگریس کی

نمایاں کامیابی سے ان تمام حقائق کا اندازہ ہوگیا جن پر غور کرنے کا موقع وقت نے نہیں دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ نوجوان نسل کی نمائندگی کرتے ہوئے میں پُر زور الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کو اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے کہ مذہبی و مجلسی اور سیاسی طور پر وہ زندہ نہیں رہ سکتے اگر انہوں نے اپنی زندگی میں انقلاب پیدا نہیں کیا۔

چنانچہ زندگی کے لمحہ بلمحہ مطالعہ اور ہمسایہ قوم کی روز افزوں بیداری و ترقی سے قدرتی طور پر متاثر ہو کر مسلمان قوم کے مفلوج پیکر میں زندگی کی نئی روح کار فرما معلوم ہوتی ہے جو ایک عظیم بیداری کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روح تمام حصص جسم میں زندگی کی موج نہیں دوڑا دیگی۔ گذشتہ برس کے دوران میں مسلمانوں کے لیڈروں نے اپنی قوم سے جو وعدے کئے تھے اور عوام کو آزادی کی تحریکات میں شریک ہونے سے دامن پکڑ پکڑ کر بٹھایا تھا اس کی تمام حقیقت طشت از بام ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ سمندر پار سے آنے والے "تحفۂ آزادی" کا جو شدید انتظار تھا وہ مایوسی کے ساتھ ختم ہو چکا ہے اور مسلمان سمجھ چکے ہیں کہ ان کے وہ رہنما جو ان کی ترقی اور نئی زندگی کے دعویدار تھے جھوٹے اور خود غرض تھے ان کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ وہ اپنی ذاتی جاہ و عظمت میں اضافہ کریں اور نئے ہندوستان میں اپنے لئے اقبال و ترقی کی نئی راہ کھولیں مجلسی طور پر وہ سمجھ گئے ہیں کہ اگر وہ اس لکیر کے فقیر بنتے جس کو وہ برسوں سے پیٹ رہے ہیں تو وہ نوجوان ہندو سے اس قدر پیچھے رہجائیں گے کہ ایک دن اس کا سرِ دامن چھونا بھی ان کے لئے ناممکن ہو جائیگا۔

چنانچہ عام طور پر سوشل زندگی میں آزادی اور استواری کے جذبات کی تیز روپائی جاتی ہے اور انکی نگاہوں سے برستا ہے کہ حالات اگر موقع دیں تو وہ قدامت کی اس جھول کو جو صدیوں سے ان کے وجود کے دوش نازک پر بارِ عظیم ثابت ہو رہی ہے۔ دُہم سے پٹک دیں اور اپنی ہستی کی نئی جلوہ آرائیوں سے دنیا جہان کو خیرہ کر دیں۔

وہ اخبار و رسائل جن کے لب اظہارِ حق کو جرم و کفر کا درجہ دیتے تھے اب آزادانہ ان حقائق کو بیان کرتے ہیں جو مسلمان کی سیاسی و مجلسی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو اعتراف ہے کہ وہ غلط راہ پر تھے۔ وہ اب اس راز کو سمجھ گئے ہیں کہ مسلمان قوم اسوقت تک زندہ نہیں رہ سکتی جب تک کہ وہ مجاہدانہ طور پر میدان میں نہ کود پڑے کہ آج سوال قدیم روایات زندگی کے بتوں کی پرستش کا نہیں ہے بلکہ اس نئے مندر کی تعمیر سب سے زیادہ اہم ہے جس میں بیٹھکر اپنی نئی زندگی کے عقیدہ حیات کی پوجا کیجا سکے اور بلا شک وہ لوگ فلسفہ جدید سے ناواقف ہیں جو اک عمر کے چھانے ہوئے راستوں میں زندگی کی راہ تلاش کر رہے ہیں وہ راستے زندگی پر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے اب نیا دور ہے اس لئے نئی راہوں پر سفر ناگزیر ہے ہم کو اسوقت زندہ ہونا اور زندہ رہنا ہے لیکن زندہ رہنے کے لئے خوش یقینی کی ضرورت ہے۔ خودی کی ضرورت ہے۔ خودداری کی ضرورت ہے۔ محنت کی ضرورت ہے خود اعتمادی کی ضرورت ہے اور آزادی کی ضرورت ہے۔ یقین کرو کبھی مذبذب قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجاہدۂ حیات کے دوران میں بے پردگی اور پردہ داری، جہل و علم، آزادی و قید، ریش و بے ریشی، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے بے ضرورت خیالات میں قید رہنا خود کو زندہ دفن کر دینے کے مترادف ہے۔ ؎

حیات کیا ہے! خیال و نظر کی مجذوبی — خودی کی موت ہیں اندیشہ ہائے گوناگوں۔

سنو مسلم کانفرنس کا صدر اقبال آج کیا کہتا ہے۔ ؎

تو ابھی رہگذر میں ہے قیدِ مقام سے گذر — مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر

وہ اقبال جو سیاسی اور اخلاقی طور پر قطعی قدیم الخیال ہے بے تابانہ چلاتا ہے ؎

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور — ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر

جس کا اعتقاد سیاسی طور پر صرف غلامیٔ افرنگ تھا وہ مسلمانوں سے خطاب کرتا ہے ؎

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار — طائرک بلند بال دانہ دام سے گذر

وہ مغربی تہذیب و مغربی کلچر کو "دانہ دام" سے تعبیر کرتا ہے اور دنیا کی فضاؤں سے بلند ہو کر فرشتہ وار لاہوتی نغمہ گاتا ہے۔

جس کا عمل ہے بے غرض اسکی جزا کچھ اور ہے — حور و خیام سے گذر بادہ و جام سے گذر

عمل کی روحانیت اور افضلیت کا اس سے بہتر بیان اور کیا ہو سکتا ہے۔ وہ جزا کیا ہے! جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے وہ جزا "حیات" ہے اور محض حیات نہیں حیات جاوید جو اسی وقت نصیب ہو سکتی ہے جب کسی قوم کی زندگی شانداری اور عزت کے ساتھ بسر ہو۔ تاریخ کے صفحات روزانہ ان قوموں کے لئے لعنت کے سامان مہیا کرتے ہیں جنہوں نے زندگی کو نہیں سمجھا اور ہر صبح برکت و رحمت کا قصیدہ گاتی ہے ان اقوام کی شان میں جنہوں نے زندگی کی قدر کی۔ خدا کا شکر ہے کہ بالآخر مسلمانوں میں ایک حرارت خفی کے آثار پائے جاتے ہیں جو ان کے رگ و پے میں تازہ اور جوان خون پیدا کر کے رہے گی۔ آخر ؎

کب تک رہے محکومیٔ انجم میں میری خاک — یا میں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے

فراموش کار دوستوں سے

اگر محض دوستی اور اس کے نتائج سے لطف اندوز ہونے اور زندہ رہنے کا سوال ہوتا تو اس سے زیادہ دلچسپ اور شاعرانہ کیفیت اور کیا ہو سکتی تھی کہ میں اپنے دوستوں کی فراموش کاریوں کے تصور میں ڈوبا ہی رہتا۔ نہ خو چھوڑنے کا شکوہ ہوتا نہ "وضع" پر خوددارانہ اصرار، نہ "سبک سری" کی نوعیت اور نہ "سرگران" ہونے کے متعلق استفہام مگر آج سوال ہے کام کرنے کا اس لئے عملی توازن کے لحاظ سے "وجدان" کو نظر انداز کرنے کے بعد کام کرنا چاہئے۔ یہ حقیقت غالباً ذکر کرنے کے قابل ہے کہ میں ہندوستان میں اپنے دوست ہی کی دوست رکھتا ہوں اور میں نے اپنے خیال میں کبھی کسی کو دشمن نہیں سمجھا۔ پھر اس کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی تقسیم کیجائے۔ یعنی ؎

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

میں اپنے تمام واقف کاروں اور دوستوں کو "وہ فراموش کار ہوں یا یاد رکھنے والے" زندگی اور عمل کی طرف آواز دیتا ہوں۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی رہبری اور مخلصانہ امداد و مشورہ سے میری مدد فرمائیں اور متحد ہو کر قومی خدمت میں میرا ہاتھ بٹائیں ؎

"گرم فغاں ہے جرس اٹھ کہ گیا قافلہ"

معذرت

عین اسوقت جبکہ ایشیا کے موجودہ نمبر کی طباعت کا کام شروع ہونے والا تھا کہ مجھے مجبور کر دیا گیا کہ فردوس کشمیر کی سیر کے لئے روانہ ہو جاؤں۔ ایک وقت تو وہ تھا کہ سیر کشمیر کی آرزو بیتاب کئے ہوئے تھی لیکن جس وقت قدرت نے اس کے سامان بہم پہنچائے تو میں بہت رد و کد کے بعد کشمیر کے لئے روانہ ہو سکا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ کشمیر کی سیر کرنے کے لئے بہت بڑی قربانی کرنی ہوگی۔ ادھر بادہ مشرق کا کام آخری منزلوں میں تھا ادھر ایشیا کی تیاری۔ کوئی شک نہیں کہ اگر میں کشمیر نہ جاتا اور وہاں تقریباً ۲۰ روز صرف نہ ہو جاتے تو اسوقت تک دونوں

چیزیں کبھی کی شائع ہو چکی ہوتیں۔ یہ معذرت فرض شناسی کی مادیت کی ادنیٰ مثال ہے۔ ورنہ جہاں تک کشمیر اور اس کے تمام جمالیاتی تعلقات کا تعلق ہے وہ حقدار ہیں کہ یہ وقت اور زندگی دونوں انہیں خوشی سے نذر دیدیجائیں۔ اگر میرا شمار موجودہ زمانہ جد وجہد وعمل کی مخلوق میں نہ کیا جاتا تو مجھے کاموں کی تاخیر اور حسب آرزو تکمیل نہ ہونے کا ہرگز افسوس نہ ہوتا۔ لیکن ایشیا کی اس بارہ کی اشاعت میں تاخیر ہو جانے کی اور اس نمبر میں کتابت کی بعض غلطیاں رہجانے سے مجھے تکلیف ہوئی۔ کاپیاں اور پروف میری نظر سے نہیں گذرے۔ ناظرین اپنے خیال میں ان اغلاط کی تصحیح فرمالیں

آخر میں میں مسٹر اقبال احمد بی اے ایڈوکیٹ۔ اعظم صاحب اور راحد صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ایشیا کے اہتمامات میں مجھے بیحد مدد دی۔ گو میں جانتا ہوں کہ ان سب کے خلوص کو میرے شکریہ کی ضرورت نہیں ہے۔

یادِ رفتگان

آغا محمد شاہ حشر کاشمیری

ہندوستان کے ادیب شہیر حضرت آغا محمد حشر کاشمیری جنکا انتقال لاہور میں ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو ہوگیا، ملک کی ان عظیم ہستیوں میں سے تھے۔ جو انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے قومی لٹریچر علی الخصوص اردو وہندی ادب کو آغا حشر کی موت سے ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے۔ وہ ایک جامع کمالات وصفات انسان تھے اور سچے قوم پرور تھے ان کی ادبی طاقتیں تمام حیات اردو وہندی ادب کی ترقی و توسیع میں صرف ہوتی رہیں اور انہوں نے اپنے ڈرامہ کے ذریعہ وہ اصلاحی قومی اور مجلسی آزادی کی رُوح ہندوستانیوں میں دوڑائی جو اس سے قبل کسی نے نہیں دوڑائی تھی۔ وہ ہر قوم سے گہرے تعلقات رکھتے تھے اور ہر قوم کی مذہبی وتمدنی تاریخ سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں قومی عصبیت کا شائبہ بھی نہ تھا۔

اس وقوف اور خداداد عقل سلیم نے انہیں ہمیشہ فرقہ پرستی اور قوم فروشی سے دور رکھا انہوں نے جو کچھ کیا وہ ہندوستانی قوم کے لیئے کیا۔ اور انسانی ذہن ودماغ کے لئے وہ اپنی زندگی میں اسقدر لٹریچر پیدا کرگئے۔ کہ وہ قیامت تک ان کی عزت وعظمت کو انسانوں کے دلوں میں قائم رکھیگا۔ وہ حقیقی طور پر نیشنل ڈرامانگار خوش فکر قومی شاعر اور جادو بیان مقرر تھے۔ انہوں نے اپنی جادو بیانی او معجز نما آرٹ سے تمام ہندوستان کے قلوب کو مسخر کر لیا تھا۔

ہندی زبان کے "نورتن" کے بعد آغا حشر پہلا شخص تھا جسنے ہندو قوم میں ہندی زبان کے احیا کی تحریک کو راسخ کیا اور اردو وہندی زبان کا ایسا نکھرا ہوا معیار پیش کیا۔ جو اس سے پہلے کسی ہندی شاعر اور ادیب نے پیش نہیں کیا تھا۔ آغا حشر کی عظمت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کہ انہوں نے ہندوستان کی مختلف تہذیبوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اپنے وطن پرور قلم سے تمام قوموں کو ایک مرکز پر متحد کرنے کے لئے کام کیا۔ مجھے انکی موت کا صرف ایک ہم عصر اور ہم مذاق ہونیکی حیثیت سے ہی رنج نہیں ہے بلکہ گہرے دوست ہونیکی حیثیت سے بھی میری آنکھیں ان کے لیے غمناک ہیں۔ میں اس غم میں جوان کی المناک موت سے ان کے بھانجوں اور خصوصاً ان کے چھوٹے بھائی جناب محمود کو ہوا ہے دل سے شریک ہوں اور ایشیا کی کسی اشاعت میں "آغا حشر کے ساتھ چند دن" کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کرونگا جو ناظرین کی بہت سی دلچسپیوں کا موجب ہوگا۔ خدا ان کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

میر سید ممتاز علی

آغا حشر کے بعد ہی تہذیب نسواں اور دار الاشاعت پنجاب کے بانی میر سید ممتاز علی رحمۃ اللہ علیہ کی موت اردو دنیا کی انتہائی بدقسمتی ہے۔ ابھی ایک داغ مٹا نہیں تہا کہ دل پر دوسرا داغ لگا۔ میر سید ممتاز علی ان بزرگوں میں سے تھے جن کی ذات اردو زبان کے لئے نہایت مغتنم تھی اور جنہوں نے اپنے رسائل و اخبارات کے ذریعہ طبقۂ نسواں اور ہندوستانی ذہن ودماغ کے لئے بہترین سامان فراہم کیا۔

مجھے اس سلسلہ میں میر صاحب مرحوم کے صاحبزادے سید امتیاز علی تاج بی اے سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا ان کو صبر عطا فرمائے۔

مظہر حسین اختر میرٹھی

زندگی کا سب سے المناک فرض شاید اپنے کسی عزیز دوست کے لئے آنسو بہانا ہے۔ پھر رونا یہ ہے کہ یہ آنسو بہانا بھی اسکو زندگی بھر واپس نہیں لاتا۔ مظہر صاحب میرٹھ کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے، اردو ادب سے ان کو گہرا شغف اور اردو شاعری سے پختہ ذوق تہا۔ متقدمین ومتاخرین کا کلام انہیں ازبر تھا۔ حالیہ شعرا کے کلام کے متعلق روشن رائے رکہتے تھے۔ نہایت خلیق و شریف بیحد متواضع اور نیک۔ نہایت صابر و قانع اور بہت ہی بہتر انسان تھے۔ دن رات ان کے ساتھ صحبتیں رہتی تہیں اور میرے ان دوستوں میں سے ایک تھے جنکو میرے ہر کام سے گہری دلچسپی اور خصوصاً ادبی جد وجہد سے شغف تھا افسوس ہے کہ کئی ماہ کینسر کی تکلیف میں مبتلا رہ کر بالآخر مجلس کو سونا کر گئے۔ ان کی موت نے مجھے ایک مخلص ادبی رفیق اور ایک آزاد نقادِ امور سے محروم کر دیا۔ مجھے ان کے اعزا خصوصاً بیگم مظہر اور ان کے بھائی سید وصال حسین صاحب بی اے بی۔ ایس۔ سی سے دلی طور پر ہمدردی ہے۔ خدا مظہر مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ س

فروغِ شمع جواب ہے رہیگا صبح محشر تک — مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

ساغر نظامی

عمر خیام کی رباعی کا ایک تصویری تخیل

رُوح کا شعلہ

پٹ مندر کے کھول پُجاری پٹ مندر کے کھول،

پریم نگر سے آئی ہیں داسی پٹ مندر کے کھول ہیرے، موتی لائی ہیں داسی پٹ مندر کے کھول
وہ موتی ہیں تیج سے جن کی چندرماں چُھپ جائے وہ ہیرے ہیں جوت جنھوں کی سورج کو شرمائے
نینن کا کانٹا ہے ان کو اس کانٹے میں تول
پٹ مندر کے کھول

صبح سویرے چھیڑا کس نے بنسی کا یہ راگ آنکھ کھُلی ایسے ہیں میری، یہ بھی میرے بھاگ
کوئل، مور، پپیہا، شاما سب سوویں نر ناری گہرے سپنے میں ڈوبی ہے، سپنے کی متواری
سارا جگ مردہ ہے پُجاری، ہیرے موتی رول
پٹ مندر کے کھول

دور کہیں اک جھرنا گاوے سپنے کے سے راگ لٹنے کو ہے دن کے ہاتھوں، تاروں کا سُہاگ
سکھیاں اپنے ہٹ میں لیٹی کریں دلوں کی کھود جمنا دھُندلا درپن ہے اور پنگھٹ سونی گود
پنگھٹ پر ہر کوئی چُپ ہے گری، گگری، ڈول
پٹ مندر کے کھول

دو نینن میں سو آنسو ہیں دیوانی کی بھینٹ نین مرے ماٹی ہیں کیول، بھینٹ ہے یہ ان میٹ
اُس مندر کے کھول ذرا پٹ جس میں ہیں گردھاری وہ گردھاری جن پہ ساری دنیا ہے بلہاری
کب سے ہیں چینخوں بیچاری سُن تو میرے بول
پٹ مندر کے کھول

جیون میرا روپ بدل کر بن جائے ایک ہار اُن کے گلے کا ہار پجاری، میرا من سنگھار
مجھ کو گلے یوں پڑتے دیکھیں دیویں وہ من ہار گُندھ جاویں اک ہار میں دونوں سنسار اور ساکار
تجھ کو کیوں ہے عار پجاری کچھ تو مُنہ سے بول
پٹ مندر کے کھول

جیون کیا ہے ایک رسیلا اور امر سنگیت پریم نگر میں نہیں پجاری مر جانے کی ریت
جھانجھ کی لے پر دھرتی ناچے اور جھومے آکاس تال پہ میرے گھونگھرو کی ترلوک میں ہووے راس
میرے مَد کے آگے پُجاری دُنیا کا کیا مول
پٹ مندر کے کھول

میں پگلی، اب جاؤں کدھر کو پھوٹے مُنہ سے بول پٹ مندر کے کھول پجاری، پٹ مندر کے کھول
جوبن اور جوبن کی مستی سب کچھ بھینٹ چڑھاؤں جگ ڈھونڈے ہر رنگ میں مجھ کو میں اُس میں کھو جاؤں
پاگل، کامی، چنچل، پاپی مت ہو ڈانواں ڈول
پٹ مندر کے کھول

ساغر نظامی

مسئلۂ شرق اور ترک

ترکی قوم اور دُنیا میں اسلام کا مستقبل

پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے کہ "جو شخص منظر سے کام لیگا خود ہی فائدہ میں رہے گا اور جو اندھا بن جائیگا خود ہی نقصان اُٹھائے گا" مشرق نہایت بے صبری کے ساتھ مغرب کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اور اقوام عالم کے زمرے میں شریک ہونا چاہتا ہے خصوصاً مشرقی دُنیائے اسلام اپنی مشہور قدیم تہذیب کا واسطہ دیکر اتحاد بین الملل میں حصہ لینے کی خواہشمند ہے ان تحریکات کو جو حقیقتاً نہایت ہی پُر خلوص اصحاب الرائے کی تدبیر کا نتیجہ ہیں گندم نما جو فروش سیاست دانوں نے اپنے ہم خیالوں کے مفاد کے مطابق گڑھ لیا ہے اور جذبات انسانی کی دائمی کشاکش کی تنظیم کا سوال درپیش ہوتا ہے تو بہت اُلجھی ہوئی مبہم اور ناقابل عمل نظر آتی ہیں لیکن تاریخی ڈراما کے پردوں پر مشرق و مغرب کے تصادم کا جو منظر صدیوں سے ظاہر ہو رہا تھا اب نئی شکل اختیار کر بیٹھا ہے اور روز بروز ناگوار تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ دورِ حاضرہ کی جمہوریت اس مسئلہ کو طے کرنے میں جس قدر نا اہل ثابت ہوئی ہے انسانیت کا اُفق اُتنا ہی زیادہ دھندلا ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے خیالات میں کم از کم وہ صفائی اور سنجیدگی ضرور پیدا کرلیں جس کے بغیر ہمیں کوئی حق نہیں کہ صاحب غور کہلائیں نیٹشے نے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ تہذیب مغرب کی قسمت ایشیا کے معاملات سے کس قدر وابستہ ہے۔ اپنی تصنیف "ماورائے خیر و شر" میں وہ یورپ کا نام انتہائی غصّہ اور حقارت کے ساتھ لیتا ہے یعنی وہ ملک جو برِّاعظم ایشیا کا محض ایک منحوس جزیرہ نما ہے اور روحانی فوقیت کا دعویدار ہے صرف اس لئے کہ وہ موجودہ ایجادات کا بانی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ایشیا کی اُس روحِ رواں کو اب تک قطعی نہیں سمجھ سکا جو تمام بڑے مذاہب اور فلسفیانہ نظریوں کی (جو ہمیں ورثہ میں ملے ہیں) خالق ہے نیٹشے کے ان الہامات کی تصدیق واقعاتِ حالیہ نے پوری پوری کردی ہے۔

علم معاشرت نے بیشک یہ کوشش کی ہے کہ تمام مظاہرات تمدن کو محض واقعات اعداد یا صیغۂ ضوابط کی شکل میں لے آئے۔ لیکن مسائل انسانی کے اخلاقی اور روحانی پہلو نے مادہ پرستوں پر ایک زبردست انتقامی حملہ کر دیا ہے بلکہ ہر فرقہ کے وہ ماہران معاشرت اس سے اثر پذیر ہیں جنھوں نے اب تک صرف اس لئے ایشیا سے بے اعتنائی برتی کہ وہاں صنعت و حرفت کی کمی تھی کیونکہ ان کے نزدیک یہ کمی غیر مہذب ہونے کے مرادف ہے۔ اور اب تجارت بین الاقوام کے متعلق اپنے یقین باطل سے چونک کر مغرب کو اسی مشرقی مسئلہ کا ایک نئی اور شدید اضطراب انگیز شکل میں سامنا کرنا پڑا ہے۔

یورپ کی مادی ہوس نے جو سوال اول اول اٹھایا تھا اور جس پر عالمان دین کی دھواں دھار تقریروں نے مذہبی رنگ چڑھا دیا تھا۔ اب جنگ عظیم کے زمانہ سے وہ سوال اخلاقی اور روحانی عظمت کا حامل ہے یا بذات خود ایک معیار ہے جس پر اُن تاریخی قوتوں کا توازن کیا جا سکتا ہے جو انسان کو جدھر چاہتی ہیں ڈھکیل دیتی ہیں۔ ان تاریخی قوتوں میں اسلام ایک زبردست روحانی و اخلاقی جزو ہے جس سے چشم پوشی ممکن نہیں بشرطیکہ ہم کو مشرق اور مغرب کے آیندہ تعلقات کا مسئلہ طے کرنا ناگزیر ہو اسی وجہ سے عراق، عرب کی مردم شماری کی بہ نسبت ترکی کا انقلاب کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے جبھی تو یہ انقلاب اپنے گہرے معنی میں سیاست یورپ کے حدود سے باہر ہے جو اتنے عرصہ سے اپنے انہیں ترک نظریوں کا پابند چلا آتا ہے اور اپنی پُرانی روایات پر قائم ہے حالانکہ وہ ترکی کی صرف حالی حالت پر روشنی ڈال سکتا ہے اور اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرہی نہیں سکتا جو آجتک یورپ کے کسی مدبر نے نہیں سمجھی۔ ذرا غور تو کیجئے لاسین کانفرنس میں ترکوں کے خلاف بحیثیت ایک مسلمان قوم کے کتنی تجارتی، مالی اور انتظامی شکایات پیدا ہوئیں قسطنطنیہ میں فرنچ چیمبر آف کامرس کی درخواست پڑھئے جو معاشرتی فوائد کے موافق ہے اُن مذہبی بحثوں کو بغور سنیئے جو مشرق میں عیسائیوں کی بہبودی کو خطرے میں ڈالنے کے لئے کی گئیں اور اس درخواست کا مطالعہ کیجئے جس پر عیسائیوں اور یورپ کے تمام بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں اور امریکہ کی دینی جمعیت کے دستخط ہوئے۔ ان تمام پُر اثر درخواستوں کی تہ میں آپ کو روح ایشیا اور اسلام کے متعلق ہمیشہ خیالات باطل نظر آئیں گے۔ اسی لئے مجھے یہ ضرورت ہوئی کہ آپ کی توجہ مشرق کی اور خصوصاً اسلام اور ترکی کی روحانیت کی طرف مبذول کراؤں۔ اس کی اہمیت کم سے کم ان خطروں سے کسی حالت میں کم نہیں جو آجکل مشرق کے کاروبار پر چھائی ہوئی ہیں۔ آج دُنیا کے اتحاد روحانی کی اُمید کا انحصار سب سے زیادہ اس انقلاب پر ہے جو جلد یا بدیر ایشیا اور خصوصاً اسلام کی روح میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اسلام جس کی گزشتہ مسلمہ قوت و خوشحالی نے بیشمار حاسد پیدا کرلئے تھے۔ صرف اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اس کی آواز پر ہمدردی کے ساتھ کان لگائے جائیں یا مساوات کی درخواست پر توجہ کی جائے۔ ممالک اسلام میں جو خزانے پوشیدہ ہیں اُن کو نکالنے کے لئے اسلام سے دوستی کی ضرورت ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ دوستی معمولی سیاسی فریب کاریوں سے خریدنے کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ روح مشرق کی طرف ایک ہمدردانہ محبت بھری نظر کی متمنّی ہے۔

جس تحریک نے عراق عرب میں اتنا زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کی حقیقت

"ایشیا" میرٹھ

مغرب نے اچھی طرح نہیں سمجھی ہے یہ واقعہ صرف تاریخ ترکی ہی میں ایک خاص اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اس سے باہر بھی کافی اثر جمائے ہوئے ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس کی ابتداء اور کیفیت کو اختصار کے ساتھ بیان کر دوں اور وہ سیاسی نکتہ بتا دوں جو اس کی تہ میں موجود ہے۔

۲

دُنیائے اسلام اور ایشیا سے مغربی یورپ کے آیندہ تعلقات کا مسئلہ سیاست عالم کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور ایک نہایت گہرا اور فیصلہ کن سوال سمجھا جاتا ہے باسفورس سے گنگا تک، باکو سے ہرات تک، انگورہ سے کابل، دہلی، شملہ، کلکتہ، اور بمبئی تک ہر جگہ یہی سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ آیا یورپ اور ایشیا، مشرق اور مغرب ایک قابل رہائش دُنیا کی ازسرِ نو تعمیر کے متعلق کبھی دوستانہ وار ہمخیال ہو سکیں گے یا نہیں۔ یا پھر صاحبِ ہمت ہادیوں اور اعلیٰ دماغوں کے قحط کی وجہ سے یورپ ایک خالص مادّی تہذیب کا دیوانہ ہو کر آخرکار اپنی ظالمانہ کشمکش میں ایشیا سے مغلوب ہو کر بیٹھ جائیگا۔

تمام اہل معاشرتی تجاویز جو اصلاح یورپ کے سلسلہ میں زیر بحث ہیں صرف اُسی وقت قابل عمل ہو سکتی ہیں جب مسئلہ مشرق کسی ایسی نئی بنا پر پوری پوری طرح طے ہو جائے جو ہدایات عقل و فہم کے مطابق ہو یعنی حاکم بہترین طریقوں سے محکوم کی ایسی رائے حاصل کرے جو اس کی ضروریات پر حاوی ہو جس میں وحشیانہ استبداد یا تجارتی خود غرضیاں شامل ہوں اور جو رعایا کی فلاح و بہبودی کی پوری پوری موید ہو۔ ایک قوم پر دوسری قوم کے بے سوچے سمجھے معاشرتی حملے اب قطعی ناممکن ہیں ۱۷۷۶ء میں امریکہ کی جنگ آزادی جن معاشرتی اور نفسی خیالات کا نتیجہ تھی وہی اب ایشیا میں ہیجان پیدا کر رہے ہیں۔ اور جس معاشرتی عاقبت بینی یا ابتدائی عقل و دانش نے کنیڈا، آسٹریلیا، اور جنوبی افریقہ کو ایک بڑی حکومت کے رشتہ میں منسلک رکھا اب بھی شاید وہی اس شدید تنفر کو دور کر سکے جو مشرق میں ہر دل پر چھایا ہوا ہے۔ دُنیا کی جدید تعمیر کی تمام پُر فریب بڑی بڑی تجاویز ناکام ہو کر رہیں گی جب تک کہ مغرب اقوام مشرق کے لئے کوئی مناسب مقام تلاش نہ کرلے۔

حکمران اقوام میں قوم ترک بذاتِ خود اس رتبہ سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس پر وہ بلاشرکت غیرے زمانہ سے اب تک حکمران چلی آئی ہے۔ یورپ سے ایشیا کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کی کنجی ترکوں کے ہاتھ میں ہے، اور صرف اجازت چاہتا ہے، ان راستوں پر سے گزر سکے جو شخص اسلام پر حکومت کرے خواہ تلوار کے زور سے یا قوت روحانی سے ترک ہو یا انگریز فرانسیسی ہو یا روسی، وہی ایشیا کی کنجی اپنے قبضہ میں رکھتا ہے اور جو شخص ان کنجیوں کو اپنے ہاتھ سے نکل جانے دے خواہ وہ ایشیا ہی میں بڑے بڑے وسیع رقبوں کا مالک کیوں نہ ہو کبھی بے خوف نہیں بیٹھ سکتا ترکی کی اہمیت حقیقتاً اس امر میں پوشیدہ ہے جو تاریخ سیاست کی گزشتہ پانچ صدیوں نے ظاہر کر دیا ہے یعنی ایشیا سے متعلق بڑی بڑی قوتوں کے باہمی تعلقات کا دارومدار اسی قوم پر ہے۔ جنگ ترکی کے موقع پر جن احساسات و جذبات نے قسطنطنیہ کو دہلی سے متحد کر دیا تھا۔ وہ اس دعوے کی بین دلیل ہیں۔ لائڈ جارج نے بھی مجبوراً ہندوستان کے مسلمان نمایندوں کو اس بحث مباحثہ میں شرکت کے لئے مدعو کیا جو سلطنت برطانیہ اور ٹرکی کے درمیان ہو رہا تھا۔ یہ واقعہ چھوٹا سہی لیکن اہم ضرور ہے اور خود جس واضح طور سے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ انگلستان کے دل میں ترکی کتنی اہمیت رکھتا ہے تاریخ کے سو صفحے بھی مشکل سے پیش کر سکیں گے۔ فی الحقیقت اس بات کا اقرار بے خوف تردید کیا

جا سکتا ہے کہ موجودہ صدی میں جس میں ممکنات کی کوئی حد و شمار نہیں سلطنتِ برطانیہ کی قسمت اسلام کی قسمت سے بہت مستحکم بندھی ہوئی ہے۔

یہی باعث ہے کہ اسلام سے ترکی کا طرزِ عمل مغربی اور وسطی ایشیا کے متعلق تمام معموں کی کنجی ہے ایک زبردست جنگجو قوم یعنی ترکی جو اپنی شاندار روایات کی مالک ہے تمام اہل اسلام کی آیندہ ترقی کی راہیں قائم کر سکتی ہے بشرطیکہ تہذیب مغرب کی جانب جو اس کا رجحان ہے اس کی ماہیت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے۔ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۳ء کے درمیان عراق عرب میں قومی جنگ و جدال کے موقع پر سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ترکی کو یورپ کے مقابلہ میں انقلاب اسلامی کا ہراول بنایا جائے یا ایشیا اور یورپ کے حدود پر مغرب کا عقب لشکر قرار دیکر اسے اپنی خواہشات کے مطابق اپنی عجیب و غریب تاریخی زندگی کے خوشگوار ترین لمحات سے لطف اندوز ہونے دیا جائے ترک یورپ کے موافق ہوں گے یا مخالف؟ موجودہ بے چینی کے دوران میں یہ سوال چشم پوشی کے قابل نہ تھا۔ درآں حالیکہ چھوٹی چھوٹی قومیں بھی جو نہ اتنی خوددار و غیور ہیں اور نہ اپنی گزشتہ عظمت کا اس قدر احساس رکھتی ہیں اس قابل ہو گئی ہیں کہ موقع کے لحاظ سے تہذیب مغرب کے لئے مفید یا خطرناک ثابت ہو سکیں حقیقتاً سلطنت ترکی ایشیا کی سیاسی دُنیا میں ایک نہایت ــــ کارکن قوت ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ترکی سے دوستی کئے بغیر تعلقات کا قائم رکھنا اور ساتھ ہی اس کی خصوصیات کو سمجھنے کے لئے مستعد رہنا کوئی ممکن کام نہیں خصوصاً ایسے موقع پر جب اُس نے یہ طے کر لیا ہے کہ عراق عرب کی اندرونی ترقی میں ہمہ تن مصروف ہو جائے۔ اور جب وہ صرف ایک چیز طلب کرتی ہے یعنی اقوام عالم میں سے ایک قوم بنکر رہنے کا حق۔

جب سے ترک پہلی مرتبہ تاریخ میں رونما ہوئے ہیں یورپ ہمیشہ اس کوشش میں رہا کہ اس کے صفحات سے ان کی ہستی مٹا دینے کی کوئی صورت نکل آئے۔ اور گزشتہ چھ صدیوں سے جو نمایاں حصہ وہ تاریخ میں لے رہے ہیں، اس کا خاتمہ ہو جائے۔ دو سو سال کی متواتر کاوشوں کا نتیجہ یہ ہے کہ "تین براعظم اور تین سمندر" جن پر حکومت کرنے کا فخریہ اظہار سلطان استنبول کے خطابات میں پایا جاتا تھا آج صرف ایک تاریخی یادگار رہ گئے ہیں۔

قسمت کی ایک کاری ضرب کھا کر ترکی نے اپنے اصولی مسئلہ میں سادگی پیدا کر لی ہے اور سیاسی نکتہ نظر کو چھوڑ کر پھر اسی حالت پر آگیا ہے جو اُسے تیرھویں صدی کے وسط میں حاصل تھی جب اُسے سلطنت سلجوقی کے دروازہ پر جو زندگی کے سامان تلاش کر رہی تھی دستک دینی پڑی۔ اپنی قومی سرزمین پر جسے شاید فطرت نے انہی کے استعمال کے لئے منتخب کیا ہے جب اُن کو ایسے دشمنوں کا خطرہ ہوا جو صدیوں سے للچائی ہوئی نظریں جمائے ہوئے تھے تو ترکوں نے ہمیشہ ایک نئی قوت ازسرِ نو حاصل کر لی۔ انقلاب روس نے جب ان تمام ریشہ دوانیوں پر پانی پھیر دیا جو پیٹر اعظم کے بعد پھیلائی جا رہی تھیں تو ترک منصۂ سیاست پر ایسی خوبصورتی کے ساتھ آگئے گویا کہ جوانی پھر عود کر آئی۔

آخر اس کی کیا وجہ کہ وہ غیر معمولی تغیر جو انقلاب روس نے مسئلہ مشرق کے تمام اجزا میں پیدا کر دیا مغربی قوموں کے لئے مفید ثابت نہ ہو سکا جو ۱۹۱۸ء میں کوشش کر رہی تھیں کہ مشرقی تحریک اصلاح کے سیاسی پہلو پھر حاصل کر لیں۔ یہ کیا کہ اسلام جو انیسویں صدی میں لندن اور پیرس پر تمام تر توجہ جمائے رہا ماسکو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جہاں ایک اصول جو قطعی منافی اسلام ہے آج تک پر غلبہ کئے ہوئے ہے جس کو ۱۹۱۷ء تک مشرق اپنا قدیمی دشمن سمجھتا رہا ــ مناظر کا یہ غیر متوقع تغیر اور مشرقی ڈراما کا نرالا انداز صرف یورپ کی عام رائے کی ناسمجھی کا نتیجہ ہے جو مشرق

کی نہایت ہی متعصب اور سب سے زیادہ غیر متعلق مصنوعی اثرات کا محکوم ہونے کی وجہ سے کبھی نہ سمجھ سکا کہ تہذیب مغرب کی قسمت کا تمام تر انحصار صرف اس بازی پر ہے جو ماسکو اور ایشیا میں لگی ہوئی ہے۔ خود انگریزی پبلک رائے اس اہمیت کو سمجھنے سے ابھی بہت دور ہے کہ وہ اہم ترین شاہراہیں جو یورپ کو ایشیا کے دور دراز گوشوں سے ملا رہی ہیں اسلام کے ہاتھ میں ہیں وہ عین ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک میں ہو کر گزرتی ہیں اور دنیا کی معاشرتی زندگی میں شریانوں کا کام دے سکتی ہیں بشرطیکہ وہ جن انجام میں پھیلی ہوئی ہیں وہ کم سے کم ضروری طاقت حاصل کرتے رہیں۔ جغرافیہ کے دوامی قوانین نے عہد ہائے قدیم سے ان تمام بین الاقوام شاہراہوں کو تمام بڑی تاریخی لڑائیوں کی علت نمائی قرار دے دیا ہے۔ جب تک ترکی قوم کے پاس ان اہم شاہراہوں کی کنجی موجود ہے مغربی قوتوں کو ترکی کے خلاف جد و جہد سے بچکر اُس سے تعلقات رکھنے پڑیں گے۔

بدقسمتی سے چند الفاظ کے استعمال نے جو علمائے دین کو بہت عزیز ہیں یہ سوال ذرا مبہم سا کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے بنی نوع انسان پر اتنی مصیبت نازل نہ ہوتی اگر ایک مصنوعی محبت انسانی اس پر غلبہ نہ کر لیتی۔ یہ بدستور اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا تو سیاست اس کے مدعا سے بخوبی واقف تھی (یعنی عالمگیر طاقت کے توازن کا مسئلہ) حق تو یہ ہے کہ یورپ کی سیاست تعصب مذہبی سے کبھی پاک نہیں رہ سکی خصوصاً اسلام کے مقابل میں۔ اور موجودہ عیسائیت نے گزشتہ صدیوں کی مذہبی پالیسی پر ہمیشہ لعنت ملامت کی ہے اور یہ وہی پالیسی ہے جس میں تعصب کے وہ جراثیم شامل ہیں جو بائی زنٹائن کے مورخوں نے مغربی خیالات کے پاس ترکہ میں چھوڑی ہے۔ یہ مورخ خلافت اسلام تحریک کے زبردست بانی مبانی تھے۔ اور مشرقی معاملات کے بارے میں یورپ کے خیالات کو اپنی یاوہ گوئی سے اسی طرح برگشتہ کر دیتے تھے جس طرح شکست خوردہ قومیں فاتح سے انتقام لینے اور اُن کی تذلیل سے خوش ہونے کے لئے عموماً کیا کرتی ہیں۔ جبر و اختیار کا مافذ مدت دراز تک یورپ کا تعصب رہا ہے جو مشرق کے ساتھ تھا۔ اور جب تک عیسائیت کو خطرہ ترکی رہا عیسائی قوتوں کے ماہران سیاست ان کو نوراً سپرد قلم کرتے رہے۔ ایک پوپ صاحب یعنی پایس ثانی نے جو بڑا آدم دوست تھا اور اینیز سلویس کے نام سے معروف تھا۔ ترکوں کے خلاف تیاری کرنے سے پہلے ہی مسئلہ عثمانی کو حل کرنے کے لئے ایک عجیب سیدھی سادی ترکیب نکالی۔ ایک ذاتی خط میں اس نے فاتح عصر محمد اور اُس کے رفقاء کو عیسائیت کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ تمہیں اس مذہب کا پیشوائے اعظم اور یورپ کا دین پناہ بنا دوں گا۔ یورپ جو الزام ترکی پر عاید کرتا ہے یہ خط اس کا اصلی نمونہ ہے یورپ اس کی تمام فتوحات کو جو دیگر فاتحوں سے کسی حالت میں زیادہ ناگوار نہ تھے، معاف کر دیتا بشرطیکہ وہ عیسائیت قبول کر لیتا۔ جیسا کہ ان تمام نئی قوموں نے کیا جو مذہب عیسائیت کے غلبہ کے بعد یورپ میں آئیں۔

آجکل بھی یورپ کی سیاست اسلام کے خلاف اسی مذہبی تعصب سے پر ہے۔ یہی دائرہ ہے جس نے مسئلہ مشرق کے تمام فریقوں کو موقع دیدیا ہے کہ وہ بہتر سے بہتر قابل قدر انسانی نظریوں کا مذاق اڑا سکیں۔ اور صرف اس نقطۂ نظر اور احساسات کو مرکز خیال بنائے رہیں جو یورپ کو مشرقی عیسائیوں سے متحد کئے ہوئے ہے۔ اسلام اور جدید یورپ کے باہمی تعلقات کو نقصان پہنچانے کا اتنا کارگر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایشیائی مسئلہ کو مبہم بنانے کی اس سے زیادہ موثر کوئی صورت نہ تھی۔ اور تمام عالم کے امن عام کو خطرے میں ڈالنے کا یقین کامل اور کسی طرح ممکن نہیں تھا جس طرح یورپ کے اندرونی معاملات کے متعلق مذہبی نقطۂ نظر ان تمام مصائب کا منبع تھا جس نے اس بر اعظم کو مذہبی جنگوں کے دوران میں درہم و برہم کر دیا اور جس طرح یورپ پھر

۱۲

آزادی کی سانس صرف اس وقت لے سکا جب دیوانے مذہبی سیاست دانوں سے اس نے چھٹکارا پا لیا اسی طرح ایک با اُصول محب بنی آدم کا جس پر روسی تعصب اور انگریزی مذہبی سیاست کا رنگ چڑھا ہوا ہو مشرق میں بہت ہی دردناک انجام ہو کر رہیگا جہاں اُس نے تمام خطرناک جذبات کو اُبھار کر انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

انگریزی سیاسی ادب میں ترکی اور اسلام کے متعلق دو قسم کے اہل الرائے موجود تھے ۱۸۵۶ء میں اڈنبرگ میں رچرڈ کابڈن کا مشہور رسالہ "ایشیا" چھپا جس میں انچسٹر کول کے افسر اعلیٰ نے پبلک کے اُن خیالات پر حملہ کیا جو اُس کے خلاف پیدا ہو رہے تھے۔ اور کھلم کھلا اُن لوگوں کی تائید کی جو عیسائیت کا واسطہ دیکر روس کی طرفداری میں ترکی سلطنت کا قلع قمع چاہتے تھے۔ اور اعلان کر دیا کہ انگلستان خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکتا ہے اگر وہ قہبی مشرق کا نقشہ اس طرح تبدیل کر دے۔ انگریزی آزادی پسند طبقے کے خیالات پر اس رسالہ کا اثر ہونا لازمی تھا چنانچہ ان سب کی مشرقی پالیسی نے اُنیسویں صدی میں پامرسٹن سے گلیڈ اسٹون تک گرے اور اس کو شتہ تک ایک ہی روش اختیار کر لی یعنی روس کی طرفداری جو قسطنطنیہ زار کو دینے کی تجویز کی گئی۔ اور اب بھی بے دھڑک یہی کہتے ہیں کہ اس شہر کا سوال ابھی زیر تجویز رکھا جائے تاکہ روس جب اس انقلابی بخار کی غفلت سے چونکے تو ممکن ہے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کی خواہش کرے۔ ایک مورخ نے کیا خوب کہا ہے کہ پیٹران زار نے انگلستان کے آزادی پسندوں کو ہمیشہ اسی آسانی کے ساتھ زیر اثر کر لیا جس طرح خود اپنے یہاں کے لوگوں کو۔ ترکی اور اسلام کے بہترین سیاسی مورخ ڈیوڈ ارکھارٹ نے جو یورپ میں گزرا ہے اس وقت کوشش کی کہ یورپی اور انگریزی سیاست کے اُن غلط اعتقادات کی اصلاح کرے جن کا اثر اصلاح ترکی پر پڑ رہا تھا اور جو سینٹ پیٹر برگ چانسلریز میں تجویز ہوئی تھی اُس نے ان بناوٹی اصولوں کی جو بے سوچے سمجھے مشرق پر چسپاں کئے جاتے تھے بہت زور کے ساتھ مذمت کی اور نہایت موثر پیرایہ میں درخواست کی مسلمانوں کی ان اچھی روایات کو قائم رکھنا چاہیے جن کی قوتوں کا وہ معترف تھا۔ اُس نے مشورہ دیا کہ ترکی کو یورپ میں شامل سمجھا جائے۔ اس کو یقین تھا کہ اگر ترکی کے معاملات میں بیرونی مداخلت کی متواتر روک تھام کی گئی تو وہ طاقتوں کے توازن کے لئے ایک نہایت کارآمد اور کامیاب عنصر ثابت ہوگا۔ اور ایشیا میں علوم مغرب کا ہراول بنکر اپنی تاریخی حیثیت میں قابل قدر اضافہ کریگا ۱۸۳۰ء اور ۱۸۷۸ء کے درمیان اُس نے یورپ کی تمام طاقتوں کو تلقین کی کہ ترکی معاملات میں ذرا بھی دخل نہ دیں تاکہ اُن روشن ضمیر تہذیب یافتہ حضرات کی مدد سے جو مسائل شرقی کے ماہر اور تمام سیاسی چالوں سے بری ہیں مسلمانوں کو جدید قوموں کے سانچے میں ڈھالنے کا اہم کام فطری اصول پر بتدریج مکمل ہو جائے۔ کل ابتدائی مراحل اور تمام اصلاحوں کا عمل درآمد قابل سائنس دانوں کو سپرد کرنے اور سیاسی فرقوں کے ہاتھ میں مہلک ہتیار بنا کر نہ چھوڑ دینے کی رائے اس کی ایک بہترین نصیحت ہے جو اب تک قابل قبول اور صائب کہی جا سکتی ہے۔ سب سے پہلے یہ ارکھارٹ ہی کو محسوس ہوا کہ قریبی مشرق کا سوال جس شکل میں کہ مخالفین اسلام اس یورپ کی رائے عامہ کے سامنے پیش کرتے ہیں حقیقتاً ایک راز مکنون ہے جو انجام کار خونریزیوں کا باعث ہوگا۔ سیاست مغرب کبھی نہ سمجھ سکی کہ اس مسئلہ کی جان ہے تو یہ ہے کہ یورپ اور ایشیا کے تعلقات میں کامل تغیر پیدا کر دیا جائے اور ایک عظیم الشان مذہب اور جری فرقے کو موقع دیا جائے کہ بیرونی فریب کاریوں سے محفوظ رہکر اپنی زلکیت کے اس اہم سوال کو خود حل کرلے۔

یورپ کے لوگوں نے جن کو لارڈ بائرن "خرید و فروخت کرنے والا فرقہ" کہتا ہے،

زاریت اور اسلام کے درمیان تعجب انگیز کشمکش پیدا ابھی شروع نہیں کیا یہ مسئلہ بھی اپنے ہمہ گیر مفہوم میں کھول کر بیان نہیں کیا گیا اور بین الاقوامی چالیں ایک عالمگیر جنگ عظیم کے افسوسناک اسباب فراہم کرتی رہیں۔ بہرحال ممکن ہے کہ قریبی مشرق کے عیسائی آخراً فائدہ میں رہتے اگر اپنے ذاتی حقوق پر قائم رہتے اور بیرونی سازشوں کو جو انہوں نے اکثر خود پھیلائیں خیر مقدم کہنے کے بجائے انہوں نے اس تحریک اصلاح سے اتفاق کر لیا ہوتا جو اسلام کی بنیادیں ہلا دینے پر تلی ہوئی تھیں۔

۳

۱۸۵۶ء کی پیرس کانگریس کے بعد روس نے ایک نظام قائم کیا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ترکی اپنا ایک ایک عضو جدا کر کے خودکشی کر لے۔ عیسائیت اور اسلام میں عداوت بڑھانے اور پوشیدہ ذریعوں سے اصول صلح پر عمل نہ ہونے دینے کی ترکیب جس کی تائید کھلم کھلا یورپ کی پبلک نے کی ایک نہایت بیکار اور امید افزا پالیسی تھی کیونکہ ترکی میں حکومت مذہبی کا عنصر عرصہ سے منافی ترقی ثابت ہو رہا تھا۔ اصلاح ترکی یعنی تنظیم کی پہلی زبردست کوشش اگر قطعی ناکام رہی تو زیادہ تر غیر ملکی بیجا مداخلت کی وجہ سے قریبی مشرق کے عیسائیوں کو مسلسل مداخلت اور متواتر رخنہ اندازی یعنی اسلام پر باضابطہ نگہبانی کرنیکا عادی کر دیا گویا ان کو ترکوں کے خلاف پورے پورے اختیارات دیدیا ہے بیکنس فیلڈ کے خیال کے مطابق مسلمان کافی اہلیت رکھتے ہیں کہ موجودہ تہذیب کے ہر شعبے میں حصہ لے سکیں۔ جیسا کہ انہوں نے اپنی پیشرو زبردست تہذیبوں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر ہمیشہ ظاہر کر دیا۔ اُن کی خواہش تھی کہ ان کا ملک برادرانہ حیثیت سے مسلمانوں کی معاشرتی تعلیم کا محافظ اور کارکن رہے اور ان تمام تحریکوں کو اپنے قبضے میں رکھے جو ایک صدی سے مسلمانوں کے دماغوں میں ہیجان پیدا کر رہی ہیں۔ بدقسمتی سے انگلستان لارڈ بیکنس فیلڈ کا مدعا نہ سمجھ سکا اور اُن خانگی مصیبتوں میں پھنس گیا جن میں گلیڈ اسٹون نے سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا گلیڈ اسٹون پر چونکہ عیسائی مذہب کا بہت گہرا اور یکطرفہ رنگ غالب تھا اس لئے سب جانتے ہیں کہ اُس کا اصلی اور سب سے بڑا مقصد ہی یہ تھا کہ اسلام کے خلاف حقارت کی اشاعت کرے۔ اس کے زہریلے اثرات کی وجہ سے برطانیہ اعظم کی مشرقی پالیسی قطعی بدل گئی اور وہ بے جانے بوجھے اسلام کی ضد یعنی فی الواقع زاریت کی معین و حامی بن گئی۔ بجائے اس کے کہ عیسائیت اور اسلام کے مابین وہ ایک غیر جانبدار اور شفیق واسطہ ہو روز بروز زار کی طرف مائل ہوتی رہی جس کا مدعا ہی یہ تھا کہ دنیا کے نظام سیاسی میں سے ان مستحکم اور پائیدار قوتوں کو جواب تک اسلام کی محکوم ہیں نیست و نابود کر دے۔ جنگ کے بعد جب توسیع جرمنی کا خطرہ پیش نظر ہوا تو مدحت پاشا کی ماتحتی میں پہلی تحریک ساسی نے جس کی تھوڑی بہت تائید کی وہ یہی مہلک راستہ تھا جس پر انگلستان سر کے بل چل کھڑا ہوا اور جب ایک طرف ترکی ردِّ عمل کی افواج عبدالحمید کے تحت میں تیار ہو گئیں اور اس طرح تمام یورپ کی متحدہ دشمنی کی آگ اسلام کے خلاف بھڑکا دی اور دوسری جانب جرمنی کا خوف انگلستان میں ہر دماغ پر آسیب کی طرح مسلط ہو گیا تو اس ملک کی پبلک زاریت کے مانوس خیالات کی عادی ہونے لگی اور ایڈورڈ ہفتم نے بہت سا خراج تحسین وصول کیا جب وہ نکلس ثانی سے ملنے کے لئے ریول گیا۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب ترکی نے سیاست یورپ کے تمام منصوبے پھر خاک میں ملا دئے انگلستان میں اس کی مقبولیت نے دفتر خارجی کو مجبور کیا کہ اپنے آپ کو بدل ڈالے اور ترکوں کی طرف سے ایک نیا حساب کھول دے ترک اب نہایت گرمجوشی کے ساتھ اپنے انگریز دوستوں کی جانب جھک پڑے کیونکہ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اُن کی نجات اب انگریزوں ہی کے ہاتھ میں ہے نہ کہ جرمنی کے جس نے تیس سال تک عبدالحمید کی حمایت کی اور اس کے عملے میں بہت سی بیجا رعایات زبردستی حاصل کر لیں۔ قسطنطنیہ میں نظام سلطنت قائم ہو جانے کے بعد برطانوی سفیر کا جس طرح خیر مقدم کیا گیا اس سے کافی روشن ہو جائیگا کہ ۱۹۰۸ء میں ترکوں کو کیا کیا امیدیں تھیں۔ یہ ہے وہ عجیب موقع جہاں ڈیوڈار کھارٹ کے خیالات کی خود بخود تصدیق ہو جاتی ہے۔ اتفاقات زمانہ نے انگلستان کے سامنے پھر ایک ہونہار مسلمان قوم کی دوستی پیش کر دی۔ اب موقع تھا کہ دنیا کو اس ہمہ گیر آتش سوزاں سے بچا لیا جاتا جو قریبی مشرق کے مسئلہ میں اندر ہی اندر شعلہ زن ہو رہی تھی یعنی مسلمانوں کو علم معیشت اور سیاست سے پورا پورا واقف کر دیا جاتا اور اُن تمام فرقوں میں مصالحت ہو جاتی جو ایشیا اور یورپ کی حدود پر ایک دوسرے کو پھاڑے ڈالتے تھے۔ یورپ کی بدقسمتی سے گلیڈ اسٹون کی پھونکی ہوئی تعصب روح اور تنگ نظری نے بیکنس فیلڈ کی وسعت اور رفعت خیال کو برطانوی سیاست میں منتقل کرنا اور فرقہ بندیوں کے تغیر و تبدل نے گلیڈ اسٹون کے پیرووں پر یہ فرض عاید کر دیا کہ ترکی کی قومی تحریک سے اس نازک اور اہم موقع پر ہرگز بے تعلق نہ ہوں۔

ان اسباب کے زیر اثر متعدد اور مختلف النوع بلکہ اغراض کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں ۱۹۰۸ء کے انقلاب ترکی کی ناکامی لازمی تھی۔ سیاست یورپ نے ان سخت لغزشوں سے فائدہ اُٹھایا۔ جو کسی کار اصلاح یا انقلاب کے ساتھ ساتھ قریبی مشرق میں لازماً سرزد ہو جاتی ہیں۔ تاکہ وہ مستعدی کے ساتھ اپنی تخریبی حکمت عملی پھر حاصل کرے جو اس طول طویل اور شاندار تحمل سے بہت نمایاں طور پر ممتاز تھی جو وہ نظام خودمختاری کے متعلق ظاہر کرتا رہا۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء کا انقلاب ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ترکوں کو جب سیاست مغربی میں کوئی قابل اعتماد سہارا نہ ملا تو ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء میں عراق عرب کی اصلاح کے متعلق برطانیہ کی اعانت حاصل کرنے کی لاحاصل کوشش کی اور مایوسی پر آنکھیں بند کر کے آغوش جرمنی میں جا گرے۔ بہرحال ہمیں ابتدائی کارروائیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انگلستان کے بعض حلقوں میں جہاں اُن کے کچھ ایسے بہی خواہ موجود تھے جو عراق عرب کو از سر نو زندہ کر کرنے میں حصہ لینا چاہتے تھے ان کو یہ اعانت پیش کی گئی چنانچہ امور سلطنت کے متعلق بہتر سے بہتر انتظامی ملکہ رکھنے والوں اور صاحبان تنظیم نے جن کی قابلیت کا اظہار جنوبی افریقہ اور کنیڈا میں ہو چکا تھا اعلان کر دیا کہ ہم ترکی کے لئے عراق عرب کا از سر نو انضباط و تنظیم کرنے کے واسطے اسی عزم و استقلال کے ساتھ تیار ہیں جو ہماری قوم کی قوت کا جوہر ہے اور جس نے ہر بر اعظم میں ہماری قوم کو ممتاز کر رکھا ہے۔ یہ انگریز جن کو ڈیوڈار کھارٹ کی شریف روح غیر محسوس طریقے سے ابھار رہی تھی اور جنہوں نے اسلام کی قدیمی سرزمین کو خود غرضانہ حکومت خسروی کے محکوم کرنے کے بجائے تہذیب جدیدت مالامال کرنے کے خیال پر نہایت گرمجوشی سے لبیک کہا تھا۔ جنگ عظیم سے چند ماہ پیشتر دفتر خارجی میں ان کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے جا پہنچے۔ وہاں اُن کی کوئی ہمت افزائی نہ ہوئی۔ چنانچہ دنیائے اسلام اور سلطنت برطانیہ میں سمجھوتا ہو جانے کا یہ موقع بھی نکل گیا جس پر نہ صرف قریبی مشرق کے بلکہ ممکن ہے کہ تمام دُنیا کے امن و امان کا انحصار تھا۔

۴

جب سے قریبی اور وسطی مشرق کی حکومت خلفائے بغداد و قاہرہ سے ترکوں کو ورثہ میں ملی ہے وہ ہمیشہ اسلام کے ہراول رہے ہیں مادر شروع ہی سے برابر بے تعصبی کی اُس روح کے معتقد رہے ہیں جو اُن کو اپنے پیشرووں سے ملی تھی۔ اُن کی سلطنت میں

نسلاً اس قدر غیر ملکی جماعتوں اور مرکزوں کا وجود ہی اس امر کی کافی دلیل ہے تنگ نظر قومیت اُن کی ایجاد نہیں۔ چنانچہ یورپ کو اور بھی زیادہ حیرت ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ ترکی نے خود اپنی پسماندہ حکومت ہی میں سے ایک قومی سلطنت قائم کر لی ہے۔ لیکن قومیت کا خیال تعلیم یورپ کا ایک منطقی نتیجہ ہے اگر ترک اس خیال سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں جس کے لئے پوری انیسویں صدی میں اُن پر برابر حملے ہوتے رہے تو یقیناً اسلام کی چند مصنوعی روایات کی بنا پر ان کو اب لعنت ملامت کرنا بہت بیجا ہوگا۔ اور وہ عین اس وقت جب وہ اپنے مذہب اور اپنی قوم کے خالص اور لطیف نصب العین پر نازاں ہونے کے لئے اس قسم کی پابندیوں سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ترکی قومیت اس تعلیم کے عملی نتیجہ پر پہنچنے کی راہ پر ہے جو اُس نے یورپ سے حاصل کی ہے اور جب کبھی چارٹسٹ آف گلیمن ۱۸۳۹ء کے زمانے سے جو زور اُس پر ڈالا جا رہا تھا بجنسہ اس پر عمل درآمد کرنے کے صلے میں اس کو طعن تشنیع کرنے کا یہی موقع منتخب کیا گیا ہے۔ کیونکہ تنظیمہ کے زمانے سے مسلمانوں کی جماعتوں اور مرکزوں نے جو اساسی اصلاح حاصل کی اس کو جو فہرست بیاسی شدہ دی گئی وہ ان تمام کارروائیوں میں شامل ہے جو انگورہ میں ۱۹۲۲ء سے اب تک ہوئیں۔ اصلاح اسلام کے متعلق بہت ہی مختلف حلقوں میں کوشش کی جا چکی فلسفۂ مذہب قانون اخلاقیات میں ان کوششوں کا آغاز معتزلیوں سے ہوتا ہے جو گیارھویں صدی میں مسلمانوں کا آزاد خیال عقل دوست فرقہ تھا۔ اسلام قلب ہیئت کے عمل سے کبھی خالی نہیں رہا۔ لیکن مسلمانوں کے مختلف فرقوں نے جن اصلاحوں کی کوششیں کیں خواہ کتنی ہی پُرخلوص سہی، وہ ایک دیرپا عملی نتیجہ پیدا کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ مذہب و عقائد کا تزکیہ رسوم کی اصلاح اور مشرق کے بعض غیر مہذب گروہوں کے اخلاقی لب و لہجہ کا ارتفاع تمام صاحبان رائے یا اخوت اسلامی کے سربرآوردہ سیدھے سادے معتقدین کا واحد نصب العین تھا لیکن اسلام کا قدم ترقی کسی اور چیز کا بھی حاجتمند تھا۔ اسلامی مرکزوں کی اساسی اصلاح کو عالمگیر ہونے کا معمولی سا موقع بھی دینے کے لئے دو اہم شرطوں کی ضرورت تھی۔ اوّل یہ کہ اس پر عیسائیت کا دباؤ نہ پڑے۔ دوئم یہ کہ مسلمانوں کی مضبوط، دین کی پکی، اور آزاد قوم خود اس کو انجام دے۔ آج ترکوں نے انہیں دو شرطوں کو پورا کر دیا ہے۔ اسلامی مرکزوں کی اصلاح صرف ایسی مسلمان قوم ہی سے ممکن ہے جس کا وقار پیروانِ رسولؐ کی نگاہوں میں قائم ہو اور جس کی آزادی کی ذمہ دار خود اسی کا زور بازو اور عزم بالجزم ہو سکے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام صرف اعتقادی اصول پر مبنی ہے اور اس لئے ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناموزوں سانچے میں ڈھلی ہوئی مقررہ روایات سے اسے آزاد کرنے کی ہر کوشش قابل ملامت ہے لیکن ایسے لوگ یہ امر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اسلام کو غیر متحرک بنانے والے تمام نظریے ہمیشہ بے بنیاد اور کمزور ثابت ہوئے ہیں اور خیالات کے تاریخی ہنگاموں نے دنیائے اسلام میں ہمیشہ ہلچل مچا دی ہے۔ قوانین اسلام جن کی اصلاح آج کل ترک جدید علم سیاست کے مطابق کر رہے ہیں۔ خود ان کے اعتقادی اصول کا نشان امتیازی خیالات یونان کی ایک جھلک ہے اور اس کے فلسفے میں جدید افلاطونی اور ہندوستانی تصورات شامل ہیں۔ ہمارے زمانے کے سب سے بڑے پروفیسر گولڈزیہر نے اپنی مشہور تصنیف "درس ہائے اسلام" میں نہایت مدلل اور صاف طور پر اسلام کے مادۂ قبولیت کو ثابت کر دکھایا۔ گولڈزیہر نے بتا دیا کہ اسلام نے اپنی صلاحیت اخذ و اکتساب اور عناصر خارجی سے بہرہ اندوز ہونے کی قابلیت اپنی تمام تاریخ میں واضح کر دی ہے۔ اس کا اعتقاد ہے کہ اسلام کو اُن اخلاقی کمزوریوں اور انجماد ذہنی کا ذمہ دار بنانا سراسر زیادتی ہے جو یقیناً آب و ہوا اور رجحانات کے نتائج ہیں اخلاقی نکتۂ نظر سے اسلام اب بھی ایک عالمگیر قوت ہے۔ جو صاحبان رائے کے تدبر و تفکر کا موضوع بننے کی پوری استعداد رکھتا ہے۔

لیکن اصول اسلام اور تاریخ اسلام کے مابین غیر محدود امکانات کے رنگ موجود ہیں اور اس کی آئندہ ترقی کا دارومدار قطعاً اُس رویہ پر ہے جو ترکی اس کی جانب اختیار کرے۔

مسلمانوں میں ترک از روئے فوقیت ایک سیاسی قوم ہے جب سے انہوں نے عربوں کو حکومت اسلامی سے برطرف کیا ہے وہ عرصۂ دراز تک نہایت کامیابی کے ساتھ مشرق اور مغرب کے درمیان واسطہ بنے رہے۔ جاپان سے کہیں پہلے ترکی نے تہذیب مغرب کے لئے ایشیا کے دروازے کھول دیئے تھے۔ دونوں نصف کروں کو ان نسلوں کے ذریعے سے ملا کر جنہوں نے سلطنت عثمانیہ کو اس کے یوم تاسیس سے لے کر اب تک اپنی فرودگاہ بنا رکھا تھا۔ انسانی جد و جہد کے ہر شعبے میں وہ دونوں ممالک میں ایک عقد اتحاد بنا رہا۔

گولڈزیہر جو سائنس میں مسلم الثبوت مانا جاتا ہے کہتا ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کا علوئے مرتبت اور عروج کمال دُنیائے اسلام کے محکوم حلقوں میں سے مذہبی تعصب کو بتدریج کامیابی کے ساتھ اکھاڑتا رہا اور حنفی اثر (جس کے پیرو ترک ہیں) اسی رفتار سے بڑھتا گیا۔

فتوحات عثمانی کے وقت عیسائی فرقوں کے لئے جو عضوی قوانین منظور کئے گئے وہ یقیناً اس امر کے ثبوت میں بہت کافی ہیں کہ مذہبی معاملات میں اُن کی بے تعصبی ضرب المثل ہونی چاہیئے اور اس زمانے کے یورپین فرقوں سے کہیں زیادہ فوقیت رکھتی ہے۔

خود رسول خدا فرماتے ہیں کہ میری اُمت میں اختلاف رائے رحمت خدا کا ایک ظہور ہے اس ارشاد کے بعد فرقہ بندی کا سوال بہت زور پکڑ گیا۔ ہجری کی ابتدائی صدیوں کے غور و خوض کا امتیاز خصوصی یہی آزاد خیالی تھی جو اصول مذہب کی تشریح میں روا رکھی جاتی تھی۔ مسٹر ٹامس آرنلڈ کہتے ہیں کہ بادشاہوں اور عوام نے اکثر عالمانِ دین کے تعصب کو برا بھلا کہا ہے۔ قرآن پاک میں غیر مذہب کے لوگوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا انحصار خدائے واحد کے پہچاننے پر رکھا ہے۔ نبی برحق فرماتے ہیں۔ "اہل کتاب سے تم لوگ مباحثہ کرو تو انتہائی محبت کے ساتھ"۔ پھر ارشاد ہوتا ہے "مذہب میں جبر و تشدد کو راہ نہ دو"۔

بے تعصبی کا یہ واضح ترین حکم ہے جو کلام ربانی کے لفظ بلفظ مطابق ہے۔ حضرت نے مجران کے پادریوں، پیشوایانِ دین اور راہبوں کو ایک خط تحریر فرمایا جس میں وعدہ کیا کہ اُن کے معابد کی حفاظت کی جائے گی اور ان کے حقوق میں کسی قسم کی بیجا مداخلت یا خلل اندازی نہ ہونے پائے گی۔ بشرطیکہ وہ اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔ آنحضرت نے مدینہ کے یہودیوں کو بھی اپنی عبادت کی اجازت دی یہاں تک کہ اُن کے دلی عناد نے اُن کو شہر بدر کر دیا اور سنہ ۱۰ھ میں ایک سفیر کو تبلیغ کے لئے یمن بھیجا تو ہدایت فرمائی کہ کسی یہودی پر اس کا مذہب چھڑانے کے لئے ہرگز جبر و تشدد نہ کرنا۔

جب حکومتِ عرب ایران تک پھیل گئی تو بیان کیا گیا کہ نبیؐ کا حکم یہ ہے کہ زردشت لوگوں سے بعینہ اہل کتاب سمجھ کر برتاؤ کیا جائے۔ ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ معتصم کے عہد حکومت ۸۳۳ھ تا ۸۴۲ھ میں ایک مسلمان سپہ سالار نے ایک امام اور ایک موذن کو دُرّے لگائے جانے کا حکم دیا کیونکہ انہوں نے سُغد میں ایک آتشکدہ مسمار کر کے اس کی جگہ ایک مسجد بنا دی تھی۔ دسویں صدی میں فتح ایران کے تین صدیوں بعد قریب قریب ہر صوبے میں آتشکدے پائے جاتے ہیں حتیٰ کہ مسلمانوں کی بے تعصبی کی وجہ سے مینکی[۱] بھی ایک جداگانہ

۱۔ مینکی یا مینکیہ ایران کے ایک بہت قدیم فرقے کا نام ہے جو بانی مینکیس کے نام سے موسوم تھا اور جو دو اعلیٰ اصول یعنی خیر و شر کا قائل تھا۔ (مترجم)

فرقے کی حیثیت میں دسویں صدی کے اختتام تک قائم رہے اور مامون کے عہد میں نیر و نجت نے جو اس فرقے کا پیشوا تھا بغداد میں علمائے اسلام کے ساتھ علی الاعلان مناظرہ کیا

فتوحاتِ اسلام کے بعد ہندوستان میں بھی حالانکہ اخیر زمانہ میں ہندوؤں کے بہت کافی مندر منہدم ہوگئے تھے۔ لیکن جن مسلمان حکمرانوں نے یہاں قیام کیا انہوں نے علی العموم عطیاتِ مذہبی کو احترام کے ساتھ جاری رکھا جو اُن سے پہلے ہندو بادشاہ نے مذہبی تعمیروں کے لیے مقرر کئے تھے۔ ہندوستان کی موجودہ اسلامی ریاستیں مثلاً حیدر آباد اور بھاولپور اب تک اسی روش پر قائم ہیں۔ وہاں اب بھی برابر ہندوؤں کے مندروں کی بہت کافی مالی امداد کی جاتی ہے۔

۵

مشرق میں خام اشیاء کے مسئلے کے متعلق زبردست معاشرتی غرض ترکوں کو مجبور کر رہی ہے کہ اپنے مجلسی، قانونی، مالی، اور تمدنی مرکزوں اور اپنی زراعتی اور دیگر عام پیداوار کے ذرائع کی از سرِ نو تعمیر و تنظیم کریں یہی وہ اصلاح ہے جس کی بنا خود مصلحانِ انگورہ نے ڈالی ہے اُن کے افعال کا منشا پوری پوری طرح سمجھے بغیر تین ہزار میل کے فاصلہ سے اُن کے متعلق کوئی فیصلہ کر دینا صریحاً ہٹ دھرمی ہے کیونکہ جو لوگ اُن کو مورد الزام بناتے ہیں وہ باوجود ایک مستحکم مجی جمالی تہذیب کے اُن سے کہیں کم پیچیدہ اسباب کے زیرِ اثر فاش سے فاش غلطیوں کے مرتکب ہو چکے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔

اناطولیہ کے کاشتکار نکات دینیات قطعی نہ سمجھ سکے۔ ان کی حالتِ ذہنی کو ادراک کرنے اور مادۂ انسانی کا اندازہ لگانے کے لئے جو گویا مصطفےٰ کمال کے پردہ میں پوشیدہ ہے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس سے ملتی جلتی تاریخی حالتوں کی جانب توجہ کی جائے مثلاً اس حالت کی جانب جو کاسنرسی اسنر کو اور کوسُتھ نے پیدا کی اول الذکر کی تائید پولینڈ کے کاشتکاروں نے کی اور کوسُتھ کی ہنگری کے زراعت پیشہ لوگوں نے جو بین الاقوامی سیاسی میل سے قطعی بے بہرہ تھے اور دونوں آدمی اس میل کا شکار بن گئے۔ اس لئے یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ مصطفےٰ کمال جو تاریخ سے واقف ہے اور جس کے ملک نے ۱۸۷۶ء کے انقلاب کے اصول کا اعلان اسلام کے لئے کر دیا ہے ان جیسا انجام اپنے لئے پسند نہیں کرتا بلکہ واشنگٹن کے قدم بہ قدم چلنے کو ترجیح دیتا ہے انگورہ کی مجلس اعظم کے ممبروں نے اس کو خلافت پیش کی تو اُس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اعلان کر دیا کہ خلافت جمہوری سلطنت کے اصول میں شامل ہے

اسلام ترکی جس بات کا حاجتمند ہے وہ جدید تعلیم اور سائنس ہے اب اسے قدیم بے فیض کیفیت اور اُس کی ذہنی زندگی کے متروک آئین سے رہائی حاصل کر لینی چاہیئے۔ جن لوگوں کی رائے ہے کہ تمام مسلمان اقوام میں ترک ذہنی اصلاح کی سب سے کم صلاحیت رکھتے ہیں وہ ایک ایسے مغالطہ میں پھنسے ہوئے ہیں جس کی اشاعت ہر جگہ اُن بے شمار مبداؤں نے کی ہے جو وہ صدیوں سے زیادہ ورثہ ترکی کے متمنی رہ چکے ہیں برخلاف اس کے اسلام میں صرف وہی ذہنیت آسانی سے قدیمی دینیات کے اصول ترک کر سکتی ہے اور اصلاح کا بیڑا اُٹھا سکتی ہے جو الٰہیات کے دقیق تصورات کی متحمل نہیں ہو سکتی جیسی کہ ترکوں کی نمایاں عملی ذہنیت بشرطیکہ ابتدائی کارروائیوں کے لئے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے ترکوں کا مفروضہ جوشِ مذہبی یورپ اور بائزنٹائن کی ایجاد ہے کیونکہ بے تعصبی کی تعلیم سے کوئی اور قوم کبھی اتنی مایوس نہیں ہوئی جتنی قوم ترک جب اس کو موقع دیا گیا کہ ان ملاؤں کی پیروی چھوڑ دیں جو ترکی میں الٰہیات کے دقائق کی تلقین کرنے کو پہنچے تھے۔

ترکی کا جوشِ مذہبی ایک ناگہانی شے تھی جس کی ذمہ دار قوم ترک نہیں ہو سکتی حالانکہ اس کی تاریخ کے بہت سے خونین صفحے جو حقیقتاً سیاسی اور معاشرتی اسباب کا نتیجہ ہیں اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ ذرا اس قول کو یاد کیجئے جو تعصب یہودئے قومی اسباب کے متعلق رینان جیسا شخص لکھ گیا۔

(ترجمہ)

ظہیر ایم اے (علیگ)

کشمکشِ حیات

۱۵

SAMI

تعیُّن کا جنون دشمن، سلاسل مانعِ جُنبش،
نہ رہ سکتا ہوں زنداں میں نہ جا سکتا ہوں زنداں سے

(عیاں بی اے میرٹھی مرحوم)

قدیم پجاریوں سے خطاب

(رَوانِ خلد آشیاں کے قلم سے)

برہمن۔ او سراپائے بُتاں کے پوجنے والے
مُسلماں۔ او خدائے دو جہاں کے پوجنے والے

عبادت گاہِ بندِ رسمِ دُنیا اے معاذ اللہ
سنبھل او پردہ ہائے درمیاں کے پوجنے والے

خدا کے واسطے بیدار ہو۔ ہُشیار ہو غافل
فریبِ کاوشِ سود و زیاں کے پوجنے والے

مبارک تیرے دل کو ہیبت حدّاد و آہنگر
طلسمِ بندشِ بندِ گراں کے پوجنے والے

جو ممکن ہو قفس کی تیلیوں سے درسِ عبرت لے
گلستاں کے فدائی آشیاں کے پوجنے والے

یہ صحنِ باغ یہ بادِ سموم و تند و زہر آلود
پرستارانِ گل بھی ہیں خزاں کے پوجنے والے

کہاں ہیں اپنی دنیا اپنے ہاتھوں جو بساتے ہیں
کہاں ہیں لذتِ دردِ نہاں کے پوجنے والے

کہاں ہیں جن کو راس آتی نہیں راحت زمانے کی
چمن بیزار برقِ آشیاں کے پوجنے والے

دیانت کیش راہ و رسمِ دُنیا ساز کے دشمن
شہادت کوش تیغِ خونفشاں کے پوجنے والے

یہی ہے دین تو قہرِ الٰہی کس کو کہتے ہیں
ارے او مذہبِ آتش فشاں کے پوجنے والے

ذرا سر در گریباں ہو کے دیکھ اپنی عبادت کو
بقائے اتّحادِ جسم و جاں کے پوجنے والے

طریقت پر شریعت کی نہیں زیبا ہے قربانی
رہِ گم کردہ منزل کارواں کے پوجنے والے

یہ دُنیائے خدا دشمن ہے یا دینِ خدا پرور
نظر لازم ہے نیرنگِ جہاں کے پوجنے والے

یہ شامِ آرزو کل صبحِ خوابِ مضطرب ہوگی
فریبِ کامیاب و کامراں کے پوجنے والے

ذرا ہشیار اے دلدادۂ ذوقِ تن آسانی
شہیدِ آرزو خوابِ گراں کے پوجنے والے

کسی دن دامنِ گلچیں کا بھی تو جائزہ لیتے
بہی خواہانِ گلشن باغباں کے پوجنے والے

چٹانیں ہیں چٹانیں جس کو موجِ آب سمجھا ہے
ارے کشتی کے غافل بادباں کے پوجنے والے

تو ہی بتخانہ بھی کعبہ بھی ہے اپنی پرستش کر
خدائی ہے نشاں او بے نشاں کے پوجنے والے

فنا کے راز کا جویا بقا کے راز سے غافل
تمنائے حیاتِ جاوداں کے پوجنے والے

وطن کا ذرہ ذرہ مایۂ نورِ حقیقت ہے
مکاں پر غور کر لے لامکاں کے پوجنے والے

مسیحی جین مسلم۔ بودھ۔ ہریجن۔ پارسی۔ ہندو
زمیں پر رہنے والے آسماں کے پوجنے والے

میں اس دن کا تمنائی ہوں جب سب کی زباں پر ہو
کہ ہم ہندی ہیں اور ہندوستاں کے پوجنے والے

ہندوستان میں پریس یا اخبارات کی ترقی

(ڈاکٹر علامہ سید نجم الدین جعفری بار ایٹ لا)

"میرے محترم کرم فرما ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری بار ایٹ لا ڈائرکٹر پبلک انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا نے باوجود اپنی انتہائی ذمہ دارانہ مصروفیت کے "ایشیا" کے لئے بطور خاص یہ مقالہ اہم عنایت فرمایا ہے، ہر چند کہ یہ کرم ستائش و تشکر کی منازل سے بلند ہے لیکن ... "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر" ادارۂ ایشیا آپ کی اس عنایت کا مل احترام محبت کے ساتھ شکر گزار ہے اور متوقع ہے کہ مستقبل میں اس سے زیادہ بارش لطف و کرم ہوگی۔

"ساغر (نظامی)"

ہندوستان میں پریس کی تاریخ کا آغاز مغلوں کے دور سے ہوتا ہے۔ دارالسلطنت اور تہذیب و تمدن کے دیگر مرکزوں میں محدود اشاعتوں کے قلمی اخبار ہوا کرتے تھے۔ وقائع نگار اور وقائع نویس بھی ہوتے تھے جو دربار اور عامتہ الخلائق دونوں میں تھوڑا بہت رسوخ رکھتے تھے۔ ان کا کام دوگونہ تھا۔ ایک طرف وہ مرکزی حکومت کو لوگوں کے رجحانات سے باخبر رکھتے تھے اور دوسری طرف پبلک کے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔ قلمی اخبار مغلوں کے زوال اور برطانوی راج کے استحکام کے بعد بھی جاری رہے۔ اس وقت کی اخباری دنیا میں عظیم الامرا، اور مرزا علی بیگ مشہور شخصیتوں کے مالک تھے۔

پریس کی یہ صورت کہ وہ رائے عامتہ کا آئینہ دار بھی ہو اور عوام کا مشیر اور رہنما بھی، برطانوی حکومت کے ساتھ وجود میں آئی۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ پریس ہم تک اہل یورپ کے ذریعے پہنچا ہے پہلے آدمی جنہوں نے ۱۷۶۸ء میں پریس قائم کرنے کی کوشش کی۔ مسٹر ولیم بولٹس تھے مگر وہ اپنی اسکیم میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد مسٹر جیمس آگسٹس ہکی نے ۱۷۸۰ء میں پہلا ہندوستانی اخبار بنگال گزٹ نکالا مگر چونکہ اس اخبار کے صفحات ذاتی تو تو میں میں اور پست مذاق کی چیزوں سے آلودہ ہونے لگے۔ اس لئے سپریم کورٹ نے اسے بند کر دیا۔ اس کے بعد بھی اخبار نکلے ان میں اہم ترین انڈین گزٹ ہے۔

۱۷۹۹ء سے پہلے اخبارات کے ایڈیٹروں کے طرز عمل کی رہبری کرنے اور ان کو جائز حدود سے تجاوز نہ کرنے دینے کے لئے پریسیڈنسیوں میں کوئی ہموار اور مستحکم ضابطہ نہیں تھا۔ یہ کام گورنر کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد کلکتہ پریس کی بعض نامناسب حرکتوں کی بنا پر لارڈ ولزلی نے پریس پر سنسر بٹھایا اور پہلی مرتبہ لارڈ موصوف کو یہ خیال ہوا کہ سرکاری نقطۂ نگاہ عوام کے ذہن نشین کرنے کے لئے کوئی سرکاری آرگن ہونا چاہیے۔ لیکن انگلینڈ کے کورٹ آف ڈائرکٹرز کی مخالفت کی وجہ سے وہ اپنی تجویز کو عملی صورت نہ دے سکے۔ ان کے جانشین لارڈ منٹو نے بھی کڑی نظر رکھی اور انہوں نے خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کو تہدید کی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعتقادات کے سلسلے میں ایک دوسرے کو الزام دیتے رہتے تھے۔ خوش قسمتی سے لارڈ ہیسٹنگز کے زمانے میں ہندوستانی پریس کو ڈاکٹر جیمس بکنگھم جیسا مشہور عالم نصیب ہوا جس کی شہرت تمام یوروپ میں تھی۔ ڈاکٹر جیمس نے جو "ایشیاٹک مرر" کے ایڈیٹر اور منیجنگ پروپرائٹر تھے پریس کا لہجہ بلند کر دیا اور اس خدمت کے صلے میں اچھی شہرت حاصل کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنر جنرل تک نے ہندوستانی پریس کی حمایت کی۔ اس کڑے طرز عمل کی بنا پر جو مسٹر برائس نے اختیار کیا ان میں اور پریس کے سنسر مسٹر ایڈمز میں کچھ قیل و قال بھی ہوگئی مگر مسٹر برائس کا پانسہ زبر رہا۔ لارڈ ہیسٹنگز نے ۱۸۱۸ء میں سنسر شپ اڑا دی اور اسی سال کلکتہ کے اخبارات کے ایڈیٹروں کی رہنمائی کے لئے چند ملتے جلتے قوانین بنا دئے یہ قوانین ۱۸۲۳ء تک

قائم رہے۔ اس کے بعد ان کی جگہ اور قوانین نے لے لی ۱۸۱۶ء ہندوستانی پریس کی تاریخ میں بہت اہم سال ہے۔ اسی سال ہندوستان میں دیسی جرنلزم نے جنم لیا۔ سیرام پور کی بپٹسٹ مشنری نے ایک دیسی ہفتہ وار اخبار "دِگ درشن" جاری کیا مشنری کے اس تجربے کو دیکھکر کلکتہ کے اور لوگوں نے بھی دیسی زبان کے اخبار نکالے۔ ان میں مشہور اور بارسوخ اخبارات" کا جار دپن" "سنگھاد کومودی" "سماچار چندر کا" "گنیتان" "نگمان راس بام" اور "بنگھاد بھاسکر" تھے ان میں سے بیشتر مذہبی اور لٹریری تھے صرف چند ایک سیاسیات کو چھیڑتے تھے۔ بعض کٹر ہندوؤں کے آرگن تھے اور صرف عیسائیت کے اثرات کا رد کرنے کے لئے جاری کئے گئے تھے۔ بعض ترقی پسند جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور ہندوازم کو مغربیت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ کلکتہ کے دیسی پریس نے ہندوؤں کو مغربیت کے عمدہ اثرات کے جذب کرنے کے ساتھ ہی ہندو سوسائٹی کو مستحکم رکھنے میں بڑی مدد دی ان میں سے تاتوا بھا دنی جو برہمو سماج نے مشنری کے اثرات کو گھٹانے کے لئے نکالا تھا عیسائیت کے خلاف جذبات پیدا کرنے میں بحیثیت مجموعی کامیاب ہوا اور اس نے مشنری کا اثر بہت کچھ کم کر دیا۔ اسی سال کلکتہ جرنل جاری ہوا۔ اس کی بنیاد مسٹر بکنگھم نے رکھی، یہ آزاد اخبار تھا۔ دوسرے اخبار حکومت کے زیر اثر تھے۔ اس اخبار کو یوروپین تجار کی سرپرستی حاصل تھی۔

۱۸۲۳ء میں مسٹر آدمز قائم مقام گورنر جنرل نے اخباروں کی اشاعت کے سلسلے میں چند قاعدے بنانے کی ضرورت محسوس کی اور یہ قاعدے سپریم کونسل نے منظور بھی کر لئے۔ مسٹر ایڈمز کے قواعد کی کچھ مخالفت ہوئی مگر وہ حق القائم رہے اور لارڈ ایمہرسٹ کے وقت میں بھی نہیں بدلے بلکہ ۱۸۲۶ء میں لارڈ ایمہرسٹ نے تو افسروں کو پریس سے کوئی تعلق رکھنے ہی سے منع کر دیا۔

لارڈ ولیم بنٹنک کے گورنر جنرل بن کر آنے تک پریس اپنی نرم رفتار سے چلتا رہا لارڈ بنٹنک نے پریس کو آزادی دیدی اور ان کے نظام حکومت کے ماتحت جرنلزم نے بڑی سرعت سے ترقی کی ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۰ء میں آدھے بھتہ (half Batta) کے سوال پر بڑا ہیجان ہوا اور سپاہیوں کے دکھ درد بیان کرنے کے سلسلے میں اخبار کے کالم شر انگیز تحریروں سے پر ہونے لگے۔ مگر لارڈ بنٹنک نے سوائے ایک دفعہ کے کبھی تعذیری کارروائی نہیں کی۔ گو کورٹ آف ڈائرکٹرز کی طرف سے انتظامی کارروائی پر اصرار ہوتا رہا۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ پریس کو اقتصادی حالات کی ابتری کے مضر اثرات سے دوچار ہونا پڑا۔ گورنر جنرل نے کسی اخبار کو ایذا نہیں پہنچائی۔ اس ہمدردانہ طرز عمل سے کلکتہ کے باشندوں کی ہمت بڑھی اور انہوں نے

۱۸۳۵ء میں جون ایڈمز کے پریس ریگولیشن کو مسترد کر دئیے جانے کی درخواست کی منظوری ہو گئی اور سر چارلز مٹکاف نے اپنی کونسل کی متفقہ رائے کے ساتھ ہوم کے حکام کی مخالفت کے باوجود ریگولیشن کو مسترد کر دیا۔

مٹکاف صاحب کے جانشین لارڈ آکلینڈ نے بھی اپنے پیشرو کی پالیسی پر عمل درآمد جاری رکھا۔ انہوں نے سرد یوں کو پریس سے آزاد تعلق قائم کرنے کی اجازت دی گو فوجی افسران پر قدرے گرفت رکھی۔ لارڈ آکلینڈ کے زمانے میں ایک سرکاری آرگن نکالنے کا سوال پھر سامنے آیا مگر لارڈ موصوف نے اس کی ہمت افزائی نہیں کی کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اخبار صرف اخلاقی اثر کے بل پر چلنا چاہیئے۔ لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ ڈلہوزی کے دورانِ حکومت کے تعلقات پریس کے ساتھ بہت خوشگوار رہے اور یہ خوشگواری جوں کی توں قائم رہتی اگر ۱۸۵۷ء کے غدر سے سوسائٹی اور حکومت کا توازن نہ بگڑ جاتا۔ غدر سے پہلے بمبئی اور کلکتہ کے دیسی اور انگریزی اخبارات میں ایک قسم کی توہین حکومت اور واقعات کو توڑ مروڑ کر بیان کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی بنا پر حکومت کو ۱۸۵۷ء کا گیگنگ ایکٹ جو کچھ عرصے کے لئے تھا پاس کرنا پڑا اور اس کے تحت میں بہت سے اخبارات بالخصوص دوربین سلطان الاخبار اور فرینڈ آف انڈیا کو تحدید کی گئی۔ اس ایکٹ کا ایک روشن پہلو یہ تھا انگریزی اور دیسی اخبارات میں کوئی امتیاز نہیں کیا گیا۔ اس قانون کی رو سے سرکاری لائسنس کے بغیر چھاپہ خانہ چلانے کی ممانعت ہو گئی اور حکومت کو اختیار تھا کہ لائسنس دے یا مسترد کر دے

لارڈ الگن کے زمانے میں جو لارڈ کیننگ کے جانشین تھے۔ پریس کی آزادی میں کوئی خلل نہیں آیا۔ ۱۸۶۷ء میں ۱۸۳۵ء کا قانون اٹھ گیا اور اس کی جگہ پریس اور رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ہو گیا۔ یہ حالت ۱۸۷۶ء تک قائم رہی۔ ۱۸۷۶ء میں یہ معلوم ہوا کہ دیسی پریس زیادہ مخالفانہ اور باغیانہ رویہ اختیار کرتا جاتا ہے لارڈ لٹن نے تمام صوبجاتی حکومتوں سے مشورہ طلب کیا اور انہوں نے یہ سفارش کی کہ دیسی اخبارات پر جنکے قارئین زیادہ تر جذباتی لوگ ہوتے ہیں مناسب قابو رکھنے کے لئے قانونی چارہ جوئی ناگزیر ہے بس دیسی زبانوں کی مطبوعات پر گرفت رکھنے کیلئے ۱۸۷۸ء میں ایک قانون پاس کیا گیا۔ اس قانون نے پہلی مرتبہ انگریزی اور دیسی اخبارات میں امتیاز قائم کیا۔ مسٹر گلیڈسٹون نے انگلستان کے ایوان عام میں اس قانون پر بڑی لے دے کی اور ۱۸۸۲ء میں جب مارکوئس آف رپن گورنر جنرل ہوئے، یہ قانون منسوخ ہو گیا۔ لارڈ رپن نے پوسٹ آفس کو یہ اختیار دیدیا کہ وہ باغیانہ دیسی مطبوعات پر گرفت لینے کا مجاز ہے۔ اسی زمانے میں ڈیپارٹمنٹ آف پریس کمشنر پر بھی نظر ثانی ہوئی کیونکہ اس کے اخراجات کو فضول سمجھا جاتا تھا جب لارڈ ڈفرن لارڈ رپن کے جانشین ہوئے تو انہوں نے اپنی مدبرانہ پالیسی سے ہندوستانی پریس کو جیت لیا۔ کیونکہ انہیں ایڈیٹروں کی اخلاقی قوت اور اُن کے ظرف پر بڑا بھروسہ تھا۔ انہوں نے تو یہاں تک کیا کہ معاملاتِ حکومت کے متعلق نمایاں ایڈیٹروں کو رازدارانہ گفتگو کرنے کی بھی اجازت دی۔

۱۸۸۹ء میں حکومت آفیشل سیکرٹ ایکٹ پاس کرنے پر مجبور ہوئی۔

انیسویں صدی کے اختتام پر بمبئی پریسیڈنسی میں پلیگ پھیلا۔ حکومت نے ۱۸۹۷ء اور ۱۸۹۸ء کے پلیگ ریگولیشن پاس کئے اور ان سے فسادات اور سیاسی جرائم جیسی سنجیدہ پیچیدگیاں پیدا ہوئیں چونکہ ورنیکلر پریس فرقہ وارانہ نفرت، تشدد پسندی کا ذمہ دار قرار پایا۔ اس کے خلاف کارروائی کی گئی۔ اس فوری صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ۱۸۹۸ء میں پینل کوڈ میں ایک نیا سکشن ۱۵۳ الف داخل کیا گیا۔ انیسویں صدی کا باقی حصہ ہندوستانی پریس پر کوئی نئی پابندی دیکھے بغیر گزر گیا۔ جب کبھی کوئی فوری صورت حال پیدا ہوئی۔ اس کی روک تھام کے لئے کوئی قانون بنا دیا گیا اور جب سکون ہوا۔ وہ ترک کر دیا گیا۔

بیسویں صدی کا آغاز ایک زبردست سیاسی بے چینی سے ہوا جس کی تہ میں مختلف عناصر کام کر رہے تھے۔ بالخصوص جنگ روس و جاپان۔ اس عرصہ میں کلکتہ کے پریس نے پونا کے پریس کی نقل کرتے ہوئے حکومت کے خلاف سخت لہجہ اختیار کر لیا اور اس کے صفحات تشدد کی تعلیم دینے لگے۔ کیسری، دھاری اور یوگانتر کے کالم اس بات کا ثبوت ہیں کہ مذہب تک کو سیاسیات میں ملا دیا گیا تاکہ مذہبی اور جذبات پرست جماعتوں کو تشدد آمیز حرکات پر اکسایا جا سکے۔ حکومت نے مجبور ہو کر نیوز پیپر ایکٹ بابت ۱۹۰۸ء پاس کیا۔ اس قانون کی رو سے حکومت کو یہ اختیار دیا گیا کہ ان چھاپہ خانوں کو ضبط کرے جن میں بعض جرائم پر اُکسانے والے اخبارات چھپیں۔ اس ایکٹ کی فوری وجہ مسٹر اور مسز کینیڈی کا قتل تھا۔ چونکہ تشدد روز بروز سخت ہوتا جاتا تھا اور ۱۹۰۸ء کا قانون حالات کے تدارک کو کافی نہیں تھا۔ اس لئے ۱۹۱۰ء کا پریس ایکٹ پاس ہوا۔ اس قانون کا مسودہ پیش کرتے وقت جو کچھ سرکاری ممبر نے کہا وہ قابل توجہ ہے۔ انہوں نے کہا۔

"یہ باتیں بعض اخبارات کی تعلیمات کا فطری اور معمولی نتیجہ ہیں۔ ان اخبارات نے وہ زمین تیار کی ہے جس پر اب نئی بیل پھول رہی ہے۔ انہوں نے بیج بودیا ہے اور اب یہ فصل کے ذمہ دار ہیں وجوہات کا سلسلہ بالکل صاف ہے۔ نہ صرف یہ کہ تشدد کا آغاز اس وقت سے ہوا جب پریس نے اپنا لہجہ بدلا، بلکہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ادھر کھٹکا یا گیا اور اُدھر کوئی نہ کوئی واردات ہوئی"۔

جب اس ایکٹ کی ضرورت ختم ہو گئی۔ پریس لا کمیٹی کی سفارش پر لارڈ ریڈنگ کے زمانے میں اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اس کی منسوخی پر چیمبر آف پرنسز نے یہ درخواست کی کہ پریس ایکٹ کی ضروری دفعات کے استرداد سے ہندوستانی ریاستوں کے لئے جو کمی ہو گئی اُسے خاص تحفظ سے پورا کیا جائے چنانچہ ۱۹۳۴ء میں ہندوستانی ریاستوں کو سازشوں سے بچانے کے لئے انڈین اسٹیٹس پروٹیکشن ایکٹ پاس ہوا۔ کیونکہ یہ خطرہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور برطانوی ہند کی سرزمین پر سازشیں تیار کی جاتی تھیں۔

ہندوستانی پریس کے اس مختصر سے تاریخی جائزے سے ایک حد تک یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کس طرح پریس اس قدر وسعت پذیر ہوا اور کس طرح یہ ملک کے سیاسی ارتقا میں ایک زندہ قوت بن گیا۔ اب پریس ملک کی ترقی پر بڑا زبردست اثر ڈال رہا ہے اور ہم دیگر ملکوں کے پریس سے مقابلہ کر کے اسے کچھ بہتر پاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم روس یا جرمنی جیسے ملکوں کے پریس سے اپنے ملک کے پریس کا مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی پریس کو کس بلند درجہ کی آزادی نصیب ہے۔ روس اور جرمنی میں اس وقت صرف وہی پریس باقی رہنے دیا جاتا ہے جو حکومت وقت کا ہم آواز ہو۔ بالخصوص روس میں جہاں کے متعلق ہم بہت کچھ سنتے رہتے ہیں پریس کو مطلق آزادی حاصل نہیں ہے کیونکہ وہاں سرکاری ادارہ "گلاولت" ہی سب سے بڑا سنسر ہے۔ وہاں کوئی ذاتی پریس گلاولت کی مرضی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہندوستانی پریس کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات یہ ایسی روش پر جا پڑتا ہے جن سے تعصبات تمام ملک میں پھیل جاتے ہیں ملکی فضا میں جذب ہو کر ہندوستان کی جمہوریت پسندانہ اور قوم پرستانہ صلاحیتوں کو ضرر پہنچاتے ہیں۔ یہ عنصر ہماری ملکی زندگی پر بُری طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ جمہوری اداروں کے رواج پانے کے لئے ایک روشن خیال رائے عامہ کا وجود ضروری ہے۔ کیونکہ رائے عامہ ہی کے بل پر جمہوریت چل سکتی ہے اور چونکہ رائے عامہ کا رہبر پریس ہے اس لئے ان لوگوں کا جو رائے عامہ پر اثر و نفوذ رکھتے ہیں یہ فرض ہے کہ وہ پریس کو جہاں تک ہو سکے ایماندار اور صحیح الخیال بنائے رکھیں۔ لارڈ برائس نے صحیح کہا ہے کہ بڑے ملکوں میں پریس ہی نے جمہوریت کو ممکن بنایا۔ فرقہ وار اخباروں کو بھی لارڈ برائس کی اس نصیحت کو گوش گزار کرنا چاہیے جو انہوں نے اپنی کتاب ماڈرن ڈیموکریسی

میں کی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ایک ایسا اخبار جو قوم کے ایک مخصوص فرقے کو خواہ وہ نسلی ہو، مذہبی ہو، یا صنعتی ہو، خطاب کرتا ہے خطرناک ہوتا ہے اگر وہ اس فرقے کے سامنے صرف جماعتی زاویۂ نگاہ اور واقعات لائے اور اس مخصوص فرقے کی تکالیف کو مبالغے کے ساتھ پیش کرے اور اس فرقے کے باقی قوم سے علیحدگی اور مخالفت کے جذبات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرے ایک مخصوص علاقے میں یا کسی ایک جماعت کے افراد میں کسی ایک اخبار یا متعدد اخبارات کا جو ایک ہی شخص یا جماعت کے اثر میں ہوں ضرورت سے زیادہ اقتدار روشن خیال رائے عامہ کی تخلیق کے لئے خطرہ ہے)۔

ترک و اختیار

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

قومی عصبیت کو ترک کردو

کہ یہی وہ زہریلا تخیل ہے جو دنیا کے امن کو پارہ پارہ کئے ہوئے ہے یہی ایک فرد کو دوسرے فرد کے حقوق سے غصب کی خطرناک راہ دیتی ہے اور یہی اس پُرکیف محبت کی فردوس سے دور رکھتی ہے جس میں حیاتِ جاویدکے نغمہ ریز آبشار ہیں۔ یہی وہ ساپن ہے جو دنیا میں سیاسی بے چینیوں کے اژدہے پیدا کرتی ہے اور یہی وہ ڈائن ہے جس نے اپنے پنجوں سے انسانی قلوب کو جکڑ رکھا ہے۔ اٹھو اور تریاقِ محبت سے اس ساپن اور اس ڈائن کی زہریلی گرفت سے آزاد ہو جاؤ۔

اکتفا اور توکّل کو چھوڑ دو

کہ توکّل تکاہل اور سستی، قدرت کے اکرام سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے تصور میں مست رہنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ توکّل اس روحِ یقین کو کہتے ہیں جو عبد کو معبود کے علاوہ ہر ایک کی طرف سے بے نیاز کردے، توکل حجرہ نشینی اور گوشہ گیری کا نام نہیں ہے، توکل نام ہے ایک مقدس بے نیازی کا' اور بے نیازی ایک مجاہد ہی کا اصول ہوسکتی ہے جو زندگی اور قوتِ بازو سے گہرا رابطہ رکھتا ہو۔

اکتفا۔ قدرت کی توہین ہے اور تسلیم غلامی کے لئے ایک پاکیزہ بہانہ ہے۔ خون کو سرد کرنے کے لئے ایک بجھا ہوا خیال ہے۔ ایک مٹا ہوا تصور ہے اور روح کو منفعل کرنے کے لئے ایک سیلاب بھی اکتفا اس کو نہیں کہتے کہ اگر کوئی ملک غلام ہے اور اس کے باشندے امن کی زندگی بسر کرتے ہیں تو اس کے باشندوں کو آزادی کی سعی نہیں کرنی چاہئے بلکہ اکتفا نام ہے فاسد مزاج کے مطالبات ناجائز سے دماغ و دل کو محفوظ رکھنے کا۔ حرص و آز کے تقاضات کو رد کردینے کا، خود آزاد اور دوسروں کو بھی ذی عزت اور آزاد رہنے دینے کا' اپنی پونجی کی حفاظت اور دوسرے کی جنس نقد کی طرف سے آنکھ بچا کر گزر جانے کا۔

ذی حیات موسم ہے اس لئے سنو کہ اکتفا جمود کا نام نہیں حرکت کا نام ہے۔ حرکت اور حرارت ہی زندگی ہے، اکتفا کاہلی ہے اور کاہلی موت ہے اور موت دنیا میں عزت و آزادی کی ضامن نہیں ہوسکتی' اس لئے جھوٹے توکل اور باطل اکتفا کو چھوڑ دو۔ جو تم کو بازاری صوفیوں نے سکھایا ہے۔

انسانی اخوّت کو اختیار کرو

دنیا کو ایک گھر انسانی نسل کو ایک خاندان' اور تمام قوموں کے افراد کو اپنا بھائی یقین کرو کہ قومیت ہو یا وطنیت، نسل ہو یا رنگ اس کی تعیین قدرت نے نہیں کی ہے اور اگر تعیین کرتی تو یورپ میں نیلی آنکھوں والے انسانوں کے بجائے چار آنکھوں والے آدمی پیدا کرتی امریکہ میں ایک ٹانگ کا آدم ہوتا اور ہندوستان میں چار دست انسان' اسلئے سوچو اور اپنے نفس کی کدورتوں' خیانتوں' اور تنگیوں کا محاسبہ کرو' یہ تمام طلسم یہ ساری جادوگری اور یہ تنگ رنگ کے جال خود تمہارے ہی وضع کئے ہوئے ہیں۔

دنیا کا امن سیاسی خودغرضی میں پوشیدہ نہیں بلکہ اخلاقی فراخدلی میں پنہاں ہے' عیسائیت ہو یا اسلام ہندوازم ہو یا کوئی اور مذہب' جسقدر اخلاقی مذاہب ہیں ان کی روح اور انکا مقصد صرف انسانی کی بحالی و ترقی ہے۔ قومی عصبیت اخلاق کی بنیادی روح پر ایک ضرب کاری ہے' اگر یہ کیفیت ہو گئی تو انسانی روحانیت کا قلع قمع ہو جائیگا' انسان جس منزلِ ارتقا تک اس وقت تک پہنچا ہے اور خود اس کی سعی جس تمدن و تہذیب عظیم' شان درجہ بالائی سے اور جس دماغی و روحانی بلندی پر اس وقت وہ پرواز کر رہا ہے کیا وہ دنیا و انسان کے لئے محض فریب و سراب ہے؟ اور اگر سراب نہیں ہے تو پھر اپنے منصب کی روایات کو باقی رکھو

گوشوں کی دیواریں توڑ کر باہر نکل آؤ اور حجروں خدا تم کو حجروں کے اندر' گوشوں کے اندر توکل کا صلہ نہیں دیگا حمق دینگے اور آج دنیا و انسان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ حمق سے فائدہ اٹھانے والوں کو نیست و نابود کردو انسان کی عملی میں توکل فنا کا دوسرا نام ہے اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو مجاہد بنو' زندگی نام ہے اضطراب و اشتعال کا' اگر گھر کے کونوں میں اس چنگاری کی طرح چھپے بیٹھے رہے جو الاؤ سے برات کر دیا جاتی ہے تو یاد رکھو صبح ہوتے ہی تم پر اوس پڑ جائیگی لیکن اگر تم نے اپنے ہاتھوں کی قوتِ عمل سے سلگا کر مشعل بنا دیا تو تم خود اپنے رہبر بن جاؤ گے اور قسمت کی روشنی تمہاری رکاب بردار ہوگی' توکل کی تعلیم' قناعت کی تعلیم ہے جب ادیب و شعراء حکومتوں کے وظیفہ خوار ہوتے تھے اور اپنے ادب کے ذریعہ عوام کی روحِ احتجاج کو مغلوب کرنے والی اخلاقیات کا درس دیتے تھے۔ آج وہ زمانہ آگیا ہے کہ ہر شخص اپنا خود وظیفہ خوار ہے' یہ وظیفہ تمہارے ہاتھوں کی جنبش ہی ادا کر سکتی ہے' خدا پر بھروسہ کرو مگر اس یقین کے ساتھ کہ بغیر حرکت کے خدا تم کو ایک ذرہ نہیں دیگا۔ **اکتفاء**۔ تسعے کے لطف و کرم کی توہین ہے اور اس کے دروازۂ فیض سے ہٹ جانے کے مترادف۔ اکتفا ترقی کے راستے مسدود کرتا ہے بے جینی ارتقاء کی ضامن ہے۔ ہر وقت فضاؤں میں شاہین صفت اُڑنے رہو اور عقاب نظر شکاری کی طرح طائرِ وقت کا شکار کرو۔ اور اگر تم ایسا نہیں کرسکتے تو ترکش جلا دو اور کمان ٹکڑے ٹکڑے کردو۔

ساغر نظامی

انگریزی گرجوں میں دستک دینے کی خاص گھنٹیاں

(از سید عنایت علی بی اے (علیگ))

کلیسائی گھنٹی
سینٹ گری گوری کے گرجہ واقع نارویچ میں

انگلستان کے پرانے گرجوں میں اب بھی ایسی گھنٹیاں موجود ہیں جو محض مجرموں کیلئے مخصوص تھیں کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کی غرض سے گرجوں میں جب آتے تھے تو ان گھنٹیوں کے ذریعہ کلیسا کے راہب کو اطلاع دیتے تھے جو اپنے مراقبہ سے بیدار ہو کر گرجہ کے دروازہ کو کھولتا اور گناہگاروں کو کلیسا (choir) کے پاس لیجا کر امن کی چوکی (Frith or peace stool) پر بٹھاتا۔ اگر ان کے پاس ہتیار ہوتے تو یہ گنہگار وہاں پہنچکر ان کو راہب کے سپرد کر دیتے۔ پھر اپنے جرموں کا اقبال و اعتراف کرتے۔ توبہ کرتے۔ مختلف قسمیں کھاتے داخلہ کی فیس ادا کرتے اور ایک سیاہ چغا پہنکر جس کی بائیں آستین پر سینٹ کیتھبرٹ (St cuth bert) کا صلیبی نشان ہوتا۔ ہمیشہ کے لئے کلیسا کی پناہ میں نہایت پرامن زندگی گزارتے۔

عیسائیوں کا بیان ہے کہ گرجہ میں وہ حصہ جسے کلیسا (choir) کہتے ہیں نہایت متبرک و مقدس ہے اور جو شخص اس کی پناہ میں ہو وہ تمام آفات اور پاداشِ جرائم اور سزاؤں سے محفوظ ہوتا ہے چنانچہ اسی عقیدہ کو قائم رکھتے ہوئے انگلستان میں ۳۹۹ء میں گرجاؤں کی تقدیس کو حکومت نے تسلیم کر لیا۔ پھر بذریعہ قانون ۴۱۹ء گرجہ کے دروازہ سے پچاس قدم تک اس تقدیس کو وسعت دی گئی۔ بالآخر ۴۳۱ء میں گرجہ کے احاطہ تک یہ وسعت بڑھ گئی۔ اس احاطہ کے اندر اندر حکومت کے قوانین کا نفاذ اور ان کی عملدرآمد ناممکن ہو گئی تھی اور مجرم۔ ڈاکو۔ قاتل وہاں پہنچکر مامون و محفوظ ہو جاتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب انگلستان میں راہبوں کے دور دورے تھے اور راہبوں کی خانقاہوں پر بڑے بڑے شاہانِ انگلستان خمیدہ اور سرنگوں نظر آتے تھے۔

آل سینٹس کے گرجہ واقع یارک میں کلیسائی گھنٹی

حقوق کلیسا پر سب سے پرانا قانون جو ہاتھ لگا ہے وہ سنہ ۶۶ء کا ہے۔ اس میں بالتفصیل گناہگاروں کے توبہ کرنے کے طریقے درج ہیں کہ کس طرح وہ کلیسا میں داخل ہوں۔ کس طرح اپنے گناہوں کا اقبال و صحیح بیان راہب کے سامنے دیں اور پھر اپنے گناہوں سے توبہ کر کے کس طرح کلیسا کی پناہ میں آجائیں۔ کیا داخلہ کی فیس دیں اور بعد میں سیاہ لباس پہنکر کس طرح گرجہ میں پرامن طریقہ سے ایک آزاد خادم کی زندگی بسر کریں۔

چونکہ اس طریقہ میں یہ خرابی تھی کہ جس نے جب چاہا اور جیسا کچھ چاہا سنگین سے سنگین جرم کر ڈالا اور گرجہ میں جاکر توبہ کر ڈالی۔ مگر اس سے لیے سنگین جرائم کی تعداد میں جو اضافہ ہوا وہ شاہ جیمس اول کے ۱۶۲۳ء کے قانون سے واضح ہوتا ہے۔ اس لئے اس کلیسائی تقدیس کا ۱۶۹۹ء کے قانون سے سدباب ہوا اور پھر ۱۷۲۳ء کے قانون نے اسے بالکل فنا کر ڈالا۔

ہیکس ہیم (Hexham) اور بیورلی (Beverley) کے گرجاؤں میں مندرجہ بالا

امن کی چوکیاں (Frith stools) اب بھی موجود ہیں

یہ کلیسائی دستک کی گھنٹیاں پارک کے آل سینٹس چرچ، نارفوچ کے سینٹ گری گری چرچ اور ایڈل علاقہ لیڈز میں اس وقت بھی موجود ہیں۔ یہ تقریباً ایک سی وضع کی ہیں۔ ایک سُور کا منہ اور اُس کی گھنٹی پر راہب کی تصویر مع اُس کے راہبی ٹوپے کے۔ اور زنجیر ہلانے والا کڑا ان دونوں۔ اُبھرے ہوئے منہوں کے پیچھے۔ یہ گھنٹیاں ڈھلے ہوئے لوہے کی ہیں مگر ان کی ساخت اور کاریگری سے انگلستان کے قدیم فنِ آہنگری کا پتہ چلتا ہے۔

ایسی گھنٹیاں نہ صرف معبدوں اور گرجاؤں ہی میں استعمال ہوتی تھیں بلکہ ان کا رواج شہروں میں بڑی بڑی نجی اور سرکاری عمارتوں میں بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ انگلستان کے بڑے عجائب خانہ (British Museum) میں ایسی گھنٹیاں موجود ہیں۔ اور وکٹوریہ میوزیم لندن میں چودھویں صدی کی ایک گھنٹی موجود ہے۔ آکسفورڈ کی بریز نوز کالج میں جو ایک مشہور گھنٹی ہے اُس کو کالج نے ۱۸۸۸ء میں خریدا تھا اس کے متعلق ایک طول طویل داستان ہے۔ یہ گھنٹی ابتدا میں ایک معمولی عمارت میں تھی۔

رائل ہسٹوریکل سوسائٹی کے ممبر مسٹر ارنسٹ موریس نے ان گھنٹیوں کے حالات اور تصاویر سوسائٹی ہذا کے لئے فراہم کئے ہیں۔

(ترجمہ)

بریز نوز کالج۔ آکسفورڈ میں یہ گھنٹی موجود ہے

محبّت کی کرم فرمائیاں

بن نہ جائیں عشق کی رسوائیاں | شوقِ نافرماں تری خود رائیاں
برخلافِ عشق، ہر تدبیرِ عشق | مل گئیں سب خاک میں دانائیاں
کس سے ہوتیں، گر نہ ہوتیں آپ سے | اِس قدر! اور اتنی! بے پروائیاں
مرحبا! اے شاہدِ حسنِ خیال | کِس نے دیکھی ہیں تری رعنائیاں
شبنم و گل، ماہ و نجم، ارض و سما | ایک ذات، اور سیکڑوں پرچھائیاں
اب وہ آئے! اب وہ آئے! اب وہ آئے | سب ہیں یہ دل کی خیال آرائیاں

خون رلوائیں گی نشتر! ایک دن
"یہ محبت کی کرم فرمائیاں"

نشترؔ سندیلوی

جرعاتِ خیال

(روحِ فریدؔ سیدہ زینب جنت مکانی کے نام)

ساغر! تم نے افسانہ مانگا ہے گویا میرے پاس ——— کہانی کی مشین ہے کہ جب چاہا ڈھال لی، برادرانہ اصرار اور پُرخلوص محبت سے مجبور ہو کر چند بھولی بسری کہانیوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں، گل پوش شملہ میں "اُن کے" سوا کچھ یاد نہیں آتا۔ فقط تمہارا۔ فگارؔ فرید

(۱)

موہنی! آج جب میں قدم قدم پر پھسل رہا ہوں، مجھ پر ہر طرف سے کمندیں پڑ رہی ہیں اور میں بچتے بچتے بھی گرفتار ہوا جاتا ہوں سنبھلتے سنبھلتے بھی پھسلا جاتا ہوں مجھے وہ تھرتھراتی ہوئی راتیں یاد آتی ہیں جب گرجتے ہوئے راستوں کے کنارے کنارے ہم پریت نگر کو بانہوں میں بانہیں ڈالے جایا کرتے تھے۔ جب تم ڈر ڈر کر اپنی پریت بھری آنکھوں کو میرے اوورکوٹ میں چھپا لیا کرتی تھیں۔ جب تمہارے کسی قدر چھلکتے ہوئے ہونٹ میری انگلیوں کے سہارے سنبھلتے تھے اور میں ڈگمگا جایا کرتا تھا۔ جب بازار کی لہراتی ہوئی روشنی زمین کو "انجمستان" بنائے ہوتی تھی۔ جب دور گھاٹیوں میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ ہم کو غور و فکر میں ڈبو دیتے تھے۔ جب میں تمہارا ہاتھ کسی قدر دباتا تھا اور تم ڈری ہوئی ہنسی ہنس دیتی تھیں۔

آج جب ہر لمحہ ناگنوں کا نرغہ بن جاتا ہے۔ میں وہ پراگندہ راتیں یاد کرتا ہوں جب چندرما کی مدھ بھری فضا میں ہمارے دل ایک دوسرے کے پاس رہ جایا کرتے تھے۔ وحشی ہونٹوں سے پریم اور پریت کی چنگاریاں اُٹھتی تھیں اور ہم دونوں انہیں اور بھڑکا کر شعلہ کر دیتے تھے اور پھر چوموں کی روشنی میں جُھلسے جُھلسائے رخصت ہو جایا کرتے تھے ———

آج جب تم کوثر کی پھوار میں نہا رہی ہو اور پریم کے گنگا جل میں مجھے ڈھونڈھتی پھرتی ہو، میں تم سے بہت دور ہوں، تم زمرّدیں محل میں حوروں کے نرغے میں "بالم مورے پردیس" کی برہ راگنی چھیڑ رہی ہو میں بے وفائی اور بے حیائی کے سیلاب میں بہا جا رہا ہوں۔ ایک رہنما تنکا بھی ہاتھ نہیں آتا کہ کہیں تو ساحل سے جا لگوں ———

آج تمہارے پریتم کا خون برف ہو رہا ہے صرف پرانی یاد کی چنگاریوں کی حرارت میں وہ جی رہا ہے مگر یہ کب تک ——— کیا ہمارے جذبات کی گہرائیوں پر بھی خزاں کے جھونکے بہہ گئے ہیں؟

وعدوں کی یاد پر کُہر سا چھا رہا ہے، وفا کے معاہدوں پر دُنیا کا حسن اور اُرمان غالب آ رہا ہے تصوّرات کے سہارے ہیں مگر ان میں ناگنیں لپٹی ہوئی ہیں ———

میں سنسناتی ہوئی راتوں میں تمہارے لئے بڑبڑایا کرتا ہوں بھول بھول کر تمہیں یاد کرتا ہوں۔ کبھی دل کو بہلانے کے لئے تمہارے پریت نگر کی یاترا کیلئے اُٹھنا چاہتا ہوں مگر دزدیدہ نگاہوں کے گرداب میں گھِر کر اُٹھتے ہی رہ جاتا ہوں۔ دوست مُنہ چھپا چھپا کر ہنستے ہیں مگر وہی مجھے گناہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں جس سے صرف گاہے گاہے تمہاری یاد کی ایک ہلکی سی جھرجھری بچا دیتی ہے۔

وقت خوابوں کی تعمیر کی ہوئی فلک پیما عمارت کو توڑ ڈالتا ہے مسمار کر دیتا ہے، اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے ——— وقت دیوی دیوتا دونوں کے بتوں کو مٹی میں ملا دیتا ہے، خواہشیں ویران ہو جاتی ہیں اور آرزوئیں سنسان۔ صرف پریم اور پریت جاودی ہیں باقی رہتے ہیں۔ اپنی طلسماتی شمع کی روشنی میں برابر آگے ہی بڑھتے رہتے ہیں گلاب مسل جاتا ہے لیکن اُس کی خوشبو دماغ میں بسی رہتی ہے۔

(۲)

سندری! میں ہمالیہ کی چوٹیوں سے تمہیں دیکھ رہا تھا جب تم موت کے رتھ پر پریت نگر کی طرف اُڑی جا رہی تھیں مگر میں بے بس تھا! یہ نہ سمجھنا کہ ہلاکت آفریں فضا نے مجھے تمہارے پاس پہنچنے سے روک دیا یا آسمانی غصہ کے خوفناک لپکے سے میں ڈر گیا۔ میں اس آتی ہوئی گھڑی کے خوفناک ارادوں سے بے خبر بھی نہیں تھا ——— میں دیکھتا تھا کہ آسمان پر عروس کے وداعی خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سارا آسمان آبادا اپنے ڈینے پھڑپھڑا رہا ہے۔ آخری سانس لیتا ہوا مغرب دم توڑ رہا ہے، مشرق تباہی کے امواج صوتی کے ساتھ چلا آ رہا ہے ——— میں نے موت کے رتھ کا سفید لہراتا ہوا پرچم بھی دیکھ لیا تھا مجھے معلوم تھا کہ رتھ فضا کے کھمبے میں اٹک چکا ہے اور طوفانی سفر کے لئے بادلوں کے گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی ہو چکی ہیں، لہروں نے ہمارے اپنے چندرما کی تڑپ اور فطری تکلیف کو مچل مچل کر ظاہر کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور سدابہار تارے پیلے پڑ گئے ہیں ——— میں خواب سے بیدار ہو چکا تھا اور تم کو اپنی آغوش کی پناہ میں لے لینے کے لئے ایک عجیب و غریب کالا چاند میری آرزو کے گہوارے کے قریب دھیرے دھیرے تیرتا ہوا آ رہا تھا اور وہ میرے ساحل تک پہنچنے کے لئے اس قدر بضد تھا کہ میری ذرا سی لغزش میں اُس کی کشتیٔ حیات پتھریلے ساحل سے ٹکرا جاتی اور انجام اس سے زیادہ خوفناک ہوتا ——— اب تم تکمی سے وقت کے نامعلوم جزیرے میں رہو میں غیر فانی ساحل کے لئے روانہ ہو چکا ہوں تمہیں ڈھونڈھ نکالوں گا لیکن اس کے لئے مجھے بھی اپنے جسم کے امرت کو اچھی طرح نچوڑنا ہے زندگی کے مصنوعی روغن کو اچھی طرح دھونا ہے، جب میں دُنیاوی قانون کے ماتحت اچھی طرح

پاک صاف ہو جاؤں گا۔ پریت نگر کے مندر میں ہمارا تمہارا ملاپ ہو جائیگا اُس وقت ہماری روحیں ملکر ایک ہو جائیں گی ——

(۳)

کامنی! پریم کی وہ ایک مدھ بھری رات تمہیں یاد ہے جب ہم چونک کر ایک دوسرے سے ملے، آکاش سے دھرتی پر پریم کے پھولوں کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ تم کیسی سُندر معلوم ہو رہی تھیں۔ میں باہر سے آیا تھا۔ میری ماتا جی بھی ساتھ تھیں۔ تم نے کیا سب کی نظریں بچا کر مجھ پر اپنے پریم کا امرت چھڑکا، اُف کیسی نشیلی خوشبو تھی، میں بیخود ہو گیا تھا تم نے مجھے پریت کی جونہی چھڑی ماری مجھے ہوش آگیا —— پھر ہانپتے ہوئے آسمان کے نیچے ہمارے پریم کی وہ لمبی لمبی سنگتیں، میں نے تمہارے لہراتے بالوں کی اندھیری مست خوشبو لی تھی اور تمہاری چھلکتی ہوئی آنکھوں میں کرم کا نہان کر لیا تھا۔ تم نے مجھے پریم اور پیار کی دھیمی تھپکیوں میں کتنی نیندیں سلائی تھیں اور اُن اُبلتے ہوئے گھنٹوں میں دنیا کیسی مدہوش ہو جاتی تھی جبکہ ہم دونوں رخساروں کے سہارے سماج کی جبر دستیوں کے افکار میں کھوئے سے رہتے تھے —— جھڑی ہوئی پتیوں ٹوٹے ہوئے پھولوں اور بسکی ہوئی خوشبو کے سایہ تلے ہم ہچکیاں لیتے ہوئے چاند کو پیلے ہو ہو کر دیکھا کرتے تھے اور آخر کبھی کبھی اکتا کر پیوست لبوں کی مٹھاس سے درد کی چیخوں کو بھلا لیا کرتے تھے —— یہاں تک کہ ہماری پر سکون ریاضتیں اور وقت کی ستیہ گرہ کام آئی اور سماج اور دنیا کی نظروں میں بھی ہم ایک دوسرے کے ہو گئے —— مگر پھر ایک دن بدبختی کا پتھر آسمان کی چھائی ہوئی چھت میں سے کھسکا اور تم پر گرا، اُس وقت میں تم سے بہت دور ہمالیہ کی چوٹیوں پر مستقبل کا قلعہ تعمیر کر رہا تھا —— جب تمہیں تلاش کرنے پہنچا تو تم "اللہ آباد" سے بھی اوجھل ہو چکی تھیں اور اب میں تم کو وہاں دیکھتا ہوں جہاں میری جگہ نہیں —— مگر اب میں نے بغاوت کر دی ہے، ہر چیز سے بغاوت کر دی ہے انتقام کی پیاس بجھتے ہی مجھے یقین ہے کہ دروازے کھل جائیں گے اور میں ایک بار پھر تمہارا ہو جاؤں گا۔ تم روحانیت کے زرتار لباس میں ملبوس کر دی گئی ہو، مجھے ابھی مجھے ابھی جسمانی کیچلی ہی اتارنی ہے ——

(۴)

پیاری! میں وقت کا منتظر ہوں، میری روح تمہارے لئے انتظار کر رہی ہے مگر جس طرح تمہارا جسم فنا ہو چکا اور روح ہی روح رہ گئی اسی طرح جب تک کہ میرا جسم بھی فنا نہیں ہو جاتا اور صرف روح نہیں باقی رہ جاتی میں تم سے بہت دور ہوں، بہت دور!

میری روح وقت کا انتظار کر رہی ہے، طوفان، برف، آندھی اور بارش کی بھی اُسے پرواہ نہیں اُسے وقت کا انتظار ہے اور اسی کی دُھن ہے

یہ امتحان کا وقت ہے، میری روح نے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری روح سے جُدا نہیں ہوگی، میری روح بے وفا نہیں ہے، وہ وعدہ پر قائم ہے، وہ صرف تمہارے خیال میں سرگرداں رہتی ہے وہ تم سے جُدا نہیں ہوگی، تمہارے جسم نے بے وفائی کی، میرا جسم بہت دن رویا کیا، اب میں بہت روکتا ہوں، کبھی کبھی مان جاتا ہے، گھبراؤ نہیں وقت قریب ہے بہت قریب!! تم پریت نگر کی گل ریز فضا میں اپنے پریم کی بانسری بجاتی رہو، میں آپہنچوں گا —— میں آپہنچوں گا۔

موسم سہاسیٹی بجا رہا ہے اور راتیں غصیلی ہوتی جا رہی ہیں۔ تم جب سے گئی ہو جھلک دکھانے بھی نہیں آئیں، مجھے یقین ہے کہ تم نہ آؤ گی —— مگر میں اپنی روانگی کا وقت آنے تک بلبلاتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ تمہارا انتظار کرتا ہی رہوں گا!!

فرید مچھلی شہری،

میرا پیام

(جُرعاتِ خیال کے فرید کے لئے چند گھونٹ)

ہے جو سوزِ یک نفس، سازِ تمام ہے یہی — نغمۂ صبح ہے یہی نالۂ شام ہے یہی
موت جہانِ عشق میں اک شدید کفر ہے — اے دلِ نا اُمید حُسن جذبۂ خام ہے یہی
میرے لبِ خموش پر حُسن کو حیرتیں ہیں کیوں؟ — کہدے کوئی کہ عشق کا طرزِ کلام ہے یہی
منکرِ حشر ایک دن حشر کو مان جائیں گے — حُسنِ ملیح کا اگر طرزِ خرام ہے یہی
ذکرِ رہائی پر مرے اہلِ قفس پکار اُٹھے — اس کو رہا نہ کہیئے حاصلِ دام ہے یہی
خونِ حیات نذر دے لعبتِ نوبہار کو — بُلبلِ نغمہ ریز کو گُل کا پیام ہے یہی
حبِّ چمن سے مست ہو کیفِ وطن سے مست ہو — موسمِ نوبہار میں میرا پیام ہے یہی

جام بدست رقص میں بیخود و مست عیش میں
ساغرِ مست زندہ باد، گردشِ جام ہے یہی

گرم و ستیزہ کار ہے مولوئ فساد خو — پہلے اسے تمام کر شترِ تمام ہے یہی

ساغر نظامی

جیونی

میرا گھر میں پاؤں رکھنا تھا کہ کاکا نے ایک لا انتہائی گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا میری کامیابی، میری تندرستی، چھوٹی بہن کی شادی کی فکر میسور کی حالت وغیرہ وغیرہ غرضیکہ وہ کونسا ذکر تھا کہ نہ کیا گیا ہو اور میری یہ حالت تھی کہ ہمہ تن گوش تھا گو حقیقتاً یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ وہ کہہ کیا رہی ہیں البتہ کبھی کبھی ہاں ہوں ضرور کر دیتا تھا میں تو اس وقت گرما گرم چائے کی چسکیاں لے رہا تھا جو دس میل کے طویل سفر کے بعد بالکل امرت معلوم ہوتی تھی سفر کی طوالت کا اس طرح اندازہ کیجئے کہ مجھکو بائکلہ کی شکستہ اور گرد آلود سڑک پر دس میل بائیسکل پھیلنا پڑا تھا۔ اس بائیسکل پر جس میں سے چرخ چوں وچڑ پڑ کی مختلف الصوت آوازیں نکل کر انقباضِ طبع اور دل کی پراگندگی کا سامان مہیا کرنے میں مصروف کار تھیں گھر سے ۹ ماہ کی طویل جدائی کے بعد گھر کے اندر ایسا سکون محسوس ہوا کہ بس سو جانے کو جی چاہتا تھا چنانچہ نیم غنودگی کی سی حالت میں میں کاکا کی باتیں سنتا رہا مگر جی یہی چاہتا تھا کہ کاکا چلی جائیں اور میں نیند میں دنیا و مافیہا سے کھو جاؤں۔ پیالی ختم کرنے کے بعد میں نے ان سے دوسری پیالی کی درخواست کی کیونکہ اول تو تنہائی کا بہانہ اس سے بہتر نہیں مل سکتا تھا دوسرے واقعہ یہ بھی تھا کہ چلنے کی خواہش باقی تھی ان کے چلے جانے کے بعد میں اپنے ہاتھ کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور سکون کی ایک پُر مسرت موج تمام جسم میں دوڑ گئی کچھ غنودگی بھی طاری ہوگئی۔ یکایک نیم بیداری کی حالت میں میں نے اپنے عقب میں آہستہ سے دروازہ کھلتا ہوا محسوس کیا جو مکمل طور پر نہیں کھولا گیا تھا۔ میں چپ چاپ لیٹا رہا میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص دروازہ میں کھڑا ہے اور اندر آتے ہوئے ڈرتا ہے میں نے اپنا ہاتھ سر کے نیچے سے سرکایا اور پاؤں بھی فرش پر آہستہ سے پھیلایا اور کچھ بڑبڑایا بھی کروٹ بھی لی دروازہ پھر کچھ بند ہوا اور وہی شخص واپس ہوتا ہوا معلوم ہوا —— گیا

میں نے دل میں خیال کیا اور اس خیال سے کہ میں نے کسی ہمسایہ کو جو غالباً میری آمد کی خبر سنکر مجھ سے ملنے آیا تھا واپس بھیجدیا کچھ تکلیف سی محسوس کی لیکن کوئی اندر سے کہہ رہا تھا کہ نہیں ابھی یہ گوشت پوست کا مجسمہ موجود ہے باہر پتھریلی زمین پر گاڑیوں کی گھر گھراہٹ اور کووں کی کائیں کائیں نے ایک بلا خیز طوفان اُٹھا رکھا تھا۔ دروازہ سے سورج کی چند کرنیں اندر آ کر مجھ کو آرام پہنچانے میں مشغول تھیں کہ کاکا چائے لیکر اور میرے قریب کھڑے ہو کر آہستہ سے بولیں رتمو بھیا سو گئے!؟ میں نے اپنے سر کو دروازہ کے جانب حرکت دیتے ہوئے کہا جاگ رہا ہوں دروازہ اب مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔

"کاکا" میں نے کہا "دروازہ میں کوئی آدمی کھڑا تھا!"

کب۔ انہوں نے بلند آواز میں دریافت کیا۔

ابھی کوئی ایک سیکنڈ ہوا۔

انہوں نے دروازہ میں سے جھانک کر دیکھا کچھ مسکرائیں اور پکارنے لگیں جیونی! بندریا! اندر کیوں نہیں آتی۔ بھیا تم کیا سمجھ رہے تھے؟ رام جانے کون ہے؟ اور یہ کہکر ایک قہقہہ لگایا یہاں تک کہ اُن کے آنسو نکل آئے ایک نحیف آواز میں یہ الفاظ ادا کئے گئے۔

جی ماتا جی۔ جی ہاں میں اندر آنا چاہتی تھی مگر بابو جی کو سوتا دیکھکر میں یہاں رُک گئی۔ یہ الفاظ دیہاتی لہجہ میں ادا کئے گئے تھے۔

کاکا نے حکم دیا اندر آجاؤ۔

جیونی آہستہ سے دروازہ تک آ کر رُک گئی اور مجھ کو اس طرح سے دیکھنے لگی کہ میں کوئی دلی یا مہتما ہوں۔

کاکا نے پھر کہا ڈرو مت اندر آجاؤ

جیونی اندر داخل ہوئی اس انداز میں گویا کہ مندر میں داخل ہو رہی ہے اور دور ہی ایک چاول کی بوری کے پاس کھڑی ہوگئی۔

کاکا میرے قریب فخر اور محبت کے انداز میں بیٹھی تھیں۔ ان کی تمام محبت میری ذات سے وابستہ تھی انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا رتمو۔ جیونی ہماری نئی نوکرانی ہے اب میں نے جیونی کو دیکھا جس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اس کی عمر ۴۰ سے تجاوز کر چکی تھی چہرہ پر کہیں کہیں جھریاں پڑ گئی تھیں مگر آنکھوں میں عجیب چمک باقی تھی۔ اس کے بال سفید ہو چلے تھے اور لٹکی ہوئی چھاتیاں قمیص ست نا آشنا تھیں۔ کشادہ پیشانی سے بیوگی اور غم کے آثار نمایاں تھے۔

جیونی قریب آؤ میں نے کہا۔

نہیں بابو جی۔

نہیں آگے آؤ میں نے پھر اصرار کیا۔

کاکا چلائیں۔ جیونی یہاں قریب سے آکر دیکھ میرا بھیا کیسا سُندر ہے۔ کیا قیامت کا افتخار تھا جس نے میری بھدی ناک اور موٹے لبوں کا تصور دماغ میں پھر تازہ کر دیا۔ ہجو ملیح کا نہایت حسین انداز تھا۔

جیونی چند قدم اور رینگی۔

بندریا آگے کیوں نہیں آتی کاکا نے تُرشی سے کہا۔

جیونی چند قدم اور آگے بڑھی اور گردن جھکا کر ایک نئی دلہن کی طرح کھڑی ہوگئی۔

کاکا کہنے لگیں دیکھ جیونی میرا بھیا بالکل شہزادہ معلوم ہوتا ہے

"دیوتا" جیونی بولی

مجھ کو ہنسی آگئی اور چائے پینے میں مشغول ہوگیا۔

جیونی نے آہستہ سے کہا تمام گاؤں بابو جی کے راگ الاپ رہا ہے

تجھے کیسے معلوم کاکا نے پوچھا!

کیسے میں تیسرے پہر کو بزار گئی تھی مجھے بابو جی کے آنے کا حال معلوم تھا آپ نے کہا تھا کہ وہ بالکل شہزادے معلوم ہوتے ہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ بائیسکل پر سوار ہوں گے۔ جب بابو جی

اس پیپل کے نیچے پہنچے جس میں رسی کا پھندا ڈالکر اس موئے مچھیرے کودوں نے پھانسی لگالی تھی تو میں نے دیکھا کہ سب آدمی بابوجی کو دیکھ رہے ہیں اور وہ مجھ سے پوچھنے لگے یہ کون ہیں میں نے جواب دیا نائب صاحب کے سالے ہیں اور کون ہوتے۔ موئے والہ تمکو بولے کیسے سندر ہیں۔ بیوی کہنے لگی نہیں تو شہزادے ہیں شہزادے۔ میرے پاس ہی ذنکا نائی کی بیوی کہنے لگی نہیں دیوتا ہیں "دیوتا"

رمو دیکھا تمام قصبہ میں تمہاری خوبصورتی کی شہرت ہو چکی ہے اب تم ذرا احتیاط سے کام لینا اس قصبہ میں جادوگر بہت رہتے ہیں جو خوبصورت بچوں کو جانور بناکر مار ڈالتے ہیں مجھکو ہنسی آگئی۔

بابوجی ہنسو نہیں میں نے اپنی ان آنکھوں سے خود سینکڑوں جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے بھوت دیکھے ہیں جو سب کے سب جادو کے زور سے مارے گئے تھے جادو کے زور سے بابوجی جیونی نے اول مرتبہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا بابوجی دن چھپنے کے بعد تم جنگل میں کبھی نہ جانا کیونکہ اس وقت بھوت پریت نکلتے ہیں اور خاصکر گیا آنے کے بعد تال پر تو بھولکر بھی نہ جانا وہاں بھوت بہت رہتے ہیں

میں نے تعجب سے پوچھا تم کو کیسے معلوم ہوا

کیسے؟ میں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا ہے رنگی کمہار کی بیوی نے صدموں سے تنگ آکر ایک رات اسی تال میں ڈوب کر خودکشی کرلی تھی۔ ابھی کچھ دن ہوئے میں رات کو اندھیرے میں اسی تال کے پاس سے گزر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ رنگی کی بیوی لمبے بال بکھیرے اور سفید ساری باندھے میرے سامنے کھڑی ہے میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی اور رونے لگی وہ بھاگ کر درخت کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ اور عجیب بھیانک آواز میں چلانے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ پل پر کھڑی تھی اور یہ کہتی ہوئی پانی میں کود پڑی۔ میری بچی مرگئی۔ میرا بچہ مرگیا اب میں بھی مرنے جارہی ہوں۔

کاکا کانپ گئیں وہ بھوتوں سے نہایت خوفزدہ ہو جاتی تھیں اور غصہ سے بولیں گدھی چپ کیوں نہیں رہتی میں نے ہزار دفعہ منع کیا ہے کہ یہ قصّے نہ بیان کیا کر۔

ماتاجی معاف کرو (گلطی) غلطی ہوگئی۔

میں سیکڑوں دفعہ معاف کرچکی ہوں مگر تو ان قصوں کے کہنے سے باز نہیں آتی گویا ان پڑھ رہی ہے۔ تو خود جاکر تال میں ڈوب کر بھوت کیوں نہیں بن جاتی۔ کاکا غصہ سے بیتاب تھیں۔ جیونی نے خوف اور لحاظ سے سر جھکالیا اور تھوڑی دیر کے بعد بولی آپ کے بھیّا کیسے سندر ہیں؟

میں نے نہیں کہا تھا کہ میرا بھائی شہزادہ معلوم ہوتا ہے اور کسے معلوم ہے ممکن ہے اس کے جسم میں کسی دیوتا نے جنم لیا ہو۔ کاکا نے نہایت فخریہ انداز میں کہا۔

کاکا خدا کے لئے رحم کرو۔

میں نے جوش محبت سے ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

کاکا تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں اس خوفناک قصبہ میں بغیر جیونی کے کیونکر زندگی گزارتی

اور ماتاجی بنا آپ کے میں تو زندہ بھی کیسے رہتی جیونی نے کہا اسکی آواز میں گیت کا ترنم تھا۔

یہ کمبخت قصبہ کیا ہے گاؤں سے بدتر چیزیں ملنا دشوار ہیں۔ اور "وہ" (بحیثیت ایک ہندوستانی بیوی کے کاکا اپنے شوہر کا نام نہیں لے سکتیں تھیں) اکثر تقاوی کی وصولیابی کے سلسلہ میں گھر سے باہر رہتے ہیں گاؤں ہیں تو کم مگر ایک دوسرے سے بہت فاصلہ پر واقع ہیں اکثر ہفتوں گھر کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوتی اور اگر جیونی میرے پاس نہ ہوتی تو میرا خوف و دہشت سے دم ہی نکل جاتا۔ کاکا کی آواز کچھ بھرّائی ہوئی معلوم ہوتی تھی رمو تم مرد ہمارے کامنا اور وشواس سمجھنے سے بالکل قاصر ہو اب جیونی باوجود نوکرانی ہونے کے بھی مجھکو یقین ہے میرے احساسات سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

کیوں میں نے دریافت کیا!؟

کیوں کیا تو میں نہیں بتا سکتی البتہ اس قدر جانتی ہوں کہ تم کشاکش زندگی میں گرفتار ہو کو ہم سے تو کیا "مذہب" جیسی حقیقت سے بھی بیگانہ ہو چکے ہو۔ ہمارے دیوتا اب تمہارے دیوتا نہیں رہے اور تم کو جن چیزوں میں جلوہ نظر آتا ہے وہ ہماری نظروں میں بھیانک معلوم ہوتی ہیں یہ بالکل معمولی بات ہے اب کاکا کی آواز میں حزن و ملال کا عنصر نمایاں تھا۔

مگر کاکا میں نے تو ہمیشہ آپ کے کامنا کو سمجھنے کی کوشش کی ہے میں نے آہستہ سے کہا

نہایت پُرمسرت آواز سے بولیں یقینی یقینی

بابوجی تمہاری آپا تم سے بہت محبت کرتی ہیں وہ تم کو اپنے بچوں کی طرح چاہتی ہیں۔ میں بعض اوقات اس خیال سے کہ میں نے ان کے بچے نہیں دیکھے بےتاب ہوجاتی ہوں بچے کیا ہوں گے فرشتے ہوںگے اور اب تو یقینی وہ آسمان میں فرشتوں میں شامل ہوںگے کیونکہ جب بچے مرجاتے ہیں تو وہ فرشتے بن جاتے ہیں۔ جیونی نے کہا اب اس کی آنکھیں پُرنم تھیں مگر بابوجی میں کہنا چاہتی تھی کہ تمہاری آپا کو تو تم سے اس قدر پریم ہے کہ وہ اکثر تمہارا ذکر کرکے کہتی ہیں کہ اگر رمو نہ ہوتا تو میں بھی کبھی کی مرگئی ہوتی!!

تم آپاجی کے پاس کتنے عرصے سے ہو میں نے گفتگو کا پہلو بدلنے کے لئے پوچھا۔

عرصہ درعرصہ تو میں جانتی نہیں لیکن دیکھئے میں آپ کو بتلاتی ہوں جب خریف کی فصل تیار ہوگئی تھی اور ہم اناج کاٹ رہے تھے تب آپ کی آپا نے مجھکو اپنے یہاں نوکری کرنے کو بلایا تھا۔

کاکا تم کو جیونی کا حال کیونکر معلوم ہوا۔

بابوجی آپ کو نہیں معلوم سارے قصبہ میں کوئی عورت نائب صاحب کی نوکری کے لائق مجھ سے اچھی نہیں ہے اگر آپ چاہیں تو قصبہ کے تمام لوگوں سے پوچھ لیجئے اور وہ سب آپ کو بتائینگے کہ جیونی گائے سے زیادہ نیک اور بیل سے زیادہ خدمت گزار ہے جیونی سے بڑھکر نائب صاحب جیسے بڑے لوگوں کی خدمت کوئی عورت نہیں کرسکتی اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیوں منہ سے نکلا اچھا تو تم تمام گاؤں کی نوکرانیوں میں سب سے زیادہ وفادار ہو۔

"اور کیا؟" اس نے فخریہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔

تم نے کتنے نائب تحصیلداروں کی ملازمت کی ہے میں نے دریافت کیا۔

اچھا ابھی تبلاتی ہوں اب اس نے انگلیوں پر گننا شروع کیا ہر ایک کا نام ان کے بچوں کی تعداد ان کی بیویوں کا مزاج اور ان کا رحم و کرم

میں نے شرارتاً دریافت کیا جیونی فرض کرو کہ میں دس یا پندرہ برس بعد پھر اس قصبہ میں آؤں اور نائب تحصیلدار نہ ہوں تو تم میری ملازمت کروگی یا نہیں۔

یہ سُنکر وہ کچھ پریشان سی ہوئی اور جواب کے لئے کاکا کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی گر پھر کچھ ایک سوچکے بولی بابوجی آپ جیسے بابوجی جیسے بڑے ہی آدمی ہوکر آؤ گے آپ کی تعلیم آپ کی سند تا سب باتیں کہتی ہیں کہ آپ نائب تحصیلدار ضرور ہونگے اور پھر میں خوشی سے آپ کی نوکری کرونگی فرض کرو کہ میں نائب تحصیلدار نہ ہوسکا۔

آپ ضرور ہونگے ضرور ہونگے اس نے ایسے انداز سے کہا گویا کہ میں اس سے مذاق اور اپنی توہین کر رہا تھا۔

اچھا تو تمہیں ملازم رکھنے کے لئے مجھے نائب تحصیلدار ہی ہونا پڑے گا۔ میں نے مذاقاً کہا۔

عقب کے دروازے سے میری بہنوئی کی آواز آئی مگر میری طرح سے خون پسینہ ایک کرنا پڑیگا۔ نائب تحصیلداری بالکل اس کی مصداق ہے کہ عشق آسان نمود اول دلے افتاد مشکلہا“

جیونی مارے خوف کے لرز اٹھی (کیونکہ یہ آواز اُسکے آقا کی تھی) اور باہر نکل گئی

آپ کی نوکرنی بہت اچھی ہے میں نے کاکا سے کہا۔

مجھکو وہ ماتا جی کہتی ہے مگر محبت اپنے بچوں جیسی کرتی ہے۔ کاکا نے جواب دیا۔

بھائی جی کو ہفتہ میں دو تین دفعہ باہر دورہ میں جانا پڑتا تھا اور چونکہ کاکا تنہائی سے گھبراتی تھیں اس لئے جیونی ہمارے مکان ہی پر سوتی تھی اور یہ بات اب اس کی عادتِ ثانیہ ہوگئی تھی چنانچہ میرے گھر پر آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

ایک شام کا ذکر ہے نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ ہم دونوں بہن بھائی سرِشام ہی کھانا کھاکر اپنے بستروں پر دراز ہوگئے تھے کہ جیونی نے باہر ہی سے کھڑکی سے جھانک کر آہستہ سے کہا ماتا جی کیا سوگئیں؟

بند ریا اندر کیوں نہیں آتی کاکا نے کہا۔

جیونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور ایک چادر جو وہ اپنے ہاتھ میں لئے ہُوئے تھی پلنگ پر ڈالکر باہر اصطبل میں چلی گئی جہاں وہ ہمیشہ اپنا کھانا کھایا کرتی تھی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میں سیکڑوں مرتبہ کاکا سے اس بات پر جھگڑ چکا تھا مگر ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح ایک نیچ ذات کی عورت کو اسی کمرہ میں جہاں ہم کھانا کھاتے ہیں بیٹھکر کھانا کھانے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

آج میں نے پھر وہی ذکر چھیڑا آخر یہ جیونی اصطبل میں بیٹھکر کیوں کھانا کھاتی ہے۔

کہہ تو دیا نیچ ذات کی عورت ہے یہاں کیسے کھانا کھا سکتی ہے

افسوس کاکا آپ کے پہلو میں دل نہیں پتھر کا ٹکڑا ہے وہ دل بھی کیا جو دوسروں کے دکھ سے متاثر نہ ہوسکے۔ کیا نیچ ذات کو کوئی دوسرا پیدا کرتا ہے۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں کیا آپ کی معاشرت انسانیت کا خون بہانے کے لئے اُن سے بہتر قوانین وضع کرسکتی تھی؟ کیا ہندو دھرم کے ماتھے پر اس سے زیادہ کلنک کا ٹیکہ لگایا جاسکتا ہے؟ کیا نیچ گھرانے میں پیدا ہونے کا گناہ اس قدر عظیم ہے کہ وہ کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی اور نسائی جذبات میں وہ کس طرح آپ سے کمتر ہے ابھی کل کا ذکر ہے کہ آپ کہہ رہیں تھی کہ وہ آپ سے بڑی بہن یا ماں جیسی محبت کرتی ہے مگر اس کے محبت کرنے سے یہ تو لازم نہیں آجاتا کہ ہم بے دھرم ہوجائیں۔

اور انسان بے دھرم کس طریقہ سے ہوجاتا ہے“؟

نیچ ذات کی عورت کے ساتھ کھانا کھانے سے انسان بے دھرم ہوجاتا ہے۔

رتنو کافی غصہ کہہ چکے ہو یا ابھی کوئی اور بات سُنانی باقی ہے پرمیشور کے لئے چُپ ہوجاؤ یہ کہکر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

آپ ظالم نا خداترس اور انسانیت کا خون بہانے والی ہیں میں نے ان کے آنسوؤں سے بغیر متاثر ہوئے کہا۔“

”جاؤ جاؤ اپنا انسانیت کا جذبہ باہر جاکر دکھاؤ انہوں نے غصہ سے کہا اور کمبل سے مُنہ ڈھک کر زیادہ زور سے رونے لگیں۔

میرا دل بھی اُنکی ظالمانہ حرکت سے خون ہوچکا تھا یہ میری عمر میں پہلا واقعہ تھا کہ ان کے رونے سے میں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا اور غصے سے بیتاب ہوکر باہر نکل آیا میں سیدھا اصطبل میں پہنچا تو دیکھا کہ جیونی اندھیرے میں بیٹھی ہوئی اس طرح چاول کھارہی ہے جیسے گائے جگالی کرتی ہو۔ اُس نے خیال کیا کہ شاید میں اصطبل میں ہوکر باہر باغیچہ میں جانا چاہتا ہوں مگر میں اس کے برابر دیوار کے سہارے سے کھڑا رہا۔ اُس نے کھانا بند کردیا اور نہایت خوفزدہ سی ہوگئی۔

جیونی میں نے نہایت خلوص کے لہجہ میں کہا۔

بابوجی اُس نے گھبراکر جواب دیا۔

جیونی کھانا کھاتے وقت تم چراغ کیوں نہیں روشن کرلیتیں“

کیا فائدہ۔ اُس نے جواب دیا اور پھر چاول کھانے میں مشغول ہوگئی

”گر تم اندھیرے میں کیسے دیکھ سکتی ہو کہ تم کیا کھارہی ہو“

”بابوجی کھانے کی چیز کو دیکھنے سے فائدہ اُس نے ہنسکر جواب دیا“

”دیکھو جیونی تم کو بغیر روشنی کے ہرگز کھانا نہیں کھانا چاہئے“

”بابوجی مجھکو معلوم ہے کہ میرے چاول اور بھات کہاں رکھا ہے اور یہ کافی ہے“

ٹھیک اسی وقت گائے نے کثرت سے گوبر کیا جس کی چھینٹوں نے اگر کھانے کو نہیں تو کم از کم اس کے کپڑوں کو ضرور آلودہ کیا ہوگا۔ میں نے غم وغصہ سے متاثر ہوکر کہا تم کمرہ میں بیٹھکر کیوں نہیں کھانا کھاتیں (گو کہ میں سمجھتا تھا کہ وہ کبھی اس کو منظور نہیں کرے گی)

”نہیں بابوجی میں یہاں بہت اچھی ہوں میں دری کو گندہ نہیں کرنا چاہتی۔

اگر دری گندی ہوجائے گی تو میں خود اس کو اپنے ہاتھ سے صاف کردوں گا۔ میں نے اپنے دلی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش ہوگئی تاروں کی روشنی میں مجھکو اس کا موہوم سایہ اصطبل کی دیوار پر نظر آرہا تھا۔ گائے جگالی کرنے میں اور بچھڑا گھاس کھانے میں مشغول تھا اور میرے دل میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ رہا تھا مجھکو سماج کے ظلم نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور میں اس کے بوجھ کے نیچے دبا جارہا تھا۔ مگر آہ معصوم و مظلوم جیونی اس جذبہ سے بے نیاز اطمینان کے سانس لے رہی تھی اور خوش تھی۔

میں نے غم غلط کرنے کے لئے دریافت کیا جیونی کیا تم مکان پر بھی اندھیرے میں کھانا کھاتی ہو

جی بابوجی!

کیوں؟

بابوجی تیل بہت مہنگا ہے ۲ میں تیل کی ایک بوتل آتی ہے اور وہ ۸ یوم چلتی ہے۔

مگر دو آنے ہوتے ہی کیا ہیں۔

”ہوتے ہی کیا ہیں میری دو دن کی کمائی کچھ ہوتی ہی نہیں!!؟

دو دن کی کمائی ہو؟ میں نے کمال تعجب سے پوچھا؟
جی ہاں مجھے دو روپئے ماہوار گزارے کو ملتے ہیں!
دو روپئے ماہوار!!
جی ہاں دو روپئے ماہوار ——— تو بہت ہیں (اس نے لفظ "بہت" پر زور دیکر کہا) کہیں قریب ہی سے ٹوکی آواز آرہی تھی اور کہیں دور اس قدر دور کہ دُنیا والوں کی نظریں وہاں تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتی بھارت ماتا اپنے مظلوم بچوں کی بیکسی پر آنسو بہا رہی تھی کیا پاکیزہ تعلیم ہے اسلام کی میں نے دل میں خیال کیا میں نے دل میں خیال کیا جس نے شاہ گدا و محتاج و غنی کو ایک صف میں کھڑا کر دیا جہاں بزرگی و برتری منحصر ہے علم و اعمال پر نہ کہ ذات پر بیشک کرشن اور رام کی بھی تعلیم ہوگی بے شک رشیوں نے بھی یہی درس دیا ہوگا مگر دُنیا والوں نے اس تعلیم کو نیست و نابود کرکے ہندو دھرم کی پیشانی پر ایک بدنما داغ لگا دیا۔ اے پرمیشور دھرماتما گاندھی جی کو وہ قوت دے کہ وہ اس ظلم کی بیخ کنی کرنے میں کامیاب ہوں۔

اب میں تاثرات سے اس قدر مغلوب ہو گیا تھا کہ بات کرنے کو الفاظ نہیں ملتے تھے ہے ایشور کیا وہ تمام عمر یہی چاول کھا کر اپنی زندگی گزار دیگی کیا چاول کھانا ہی اس کی زندگی کا ماحصل ہے۔

میں نے اپنا غم غلط کرنے کے لئے اس سے دریافت کیا۔ جیونی تم دو روپئے کا کیا کرتی ہو۔
میں اپنی تنخواہ نہیں لیتی ہوں"
کیوں نہیں لیتی ہو۔ میں نے پوچھا۔
ماتا جی میری تنخواہ جمع کرتی رہتی ہیں اور جب وہ میرے کام سے خوش ہوتی ہیں۔ تو ایک دو آنہ انعام کے طور پر اس میں اور اضافہ کر دیتی ہیں۔ اور جب کافی رقم جمع ہو جاتی ہے تو میں ساری خرید لیتی ہوں۔
اور بقیہ کا کیا ہوتا ہے میں نے دریافت کیا۔
بقیہ سے میں اپنے بھتیجے کے لئے کھلونے خریدتی ہوں
کیا تمہارا بھائی غریب ہے۔
نہیں بابو جی مگر مجھے بچے سے محبت ہے
اگر میں تم سے بچے کو طلب کروں تو کیا تم مجھکو دیدو گی۔ میں نے مسکرا کر دریافت کیا کیونکہ غم و غصہ نے آنسو خشک کر دئے تھے۔
آپ مجھ سے کبھی نہیں طلب کرینگے اور اگر آپ طلب کریں گے تو مجھ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ بھی ہنس پڑی" کیا تم سچ کہتی ہو"
آپ کے چرنوں کی قسم اب وہ کھانا ختم کر چکی تھی اور اُٹھکر ہاتھ دھونے چلی گئی تھی۔
میں بھی باہر نکل آیا۔
ستارے آسمان پر جگمگا رہے تھے ان میں چھوٹے اور بڑے چمکیلے اور ماند میں کسی کو ایک دوسرے پر فوقیت نہ تھی سب کو نیلا آسمان اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا۔ پرمیشور کیا ان میں بھی ذات پات کا فرق ہے۔
باہر سڑک پر ایک گاڑی بان یہ شعر الاپ رہا تھا۔
"چلی آئیں تنہا انہیں بھی تو لائیں"
اور فضا ساکت تھی۔

جب کبھی رات کو جیونی ہمارے یہاں سونے آتی تو قصبہ کی خبروں کا کافی ذخیرہ اس کے پاس ہوتا تھا۔ جو ایک ایک کرکے ہم کو سنائی جاتی تھیں۔ اگر کبھی آم والے کا چھٹی رساں کی بیوی کو اغوا کرنے کا قصہ بیان کیا جاتا تھا تو کبھی دنکا کی بیوی کے مندر کے درشن سے شفا پانے کا کاکا کو ان خبروں کے سننے میں خاص لطف آتا تھا اور غالباً اسی لئے جیونی بھی قصبہ کی ایک ایک خبر نہایت احتیاط سے ہم پہنچا کر کاکا کے گوش گزار کرتی تھی ہم لوگ اپنے نرم و گرم بچھونوں پر سوتے اور جیونی چٹائی پر ایک بوسیدہ رضائی اوڑھ کر سوتی اس نے کبھی جاڑے کی بھی شکایت نہیں کی۔

ایک شب کا ذکر ہے کہ میں نے جیونی سے درخواست کی کہ وہ اپنا کچھ حال سنائے پہلے تو اُس نے انکار کیا مگر کاکا کے کہنے سے طوعاً و کرہاً راضی ہوگئی۔ میں ہمہ تن گوش تھا اور کاکا نیند سے مغلوب ہو کر دنیا سے بے خبر۔

جیونی کی پیدائش قریب کے گاؤں کوٹھالی میں ہوئی تھی اس کا باپ ایک متوسط الحال کاشتکار تھا جو موسم سرما میں کھیتی اور موسم گرما میں کپڑے دھونے کا پیشہ کرتا تھا اس کی ماں چونکہ کوٹھالی میں تنہا دائی کا پیشہ کرتی تھی اور ہر روز کسی نہ کسی کے یہاں بچہ جنانے کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے بہت عدیم الفرصت رہتی تھی۔ جیونی کے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں مگر موت نے صرف ایک بھائی بھیما نامی زندہ چھوڑا تھا باقی سب نذر اجل ہو چکے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارہ اور دل کی ٹھنڈک بنکر رہی یہانتک کہ جب اُس نے اٹھارہویں سال میں قدم رکھا۔ اس کے ماں باپ کو شادی کی فکر ہوئی بڑی جستجو کے بعد ایک دھوبی کا لڑکا تجویز کیا گیا۔ شادی کی رسم ادا کی گئی اور جیونی ماں باپ کو روتا چھوڑکر اپنے شوہر کے گھر پہنچ گئی قسمت نے یہاں بھی یاوری کی وہ شوہر کے دل کا سرور بنکر رہی شادی کے کچھ عرصہ بعد تک اس کا محبوب شوہر زندہ رہا اور جیونی اس کے دل کی رانی بن کر رہی مگر ایک روز یکایک کپڑے دھوتے وقت کسی زہریلے سانپ نے اس کو ڈس لیا تمام جادو ٹونے کئے گئے مگر کوئی بات کارگر نہ ہوئی اور وہ سب کو روتا چھوڑکر کسی دوسری دنیا کو آباد کرنے کے لئے چلدیا میرا خیال تھا کہ یہاں آکر وہ تاثرات سے بے تاب ہو کر آنسوؤں کے دریا بہائے گی مگر نہیں میں نے محسوس کیا کہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بیوگی گویا تمام مصائب والائم کی ابتدا تھی جن سے یکے بعد دیگرے اس کو ہمکنار ہونا پڑا۔ اس کے شوہر کے دو بھائی اور ایک بہن تھی بڑا بھائی شرابی اور جواری تھا۔ اور چھوٹے بھائی نے باوجود شادی کے، ایک بازاری عورت سے ناجائز تعلق کر لیا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو نہایت بے دردی سے مارتا تھا یہانتک کہ ایک روز تو اس نے بیوی کو مارتے مارتے بے ہوش کر دیا۔ اس کے جیٹھ اور دیور و نیز نند کے کافی بچے تھے جن سے گھر میں چہل پہل اور کافی رونق تھی۔ اس لئے جیونی صبر و شکر سے اپنی سسرال میں رہتی اور گھر کا کام کاج کرتی اس نے ان مصیبتوں میں کوئی تکلیف نہیں محسوس کی کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ وہ سب عطیہ ہیں دیوی ماتا کا جو اس کو آیندہ جنم میں ان سب کا نعم البدل عطا کرے گی۔

ایک روز نہ معلوم کس جرم میں پولیس والے اس کے جیٹھ کو گرفتار کرکے لے گئے اور اب کوئی کھیتی کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں رہ گیا۔ گاؤں والوں نے اپنے مویشیوں سے تمام کاشت اجڑوادی اور منع کرنے پر گالیوں سے پیش آئے۔ نتیجہ ظاہر ہے افلاس نے بڑھ کر ان کا دامن تھاما اور فاقوں کی نوبت پہنچ گئی۔ اب چونکہ جیٹھ نے جیل خانے اور دیور نے اپنی داشتہ

کا گھر آباد کر لیا تھا گھر کی عورتوں نے طعن و تشنیع سے جیوتی کا کلیجہ چھلنی کر دیا۔ منحوس بیوہ کہنا اور منہ پر تھوک دینا تو گویا ایک ان کا روزانہ کا مشغلہ تھا۔

جیوتی کہنے لگی مجھ کو اکثر خیال آتا تھا کہ میں نہر میں کود کر جان دیدوں اور دنیا کی مصیبتوں سے نجات پاؤں مگر دیوی ماتا کا ڈر اس قصد سے باز رکھتا تھا مگر ایک روز بھابی نے اس قدر بُرا بھلا کہا کہ میں گھر سے نکل کر بھاگ گئی۔ گھر سے نکلنے کو تو نکل آئی مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں میرا بھائی ہمیشہ سے مجھ سے نفرت کرتا تھا مگر بابو جی بہن تو آخر بہن ہی ہے اور آپ اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ جس ماں کا میں نے دودھ پیا تھا اسی کا بھیا نے بھی پیا تھا

ہرگز نہیں میں نے کہا۔

مگر بابو جی میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس نے وہ برتاؤ مجھ سے کبھی نہیں کیا جو آپ اپنی کاکا سے کرتے ہیں خیر میں نے کہا تم اپنا قصہ بیان کرو۔

میں سیدھی اپنے بھائی کے مکان پر گئی مجھ کو دیکھتے ہی بھابی کے آگ لگ گئی۔ انہوں نے مجھ کو منحوس ڈاین اور نہ معلوم کیا کیا کہا زمین پر تھوک دیا اور اپنے بچے کو جو کھیل رہا تھا گود میں اُٹھا کر اندر لے گئیں اسی اثنا میں بھائی بھی نکل آیا۔

کیسے آئی اُس نے کہا۔

میں نے کہا کہ مجھ کو سر چھپانے کے لئے کہیں جھونپڑا بھی میسّر نہیں ہے۔

منحوس بیوہ تجھے جھونپڑا کیسے میسّر آسکتا ہے جبکہ تو جہاں جائے گی نحوست تیرے ساتھ ہوگی۔

میں رونے لگی۔

رو۔ رو کر تو کا ڈیری کو بہر دے اُس نے غصہ سے کہا مگر میں تجھ کو ایک لقمہ بھی کھانے کو نہیں دونگا۔

مجھکو تمہارا کھانا نہیں چاہئے مجھ کو تو سر چھپانے کے لئے ایک جھونپڑی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا۔

یہ سن کر اُس کا غصہ ذرا دھیما پڑا اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور بولے اچھا یہ وعدہ کر کہ لڑے گی تو نہیں۔

"نہیں" میں نے کہا۔

اچھا پتا جی کے خیال سے میں تجھ کو رہنے کی اجازت دے سکتا ہو۔ یہاں تو چلے ہے رڈ چلے ہے کھائے چاہے مر۔ میں سر سے پیر تک کانپ گئی اتنے ہی میں بھابی بھی نکل آئیں۔ اُس نے مجھکو منحوس گدھی اُلو کی بچی۔ جادوگرنی کہہ ڈالا اور زمین پر زور زور سے ٹھوکریں ماریں۔ بابو جی میں نے ایسی عورت نہیں دیکھی وہ میری زندگی مسلسل آنسوؤں میں تبدیل کر دیتی ہے۔

کیونکر میں نے دریافت کیا۔

کیونکر تو میں نہیں بتلا سکتی مگر ہر روز جب صبح کو میری آنکھ کھلتی ہے تو کان گدھے کی بچی اور رنڈیا کے الفاظ ضرور سن لیتے ہیں۔

مگر تمہارا اپنی بھاوج سے تو کوئی واسطہ نہیں ہے۔

واسطہ تو نہیں ہے مگر اکثر ان کا بچہ میرے پاس آجاتا ہے اور چونکہ مجھے بچہ سے محبت ہے میں اس کو گود میں لیتی ہوں یہ دیکھکر بھابی کے آگ لگ جاتی ہے اور شیرنی کی طرح بھپرتی ہوئی میری جھونپڑی میں آکر بچہ کو مجھ سے چھین لے جاتی ہے اور کہتی ہیں کہ اگر بچہ کو آئندہ ہاتھ لگایا تو تیری کھال کھنچوا لوں گی۔

تو تم بچہ کو مت لیا کرو میں نے کہا۔

ہاں اگر میرا اپنا بچہ ہوتا تو میں کیوں ان کے بچہ کو ہاتھ لگاتی اور پھر بچہ کو بھی مجھ سے محبت ہے اور ہاں میں نے کہا وہ تم کو بچہ کو کیوں نہیں لینے دیتی ہیں۔

وہ کہتی ہیں کہ میں بیوہ ہوں اور میری نحوست کا اثر بچہ پر بھی پڑے گا۔ اگر میں اس کو گود میں لوں گی۔

کون کہتا ہے تمہاری بھابی۔

نہیں بھائی اور بھابی دونوں۔

کیا اُن کے ایک ہی بچہ ہے

نہیں اُن کے چار اور بچے ہیں سب بڑے ہو گئے ہیں ایک تو آپ کے برابر ہے۔

کیا سب بچے تم سے محبت کرتے ہیں۔

نہیں صرف یہ چھوٹا بچہ محبت کرتا ہے باقی تو سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں نفرت

تم کسی بچہ کو گود کیوں نہیں لے لیتیں۔

گود لیکر کیا کروں گی میں نے ایک بکری کا بچہ پال رکھا ہے وہی میرے دل کے بہلنے کے لئے کافی ہے۔

اچھا تم نے بکری کا بچہ بھی پال رکھا ہے میں نے تعجب سے کہا۔

جی ہاں بکری کا بچہ پال رکھا ہے منو میرا بھتیجہ اس سے کھیلتا ہے اور آئندہ درگا کے موقع پر میرا ارادہ اس کو کالا کما دیوی کے بھینٹ چڑھانے کا ہے۔

دیوی کو بھینٹ چڑھانے کا اسے زندہ کیوں نہیں رہنے دیتیں۔

پاپ کی باتیں نہ کرو بابو جی میں نے دیوی کو ہر تیسرے سال ایک بکرے کی بھینٹ دینے کی نیت کر رکھی ہے۔

اور دیوی تم کو بکرے کے بدلے میں کیا دیتی ہے

کیا۔ سب کچھ۔ ہر چیز۔ میری زندگی۔ میری تندرستی۔ ماتا جی کی مہربانی بابو جی سب کچھ دیوی ہی کا دیا ہوا ہے۔ یہ کہکر اس نے اپنے ہاتھ باندھے اور نہایت التجا سے دُعا مانگنی شروع کی۔ دیوی ماتا مجھ پر رحم کر ماتا جی مجھ پر رحم کر اور ساری دنیا کو دولت۔ عزت اور تندرستی عطا کر۔

میں نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا تم کو مجھ سے زیادہ محبت ہے یا اپنے بھتیجہ سے۔

میں کس طرح جواب دوں اس نے کہا میں بھتیجہ کے لئے تو ہر تیسرے سال ایک بکرا دیوی کی نذر کرتی ہوں آپ کے لئے تو میں نے کوئی بکرہ ابھی تک بھینٹ نہیں چڑھایا۔

تو صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تم کو بھتیجہ سے زیادہ محبت ہے۔

یہ بات بھی نہیں ہے کیونکہ جب سے ماتا جی نے کہا ہے کہ ان کے ایک بھائی ہے میں برابر آپ کی سلامتی اور تندرستی کی دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔

اچھا میں نے کہا کہ تم مجھ کو گود لیلو۔

یہ سُنکر وہ اس زور سے ہنسی کہ کاکا کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے غصہ سے بگڑ کر کہا چپ رہ بدتمیز میں نے کہا کاکا جیوتی مجھ کو گود لینا چاہتی ہے۔

کاکا نے کہا تم کو گود لینا چاہتی ہے جا کے کا دیری میں کیوں نہیں ڈوب مرتی۔ یہ کہکر وہ پھر

خراٹے لینے لگیں۔
میں نے کہا جیونی اگر تم مجھ کو گود دلیلو تو میں تمہارے لئے کام کرونگا اور تمہیں روٹی کپڑے کی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔
نہیں بابو جی برہمن کام کرنے کے لئے نہیں پیدا ہوئے ہیں وہ تو پرمیشور کے برگزیدہ بندے ہیں
ہرگز نہیں میں نے کہا ہم میں کوئی بزرگی نہیں ہے۔
نہیں آپ ضرور بزرگ ہیں ضرور ہیں۔ تمام مقدس کتابیں آپ کی ہیں متبرک وید آپ کے ہیں آپ سب کچھ ہیں سب کچھ آپ اونچی ذات کے ہیں اور ہم تو آپ کے خادم اور غلام ہیں۔
میں برہمن ہی نہیں ہیں میں نے کہا۔
نہیں آپ ہیں۔ آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔
جو کچھ بھی ہو اچھا جیونی تم مجھ کو گود ضرور لے لو۔
وہ پھر ہنسنے لگی۔
اچھا میں نے کہا اگر تم نہیں مانتیں تو میں مر جاتا ہوں اور پھر بکری کا جنم لوں گا اور تم اس کو خریدوگی بتاؤ اس وقت کیا کروگی۔
اس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان سی ہوگئی ہے مجھ کو بھی اس وقت نیند کا غلبہ تھا میں نے کہا کہ اچھا اب تم سو جاؤ اور کل پھر اس پر غور کرنا کہ تم مجھکو گود لوگی یا نہیں میں بھی سو گیا مگر سونے سے قبل میں نے سنا کہ جیونی دیوی ماتا سے دعا مانگنے میں مشغول ہے "دیوی ماتا میرے گناہوں کو معاف کر میری مدد کر ماتا جی ان کے بھائی اور میاں کی حفاظت کر رحم کر ماتا رحم کر" ماتا دیوی کی پجارن مصروف دعا تھی اور دیوی کا ڈیری کے کنارے اپنے خوبصورت مندر میں خاموش،

اس واقعہ کے دو سال بعد آخر وہ دن بھی آ گیا جبکہ بھائی صاحب کے تبادلے کے سلسلے میں ہم ایک گاڑی میں سوار ہو کر باکلہ کو خیر باد کہہ رہے تھے کاکا اور میں بہلی میں اندر کی طرف سوار تھے اور بھائی صاحب بیلوان کے برابر بیٹھے تھے۔ ایک ہفتہ پہلے سے جیونی برابر سرد آہیں بھرتی تھی اور جدائی کے لمحوں کا خیال کرکے اس کی آنکھیں غم آلود ہو جاتی تھیں آج بھی وہ گاڑی کے ہمراہ تھی اور جب کبھی کاکا اور اس کی آنکھیں چار ہو جاتی تھیں وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھی کاکا بھی افسردہ تھیں اور سمجھتی تھیں کہ وہ آج ایک سچی خیر خواہ سے جدا ہو رہی ہیں ہاں اس قصبہ میں جیونی ان کی تنہا رفیق اور مخلص خیر خواہ تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ بہلی پر رکھتے ہوئے کہا "ماتا جی مجھ کو بھول مت جانا"
یقین رکھ میں تجھ کو ہرگز نہیں بھولوں گی اور کاکا کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔
میرا دل بھی بے اختیار رونے کو چاہتا تھا مگر تہذیب مانع تھی اس لئے خاموش تھا دریا کے پاس پہنچکر گاڑی بان نے بیل کھول دیئے کیونکہ دریا پایاب تھا اور گاڑی کو دریا میں ہو کر دوسرے کنارہ پر پہنچنا تھا۔ میں گاڑی سے اتر پڑا کچھ تو اس خیال سے کہ کھلی ہوئی ہوا میں سانس لے سکوں مگر زیادہ تر جیونی سے گفتگو کرنے کے خیال سے۔
میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا جیونی روؤ نہیں۔
آہ بابو جی کس طرح نہ روؤں مجھ کو تمہارا جیسا دیوتاؤں کا خاندان کہاں نصیب ہوگا۔ ماتا جی مجھ پر دیوی کی طرح مہربان تھیں۔ آپ بھی مہربان تھے اور بڑے بابو یہ کہکر وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
نہیں جیونی میں نے اس سے کہا تمہارے جیسے دل کی مالک سے مل کر کون شخص دیوتا نہیں ہو جائے گا لیکن وہ رونے میں مشغول تھی اور نیز میرے الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر
تھوڑی دیر بعد گاڑی بان نے مجھ سے گاڑی میں سوار ہونے کو کہا اور میں ایک غمزدہ دل اور مجروح آتما لئے ہوئے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ آج میں ایک عجیب اور قیمتی ہستی سے جدا ہو رہا تھا۔
گاڑی بان نے ہیئے ہیئے کہکر گاڑی دریا میں ڈال دی میں خاموش گوش دل سے جیونی کی سسکیوں کی آواز سن رہا تھا۔ وہ ایک پیپل کے درخت سے کمر لگائے ہماری گاڑی کو ٹکٹکی باندھے ہوئے تک رہی تھی۔ وہ نیلے آسمان کے نیچے اس وسیع دنیا کا ایک نہایت ہلکا اور خفیف سا نقش معلوم ہوتی تھی وہ اس دنیا کی ایک نہایت قیمتی ہستی تھی مگر اوہام پرستی اور سماج کے مظالم کا شکار

از (ڈرامہ راؤ)

مترجمہ
اقبال احمد بی اے

میخانۂ اقوام

مُسلمِ ہندی

شعاعِ مہر سے ہے مطلعِ سحر خالی
ہوا نہ ہو نہیں تاریکیوں میں گھر خالی

نہ فکر بیخودیِ شوق کی نہ کسل کا غم
ہر اک ہاتھ میں اک جام ہے مگر خالی

سوالِ کیف کی آواز ہر طرف ہے بلند
مگر سرورِ عمل سے ہیں بے خبر خالی

بُرا ہو لعنتِ تشنہ لبی بُرا ہو ترا
ہے ایک اشک سے بھی آج چشمِ تر خالی

ہر ایک گام پہ ہے ذکرِ میکشانِ قدیم
مگر ہے جوشِ عمل سے ہر ایک سر خالی

کبھی ہزار گلستاں تھے اور ایک نگاہ
اب ایک پھول سے ہے دامنِ نظر خالی

ہے اتفاق سے بت خانہ صد صنم بکنار
اور اختلاف سے کعبے کے بام و در خالی

مےِ غلامیِ مغرب سے مست ہے مُسلم
خود اپنے ظرفِ خودی کی شکست ہے مُسلم

"ہندو"

نشاطِ تازہ سے ہے چشمِ برہمن روشن
جدید نور سے ہے محفلِ کہن روشن

عجب نکھار پہ ہے صندل و عبیر کا رنگ
ہوئی ہے قشقۂ خونیں سے انجمن روشن

بہار اب کے برس آگ بن کے آئی ہے
ہے ایک "لالۂ رنگیں" سے کُل چمن روشن

جگر کے داغ چھپائے سے چھپ نہیں سکتے
وطن کی آگ سے ہیں سب کے پیرہن روشن

ستارے کیا کہ نہ بھولیں گے راہ ذرّے بھی
ہیں ایک چاند کے پرتو سے بن کے بن روشن

ضیائے بزم نہیں اب رہینِ منتِ شمع
بجھے گی شمع تو ہو جائے گی لگن روشن

تلاشِ شمع میں اہلِ حرم ہے مصروف
چراغ دیر نے کی محفلِ وطن روشن

مہِ جدید براوجِ وطن ہویدا شد
"کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد"

"افغان"

اٹھی ہیں جہل و بغاوت کی آندھیاں تاریک
سیاہ تر ہے زمین اور آسماں تاریک

یہ کس کا خون در و بامِ میکدہ میں ہے جذب
ہے جوشِ رنگ سے صہبائے ارغواں تاریک

سوادِ بحرِ الم سے یہ کس غضب کا دھواں
اُٹھا کہ ہو گئے کشتی کے بادباں تاریک

ہوئی حجابِ ثریا سے بے حجابیِ حُسن
چلا نہ کام کہ تھی "بزمِ کہکشاں" تاریک

سیاہ بختیِ افغاں کا یہ تصرف دیکھ
کہ بعدِ صبح بھی ہے راہِ کارواں تاریک

نوائے بلبل رنگیں چمن میں جب سے نہیں ہر ایک پھول ہے بے نور گلستاں تاریک
مآلِ قسمتِ گلشن کی خیر ہو یارب! ہے آشیاں کی طرح ذہنِ باغباں تاریک

یہ رندِ بادیہ سرخوش بھی تشنہ کام بھی ہے
تضاد دیکھ کہ آزاد بھی غلام بھی ہے

"ایرانی"

کمال سعی پہ ہے کائنات کی بنیاد اسی سے رونقِ صحرا اسی سے گھر آباد
دیارِ عشق میں لازم ہے شرطِ سعی و عمل کہ ایک بانوئے رنگیں ہے اصل میں فرہاد
نہ اب وہ نغمۂ چاریاں نہ بربطِ عیش نہ اب وہ سیرِ مصلے و آبِ رکنا باد
ہزار قطرۂ خونِ جمیل صرف ہوئے تو ہو سکا وطنِ حافظ و تمیں آزاد
کمالِ تیغِ رضا کی ہے دھوم عالم میں کہ دی ہے رزحِ منوچہر نے مبارکباد
بساطِ گلشنِ ایراں پہ کھیل مشکل ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں مات کھا گیا صیاد
اسیرِ حبِ وطن کے خطاب ہیں کیا کیا غیور و زندہ و آزاد و اشرف و دلشاد

یہ قوم میکدہ در بر ہے خود خمستاں ہے
چراغِ محفلِ فارس اسی سے تاباں ہے

"روسی"

چمن میں آج جو ہے پابہ گِل بہ مجبوری وہ کل بہار کو دیگا پیامِ منصوری